کلیاتِ
مُلّا رموزی
(جلد دوم)
مرتب
خالد محمود
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

کلیات مُلّا رموزی

(جلد دوم)

مرتب

خالد محمود

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2014
تعداد : 550
قیمت : -/243 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1804

Kulliyaat-e-Mulla Ramoozi
(Vol. II)
Edited by
Prof. Khalid Mahmood

ISBN :978-93-5160-024-4

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025 فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099 شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM,TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو طنزیات و مضحکات کا سرمایہ جن چراغوں سے منور ہے، ملا رموزی ان میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا طرز خاص ''گلابی اردو'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے قدیم مذہبی اور فقہی کتب کے طرز بیان میں اپنے عہد کے حساس موضوعات اور مسائل کی ناہمواریوں کو نشانہ بنایا۔ اردو ادب میں طنز اور مزاح کو عموماً ایک اسلوب یا کم از کم لازم و ملزوم خیال کیا جاتا ہے جبکہ ناقدین ادب نے دونوں کی نفسیات کو جداگانہ طور پر خود مکتفی اساس کا حامل بتایا ہے۔

ملا رموزی کی طنزیات و مضحکات کو اپنے عہد میں بہت سراہا گیا۔ عہد اور اس کے بعد بھی ان کے رنگ تحریر کی تقلید کی گئی اور اسے ایک کامیاب مزاحیہ حربے کی حیثیت حاصل رہی۔ عوامی ادب (Popular Literature) کی فراہمی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اشاعتی پالیسی کا ایک اہم حصہ رہی ہے۔ ملا رموزی کی کلیات کی یہ پیش کش کونسل کے اسی اشاعتی پروگرام کا حصہ ہے۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ بھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں شائع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر

علم وادب کے شائقین تک پہنچاتا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول، اس ہر دلعزیز زبان میں معیاری کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

پروفیسر خالد محمود دنیائے ادب میں نمایاں نام رکھتے ہیں۔ ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ خود طنز و مزاح کے تخلیق کار ہیں اور اس فن کے ابعاد سے واقفیت رکھتے ہیں۔ توقع ہے کہ ملا رموزی پر ان کا یہ کام ملا رموزی کی شش پہلو شخصیت اور ان کے فکاہی کارناموں کی تفہیم میں سنگ میل کی حیثیت رکھے گا، طنزیات ومضحکات سے متعلق عمومی طور پر پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا اور کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح 'کلیات ملا رموزی' کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

ترتیب

مقدمہ

بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو کا قصرِ ادب جن چراغوں سے منور تھا ان میں طنز ومزاح کی ایک طرز خاص ''گلابی اردو'' کے موجد اور خاتم ملا رموزی کا نام نامی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ملا رموزی اپنے عہد کے کثیر الجہات اور کثیر التصانیف مصنف تھے۔ یوں تو انھوں نے ادب کے مختلف اسالیب میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں مگر ان کا اصل میدان طنز ومزاح تھا۔

اردو ادب میں طنز اور مزاح دونوں کو عموماً ایک ہی اسلوب یا کم از کم لازم وملزوم خیال کیا جاتا ہے حالانکہ ایسا ہے نہیں۔ طنز اور مزاح اپنا الگ الگ مستقل اور مستحکم وجود رکھتے ہیں اور ان کی الگ الگ پہچان بھی ہے۔ ناقدین ادب نے دونوں کی نفسیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تعریف وتوضیح کی ہے۔

مزاح کا بنیادی تعلق ہنسی یا خندہ یا ہنسنے ہنسانے سے ہے۔ ایک ماہر نفسیات کی رائے میں ''ہنسی عدم تکمیلیت اور بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان اس وقت ہنستا ہے جب اس کی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہو۔'' ایک اور ماہر نفسیات کے مطابق ''ہم ایسی باتوں پر ہنستے ہیں جو ہمارے یقین سے بالاتر ہوتی ہیں اور ایسی چیزوں پر بے اختیار ہنس دیتے ہیں جو عقل سے بہت دور نظر آتی ہیں۔'' ان کے علاوہ بھی ہنسی کے کئی عوامل ہیں مثلاً میکانکی

نظام حیات اور یکسانیت کے خلاف ردعمل، پریشانیوں سے وقتی نجات کی خواہش، نفسی توانائی کی حفاظت اور کفالت اور اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کے درد کا شعوری احساس وغیرہ۔ یہی عوامل مزاح تخلیق کرتے ہیں اور یہی وہ مزاح ہے جو پژمردہ، فسردہ اور بے رنگ و نور زندگی میں رنگ و نور لاتا ہے۔ مسرت و شادمانی فراہم کرتا ہے اور خوش دلی کو فروغ دیتا ہے اسی لیے مولانا الطاف حسین حالی نے اسے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا قرار دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لیے کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اور ایک سہانی خوشبو کی لپٹ ہے، جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ ایسا مزاح فلاسفہ اور حکما بلکہ اولیا اور انبیا نے بھی کیا ہے اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے جودت اور ذہن کو تیزی ہوتی ہے اور مزاح کرنے والا سب کی نظروں میں محبوب اور مقبول ہو جاتا ہے۔''

یہ ایک مہذب انسان کے لطیف و شائستہ مزاح کی جامع اور بلیغ تعریف ہے اس مزاح میں طنز، تشنیع، تلخی، ترشی، تمسخر، لعنت، ملامت، دل شکنی، حقارت، فحاشی، عریانیت یا کسی کی دلآزاری کا شائبہ تک نہیں ہوتا اسی لطیف و شائستہ مزاح کو حالی نے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اور خوشبو کی لپٹ سے تعبیر کیا ہے۔

طنز کا معاملہ مختلف ہے۔ ادب میں طنز کے لیے کئی اصطلاحیں مستعمل ہیں مثلاً ہجو، تعریض، تنقیص، لعن طعن، استہزا، تمسخر، مضحکہ وغیرہ۔ اردو کے مشہور طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی کے مطابق ان تمام اصطلاحات میں صرف طنز ہی وہ لفظ ہے جو بڑی حد تک انگریزی کے لفظ Satire کی ترجمانی کرتا ہے اس لیے اردو میں اسی اصطلاح کا چلن ہے۔ طنز ایک طرح کا عمل جراحی ہے، جس کا مقصد اصلاح اور تنقید حیات ہے۔ اسی خیال سے طنز کے لیے مقصدیت کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اگر طنز میں اصلاح کا پہلو نہ ہو تو یہ محض ہجو یا تنقیص بن کر رہ جاتا ہے۔

جب ہم طنز و مزاح دونوں کو یکجا کر کے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں بیشتر طنز نگاروں نے پرانے حکیموں کی طرح طنز کی کڑوی کسیلی دوائیں مزاح کی مٹھائی میں لپیٹ کر کھلانے

کی کوشش کی ہے تا کہ منہ کا ذائقہ بھی نہ بگڑے اور علاج بھی ہو جائے اسی لیے اردو میں خالص طنز اور خالص مزاح کی بہ نسبت طنز و مزاح کے مشترک نمونوں کی مقدار زیادہ ہے۔

ہمارے عہد کے سب سے بڑے طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرز نگارش کا معنی خیز تجزیہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''وار ذرا اوچھا پڑے اور بس ایک آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں ورنہ مزاح''

طنز و مزاح نگار کے بارے میں ان کی رائے ہے:

''ایک اچھا طنز نگار تنے ہوئے رسّے پہ کرتب نہیں دکھاتا بلکہ تلواروں پر رقص کرتا ہے اور مزاح نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں اور اس طرح کہہ جاتا ہے کہ سننے والے کو بہت بعد میں خبر ہوتی ہے۔''

طنز و مزاح کے انھیں خوش گوار و خوش اطوار اوصاف کو اردو کے جن ادیبوں نے اعتبار بخشا ہے ان میں بہ اعتبار شہرت و مقبولیت ریاست بھوپال کے مشہور طنز و مزاح نگار، کالم نویس، خاکہ نگار، ادیب و شاعر ملا رموزی منفرد اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

ملا رموزی کا وطن بھوپال ہے جو اپنے محل وقوع اور تاریخی عوامل کی وجہ سے وسط ہند کی چھوٹی مگر اہم ریاست تھی۔ اس کی سرسبز و شاداب پہاڑیاں، وسیع جھیلیں، صاف شفاف سڑکیں، خوشنما اور کثیر مساجد، جن میں ایک مسجد موسوم بہ ''تاج المساجد'' ہندوستان کی سب سے بڑی مسجد خیال کی جاتی ہے۔ اور بھوپال کا ایک تالاب بھی ہندستان میں وسیع تر ہونے کا دعوے دار ہے۔ ان تمام دلکش و دلفریب مناظر کے درمیان بھوپال کی گنگا جمنی تہذیب، اتحاد و یکجہتی کی فضا، حسن مزاح، تواضع، رواداری، علم پروری اردو زبان و ادب سے قلبی لگاؤ اور مخصوص لب و لہجہ بھوپال کی پہچان کے خاص وسیلے ہیں۔

بھوپال میں اردو شعر و ادب کا آغاز اٹھارھویں صدی کی پہلی دہائی میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ابھی خود دلّی میں فارسی کا بول بالا تھا اور وہاں اردو شاعری محض تفنن طبع کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔

ادبیات بھوپال کے پہلے محقق ڈاکٹر سلیم حامد رضوی بھوپال میں اردو کے آغاز و ارتقا کا

جائزہ لیتے ہوئے اپنی معروف کتاب ''اردو ادب کی تاریخ میں بھوپال کا حصہ'' میں رقم طراز ہیں:

''یہ سمجھنا کہ بھوپال میں اردو ادب کا آغاز ریاست بن جانے کے بعد حکومت کی سرپرستی کی بدولت ہوا درست نہیں ہے۔ عام بول چال کی زبان بعض مخصوص رجحانات اور تقاضوں کی بدولت خود بخود ادب کے زینے طے کرنے لگتی ہے یہاں بھی انھیں تقاضوں کی بدولت سترہویں صدی کے نصف آخر میں ہی اردو نے ادبی منزلیں طے کرنا شروع کر دی تھیں۔ نظم کے جو قدیم نمونے مجھے ملے ہیں انھیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان علاقوں میں یہ مخلوط زبان دہلی سے تقریباً پچاس سال قبل اپنے مخصوص معاملات کے لحاظ سے شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھ چکی تھی۔ دہلی میں اردو میں شعر کہنے کا رجحان اگرچہ محمد شاہ کے عہد میں بھی پیدا ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ آغاز اٹھارھویں صدی کے ربع اول کے خاتمے پر ہوا بلکہ عام خیال کے مطابق یہ کہنا بھی درست ہے کہ اپنی عام بول چال کی زبان کی ادبیت اور شعری صلاحیتوں کا اندازہ اہل دہلی کو اس وقت ہوا جب ولی اورنگ آبادی نے 1700 کے لگ بھگ دہلی آ کر اپنا کلام سنایا جو دکنی اردو میں تھا لیکن ولی کا کلام سن کر بھی شعرائے فارسی نے عام طور پر اردو میں شعر گوئی کی طرف باقاعدہ توجہ نہیں کی۔ 1722 میں جب ولی دکنی کا دیوان دلّی آیا تب وہاں اردو شاعری کی طرف توجہ کی گئی اس طرح دلّی میں اردو شاعری کا آغاز 1722 کے بعد ہوا جبکہ ریاست بھوپال کے علاقوں میں ہم کو اردو شاعری کے وہ نمونے اٹھارہویں صدی کے ابتدائی حصے میں ہی مل جاتے ہیں جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ تقریباً نصف صدی کے ارتقا کا نتیجہ ہیں اور یہاں کی شاعری ولی اورنگ آبادی کی تحریک شعری کی مرہونِ منت نہیں ہے بلکہ مقامی حالات اور تقاضوں کا نتیجہ ہیں۔''

تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ دہلی کی شاعری پر فارسی کے غلبے کی وجہ سے اہل دہلی اردو زبان کو شاعری کے قابل نہیں سمجھتے تھے جبکہ دکن، گجرات اور ہندستان کے بعض دوسرے صوبوں میں جن میں بھوپال بھی شامل ہے اردو شاعری کا آغاز ہو چکا تھا، ڈاکٹر مسعود حسین خاں

''اردو زبان وادب'' میں لکھتے ہیں:

> ''سیاسی مرکز سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خسرو کی زبان دہلوی نے گجرات، دکن اور ہندستان کے دوسرے صوبوں میں ادبی حیثیت اختیار کرلی تھی البتہ خود دہلی میں فارسیت کے غلبے کی وجہ سے اسے ادبی حیثیت اختیار کرنے اور فارسی کی جگہ لینے میں دیر لگی۔''

بھوپال میں اردو شاعری کا اوّلین دور جو اٹھارہویں صدی کی پہلی دہائی سے شروع ہوتا ہے اس میں بیرسیہ کے قاضی محمد صالح امیٹھوی کی مثنوی ''اخلاق حسنہ'' کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ یہ مثنوی زائد از تین سو سال قبل یعنی 1707 میں تخلیق ہوئی اور لطف یہ ہے کہ اتنی قدیم ہونے کے باوجود اس کی زبان حیرت انگیز طور پر صاف وسادہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہے دھوکا یہ دنیا کا سب کاروبار	نہیں اس میں کچھ بھی ثبات وقرار
ہے کچھ آج اور کل تماشا ہے کچھ	کہوں کیا کہ اس کا سراپا ہے کچھ
طریقہ عجب اس کا دیکھا یہاں	کہ اس میں گرفتار ہے گا جہاں
نہ آسودہ اس میں ہوا ہے کوئی	گرفتار خواری رہا ہے کوئی

اس دور کے دوسرے شعرا میں مفتی خیراللہ صدیقی، سید اصغر علی اصغر، شیخ امان اللہ حسینی، سید مقصود عالم دیدار، عنایت اللہ نادان، مولوی نظام الدین، شیخ رحمت علی مجرم، امیر علی امیر گوالیاری اور بدیع الدین خورد وغیرہ شامل ہیں۔ اس دور میں غزلوں سے زیادہ مثنویاں لکھی گئیں جو اعلیٰ فنکاری کا نمونہ ہیں اور جن کے توسط سے اٹھارہویں صدی میں بھوپال کی ادبی ترقی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس کے بعد نواب قدسیہ بیگم، نواب جہانگیر محمد خاں اور نواب سکندر جہاں کا عہد آتا ہے اس عہد کے مزاج میں رنگارنگی اور تنوع ہے جس کے تحت تصوف، تعشق اور سوز وگداز کے ساتھ ساتھ معاملہ بندی اور چٹخارے کی زبان کا لطف بھی موجود ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نواب جہانگیر محمد خاں جو ریاست بھوپال کے آٹھویں فرماں روا اور نواب سکندر بیگم کے شوہر تھے خود بھی شاعر تھے دولہ تخلص تھا اور لکھنوی انداز میں شعر کہتے تھے اس دور کے شعرا میں شیخ عبدالواحد خاں مسکین تلمیذ جرأت، شاہ رؤف احمد رافت، قدرت اللہ قدرت بناری، منشی غلام ضامن کرم، منشی جگل کشور سیراب،

سید یوسف علی یوسف، منشی عبدالعلی تو نگر، شاہ فرید الدین، سید مولوی امداد علی امداد خیر آبادی، مولوی یمین الدین احمد، حکیم اخگر علی اخگر فرخ آبادی اور عبدالحمید خاں عاجز کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ریاست بھوپال کی ادبی سرگرمیوں کا اگلا دور نواب شاہ جہاں بیگم کا زمانہ ہے علیا حضرت خود بھی شعر کہتی تھیں، شیریں اور تاجور تخلص تھے۔ ان کے ذوق شعری کے بارے میں مولانا سید امجد علی اشہری تقریظ "خمخانہ جاوید" میں رقم طراز ہیں:

"حضور ممدوحہ کی بدولت نہ صرف بھوپال میں شعر و شاعری کا چرچا عام ہوا بلکہ محل خاص پر اکثر مشاعرے کی محفلیں منعقد کرتی تھیں جن کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں شرفا کی بیویاں شریک ہوا کرتی تھیں۔ ان میں بعض اعلیٰ درجے کی شاعرات تھیں۔ بھوپال کی عورتوں میں شعر و شاعری کی اشاعت حضور ممدوحہ کی بدولت عام ہوئی۔"

نواب شاہجہاں بیگم کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں "دیوان شیریں" اور "تاج الکلام" ایک طویل مثنوی "صدق البیان" بھی مطبوعہ ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

پاس بیٹھے ہیں عدو دور کھڑے ہیں عاشق
یہی شاید تری محفل کا قرینہ ہوگا

واہ واہ کیا ہی نیا یہ آپ کا چالا ہوا
دل ہمارا لے لیا اک عمر کا پالا ہوا

علیہ حضرت کے ذوق شعری سے حوصلہ پا کر اس عہد کی جن خواتین نے شعر گوئی میں حصہ لیا ان میں ایک اہم نام حسن آرا بیگم تمکین کا ہے جو نواب یار محمد شوکت کی اہلیہ تھیں اور مکہ والی بی بی کے نام سے مشہور تھیں۔ دیگر شاعرات میں منور جہاں بیگم مسرت کلثوم بی بی ممتاز، سکندر بیگم ضیا، سلطان جہاں بیگم حیا اور آمنہ بیگم کے نام خاص ہیں۔

نواب شاہجہاں بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن خاں عربی اور فارسی کے تبحر عالم اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کیا کرتے تھے توفیق تخلص تھا۔ شاعری تو روایتی انداز کی ہے مگر عالمانہ شان اور قدرت زبان و بیان کا پتہ دیتی ہے۔ دو شعر پیش ہیں:

فلک کی خیر ہو یارب کہ اس ستم گر نے — نگاہ گرم سے پھر سوئے آسماں دیکھا

لیا ہے رعد نے انداز میرے نالے کا — اڑائی برق نے آہ شرر فشاں کی طرح

ان کا دیوان ''گل رعنا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ان کے علاوہ اس دور میں صابر علی صبا سہوانی شاگرد غالب منشی ارشاد احمد میکش ایک اور شاگرد غالب خان محمد شہیر، بھوپال میں شاعر گر کے نام سے شہرت پانے والے مولوی محمد احسن بلگرامی سید امجد علی اشہری، سلیم سندیلوی، نواب صدیق حسن خاں کے بڑے صاحبزادے سید نور الحسن خاں کلیم اور چھوٹے بیٹے سید علی حسن خاں سلیم، ذوق کے شاگرد صفدر علی ہاشمی، تاریخ گوئی کے ماہر فدا علی فارغ مرادآبادی جیسے اہم نام شامل ہیں۔ یہ وہ حضرات تھے جو دربار سے وابستہ رہے اور جو دربار سے وابستہ نہیں تھے ان میں نیاز خیرآبادی، قمر سندیلوی، بزم اکبرآبادی، امیر مینائی کے شاگرد عبدالکریم خاں برہم، غالب کے شاگرد جوہر شاہجہاں پوری غالب کے ایک اور مشہور شاگرد نواب یار محمد خاں شوکت، محمد عباس رفعت شیروانی راسخ رام پوری جیسے اساتذۂ فن بھی موجود تھے۔ سراج میر خاں سحر کا نام نامی بھی اسی عہد کے شعرا میں شامل ہے، جن کی ایک غزل نے دنیائے شعر و ادب میں دھوم مچادی تھی آج بھی اہل اللہ کی مجالس ہوں یا عشاق کی محافل یہ غزل ہر دل کی صدا بنتی ہے:

سینے میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق

پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

اس دور میں قصیدہ گوئی کا بھی بول بالا رہا، مولوی حکیم سید اعظم حسین سلیم سندیلوی نے اچھے قصیدے لکھے۔ قصیدے کے علاوہ وہ مزاح کا شوق بھی رکھتے تھے اور اس رنگ میں اکبرآبادی کا تتبع کرتے تھے۔

عہد شاہجہانی کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم کا دور آتا ہے اس عہد کے شعر و ادب پر مغربی اثرات رونما ہونا شروع ہوتے ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم روشن خیال اور سرسید کی ہم نوا تھیں انھوں نے ادب کو زندگی سے قریب کرنے کی کوششوں کا خیر مقدم کیا۔ بیگم صاحبہ کے اصلاحی مزاج سے حوصلہ پا کر بھوپال میں شعر و ادب کی روش یکسر تبدیل ہوگئی۔ اب شاعری میں تصنع اور تکلف کی جگہ سادگی اور حقیقت بیانی کا رجحان تقویت پانے لگا اور وصل و ہجر کی جگہ فلسفیانہ خیالات

کوفروغ حاصل ہوا۔ اس دور کے شعرا میں عیش بھوپالی، انور بھوپالی، عبدالواسع صفا، عبدالشکور اخلاص، نکہت سہسوانی، سید محمد میاں شہید، ذکی وارثی، پیرزادہ محمد اسمٰعیل رخشاں، قدسی بھوپالی، سید حامد حسین ترمذی، نیر بھوپالی، صفدر مرزاپوری، شریف محمد خاں فکری، عبدالجلیل مائل نقوی جیسے شاعر موجود تھے۔ اس دور میں اصلاحی رجحانات کوفروغ دینے والوں میں کچھ نئے تعلیم یافتہ اور علم دوست شعرا بھی شامل تھے۔ سید محمد یوسف قیصر، رشید احمد ارشد تھانوی، علامہ محمد حسین محوی صدیقی، مولوی محمد اسحاق ماہر، ذکاء صدیقی، سعیداللہ خاں بزمی، ''مطالب الغالب'' کے مصنف ممتاز احمد سہا مجددی، محمود اعظم فہمی بھوپالی، رمزی ترمذی، منشی لکھمی نرائن افسر، منشی جنگل کشور مہر، گوبند پرشاد آفتاب اسی قبیل کے بزرگ تھے۔ بھوپال میں نئی شاعری کوفروغ دینے اور نئے خیالات کو پھیلانے میں جن شعرا کا سب سے بڑا ہاتھ ہے ان میں سید محمد یوسف قیصر بھوپالی اور احمد علی شوق کے نام سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان دونوں بزرگوں میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ انھوں نے شہر غزل بھوپال میں غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لکھیں۔ نظم طباطبائی اور اسمٰعیل میرٹھی کے انداز میں انگریزی نظموں کے منظوم تراجم بھی کیے۔ بھوپال کے دو مشہور مزاحیہ شاعر قاضی فصیح الدین ققنس اور حاجی قمر علی خاں ڈھینڈس اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد نواب حمید اللہ خاں کا عہد شروع ہوتا ہے جس میں ہمارے نرالے طنز و مزاح نگار ملا رموزی جلوہ گر ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت ذکاوت اور ندرت بیان کے ذریعہ پوری اردو دنیا سے خراج تحسین وصول کیا اور چہار جانب بھوپال کا نام روشن کیا۔

بھوپال میں طنز و مزاح کی روایت نئی نہیں تھی ادبی تاریخ سے یہ بات تو ثابت ہے کہ یہاں اردو شعر و شاعری کا چلن ریاست کے قیام یعنی 1722 سے پہلے ہی عام ہو چکا تھا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ نوابین اور بیگمات بھوپال کی اردو دوستی اور ادب نوازی کے سبب اس کی ترقی کے امکانات روشن سے روشن تر ہوتے گئے۔ فرماں روایان بھوپال کی علم دوستی اور ادب پروری کے زیر سایہ اردو زبان و ادب کو پھلنے پھولنے کے بہترین مواقع میسر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ہندستان کے مختلف شہروں سے مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھنے والے ہر طبقے کے لوگ یہاں خود بھی آئے اور بلائے بھی گئے۔ دلی اور لکھنؤ کی محفلیں اجڑنے کے بعد ان مراکز اور ان کے اطراف و جوانب سے بہت سے ادیبوں،

شاعروں، عالموں اور فاضلوں نے بھوپال کا رخ کیا۔ آزادی سے قبل ایک دور ایسا بھی آیا کہ تقریباً ہر مسلم دانشور کسی نہ کسی حوالے سے بھوپال میں موجود ہوتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اقبال اور بھوپال کے رشتے سے بھی سب واقف ہیں، ان نابغۂ روزگار ہستیوں کے علاوہ شبلی، عبدالرزاق البرامکہ، ظہیر دہلوی، عبدالرحمٰن بجنوری، سر راس مسعود، اسلم جے راجپوری، سید سلیمان ندوی، مانی جائسی، نیاز فتح پوری، امیر مینائی وغیرہ کے نام بھی علم وادب کی دنیا میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور یہ تمام لوگ کسی نہ کسی طور پر بھوپال سے وابستہ رہے۔

وسط ہند میں واقع ہونے کی وجہ سے بھوپال کو یہ سہولت میسر تھی کہ شمالی ہند کے ساتھ ساتھ اس کا تعلق جنوبی ہند خصوصاً دکن کی مسلم ریاستوں سے بھی قائم رہا اور ان علاقوں کی تہذیب و ثقافت اور ادبی روایت سے بھوپال نے کسب فیض بھی کیا۔ بھوپال کے حکمراں ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ مذہبی ذہن رکھتے تھے۔ بھوپال کے فطری حسن نے اہالیانِ بھوپال کے مزاج میں زندہ دلی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور شگفتہ مزاجی کے جوہر پیدا کر دیے تھے۔ چنانچہ ہر عہد کے ادب میں اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ریاست بھوپال کے جن شعرا کے کلام میں طنز و مزاح کے اثرات ملتے ہیں ان میں قاضی فصیح الدین قُقْنُس اور حاجی قمر علی خاں ڈھینڈس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ مولوی حکیم سید اعظم حسین سلیم، قمر الدین قمر سندیلوی چھتر سال چھتر، عبدالعزیز خاں عزیز، حکیم سید معظم حسین خاں فیضی، حکیم احسن قادری احسن وغیرہ کے نام بھی اس فہرست میں شامل ہیں مگر طنز و مزاح کے حوالے سے بھوپال کو جن حضرات نے دنیائے ادب میں روشناس کرایا ان میں ملا رموزی اور تخلص بھوپالی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ تخلص بھوپالی نے غفور میاں اور پاندان والی خالہ جیسے کردار تخلیق کیے اور ان کے ذریعے بھوپالی تہذیب کو متعارف کرایا۔ انھوں نے بھوپال کی زبان اور لب و لہجے سے مزاح پیدا کیا۔ ان کے کردار نہایت جاندار، زندہ اور مکالمے حد درجہ برجستہ ہیں، خالہ اپنے دلچسپ تبصروں سے ہر موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں اور قاری کو ہنسنے ہنسانے اور غور وفکر کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ملا رموزی ایک بالکل نئی طرز کے موجد اور خاتم تھے۔ اپنی ''گلابی اردو'' کے وسیلے سے وہ ساری ادبی دنیا میں جانے اور مانے جاتے ہیں۔ ان کا انداز منفرد اور کینوس وسیع تر ہے۔ یوں تو انھوں نے اپنے عہد کے مقامی، غیر مقامی، علاقائی، غیر

علاقائی، ملکی، بین المملکتی، قومی، بین الاقوامی، تہذیبی، تمدنی، ادبی، سماجی، تعلیمی اور خانگی ہر موضوع کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا مگر ان کا اصلی ہدف سیاست اور مغربی تہذیب تھی۔ ان موضوعات پر ان کا قلم بے تکان چلتا ہے ان کے قلم کی دھار تیز ہے مگر انداز میں لطافت ہے اس لیے تکلیف کا احساس ذرا بعد میں ہوتا ہے۔ ان کے لطفِ زبان اور ندرتِ بیان میں ایسا جادو ہے کہ وہ سخت سے سخت بات کہہ گزرتے ہیں مگر قاری ہنستا رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی تحریروں میں ایسے غیر ملائم اور غیر فصیح الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں کہ کوئی دوسرا ایسا کرے تو اس کی گرفت کی جاسکتی ہے مگر ملاّ رموزی کا فن ان تمام الفاظ کو نہ صرف گوارہ بلکہ خوشگوار بنا دیتا ہے اور ایسی لطافت پیدا کر دیتا ہے کہ اپنے سیاق و سباق کے درمیان وہ الفاظ حسین تر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ خود ملاّ رموزی کو بھی اپنے طرزِ تحریر کی انفرادیت اور مقبولیت کا احساس تھا۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ طرزِ تحریر میرا سب سے پہلا طرزِ تحریر ہے جس کے ذریعے میں ملک میں روشناس ہوا ہوں اور میرے قدرداں بھائیوں اور بہنوں میں ایسے بے شمار بہن بھائی موجود ہیں جو میرے اس طرزِ تحریر کو پسند کرتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ ان کے طرزِ تحریر کو عوام و خواص سبھی نے پسند کیا ہے۔ مشہور طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب ''طنزیات و مضحکات'' میں ملاّ رموزی کی ظرافت اور تخیل کی بلند پروازی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''ملاّ صاحب کی تصنیفات بعض حیثیت سے بے مثل ہیں ان کو ایسی ایسی ظرافتیں بھی سوجھ جاتی ہیں جہاں بہ مشکل کسی کی رسائی ہوسکتی ہے جو نہایت درجہ دلکش اور پر لطف ہوتی ہیں اور جہاں تک ہر شخص کا پہنچنا قطعاً آسان نہیں۔''

پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''ملاّ رموزی میں ادبیت کی فراوانی اتنی زیادہ ہے کہ ایک بھی ہم عصر کو حاصل نہیں، دوسری چیز غور و فکر اور خیال کی پرواز اس درجہ بلند اور موزوں ہے کہ ان کی تحقیق اور فکر کا ہر نتیجہ حیرت انگیز اور مخاطب کو ششدر بنا دینے والا ہوا کرتا ہے۔ مثلاً گلابی اردو میں جب وہ خالص موضوعات پر لکھتے تھے تو ان کی بین الاقوامی معلومات اس درجہ مستند اور

بلند ہوتی تھیں کہ اردو کے پختہ کار اخبار نویسوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ سیاسیات میں جو معرکہ خیز نکتے ملا رموزی بیان کر جاتے ہیں دوسرے کے بس کی بات نہیں۔"

پروفیسر عبدالقادر سروری مزید لکھتے ہیں:

''ملا رموزی کی ہمیشہ باقی رہنے والی تحریروں میں بہت کم ایسی ملیں گی جن میں ظرافت صرف، ظرافت کی خاطر کا اصول مدِ نظر رکھا گیا ہو۔ ان کی کسی تحریر کا مقصد ہمارے مذموم رواجات کا استیصال ہے، کسی کے ذریعے ہماری حالت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہیں ایڈیسن کی طرح ہمارے معاشرتی عیوب بے نقاب کرتے ہیں جو باتیں مصلحین کی زبانوں پر بھی نہیں آتیں وہ ان کے زبان قلم سے بے تامل نکل پڑتی ہیں اور ان کی ادراکی وسعت کا تو جواب نہیں کہ جس مقام تک ہمارے واعظین اور لیڈروں کا گزر بھی نہیں یہ وہاں بے روک داخل ہو جاتے ہیں۔"

ملا رموزی کا نام محمد رشاد ہے۔ انھوں نے 21 مئی 1898 کو بھوپال کے ایک معزز متوسط خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ اولاً قرآن پاک حفظ کیا، اس کے بعد مدرسہ سلیمانیہ بھوپال میں ابتدائی تعلیم مکمل کی، پھر کانپور کی معروف درسگاہ دارالعلوم الٰہیات سے ''فاضل الٰہیات'' کی سند حاصل کی۔ ملا رموزی فطرتاً طباع، ذہین اور بذلہ سنج تھے۔ مطالعے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ چنانچہ انھوں نے علمی ادبی اور مذہبی کتب کے ساتھ معاصر اخبارات ورسائل کو بھی اپنے مطالعے میں شامل کیا جو ان کی معلومات میں اضافے کا سبب بنا۔ ان دنوں بھوپال میں اچھا علمی اور ادبی ماحول تھا جو ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوا۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا آزاد سبحانی اور علامہ محوی صدیقی جیسے مستند اہل قلم کی صحبتوں نے ان کے ادبی ذوق کی آبیاری کی۔

ملا رموزی نے اپنے ایک مزاحیہ مضمون ''ایک سفریہ'' میں عبدالحلیم صدیقی کا تعارف اپنے مخصوص انداز میں کرایا ہے:

''علامہ عبدالحلیم صدیقی نہ صرف ایک جادو بیان مقرر اور ایک تبحر عالم ہیں بلکہ وہ ملا رموزی کے وہی استاد ہیں جن کے فیض علم وفن نے آج ملا رموزی کو حضرت

ملا رموزی صاحب بنادیا ہے۔ ورنہ موصوف کی محنت وتوجہ سے پہلے یہی آج کل کے ملا رموزی صاحب تھے جو پہلوانوں کے دنگل دیکھتے پھرتے تھے اور کریما و مانقما بھی مشکل سے پڑھ سکتے تھے۔ پس اگر وہ علامہ عبدالحلیم صدیقی کے زیر سایہ نہ آجاتے تو آج کسی نہ کسی شہر میں غنڈا ایکٹ کے تحت دھرے ہوتے اور ضمانت دینے والے بھی نہ ملتے۔''

ملا رموزی محض طنزیہ اور مزاحیہ شاعر و ادیب ہی نہ تھے ایک سنجیدہ کالم نویس اور صاحب طرز انشاپرداز بھی تھے چنانچہ 1917 میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز کالم نویسی سے ہی ہوا تھا۔ انھوں نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت غلام ہندستان مختلف سیاسی، سماجی، معاشی مسائل اور اس کے نتیجے میں اخلاقی زوال میں مبتلا تھا۔ انگریزوں کے ظلم وستم نے غریب ہندستانیوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ انگریز حکمرانوں نے نہایت چالاکی اور چال بازی سے ہندستانیوں کے دلوں میں تفریق کے بیج بودیے اور ہندستان کی ریاستوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار کر دیا مگر عوام الناس کی اکثریت بلاتفریق مذہب وملت انگریزوں کے خلاف اپنے دلوں میں نفرت کا جذبہ رکھتی تھی ہر سچا ہندستانی ان غیر ملکی حکمرانوں سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کا خواہش مند تھا اسی مقصد کے تحت مختلف سیاسی اور سماجی تنظیموں نے صدائے احتجاج بلند کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس طرح ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہوگیا۔

ملا رموزی کو خدا نے قلم کی دولت عطا کی تھی وہ حساس اور غیرت مند انسان تھے۔ ان کا دل وطن کی محبت سے سرشار تھا چنانچہ ملک وقوم کی زبوں حالی، نکبت، بے بسی، بے حسی، بے کسی، تہذیبی اور مذہبی اقدار و روایات کی پامالی اور زوال پذیری ان کی برداشت سے باہر ہوگئی تو انھوں نے اصلاح قوم کی خاطر قلم اٹھایا اور پورے جوش وخروش اور جرأت مندی کے ساتھ حق کی آواز بلند کرنے لگے۔ قلم میں بڑی طاقت ہوتی ہے بعض وقت اس کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔ اگر جذبہ صادق اور نیت میں خلوص ہو تو فنکار کا قلم ملک وملت کے دلوں پر دستک دینے لگتا ہے اور جلد یا بدیر اس کی محنت مستجاب ہوکر رہتی ہے۔ ملا رموزی نے بھی اسی مقصد سے قلم ہاتھ میں لیا تھا۔ مگر انھوں نے اپنے اسلوب کو عام روش سے ہٹا کر شگفتگی کی

راہ پر لگا دیا تا کہ روتی بسورتی ہوئی مایوس قوم کے چہرے پر مردنی کی جگہ مسرت، خوشی اور خوش طبعی کی جھلک نظر آئے اور اس میں جینے اور ہنسنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

''میرا مقصد تحریر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ قوم میں زوال دغلامی، غیر قومی علوم اور غیر قومی تربیت سے جو افلاس انگیز اور موت آور ذہنیت پیدا ہوگئی ہے ملازمت کی لعنت اثر زندگی اور اولاد کی کثرت سے جو مالی تباہی پھیلی پڑی ہے اور اس سے جو بدمزاجی، خستگی اور دماغی پریشانی ہوئی ہے اس کا یہ مولویانہ اثر ملاحظہ ہو کہ ہندستانی لوگ اپنی تفریحی مجالس اور تفریحی تقاریب میں بھی اتنے گاڑھے اور موٹے واللہ چنانچہ بنے رہتے ہیں گویا کہ قہقہہ انھیں دس سال کی سزا دے دی جائے گی اگر وہ تفریحی محفل میں کہیں ہنس پڑے۔ پس چاہتا ہوں کہ رونے والی قوم میرے ذخیرہ تحریر سے زندہ دلی، خوش دماغی ہنسی اور خوشی طبعی کی امنگ اور مسرت اندوز زندگی کی بہاریں حاصل کرے اور منشی نولکشور کے مولویوں نے جتنی کتابیں قیامت اور دوزخ کے عذابوں سے ڈرانے اور رلانے کے لیے لکھی ہیں ان کے مقابل جنت کی بہاروں کا کوئی تحریری نمونہ بھی موجود رہے۔''

ملا رموزی کے جس طرز تحریر پر لوگ اتنے فدا تھے اور جسے خود ملا صاحب نے ''گلابی اردو'' کے نام سے موسوم کیا اور دعویٰ کیا کہ:

''ملا رموزی نے بھی ''گلابی اردو'' کے نام سے وہ طرز تحریر اختیار کیا کہ اچھے اچھے مر گئے مگر سمجھ نہ سکے کہ یہ کیا ہے۔''

بطور نمونہ یہاں ان کی ایک کتاب ''گلابی اردو'' سے چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔

اس کتاب میں ملا صاحب نے اپنا نام ابوالقدوس حافظ صدیق رشاد توحیدی لکھا ہے جیسا کہ وہ ابتدا میں لکھا کرتے تھے یہ کتاب نقیب پریس بدایوں سے طبع ہوئی تھی۔ سنہ اشاعت 1921 اور قیمت آٹھ آنے ہے۔ پہلا اقتباس بعنوان ''سبب تالیف کتاب'' ہے۔

''امابعد۔ اے وہ ہم ملا رموزی صاحب کہ نہیں لکھتے ہیں ہم سبب تالیف کتاب کا مگر موافق رسم قدیم مصنفوں ہمارے اور تاریک خیال علما ہمارے کے کہ صرف کیں

عمر میں تمام اپنی انھوں نے بیچ لکھنے حاشیوں کتابوں عربی کے مگر نہ سکے وہ یہ کہ لکھتے وہ کچھ اور تحفظ اور خلافت ایجی ٹیشن کے تاکہ ذریعے سے تحریروں اور کتابوں ان کی کے بیداری بیچ مسلمانوں ہند کے پیدا ہوتی بس البتہ تحقیق ایک دن موافق مادیت اپنی کہ ہمراہ دوست پرانے اپنے کے بیچ ملک عراق کے گئے ہم واسطے دیکھنے ان مقامات مقدس کے کہ فوجیں اتحادیوں کی رہتی ہیں بیچ ان کے اور فروخت ہوتی ہے۔ بیچ ان کے شراب ناگاہ بیچ نظر کے پڑے آنریبل وزیر حسن کہ گئے ہیں وہ بیچ مقامات مقدس کے واسطے کرنے ملازمت انگریزوں کی کے بس قسم ہے چودہ اصولوں پریزیڈنٹ ولسن کی کہ جب برابر ہمارے آئے وہ تو جھڑکا ہم نے ان کو اس طرح کہ اے وہ تم آنریبل وزیر حسن شاگرد شریر ہمارے کہو کہ کیونکر ترک کی تم نے ملازمت آل انڈیا مسلم لیگ کی شاید کہ ناراض ہوئے تم اس سے کہ مخالفت کی عدم تعاون کی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے سبب سے لالچ ملازمت حیدرآباد کے پنشن کردے اللہ ان کی اور مولوی عبداللہ عمادی کی یا گھبرا گئے تم گرفتاریوں سے علمائے دین اسلام کے بیچ ملک ہندستان کے کیونکہ حکیم لقمان نے بیچ کتاب ''پریس ایکٹ'' کے لکھا ہے کہ نہیں گرفتار اور ذلیل ہورہے ہیں علمائے دین اسلام کے مگر ہاتھوں سے ان مسلمانوں کے کہ ملازم ہیں وہ بیچ محکموں خفیہ پولیس اور آبکاری اور سائر کے طاعون پھیلادے اللہ بیچ خاندانوں ان کے کے اور بیچ فوجوں یونان کے یا خفا ہوئے تم ان اخباروں اردو سے کہ مخالفت کی انھوں نے تحریک ترک موالات کی مثل اخبار وطن لاہور اور آزاد کانپور کے۔''

دوسرا اقتباس:

شاہ نادر خاں صاحب کا حادثہ:

''اے عجب وہ گھڑی کہ سنی ہم نے اور بیوی بچوں ہمارے نے خبر حادثہ شاہ نادر خاں صاحب کی مگر یہ کہ اوپر فقط ساعت اس خبر ہذا کے پھر سوال کیا اور کانپے ہم، اے لرزے ہم، خوف سے خدا حکمت والے کے، پھر سوال کیا ہم سے بیوی عرف زوجہ

ہماری نے، یہ کہ کیا ہوا اے شوہر میرے، کہ شہادت پائی بادشاہ افغانستان نے اور گواہی دی ہم نے سامنے زوجہ اپنی کے، اوپر اس بات کے، کہ تحقیق اللہ قادر ہے اوپر ہر بات کے۔''

تیسرا اقتباس:

''اے سینما میں جھانکنے والو!

نہ چاہیے اور البتہ نہ چاہیے تم کو، یہ کہ جھانکو تم، بیچ سینما کے، طرف پردہ نشین عورتوں کے کہ تحقیق ہیں وہ عزت تمھاری، اگر چہ بہ سبب جہالت سخت کے، غافل ہیں مسلمان ترقی اور تعلیم اپنی سے، مگر نہ دیکھا تم نے بیچ زمانہ جنگ کے، کہ کام آئیں عورتیں بیچ لڑائی چین و جاپان کے، موافق حق کام آنے اپنے کے۔''

بھوپال کے تانگے والوں کا لب ولہجہ اور انداز گفتگو کی نقشہ کشی بھی ملاحظہ کیجیے:

اگر آپ نے سفر سے پہلے کرایہ طے نہیں کیا اور منزل پر پہنچ کر کچھ دینا چاہا تو تانگے والا بے عزت کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ اس کی زبان سے ''ایک سفریہ'' سے ماخوذ کچھ اس طرح کی باتیں سننے کو مل سکتی ہیں:

- ''میں نے تو آپ کو اشراف آدمی سمجھا تھا اس لیے سواری کے وقت کچھ نہ کہا۔''
- ''اس میں کیا ہوگا میں تو پورے دس آنے لوں گا۔''
- ''کیا؟ قرآن کی قسم ایک پیسہ کم نہ لوں گا۔''
- ''خدا پاک کی قسم صبح سے گھوڑا الگ بھوکا ہے اس پر یہ دس پیسے دے رہے ہیں''
- ''اچھا تو جب جیب میں دام نہیں تھے تو تانگے میں قدم کیوں رکھا آپ نے۔''
- ''میں سامان تو نہیں اتارنے دوں گا اب چاہے آپ میرا تانگہ ہی بند کرا دینا اور کیا تو۔''
- ''اچھا تو آپ بیچ میں بول رہے ہو تو آپ ہی رکھ دیجیے دس آنے میرے اور کیا تو۔''
- ''بس منہ چلانا آتا ہے آپ کو جیب میں دام بھی نہیں اتنے۔''
- ''جی ہاں۔ دام کے دام کھا جایئے اور ہم ہی گدھے بدتمیز ہیں آپ تو بڑے کہیں کے...... تمیز دار آدمی ہیں۔''

○ ''جی ہاں سرکار بھی آپ ہی کی ہے بس تو پھر ہمارے بچوں کو سولی پر چڑھا دیجیے۔ ارے ہاں تو۔''

ملا رموزی فطری طنز و مزاح نگار تھے انھوں نے اس میدان میں جو کمالات دکھائے تب اردو کی مزاحیہ ادبی تاریخ میں کسی ایک شخص کی تحریروں میں کہیں نظر نہیں آتے انھوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔'' گلابی اردو'' کے تو خیر وہ موجد ہی تھے اور اس فن میں کوئی ان کا حریف تو کیا مقلد و پیروکار بھی نہ بن سکا، اس کے علاوہ وہ ایک سنجیدہ مضمون نگار، دلچسپ خاکہ نگار، شگفتہ کالم نویس، شاعر اور سادہ، سلیس اور بامحاورہ نثر کے بھی بہترین طنز و مزاح نگار اور اسی کے ساتھ مقرر، مفکر، محقق، مدبر، فلسفی اور سیاسی مبصر بھی تھے۔ قومی اور بین الاقوامی سیاست کے مسائل نیز مذہبی سماجی اور تہذیبی امور پر ان کے تبصرے جرأتمندانہ اور بے باکانہ ہوتے ہیں۔ مختلف اخباروں کے مدیران کے نام ان کے خطوط بھی خاصے کی چیز ہیں۔ مگر ان کی تمام شہرت'' گلابی اردو'' کے دائرے میں سمٹ کر رہ گئی اور آہستہ آہستہ اس کا اثر بھی زائل ہوتا گیا۔ حالانکہ ان کے دوسرے مضامین بھی کچھ کم نہ تھے مگر ان کے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی۔ انھوں نے نکات، لقمے، تھرڈ کلاس اور زنانہ کے عنوانات سے جو معرکۃ الآرا کالم اور مضامین قلم بند کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اخوۃ (لکھنؤ) حقیقت (لکھنؤ) خلافت (بمبئی) البرید (کانپور) مدینہ (بجنور)، الجمعیۃ (دہلی)، قوم (دہلی)، اور زمیندار (لاہور) جیسے اہم اخبارات میں ان کے مضامین اہتمام سے شائع ہوتے تھے اسی طرح ملاپ، تیج، ویر بھارت، بھیشم اور پارس کے صفحات بھی گلابی اردو سے مزین نظر آتے ہیں۔

ملا رموزی میں خاص بات یہ تھی کہ وہ بیک وقت کئی اسالیب پر قادر تھے ان کے مکالمے حد درجہ برجستہ اور کرداروں کی فطرت کے عین مطابق ہوتے ہیں جس طرح آپ نے بھوپال کے تانگے والے کے مکالموں کا انداز دیکھا ہے۔ اسی طرح مولوی صاحبان کے کردار، تصنع، تکبر، تفکر اور خالی پن کا خاکہ اس طرح اڑایا گیا ہے کہ ان کی مصنوعی شخصیت اور اداکاری کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ موقع یہ ہے کہ ملا رموزی کہیں تقریر کے لیے مدعو کیے گئے ہیں اور دوران سفر اپنے ذہن میں تقریر کے داؤ پیچ مرتب کر رہے ہیں۔ اس تقریر کی پلاننگ ملاحظہ کیجیے اور

طنز بلیغ کی داد دیجیے۔ لکھتے ہیں:

- اس مرتبہ تقریر سے پہلے وہاں کے لوگوں سے بہت زیادہ اور مصنوعی طور پر پھول کر بات کروں گا۔ اس سے یہ ہوگا کہ وہاں کے باشندے تقریر سے پہلے ہی آدھے کے قریب مجھ سے دب جائیں گے۔
- جاتے ہی وہاں کے لوگوں سے اتنے موٹے موٹے اور گاڑھے عربی الفاظ بولوں گا جس سے وہ سہم جائیں گے کہ بلا کے ذی علم مولوی صاحب آئے ہیں۔
- جاتے ہی کہوں گا کہ میں آج کل پرہیزی کھانا کھاتا ہوں جب لوگ کہیں گے فرمائیے فرمائیے وہ بھی تیار ہوسکتا ہے تو ایک آدھ عمدہ قسم کی غذا تیار کراؤں گا۔
- مذہبی مسائل پر گفتگو کرتا رہوں گا جس سے میری مذہبی معلومات کا رعب طاری ہوجائے۔
- بہت کم مسکراؤں گا اور ہنسی کو بالکل ہی چھپاتا رہوں گا۔
- بے وقت تازہ پھل کھانے کا عادی ظاہر کروں گا۔
- تحفے اور ہدیے دینے کا ثواب بتاتا رہوں گا۔
- تقریر سے پہلے کھانسی سے کام لوں گا اور پھر ادھر اُدھر دیکھوں گا پھر مسلسل سفر اور مسلسل تقریروں سے تھکن ظاہر کروں گا پھر پینے کو پانی طلب کروں گا۔ پھر مجمع سے درود شریف پڑھواؤں گا پھر کہیں تقریر شروع کروں گا۔ پھر تقریر یوں کروں گا کہ اصل معاملے پر دو چار جملے بول کر خلاف عقل و یقین حکایات قصے اور بے بنیاد روایات سے لوگوں کو رلانے کی کوشش کروں گا اگر وہ نہ روئیں گے تو خود رونے لگوں گا اور درود شریف پڑھواتے ہوئے اپنے لیے پانی پھر چائے طلب کروں گا۔
- جب مجمع رونے لگے تو یہ بھی ترکیب سے کہہ دوں گا کہ اگر کوئی اور صاحب میرے وعظ کا بندوبست کرا سکیں تو دو دن اور قیام کروں گا۔

ملّا رموزی اپنی تحریر میں لفظی اور معنوی تضادات سے نہایت دلچسپ اور گہرے معنی پیدا کرنے میں طاق ہیں باتیں کرتے کرتے نہایت سادگی کے ساتھ اچانک ایسا برجستہ جملہ چسپاں کردیتے ہیں کہ بس سوچتے ہی رہ جایئے تمثیل، تشبیہہ اور استعارے اپنی الگ بہار دکھاتے

ہیں۔ جیسے یہ اقتباس:

''جامعہ الٰہیہ کانپور میں ہمارے وطن کے ایک بزرگ بھی آباد تھے خود کو ہمارا استاد کہتے تھے بھاگے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ملا صاحب خبر ہے کہ وطن عزیز میں طاعون کا دورہ شروع ہوگیا ہے طبیعت کو کسی طرح چین نہیں۔ ہم نے ادب سے فرمایا کہ اگر وطن میں طاعون آجانے سے آپ ایسے ہی پریشان ہیں تو چلیے کچھ دن کے لیے وطن ہو آئیں وہاں عزیزوں اور احباب کے جنازوں میں شرکت سے کسی قدر طبیعت بہل جائے گی اور روزانہ بڑے قبرستان تک بھی چہل قدمی ہو جائے گی۔ اس فقرے کو سن کر اور تو کچھ نہیں مولوی صاحب قبلہ ہمارے پاس سے عربی کی وہ دعا پڑھتے ہوئے چلے گئے جسے جماہی آتے وقت مسلمان منہ پر ہاتھ رکھ کر پڑھتے ہیں۔''

ملا رموزی کی نثر خصوصاً ''گلابی اردو'' سے محظوظ ہونے کے لیے ان کے قاری کا وسیع المطالعہ ہونا ضروری ہے ورنہ ان کی تحریر سے لطف اندوز ہونا تو کجا سمجھ ہی میں آنا مشکل ہوگا۔ انھوں نے عربی اصطلاحات کے استعمال اور صنائع بدائع کے پیرائے میں ایسے ایسے سیاسی، سماجی اور دقیق فلسفیانہ نکات بیان کیے ہیں کہ قاری پر حیرت وانبساط کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان کی نکتہ رسی، نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی قابل رشک ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے جس میں ملا صاحب ان قلیوں سے مخاطب ہیں جو انگریزوں کو سلام کرتے ہیں اور ہندستانیوں سے جھگڑتے ہیں:

''امابعد اے محترم قلی مزدورو!

البتہ تحقیق گواہی دیتے ہیں ہم اوپر اس بات کے کہ اگر چہ مزدوری کرتے ہو تم اور بستر سوار کرتے ہو اوپر ریل کے۔ وقت آنے اور جانے ریل کے مسافروں انگریز اور مسافروں ہندستان کے مگر وقت لینے مزدوری کے سلام کرتے ہو تم انگریز مسافروں کو ٹیڑھے ہو کر۔ اے جھک جھک کر مگر قسم ہے تمہا کو فروشوں ہند کی کہ لڑائی لڑتے ہو تم ساتھ ہندستانی مسافروں کے اور جھگڑتے ہو تم اوپر مزدوری کے ساتھ مسافروں غریب اور افلاس کے مارے ہوئے ہندستانی کے اور جو کم دے مزدوری کوئی مسافر ہندستان کا تم کو بستر اس کا اوپر فرش زمین پلیٹ فارم اسٹیشن کے پھینک دیتے ہو تم اور

ڈانٹ دیتے ہو تم اس غریب مسافر کو یا پھر چھوڑ دیتے ہو اوپر پلیٹ فارم کے لوٹا اس کا یا مبلغ ایک صندوق اس کا یا انکار سخت کرتے ہو تم اٹھانے سے بستر کسی غریب مسافر ہندستانی کے۔ پس تحقیق سبب سے ایسی زیادتیوں تمھاری کے غالب لایا ہے اللہ انصاف کرنے والا اوپر تمھارے انگریزوں کو۔"

گلابی اردو کا یہ منفرد اسلوب ملا صاحب نے اس وقت اختیار کیا تھا جب سادہ تحریر میں کڑوی بات کہنا قانوناً دوبھر ہو گیا تھا۔ 1917 میں جب ملا رموزی نے لکھنا شروع کیا ہندستان نازک دور سے گزر رہا تھا۔ انگریزوں کے ظلم و استبداد نے ہندستانیوں کا جینا مشکل کر رکھا تھا آزادانہ اظہار پر پابندی عائد تھی۔ اسی دوران جرمنی کے حملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور پابندیاں مزید سخت ہو گئیں پریس ایکٹ کے نفاذ نے صحافیوں کے قلم کو قانونی شکنجوں میں کس کر بے اثر کرنے کی کوشش کی۔ صحافیوں پر گہری نظر رکھی جانے لگی حکومتیں جانتی ہیں کہ قلم کی دھار تلوار سے زیادہ تیز ہوتی ہے، اس لیے اس کی دھار کو کند کرنے کے تمام سامان کیے گئے۔ ملا رموزی چونکہ ایک آزاد خیال صحافی تھے اپنی بات آزادی کے ساتھ کہنا چاہتے تھے۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ کم از کم حکومت وقت کی بے اعتدالیوں، ستم شعاریوں اور فریب کاریوں کے بارے میں وہ اپنی بات سنجیدہ پیرائے میں کھل کر نہیں کہہ سکتے تو انھوں نے طنز و مزاح کا سہارا لیا اور اپنی تحریر کو ظرافت کا رنگ دے کر دل کی بھڑاس نکالی۔ طبیعت میں جودت اور جدت تھی اس لیے اس میدان میں بھی عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے کا اہتمام کیا اور ایک بالکل نئی راہ ڈھونڈ نکالی اور اس طرح اپنی "گلابی اردو" کی بنیاد ڈالی۔ گلابی اردو دراصل طرز قدیم میں عربی زبان کی قدیم کتب خصوصاً آسمانی صحیفوں کے لفظی اردو ترجموں کی پیروڈی ہے۔ یہ ترجمے اس قدر پیچیدہ اور گنجلک ہوتے تھے کہ نہ صرف ان کا سمجھنا آسان نہ تھا بلکہ اسلوب بھی مضحکہ خیز ہو جاتا تھا حالانکہ ان مترجمین کی بھی اپنی مجبوریاں تھیں ابتدا میں قرآن حکیم کے ترجموں کی بھی سخت مخالفت ہوئی لیکن ہندستان کے مجتہد اعظم حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے اجتہاد کر کے اولاً فارسی پھر اردو میں اس کام کا آغاز کر ہی دیا۔ چونکہ عربی اور اردو قواعد میں بڑا فرق ہے۔ صیغے تک یکساں نہیں۔ اس لیے بامحاورہ ترجمے میں معنی و مفہوم کے تبدیل ہو جانے کا اندیشہ رہا ہوگا۔ اس وقت اردو نثر نے بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ ہر طرح کے بیان پر قادر

ہو سکے۔ چنانچہ بزرگوں نے لفظی تراجم ہی میں عافیت سمجھی اور کسی نہ کسی طرح عوامی زبان یعنی اردو میں قرآن حکیم کے معنی و مفاہیم کو اردو داں طبقے تک پہنچانے کی مخلصانہ کوشش کی۔ ملا رموزی کی جودت طبع نے اسی لفظی ترجمے میں عصری مسائل کے بیان کے ذریعے مزاح پیدا کر کے اپنی اردو کو زعفران زار بنادیا۔ ملا رموزی خود بھی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے اس لیے عربی مصطلحات تک انھیں رسائی حاصل تھی بلکہ ان پر دسترس بھی رکھتے تھے جو اس طرز جدید میں ان کے کام آئی۔ گلابی اردو میں البتہ، تحقیق، اے وہ، مگر، بیچ، شیطان راندا ہوا، پیچھے تمھارے، موافق، پس، نہیں سکتے ہو، اوپر سڑکوں ٹھنڈی کے، عجب کیا نہیں دیکھا تم نے، مخمل موتیوں کے ملیں تم کو بھی وغیرہ اسی قبیل کے الفاظ واصطلاحات ہیں۔ جملوں کی نحوی ترکیب اسم، ضمیر، فاعل، فعل اور مفعول کا فصل، حروف جار، اضافتیں، کا، کی، کے سب کچھ بدل کر جملوں کی ساخت میں مضحکہ خیزی پیدا کی گئی ہے اور یہ سب کچھ اس خوبی سے ہوا ہے کہ ہر بات کہنے کے باوجود کسی قانونی، سماجی اور اخلاقی گرفت سے بھی محفوظ رہے گویا سانپ بھی مرگیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔

ملا رموزی نے 1917 سے 1922 تک پورے جوش وخروش کے ساتھ طنز وظرافت کے پھول کھلائے۔ اس طرز خاص نے انھیں پورے ملک میں مقبول بنادیا۔ خاص و عام میں ان کی مقبولیت دیکھتے ہوئے ہر اردو اخبار ان سے مضمون کی فرمائش کرتا، ملا صاحب چونکہ پیشہ ور قلم کار تھے اس لیے معاوضہ بھی لیتے تھے جو اس وقت ایک روپیہ فی صفحہ تھا اخبارات ان کے مضامین انھیں کی شرائط پر وی پی سے حاصل کر کے شائع کرتے اس کے علاوہ ان کے قارئین بھی انھیں تحائف بھیجتے رہتے۔ ریاست بھوپال سے انھیں ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ریاست حیدرآباد کے اردو دوست وزیراعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد بھی ان کی تحریروں کے مداح تھے اور انھیں تحفے بھیجتے تھے۔ اس دور میں ملا رموزی جیسی مقبولیت کسی اور کو حاصل نہ تھی۔ ملا رموزی نے 1922 میں گلابی اردو چھوڑ کر سادہ تحریر لکھنا شروع کردیا۔ گلابی اردو ترک کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے نکات کے کالم میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اکثر احباب کو شکایت ہے کہ ہمارے مخصوص طرز تحریر ''گلابی اردو'' میں اب وہ پہلی سی شگفتگی باقی نہیں رہی ان کا یہ خیال بالکل صحیح ہے مگر ایسا قصداً کیا گیا وجہ یہ ہے کہ

گلابی اردو کی جان شگفتگی اصل میں وہ سیاسی تنقید و نکتہ چینی ہوا کرتی تھی جو اس وقت اس
کا حقیقی نصیب العین تھی مگر یہ نصب العین تابع تھا مسلمانانِ ہند کے اس عظیم الشان اور
متفقہ مقصد کا جو منصب خلافت کے حفظ و بقا کے لیے آٹھ کروڑ مسلمانان ہند نے طے
کیا تھا۔"

مگر یہ مقصد پورا نہ ہو سکا اور ترکی کی خلافت ختم ہوتے ہی ہندستان کی خلافت تحریک بھی دم توڑ گئی اور اسی کے ساتھ گلابی اردو کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

"گلابی اردو" کے بعد انھوں نے سادہ اور بامحاورہ زبان میں مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کیے اور ان میں بھی رنگین پھول کھلائے۔ مزاح کے علاوہ ان کے سنجیدہ مضامین بھی فکر انگیز ہیں۔ یہ مضامین ان کے مطالعے کی وسعت، مشاہدے کی باریکی سیاسی شعور کی پختگی اور فکر کی بلندی کا احساس دلاتے ہیں۔ نکات کے عنوانات سے انھوں نے جو مختصر تحریریں یادگار چھوڑی ہیں ان میں سیاسی سماجی، مذہبی، تہذیبی اور انسانی نفسیات سے تعلق رکھنے والے ایسے ایسے نکتے بیان کر دیے ہیں کہ ان کی فکر عالی اور تحریر مثالی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے جس میں اپنے عہد کے نئے اردو اخباروں کے مدیران کی ذہنی کج روی اور طرز عمل کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ کیا گیا ہے، لکھتے ہیں:

"1914 میں جنگ یورپ کی خبروں کی اشاعت سے مالی فائدے اٹھانے کے لیے
زبان اردو کے بے شمار اخبارات جاری ہوئے چونکہ ان نئے اخبارات کا مقصد پیسہ
کمانا تھا نہ کہ عوام کی اصلاح و فلاح اس لیے ان اخباروں میں اخباری اصول و ضوابط
کا کامل فقدان رہا مثلاً ایسے اخباروں کے ایڈیٹروں کا زیادہ حصہ نیم تعلیم یافتہ
نوجوانوں پر مشتمل تھا جو اصول رہنمائی سے خود بے خبر تھے اور اسی لیے ان کی اخبار
نویسی سے بجائے اصلاح کے عوام کا ذوق تباہ ہو گیا مگر اس نوجوان اخبار نویس
جماعت نے اس کمزوری کو عوام کے سر یہ کہہ کر تھوپ دیا کہ "عوامِ ہند بدمذاق ہیں"
حالانکہ عوام کی بدمذاقی کی اصلاح ہمیشہ اخبار نویس کے ذمے عائد ہوتی ہے۔"

اپنے عہد کے اخبار نویسوں کی اس طرح خبر لینا بڑی جرأت کی بات ہے اور ملا رموزی میں اس طرح کی اخلاقی جرأت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ایک اور جرأت مندانہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اخبارات اردو زیادہ تعداد میں چونکہ نااہل لوگوں کے ہاتھ میں رہے اور ان کی تحریر پر حکومت نے سوائے اپنی حکومتی مصالح کے کوئی اخلاقی احتساب و سزا عائد نہ کی اس لیے ان کی اخلاقی بے راہ روی کے مضر اثرات قوم کے ہر حصہ زندگی پر پڑے اور قوم کی اجتماعی زندگی کبھی ایک مرکز یا متحدہ مقصد کے تابع نہ ہوئی اور یہی وہ عظیم الشان خسارہ ہے جو اخبارات سے قوم کو پہنچا۔''

ملا رموزی باتوں باتوں میں اکثر پتے کی بات کہہ جاتے ایسی ہی کچھ اور پتے کی باتیں ملاحظہ کیجیے:

- ''جس ملک میں کثیر المقاصد انجمنیں بکثرت ہوں اس امر کی علامت ہے کہ اس ملک کے باشندوں میں وحدت خیال نہیں اور جن باشندوں میں وحدت خیال نہ ہو ان میں وحدت عمل نہیں اور جن لوگوں میں وحدت عمل نہ ہو ان کی قومی موت یقینی ہے۔''
- ''جو قوم کسی دوسری قوم کے اخلاق، تمدنی، معاشرتی اور فکری آثار و اثرات کو پسند کرتی ہو وہ اس کی غلامی کو باعث عار نہ سمجھے گی۔''
- ''جو شخص کسی ادنیٰ بے غیرتی کو پسند یا گوارہ کر سکتا ہے وہ وقت آنے پر بڑی سے بڑی بے حیائی کو بھی برداشت کر سکتا ہے۔''
- ''دوست کے معنی ہیں ایک فریب دینے والا انسان جو اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے ہمارے ساتھ ہے مگر ہم اپنی بے ذوقی سے اسے پہچانتے نہیں۔''
- ''جو شخص وقت کا پابند نہ ہو سمجھو یہ ہندستانی ہے اور جو شخص پچاس روپے ماہوار تنخواہ پر قابو سے باہر نظر آئے سمجھو یہ ہندستانی افسر ہے۔''

ملا رموزی نے رسالہ جامعہ (جامعہ ملیہ اسلامیہ) دہلی میں اپنا مضمون بعنوان ''رائے'' اشاعت کے لیے بھیجا اس کی تمہید دلچسپ اور معلوماتی ہے طرز تحریر میں وہی شگفتگی پائی جاتی ہے جو ان کے نیم مزاحیہ مضامین کی جان ہے۔ لکھتے ہیں:

''1927 کے انگریزی ماہ نومبر کی خدا جانے کس تاریخ کو حضرت قبلہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب ہمراہ برادر مکرم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے پی ایچ

ڈی پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی ایک بڑی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ یکا یک موصوف کی نظر
ہمارے اوپر آپڑی (یہ دور بیٹھنے والے پر جاپڑی کی ضد ہے)، (آپڑی) ہم نے فوراً
ادب سے سلام کیا تو اتفاقاً فرما کر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے فرمایا:
اجی یہ ہیں ملا رموزی
تو ذاکر صاحب بڑے تپاک سے اٹھے اور ہم سے مصافحہ فرمایا۔ (حالانکہ موقع
معانقہ کا تھا) اور یہ بھی فرمایا کہ میں تو جرمنی میں بھی آپ کے مضامین سے لطف اندوز
ہوا کرتا تھا آج آپ کی صورت بھی دیکھ لی۔''
ہم یہ سمجھے کہ اوہو اب تو ہمارے مضامین ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ''پیام مشرق'' اور مثنوی
وغیرہ سے بھی بڑھ گئے اور ان کی خوبی اور مقبولیت کا اب یہ عالم ہے کہ وہ جرمنی کی
زبان میں بھی ترجمہ ہونے لگے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے بیان سے یہ حسرت انگیز
تردید بھی ہوگئی کہ جرمنی میں مضامین پڑھنے سے قیام جرمنی مراد ہے نہ کہ زبان
جرمنی۔ ظاہر ہے کہ اس تردید سے ہمارے دل پر ایک ضرب شدید تو پڑی ہوگی مگر ہم
نے خود کو سنبھال کر رسالہ جامعہ کا تذکرہ شروع کر دیا اور ڈاکٹر صاحب کو اپنا یہ احسان
جتایا کہ ہم نے جامعہ کے علی گڑھی دور میں وہ مضامین لکھے ہیں جو اصطلاح میں
''معرکۃ الآرا'' کہلاتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''مگر اب تو آپ نے جامعہ کو
بھلا ہی دیا تو ہم نے بھی فی البدیہہ یہ عرض کیا، جامعہ تو اب بالکل ہی متین اور علمی
رسالہ ہوگیا ہے اور ہمیں متانت سے اتنی ہی وحشت ہوتی ہے جتنی ہندستانی پولیس کو
ہڑتالیوں سے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا آپ اپنے ہی رنگ میں لکھیے۔ اس لیے
بالفاظ اخبار ریاست دہلی ان اوپر کے حالات کی وجہ سے جامعہ میں یہ بدعتی مضمون
پیش کرتے ہیں خدا اسے قبلہ مولانا اسلم جیراجپوری کی نظر سے بچائے کہ کہا ہے: گر
قبول افتدز ہے عز و شرف۔''
ایک اور مضمون ''پیشاور تک مگر علی گڑھ تک'' کا یہ دلچسپ اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے:
''28 نومبر 1927 کو مفتی اعظم حضرت علامہ محمد مفتی کفایت اللہ جمعیۃ العلما ہند کا

گرامی نامہ ملا کہ جمعیۃ کے سالانہ اجلاس پیشاور کی شرکت کے لیے آپ کا نام پیشاور کی مجلس استقبالیہ کو بھیج دیا گیا ہے تیار رہو۔ ننھے میاں کی والدہ سے پیشاور تک سفر کا تذکرہ جو کیا تو انھوں نے جو طویل جوابات عطا فرمائے ان کے جملہ حقوق بحق راقم الحروف محفوظ رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ بستر باندھ دیا، کپڑے رکھ دیے، کھانا پکانے بیٹھ گئیں۔ صرف ہم سے خندہ پیشانی سے بات کرنا ترک کر دیا۔ ننھے میاں پر بات بات میں جھنجھلانے لگیں۔ برتن کو زمین پر رکھنے کی جگہ پٹک دیتی تھیں۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے تک تازہ پان بھی نہ کھایا۔ ہر بات میں آگ لگ جائے کا استعمال زیادہ ہونے لگا بس ان تیوروں سے ہم تاڑ گئے کہ یہ سب کچھ ہمارے سفر پر نہیں بلکہ سفر خرچ پر اظہار ناراضگی ہو رہا ہے اور چونکہ اس سے قبل بھی انھیں روپے پیسے کے معاملوں میں آزمائے ہوئے ہیں اس لیے آہستہ سے کھانستے ہوئے اٹھے اور اپنے علم پرور و معارف نواز کرم فرما حضرت رشدی سے کرایہ کو کہہ دیا۔"

ملا رموزی نے شاعری بھی کی ہے ان کی شاعری کے موضوعات میں نثری موضوعات جیسا تنوع تو نہیں ہے مگر اس میں ہندستان کی معاشی اور معاشرتی زندگی کے نقوش زیادہ گہرے اور تہذیبی صورت حال زیادہ توجہ طلب ہے۔ ملا صاحب کی تعلیم و تربیت مشرقی تہذیب میں ہوئی تھی۔ یہ تہذیب ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک دور اندیش اور تعلیم یافتہ انسان بھی ہیں چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی تہذیب و ثقافت کو مغرب کی تہذیب و معاشرت نگلنے کے درپے ہے تو انھیں سخت تکلیف ہوتی ہے وہ اس غیر ملکی تہذیب کو اپنے لیے ضرر رساں خیال کرتے ہیں۔ انھیں ہم وطنوں پر بھی غصہ آتا ہے جو آنکھیں بند کر کے مغرب پرست ہوئے جاتے ہیں اور اپنی تہذیبی اور معاشرتی اقدار و روایات کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ ملا رموزی نے طنز و مزاح کے پردے میں ان احساس کمتری کے ماروں کی خوب خبر لی ہے اس معاملے میں وہ پوری طرح اکبرالٰہ آبادی کے ہم خیال ہیں۔ اس قبیل کی نظموں میں "کوٹھیاں میرے نام کیجیے الاٹ" بدھو کی عید، رگیدے جائیں گے سب کالے نفع خوار ابھی، نرخ حد سے سوا جزاک اللہ، بے پردگی کے کام ہیں دشوار اب کہاں، خیال دیال، فتح مقامات وغیرہ جیسی نظموں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

''کوٹھیاں کیجیے میرے نام الاٹ'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان اشعار سے عہد رموزی میں ہندستانی معیشت کی صورت حال واضح ہوتی ہے۔

میرے افسانے کا لکھے جو پلاٹ　　یاد آئے گا اس کو خود اراراٹ
یاد کرتے ہیں گیہوں مکا کو　　روز رو رو کے میری چکی کے پاٹ
بیر بھی اس طرح نہیں ملتے　　جیسے ملتے تھے پہلے سیب و کاٹ
اب تو اللہ ہی درست کرے　　اصلی گھی کا بگڑ چکا ہے جوماٹ
بارہ آنے کے گھر میں کیا لکھوں　　کوٹھیاں کیجیے میرے نام الاٹ

اس نظم سے اشیائے خورد و نوش کی قلت اور مہنگائی کی شدت پر روشنی پڑتی ہے۔ ''بدھو کی عید بھی'' اسی انداز کی ہے اس میں بھی عام آدمی گرانی سے گراں بار ہے شعر دیکھیے:

بدھو یہ کہہ رہا تھا کہ کل میٹھی عید ہے　　بیوی یہ کہہ رہی تھی کہ گرانی شدید ہے
خرچے میں بیوی بچوں کے یہ خاص بات ہے　　ان کا نہ کوئی کھاتہ نہ کوئی رسید ہے
فرمائشوں سے بیوی کی مقروض ہوگیا　　رمضان بھر کا حاصل گفت و شنید ہے
کچھ شعر اس میں میرے ہیں کچھ میری بیوی کے　　یہ فیض خاص مالک ''عصر جدید'' ہے

مغربی تہذیب جو مغربی تعلیم کے زیر سایہ ہندستان میں آہستہ آہستہ رواج پذیر ہو رہی تھی مشرقی تہذیب کے دلدادگان اس کی درآمد سے بہت مفکر رہا کرتے تھے ان میں جو شاعر و ادیب تھے اور جنھیں ہندستان کے اقدار و روایات اور مذہبی اخلاق کے زیاں کا شدید احساس تھا وہ اپنی فکر مندی کا اظہار قلم کے ذریعہ کرتے تھے اور بعضوں نے اس راہ میں طنز کی روش اپنائی اور طنز کو خوشگوار بنانے کے لیے اس کی تلخی کو مزاح کی شیرینی میں لپیٹ کر پیش کیا اردو میں منشی سجاد حسین کا اخبار ''اودھ پنچ'' اس نظریے کا سب سے بڑا نقیب تھا۔ اس کے پاس لکھنے والوں کا ہجوم جمع ہوگیا تھا جن میں سب سے بڑا نام اکبرالہ آبادی کا ہے جو اردو شعرا میں طنز و مزاح نگاروں کے سرخیل ہیں ملا رموزی بھی چونکہ انھیں کے ہم خیال تھے اس لیے انھوں نے اکبری روش اختیار کی ان کی ایک نظم ''بے پردگی کے کام ہیں دشوار اب کہاں'' اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ نظم یہ ہے:

بے پردگی کے کام ہیں دشوار اب کہاں　　یورپ کی پی ہے جب تو ہیں ہشیار اب کہاں

تو بہ کے بعد پھر نہ کبھی توڑتے تھے عہد   بی اے کے عہد میں وہ گنہگار اب کہاں
سائنس سے قریب ہوئے اور خدا سے دور   ہم اس کی نعمتوں کے سزاوار اب کہاں
جب عشق بی اے پاس ہے اور حسن بی بی پاس   اک دوسرے کا کوئی وفادار اب کہاں
شعر زوال و شعر گدائی گلی گلی   اقبال کے جلال کے اشعار اب کہاں

ایک اور نظم "فلک کے پاس پہنچ کر بھی خدا سے ہے دور" کے چند شعر اور ملاحظہ کیجیے:

ملا تو ہے تجھے سائنس میں غضب کا شعور   فلک کے پاس پہنچ کر مگر خدا سے ہے دور
بنا چکا ہے تو راکٹ چڑھے گا چاند پہ تو   یہ حق ہے تجھے چاہے کرے تو جتنا غرور
کمال سب سہی لیکن سکون قلب بتا   قدم قدم پہ حوادث اور ان پہ فسق و فجور
سمجھ سکے تو بتاؤں کہ مادے سے تجھے   ملی تو عقل مگر مل سکا نہ عقل کا نور
یہ نور دیتے ہیں اس کو جو خود کو بندہ کہے   اسی کے حق میں حقائق کا علم اور ظہور
بلند تر ہے مقام خیال و فکر اس کا   یہ ہے وہ دل سے جو کہتا ہے ہاں خدا ہے ضرور
جو کہہ رہا ہے رموزی بہ طرز شعر و سخن   ہے اس میں اصل میں پوشیدہ قلب و جاں کا سرور

نظم "خیال ویال" بھی خوب ہے۔ ردیف میں جھنجھلاہٹ پیدا کی گئی ہے۔ کہتے ہیں:

کہاں کا شعر کہاں کا حسیں خیال وَیال   کہاں جدائی کا محبوب کی ملال وَلال
مجھے تو گیہوں کا غم کھائے جا رہا ہے ابھی   کہاں کا غمزۂ جانا نہ اور جمال وَمال
جوار اور وجی ٹیبل کے گھی کے کھانے سے   سسک رہا ہے مرے شعر کا کمال وَمال
اب اس پہ ٹیکس کی کثرت قوی غذاؤں کا قحط   وہ جائے بھاڑ میں اب ہر حسیں مقال وقال
اب ایسے حال میں جینے کی اک ہی حکمت ہے   رہوں نہ میں کبھی اک لحہ کو نڈھال وَڈھال

ملا صاحب کی شاعری کا دوسرا اہم موضوع وطن دوستی ہے انھیں اپنے وطن ہندستان سے محبت ہے۔ ان کا شمار متحدہ قومیت کے حامیوں میں ہوتا ہے۔ جس کے علمبرداروں میں گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ جیسے اولوالعزم قائدین شامل تھے۔ اسی لیے ملا صاحب ہمیشہ ہجرت کے خلاف رہے۔ انھوں نے یہ کبھی نہ چاہا کہ مسلمان اپنے وطن کو خیرباد کہیں۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ

مسلمانوں کو ہر حال میں یہیں رہنا چاہیے خواہ انھیں کتنی بھی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ شاید ان کی آنکھیں بھی وہی سب کچھ دیکھ رہی تھیں جس کی پیشن گوئی مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی اور بعد کے حالات نے جسے صد فیصد درست ثابت کر دیا۔ ایک نظم ملاحظہ کیجیے جس میں ملا رموزی نے بغیر کسی شاعرانہ تکلف کے راست بیانی کا انداز اختیار کیا ہے۔ عنوان ہے:

''للہ بھاگیے نہیں ہندستان سے''

للہ بھاگیے نہیں ہندستان سے — مارے بھی جائیں آپ اگر اپنی جان سے
ڈٹ ڈٹ کے رہیے آپ اب آن بان سے — ہندو کا ہند ہے تو ہے مسلم کا بھی یہ ہند
اک لاکھ میل دور ہے مسلم کی شان سے — جغرافیہ میں میں نے پڑھا ہے کہ بھاگنا
جاتے رہیں ہمارے بھی وہم و گمان سے — اتنا نہ بھاگتے ہی چلے جایئے کہ آپ
مر جائیں گے نہ جائیں گے ہندستان سے — ملا رموزیوں نے کہا ڈٹ کے آج شب

مسلسل غزل کی ہیئت میں یہ نو اشعار کی نظم ہے جس میں سے پانچ شعر بطور مثال اوپر نقل کیے گئے ہیں باقی اشعار بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

اسی قبیل کی ایک اور نظم جس میں اور زیادہ سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے قوم کو غیرت دلانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں لعن طعن سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ ہیئت وہی غزل کی ہے عنوان ہے ''بھگوڑے'' جو غیرت دار انسان کے لیے سخت ترین حربے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ نظم کے ہر شعر میں طنز کے کوڑے برستے رہتے ہیں۔ یہ نظم ہمیں احساس دلاتی ہے کہ ملا رموزی تقسیم ملک اور ملک سے ہجرت کرنے والوں کے کس قدر خلاف تھے۔ نظم ملاحظہ ہو:

اب کون ہے جو بھاگنے کی راہ سے موڑے — بے عقل ہر اک ملک میں ہوتے ہیں بھگوڑے
خطرات کی دہشت کے پڑا کرتے ہیں کوڑے — اعصاب کی کمزوری سے ان سب کے دلوں پر
پھرتے ہی رہا کرتے ہیں یہ دیس کو چھوڑے — ان کے لیے ہے خانہ بدوشی ہی مقدر
ہر بستی کے حق میں ہیں یہ بیماری کے پھوڑے — خود ڈرتے ہیں اور دل کو ڈرانے میں ہیں استاد
جس طرح بدک جائیں سڑک پر کبھی گھوڑے — اس طرح کی وحشت سے دھڑکتے ہیں یہ اکثر
جس سمت ملی گرم ادھر ہی کو یہ دوڑے — یہ روٹی کے بندے ہیں یہ عادت ہے انھیں کی

آتا نہیں ان کو کہ یہ اس طرح رہیں اب ملتے رہیں گھر بیٹھے انھیں پوری پکوڑے

رہ جائیں وطن ہی میں رموزی جو فلک سے

پڑ جائیں ذرا وزنی سے دوچار ہتھوڑے

اس غزل نما نظم میں مشکل قوافی کو بڑی خوبی اور برجستگی سے نبھایا گیا ہے مگر تلخی بھی کم نہیں ہے۔ ملا رموزی کی نثر میں بلیغ طنز اور لطیف ظرافت کے امتزاج سے ضیافتِ طبع کے لیے اصلاحِ نفس کا جو سامان کیا گیا ہے وہ ان کی شاعری میں نظر نہیں آتا اور اپنی شاعری میں وہ خود بھی اس کے دعوے دار نہیں۔ ان کی نثر اور شاعری میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ نثر خصوصاً گلابی اردو کی نثر سے لطف اندوز ہونے کے لیے علم وادب کا گہرا مطالعہ اور اعلیٰ ادبی ذوق درکار ہے۔ اس کے برعکس ان کی شاعری ہر مذاق کا آدمی سمجھ سکتا ہے اس کے لیے علم وادب سے واقفیت بھی شرط نہیں۔ فنی اعتبار سے بھی ان نظموں کو اعلیٰ معیاری نظموں میں شمار نہیں کیا جا سکتا مگر شاعر کا جذبہ صادق ہے اس لیے کوئی بھی شخص اس کے پیغام کے مقصد اور مقصد کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اس انداز کی نظموں میں ''للہ بھاگئے نہیں ہندستان سے''، ''دہلی سے کیوں فرار ہو دہلی کے دوستو''، ''جس شرط پر رکھے تجھے ہندستان رہ''، ''مرد اور وطن''، ''مسلمان کو کس نے مارا'' اور ''بھگوڑے''، جیسی نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ملا رموزی نے اصلاحی مقاصد کے تحت جو طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں کہی ہیں ان کا انداز بالکل مختلف ہے ان کے علاوہ کچھ ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں بھرپور شاعری ہے فکری اور فنی اوصاف سے معمور ان نظموں میں خیال کی نزاکت، فکر کی بلندی اور فن کی نزاکت بھی دیدنی ہے ''ماہِ گل افروز'' ایسی ہی ایک خوبصورت برجستہ اور رواں دواں نظم ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

میں صبح کے تارے کے تبسم میں ہوں بیدار — تو ریشمی بستر پہ نہ بیدار نہ ہشیار

میں مطلع برجیس ہوں تو ماہ دو ہفتہ — اس پر ہیں ترے حال میں افسردہ کے آثار

اک میں ہوں کہ طوفان کے منہ پھیر رہا ہوں — اک تو ہے کہ گھر تک سے نکلنے سے ہے بیزار

اس ماہِ گل افروز میں آ دیکھ مرے ساتھ — جنت کی جوانی کا تماشا سرِ کوہسار

آ دیکھ مری دیکھنے کی آنکھ سے ظالم — بارش سے بہاروں پہ جو پُرجوش ہیں گلزار

بھیگی ہوئی شاخوں کے تموج سے ہے پیدا   دلہن سی لجائی ہوئی اک شوکت رفتار
پھولوں سے ڈھلکتی ہوئی بوندوں میں ہے ابتک   وہ تیرے پسینے میں تیری طلعتِ رخسار
چٹکی ہوئی کلیوں میں وہ اک موج تبسم   جو پہلی نظر میں تری شرمائی تھی اک بار
جس طرح تری زلفیں ہیں بکھری ہوئی ظالم   ان کالی گھٹاؤں میں انھیں کا تو ہے کردار
ابھرے ہوئے غنچوں کے تکبر سے ہے ظاہر   وہ تن کے ترے چلنے کے اور باتوں کے اطوار
ویسی ہی چٹانوں پہ پھسلنے کی ہے ترکیب   اٹھلانے میں جیسے تھی تری لغزش رفتار
وہ چور سا احساس بھی غنچوں میں ہے بیتاب   جو تیرے خیالات میں رہتا ہے نگوں سار
کچھ اور میں کہنے کو تھا تجھ سے زرہ شوق   یعنی میں وفادار ہوں یا تو ہے وفادار
وہ بات مگر کان میں اک غنچہ نے کہہ دی   قربان مری نظم مری ثروت افکار

اس خوبصورت نظم میں ملا رموزی نے موسم بہار کے حوالے سے حسن محبوب کی محبوبیت کا اس خوبی سے تعارف کرایا ہے کہ ہر تصویر متحرک اور ہر پیکر گفتگو کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات میں تازہ کاری ہے۔ ملا صاحب نے ثابت کر دیا ہے کہ نثر ہو یا نظم، طنز ہو یا مزاح یا سنجیدہ انداز گفتگو انسانی نفسیات ہو یا فطرت نگاری ہر قسم کے موضوعات قلم بند کرنے کے لیے نئے مضامین باندھنے اور ہر اسلوب میں دادِ سخن دینے پر قادر ہیں۔ یہ وہ جوہر ہے جو ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ البتہ اپنی محنت اور ریاضت سے قلم کی شمشیر کو صیقل کیا جا سکتا ہے چنانچہ ملا رموزی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ حصول علم وآگہی سے ان پر جلا کرتے رہے اور یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔

ملا رموزی کا زیر نظر کلیات جو تین ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنے اور ان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کلیات میں پانچ جلدیں ہیں جلد اول میں 934 صفحات ہیں اس میں ''گلابی اردو'' کے (مطبوعہ اور غیر مطبوعہ) مضامین نیز عورت ذات کے عنوان سے شائع ہونے والی تمام تحریریں شامل ہیں۔ جلد دوم میں نکاتِ ملا رموزی حصہ اول و دوم، شادی، خواتینِ انگورہ اور زندگی کے عنوانات پر مشتمل 788 صفحات ہیں۔ جلد سوم کی ضخامت 748 صفحات ہے اس میں صبح لطافت، لاٹھی اور بھینس،

شفاخانہ، مضامین رموزی، شرح کلام اکبرالہ آبادی، مشاہیر بھوپال جیسے موضوعات اور خطوط رموزی جمع کیے گئے ہیں۔ جلد چہارم حقائق ولطافت، نوادر ولطائف، رموز ولطائف، رمز ولطیفہ اور مختلف کالموں کو محیط ہے۔ اس جلد کے کل صفحے 914 ہیں اور یہ سب سے ضخیم کتاب ہے۔ پانچویں اور آخری جلد 466 صفحات کے ساتھ گلابی شاعری، مجموعہ کلام، نظریات غزل، اخباری شاعری اور جنگ جیسی شعری اور نثری تحریروں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان سب مضامین کے علاوہ ہر جلد میں مقدمہ بھی شامل ہے۔

ملا رموزی نے بہت زیادہ لکھا ہے۔ ان کی تمام تحریروں کو جمع کرنے کا دعوا نہیں کیا جا سکتا البتہ اس کلیات میں ان کی وہ تمام تخلیقات، جن تک رسائی ممکن ہو سکی یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں اپنی نارسائی کا احساس ہے اور اس پر افسوس بھی ہے کہ ان کی کچھ مطبوعات کے صرف نام ملتے ہیں مگر کتابیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ زیر نظر کلیات میں شامل تمام کتابیں ملا رموزی کے فرزند ارجمند جناب رفعت اقبال کی ذاتی لائبریری سے حاصل کی گئی ہیں۔ موصوف نے اپنے والد محترم کی اس بیش قیمت وراثت کو سینہ سے لگا کر رکھا اور اس کی دیکھ ریکھ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ انھیں کی بدولت ادب کا یہ سرمایہ باقی رہا اور انھیں کے تعاون سے کلیات کی زینت بنا۔ میں ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کا احسان مند اور اس کلیات کے مرتب کے طور پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اسی شکریے کے مستحق میرے عزیز دوست پروفیسر محمد نعمان خاں بھی ہیں، سچ پوچھیے تو برادرم محمد نعمان خاں نہیں ہوتے تو میں یہ کلیات مرتب نہیں کر سکتا تھا اور شاید کرتا بھی نہیں۔ کلیات سے متعلق سارا مواد فراہم کرنے کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے سر لے لی تھی۔ ان کے تعاون خاص کی وجہ سے یہ کام میرے لیے آسان تر ہو گیا۔ رسمی طور پر شکریہ ادا کرنے سے اگر چہ حق معاونت ادا نہیں ہو سکتا مگر اخلاقیات کے بھی اپنے حقوق اور تقاضے ہوتے ہیں اس لیے میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکر گزار ہوں۔ آخر میں مگر دراصل سب سے پہلے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا شکریہ واجب آتا ہے کہ اگر اس نے اس کتاب کو چھاپنے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو نہ رموزی صاحب کے فرزند ارجمند کی کوشش بارآور ہوتی اور نہ کسی کا دست تعاون کام آتا۔ میں کونسل کی اشاعتی کمیٹی کے اراکین، اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام صاحب اور وائس چیرمین

جناب وسیم بریلوی صاحب سب کا خلوص دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہارون صاحب جو اس کتاب کے کمپوزر ہیں انتہائی مخلص اور بے نیاز قسم کے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں منتہی بھی ہیں، انھوں نے بڑی محنت اور محبت سے اس کتاب کی کمپوزنگ کی ہے میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ ملا رموزی جیسے کثیر الجہات اور کثیر التصانیف بلند پایہ ادیب کا یہ کلیات بہت پہلے شائع ہونا چاہیے تھا مگر وقت نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان پر اتنا کام بھی نہیں ہوا جتنا چھوٹے موٹے قلم کاروں پر ہو جاتا ہے جبکہ ان کے عہد کے بلند پایہ ادیبوں نے ان کی ادبی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا تھا۔ کسی شخص کی عظمت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ ایک بالکل نئے طرز کا موجد بن جائے اور وہ بھی ایسے طرز کا جس کی نقل بھی آسان نہ ہو مگر اب لوگ انھیں تقریباً فراموش کر چکے ہیں خود ان کے وطن میں بھی مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی عمارت ''ملا رموزی بھون'' کی وجہ سے ہی لوگ ان کے نام سے واقف ہیں مگر کارناموں سے شاید وہ بھی واقف نہ ہوں۔ امید ہے کہ ان حالات میں اس کلیات کی اشاعت نیک فال ثابت ہوگی۔

خالد محمود

نکاتِ رموزی

یعنی

مشہور ظریف انشاپرداز حضرت ملّا رموزی

موجدِ گلابی اردو کے سادہ اور سلیس ظریفانہ مضامین کا مجموعہ

(حصہ اول)

از

ملّا رموزی

فہرست

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

مقدمہ

(از جناب ابوالفخر نازش رضوی صاحب چیف ایڈیٹر ''بہارستان'' لاہور)

اربابِ کمال کی زندگی جس طرح حیرت انگیز او گوناگوں حالات کی متحمل ہوا کرتی ہے اسی طرح ان کی شہرت و ناموری بھی غیر متوقع اور لامتناہی حد تک پہنچ کر رہتی ہے۔ کسے خبر تھی کہ 1918 میں ایک نوجوان طالب علم دارالعلوم کانپور سے نکل کر اخبارات و رسائل کے ذریعہ اپنے حکمت آفرین مضامین سے ہندستان کے گوشہ گوشہ میں اپنی شہرت و مقبولیت کا ڈنکا بجادے گا؟ اور 1918 سے 1921 کی چار سالہ مدت میں اس کے مطبوعہ مضامین کے دو مجموعے شائع ہو جائیں گے اور ان پر ملک کے ممتاز اہلِ قلم حضرات مقدمے لکھیں گے اور دنیا انھیں ہاتھوں ہاتھ لے گی؟

1918 میں جنگ یورپ کی وجہ سے ہندستان کی صحافت خصوصاً اردو اخبارات کے لیے جس قدر اہم خطرات پیدا ہو چکے تھے، ان سے اخباری دنیا میں ایک مہلک افسردگی طاری تھی اور مشاہیر اہلِ قلم پر خوف و رجا کی تلوار لٹک رہی تھی، لیکن جس طرح اسی زمانے میں قدر دانِ یورپ کے اندر ''اسٹیفن لیکاک'' ایسا ظریف انشا پرداز اور ''برنیر فادر'' ایسا کارٹونسٹ پیدا ہوا اسی طرح ناقدردان ہندستان میں اردو صحافت و ادبیات کے لیے ملا رموزی ایسا حکیم و بالغ نظر ظریف اہلِ

قلم پیدا ہوا۔

ملا رموزی نے 1918 میں ایک اچھوتا اور انوکھا طرز تحریر ایجاد کیا جو کبھی پرانے زمانے کے ملا لوگوں کا طرز ترجمہ تھا، مگر بقول انگریزی اخبار انڈ پینڈنٹ الہ آباد ملا رموزی نے حیرت انگیز طریق پر اس طرز تحریر کا ''گلابی اردو'' نام رکھ کر اسے جو ترقی دی اور اس میں اخلاق و مذہب اور سیاست و اجتماعیات کے جو دقیق و بلند پایہ نکات و مسائل حل کیے، ان سے اردو جرائد میں ایک روح پرور شگفتگی پیدا ہوگئی۔ ملا رموزی کے ''گلابی اردو'' نامی مضامین کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ لوگ انھیں آنکھوں میں جگہ دینے لگے۔ محفلیں ان کی حکمت آفرینی اور ظرافت سے گرم رہنے لگیں اور انھیں کتابی شکل میں مرتب کیا گیا تو ان کی لطافت پر اخبارات و رسائل، علمائے کرام، صوفیائے عظام اور ممتاز لیڈروں نے یکساں طور پر نہایت وقیع رائے کا اظہار کیا۔

(مشاہیر ہند کی آراء کے لیے دیکھو کتاب ''سوانح ملا رموزی''، مطبوعہ آری پریس، دہلی)

الغرض ملا رموزی 1918 سے 1921 تک گلابی اردو کے عنوان سے اردو کے سب سے مقتدر اور مشہور اخباروں میں جو معرکۃ الآرا مضامین لکھتے رہے، ان سے ان کی شہرت ہندستان اور یورپ کے ان مقامات تک پہنچ گئی جہاں اردو اخبارات جاتے ہیں اور ترکی، ایران اور امریکہ میں رہنے والے ہندستانیوں نے ملا رموزی کے ان مضامین کے مجموعے طلب کیے۔ گلابی اردو کے مضامین کی عام طور پر یہ خوبی سب سے نمایاں ہے کہ ان کے اندر ملا رموزی نے سیاسی مسائل کے دقیق اور ناقابلِ فہم پہلو ہنسی ہنسی میں سمجھا دیے، مگر میری نظر میں ملا رموزی کے مضامین کی نہایت درجہ اہم خصوصیت یا وجہ قبولِ عام ان کی حد سے بڑھی ہوئی بے باکی، بے خوفی اور شدتِ بیان ہے۔ یعنی وہ عوام سے لے کر علماء، مشائخ، زعماء، حکام، وزرا اور بادشاہوں تک پر جب لکھتے ہیں، اس درجہ شدت اور بے باکی سے لکھتے ہیں کہ ملک کے نامور آزاد اہلِ قلم اس پر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ مشرقی ہندستان کا مشہور آزاد نگار اخبار روزنامہ ''سیاست'' لاہور 12 مئی 1921 کی اشاعت میں ملا رموزی کی اس بے خوف و خطر مضمون نگاری پر لکھتا ہے کہ:

> ''یہ شرف خدا نے صرف ملا رموزی کو عطا فرمایا ہے کہ وہ ''گلابی اردو'' کے رنگ میں پتہ کی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ دوسرے اخبار نویسوں کو جرأت نہیں پڑتی کہ ایسی

باتیں کہہ سکیں"۔

یہ تو ان بے شمار اخبارات میں سے صرف ایک اخبار کی رائے تھی جو ملّا رموزی کی تحریر کی بے باکی کے لیے متعدد بار اظہارِ خیال کر چکے ہیں، لیکن ملّا رموزی کی تحریری عظمت کچھ اس سے بھی بلند ہے اور اخبارات کے مقابل وہ خالص علمی اور فنی نقطۂ نظر سے دنیائے علم و ادب میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر چکے ہیں اور جس طرح وہ عوام میں "موجد گلابی اردو" مان لیے گئے ہیں اسی طرح محققین اور نقادوں کی نظر میں وہ زبانِ اردو کے ان اکابر ارکان میں شمار ہوتے ہیں جن کے طرزِ تحریر کی تقلید سے ادبیات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ "اردو زبان کے اسالیب بیان" کے عنوان سے عثمانیہ یونیورسٹی کے مشہور تنقید نگار پروفیسر مولوی غلام محی الدین زور بی۔اے، علی گڑھ کے بلند پایہ علمی و ادبی مجلّہ "سہیل" میں ملّا رموزی کے طرزِ تحریر اور شدتِ بیان کے متعلق لکھتے ہیں:

> "مُلّا رموزی صاحب پر ہر قومی و ملکی سربرآوردہ حادثہ اثر کرتا ہے اور وہ اپنا قلمی تنبیہ الغافلین سنبھالے بغیر نہیں رہتے۔ ان کے طرزِ تحریر کا اثر موجودہ زمانے کے ایسے انشا پردازوں پر پڑا ہے جن کی طبیعت میں زندہ دلی ہے اور اسی حیثیت سے ان کا ایجاد کردہ طرزِ تحریر زندہ رہنے والا ہے"۔

گلابی اردو کی مذکورہ خصوصیتوں کے ساتھ ہی اس کی ایک خصوصیت عوام و خواص کے لیے کسی قدر اہم ہے اور وہ اس کی خصوصی اندازِ بیان، یعنی گلابی اردو چونکہ عربی زبان کے قدیم اردو طرزِ ترجمہ کا چربہ ہے اس لیے اس میں جو محاورات اور مصطلحات یا ضرب الامثال استعمال ہوتی ہیں، ان سے عربی داں طبقہ جس قدر لطف اندوز ہوتا ہے اتنا لطف انگریزی داں گروہ کو نہیں آسکتا۔ اِدھر بے وقوفوں کی ایک جماعت تھی جس کو یہ بدظنی تھی کہ ملا صاحب گلابی اردو کے سوا مروجہ اردو میں کچھ لکھ ہی نہیں سکتے۔ حالانکہ اس کے جواب میں اخبار 'اخوۃ' لکھنؤ، 'حقیقت' لکھنؤ، 'خلافت' بمبئی، 'البرید' کانپور، 'مدینہ' بجنور، 'الجمعیۃ' دہلی، 'قوم' دہلی، 'زمیندار' لاہور کے فائل موجود ہیں جن میں ملا صاحب کے مروجہ اردو نہایت معرکۃ الآرا مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے غازی اعظم، خواتین انگور، اقطابِ مشرق وغیرہ نامی نہایت متین اور تاریخی کتابیں بھی اسی مروجہ اردو میں لکھی ہیں۔ پھر بھی فطرت آگاہ ملّا رموزی کو اس کا خیال یا بدظنی کے ردّ و ارتفاع کا خیال ہوا اور انھوں نے 1925ء سے

مروجہ اردو میں ظریف مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا جو اس وقت زیر بحث ہے۔ اب ان مضامین کے دیکھ لینے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت اردو اخبارات و رسائل میں ملا رموزی اور صرف ملا رموزی ہیں جو بیک وقت دو قسم کے طرز تحریر کے خصوصی مالک ہیں۔ ملا رموزی کا زیر بحث طرز تحریر بہ لحاظ ظرافت، نکتہ چینی، اصلاح و مقبولیت کے گلابی اردو کا دوسرا عکس ہے پھر بھی اس میں چند خوبیاں گلابی اردو سے سوا نظر آتی ہیں اور کہنا پڑتا ہے کہ:

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل

<u>فطرت شناسی:</u>

ملا رموزی کے پہلے مجموعۂ مضامین ''انتخابِ گلابی اردو'' مطبوعہ نقیب پریس بدایوں پر ملک کے مشہور اہلِ قلم اور ادیب چودھری رحم علی ہاشمی، بی۔ اے، چیف ایڈیٹر اخبار اخوۃ 'و استقلال' نے جو تنقید لکھی ہے، حق یہ ہے کہ وہ ملا صاحب کے طرز تحریر کا نہایت درجہ جامع تبصرہ ہے بلکہ اس کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چودھری صاحب نے یہ سب کچھ ملا رموزی کو دیکھ کر لکھا ہے اور ان کے ساتھ رہ کر ان کی تمام قوتوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسی لیے چودھری صاحب نے سب سے پہلے ملا رموزی کی اُس نکتہ آفریں قوت کی تعریف کی ہے جو جانِ مضمون ہوا کرتی ہے یعنی ملا صاحب کی فطرت شناسی۔ ملا رموزی میں یہ کمال اس قدر خاص ہے کہ وہ جو بات کہتے ہیں فطرت اور منشائے فطرت کے عین مطابق ہوا کرتی ہے۔ اسی نسبت سے ملا رموزی اکثر و بیشتر مواقع پر اپنی مخاطبت جاہلوں اور غریبوں سے رکھتے ہیں اور انھیں زندگی، ترقی اور اصلاح کے وہ گر بتاتے ہیں جن کی طرف اکابر مصلحین کے خیالات کبھی منتقل نہیں ہوتے اور چونکہ عموماً مصلحین کے مخاطب ذی علم اور حساس لوگ ہوا کرتے ہیں اور جاہلوں کی اصلاح پر کوئی ملتفت نہیں ہوتا اس لیے ملا رموزی کا انھیں مخاطب کرنا فطرت کا وہ نازک احساس تھا جسے ملا رموزی نے اپنی قابلیت سے پالیا۔ پھر کمال یہ ہے کہ وہ جس شخص سے مخاطب ہوئے ہیں، اس کی حیثیت اور قابلیت کے موافق بات کرتے ہیں۔ چنانچہ گلابی اردو میں ملا صاحب ہمیشہ خود کو، ہز ہائی نس، اعلیٰ حضرت جوئیڈ جارج اور لارڈ کرزن یا وائسرائے ہند کے استاد سے کم حیثیت تصور نہیں فرماتے اور بڑے وائسرائے اور وزرا ان کے حجرے میں زانوئے ادب تہ کیے نظر آتے ہیں، لیکن یہی اعلیٰ حضرت جواب اخبارات میں

''حضور ضیاء الملک ملا رموزی'' مان لیے گئے ہیں، جب زیرِ بحث مضامین میں عوام کی اصلاح پر آمادہ ہوتے ہیں تو خود کو دنیا کا انتہائی غریب، مفلس، تنگ دست، مزدور یا بقول ان کے ''کسی دفتر کے منشی جی'' کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اور اس رنگ میں غریبوں محتاجوں اور بے کس لوگوں کی المناک اور قابلِ اصلاح زندگی کے جو نقشے وہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں دنیا ان کی قوتِ مطالعہ، وسعتِ معلومات، زورِ اندازہ پر عش عش کر اٹھتی ہے۔ چنانچہ آپ اس کتاب میں ''تھرڈ کلاس''، ''لقمے''، ''زنانہ''، ''1925 کا قومی ہفتہ''، ''علی گڑھ جبلی'' وغیرہ عنوانات سے جو مضامین ملاحظہ فرمائیں گے اور وہ ان کے اندر ملا رموزی ایک مصیبت زدہ اور مفلوک الحال انسان کی صورت میں نظر آئیں گے اور وہ ایک مفلس اور بے زر مسافر کی حیثیت سے نادار بے نوا ہندستانیوں کے سفر کی جن مشکلات کا نقشہ کھینچیں گے ان کی صحت و اصلیت پر بے ساختہ آفرین کہنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ ایک عیالدار سپاہی یا تنگ دست مزدور کے جھونپڑے کے اندر کی جن تکالیف کا فوٹو کھینچتے ہیں تو پہلے خود کو ایک مفلس مزدور کا جامہ پہناتے ہیں اور اس طرح فاقہ کشانِ ہند کی جس المناک زندگی کی اصلاح کی خاطر وہ خود کو مختلف صورتوں میں پیش کرتے ہیں حقیقت میں یہی طرز ان کی قابلِ رشک شہرت و قبولِ عام کی وجہ موجہ ہے۔

وسعتِ نظر:

اِن مضامین کی روح و رواں ملا رموزی کی قوتِ اندازہ یا وسعتِ نظر ہے۔ دنیا کے اربابِ کمال کا شیوہ عام ہے کہ وہ کسی کمال کی تحصیل و تکمیل کے لیے ذلیل سے ذلیل بھیس بدل کر زندگی گزارتے ہیں۔ محکمۂ سی آئی ڈی کا ایک افسرِ اعلیٰ کسی قاتل کی تلاش میں کبھی بھنگی اور چمار کا لباس بھی پہن لیتا ہے مگر دنیا اس کی عظمت کو دوبالا سمجھتی ہے، مگر ملا رموزی کا کمال اس سے بھی بلند و بالا ہے۔ یعنی وہ نہ کسی خاص مسئلہ کے لیے بھیس بدلتے ہیں نہ سفر کرتے ہیں، نہ مطالعہ کرتے ہیں نہ تحقیق بلکہ ایک مختصر سے شہر کی محدود فضا میں بند رہ کر لکھتے ہیں، مگر انسانی زندگی کے جس پہلو پر لکھتے ہیں اس کی اس قدر مکمل تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں گویا وہ عرصہ سے اس حصہ زندگی کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ یہ فقط ملا صاحب کی وسعتِ نظر ہے اور

بس۔ ملا رموزی صاحب نے بہ عنوان زنانہ، لقے وغیرہ بعض مضامین میں خود کو ایک نہایت تجربہ کار شادی شدہ انسان کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے زندگی کے اُن خالص خانگی امور کی تصویریں کھینچی ہیں جو صرف شادی شدہ اشخاص سے متعلق ہوتے ہیں اور اس حیثیت سے ملا صاحب نے الفاظ، جملے، محاورے اور مصطلحات بھی وہی استعمال کی ہیں جو ایسے امور کے لیے خاص ہیں، مگر آپ یہ سن کر کس قدر حیران ہوں گے کہ ابھی ملا صاحب نا کتخدا ہی دھرے ہوئے ہیں مگر کمال یہ ہے کہ مضامین سے دس شادی شدہ انسانوں کا تجربہ نمایاں ہے۔ اور یہ سب کچھ ان کی فطری دوررسی اور وسعتِ نظر کا نتیجہ ہے اور اسی نسبت سے ان کا جواب پیش کرنے سے اردو کا موجودہ عہد قاصر ہے۔

الفاظ واشارات:

گلابی اردو میں ملا رموزی صاحب نے مشہور فارسی عربی ضرب الامثال، اشعار اور مقولوں کے اردو ترجمہ میں اپنی اجتہاد و تصرف سے جو ندرت و شگفتگی پیدا کی ہے وہ تو ادبیاتِ اردو میں ''زعفران زار'' کی حیثیت حاصل کر چکی ہے لیکن زیر بحث طرز تحریر میں ظرافت و اصلاح یا تنبیہ و ہدایت کے لیے ملا رموزی صاحب نے جو الفاظ و اشارات وضع کیے ہیں ان کی معنویت و معنی آفرینی اپنی لاجوابی میں ممتاز ہے۔ ملا رموزی صاحب میں مرصعِ الفاظ و اشارات کی قوت اس درجہ بے مثال ہے کہ زبانِ قلم تعریف سے قاصر ہے۔ ملا صاحب کے بے شمار الفاظ ہیں جن کی ندرت اور معنی آفرینی پر میں نے بچشمِ خود متعدد اربابِ علم و فضل کو دیکھا ہے کہ وہ لمحوں ساکت رہے ہیں جو انتہائی مسرت و حیرت کی مسلمہ حد ہے اور جس قدر ان الفاظ پر غور کیجیے اتنا ہی لطف بڑھتا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آدمی ملا صاحب کا مضمون ایک وقت پڑھ کر چھوڑ نہیں دیتا بلکہ متعدد بار اس مضمون کو پڑھا جاتا ہے لیکن سیری نہیں ہوتی۔ ایک موقع پر مضمون کی ضرورت ملا صاحب کو مجبور کرتی ہے کہ وہ لفظ ''بیت الخلا'' کا استعمال کریں، جو کوئی متروک یا مکروہ لفظ نہیں مگر ملا صاحب کی بلند پایہ انشا اس کو قبول نہیں کرتی اور ملا صاحب ''بیت الخلا'' کے لیے لکھتے ہیں کہ:

''صبح جب ہم اپنے گھر کے ''میونسپل بورڈ'' میں گئے''۔

کہیے بیت الخلا کے لیے میونسپل بورڈ کا لفظ کس قدر ظرافت آفریں اور بامعنی لفظ ہے۔ ایک جگہ وہ ایک آزاد گفتگو کرنے والی عورت کے لیے لکھتے ہیں کہ:

''کہ وہ تو آپ سے شرماتی ہیں ورنہ وہ تو اس قدر 'ابوالکلام آزاد' واقع ہوئی ہیں کہ رات بھر 'خانگی مسائل' پر گفتگو کرتی رہتی ہیں''۔

زیادہ اور آزاد گفتگو کرنے والی عورت کے لیے ''ابوالکلام آزاد'' کا مشہور جملہ کس درجہ لطافت آفریں ہے؟ غرض ملا رموزی صاحب کے پاس اس قسم کے الفاظ واشارات کا ایک بے مثال خزانہ ہے جسے موجودہ عہد کا کوئی ظریف انشا پرداز نہیں پا سکتا۔

مختصر یہ کہ ان خصوصیات کے ساتھ ملا رموزی صاحب نے اردو ادبیات اور اردو صحافت میں جس قدر بہاریں پیدا کی ہیں وہ مجموعہ ''نکاتِ رموزی'' کے مطالعہ ہی سے متعلق ہیں اور موصوف کا یہی وہ رشکِ گلزار تحریر طرز ہے جو آج کل اردو اخبارات اور رسالوں کی روح رواں بنا ہوا ہے اور اسی نے ملا رموزی کی شہرت و زندگی کو بقائے دوام کی نعمت سے مالا مال کر دیا ہے اور ''تاریخ اردو'' کا مورخ مجبور ہوگا کہ ملا رموزی کو اردو کے ممتاز جلیل القدر بانیوں میں تسلیم کرے جن کے زورِ قلم سے اردو زبان علمی، ادبی زبان مانی جائے گی۔

افسوس:

ملا رموزی کے انشا پردازانہ تبحر اور محاسن کے اظہار کے بعد مجھے ان کی ایک اور قوت کو بروئے کار لانا ہے جو انھیں اپنے تمام معاصرین کے مقابل امتیازی حیثیت دینے والی قوت ہے اور یہ قوت ملا رموزی کا ناقابلِ شکست حوصلہ اور عزم و استقلال ہے۔ یہ معلوم کر کے دنیائے ادب و انشا کو ماتم کرنا چاہیے کہ آج وسطی ہند کے اس یکتائے روزگار ظریف اہلِ قلم کے حالاتِ زندگی کچھ اس درجہ صبر آزما ہیں جن کے تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اگر آج ملا رموزی یورپ میں نہ سہی پنجاب ہی میں ہوتے تو شاید وہ زندگی کے ایسے نامرادو ناکام مراحل سے دوچار نہ ہوتے، جنھوں نے ان کو جوانی میں بوڑھا کر دیا۔ حقیقت میں ملا رموزی نہایت مصیبت زدہ انسان ہیں۔ ان کا کوئی معاون و مددگار نہیں۔ کوئی سرپرست وقدرداں نہیں۔ وہ گزارہ کی طرف سے بے حد پریشان

رہنے والے نوجوان ہیں، مگر کوئی نہیں جو ادبیاتِ اردو اور صحافتِ اردو کے اس جوہر یکتا کی حوصلہ افزائی کرے۔ امریکہ کا ایک ہواباز نیویارک سے پیرس تک 42 گھنٹہ کی مسلسل پرواز سے جب پیرس پہنچتا ہے تو پچاس ہزار آدمی اس کا استقبال کرتے ہیں اور جب وہ امریکہ واپس جاتا ہے تو نیویارک کا ایک ادنیٰ تاجر اسے پچیس ہزار ڈالر کا نقد انعام نذر کرتا ہے، مگر ایک مجبور و بیکس ملا رموزی ہے جسے گزارہ کی عقل آزما مصروفیت سے اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ سکونِ خاطر سے کوئی مضمون لکھ سکے۔ یہاں تک کہ ملا رموزی مجھے اپنے ایک گرامی نامہ میں یہ جملے لکھتے ہیں جن سے آنکھوں میں دنیا سیاہ ہو جاتی ہے:

"نازش!

مجھے پنجاب کی قدر دان فضاؤں میں جلد بلالو میں ابھی بالکل نوجوان ہوں مگر مسلسل ناقدردانیوں نے بوڑھا کر دیا ہے"۔

آہ یہ اس ادیب کے الفاظ ہیں جس کی حیات افروز تحریروں سے آج مرجھائے ہوئے دل زندگی پاتے ہیں، پھر ستم تو یہ ہے کہ ملا رموزی کے ان مصائب سے ان کے وہ لفظی دوست واقف ہیں جو خود کو درد رکھنے والا مسلمان کہتے ہیں، پھر ان زہرہ گداز مصائب میں ملا رموزی کا اس قدر شگفتہ مضامین لکھتے رہنا خدا ساز بات نہیں تو اور کیا ہے؟ اے کاش ملا رموزی خانخاناں کے عہد میں ہوتے جو ان کے ایک ایک جملہ پر زر و جواہر کے خزانے نثار کرتا۔ مگر ملا رموزی کو خدا اب بھی فراغت و صحت سے مالا کر دے۔

زندہ باد ملا رموزی

پائندہ باد نکاتِ رموزی

نازش رضوی

5 ستمبر 1927 مطابق 6 ربیع الاول 1345 ہجری قدسی

ہم اور ہمارے البتہ تحقیق حالات

(مُلّا صاحب کے ذاتی قلم سے)

امابعد!

پس فرمایا بعض نے بعض سے کہ اگر دنیا میں کسی شخص کو سچے دوستوں کا ایک غول مل جائے۔ عام اس سے کہ وہ سائبیریا کے کسی چٹیل بیابان سے تعلق رکھتا ہو یا مالابارہل بمبئی کے کسی ممتاز عشرت کدہ سے متعلق ہو، ہونا مبارک ہے کیونکہ وہ تو کہا ہے نا کہ ''دوستوں کی زیادتی خوش نصیبی کی علامت ہے''۔ لہٰذا ہمارے دوستوں کی مردم شماری کے اعداد قحط سالی اور طاعونی حوادث سے وضع ہو کر بھی اتنے باقی رہ جاتے ہیں کہ اگر انھیں ہندستانی فاقہ کش رنگروٹوں کی وردی پہنا کر قطار اندر قطار کھڑا کیا جائے تو جرمنی یا افغانستان کی کیا مجال ہے جو ہندستان کے غریب ہندو بھائیوں پر حملہ کی جرأت کرے۔ لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ اس کثیر العیال دوستی کے اعتبار سے ہم خوش قسمت اور ہمارے وہ بھی خوش قسمت، لیکن بلحاظ وفاداری و ہمدردی اگر ہمارے اِن کثیر الاشاعت دوستوں سے کوئی شخص ''حق دوستی ادا کرنے'' کا سوال کرے تو پھر ان کی کثرت ہمارے لیے ویسے ہی ثابت ہوگی جیسی وقت مصیبت شریف مکہ کے لیے امیر فیصل اور امیر عبداللہ کی موجود ہوگی۔ یعنی کوئی بھی کام نہ آیا اور وہ مکہ سے نہایت آب تاب کے ساتھ نکال دیے گئے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اپنی سوانح عمری خود ہی لکھ رہے ہیں تا کہ سند رہے اور وقت ضرورت تمھاری اولاد کے کام آئے۔ اگر چہ مشرقی عقائد والوں کے نزدیک کسی شخص کا بقید حیات مع نام وولدیت اور قومیت وسکونت اپنی سوانح عمری خود ہی لکھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی نوجوان کی دعوت ولیمہ میں بھائی عزرائیل علیہ السلام کو بھی بلا لینا۔ پس ہے شگونِ بد؟ لیکن بھائی مکھی ندی کی سودیشی محبت کا تقاضا جب مارشل لا کی حد تک پہنچ گیا تو سوانح عمری کا لکھنا ہمارے اوپر بھی ویسا ہی فرض ہوگیا جیسا زمانۂ طاعون میں ہر مسلمان پر روزانہ بڑے قبرستان تک چہل قدمی کرنا تمدنی شریعت میں فرض لکھا ہے۔ لہٰذا بعد سلام مسنون آں کہ گزارش فدوی کی یہ ہے کہ:

پیدائش:

7 ذی الحجہ 1319 ہجری کو مشیت الٰہی اس طرف مائل ہوئی کہ ہم کو ریاست بھوپال میں پیدا ہونا چاہیے۔ ہوئے اور جس وقت ہماری ولادت عمل میں آئی تو کائناتِ عالم میں کہرام مچ گیا۔ مبارک سلامت کے گیت گائے گئے، گارڈ آف آنر نے سلامی اُتاری، قلعہ شاہی سے توپیں سر کی گئیں اور اس ہنگامہ میں 2457 آدمی مجروح، 573 افسر مقتول کچھ مفقود الخبر اور باقی لوگ نہایت شائدار طریق پر پسپا ہوئے۔ ملازمین دارکان دولت کو انعامات تقسیم کیے گئے، تمام دفاتر اور شہر میں ہڑتال منائی گئی۔ لوگ سیاہ لباس پہنے بازاروں میں خوشیاں مناتے پھرتے تھے۔ کئی مقامات پر پولیس سے جھڑپ بھی ہوئی جس میں بُدھو خاں ولد نجو خاں کو توال شہر کی بائیں آنکھ میں کسی قدر خفیف سی ضرب شدید بھی آئی اور وہ اسی وقت بقضائے الٰہی فوت ہو گئے اور ان کا حق پنشن گورنمنٹ نے ہمارے نام منتقل کر دیا۔ غرض عجب سماں تھا، جس طرف دیکھیے اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑا لیفٹننٹ گورنر اترنے والا ہے جس کے استقبال کی خوشی میں تمام راستے بند ہیں اور پولیس ہے کہ مارے لٹھوں کے رعایا کو کسی راستہ سے گزرنے نہیں دیتی۔ رات بھر کسی نے ہماری ولادت کی خوشی میں چراغ تک نہیں جلایا۔ کیونکہ چشم بددور پیدائش کے وقت ہم تھے بھی کسی قدر حسین۔

ابتدائی تعلیم وتربیت:

غرض ہوتے ہوتے جب ہم کامل سات برس تک محلّہ کے لونڈوں میں خوب دل لگا کر کھیلتے رہے اور شریف اہل محلّہ کے مکانوں پر شب کے وقت نہایت ادب واحترام سے پتھر پھینکنے کی عادت پختہ ہوگئی تو ایک دن بلاتحریک وتائیدِ والدین اہل محلّہ نے خلافت فنڈ سے روپیہ لے کر ہمیں پڑھنے بٹھادیا۔ لہٰذا چاروناچار ہم نہایت شوق سے پڑھنے بیٹھ گئے اور عرصہ تک بیٹھے رہے۔ اِدھر خدا کے فضل سے آباواجداد کے عالمانہ مراتب کے موافق ہمیں تمام علوم وفنون میں یکتا ہونا ہی تھا لہٰذا کامل ایک اوپر دس برس میں ہم نے کریما، آمد نامہ، دستور الصبیان، اُمّ الصبیان، علم الکلام، کہانسی وزکام، گل بنفشہ، تخم خطمی گاؤزبان، عناب، سپستان، گلستاں وبوستاں اور طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں مع بغدادی قاعدے کے جب پڑھ کر رکھ دیں تو ہماری اس ذہانت وذکاوت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بھی کانپ گئے اور لندن آکسفورڈ یونیورسٹی کے ہیڈ مولوی پروفیسر براؤن کے ہاتھ سے کتاب گرگئی اور اب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ ہونہ ہو یہ لڑکا جس کی پیشانی سے آثار ہوش مندی چھن چھن کر ٹپک رہے ہیں کسی دن اچھے اچھے لوگوں کی عزت لینے میں کمی نہ کرے گا۔ یعنی بڑا صاحب شہرت اور علامہ ابن خلدون ہوگا۔

غرض اس ابتدائی تعلیم کے بعد جب بھی ہمارا چال چلن روز بروز اچھا ہی ہوتا گیا اور محلّہ والوں کی تکلیف کسی طرح دور نہ ہوئی تو عین اس وقت جب کہ برادری والوں میں نیک گھڑی اور خاندانی حالات معلوم کرکے اگر لڑکے کی آمدنی اور تنخواہ خاندانی شرافت سے بھی زیادہ پالیتے ہیں تو بوساطت قاضی صاحب عربی زبان میں اس کے گلے سے ایک کثیرالعیال گھنٹی باندھ کر خدا کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ ہمیں کانپور کے دارالعلوم جامعہ الہٰیہ میں بھیج دیا گیا اور اسی لیے اس عظیم الشان دارالعلوم میں بالغ ہی داخل ہوئے۔

دارالعلوم الٰہیات کانپور کی اعلیٰ تعلیم:

دارالعلوم سے یوں تو خدا ہر مسلمان کو بچائے۔ لیکن جو لوگ اس میں تعلیم پاچکے ہیں ان

کے ماں باپ تک جانتے ہیں کہ یہاں شریف النسب اور اعلیٰ خاندانوں کے طلبا کے ساتھ ہر سال یہ سلوک کیا جاتا ہے کہ انھیں فارسی عربی کے ساتھ سنسکرت یا انگریزی زبان لینے پر بہ طیب خاطر مجبور کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس زمانہ تک ہمارا شمار بھی اعلیٰ خاندانوں میں ہوتا تھا اس لیے ہمارے اوپر فرض ہو گیا کہ ہم روزانہ دو گھنٹے سنسکرت ایسی شیریں زبان حاصل کریں۔ ہمارے پروفیسر صاحب سنسکرت قوم کے نہایت موٹے پنڈت اور ذات کے نہایت شریف بقال تھے اور تمام طلبا پنڈت جی سے نہایت خوش تھے۔ البتہ پنڈت جی جس وقت اپنے خاص الخاص پوربی لہجہ میں کسی ادق عبارت کو سمجھانے کے لیے ہر طرح آمادہ ہو جاتے تھے تو ہم لوگوں کا معاملہ اکثر پولیس اور کوتوالی تک پہنچ جاتا تھا۔ آخر کار فیصلہ یہی ہوا کہ ہم سنسکرت پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔ چھوڑ دیا۔ اب جو سنسکرت زبان کی تعلیم چھوڑی تو تمام پروفیسروں میں ہمارے موافق بغاوت اور سازش کی تیاریاں ہونے لگیں کیونکہ پروفیسروں کو کامل یقین تھا کہ اگر ہم کو اس زبان کے بدلے کوئی دوسری زبان نہ دی گئی تو اس آزادی کے عالم میں ہماری ذات سے کسی پروفیسر کو فائدۂ عظیم پہنچ جائے گا۔ آخر طے پایا کہ ہمیں بجائے سنسکرت کے انگریزی زبان لینا چاہیے۔ لی اور اس خداداد ذہانت کو دیکھیے کہ کامل دو برس میں پوری کنگ ریڈر پڑھ کر رکھ دی۔

ندوہ کی تعلیم:

ہم نے اوپر فرمایا ہے کہ ہم قابل ترین طالب علم تھے۔ ثبوت یہ ہے کہ الٰہیات میں جب کوئی علم باقی نہ رہا تو ندوۃ العلما لکھنؤ گئے۔ ارادہ تھا کہ یہاں دینیات کی تعلیم حاصل کریں گے، لیکن ندوہ کی پہلی خرابی تو یہ تھی کہ یہ شہر سے باہر ایک ایسے مقام پر آباد کیا گیا ہے جہاں قتلِ عمد، اغوا، اقدامِ قتل، فرار، خودکشی اور بالجبر کی ہر واردات نہایت آب و تاب سے ہو سکتی ہے۔ لیکن جب ایک مولویانہ یونیفارم پہنے ہوئے پروفیسر ندوہ سے اپنے اس شک کا اظہار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ندوہ کی عمارت شہر سے باہر بنوانے کی غایت بقائے صحت ہے اور بس، لیکن جس وقت ندوہ کے طلبا کو ٹوٹی ہوئی چارپائیوں پر دراز پایا اور بجائے تکیہ کے موٹی موٹی کتابیں ان کے سرہانے رکھی دیکھیں تو قدرے دل برداشتہ ہوئے لیکن جب ظہر کی نماز میں کھدر خوردہ

پروفیسروں کو مٹی کے لوٹوں سے وضو کرتے ہوئے دیکھا تو شام ہی کی گاڑی سے روانہ ہو کر ایک اسلامی کالج میں دم لیا۔

کالج کی اعلیٰ تعلیم:

رات ہی کے وقت کالج کے ہیڈ کانسٹبل نے ہمارا حلیہ اور پتہ وغیرہ لکھ کر جامہ تلاشی لی اور ایک کمرہ رہنے کو دے دیا۔ غرض شاہانہ تزک واحتشام کے ساتھ ہماری تعلیم شروع ہوئی اور ہم نے اپنی خداداد قابلیت اور وسعت نظر سے یہاں کے خاصی پوزیشن والے اور خاص کر رئیس طلبا سے تعلقات پیدا کیے تا کہ بعد فراغ علم یہ تعلقات ملازمت کے لیے کام آئیں۔ قصہ کوتاہ ہم نے اس کالج میں یوں تو ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی تک تعلیم پائی لیکن کثرت مشاغل کی وجہ سے اب اس میں سے ایک حرف بھی یاد نہیں۔ البتہ اس کالج میں جو نصابِ تعلیم ہم نے پڑھا اس کی درجہ وار کتابیں یہ ہیں جو وہاں اس وقت پڑھائی جاتی تھیں۔

درجۂ انٹرنس:

سر کے انگریزی بالوں کا سو سو طرح سے سنوارنا، سگریٹ نوشی کی ابتدائی مشق، اعلیٰ قسم کی شیروانی، بے انتہا چست پاجامہ، نازک سی گھڑی کا ہاتھ پر باندھنا چاہے وہ چلتی نہ ہو۔ بہ اندازۂ حسن وعمل کسی شاعر یا ادیب سے پُرتکلف رسم وراہ کا پیدا کیا جانا، ہاکی اور فٹبال کے قواعد کا روزانہ حفظ یاد کرنا۔

درجۂ ایف۔اے:

درجۂ انٹرنس کی ہاکی اور فٹ بال کا آموختہ دنیا بھر کے ٹورنامنٹ میں شرکت، شب کے وقت بورڈنگ میں کسی قدر موسیقی کی مشق، سگریٹ نوشی کی تکمیل، اردو عبارت اور گفتگو میں انگریزی الفاظ کا بلا ضرورت استعمال۔

درجۂ بی۔اے:

سوٹ، ٹینس، کرکٹ، سگارنوشی اور بہ اندازِ استطاعت انگریزی نسل کا ایک آدھ کتا بھی پال لینا، جو ٹینس گراؤنڈ تک حقِ رفاقت ادا کر سکے۔ کسی قدر مضمون نگاری اور تقریر کی مشق جو زمانۂ تلمذ میں کام آئے۔

درجۂ ایم۔اے:

ٹینس اور کرکٹ کا آموختہ، نماز اور روزہ کی کاپیاں پھاڑ پھینکنا۔ ایڈیٹری اور لیڈری کی مشق، گورنمنٹ سروس وفاداری کا حصۂ اول حفظ یاد کرنا۔ مشرقی رسم و رواج سے قطعاً نفرت کا سبق بورڈ پر لکھنا۔ ڈاڑھی کے ساتھ مونچھوں کا صاف اور خوشخط املا لکھنا۔ مادری زبان کا یک لخت بھول جانا، نیوی کٹ یا امپیریل سگریٹ کا پینا، انگریزی اخباروں کے سوا ملکی اخبارات کو ہاتھ تک نہ لگانا، پرانے ماں باپ کو نئے طریقوں کا ڈرائنگ سکھانا، سودیشی بیوی کو انگلش لباس میں جمناسٹک کرانا، فکرِ ملازمت میں کلکٹروں کی کوٹھیوں تک روزانہ ریس۔

ایل۔ایل۔بی:

مسلمانوں کے تنازعات کو بجائے باہمی تصفیہ کے عدالت تک پہنچا دینا۔ اپیل بالائے اپیل کے ذریعہ موکل کی ساری دولت کو حفظ ہضم کر جانا۔ مفلس موکل سے مختنانہ بذریعہ قرقی وصول کرنا، جھوٹے گواہوں کو خدا اور رسولؐ کی قسم کھانے کے طریقے حفظ یاد کرانا، آخر عمر میں قانونی دفعات کا مالیخولیا۔ حسبِ دفعات تعزیرات ہند وفات پانا۔

گلابی اردو کی ایجاد:

غرض ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی کی مذکورہ کتابیں پڑھ لینے کے بعد زیرِ صدارت گورنر صوبہ یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ میں جب چانسلر نے ہمیں ایم۔اے۔، ایل۔ایل۔بی کی سند کے ساتھ وہ

لحاف بھی اڑھادیا جسے ''گون'' کہتے ہیں تو اب ہمیں اطمینان ہوگیا کہ ہم دنیا میں کلکٹر، گورنر، لیڈر، ایڈیٹر اور بس چلا تو خلیفۃ المسلمین تک ہوسکتے ہیں، لہٰذا کسب کمال اور عروج زندگی کی خاطر مضمون نگاری کے لیے کمر باندھی۔ اور خوب یاد ہے کہ اس وقت دنیا کی تمام لکڑیاں جن میں چوب عمارتی اور ہیزم سوختنی بھی شامل ہے، ہمارا قلم بن گئی تھیں اور بحیرۂ روم اور سنگاپور کا وہ تمام پانی ہماری سیاہی ہوگیا تھا جہاں برطانیہ بحری مرکز بنا کر ہندستان افلاس نشان پر انشاء اللہ ایک اور احسان کرنے والی ہے۔ غرض مضمون نگاری شروع ہوگئی اور اس قدر لکھا کہ اخبارات کا وہ کالم تک باقی نہ رہا جس میں مہذب سے مہذب اخبار بھی ''بال صفا پاؤڈر'' اور ''سوزاک واساک'' کے نسخوں کا اشتہار دینا کوئی معیوب بات نہیں سمجھتے۔ جہاں تک کہ جب ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور ہماری مضمون نگاری کی شہرت ولایت تک پہنچ گئی تو انھیں سر کا اور ہمیں جی۔ آئی۔ پی۔ آر کا خطاب ملا۔ اور خود ملک معظم نے ہمیں پیغام تعزیت بھیجا اور لکھا کہ مابدولت واقبال آپ کی مضمون نگاری سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ گریٹ انڈین پین شولا ریلوے کمپنی ایسی مقتدر ولایتی علمی مجلس کی طرف سے جب جی۔ آئی۔ پی۔ آر کا خطاب مل گیا تو اب ہمیں یقین ہوگیا کہ اگر کچھ دن اسی طرح مشق ناز کرتے رہے اور خون دو عالم کے قصاص کے لیے اردو اخباروں کی گردن اسی طرح خمیدہ رہی تو انشاء اللہ ہندستان کے شیکسپیئر ہوجائیں گے۔ اتفاق کہیے کہ جامعہ الٰہیہ کانپور میں ہمارے وطن کے ایک ایسے بزرگ بھی آباد تھے جو خود کو ہمارا استاد کہتے تھے۔ بھاگے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ملا صاحب خبر بھی ہے کہ وطنِ عزیز میں طاعون کا دورہ شروع ہوگیا ہے۔ طبیعت کو کسی طرح چین نہیں۔ ہم نے ادب سے فرمایا کہ اگر وطن میں طاعون آجانے سے آپ ایسے ہی پریشان ہیں تو چلیے کچھ دن کے لیے وطن ہو آئیں، وہاں عزیزوں اور احباب کے جنازوں میں شرکت سے کسی قدر طبیعت بہل جائے گی اور روزانہ بڑے قبرستان تک چہل قدمی بھی ہوجائے گی۔ اس فقرہ کو سن کر اور تو کچھ نہیں مولوی صاحب قبلہ ہمارے پاس سے عربی کی وہ دعا پڑھتے ہوئے چلے گئے جسے جمائی آتے وقت مسلمان منہ پر ہاتھ رکھ کر پڑھتے ہیں، لیکن ہونا ہی کیا تھا دوسرے دن کی ڈاک سے مولوی صاحب کو ایک اور خط ملا جس میں لکھا تھا کہ وطن میں اموات کی شرح پیدائش تین سو یومیہ ہے اور اب وطنِ عزیز میں وہ جانور بول رہا ہے جس کا سایہ پڑجانے سے اگر آدمی بادشاہ نہ سہی تو دیوالیہ ضرور ہوجاتا ہے۔ پھر ہمارے پاس

بھاگے ہوئے آئے اور کہا کہ لو بھائی اب تو خاتمہ ہی ہوگیا۔ لہٰذا مولوی صاحب کی پریشانی رفع کرنے کے لیے ہم نے ''یہ گلابی اردو'' ایجاد کی اور نتیجہ یہ دیکھا کہ اکثر شریف لوگ اسے پڑھتے وقت اپنے دانتوں کو ہونٹوں کے اندر محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

وفات:

آپ اس کلیہ کے قائل ہوں گے کہ مشاہیر عالم کی وفات اکثر غیر متوقع طور پر واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نسبت سے کہ ہم بھی اپنے رنگ کے ایک ہی مشاہیر ہیں، اس طرح وفات یاب ہوئے کہ ایک ایسی شب آدینہ میں جب کہ ہر کام کرنا ثواب سمجھا جاتا ہے، ہم ایک ایسی خرابات میں گئے جو عہد عالمگیری کی پرانی مسجد کے بالکل ہی زیر سایہ واقع ہوئی تھی۔ اس کے اندر چاروں اماموں کے مقلد اپنا اپنا مصلیٰ بچھائے مصروف درود وظیفہ تھے اور چانڈو، بھنگ، گانجا اور چرس اور ان میں سے کسی ایک سے بھی گریز و احتیاط نہ تھی۔ البتہ چند افیونی عقیدہ کے بزرگ بمقتضائے خودداری ان سب سے علاحدہ صف بستہ ایک دیوار کے سہارے بیٹھے یاد الٰہی میں جھوم رہے تھے۔ اتفاق کہیے کہ آج ہی اس محترم محفل کے داخلہ کی فیس ہمارے پاس نہ تھی۔ لہٰذا وقت داخلہ ایک ایسے پاسباں سے تصادم ہوا جس کے ہاتھ میں اکبر بادشاہ کے دیے ہوئے حقہ کی نے تھی، پس اس کا ہمارا معانقہ ہوتے ہی عالم زیر وزبر نظر آنے لگا۔ ہوتے ہوتے ہم سے قتل عمد کی واردات عمل میں آگئی۔ بس پھر کیا تھا۔ پولیس کے تمام عقیدت مند ہم سے بیعت کے لیے جمع ہو گئے اور ہم خوش خوش اور کشاں کشاں ایک ایسی سرائے میں ٹھہرائے گئے جہاں اکثر بے روزگار لوگ دنوں بلکہ چالان نہ ہو تو مہینوں ''پابدستِ دگرے دست بدستِ دگرے'' کی روٹیاں کھایا کرتے ہیں۔ اور اسی سرائے کا نام بعض بے وقوفوں نے حوالات رکھا ہے۔ اتفاق سے کوتوالِ شہر مجرموں سے بہ مراحم خسروانہ نذریں قبول فرمانے کے عادی واقع ہوئے تھے، لہٰذا اسی سلسلہ میں انھوں نے ہمیں فوراً ضمانت پر رہا کر دیا، لیکن حوالات کی صاف اور کھلی ہوئی آب و ہوا سے ہماری صحت خراب ہو گئی تھی اور ہم گھر آتے آتے علیل ہونا شروع ہو گئے۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی بڑے بڑے لارڈ اور گورنر جمع ہو گئے۔ تمام اہلِ محلّہ اور رشتہ دار سرہانے کھڑے ہو کر مسرت کے گیت گانے لگے یہاں تک کہ ہزار ہا ہندو اور انگریز ہمارے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور اسی حالت میں ہم اناللہ ہو کر رہ گئے۔

جنازہ:

ہمارے دشمنوں کی وفات پر تمام اخبارات نے سیاہ کالموں میں ایک ایک دو دو سطر میں تفصیلی حالات کے ساتھ اظہار افسوس کیا۔ کیونکہ کسی غریب مضمون نگار کے لیے اردو اخبارات اس سے زیادہ لکھتے بھی نہیں ہیں۔ لوگوں نے ہمیں ہار پہنائے اور تمام میونسپلٹیوں نے ایڈریس پیش کیے اور ہمارے پس ماندوں میں ہماری جائیداد تقسیم کرنے کی خوشیاں منائی گئیں۔ بڑے بڑے لارڈ جب ہماری نعتیں لے کر درۂ دانیال سے گزرے تو تمام جہازوں نے اپنے جھنڈے سرنگوں کر دیے۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے ہمیں اظہار تعزت کا منی آرڈر بھیجا۔ اب جو ہماری نعش وطن میں پہنچی تو سب سے پہلے اس امر پر جھگڑا ہوا کہ ہمیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ ہماری تمام عمر سی آئی ڈی کی ملازمت میں گزری تھی اور رات دن مسلمان لیڈروں کے گرفتار کرانے کی فکر میں رہتے تھے، لیکن وہ تو ہم نے زندگی ہی میں لکھ دیا تھا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو گورنمنٹ کی طرف ہمارا جنازہ رجوع کیا جائے۔ لہٰذا پولس نے مداخلت کر کے وفاداران سرکاری کے قبرستان میں ہمیں نہایت آب و تاب سے دفن کر دیا۔ جس وقت ہماری نعش قبر میں اتاری جارہی تھی اس وقت تمام شہر آراستہ کیا گیا تھا۔ دکانیں سجائی گئی تھیں۔ تمام بازاروں میں چہل پہل تھی۔ غرض ہماری وفات پر وہ خوشی منائی گئی جو شاید عرب میں ابوجہل کی موت پر بھی نہ منائی گئی ہوگی۔ بڑی خصوصیت ہمارے جنازہ کی یہ تھی کہ اس میں شریف مکہ اور مسٹر لائیڈ جارج ایسی مقبول عام ہستیاں بھی شریک تھیں۔ یہاں تک کہ ہمارا وہ مزار تیار ہو گیا جس پر "بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے" کا عظیم الشان کتبہ سرکاری مصارف سے لگایا گیا۔

"اب خدا ہماری عمر دراز کرے اور آپ لوگوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے"۔

نشان انگوٹھا

ملا رموزی بقلم خود

گواہ شد
نجو خاں ولد بدھو خاں تمباکو فروش

گواہ شد
لیفٹنٹ گورنر شام

◆◆◆

نکات

اردو اخبارات ورسائل میں دو قسم کے اشرف المخلوقات کام کرتے ہیں۔ایک ''مضمون نگار'' اور دوسرے ''ایڈیٹر'' مضمون نگار ایڈیٹروں سے تعداد میں زیادہ ہیں۔اور ان کی تعداد کا اضافہ خود ایڈیٹروں کی ''قدر دانی'' اور ''حوصلہ افزائی'' کا نتیجہ ہے۔جس نیم مشق مضمون نگار نے مضمون بھیجا اور ایڈیٹر صاحب نے شائع فرمادیا بس مضمون نگار صاحب کا حوصلہ بڑھا اور وہ اسی دن سے ''رقمطراز'' ہونے لگے۔لہٰذا یہ ایسی ہی فی سبیل اللہ مضمون نگاری تو ہے جس کے اندر معانی، مطالب، مقاصد، فوائد، معلومات اور تاثیر کی جگہ الفاظ، قافیے، محاورات اور مصطلحات اور سودیشی بندشوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور قارئین اور خریداروں کو بجائے فائدہ کے سالانہ چندہ کا غیر سرکاری لگان ادا کرنے کے عوض کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری قسم ایڈیٹروں کی ہے۔اس میں قسم اول کے ایڈیٹر وہ ہیں جو خود تو نرے ''ناتراش'' ہیں لیکن دوسرے اخبارات ورسائل سے مضامین کی ''نقل مطابق اصل'' والا معاملہ کر لینے میں کمال رکھتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ وہ ادنے سے ادنے مضمون نگاروں سے بڑے بڑے القاب اور خوشامد کے خطوط لکھ کر مضامین حاصل کرتے ہیں لیکن معاوضہ دینے میں ان کی حالت ہمیشہ سقیم

رہا کرتی ہے۔ایسے ایڈیٹروں کو"خوبصورت بلا" کہتے ہیں۔

دوسری قسم کے ایڈیٹروں میں وہ ایڈیٹر داخل ہیں جو دن رات کی محنت شاقہ ، مطالعہ اور ترجمہ کی مدد سے مہینہ بھر میں ایک آدھ اول جلول سا مضمون تیار کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ مضمون حاصل کرنے کے لیے مضمون نگاروں کو مفت پرچہ ارسال خدمت کرتے ہیں، مگر خط بہت کم لکھتے ہیں۔ گویا وہ بڑے ہی مستغنی المضامین ایڈیٹر ہیں۔ حالانکہ روزانہ مفت پرچہ حاضر فرمانا ان کی بیکسی کی دلیل ثابت ہے۔ایسے ایڈیٹروں کو"کالی بلا" کہتے ہیں۔

قسم آخر میں وہ ایڈیٹر داخل ہیں جو خود نہایت فاضل اور متبحر اور اعلیٰ انشا پرداز ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کمال قابلیت سے پورے پرچہ کو اپنے ہی قلم سے تیار کر سکتے ہیں۔ وہ تھرڈ کلاس مضمون نگاروں کے مضامین کو بڑی شرافت سے ردی کی ٹوکری میں دے مارتے ہیں، لیکن ایسے ایڈیٹروں سے کوئی کم نویس مگر اعلیٰ انشا پردازوں سے "معاوضہ" کا ایمان آزما مطالبہ کر کے پیچھا چھڑانا چاہے تو وہ ایسے مضمون نگاروں کی ماہانہ تنخواہ تک مقرر کر دینے کو تیار رہتے ہیں، اس لیے ایسے ایڈیٹروں کو"بلائے بے درماں" کہتے ہیں۔

پس رسالہ بیدار کے فاضل مدیر مولانا کوکب اور منصرم حضرت عبدالعزیز خاں صاحب بھی ایسے ہی ایڈیٹروں میں سے ایک ہیں۔ چنانچہ عرصہ سے ان کے ہمارے درمیان"بیدار" کے لیے مضمون نگاری پر"غیر خوں ریز جنگ" ہو رہی تھی اور ہم نے اپنے سیزدہ سالہ تجربات مضمون نگاری میں سے مضبوط سے مضبوط تجربہ صرف کر کے انھیں شکست دینا چاہا، مگر ایسے ایڈیٹروں کا "قدر دان" واقع ہونا ہی اس دن سے کسی طرح کم نہیں جس دن مولانا شوکت علی ایسے قصاب بھائی بھی روئی اور کپاس کی طرح اُڑتے پھریں گے اور آفتاب سوانیزے کے برابر آجائے گا۔

لہٰذا انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر فرانس پر نپولین اعظم اور قسطنطنیہ پر مصطفیٰ کمال پاشا کا غلبہ محض"ہمت" کا ثمرہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جوالاپور کے مولانا کوکب بھوپال کے ملا رموزی پر

مضمون حاصل کرنے کے معاملہ میں فتح حاصل نہ کرلیں، پس ہم پوری ندامت سے اقرار کرتے ہیں کہ ہمارے مقابلہ میں مولانا کوکب مدیر رسالہ ''بیدار'' کو کامل فتح حاصل ہوئی اور انھوں نے ہم سے رسالہ ''بیدار'' کی ہر اشاعت کے لیے ایک عدد مضمون لکھوانے کے لیے قبالہ تک لکھوالیا۔ اس لیے ہم بہ ثبات عقل و ہوش لکھے دیتے ہیں کہ مجلّہ ''بیدار'' میں ہم بلا جبر و اکرام و بلا مشارکت غیرے واحدے ہر اشاعت میں ایک سے لے کر دو مضمون تک لکھا کریں گے۔

بہرۂ نکات یا نکات کے عنوان سے جو کچھ لکھا جائے گا، اس کا پہلا مقصد تو یہ ہوگا کہ رسالہ ''بیدار'' کے پڑھنے والوں میں جو حضرات ہنسی، مذاق، تفنن، خوشدلی کی نعمت سے ابداً محروم رہتے ہیں یا اس لطافت انگیز جوہر کو ''لغویت'' کہہ کر دن رات ڈپٹی کلکٹرانہ انداز میں مکے شریف کی خشک کھجور بنے بیٹھے رہتے ہیں یا بلغمی جسم اور موٹاپے کی وجہ سے جن کے دماغوں سے تفریح و ظرافت کی تازگی ضائع ہوچکی ہے اور دن بھر اپنی دکانوں، دفتروں، بنگلوں اور کوٹھیوں میں ''ڈنلپ ٹائر'' کی طرح پھولے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں انھیں گدگدایا جائے اور بتلایا جائے کہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لحہ روحانی بنے رہنا ہی متانت نہیں بلکہ کسی وقت مسکرا دینا، کھلکھلانا یا قہقہہ لگانا بھی طبی اصول سے مفید صحت ہے بلکہ شریعت غرائے اسلامیہ میں بھی مزاح وظرافت کوئی فعل حرام نہیں۔ اسی طرح فن انشا و انشا میں ہر تحریر و تقریر کے بیچوں بیچ بقدر ضرورت ظرافت کا پیدا کرنا شرط لازم ہے۔ پس ان حالات میں آپ اگر دن بھر استغفر اللہ اور لاحول ولا ہی بنے رہے اور ہر مخاطب کے سامنے اپنے چہرہ کو مدقوق اور بشرہ کو کوفتہ بخنہ بنائے رہے تو یہ آپ کی ''متانت و سنجیدگی''، بردباری و تہذیب نہیں۔ اچھی خاصی مردہ دلی، خشکی، بے مروتی بلکہ کمبختی ہوگی۔

دوسرا مقصد اس عنوان سے یہ ہوگا کہ آپ کو ہنسی ہنسی میں سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و قومیت کے وہ باریک نکتے سمجھا دیے جائیں جس کا تعلق آپ کی روز مرہ زندگی سے ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں بعض نکتے ایسے بھی ملیں گے، جن کے اندر مذاق اور دل لگی کے علاوہ انتہائی متانت و سنجیدگی اختیار کی جائے گی۔ کیونکہ بعض مواقع پر نری ظرافت بھی

خطاب و بیان کی تاثیر و اہمیت کو کم کر دیتی ہے۔ مگر ایسے سنجیدہ نکات پر آپ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ نکات کا لکھنے والا ملا رموزی بھی کسی مہاجن کی باسی کڑھی بن گیا ہے، جس میں کوئی چھپٹا اُبال ہی نہیں آتا بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ ہماری ظرافت کی ایک ایک سطر میں بھی کام کی باتوں کو تلاش کرتے رہے وہ ملیں گی اور بکثرت ملیں گی انشاءاللہ۔

کہتے ہیں کالے منہ کا کوا جب حسین جمیل ہنس کی چال کی نقل کرتا ہے تو وہ اپنی چال بھی بھول جاتا ہے ٹھیک یہی حالت اور مثال اُن بے چارے ہندوؤں کی ہے جو 1926 میں مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ ''تبلیغ اسلام'' کی نقل ''شدھی'' کے ذریعہ اتارنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ تحریک شدھی کے سلسلہ میں آج لکھے پڑھے ہندوؤں کو جن طفلانہ حرکات میں مبتلا دیکھا جاتا ہے ان پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔ مثلاً ان لوگوں میں ایک طبقہ ہے جو خدا اور صرف خدا کو پوجنے والے مسلمانوں کو گائے، بھینس، پتھر، پیپل اور مہاتما نام کے انسانوں کے سامنے سر جھکانے کی دعوت دیتا ہے اور اس کو خلاصہ دھرم کہتا ہے۔ یا بالفاظ صاف مسلمانوں کو ہندو بنانے کی فکر میں علم و عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتا ہے اور یہی وہ طائفہ ہے جو کہتا ہے کہ مسلمانانِ ہند از روئے تاریخ ہندو ہیں۔

اب 99 فیصدی ہندوؤں کی اس تاریخ دانی اور تاریخ آگہی کا اندازہ تو اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ہر لکھا پڑھا ہندو لفظ ''تاریخ'' کو ہمیشہ بمعنی واحد تواریخ لکھتا اور بولتا ہے۔ پھر اس تواریخ سے جہاں اور حماقت آفریں واقعات گھڑے جاتے ہیں ان ہندوؤں کی یہ تاویل تو بے انتہا مضحکہ خیز ہے کہ وہ مسلمانوں کے جاہل طبقوں خصوصاً قصاب اور جُلاہوں کے ایسے ناموں کو جو یا تو ان کی عرفیت یا لاڈ پیار کے نام ہیں ہندوانہ نام ثابت کر کے انھیں ہندو ہو جانے کی ترغیب دیتے ہیں اور بھولے یا جاہل مسلمان ان کی دلیل سے مرعوب ہو کر ہندو ہو جاتے ہیں۔ یا کم از کم ان کے دل میں اپنے ہندو ہونے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔

عموماً قصاب بھائیوں میں جو نام رکھے جاتے ہیں، وہ شیخ بدھو، شیخ نجو، جو، کمو، سدھو، ننھا

اور بدھاوغیرہ قسم کے ہوتے ہیں۔ عام لوگ تو ان کے نام کسی بامعنی نام کا مخفف سمجھتے ہیں مثلاً نجو مخفف ہے نجابت محمد خاں کا یا بدھا مخفف ہے بہادر خاں کا (علی بہادر خاں ایڈیٹر خلافت نہ گھبرائیں)، لیکن ہندوان ناموں کو بھی شدھ فرماتے ہیں کہ اول تو اس نام والے کو وہ ایک تاریخی گمراول جلول سا لیکچر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دیکھو تم اور تمھارے باپ دادا سب ہندو تھے، مگر مسلمان جو عرب سے آئے تھے نہایت ظالم تھے انھوں نے یہاں کے ہندوؤں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنالیا۔ اس پر اگر کوئی مسلمان ''اجو'' ان سے ثبوت طلب کرتا ہے تو وہ اکڑ کر فرمادیتے ہیں کہ دیکھو تمھارا نام ہی اس کا ثبوت ہے کہ تم پہلے ہندو تھے اور وہ اس طرح کہ تمھارا اصل نام ''اجودھیا پرشاد'' تھا کثرتِ استعمال سے ''اجو'' رہ گیا۔ بس اب تو اجو خاں کے ہوش جاتے رہے اور جہالت کی وجہ سے وہ کوئی جواب نہ دے سکے اور آہستہ سے شدھ ہو کر رہ گئے۔

جماعت قصاب خصوصیت سے اس مرض میں مبتلا ہے اور محض تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے 95 فیصدی قصاب کے نام ایسے ہی چنو، بدھو ہوا کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی ایسے ناموں کا تذکرہ سنا ہوگا اور اسی لیے شریعتِ مطہرہ اسلامیہ نے مسلمانوں کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنے ناموں کو جب اور جس وقت چاہیں بدل سکتے ہیں۔ لہٰذا ہر پڑھے لکھے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قصاب بھائیوں کو خصوصاً اور محلے کے جاہل مسلمانوں کو عموماً ایسے ناموں کی تبدیلی پر آمادہ کر کے ان کے نام خالص اسلامی طرز و معنی کے رکھیں۔

بعض ناموں میں یہ مزہ آتا ہے کہ نام تو نہایت بامعنی اور خالص اسلامی ہوتا ہے۔ لیکن ان کی عُرفیت اس قدر بعید الفہم اور غیر مناسب ہوتی ہے کہ اس سے اصل نام کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ مثلاً ہمارے دو عزیز مسلمان بھائیوں کے نام ''فتو'' اور ''نتھا'' تھا۔ جب ہم نے ان سے اصل نام دریافت کیے تو فتو نے اپنا نام بتلایا فتح محمد جو عرفیت سے خاص مناسبت رکھتا ہے لیکن جب نتھا نے اپنا نام حبیب اللہ خاں بتلایا تو اس اَنمل بے جوڑ عرفیت پر ہم کچھ دیر سر جھکائے جل جلالہ پڑھتے رہے۔ بارے حبیب اللہ خاں نے ہمارے سمجھانے پر اس عرفیت کی خریت کو سمجھ کر عہد کیا کہ وہ

آئندہ نہ تو خود اس عرفیت کو استعمال کرے گا اور نہ دوسرے کو اس عرفیت سے پکارنے دے گا۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں سے استدعا ہے کہ وہ ایسے مسلمانوں کے ناموں کی اصلاح کریں اور اگر رکھنا محض نام کی طوالت کو کم کرنے کی غرض سے ضروری ہو تو اسے بھی اسلامی طرز پر رکھیے۔ مثلاً احمد، محمد، علی حسن، عمر اور عثمان سے زیادہ مختصر عرفیت اور کیا ہو سکتی ہے۔

◆◆◆

نکات

غریب آدمی کے لیے یوں تو ہر دن منحوس ہی ہوا کرتا ہے لیکن دنیائے ادب وظرافت میں یکم مئی کا دن بے انتہا منحوس تھا۔ جب کہ ادارہ ''زمیندار'' سے سالک ایسا بلند پایہ ظریف اور خوش طبع ادیب چھ مہینے کی رخصت لے کر نہایت لیاقت سے یہ شعر پڑھتا ہوا بیڈن روڈ محلہ شاہ کنٹھ لاہور کے سراپا میں غائب ہو گیا کہ:

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ناظرین ''زمیندار'' کی انتہائی بدمذاقی اور ناقدردانی سمجھی جائے گی اگر حضرت سالک کی پنج سالہ خدمات کی منت گزاری میں ان کے لیے کچھ بھی نہ کہا جائے۔ لہٰذا ہم ناظرین ''زمیندار'' کے پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے کہتے ہیں کہ بھائی سالک تم نے اپنی دماغی اور فکری قوتوں کو ملک وقوم کی اصلاح ورہنمائی میں نہایت خوش اسلوبی، سلیقے اور بے باکی سے صرف کیا۔ تم نے صحافت اردو میں ''افکار وحوادث'' کے ظریف کالم کو قائم کر کے تمام اخبارات کے ناظرین کے منہ کا مزہ بدل دیا اور اب وہ ایڈیٹر بھی خواہ مخواہ ظریف بن رہے ہیں جن کی صرف صورت دیکھنے سے آدمی گھنٹوں روتا ہے۔

بھائی سالک! تمھاری یہ کوشش یادگار زمانہ رہے گی کہ تم نے اسلام کے بکھرے ہوئے اوراق کی شیرازہ بندی یعنی نقشبندیوں، مجددیوں، چشتیوں، قادریوں، نظامیوں، احمدیوں، وہابیوں، حنفیوں، دیوبندیوں اور علی گڑھیوں کی ایک مشترکہ اور متحدہ کمپنی لمیٹڈ آف انڈیا بینک میں اپنی بہترین قوتیں صرف کیں اور تم نے پیر پرستوں، قبر پرستوں، دیداریوں، فجندیوں، رضائیوں، چھوٹانیوں، زانی مجذبوں، شراب خور رندوں، حلوہ مانڈا کھانے والے اماموں، فتویٰ نگار ملّانوں اور جرائم پیشہ قلندروں کی خوب خوب قلعی کھولی اور ان کے مکر سے خدا کے ہزاروں بندوں اور بندیوں کو بچایا۔

تمھارے حکمت نگار قلم کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ تم نے زبانِ اردو کے اس ستون کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی جسے آج تک صرف لکھنؤ اور دہلی کے خاص الخاص اہلِ زبان تعمیر کرتے چلے آئے تھے۔ تم نے کہہ دیا کہ بس بھائی منظرِ عام پر وہی شاعر اور اہلِ قلم آ سکتا ہے جو زبان و عروض، ذوقِ سلیم، ملت عالیہ اسلامیہ کے درد اور علوم و معارف کا سرمایہ دار خصوصی ہو یہ نہیں کہ ایسے بے تکی سی عبارت کے قافیہ جوڑ دیے اور بن بیٹھے فصیح الملک مرزا داغ دہلوی۔

زبان وادب کے متعلق تمھارا یہ کارنامہ بھی کچھ کم قابلِ تعریف نہیں کہ تم نے عملاً بتادیا کہ لکھنؤ اور دہلی کے زبان دان تو اب ہو چکے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین لہٰذا اب زبان کو اتنی وسعت دو کہ یہ میٹھی زبان دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک جس کا جی چاہے سمجھ لے اور طریق یہ اختیار کیا کہ بس لکھ مارا وہی فقرہ جو عوام میں بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ناک پر انگلی رکھ کر جو کہا ''اوئی بہن'' تو ہوگئی بیگمات کی زبان اور ٹکسالی اور جو کہا ''ابے جاتس سے ہوتا ہی کیا ہے'' تو کانوں میں انگلیاں دے کر اُف کہا اور بیٹھ گئے کمر پکڑ کر کہ حضرت کس قدر ثقیل لفظ استعمال کیا۔

تمھارا نہایت متین اور سنجیدہ کارنامہ یہ بھی ہے کہ تم نے ''زمیندار'' کے اڈیٹوریل مضامین کے ذریعہ بھی ملک وقوم کی کافی خدمت کی۔ خلافت کمیٹی جمعیۃ العلما، تنظیم وتبلیغ، سوراج، شدھی و

سٹگھن ابن سعود و دیدار اینڈ کو، اور لارڈ ریڈنگ اور نظام حیدرآباد سے لے کر لائڈ جارج اور سر مائیکل اوڈوائر تک پر خوب ہی لکھا اور یقیناً تمھارے دل میں یہ حسرت ہی رہی ہوگی کہ ان مضامین کے صلہ میں گورنمنٹ نے تمھارے ساتھ کیوں نہیں "بعنو ر دریائے شور" والا معاملہ کیا؟ کیونکہ تم ایسے حوصلہ مند نوجوان کا ایک سال میں ہوتا ہی کیا ہے؟ کیوں ہے نہ ٹھیک۔

پس ان خدمات کے صلہ میں ہم ناظرین "زمیندار" کی بلا رضا مندی اور بلا اتفاق رائے تمھاری خدمت میں ہدیۂ شکر پیش کر کے تمھارے شہرۂ آفاق حلم وتحمل سے توقع کرتے ہیں کہ ہمارے اس شکریہ سے تمھارے اندر کوئی غرور پیدا نہ ہوگا اور دعا کرتے ہیں کہ خدا تم کو ان چھ مہینوں کے اندر اتنا تندرست اور توانا کردے کہ بلا سواری دفتر "زمیندار" تک نہ آسکو۔ آخر میں گزارش ہے کہ اگر واقعی تم بغرض حصول راحت و بقائے صحت چھٹی پر گئے ہو تو خدا کے لیے یہ "محلہ شاہ کلنٹھ" ایسے ثقیل نام کے محلّہ کو چھوڑ دو جو تم ایسے ادیب کے لیے صریح توہین ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

چھٹی چھ ماہ کی مبارک ہو
بہ سلامت روی و باز آئی

ادارہ "زمیندار" یا بزم "افکار وحوادث" سے سالک صاحب کے اٹھ جانے کے بعد ان کے جانشین نے یہ جو کہا تھا:

"اس غیر حاضری کے زمانہ میں الوان نعمت کے چٹخاروں بھرے خون کی جگہ اُبلی کھچڑی اور بے مرچ کا سالن ہی کھانا پڑے گا"۔

تو اس سے دو نکتے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سالک صاحب ایڈیٹر کا ہے کو تھے اچھے خاصے رکاب دار تھے جن کا کام ہی سموسہ کھلانا تھا۔ اور ان کے قائم مقام حکیم اجمل خاں اپنے مریضوں کو بے مرچ کا سالن دیا کریں گے۔

دوسرے یہ کہ سالک صاحب کی ششماہہ علاحدگی سے "افکار وحوادث" کا خوان تفنن بے

نمک ہو جائے گا اور ''زمیندار'' کے 95 فیصدی ناظرین کے لیے اس میں کوئی لطف نہ رہے گا حالانکہ ''افکار و حوادث'' کی شگفتہ بیانی قائم رکھنے کے لیے تنہا قبلہ مولانا ظفر علی خاں صاحب کا گل بار و گل فشاں قلم ہی کافی ہے، جس کے لیے مدت سے آنکھیں ترس رہی تھیں پھر ''زمیندار'' کے سرورق والے مولوی باہتمام لال شاہ ایڈیٹر، و پرنٹر و پبلشر، جو ''زمیندار'' کو منصور پریس میں روزانہ چھاپ کر دفتر ''زمیندار'' سے شائع کر دیتے ہیں۔ اگر ظرافت پر اتر آئے تو مارے ہنسی کے آپ لاحول ولا نہ ہو جائیں تو آپ کا ذمہ۔

لیکن اس معاملہ میں ہمارا تجربہ ہے کہ انسان کی ہر حرکت اس کی قوت خیال اور عقیدت کے تابع ہوا کرتی ہے۔ مثلاً آپ اگر رات کو یہ قصہ سن لیں کہ قادیان شریف میں جن اور بھوت بکثرت رہتے ہیں تو آپ کو اس خواب میں قادیان کے بزرگ سے بزرگ احمدی بھی بھوت پریت بن کر ہی نظر آئیں گے۔ اسی طرح اگر آپ سے کہہ دیا جائے کہ مسجد وزیر خاں میں تہجد کے وقت منبر پر ایک عدد کالا دیو آ کر بیٹھ جاتا ہے تو آپ کو خواب میں صاف نظر آئے گا کہ منبر پر کالا دیو ہی بیٹھا ہے چاہے وہ قبلہ دیدار علی ہی کیوں نہ ہوں۔

پس واہمہ اخلاق کے اسی سہارے سے اس عقیدہ پر جم جائے کہ ''افکار و حوادث'' کا ایک ایک لفظ سالک صاحب کے ہی قلم سے ٹپک رہا ہے جو روتوں کو بھی ہنسا سکتا ہے لیکن اگر متخیلہ صاف جواب دے دے تو پھر وضعداری قائم رکھنے کے لیے چھ مہینے تک یہی کہیے کہ ''افکار و حوادث'' کی ایک ایک سطر پر بلاضرورت ہنستے رہیے۔

اس وضعداری کی شان برقرار رکھنے کے لیے ہم نے یہ تدبیر سوچی ہے کہ ''افکار و حوادث'' کے کالم میں خود ہی کبھی لکھ لیا اور خود ہی ہنس دیے۔ اس میں دوسروں کی محتاجی ہی نہیں۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی کریں گے کہ اب مسلمانوں کی زندگی کے وہ حصے نمایاں کریں گے جنھیں سالک صاحب مصروفیت کی وجہ سے اور قبلہ مولانا ظفر علی خاں متانت کی وجہ سے ہاتھ نہ لگا سکے۔ یا جس پر

سالک صاحب نے حال ہی میں قلم تو اٹھایا لیکن کثرت کار کی وجہ سے تمام نہ کر سکے۔ مثلاً ان تعویذ گنڈے والے عالموں نے نجوم اور رمل کے ذریعہ سے ظالم حاکم بدھو چپراسی اور ضدی معشوق کو عاشق دلگیر کا بندۂ فرمان بنا بنا کر پچانوے فیصدی مسلمانوں کی عقلوں پر جو پٹیاں باندھ رکھی ہیں ان کی دھجیاں اڑائی جائیں اور عقل کے اندھے گانٹھ کے پورے مسلمانوں کو بتایا جائے کہ اڑھائی روپیہ کا منی آرڈر بھیج کر نہ معشوق تابع ہوگا نہ لارڈ ریڈنگ بلکہ ان کے تابع کائنات عالم کے ذرّہ ذرّہ ہو سکتا ہے لیکن صرف اسی شریعت مطہرہ کی پابندی سے جس کے حامل محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ بآبائنا ھو و امھاتنا۔

اس کے بعد ایک اور علت ہے جس نے بعض اسلامی کج کلاہوں اور بعض اسلامی درسگاہوں کو لوط علیہ السلام کی امت بنا رکھا ہے۔ ابن سعود کے قہرمانی ہاتھ نے ملک الحجاز علی ابن حسین کو تو اس علت میں جدہ سے نکال باہر کیا، لیکن ہندستان جہاں تلوار کا کام صرف قلم ہی سے لیا جاسکتا ہے ابھی تک اس مصیبت سے نجات نہیں پاسکا۔ پس اگر اس موضوع پر جرأت سے قلم نہ اٹھایا گیا تو وہ دن دور نہیں کہ مسلمان نوجوان شادی کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگیں اور اسلامی تعلیم گاہوں کے بورڈنگ ہاؤسوں میں فنِ لوطیالوجی کا آموختہ دہرایا جایا کرے گا۔ آئندہ ایسے طلبا کے ان تاریک حالات کو کھلم کھلا پیش کرنے میں اگر چند مقدس بزروں کا پول بھی کھل جائے تو رامپوری ذوق کے حضرات کو گھبرانا نہ چاہیے۔

اللہ کے بندے ملا رموزی کی طرف سے حضرت سالک سلام مسنون قبول کر کے معلوم کریں کہ جب ''زمیندار'' کے افکار و حوادث کو چھوڑ کر اپنے افکار و حوادث کا علاج کرانے گئے تھے، اس وقت ہم تھے اور صرف ہم تھے کہ قوم کی طرف سے بلا جبر و اکراہ اور بہ ثبات عقل و ہوش آپ کی گزری ہوئی خدمات کو یاد کر کے آنکھوں میں آنسو بھر لائے تھے اور انھیں افکار و حوادث کے ذریعہ سوائے قبلہ مولانا ظفر علی خاں مدظلہٗ کے تمام قوم کو تمھاری یاد میں رلایا تھا۔ مگر ایک آپ ہیں اور صرف آپ ہیں کہ اب تک ہمارا شکریہ تک...

بھائی سالک!

آپ کے جانے کے بعد تمام لوگوں کی آنکھوں میں دنیا سیاہ ہوگئی تھی لیکن آج جب کہ خدائے رحیم ورحمان نے اپنے رسول معلیٰ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی دعاؤں سے آپ کو تندرست کر کے پھر "زمیندار" میں بھیج دیا تو ہم ہیں اور صرف ہم ہیں کہ آپ کی اس "افکار و حوادث نشینی" کی تقریب میں ساری زمیندار برادری کی طرف سے آپ کو خالص دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ گو ہم قوم کے زمیندار نہیں اب یہ اور بات ہے کہ اس چھٹی کے زمانے میں بعض لوگوں نے آپ کی طرف سے بدگمانی کا اظہار کیا پھر بھی اتنا بتلائے دیتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ کہا کہ اب سالک صاحب زمیندار میں نہ آئیں گے اور وہ افغانستان جائیں گے یا لارڈ ریڈنگ کی جگہ کام کریں گے تو ایسا خیال کرنے والے ہوں گے قوم کے رام پرشاد۔ ہمارے حلقے میں تو ایسا کوئی نہیں جو آپ سے آج تک بدظن یا نیک ظن ہو۔

البتہ ہم اور ہمارے حلقے کے تمام سنجیدہ اور بالغ نظر لوگ اصولاً یہ تسلیم کر چکے تھے کہ آپ "صحت بحال" کرنے کے لیے دن بھر چارپائی پر لیٹے رہتے ہوں گے اور آپ کے طبی مشیر آپ کو روزانہ گل بنفشہ، تخم خطمی، عناب، گاؤزبان کوفتہ بیختہ جوش دادہ ہمراہ شربت سکنجبین نبوشند، لکھ دیتے ہوں گے اور جب آپ "بھوک" کی شکایت کرتے ہوں گے اور جس وقت آپ کو یہ حکیم لوگ براہِ خسروانہ کھچڑی، مونگ کی دال اور دلیا بتلاتے ہوں گے تو آپ کو اپنی زندگی کی طرف سے بے حد مایوسی ہوتی ہوگی؟ اور گو آپ پیروں فقیروں کے مخالف رہے ہیں، لیکن ان چار مہینوں میں بغرض حصولِ صحت وتوانائی آپ نے دم کیے ہوئے پانی، نقشِ سلیمانی اور پڑھے ہوئے لوبان کی دھونی ضرور لی ہوگی۔ اب یہ اور بات ہے کہ آپ ان باتوں کا اقرار نہ کریں مگر علالت اور چھٹی سے دفتر زمیندار تک یہ ڈیڑھ ماہ پیشگی جست کی بھی ایک ہی رہی۔

آپ نے آنے کے بعد بحمد للہ کہ افکار وحوادث کو اسی اندازِ خاص سے شروع کر دیا ہے جو

صرف آپ کے اور ہمارے لیے مخصوص عطیہ فطرت ہے، لیکن ابھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس مرتبہ آپ کس طبقے، کس جماعت، کس جمعیۃ، کس موتمر اور کس معتبر حاجی پر لکھیں گے اور چونکہ چھٹی کے زمانہ میں آپ رات دن سیر تماشے میں مصروف رہتے ہوں گے اس لیے آپ نے اخبارات کو ہاتھ تک نہ لگایا ہوگا۔ اس لیے آپ قوم کی موجودہ ضروریات اور انقلابات سے اتنے ہی بے خبر ہوں گے جتنے اسلامیہ کالجوں کے طلبا ''دینیات'' سے ہوتے ہیں، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ آپ کو قوم اور ضروریاتِ قوم کا موجودہ حال بتلادیں۔

آپ کے جانے کے بعد یہ ہوا کہ جناب حج ہوا اور حج کے زمانے میں جناب یہ ہوا کہ موتمر مکہ کا اجلاس ہوا اور جناب اس اجلاس میں یہ ہوا کہ حجاز ملک خدا کا اور حکم وفد خلافت ہند کا لہٰذا وفد نے حکم دیا کہ سلطان ابن سعود کو چاہیے اور لا جرم چاہیے کہ وہ اندر ایک ہفتہ کے حجاز کو خالی کردیں تا کہ حجاز میں خلافتِ راشدہ کے نمونے کی جمہوریت قائم ہوجائے۔ اتفاق سے ایک طرف مولانا ثناءاللہ امرتسری بھی بیٹھے ہوئے تھے کمبل پھینک کر بول ہی تو اٹھے اور فرمایا کہ:

> ''کیا حجاز میں خلافتِ راشدہ کے نمونے کی حکومت وہی مسلمانانِ ہند قائم کرانا چاہتے ہیں جن کے 95 فیصدی اعمال حیات اسلامی زندگی اور اسلامی تعلیمات سے اتنے ہی دور ہیں جتنا آج سے خود خلافتِ راشدہ کا زمانہ''۔

بس جناب مولانا کا یہ فرمانا تھا کہ عالم اسلام کے تمام نمائندوں نے تالیاں بجادیں اور وفد خلافت نے کہا کہ بہتر ہے مولانا مگر ذرا ہندستان چلیے تو پھر بتلادیں گے۔ لہٰذا یہ حضرات جو واپس آئے ہیں تو ایک دوسرے کے خلاف ہی نہیں بلکہ مسلمانانِ عالم کی بین الاقوامی زندگی اور اعتقادات پر وہ ''فساد بدوش اور لڑائی در بر'' مضامین اور تقریریں شائع فرمارہے ہیں کہ والحفیظ۔ یہ ''فساد بدوش اور لڑائی در بر'' کی ترکیبیں صحیح ہیں۔ پوچھ لو ایڈیٹر صاحب رسالہ پیمانہ کچی دروازہ لاہور سے۔

آپ کے جانے کے بعد باہتمام لال شاہ ایڈیٹر و پرنٹر زمیندار پر فحش اشتہار کا مقدمہ چلایا گیا اور بے چارے ممدوح مارے عدالتی وارنٹوں کے دہ ہو گئے۔ حالانکہ ایڈیٹر اور اشتہار سے وہی علاقہ ہے جو حضرت موسیٰ کی تحریر سے حضرت عیسیٰ کو۔ مگر جب:

بات پر واں زباں کٹتی ہے

تو بھائی اس مرتبہ یہ کرو کہ اپنے ادبی انتقاد میں جہاں غلط گو شاعروں کی حجامت بناؤ، وہاں عام اشتہاروں، ان کی غلط سلط سرخیوں، عنوانوں، عبارتوں اور جملوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیا کرو۔ کیونکہ آخر اشتہاری تحریر بھی داخلِ فن انشاء ہے۔

آپ نے علالت کے زمانہ میں حکیموں کے مطب میں ایسی مینڈکیاں دیکھی ہوں گی جو زکام کا نسخہ لکھوانے آئی ہوں گی، لیکن کہیں نہ سنا ہوگا کہ ہمارے ملک کی ''جنتریوں'' کو بھی زکام ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سال سلطان غازی پادشاہِ اسلام حضرت ابن سعود کے مخالف اخباروں کے ساتھ ایسی سالانہ جنتریاں بھی شائع ہوئی تھیں جنھوں نے حضرت غازی پادشاہ ممدوح کے برخلاف خرافیات کا ایک نفرت انگیز ذخیرہ جمع کر کے اپنے ناظرین میں پادشاہ ممدوح کی توقیر دینی اور اسلامی و سیاسی عظمت و برتری کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا چاہیے اور ضرور چاہیے کہ آپ اپنے ادبی انتقادان میں مساتوں کو شامل کر لیں۔

◆◆◆

لقمے

کون وہابی چاہتا ہے کہ بارش کا فردوس آفریں موسم نہ آئے؟ کون نجدی چاہتا ہے کہ بارش کی جھڑیاں نہ لگیں؟ کون قبہ شکن چاہتا ہے کہ بارش سے دلفریب اور عالم آرا مناظر پیدا نہ ہوں؟ کون اہلِ سنت والجماعت چاہتا ہے کہ بارش کے فیض وفیضان سے دودھ سے زیادہ سفید و شہد سے زیادہ میٹھے چشمے اور آبشاریں جاری نہ ہوں؟ کون حنفی چاہتا ہے کہ بارش کی جاں بخش و جاں نواز ٹھنڈی ہوائیں نہ چلیں؟ لیکن از برائے خدا ایک خدام الحرمین، یا ایک ہی مولانا محمد علی و شوکت علی یہ ثابت کر دیں کہ دس سے پندرہ روپیہ ماہوار آمدنی والے مسلمانوں کے لیے اس موسلادھار بارش کی کیا ضرورت ہے۔ خصوصاً جن کے جھونپڑوں پر بجائے فولادی چادروں کے مٹی کے کھپرے ہوں یا جن کی کچ مچ دیواروں کا بمقدار پچاس ٹن نجد کی چند کھجوروں کے ناتراشیدہ ستون پر دھرا ہوا ہو ان کے لیے اس بارانِ بے حساب سے کیا فائدہ۔

---

20 اگست کو عزیز مکرم مولوی حسین میر صاحب کا فتویٰ نما خط ملا کہ ''ضیافت رنج'' کے لیے کچھ لکھو ورنہ اپنے وہابی ہونے کا اقرار کرو''۔ قلم دوات کے پاس جا کر بیٹھے تو خیال آیا کہ موجودہ صحیح حالت کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیں تو ان لوگوں کے نزدیک ہمارا کیا وقار رہ جائے گا جو آج ہم کو

ہز ہائی نس اور اعلیٰ حضرت سمجھے بیٹھے ہیں؟ لیکن اس کو بھی وہابیت کے خلاف سمجھا کہ حق کو چھپائیں۔ قلم اٹھاتے ہی پورے جلال اور دبدبے سے ایک چھینک آئی تو یاد آیا کہ آج زکام بھی ہے۔ دماغ کے ساتھ ناک بھی خاصا پرنالہ بن چکی ہے۔ جانے بھی دو۔ سوجاؤ کہ آسمان پر قراقر شروع ہوا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے چلے تو دماغ مچلنے لگا۔ بل بے مرض لکھو۔

زکام اور شدید بارش کی حالت میں قلم اٹھایا تو مارے تحریک کے سر جھکانا محال۔ نزلہ کہتا تھا کہ مجھے آج ہی بہہ جانے دیجیے۔ تنگ آکر ترکیب یہ کی کہ سر کو پشت کی طرف جھکا کر پورے غصہ کے ساتھ اس مادۂ رقیق کے تین چار کش اوپر کی طرف جو لیے تو تمام نزلہ دماغ کے بالائی حصہ میں سمٹ گیا۔ اور ہم نے پوری تیزی سے قلم چلانا شروع کر دیا لیکن اس گھبراہٹ میں لالٹین کی بتی بیحد تیز ہو گئی تھی جو اسے کم کرنا بھول گئے تو تھوڑی ہی دیر میں دھوئیں کی کافی مقدار دماغ میں داخل ہو گئی اور اس نے زکام شدہ دماغ کے بحر منجمد شمالی کو پھر پگھلا دیا۔ لہٰذا یہ رشحات دماغی صفحہ مضمون پر بوندیں بن کر ٹپکے تو یقین آیا کہ بارش اب شروع ہوئی۔

غلط ہے کہ ہمارے مکان میں پختہ دیواروں کے متعدد کمرے ہیں بلکہ ایک کچے مکان میں تین دالان ہیں ایک میں سامان ایک میں ''باورچی خانہ'' ایک میں ہم سب۔ جھوٹ ہے کہ ہم نہایت پرفضا نہایت پرسکون جگہ پر بیٹھ کر مضمون لکھتے ہیں۔ بلکہ اسی ''ہم سب'' والے دالان کے ایک گوشے میں ایک حجامت بنی ہوئی میز پڑی ہے، اس پر رات کو وہ ایک پنسل اور کاغذ رکھ دیتی ہیں۔ پھر جب اہل وعیال پر نیند تو کیا بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے تو ہم رقمطراز ہوتے ہیں۔ بہتان ہے کہ ہمیں نظام حیدرآباد سے کافی وظیفۂ علمی ملتا ہے اور ہم دن کی نور بخش روشنی میں اطمینان سے مضامین سوچتے ہیں بلکہ تمام دن نوکری چاکری والا معاملہ کر کے جب رات کو خاصے ''اسپ تازہ شدہ مجروح'' ہو جاتے ہیں تو مضامین میں سر کھپاتے ہیں۔ پھر ایسے مضامین کو بھی جو ایڈیٹر بجائے نقد کے ''برائے مہربانی'' طلب کرے اس کے لیے دعا دل سے نکلتی ہے اُسے آپ ہی سمجھ لیجیے۔

بارش کا زور بڑھنے لگا۔ مرطوب ہوا سے کاغذ اخاصا واٹر پروف بن گیا تو لالٹین پر رکھ کر خشک اور جلد جلد قلم چلانا شروع کر دیا لیکن کاغذ کوار مان تھا کہ میں آج ''ریشمی رومال'' ہی بن کر رہوں گا۔ پھر پاپڑ بن گیا۔ کاغذ کی اس نمی اور تری سے روشنائی بجائے حروف والفاظ کے بہزاد و مانی کے پھیلے ہوئے نقش ونگار بنانے لگی۔ اب اس حالت میں تھا نہ بیکار ہمارا لکھنا؟ لہٰذا اس کاغذ کو پھاڑ کر پھینک دیا اور لگے دوسرا کاغذ لالٹین پر خشک کرنے۔

اس دوسرے کاغذ پر دو ہی سطریں لکھی تھیں کہ جنوبی حصۂ مکان سے ایک زور کا دھما کا ہوا، مگر ہم فوراً سمجھ گئے اور صرف انا اللہ کہہ کر لکھنے میں برابر مصروف رہے مگر برابر کے بچھے ہوئے پلنگوں سے آواز آئی کہ خیر تو ہے۔ یہ کیا ہوا؟ ہم نے اطمینان سے کہہ دیا کہ ہوا کیا وہی کھڑکی والی دیوار گر گئی۔ یہ کہہ کر پھر لکھنے لگے تو جھنجھلا کر بولیں کہ یہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اب تو ہم سمجھ گئے کہ اگر ''جواب الجواب'' دیتے ہیں تو ابھی ابھی مذاکرۂ علیہ بپا ہو جائے گا لہٰذا خاموش۔

پانی نے اور زور پکڑا اور ساتھ ہی گرج اور کڑک بھی۔ تو ایک پلنگ سے گھبرائی ہوئی آواز آئی ابا جان! ہم نے کہا کیا کہتے ہو جواب ملا کہ ہمارے بستر پر پانی ٹپک رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی اپنے پلنگ پر بستر سمیٹے ہوئے اور غصہ کا منہ بنائے بیٹھی تھیں۔ ہم نے اٹھ کر صاحبزادے کو اپنے پلنگ پر سلا دیا اور ان سے ڈرتے ڈرتے کہا کہ سو کیوں نہیں جاتی؟ بس پھر تو برس پڑیں اور پہلا جوش ہماری مضمون نگاری ہی پر خرچ ہوا۔ کہنے لگیں:

''خدا سمجھے ایسی مضمون نگاری کو—''

''بارش کا زور دیکھو، مکان گر رہا ہے—''

''بچے پانی کی وجہ سے سو نہیں سکتے مگر—''

''حضور (یعنی ہم) برابر لکھ رہے ہیں—''

اب تو مجال نہ تھی کہ ایک سطر بھی لکھتے۔ بس جناب اپنے پلنگ پر آ کر منجھلے صاحبزادے کو جب گود میں لے کر بیٹھ گئے تب کسی قدر مہربانی سے بولیں کہ:

''اب اس دیوار کو کس طرح بنائیں گے پیسہ ہے نہیں''۔

ہم نے کہا اب تو سو جاؤ۔ کیونکہ سوائے مہاجن جمنالال کے سودی روپیہ کے اور کون بنوا سکتا ہے؟ تمھارا زیور اور جمنالال کی دکان کو خدا سلامت رکھے۔ کل ہی دیوار بن جائے گی اس کے بعد کی گفتگو کیونکہ طویل ہے لہٰذا باقی آئندہ۔

اس طرح کٹتی ہیں غریبوں کی برساتی راتیں۔ اور اس طرح لکھا کرتے ہیں ہم ظریف مضامین۔ ارباب علم وفضل کی قدردانی ملاحظہ ہو کہ کل بجنور سے خط آیا ہے لکھا ہے کہ:

"مسائل حاضرہ سیاسیہ پر ایک دلچسپ اور لطیف مضمون لکھیے۔ 10/ فی صفحہ مطبوعہ دیں گے"۔

آہ نہ ہوئے فردوسی ورنہ ان سے کہتے کہ 10 آنہ فی شعر اجرت لے کر ایک اردو شاہنامہ بھی لکھتے جایئے کیونکہ فی شعر ایک اشرفی کے مقابل 1926 میں 10 آنہ فی صفحہ کیا کم قدردانی ہے؟

سچ تو کہتے ہیں مکرم دوست محمد عسکری وکیل کہ:

"آج کل کے مالکان اخبار و رسائل اچھے خاصے سرمایہ دار ہیں جو فاضل مضمون نگاروں کے دماغ کا خون چوس کر ہزاروں روپیہ کماتے ہیں اور مضمون نگار اپنی بدقسمتی سے ایسے ذلیل معاوضہ پر اپنے دل و دماغ ان کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں"۔

پس ایسی مضمون نگاری سے تو خدا کسی فوج کے سپاہیوں میں بھرتی کرا دے۔ علامہ حسین میر صاحب کو نہ گھبرانا چاہیے کیونکہ وہ ایسے مالکانِ اخبار میں سے نہیں ہیں۔

◆◆◆

تھرڈ کلاس

فصیح الملک نواب مرزا خان داغ دہلوی مرحوم کے دیوان میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اضطرابِ شوق میں آپ کی شامت جو آئی تو آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ! ''حالِ دل جو کچھ بھی تھا سب اُن کے منہ پر رکھ دیا'' یعنی دوست سے کہہ دیا۔ لیکن ہمارے خیال میں اگر اس مہذب ترین عہد میں کسی بھلے مانس کی شامت آئے تو اسے اور نہیں کم از کم جی۔ آئی۔ پی ریلوے کے تھرڈ کلاس میں سفر کر لینا چاہیے۔ پھر اگر اس سفر میں داغ مرحوم کی شامت سے بہتر شامت نہ آ جائے تو ہمارا ذمہ۔

پس ٹھیک 5 اکتوبر 1925 کو دن کے کوئی اڑھائی بجے ہمارے نام بمبئی سے اس مضمون کا تار آیا کہ ''اگر دیکھنا ہو تو فوراً آؤ حالت خراب ہے۔ دیکھو اگر کھانا وہاں کھاؤ تو پانی یہاں آ کر پینا''۔

تار مذکور ہمارے ایک دوست کا تھا جو عرصہ سے قبل بازار میں بیمار پڑے تھے مگر اب جو وہ بالکل ہی انا اللہ ہونے لگے تو تار دے مارا۔

نہ پوچھیے اس وقت کی وحشت کا عالم۔ ریل کے اوقات اور ریلوں کے نام معلوم کرنے کا کسے ہوش۔ کپڑوں کی ایک معمولی گٹھڑی اور چند نوٹ لے کر بھوپال کے ریلوے اسٹیشن پر جا پہنچے۔ اس وقت یہاں سے ایک پسنجر ٹرین جانے والی تھی۔

مسافر خانے کے ایک گوشہ میں وہ ٹکٹ گھر بنا ہوا ہے جسے اگر پولیس حوالات کہیں تو کسی کو توہین نہیں۔ ٹکٹ گھر کی اس کھڑکی تک جہاں سے بابو جی ٹکٹ مرحمت فرماتے ہیں، کسی تھرڈ کلاس مسافر کا پہنچ جانا اور پھر بعافیت واپس ہو لینا ہمارے نزدیک موجودہ آویزش نجد و حجاز کے زمانہ میں حج کر آنے سے بھی زیادہ اہم ہے۔

ٹھیک کھڑکی سے کوئی دو بالشت کے فصل سے ایک لکڑی لگا دی گئی ہے تاکہ کھڑکی کے قریب مسافروں کا جلسۂ احتجاج نہ برپا ہو جائے۔ اس لکڑی کے ایک سرے پر وہ کالے کپڑے پہنے ہوئے لیفٹنٹ گورنر نظر آتے ہیں جسے عوام ریلوے پولیس کا سپاہی کہتے ہیں۔ آپ کی ڈیوٹی کا قانونی مقصد تو صرف اسی قدر ہے کہ ٹکٹ خریدتے وقت مسافروں کی جیبوں پر کوئی صاحب ہاتھ نہ ڈالیں، لیکن اس کی نوبت شاذ ہی آتی ہے۔ البتہ پولیس مین صاحب یہ خدمت روزانہ بجالاتے ہیں کہ جہاں کھڑکی کے سامنے دو چار مسافر جمع ہو گئے آپ نے پولیس کی مشہور آن بان کے ساتھ دو چار... سیدھی سیدھی سنا دیں۔ پھر اگر اس پر بھی مسافروں کی غیرت میں کوئی اشتعال نہ پایا تو براہ راست گھونسہ بازی، دھکہ بازی اور آخر میں ڈھائی ہاتھ کی سودیشی لٹھ بازی پر اتر آئے جو ہندستان کی مشہور شورش کے وقت اکثر کام آتی رہتی ہے۔ چنانچہ جس وقت ہم کھڑکی کے سامنے پہنچے تو مسافروں پر کچھ اسی قسم کا چھایا ہوا ابر برس رہا تھا، لیکن مسافروں کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس پر بھی کپڑے پھاڑتے ہوئے اور ہجوم کو چیرتے ہوئے کھڑکی تک پہنچنے کے لیے اُتنے ہی بے چین و بے قرار نظر آتے تھے جیسا کہ حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے اس سال مولانا عرفان اور قبلہ عبدالحلیم صدیقی مکہ معظمہ میں دیکھے گئے۔ اس کھڑکی کے ہجوم میں "گاڑی جانے والی ہے" اور "بابو جی ہم کو بھی دینا" کی آوازیں کچھ اس ترتیب اور سلسلے سے آ رہی تھیں گویا انیس مرحوم بیٹھے قصیدہ کہہ رہے ہیں۔ اور کیا مجال جو بندش میں کہیں بھی جھول رہ جائے۔ اب اس کشمکش میں دم گھٹنے کا سبب یہ تھا کہ کھڑکی کے سامنے اس لکڑی کے تنگ کٹہرے میں ٹکٹ لینے کے لیے ہر مسافر مع بستر داخل و خارج ہو رہا تھا۔ پھر اگر خدانخواستہ اس ہنگامہ میں کسی شنٹنگ انجن نے بھی سیٹی دے دی تو ایسا معلوم ہونے لگا گویا امین آباد لکھنؤ میں کسی ربڑ ٹائر تانگہ کا غضب ناک گھوڑا بدک گیا۔ بعض مسافروں کا یہ عالم بھی دیکھا کہ وہ اس سیٹی پر بلا ٹکٹ لیے ہی اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑے۔

غرض ہم ایک طرف:

''خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید''

بنے کھڑے بارگاہ رب العزت میں کبھی ٹکٹ جلدی ملنے کی دعا کرتے اور کبھی ہندستانیوں کی اس دُرگت پر آنسو بھر لاتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہم کو ہجوم کی حالت سے مایوسی ہو چلی اور یقین کہ گاڑی آئے تک بھی یہ جلسۂ احتجاج برخاست نہ ہوگا تو بس ہم نے بھی بیک جرأت رندانہ کھڑکی کو جالیا۔ اب جو ٹکٹ لینے کے لیے کھڑکی کے تنگ دروازہ میں ہاتھ ڈالا اور بقیہ پیسے واپس لینے کے لیے ٹھہرے تو پیچھے سے واپس آنے کے لیے اس طرح تقاضا شروع ہوگیا کہ شیروانی کے دونوں دامن چاک بن گئے۔ بہرحال اتنا ہوش اب بھی ہے کہ جس وقت ٹکٹ لے کر اس کھڑکی سے باہر آئے ہیں تو ٹوپی اور شیروانی کو از سر نو سنبھالا تھا۔ کاش ہمیں اس وقت بھائی عارف ہسوی کا ڈیل ڈول تو کیا اگر قد ہی مل جاتا تو ہم کٹہرے کے باہر ہی سے ہاتھ بڑھا کر ٹکٹ لے لیتے۔

پلیٹ فارم کے دروازے پر ایک قحط زدہ عیسائی صاحب اپنی چیک کرنے والی فولادی قینچی لیے گزرنے والے مسافروں کے سروں کی تواضع فرما رہے تھے اور ہر مسافر ان کی قینچی کی زد میں آکر کسی قدر سہم کر جلد ٹکٹ دکھا دیتا تھا۔ بعض مسافروں کے ساتھ ان کی ''نیک بخت'' اور پانچ چھ بچے بھی نظر آئے جنھیں وہ اس دروازے سے باعزت لے جانے کے لیے ویسے ہی کوشش کرتے تھے جیسے کسی طویل مال گاڑی کا اِنجن کسی بلند جگہ ان وزنی ڈبوں کو کھینچنے کے لیے کثرت سے دھواں اُڑاتا ہے۔ ابھی یہ منظر بدلنے نہ پایا تھا کہ ریل پلیٹ فارم کے اندر داخل ہوگئی۔ اب تو موسم ہی بدل گیا جتنے مسافر دروازے کے باہر ٹکٹ دکھانے کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے وہ سب کے سب خدا کا نام لے کر ٹکٹ کلکٹر صاحب پر ٹوٹ پڑے۔ ٹکٹ کلکٹر صاحب تو سر سے گری ہوئی ٹوپی کی تلاش میں رہے اور مجاہدین کی یہ درجۂ سوئم جماعت ریل کے دروازوں پر منتشر نظر آنے لگے۔ اُس وقت گاڑی میں سے اُترنے والوں اور گاڑی میں سوار ہونے والوں کا جو مقابلہ نظر آیا وہ شاید میدان ریف میں فرانس و ہسپانیہ اور غازیانِ ریف کی گھمسان کی جنگ میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ البتہ فرق یہ تھا کہ میدانِ جنگ میں ایسی کشمکش کے موقعہ پر فوجیں سنگین برچھے اور تلواریں استعمال

کرتیں اور یہاں رسّی میں بندھے ہوئے ٹین کے لوٹے اور بستروں کے بنڈل کام میں لائے جارہے تھے۔ ہراترنے والا مسافر چڑھنے والے مسافر پر تنگ آکر اپنا بستر دے مارتا تھا اور چڑھنے والا مسافر ریل کے اندر سوتے ہوئے مسافروں پر کھڑکی کے راستے اپنا وزنی بستر اور گٹھریاں پھینک دیتا تھا۔ بعض دروازوں پر ہاتھا پائی کا پارٹ بھی دیکھا جارہا تھا۔ ایک دروازے پر دست د گریبانی اور ہاتھا پائی کے اس مقابلہ میں گنے کے وہ ڈھائی ڈھائی ہاتھ کے ٹکڑے بھی استعمال ہورہے تھے جنھیں کانپور سے خرید کر اہل وعیال کے لیے بہ طریق ہدیہ ہر تھرڈ کلاس مسافر لاتا ہے اور تو کچھ نہیں البتہ اس گنا بازی کے ہنگامہ سے ایک طرف چند سودیشی بیرسٹروں کا وہ گروہ رُکا ہوا تھا جس کے ساتھ قاف کی کچھ پریاں بھی تھیں۔

الغرض اس ہجوم اور دھینگا مشتی میں ہم بھی بہ کمال متانت اور تحمل کے کسی خالی ڈبے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اتفاق سے ایک ایسے ڈبے پر نظر پڑی جس کے دروازے پر ایک سفید پوش بزرگ نہایت غضب آلود اور خوفناک چہرہ بنائے کھڑے تھے۔ چہرے پر قہر وجلال کے یہ دیسی آثار محض اس لیے پیدا کر دیے گئے تھے کہ کوئی گھبرایا ہوا مسافر آپ کے ڈبے میں نہ آگھسے اور آپ اپنے اس مقبوضہ ومملوکہ ڈبے میں بلا مشارکت غیرے واحد کے بمبئی تک آرام کے ساتھ سوتے چلے جائیں۔ لیکن چونکہ ہمیں بھی:

پانچویں پشت ہے اس ریل کی سپاہی میں

کا فخر حاصل ہے، اس لیے ہم نے بخط مستقیم اسی دروازہ کا رُخ کیا۔ اور پینترا بدل کر اپنے چہرے کو ان سے بھی زیادہ پُر جلال و پُر غضب بنا کر ان سے بلا اجازت لیے اس دروازہ کو کھول دیا۔ گو ہماری اس حرکت سے خاں صاحب نے کسی قدر غضب آلود نظر سے ہمیں دیکھا تو لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ فرما سکے۔ البتہ اندر جو داخل ہوئے تو دیکھا آٹھ مسافروں کی جگہ تین مسافر بستر ے جمائے خواب آلود ہورہے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے باندازِ گورنری فرمایا کہ ''یہاں جگہ نہیں ہے آگے جاؤ'' لیکن ہم نے اس کا جواب صرف یہ دیا کہ ان کے پاؤں پر بستر ارکھ کر بیٹھ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور کچھ فی البدیہہ باتیں کرنے لگے، لیکن جب ہم نے ان کے ہر مصرعے پر ایک بند چست کر دیا تو یہ بھی ہماری قادرالکلامی کے قائل ہو کر رہ گئے اور

آہستہ سے جگہ دے دی۔

ریل چل دی اور وہ بزرگ جو دروازہ پر پہرہ دے رہے تھے اندر تشریف لائے۔ اسی غضب ناک انداز میں اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ البتہ اندازہ ہو رہا تھا کہ آپ کو ہمارے حملہ سے بے انتہا تکلیف ہے۔ ہم نے تھوڑی دیر بعد اخبار ''زمیندار'' کا ایک پرچہ نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ ابھی دو چار سطریں ہی پڑھی ہوں گی کہ سامنے کی سیٹ سے خدا کی شان کو آتے ہوئے دیکھا یعنی سامنے کی نشست سے ایک قبلہ و کعبہ اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھے، جن کا نام تو معلوم نہیں البتہ حلیہ یہ تھا جس کی ضخامت گویا اچھا خاصا واٹر ٹینک، آنکھیں جیسے جی۔ آئی۔ پی۔ آر کے انجن کی دونوں لالٹین۔ دونوں بھوؤں کا میدان صاف۔ داڑھی حسب ضابطہ۔ شکم مبارک این، ڈبلو، آر کا انجن۔ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ۔ موٹاپے کی وجہ سے سانس کا یہ عالم گویا آپ ''ضیق النفس'' کے پرانے مریض ہیں۔ گفتگو میں استغفر اللہ، لاحول ولاقوۃ اور سبحان اللہ کا معقول خرچ۔ حروف کے مخارج میں (ح) اور (ع) کو نہایت قرأت سے ادا کیا جاتا تھا۔

غرض بیٹھتے ہی ارشاد ہوا ''کیا جناب میں بھی اس اخبار کو دیکھ سکتا ہوں''؟ اب تو ہم سمجھ گئے کہ اگر اخبار ان کو دے دیا تو پھر ہم بے کار اور آں جناب با کار ہو جائیں گے۔ لہٰذا بھائی عارف ہسوی کے لہجے اور مولانا شوکت علی کے تیوروں کے ساتھ ہم نے کہہ دیا ''جی نہیں میں خود دیکھ رہا ہوں'' ہمارا یہ ٹکا سا جواب گو قبلہ کو ناگوار تو ہوا، لیکن فرمایا اور بڑے تحمل سے فرمایا کہ ''اجی حضرت تو پھر یہی فرما دیجیے کہ وہابیوں اور اہل قریش کے جھگڑے کی بھی کوئی خبر ہے؟''

وہابی کے لفظ پر ہم چونک گئے اور سوچا کہ ہو نہ ہو آپ ضرور حنفی ہیں۔ اور آپ کا بریلی اور بدایوں سے قریب کا تعلق ہے۔ اس لیے فوراً ہم ان سے مخاطب ہوئے اور حسب ذیل گفتگو شروع ہوئی۔

ہم — ''جی ہاں۔ یہ خبر ہے کہ اب مدینہ طیبہ فتح کر لینے کے بعد وہابی جدہ پر قبضہ کر کے امیر علی غدار کو تباہ کرنے والے ہیں''۔ اس گفتگو میں ہم نے اپنا لہجہ قصداً از راہ مدار بنا لیا تا کہ قبلہ ہم سے کسی طرح ناراض ہو جائیں اور ہمیں اخبار بینی کی فرصت نصیب ہو جائے، لیکن آہ کہ ایسا نہ ہوا

بلکہ حسب ذیل انداز میں ہم سے الجھ پڑے۔

قبلہ — ''تو کیا جناب کچھ عربی بھی جانتے ہیں؟''

ہم — ''جی کچھ کیا معنی اس قدر جانتے ہیں کہ گھنٹوں بلا سانس قائم کیے عربی پر گفتگو کرتے رہتے ہیں''۔

قبلہ — تو کیا جناب عرب میں رہے ہیں؟''

ہم — ''جی نہیں عرب کی تو صورت نہیں دیکھی بلکہ کانپور اور لکھنؤ میں عربی پڑھی ہے اور الحمدللہ کہ علوم دینیہ کی باقاعدہ تحصیل و تکمیل کی ہے''۔ اب تو قبلہ کسی قدر گھبرائے اور فرمایا کہ ''تو پھر جناب کا نام؟''

ہم — ''ملا رموزی''۔

قبلہ — (بے انتہا حیرت سے) ''اوہو آپ ہیں ملا رموزی''؟

اب یہاں سے گفتگو کا نقشہ ہی بدل گیا اور اب خاص الخاص مولویانہ انداز پر مباحثہ شروع ہو گیا جس کے ہر فقرہ پر گمان ہوتا تھا کہ ہم از سر نو کسی عربی مدرسہ میں داخل ہو کر میزان و منشعب اور نحو میر پڑھ رہے ہیں۔

غرض اس مباحثہ میں قبور کے انہدام پر عربی دلائل کے ساتھ خوب خوب بحث ہوئی، لیکن آپ تفصیلات کو چھوڑ کر صرف وہ فقرے سن لیجیے جن پر مباحثہ ختم ہوا:

قبلہ — ''کیوں صاحب باوجود ایک جید عالم ہونے کے آپ کی وضع قطع تو نیچری ہے۔

ہم — ''جی ہاں گنہگار ہیں''۔

قبلہ — ''تو پھر آپ سے دینی مسائل پر گفتگو کرنا ہی عبث ہے''۔

ہم — ''جی ہاں میں تو اس سے پہلے ہی ایسا چاہتا تھا، مگر...

اب فرصت پا کر اخبار دیکھنا شروع کیا۔ اور ہر ریل کے وہ جاں گسل ہوش ربا جھٹکے جو چوب خشک کی دیواروں سے ہمیں پکڑ پکڑ کر ٹکرا دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے غنودگی شروع کی اور تھوڑی ہی دیر میں ''پلنگ خفتہ باشد'' ہو کر سو گئے۔ لیکن عین اس وقت جب کہ ہم جوانی کی نیند کے مزے

لے رہے تھے یکا یک ایک جھٹکا لگا جس کے اثر سے ہم الصلوٰۃ خیر من النوم... کہتے ہوئے اٹھ گئے۔ اب جو آنکھیں کھولتے ہیں تو سینہ پر ایک گٹھڑی اور بستر رکھا دیکھ کر ہمیں کوئی حیرت نہ ہوئی بلکہ فوراً سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہ کوئی اسٹیشن ہے، جہاں سے کوئی گھبرایا ہوا کسان سوار ہو رہا ہے اور اس نے گھبراہٹ میں یہ بستر اکھڑکی سے ہی ہمارے اوپر دے مارا اور اب وہ صدر دروازے سے آیا ہی چاہتا ہے۔ یہ سوچ کر گردن اٹھائی تو صدر دروازہ سے دیکھا کوئی دس بارہ کسان ریل کے اندر چلے آرہے ہیں۔ سروں پر چار چار تھان کھدر کے لپیٹے ہوئے جن کے اندر سے وہ لمبی لمبی چلمیں آرہی تھیں جو بوقت سفر اس کی کھدری عمارے کے اندر لگائی جاتی ہیں۔ اسی کھدر کے "میڈ ان دیہات" کوٹ جن کے سینے کھلے ہوئے اور اندر سے سینے کے بال صفا پاؤڈر صاف نظر آرہے تھے۔ ہاتھوں میں بڑی بڑی لاٹھیاں، بقدر ستر عورت دھوتیاں اور پاؤں میں وہ وزنی جوتے جو اگر اخبار "ہمدم" کے کسی لکھنوی کاتب یا اسسٹنٹ ایڈیٹر کو غلطی سے پہنا دیے جائیں تو اف کہہ کر انا للہ ہی ہو جائیں۔ غرض کسانوں کی یہ پوری پارلیمنٹ جب اس ڈبے میں داخل ہو گئی تو اب ہمیں اطمینان ہو گیا کہ بمبئی تک سونا تو ایک طرف شاید ہم حرکت بھی نہ کر سکیں گے۔

غرض گاڑی تین منٹ ٹھہر کر چل دی۔ اتفاق سے ہماری نشست سے قریب ہی وہ حصۂ ریل بھی واقع تھا جس کا دروازہ کھل جانے پر یقین آتا تھا کہ لکھنؤ کے مشہور عطر فروش اصغر علی محمد علی کی دکان یا شہر قنوج کا اسٹیشن قریب آگیا ہے۔ کسانوں کی اس جماعت نے جب دیکھا کہ سیٹوں پر چند سفید پوش حضور بیٹھے ہیں تو انھوں نے بڑے اطمینان سے اپنی نشست کے لیے وہ حصہ منتخب فرما لیا جہاں عام لوگ پاؤں لٹکا کر بیٹھے ہیں۔ یعنی سیٹوں کے نیچے۔ ان لوگوں کو بڑی خوشی اس امر کی تھی کہ گاڑی میں جگہ مل گئی۔ لہٰذا اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب کسان پارلیمنٹ کے ممبروں میں سلسلۂ کلام شروع ہوا۔ اور تو کچھ نہیں ان کی گفتگو کے شور سے ہر وقت بمبئی کے بڑے مارکیٹ کا احتمال ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ان لوگوں سے بعض نے بعض کو اشارہ کیا۔ اور اب کھدر کے عماموں میں سے چلمیں نکالی گئیں اور بلا کسی تکلف کے عمامہ کا سرا پھاڑ کر چلم پر رکھ دیا اور دوسرے نے دیا سلائی سے فوراً تیز کر دیا۔ اب کیا تھا اُدھر چلم کا روشن ہونا، ادھر ریل کی تیز رفتار سے ہوا کا اندر داخل ہو کر دھوئیں کی ان زہریلی گیسوں کو روک دینا۔ گویا اب ہم اس چاہ بابل میں تھے جہاں

سنا ہے کہ دو فرشتے اوندھے لٹکا دیے گئے ہیں اور دنیا کا تمام دھواں ان کی ناک سے ہو کر گزرتا ہے۔ قصہ کوتاہ تھوڑی ہی دیر میں ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حالانکہ ہمیں رونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسی ڈبے کے جنوبی حصہ میں ایک ہندو عورت چار پانچ بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔ اتفاق سے کسان پارلیمنٹ کے ایک ممبر صاحب لوٹا ہاتھ میں لے کر رفع شک کے لیے ریل کی اُس معطر کوٹھری میں جو جانے لگے، تو اس کا ستون نما پاؤں ایک بچہ پر پڑ گیا۔ اب تو الامان والحفیظ کون کس کی سنتا ہے۔ عورت اور یہ بچے اس کسان سے فوراً ہی تو لپٹ پڑے اور نوبت با ینجا رسید کہ پانی سے بھرا ہوا لوٹا ہاتھ سے چھوٹ کر قبلہ و کعبہ پر جا پڑا جو پاس ہی لیٹے ہوئے کسی مسئلہ میں غور کر رہے تھے۔ اب تو کسان کی موت ہی آ گئی۔ بہرحال ہم دیکھ رہے تھے کہ ڈبے کے کوئی ایک اوپر سو آدمی کھڑے ہوئے ایک دوسرے سے زور شور کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں کسان صاحب پر چوب خشک کا ایک ہاتھ پڑا۔ پھر تو معلوم ہونے لگا کہ کسی توپ خانے کے دیلر گھوڑے مع توپوں کے بدک کر اس ڈبے میں آ گئے ہیں اور اپنی ہنہناہٹ اور ٹاپوں سے اس لکڑی کی ریل کا ابھی خاتمہ کیے دیتے ہیں۔

غرض ابھی یہ آب و ہوا تبدیل نہ ہونے پائی تھی کہ ایک بڑا اسٹیشن آ گیا اور ایک نیم انگریز خطرۂ ہندستان یعنی ٹکٹ کلکٹر نے اس گھمسان کی جنگ کا التوا کر دیا اور یہ التوا ابھی اس لیے عمل میں آیا کہ کسان پارلیمنٹ کے ان ممبروں کو اسی اسٹیشن پر اترنا تھا۔

حاصل کلام ایسے ہی حالات کے جب ہم ڈیڑھ دن کے بعد بمبئی کے اسٹیشن پر اُترے ہیں تو ہماری زبان پر یہ غلط مصرع جاری تھا:

مریض لینے کو آئے مریض ہو کے چلے

یہ ہے تھرڈ کلاس ہندستانی ریلوں کا حال جس کے سفر میں علاوہ پیاس کے انتہائی تکلیف کے مذکورہ مصائب و نوائب کا سامنا روزمرہ کرنا پڑتا ہے اور یہ ہے کہ وہ نظام ریلوے کا جس پر مہذب ریلوے کا اطلاق خدا جانے کہاں تک صحیح ہے؟ نہیں آتا ہماری سمجھ میں کچھ کہ کن الفاظ سے تعبیر کریں ان حالات حاضرہ کو جو اکثر ریلوے سفر میں دیکھے جاتے ہیں"۔

◆◆◆

زنانہ

ہندستان جہالت نشاں میں عورت ایسی لطیف اور جاندار چیز کے خطاب کے لیے جو اسمائے ارشادات یا ضمیریں وضع کی گئی ہیں، ان میں صوبہ جات متحدہ اور سی پی کی ضمیریں نہایت پُر لطف ہیں مثلاً یہاں عورت کو ''سواری'' کہتے ہیں۔ طریق استعمال یہ ہے کہ'' ذرا پردہ کیجیے سورایاں آتی ہیں''۔ دوسرا نام ہے ''مستورات'' خدا جانے یہ مستور کے معنی عورت اور مستورات کے معنی عورتیں کس مولوی فاضل نے وضع فرمائے ہیں۔ تیسرا نام ہے ''ماں بہنیں'' طریق استعمال یہ ہے ''ہماری ماں بہنوں سے ایسی ہی توقع تھی''۔ چوتھا نام ہے ''بہو بیٹیاں'' پانچواں نام ہے ''بی بی''۔ چھٹا نام ہے ''نیک بخت'' یہ نام صرف خاوند کے لیے مخصوص ہے۔ اور وہ بھی اُس وقت کے لیے جب وہ اپنی بیوی سے جنگ میں مغلوب ہو گیا ہو تو کہے گا کہ بس نیک بخت جانے بھی دے۔ ساتواں نام ہے ''اماں'' اور لطف یہ ہے کہ اس نام کو بھی خاوند ہی زیادہ استعمال کرتا ہے۔ البتہ اس نام میں اولاد کا نام بھی ملا لیا جاتا ہے۔ مثلاً چنوں کی اماں اور بدھو کی ماں، اب آٹھواں نام کلیجہ تھام کر سن لیجیے اور وہ نام ہے ''گھر کے لوگ'' مثلاً خاوند کہے گا کہ میرے گھر کے لوگ کہتے ہیں کہ تم انگریزوں کے کپڑے کیوں استعمال کرتے ہو؟ تو عوام کہیں گے سچ تو کہتے ہیں تمھارے گھر کے لوگ۔ مراد یہاں صرف ایک عورت کا قول ہے۔ ان ناموں کے بعد بیوی کے لیے ''وہ''، ''اُن''

اور ''تم'' کی ضمیریں بھی کام میں لائی جاتی ہیں۔ مثلاً ''وہ کہتی ہیں'' وغیرہ۔

لیجیے یہ ہیں وہ اسمائے اشارات جن کے ساتھ عورت یا عورتیں مخاطب کی جاتی ہیں۔ لیکن کیوں صاحب وہ جو انگریز کہتے ہیں کہ ہندستانیوں کو ہم نے مہذب بنایا اور اگر آپس میں اتفاق نہ کیا تو بناتے ہی رہیں گے۔ تو آخر کو وہ ہم سے کچھ زیادہ ہی قابل ہوں گے تب ایسا دعویٰ کرتے ہیں۔ لہٰذا اب انھوں نے بھی ہماری عورتوں کا ایک نام وضع کیا ہے اور وہ نام ہے ''زنانہ''۔ اب یقین نہ ہو تو دیکھ لو انگریزی ریلوں کے ہر تھرڈ کلاس ڈبے کی وہ تختی جس پر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے ''زنانہ''۔ مراد یہ ہے کہ اس ڈبے میں صرف عورتیں بیٹھ سکتی ہیں۔ پھر یہی نام پلیٹ فارم کے اُس آہنی کمرہ پر لکھا ہوتا ہے جہاں گاڑی ٹھہرتے ہی گھبرائے ہوئے مسافر لوٹا ہاتھ میں لے کر کچھ دیر خموش جا بیٹھتے ہیں۔ اب اربابِ تحقیق اور مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہو کہ نہ ہو جس طرح مرد سے مردانہ بنا ہے اور اسی طرح زن سے یہ زنانہ پیدا ہوا ہے اور لکھنوی کنکوے بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت واجد علی شاہ بھی محض اسی تخلص کی وجہ سے تخت سے اتارے گئے۔

ہمارے وطن کے تمام لوگ اب تک یہی جانتے ہیں کہ ابھی نہ ہماری کوئی سواری ہے اور نہ گھر کے لوگ، نہ ہماری کوئی نیک بخت ہے نہ لڑکے کی ماں، گویا ابھی ہم ناکتخدا ہی دھرے ہوئے ہیں، لیکن کیوں صاحب جب اچھے خاصے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے اور صاف نظر آنے والے مردوں کا نام ''خفیہ پولیس'' رکھ دیا جاتا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک مرد کسی عورت کو بلا نکاح اپنی ''خفیہ پولیس'' بنا لے اور عوام یہی سمجھتے رہیں کہ ابھی ان کی شادی ہی نہیں ہوئی اور پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی اس خفیہ نیک بخت کو جہاں چاہیں سیر کراتے پھریں کیونکہ وہ بمبئی کی مالا بار ہل پر مسٹر باؤلا بھی تو آخر بی ممتاز جان امرتسر والی کو لے ہی گئے تھے۔ آخر کار اسی قسم کی ایک نیک بخت کو اپنے ہمراہ لے کر وطن سے ہم جو لفظ قرار کا صرف ایک نقطہ ہوئے تو سیدھے ریلوے اسٹیشن جا پہنچے، اب جو ریلوے کی خفیہ اور علانیہ پولیس نے اُن پر شک نہ کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک قیمتی برقعہ اوڑھے تھیں (دیکھیے یہ حالت فرار یہ پہلا فائدہ ہے پردہ کا تب ہی تو کہتے ہیں کہ پردہ ترک نہ کرو رنہ اسٹیشن ہی پر) اب جو ریل میں بیٹھنے کی باری آئی تو خوف پیدا ہوا کہ اگر انھیں بھی ساتھ لے کر بیٹھتے ہیں تو لوگ باگ ہم کو ان کے ساتھ مشہور عالم جنتری

بنا دیں گے۔ لہٰذا ہم نے ان کو پلیٹ فارم کے زنانہ سے گزار کر خود الگ ٹہلنا شروع کر دیا۔ گویا ہم کو ان سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور ہم کوئی بڑے ہی پاکباز اور میر تقی میر ہیں۔ اب جو ریل آئی تو بس ہونے لگا مسافروں کا عظیم الشان دنگل۔ لہٰذا ایک ایسی نیک بخت جنھوں نے عمر بھر ریل کی صورت نہ دیکھی ہو اور جنھیں ایک معزز اخبار نویس کے ساتھ بھاگنے کا پہلا ہی موقع ہو ریل میں کیسے سوار ہو سکتی ہیں۔ دیکھا تو پلیٹ فارم کے ایک گوشہ میں سہمی ہوئی بیٹھی ہیں اور گھبرا گھبرا کر ہماری طرف دیکھتی جاتی ہیں۔ آخر صاف نہ رہا گیا، گئے اور ساتھ لے کر ریل کے ''زنانہ'' کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ ایک گرجتی ہوئی آواز آئی کہ اِدھر نہ آنا یہ زنانہ ہے مطلب یہ تھا کہ اِدھر عورتیں بیٹھی ہیں۔ ابھی اس آواز کا ترنم ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک غضبناک خاں صاحب دوڑے ہوئے آئے اور پولیس کے لہجہ میں فرمایا کہ بس کھڑے رہیے یہ زنانہ ہے، اب تو نہ رہا گیا اور ہم نے ادب سے عرض کیا اور جو صاحب ہمارے ساتھ یہ ایک زنانہ ہے اسے کیا کریں۔ اور فرمایا کہ بس اُنھیں اندر جانے دیجیے اور آپ دروازہ سے الگ کھڑے رہیے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضور ہمارا زنانہ تو ریل میں بیٹھنا ہی نہیں جانتا تو فرمایا کہ کیا کریں اور جو میرے گھر کے لوگوں کی بے پردگی ہوگی تو؟۔

اس پر ہم نے عرض کیا کہ حضور اور جو یہ ڈبے کی تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں۔ تو فرمانے لگے میری سواریاں تو برقعہ پہنے ہیں۔ اس وقت اس زنانہ ڈبے میں کوئی پانچ کم تیس عورتیں اس طرح بیٹھی تھیں کہ دو چار تو برقعہ پہنے تھیں، باقی سب علانیہ۔ بس چادریں جسم پر پڑی تھیں جو کسی بھلے مانس کو دیکھ کر چند سیکنڈ کے لیے چہرے پر ڈال لی جاتی تھیں۔ مگر خوانچے والوں سے بلا نقاب ہی سودا خریدا جاتا تھا۔ کیونکہ خوانچے والے کوئی آدمی تھوڑا ہی ہوا کرتے ہیں۔ بہرحال ہمارے گھر کے لوگ کچھ تو اس وجہ سے کہ اس وقت عالم فرار میں تھے اور کچھ اس وجہ سے طبعاً مزاج کے نیک اور حلیم واقع ہوئے ہیں۔ بلا ہماری امداد کے سوار ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب جو وہ اندر گئیں تو خاں صاحب نے جھپٹ کر اس کا دروازہ بند کر دیا اور کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر پھر دربانی فرمانے لگے۔ گویا اس وقت ہمارے گھر کے لوگ بھی خاں صاحب ہی کے گھر کے لوگ تھے۔

پس ایسے حالات کے ساتھ جب ریل روانہ ہوئی تو ہم دعا میں مصروف ہو گئے کہ خدا ہماری نیک بخت کو خیر و عافیت میں رکھنا۔ اب جو پہلا اسٹیشن آیا تو ہم نے ارادہ کیا کہ جا کر اس بے زبان سے دریافت کریں کہ کوئی ضرورت تو نہیں ہے لیکن دیکھتے کیا ہیں کہ ہم سے بھی پہلے خاں صاحب دروازہ پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں۔ اب ہم جو پہنچے تو خاں صاحب کسی قدر تپاک سے پیش آئے اور فرمایا کہ آیئے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضور اب تو ہم کو بھی ان سے خیریت دریافت کرنے کا موقع عطا فرمایئے۔ مگر اللہ رے خاں صاحب کا سوراج کہ اس پر بھی آپ نے ڈبے کے قریب تو آنے کی اجازت نہیں دی البتہ دادرسی یوں فرمائی کہ اپنی نیک بخت سے فرمایا کہ ان کے گھر کے لوگوں سے دریافت کرلو کہ کوئی ضرورت تو نہیں ہے۔ بس جناب خاں صاحب کے اس دخل درمیان بیوی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری نیک بخت نے مارے غصہ کے کہلا دیا کہ ''ہمیں کچھ نہیں کہنا'' حالانکہ خدا ان کی عمر دراز کرے وہ تو اتنی بڑی ابوالکلام آزاد واقع ہوئی ہیں کہ رات بھر خانگی معاملات میں ہم سے تبادلۂ خیالات کرتی رہتی ہیں۔ پس اس مزاج دانی کی وجہ سے ہم نے خاں صاحب سے عرض کیا کہ حضور وہ تو آپ سے شرماتی ہیں ذرا تو ہٹ جایئے پھر دیکھیے وہ ضرور ہم سے کچھ فرمائیں گی۔ اس گزارش پر خاں صاحب نے جو جواب مرحمت فرمایا اُس پر دل میں تو آیا تھا کہ بس مرجائیں، مگر آپ بھی سن لیجیے فرمانے لگے کہ میاں تو بس دروازہ پر انھیں بلالو۔ وہ تو میری بیٹی کی طرح ہیں۔ گویا اس حساب سے اس وقت خاں صاحب ہمارے خسر بھی تھے۔ اب تو جناب نہ رہا گیا اور پینترا بدل کر کہا کہ خاں صاحب:

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

اب خاں صاحب جو بقدر دو فٹ پیچھے ہٹے تو ہم نے سیٹی دی۔ دو مرتبہ تو چھما چھم کی آواز آئی اور تیسری مرتبہ دروازہ پر آ گئیں۔ پیشانی سے پسینہ صاف کرتی جاتی تھیں مگر ہمیں دیکھ کر مسکرائی اور پیار لہجہ میں فرمایا کہ ''ہم تو مر گئے پانی پلا دو'' ان کے اس فقرہ پر ہمارا جو حال ہوا اسے ہم سے بہتر کوئی ادیب نہیں جان سکتا۔ بس دوڑے پانی کے لیے، مگر وہ تو چھوٹے اسٹیشنوں پر انگریزوں کو پانی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، اس لیے صرف جنکشنوں پر کمپنی انتظام کرتی ہے۔ تنگ آ کر سوڈا لے کر ہی دوڑے۔ اُدھر خدا کی خدائی کے قربان جایئے۔ اسی اسٹیشن سے خاں صاحب

بھی سفوف دافع تبخیر ہو گئے اور ہمیں کسی قدر اطمینان حاصل ہوا۔ لیکن خاں صاحب کے رفع شر سے ہمیں جو مسرت حاصل ہوئی تھی ابھی اسے کچھ دیر بھی نہ گزری تھی کہ اسٹیشن کے باہر سے باجوں کی آواز آئی۔ دیکھا تو ایک دیہاتی بارات چلی آرہی ہے۔ ایک ضعیف العمر ٹٹو پر توشک بچھائے دولہا اس طرح بیٹھے چلے آرہے ہیں جیسے کسی عربی مدرسہ میں طلباہل ہل کر پڑھ رہے ہیں۔ آگے آگے جہیز کے برتن، ایک پلنگ اور تین صندوق مگر وہ خاں صاحب چلے گئے تھے تو ہمیں یہ غرور پیدا ہو گیا تھا کہ اب تو ہم بھی کسی رستم خاں کو ڈبے میں نہ آنے دیں گے اور محو تھے ان سے گفتگو میں۔ اُدھر انھوں نے باجوں کی آواز جو اس جنگل کے اسٹیشن پر سنی تو لگیں گھبرا کر کہنے کہ "یہ کیا ہے ہمیں بھی دکھلا دو"۔ اب تو جناب ہم گھبرائے مگر ترکیب یہ کی کہ بس ایک ڈانٹ دی جس کے الفاظ یہ ہیں:

"سنو جی! ہم جو ایک شہرۂ آفاق جرنلسٹ ہیں اور تمھارے ساتھ اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر گھر سے جو فقر و ہوئے ہیں تو یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ تمھیں اسٹیشنوں پر تماشے دکھاتے پھریں۔ ابھی تماشہ تو تماشہ ہم تو تمھارے پاس جتنی دیر کھڑے رہتے ہیں اتنی دیر پولیس والوں کے تیور غور سے دیکھتے رہتے ہیں۔ کیونکہ آپ کا ہمارا معاملہ بلا دین مہر اور ایجاب و قبول کے ہے"۔ لیجیے یہاں تو یہ مذاکرۂ علمیہ بپا تھا اُدھر بارات والوں نے رُخ کیا تو سیدھے زنانہ ڈبے پر ایک نہ دو پوری پانچ ٹولیاں لا کر رکھ دیں۔ اور شاید وہ دولہا کے باپ ہی ہوں گے جنھوں نے ایک فیلڈ مارشل کے لہجہ میں ہماری یوں عزت افزائی فرمائی کہ "بس ہٹیے جناب سواریاں سوار ہونے دیجیے"۔

بس حضرت دھری رہ گئی ہماری ساری لیفٹنٹ گورنری اور باراتیوں کی تعداد کا اندازہ کر کے ہم نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور پسپا ہو کر اپنے ڈبے میں آگئے۔ اب ہونے دیجیے زنانہ میں سواریوں کا داخلہ۔ کوئی تین اوپر تیس عورتیں تو بلا ڈولی ہی کے بھر گئی تھیں۔ ان کے بعد خاص اہتمام سے کوئی سات عورتیں دولہن کو لے کر جا بیٹھیں۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ دولہن کی والدہ ماجدہ نے عمر بھر میں جس قدر برتن جمع فرمائے تھے وہ سب کے سب اس لاڈلی بیٹی کو دے دیے تھے۔ گویا دولہا لوگوں کے ہاں تو برتن کبھی ہوا ہی نہیں کرتے۔ وہ تو خیر ہی گزری کہ دولہا صاحب اپنے ٹٹو کو پلیٹ

فارم کے باہر ہی بھول آئے ورنہ کیوں صاحب بٹھایا جاتا وہ بھی اس زنانہ ڈبے میں؟ اس وقت اس خالص زنانہ ڈبے میں بارات کا ہر غیر محرم شخص نہایت آزادی سے آجا رہا تھا۔ گویا سوائے ان کی ماں بہنوں کے دوسروں کی ماں بہنیں اس ڈبے میں انھیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔ اب آپ ہی اس بارات کے سوار ہو جانے پر اس نصف زنانہ ڈبے کی وسعت کا اندازہ کر لیجیے، جو پہلے ہی کثیر العیال اور قلیل المعاش ہو رہا تھا۔ سب کے بعد باراتیوں نے ترکیب یہ کی کہ دولہن کے ساتھ دولہا دو عدد نوجوان چھوکرے بھی سوار کر کے جھٹ پٹ دروازہ بند کر کے فاتحانہ انداز میں آگئے مردانہ ڈبے میں۔ اُدھر سرخ و سبز جھنڈی والے انگریز نے صدا دی کہ ''بھا گو ڈیم گاڑی جاتا ہے''۔ یہاں ڈیم کے معنی وہ شریف ہندستانی ہوتے ہیں جو پلیٹ فارم پر گاڑی روانہ ہونے کے انتظار میں ٹہلتے رہتے ہیں۔ لیکن گارڈ کے اس فقرہ پر ہم نے آج تک کسی شریف ہندستانی کو غصہ ہوتے نہیں دیکھا۔ غرض گاڑی تو چل دی لیکن ہمارے طیش کا یہ عالم کہ دوسرا اسٹیشن آتے ہی پہنچے سیدھے گارڈ صاحب کے پاس اور عرض کیا کہ حضور اس زنانہ ڈبے میں تو حشر بپا ہے۔ ہمیں یہ لوگ ڈبے کے پاس نہیں آنے دیتے۔ اِن بارات والوں نے اس ڈبے میں دو عدد نوجوان لڑکے بھی بٹھلا دیے ہیں اور ڈبے میں پانی نہیں وہ الگ۔

ہماری اس فدویانہ التجا کو گارڈ صاحب نے چلتے چلتے سنا اور انتظام یہ فرمایا کہ سیٹی بجاتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کے کمرہ میں چلے گئے۔ گویا نہ ہم نے ان سے کچھ کہا تھا اور نہ انھوں نے کچھ سنا۔ یہ پہلا موقع تھا جب یقین آگیا کہ اب انگریز انصاف تو انصاف فریادی کی طرف دیکھتے بھی نہیں اور ایک ذلیل حیثیت کے ریلوے گارڈ کے نزدیک بڑے سے بڑے شریف ہندستانی مسافر کی پوزیشن ''ڈیم'' کی ہے۔ لہٰذا گارڈ کی اس تمکنت اور شیطنت پر ہم نے بھی ایک بیوہ کی طرح فوراً دعا کی کہ خدا کرے احرار ترک اب تو موصل پر حملہ ہی کر دیں، مگر وہ تو سعدی صاحب شیرازی کہتے ہی پھرتے تھے کہ بھائیو:

صبر کڑوا ہے پھل میٹھا رکھتا ہے

دو ہی اسٹیشن چلے ہوں گے کہ آگیا ایک جنکشن، پس یہاں بدمعاش ہندستانی ٹکٹ کلکٹر کھڑے ہوئے تھے، جوں اس کی نظر اس ڈبے پر پڑی جھپٹے اور لگے عورتوں کی مردم شماری کرنے۔ ایک

صاحب نے فوراً ان دونوں نوجوان لڑکوں کو کان پکڑ کر نکال باہر کیا اور ایک نے بارات والوں کے پاس تین ٹکٹ کم ثابت کر کے مع جرمانہ دام وصول کر ڈالے اس وقت جس آزادی سے یہ دیسی ٹکٹ کلکٹر اس زنانہ ڈبے میں آجا رہے تھے اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ ہندستانی ٹکٹ کلکٹر تو کیا اچھے خاصے انگریزی پلے ہیں، جن کے نزدیک اپنی وطنی ماں بہنوں کی عزت وحرمت کوئی چیز ہی نہیں۔ تب ہی تو یہ افغانی مسافران دیسی ٹکٹ کلکٹروں کو ہر اسٹیشن پر مسہل دیے جاتے ہیں اور پھر یہ ہندستانی کلکٹر صاحب اپنی ٹوپی ہی سنبھالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب اس زنانہ ڈبے میں ان ٹکٹ کلکٹروں کے حملے پر باراتی صاحبان بہت ٹائن ٹائن کرتے رہے کہ حضور بے پردگی ہوتی ہے۔ ٹکٹ تو ہمارے پاس ہیں زنانے کے پاس نہ جایئے، مگر جب ریلوے کمپنیاں ہی ان دیسی اور کمینہ صفات ٹکٹ کلکٹروں کو کوئی سزا نہیں دیتیں تو اب باراتیوں کی کائیں کائیں سے ہوتا ہی کیا تھا۔ پس جب دار و گیر کے بعد باراتی صاحبان ہمارے ڈبے میں واپس آئے تو ہر فرد کے چہرۂ انور سے فاقہ کشی کے آثار نمایاں تھے۔ بس جناب ہم بھی مع ان کے اسی جنکشن پر اترے اور جب گھر پہنچے تو ڈیڑھ دن کے اس زنانہ سفر سے ان کا جو حال ہوا وہ یہ کہ ریل کے کرایہ کے بعد ان کے علاج میں کوئی ڈیڑھ سو روپیہ خرچ ہوئے اور میاں اب ان کی زندگی کی طرف سے ہمیں تو کوئی امید نہیں اب یہ ان کی غیرت پر موقوف ہے کہ وہ پھر بھی صحت یاب ہو جائیں ہمیں تو ضرورت نہیں۔ جب تو کہتے ہیں پنڈت موتی لال نہرو کہ یہ ان لال منہ کے لوگوں نے ہندستان میں ریل اپنی تجارت اور فوجی قبضہ کے لیے جاری کی ہے۔ انھیں غلام ہندستانیوں کے آرام سے کیا کام پس اس طرح سفر کرتی ہیں ہندستانی ریلوں میں اشراف ہند کی ماں بہنیں۔ مگر بھائی ہم تو ہیں انگریزی کالجوں اور انگریزی اسکولوں کے تعلیم یافتہ اور لجسلیٹو اسمبلی کے رکن، لہٰذا ہم تو یہی کہے جائیں گے کہ کہ ہندستان میں ہندستانی عورتوں اور مردوں کی بے عزتی اور بے حرمتی تو خیر ہوتی ہی رہتی ہے، مگر ہندستان میں انگریزوں کا دم پھر بھی غنیمت ہے۔ کہو بھائی محمد علی جناح ہے نہ ٹھیک؟

◆◆◆

شکار

آلو اور برف پیدا کرنے والی یورپین زمینوں میں تو یہ صلاحیت کہاں؟ البتہ ہندستان کی زرخیز و زرریز زمینوں میں ''شکار'' کی پیداوار بکثرت پائی جاتی ہے۔ کلکتہ میں ہمیں گورنمنٹ کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ایک رکن ملے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب ہم اور آپ بلا حجامت بنے ہوئے انسان تھے۔ اس وقت شکار کا مقصد صرف شکم پُری تھا، لیکن ہندستان میں انگریز کیا آئے کہ یہاں ایک فاقہ کش ہندی سے لے کر ایک فریدوں چشم رئیس تک کا مشغلہ رنگیں شکار ہوگیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ ایک بیکس ہندستانی شکار کے شوق میں کسی وحشت خیز جنگل میں بھوکا پیاسا درندوں کا شکار ہو جائے، لیکن کسی یورپین صاحب بہادر کے متعلق کبھی نہیں سنا کہ ان کی وفات مسرت آیات کسی جنگل میں اس لیے عمل میں آئی کہ وہ شیر کے منہ میں چلے گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ہندستان میں آتے ہی انگریز خود کو مصر کا وہی پادشاہ تصور کرتا ہے جو بلا سامان کے زمین میں اس لیے ٹھونس دیا گیا کہ اس نے اپنے لیے یہ بھی کہا تھا کہ ''میں اللہ میاں ہوں'' اسی طرح یہ جو دیسی ریاستوں کے صرف نام کے راجہ اور نواب بنے بیٹھے ہیں ان میں جس قدر سمجھدار ہیں انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہماری فرماں روائی ہر اس انگریز کی خوشنودیِ مزاج تک ہے جو ہماری ریاست میں شکار کو آئے اور ہم سے خوش ہو کر جائے۔ لہٰذا ایسے والیانِ ریاست نے ترکیب یہ کی ہے کہ

اپنی حدود ریاست میں بس بنا دیا ہے ایک جنگل اور چھوڑ دیتے ہیں اس میں شیر اور چیتے۔ ادھر ریاستوں میں جو ہوئے کسی قومی کالج کے خالص قومی وزیر اعظم تو بنا دیا انھوں نے بھی فوراً ایک قانون کہ:

''ہر گاہ اس حلقۂ جنگل میں عوام کو شکار کی سخت ممانعت ہے، جس میں کہ یورپین صاحب بہادر بہ وقت دورۂ شکار فرماتے ہیں اور ہر گاہ کہ اس سے بحث نہ ہوگی کہ شکار کی اس ممانعت سے بے کس کسانوں کی کھیتیاں ہوں کیونکہ یہاں تو ہر گاہ منظور ہے صاحب بہادر کو شکار کرانا ورنہ ہر گاہ کہ اگر نہ ملا شکار صاحب بہادر کو تو جاتی رہے گی ریاست''۔

پس ایسے ہی قوانین کے تحت صاحب بہادر نہایت شرافت سے آئے کسی دیسی ریاست میں والیِ ریاست نے اسٹیشن پر ہاتھ جوڑ کر استقبال کیا ۔شکار گاہ میں گئے ۔ شکار کیا۔ شام کو اسٹیٹ ڈنر کھایا۔ گارڈ آف آنر نے سلامی دی اور رخصت ہو گئے ۔اب یہ اور بات ہے کہ صاحب بہادر کے شکار میں دو چار کسان مارے گئے ۔ کسی کو شیر نے زخمی کیا کوئی چیتے کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ کیونکہ ایسے مقتولین کے رشتہ داروں کے گزارہ کے لیے والیانِ ریاست خود ہی تین سے لے کر پانچ روپیہ ماہوار کا گراں قدر وظیفہ مقرر ہی کر دیتے ہیں۔اب کہیے ایک مقتول کسان کی قیمت میں اگر اس کے خاندان بھر کے گزارہ کے لیے صرف پانچ روپیہ ماہوار کوئی دیسی ریاست مقرر کر دے تو کیا کم ہیں۔ورنہ خود سرکار انگریزی کے لیے میدانِ جنگ یورپ میں جو ہندستانی جانیں قربان کرنے جاتے تھے انھیں ریلوے اسٹیشنوں پر چنے کھانے کو دیے جاتے تھے۔

الغرض ہم ملا رموزی جو فطرتاً بڑے شکاری واقع ہوئے ہیں، جہاں اپنی حدود جاگیر میں ایک جاگیردار کی حیثیت سے شکار فرماتے رہتے ہیں۔ وہاں وائسرے بہادر سے لے کر بڑے بڑے لارڈوں اور صاحب بہادروں کے ساتھ جو شکار میں شریک رہے ہیں تو اپنے فرسٹ کلاس اور تھرڈ کلاس شکار کے تجربات ناظرین ریاست کے لیے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

ایک تھرڈ کلاس پوزیشن کے ہندستانی شکاری کا سامان یہ ہوتا ہے۔

پرانی وضع کی بندوق جس کے زور سے گولی چلاتے وقت خود شکاری بقدر دو فٹ پیچھے

گر پڑتا ہے۔ ایک توشک اور ایک موٹا لحاف کاندھے پر۔ کمر میں پانی کی چھاگل۔ گلے میں راستے کا ناشتہ بندھا ہوا۔ سبز کاہی رنگ کا لباس، تلوار بغل میں اور جوتے ہاتھ میں۔ گاڑی اور موٹر ندارد۔ اس سامان کے ساتھ جنگل میں پہنچ کر یہ شکاری "اودی" بناتا ہے۔ واضح ہو کہ "اودی اس چہار دیواری کو کہتے ہیں جس کے اندر خفیہ پولیس بن کر شکاری ساری رات بیٹھتا ہے۔ اب اس اودی میں رات بھر بیٹھنے کے اصول یہ ہیں:

اول یہ کہ اودی میں بیٹھنے سے پہلے سامنے کے ایک ایک درخت اور زمین کے ہر نشیب و فراز کو اس لیے حفظ یاد کر لو کہ شب کی تاریکی میں جنگل کا ایک ایک حصہ بھوت یا شہر بمبئی نظر آتا ہے اور شکاری انسان ضعیف البنیان اس سے ڈرتا ہے۔

دوم یہ کہ اودی میں شام سے لے کر صبح تک ایسے بیٹھو کہ جسم کو حرکت نہ ہو کیونکہ سنسان جنگل میں خفیف سی حرکت بھی جرمنی کو گولہ بارود کا شور پیدا کر دیتی ہے۔

سوم یہ کہ اودی کے اندر جو قیامت کے مچھر اور حشرات الارض انسان کا خون پینے جمع ہوتے ہیں اور اس سے جو نا قابلِ برداشت خارش اور شورش پیدا ہو جاتی ہے، اس کے رفع کرنے کے لیے صرف اجازت ہے کہ بس اپنی جوانی کے خون کا ایک بڑا سا گھونٹ تو پولی لیکن حرکت نہ کرو کیونکہ ممکن ہے کہ اودی کے سامنے کوئی درندہ خفیہ پولیس بنا بیٹھا ہو اور تمھاری اس حرکت پر وہ تمھیں ریشہ خطمی بنا ڈالے۔

چہارم یہ کہ اگر اودی میں رات بھر کے پورے بارہ گھنٹوں میں تمھارے اوپر حوائج ضروری کا دورہ ہو تو اس معاملہ کو بھی بس شکم مبارک کے اندر ہی نظر بند رکھیے اور جو آپ نے کہیں اودی کے قریب میونسپل ڈپارٹمنٹ بنا ڈالا تو تو اس کی بو سے میلوں دور سے شیر اور تیندوا دوڑ آتا ہے اور شکاری صاحب کو کوفتہ بنجتہ کر کے رکھ دیتا ہے۔

پنجم یہ کہ اودی میں بیڑی سگریٹ، حقہ اور چلم پینے کی سخت ممانعت ہے۔ کیونکہ جنگل میں ان چیزوں کے دھوئیں کی تعفن سے جانور بھاگ جاتے ہیں۔ پان چھالیا کھانا بھی اس لیے حرام ہے کہ چھالیا کا دانہ دانتوں کے بیچ میں دب کر شور پیدا کر دیتا ہے، جس سے جانوروں کے بھاگ جانے کا احتمال قوی ہے۔

یہ ہیں وہ مختصر اصول اودی میں بیٹھنے کے جن کی پابندی غروب آفتاب سے لے کر طلوع آفتاب تک ہر شکاری پر لازم ہے۔ اب مانا کہ یہ تمام اصول انسان کے تحفظ کے لیے وضع کیے گئے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ آخر آپ پر خدا کا وہ کون سا نمبر اول عذاب نازل ہوتا ہے جو آپ ان جان لینے والے اصول کی پابندی کے لیے جنگل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں؟؟؟

ہمارے حسد پیشہ اور منافق دوستوں کے گھروں میں اس خبر سے دس اور تیس دن ماتم رہے گا اور وہ گندم نما جو فروش مخلص مارے افسوس کے انفلوانزا میں مبتلا ہو جائیں گے جو ہم سے صرف اس لیے اکڑ کر ملتے ہیں کہ ہماری تنخواہ ان سے کم ہے کہ محض ان کے تکبر اور خباثت نفس کے صلہ میں خدائے رحیم و رحمان نے ہمیں اس قبولِ عام و وقار کے علاوہ جو برٹش انڈیا کے علمی طبقوں میں آج حاصل ہے۔ چند تاجدران خود مختار ایسے بھی عطائے فرمائے ہیں جو ہماری علمی خدمات کے دل سے قدرداں اور ہماری سرپرستی کے لیے ہر طرح آمادہ ہیں۔ پس ایسے ہی ذی وقار ذی جاہ حکمرانوں میں سے ایک جواں بخت و جواں دوست نواب نے ہم کو اس طرح طلب فرمایا کہ بھیج دیا اپنے اے۔ ڈی۔ سی کو ایک بڑے موٹر میں ہمارے اُس قصر ہمایونی پر جس کی مرمت کے لیے ہم تین سال سے برابر پبلک جلسے کر رہے ہیں، لیکن چندہ فراہم نہیں ہوتا۔ بس ایک ایسے مکان پر کسی تاجدار کے اے۔ ڈی۔ سی کا موٹر لے کر پہنچ جانا تھا نہ مارے خوشی کے بے ہوش ہو جانے والا معاملہ؟ غرض کچھ ایسی ہی بے خودی کے عالم میں ہم بلا بستر ایک کہنہ خلعتِ فاخرہ کے موٹر میں جلوہ فرما ہو کر اسٹیشن پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی ایک جلیل القدر حکومت کے دو ممتاز عہدہ دار کھڑے ہیں۔ ان میں سے ایک تو تھے ملٹری سکریٹری اور دوسرے تھے انجینئر۔ اسٹیشن کے خفیہ پولیس کے سپاہی نے جو جنگ یورپ کے بعد سے اسٹیشن پر صرف مسافروں کے حلیے بگاڑنے اور ٹکٹ کے نمبر لکھنے پر نوکر رکھ لیے گئے ہیں۔ آگے بڑھ کر ہم سے عرض کیا کہ یہ دونوں اعلیٰ افسر بھی حضور ہی کے ہمراہ رکاب نواب صاحب کے پاس جا رہے ہیں۔ اب یوں تو ہم ہز مجسٹی سے لے کر وائسرائے ہند کے سیلون تک کو ہمیشہ اپنا ہی سیلون تصور کرتے رہتے ہیں اور یہ کوئی جرم بھی نہیں، لیکن چونکہ اس مرتبہ ہمارے ساتھ یہ دونوں افسر جلیل القدر سفر کر رہے تھے اس لیے محض ان کی اعلیٰ پوزیشن کا لحاظ کر کے ہم نے ریل کے تھرڈ کلاس ہی میں سفر کرنا گوارا کر لیا۔ اور اب نہایت دھوم

دھام سے ہمارا وہ اسپیشل ٹرین روانہ ہو گیا۔ جسے عوام دو بجے والی پسنجر کہتے ہیں۔ گو ہمیں اس ریل میں ایک طویل سفر کرنا تھا، لیکن ڈرائیور چونکہ قوم کا انگریز تھا اس لیے اسے ہم سے یہ حسد تھا کہ ایک ہندستانی ہو کر ہم کیوں اتنے بڑے افسر ہیں، اس لیے وہ ہر اسٹیشن پر تین منٹ کے لیے ریل روک دیتا تھا۔ مگر اس ہر اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرنے سے ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیا کہ جو تھرڈ کلاس مسافر پانی ڈھونڈنے اترے تھے گاڑی چلتے وقت جب وہ چلتی ریل میں سوار ہونے لگے تو ہندستانی اسٹیشن ماسٹر نے کمر پکڑ کر انھیں روک لیا اور انگریز گارڈ نے اوپر سے جھنڈی کا ڈنڈا دکھا کر انھیں ڈیم کہا اور وہ اسی اسٹیشن پر سرکار کی دُہائی دیتے رہ گئے۔ مگر گاڑی نہ رُکی۔ سنا ہے کہ اگر کسی نیم انگریز کا کتا بھی پلیٹ فارم پر رہ جائے تو پنجاب میل تک روک دیا جاتا ہے۔ تب ہی تو کہتے ہیں کہ اگر بار ودلی میں مدن موہن مالوی صاحب وائسرائے سے نہ مل جاتے تو اب تک یہ ریلیں بھی ہماری جائیداد ہو جاتیں۔ پھر روزانہ یہ ہوتا رہتا کہ ہر سامنے آنے والے گاؤں پر گاڑی گھنٹوں کھڑی رہتی۔ بہر حال اب ہمارا اسپیشل ٹرین ایک بڑے اسٹیشن پر جو ٹھہرا تو اسٹیشن ماسٹر نے ہمیں تین آنے کی پوریوں اور کچوریوں کا شاندار ڈنر دیا، جس میں ملٹری سکریٹری اور انجینئر صاحب نے بھی بڑے فخر سے شرکت کی۔ فرق یہ تھا کہ جب یہ ڈنر پلیٹ فارم کے ایک درخت کے نیچے کھڑے کھایا جا رہا تھا۔ تو اس وقت ملٹری سکریٹری صاحب گھبرا کر یہ دیکھ لیا کرتے تھے کہ کوئی ہم کو پوریاں کھاتے تو نہیں دیکھ رہا۔ ہوتے ہوتے اب اس اسٹیشن پر پہنچے جہاں اعلیٰ حضرت ہز ہائنس کے خدام ہماری پیشوائی کو کھڑے تھے۔ ہم لوگ ابھی اسٹیشن سے باہر بھی نہیں نکلے تھے کہ خود بدولت ہز ہائنس نے ورود اجلال فرمایا اور ہم لوگوں کو جس وقت ہز ہائنس اپنے موٹر میں لے کر روانہ ہوئے تو اس وقت کبھی ملٹری سکریٹری صاحب اس خیال سے اکڑتے جاتے تھے کہ ہز ہائنس بہادر محض میری پوزیشن کی وجہ سے مجھے لینے تشریف لائے تھے اور کبھی ہم اس وہم میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ نہیں یہ محض حضور نے ایک ممتاز جرنلسٹ کی علمی قدر و عزت فرمائی ہے۔ اور کیا تاریخ رومہ میں یہ واقعہ نہیں پڑھا کہ ایک مرتبہ مئی کے مہینے میں سلطان محمود غزنوی ایسا جلیل الشان شہنشاہ فردوسی اور سعدی شیرازی کے استقبال کے لیے مکہ معظمہ تک پیدل گیا تھا۔ اور پھر بھی یہ دونوں اس کے ساتھ ڈیرہ اسماعیل خاں تک بھی نہ آئے۔ الغرض اس وقت اعلیٰ حضرت ہز ہائنس

بہادر اپنی ریاست کا دورہ فرمارہے تھے۔ شاہی کیمپ پر پہنچ کر کچھ دیر تک لطف کلام رہا پھر کھانا کھایا اور رات کے کوئی گیارہ بجے معلوم نہیں کس خوف سے تمام لوگ لحاف اوڑھ کر صبح تک چارپائیوں پر خاموش لیٹے رہے؟۔

آج شکار کا دن تھا یعنی ہماری موت اور زندگی کا امتحان۔ واضح ہو کہ شکار ایسے جرأت آزما معاملہ میں ایک ادیب اور جرنلسٹ کو اتنا ہی غیر موزوں سمجھیے جتنا چرخہ اور حصول سوراج کیونکہ جس طرح شاعر قدرت کی نازک ترین صنعتوں اور تخیل کی عقل آزما گہرائیوں کی تہہ تک حکمت کے رموز دریافت کر لیتا ہے اسی طرح ایک مضمون نگار اور نہیں تو جنگل کے ہر پتہ اور وادی کے ہر کنج کے اندر خواہ مخواہ شیر اور تیندوے کا وجود محسوس کر کے آن واحد میں اُتان وحیزاں ہونے لگتا ہے۔ یہ نہیں کہ بس لی بندوق اور سمجھ لیا کہ جنگل کے غیر تعلیم یافتہ ہمارے کر ہی کیا سکتے ہیں۔ غرض ہز ہائنس کے ساتھ موٹر میں جب بیٹھنا ہی پڑا تو ہم نے محض خاندانی وضعداری قائم رکھنے کے لیے اپنے چہرے پر بہادری کے آثار پیدا کر لیے، لیکن ایک مقام پر پہنچ کر ہز ہائی نس نے ہم سے اور اپنے ایڈوکیٹ جنرل اور ہوم سکریٹری سے فرمایا کہ آپ لوگ اس جگہ ٹھہر جائیے۔ ہم پارچہ دیکھ آئیں۔ یہ فرمایا اور چلے گئے۔ اب جو شامت آئی تو ہوم سکریٹری صاحب نے فرمایا کہ ''چلو بھائی معلوم نہیں ہز ہائی نس کب تک واپس تشریف لائیں ہم لوگوں کو اپنے پارچوں پر پہنچ جانا چاہیے''۔ اس ارشاد کے بعد ہم لوگوں کی بارات اس جنگل کی طرف روانہ ہوگئی جہاں خوفناک شیر اور درندے رہتے تھے، لیکن ایک مرتبہ پھر واضح رائے عالی باد کہ ''پارچہ'' کسی اونچے درخت کی ان شاخوں کو کہتے ہیں جن پر ایک عدد چارپائی باندھ کر شکاری بیٹھ جاتے ہیں اور ''ہانکا'' اس بے موقع شور اور غوغے کو کہتے ہیں جو کسانوں کی ایک جماعت جنگل میں مچاتی ہے تاکہ اس شور سے پوشیدہ درندے گھبرا کر نکل آئیں اور شکاری صاحب شکار فرمالیں۔ پھر اگر یہ ہانکا کسی صاحب بہادر کے لیے کیا جاتا ہے تو اس میں انتظام کی معقولیت اور رعایا پروری کی ارزانی یوں فرمائی جاتی ہے کہ شکار سے ایک دن پہلے ہی آس پاس کے تمام مصروف اور جاندار کسانوں کو تحصیلدار یا تھانیدار پکڑ لیتا ہے اور جس وقت یہ بھوکے پیاسے کسان چلاتے ہوئے جنگل سے درندوں کو بلا ہتھیار باہر نکالتے ہیں اس وقت تحصیل یا تھانے کے سپاہی یہ کہہ کر ان کسانوں کے سردار کر کی تواضع فرماتے جاتے

ہیں کہ: ''ابے زور سے چلاتے چلو''۔

غرض جب تینوں اعلیٰ افسر بلا کسی رہبر کے اس کبھی نہ دیکھے ہوئے جنگل کی طرف روانہ ہونے لگے تو ہمارے ہوم سکریٹری صاحب نے محض اس گھمنڈ پر کہ میں ہوم سکریٹری ہوں ایک ایسے ہی مصیبت زدہ کسان سے فرمایا کہ ''چل بے آگے ہو ہمیں پارچہ تک چھوڑ آ''۔

چونکہ ہندستانی کسان کوئی بالشویک کسان تو ہیں ہی نہیں جن کے ہاں اشتراکی اصول کے موافق غلامی اور تابعداری کوئی چیز ہی نہیں، اس لیے ہوم سکریٹری صاحب کی زبان حکومتِ ترجمان سے ''چل بے'' کا عزت افزا جملہ ہوتے ہی ایک چل بے صاحب ہمارے آگے ہوئے۔ یہ چل بے صاحب ایک ایسے برافروختہ کسان صاحب تھے جن کی عمر بارہ بیگھہ چھ بسوہ تھی۔ اور خدا جانے کس گاؤں سے آپ اس ہانکے میں پکڑے جو گئے تو آپ نے بھی دل میں ٹھان لی تھی کہ موقعہ پاتے ہی میں بدلہ لے ہی لوں گا۔ لہٰذا انھوں نے ہماری رہنمائی اس طرح فرمائی کہ بجائے ہز ہائی نس کے پارچہ پر پہنچانے کے دھر لیا بخطِ مستقیم ایک گھنے جنگل کے راستہ پر۔ اور ٹھہرا دیا ایک خطرناک دامن کوہ میں۔ اور یہاں پہنچ کر نہایت شرافت سے صاف جواب دے دیا کہ اب خود میں بھی رستہ بھول گیا۔ اُدھر ہز ہائی نس بہادر اپنے پارچہ پر پہنچ ہی چکے تھے۔ لہٰذا ہو گیا ہانکا شروع اور برآمد ہونے لگے درندے۔ گویا ہمارے ان رہنما صاحب نے صرف لفظ ''چل بے'' کی سوزش کا انتقام ہوم سکریٹری اور ہم ایسے شہرۂ آفاق انشا پرداز سے یوں لیا تھا کہ بس اِس ان دیکھے اور اَن بوجھے جنگل کے درختوں پر لٹک کر جان دے دیں اور ہماری اس تاریخی وفات سے رپوٹرا یجنسی اور ایسوسی ایٹیڈ پریس اور اخبارات تو ایک طرف خود اس جنگل کے قانون گو صاحب تک خبردار نہ ہونے پائیں، مگر وہ تو کہا ہے نا کہ:

بزرگی بہ عہدہ است نہ بہ علم و سال

لہٰذا ہم تو اپنی قلیل تنخواہ کے اعتبار سے رہنما صاحب کے اس فقرہ پر کچھ اشعار گنگنانے لگے، مگر ہوم سکریٹری صاحب نے اپنے عہدے اور پوزیشن کا اندازہ کیا تو سمجھ گئے کہ دیسی ریاستوں کا ہوم سکریٹری یورپ کی کسی بڑی مملکت کے وزیر داخلہ کا خسر ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا ان جناب نے کسان صاحب کے اس جواب صاف پر اُن کے جو ایک سودیشی دھپ رسید کیا تو ان

کے فرقدان مبارک سے دیسی سوت کابُنا ہوا ایک تھان زمین پر آ رہا اور فرمایا کہ:

''جا اسی وقت حضور ہز ہائی نس کا پارچہ ڈھونڈ کر آ، اور ہم کو وہاں لے جا''

اور تو کچھ نہیں ہمیں افسوس اس امر پر ہوا کہ کسان صاحب کے اس عمامہ میں قطب صاحب کی لاٹ کے برابر جو ایک چلم رکھی ہوئی تھی وہ سکریٹری صاحب کے اس کے بے تحاشا دھپ کے ضرب سے چور چور ہوگئی۔

غرض کسان صاحب تو پارچہ تلاش فرمانے لگے اور ہم نے یہ کیا کہ ایک املی کے درخت پر چڑھ گئے اور نہایت لیاقت سے سورۂ یٰسین شروع کردی۔ اتنے میں خدا کا کرنا کہ جھاڑیوں میں سے چلے آرہے تھے چہرۂ انور سے آثار صحرا نمودار، دوش مبارک پر جھولا پڑا ہوا اور دست اقدس میں کلہاڑی۔ بس اِن کو دیکھتے ہی ہوم سکریٹری صاحب سمجھے کہ ہو نہ ہو آپ وہی خضر علیہ السلام ہیں جو جنگل میں بھٹکے ہوئے مسافروں کو سرکاری پارچہ بتادیا کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ نے ان سے پارچہ ہی کی سمت دریافت فرمائی، لیکن ہم کو یہ فکر ہوگئی کہ کچھ بھی ہو لیکن خضر علیہ السلام ایک پیغمبر ہوکر کلہاڑی تو کبھی شاید نہ باندھیں گے۔ آخر کو وہی ہوا اور دریافت پر معلوم ہوا کہ آپ خود بھٹکے ہوئے تحصیل کے ایک سپاہی ہیں۔ اس وقت کا نقشہ یہ تھا کہ سامنے سے ہانکا آرہا تھا۔ یعنی سینکڑوں کسان شور کرتے ہوئے شیر اور تیندوے کو لا رہے تھے اور پشت کی طرف ایک ندی کے کنارے حضور ہز ہائی نس اور ممدوح کے ساتھی بندوقیں ہماری طرف سیدھی کیے بیٹھے تھے اور لطف یہ تھا کہ بندوق والوں کو اس امر کا علم نہیں تھا کہ ہماری بندوقوں کی عین زد میں چند لکھے پڑھے حرام جانور بھی درختوں پر بیٹھے مارے خوف کے سورۂ یٰسین پڑھ رہے ہیں۔ اِدھر ہوم سکریٹری صاحب پر درندوں کی آمد اور بندوقوں کے فیر کا جو خوف غالب ہوا تو بیٹھ گئے میدان میں اور لگے زور شور سے یہ مصرع پڑھنے کہ:

''اب جو ہو سو ہو''

مگر اسی بدحواسی اور مایوسی کی انتہا ملاحظہ ہو کہ اس وقت ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اگر اس شکار میں ہم گولی اور درندوں سے بچ گئے تو شکار کے ان حالات کو اخبار میں ضرور لکھیں گے سو لکھ دیے کہ سند ہوں اور وقت شکار کے کام آئیں۔

یہ ہے ایک ہلکا سا خاکہ امیروں کی شکار کا۔ دعا ہے کہ خدا کسی شاعر اور مضمون نگار کو شکار گاہ میں نہ لے جائے اور دعا ہے کہ خدا حضور ہز ہائی نس سے ہماری تنخواہ میں اضافہ تو کرا دے مگر ہمیں اپنے ہمراہ شکار گاہ میں لے جانے کی کبھی توفیق نہ عطا فرمائے۔ ہاں اس میں کوئی نواب یا راجہ ہمیں ہزار دو ہزار روپیہ پیشگی دے کر اپنے ہمراہ شکار گاہ میں لے جائے اور پھر دیکھے ہماری بزدلی اور بہادری کے کرتب مگر ایڈیٹر ریاست کہہ رہے تھے کہ اب ایسے فیاض والیانِ ریاست کو لارڈ ریڈنگ نے ہندستان میں رہنے ہی نہیں دیا کہ اس قدر رقم بھیج کر ہم کو آج ہی اپنے ساتھ شکار میں لے جاتے۔

◆◆◆

1925 کا قومی ہفتہ

ہندستان افلاس نشاں میں کوئی چالیس سال سے یہ بات چلی آرہی ہے کہ دسمبر کے اس مہینہ میں جب کہ انگریزی قوم کا سال ختم ہوتا ہے اور وہ اپنی فاتحانہ شادکامیوں اور اپنے مقبوضہ ممالک کی وسعت پر عید مناتی ہے۔ ہندستان کے کسی شہر میں ایک یہ آل انڈیا نیشنل کانگریس ''عرس'' منایا جاتا ہے۔ اس عرس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ اس میں بلا قوالی اور محفلِ سماع کے ہندی نسل کے چند ذی ہوش انسانوں سے یہ کہلوا دیا جائے کہ:

''انگریز ہندستان کو بلا جبر و اکراہ اور بلا مشارکت غیرے اندر میعاد ایک سال ہمیں تفویض کر دیں یعنی دے دیں ورنہ ہم لے کر رہیں گے''۔

گو ان اقوالِ سالانہ کے جواب میں لندن پارلیمنٹ سے ایک نیم انگریز خطرۂ ہندستان ہر سال گرج کر یہ جواب دے دیتا ہے کہ تم ابھی جاہل ہو، لیکن چونکہ عاقلانِ ہند کی ایک ارسطو سرشت اور فلاطوں حکومت جماعت اس امر پر متفق ہو چکی ہے کہ:

''قطرہ قطرہ بہم شود دریا''

یعنی اگر انگریزی قوم کی کثیر التعداد افواج اور محیر العقول اسلحہ جنگی بیڑوں اور ہوائی جہازوں کے ہوتے ہوئے بھی ہر سال باندازۂ یک خطبۂ صدارت کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہے تو کسی

دن یہ گفتار پیہم دریا ہو کر تمام انگریزوں کو مع آلات حرب ڈبو دے گی اور اس طرح بلا خونریزی کے ہندستان قبضہ میں ویسا ہی آ جائے گا جیسا کہ شاید ہمارے اسلاف نے بلا لڑے حاصل کیا تھا۔

جب اس غرض کے ماتحت یہ عرس منایا جاتا ہے تو اس کی رونق بڑھانے کے لیے چند چھوٹے چھوٹے میلے بھی لگائے جاتے ہیں مثلاً آل انڈیا خلافت کانفرنس، ایجوکیشنل کانفرنس، پریس کانفرنس، ہندی کانفرنس، والنٹیئر کانفرنس، چنیں کانفرنس اور چناں کانفرنس وغیرہ وغیرہ اور ان میں نام کی مناسبت سے مختلف کرتب دکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً:

خلافت والے کہتے ہیں کہ دنیا میں اب یا تو انگریز ہی رہیں گے یا خلافت!

ایجوکیشنل والے کہتے ہیں کہ صرف انگریزی جاننے والے تعلیم یافتہ ہیں باقی سب جاہل۔

ہندی زبان والے کہتے ہیں کہ دنیا بھر کی حکومتوں کو سرکاری زبان ہندی بنانی پڑے گی۔

پریس والے کہتے ہیں کہ ہندستان پر یا تو انگریز حکومت کریں گے یا ہمارے پتنگ کے کاغذ پر شائع ہونے والے اخبارات!!!

لہٰذا انھیں مقاصد کے ساتھ اس عرس میں شریک ہونا ہندستان کا بڑے سے بڑا انسان اور چھوٹے سے چھوٹا اناڑی جج اکبر نہیں تو عید کی نماز کے برابر واجب ضرور سمجھتا ہے۔ خواہ وہ دسمبر ہی کا مہینہ کیوں نہ ہو۔

الغرض یہ عرس اس سال شہر کانپور واقع صوبۂ متحدہ متصل لکھنؤ ڈاک خانہ کاکوری جہاں ریل پر حملہ کرنے والوں کو باغی کہہ کر گرفتار کر لیتے ہیں واقع ہوا۔ اور چونکہ انسان فطرتاً تماشہ طلب اور مناظر پسند واقع ہوا ہے لہٰذا اس خیال سے کہ کچھ دن سے ہم بھی انسان ہو گئے ہیں اور اس عرس میں ہندستانی موالید ثلاثہ کے تینوں عناصر بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ یعنی حیوانات، نباتات اور جمادات، اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ کانپور چلیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اپنے سفر کی کیفیت لکھیں ان کانگریسی موالید ثلاثہ کی تعریف کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔

حیوانات سے مراد جاندار اجسام کی وہ جماعت ہے جو اپنے آپ کو کانگریس کی عقل کل فراست و تدبر کا منبع سمجھتی ہے اور اپنی تمام تجاویز میں انگریزوں کے خلاف ڈانٹ ڈپٹ، دھمکی، الٹی میٹم، سوراج، چرخہ، ہوم رول، ترک موالات، تشدد، مقاطعہ اور کبھی کبھی فاقہ کشی اور روزے

تک کا اہتمام کرتی ہے اور اپنی ان تمام لامعنیات سے 28 دسمبر تک انگریزوں کو اگر لرزہ براندام نہیں تو ہنسا ضرور دیتی ہے۔

نباتات سے مقصود ہیں کانگریس کے عارضی کرایہ کے مکانات، پنڈال، سودیشی کیمپ، مصنوعی دروازے، نئے بازار، جلوس بندے ماترم، اللہ اکبر کے نعرے اور رضا کار جو محض اس ہنگامی اجتماع کے وقت پیدا ہوتے ہیں اور یکم جنوری کو جہاں سے پیدا ہوتے ہیں پھر وہیں چلے جاتے ہیں۔

کانگریس کی قسم جمادات میں وہ مقامی بے فکرے ملازمین گورنمنٹ، وفادارانِ سرکاری، اسکولوں کے لڑکے، مساجد کے امام، مندروں کے پجاری اور تاریک خیال تاجر و مہاجن داخل ہیں جو کامل ایک ہفتہ تک اپنے سر پر کانگریس کے ہنگامہ آرا اجلاسوں کے طاری رہنے کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ کانگریس کے پنڈال میں ٹکٹ لے کر شریک ہونا تو بڑی بات ہے وہ یہ بھی دریافت نہیں کرتے کہ یہ ہنگامے ہمارے شہر کے کس محلّہ میں ہو رہے ہیں۔ بہ شکل جمادات دن بھر اپنی دکانوں پر جمے رہتے ہیں گویا اس سال ان کے شہر میں کچھ ہوا ہی نہیں رہا۔

ایک ہندستانی خصوصاً بقدر تھرڈ کلاس مقدرت والے مسافر کے لیے گھر سے چلتے وقت ''ہمیں بھی لے چلو'' کا خطرہ جس درجہ سوہانِ روح ثابت ہوتا ہے اس کا نتیجہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ آدمی بازار جانے کے بہانے سے نجد و حجاز تک ہو آتا ہے لیکن ''مچلنے والوں'' کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ آپ تھے کہاں۔ پس کچھ ایسی ہی کشمکش کے رونما ہونے پر ہم نے بہ کمال ہوشیاری گاڑی آنے سے دو گھنٹہ پہلے بستر محلّہ کے ایک مکان میں منتقل کر دیا اور پھر گھر میں کچھ ایسے مصروف ہو گئے گویا اب ہمیں کہیں جانا ہی نہیں، لیکن برا ہو اس تماشہ پسندی کے لپکے کا جب یہ پڑ جاتا ہے تو اس کا چھوٹنا، اتنا ہی محال ہو جاتا ہے جتنا سید جالب صاحب دہلوی کے لیے اخبار ''ہمدم'' کی ایڈیٹری کا چھوڑنا۔ پس عین اس وقت جب کہ وہ ہمیں تاک رہے تھے ہم نے بھی مٹی کے چند خشک ڈھیلے اٹھائے اور کھانستے ہوئے روانہ ہوئے گویا ہم کانپور نہیں بلکہ رفع شر کے لیے گھر سے میونسپل ہال تک جا رہے ہیں۔ اب انھیں تو یہی خیال ہوگا کہ ہم اس سودیشی محکمہ حفظانِ صحت میں سرگرمِ عمل

ہیں، لیکن اتنے وقفہ میں ہم وطن سے کوئی دو اسٹیشن نکل گئے تھے اور الحمدللہ کہ تھرڈ کلاس کی ہر مصیبت کو انگریزی تمکنت اور اینگلو انڈین تکبر کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے کانپور کے اسٹیشن پر جا پہنچے۔ ریل سے اتر کر پلیٹ فارم کے تنگ دروازہ پر کسانوں کی بستر بردار جماعت کی دھکا پیل اور تانگوں کے میدانِ جہاد میں یوں تو کانگریس کے تمام اجلاسوں کا لطف آ گیا تھا، مگر وہ تو بوالہوسی تھی کہ پھر بھی تلک نگر کا حوصلہ کیا۔

چونکہ یہ فدوی عفی عنہ اس شہر کانپور میں بسلسلۂ تعلیم صدہا سال رہ چکا تھا اور راتوں کو ایک بظاہر مولوی صورت بزرگ کے ساتھ محض تفریحِ طبع کے لیے یہاں کی تاریک سے تاریک گلی سے واقف تھا اس لیے بلا تانگہ مع بستر آنکھیں بند کر کے جو کھولیں تو خود کو ایک کانپوری کرم فرما کے مکان پر پایا۔ اطلاع ہوتے ہی ہمارا سانس قائم ہونے سے پہلے آ کر جھوم گئے اور پُر تپاک خیر مقدم کے بعد صحن خانہ سے مع بستر ہمارا جلوس نکالتے ہوئے اوپر کی منزل میں لے گئے۔ جو کارخانہ پارچہ بافی یا بکنگھم پیلس لندن سے کسی طرح کم آراستہ نہیں تھی۔ اب کے جو تلک نگر کے کسی کھدری کیمپ میں قیام نہیں کیا، اس کا سبب جہاں چند اخبار نویسانہ وجوہ تھیں وہاں مسلمان لیڈروں کا وہ قحط زدہ چہرہ بھی تھا جو بادصف ملاقات کے ایسے مواقع پر محض اس لیے شدت سے خشک کر لیا جاتا ہے کہ "کہیں ہمارے پاس نہ ٹھہر جائیں"، مگر کسے خبر تھی کہ جو ملا رموزی ایک کانپوری بیرسٹر کی کوٹھی پر مقیم ہے وہ خدا جانے کس طرح اور کس رنگ میں کانگریس و خلافت کانفرنس کے ڈائس کے قریب پہنچ کر مقرروں اور لیڈروں کی بدحواسیوں اور غلط کاریوں کے فوٹو کھینچ لے گا۔

تلک نگر میں جہاں خلافت اور کانگریس کے اجلاس ہوئے اگر ہمارے لیے کوئی مشکل کام تھا تو وہ صرف یہ کہ خود کو واقف کار لیڈروں اور شناسا ایڈیٹروں سے اس طرح چھپائے رکھیں کہ وہ ہمیں پہچان نہ سکیں ورنہ اظہار و ملاقات پر خطرہ تھا کہ بہت سی غلطیاں چھپالی جاتیں۔ لہٰذا بجز مولانا محمد علی کی ایک گھبرائی ہوئی نکر اور مولانا نیاز فتح پوری اور مولانا عبدالحلیم صدیقی کے ہمیں کسی نے نہیں پہچانا۔ اب اس خاص ہندستانی نوآبادی میں پہنچ کر سب سے پہلے ہم نے لیڈروں کے کیمپ جھانکے۔ اس تاک جھانک سے مقصد یہ تھا کہ جو لیڈر عوام کو ترکِ موالات کی تعلیم دیتے دیتے

جوان ہو گئے ہیں وہ خود کس قدر عامل ہیں؟ چنانچہ اس مقصد میں ہمیں 95 فیصدی کامیابی ہوئی۔ مثلاً ایک لیڈر کے کیمپ میں کسی انگریزی کمپنی کے بنے ہوئے تولیا تولیے دیکھے جو منہ ہاتھ صاف کرنے کے لیے ایک رسی پر لٹک رہے تھے۔ ایک لیڈر صاحب کو دیکھا جو خالص انگریزی کمبلوں میں پارسل پیکٹ بنے چارپائی پر رکھے ہوئے تھے۔ ایک لیڈر صاحب کی خدمت میں خالص انگریزی سگریٹ کے دو عدد ڈبے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ایک کیمپ میں گنجفہ کھیلا جارہا تھا۔ گویا یہ لوگ اس وقت قوم کے مصائب یاد کر کے تاش کے ذریعہ ماتم منا رہے تھے۔ ایک مسلمان لیڈر صاحب کا لحاف اور تکیے اس درجہ مکلّف تھے گویا آپ آج اسی پر تکلف لحاف کو اوڑھ کر جمعہ کی نماز پڑھانے جانے والے ہیں۔ عام اخبارات میں مولانا شوکت علی کو بڑے بھائی لکھتے ہیں، لیکن ہم نے کانپور میں ان کا ضد پیدا کر لیا یعنی گاندھی صاحب جو اپنی لاغری اور ضعف میں مولانا شوکت علی کی نوٹ بک معلوم ہوتے تھے۔ چونکہ ان کے ساتھ اس وقت کچھ امریکن مرید اور مریدنیاں بھی تھیں اس لیے ہم نے ان کی قیام گاہ کے بہت چکر کاٹے تا کہ ان کے قریب بھی کچھ مل جائے، مگر بجز چند معمولی باتوں کے کوئی خاص بات نہیں ملی البتہ ان کے ایک معتقد کو ایک دن ناشتہ کرتے پالیا جو انگریزی کا ڈبہ چاقو سے کاٹ رہے تھے۔ کھدر پوشی کے لحاظ سے یوں تو ہر لیڈر اچھا خاصا قبل مسیح کا انسان نظر آتا تھا، لیکن ایک ہندو صاحب کی کھدری عبا جب ہوا کی وجہ سے غبارہ بن گئی تو اس کے اندر سے انگریزی بنیائن اور انگریزی چکن کی قمیض صاف نظر آ گئی تھی۔ ہندو لیڈروں کی قیام گاہوں پر صبح جو مسواک کی جاتی تھی، اس کی آواز پر گمان ہوتا تھا کہ یہاں ہیضہ پھیل گیا ہے اور استفراغ کے نعرے زور شور سے لگائے جارہے ہیں۔ البتہ کچھ مولانا قسم کے لیڈر کہیں کہیں محو تلاوت قرآنی بھی نظر آئے جو ہمیں قریب سے گزرتا پا کر زیادہ زور سے پڑھنے لگے۔ یہ ان کا خلوص تھا ریاکاری نہیں۔ صبح کی نماز میں جماعت کے اندر جو کمی نظر آتی تھی وہ شب کی قومی مصروفیت کی وجہ سے تھی جو قابلِ گرفت نہیں۔ البتہ بعض اخبار نویسوں کو یہاں جبری بھرتی کی طرح جبری نماز بھی اختیار کرنا پڑی تا کہ ساتھیوں میں بے نماز مشہور نہ ہوں۔ ان میں ہمارے ایک دوست بھی تھے جو بلا معاوضہ ہمارے ہر مضمون کو شکریہ کے ساتھ شائع کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

آج کانگریس کے عظیم الشان اجلاس کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ہم نے غسل کر کے سُرمہ لگایا اور محترم میزبان کا فاتحہ پڑھ کر روانہ ہوئے۔اس مرتبہ اس قوم پرست طبقہ سے ٹکر ہوئی جو ایسے مواقع پر لیڈروں کی تقریروں کو نوٹ کر کے محض ملک وقوم کی محبت میں ان پر مقدمہ چلا کر کالے پانی پہنچادیتا ہے۔ان کے چہرے ''بہشتی زیور'' سے کم منور نہیں تھے۔البتہ وہ کسی لیڈر کو قریب سے گزرتا پا کر صرف ذرا اڈر جاتے تھے۔جیبوں میں وہ نوٹ بکیں محفوظ تھیں جن میں کسی لیڈر کی غلط تقریر تو کیا البتہ دعائے گنج العرش اور درود تاج لکھی ہوتی ہے اور اسے جلسہ گاہ میں نکال کر عوام کی نظریں بچا کر کبھی کبھی پڑھ لیتے ہیں۔پھر معلوم نہیں لوگ انھیں کیوں سی۔آئی۔ڈی کہتے ہیں؟
آج سب سے زیادہ شوق صدر کانگریس سروجنی نائیڈو کے دیکھنے کا تھا،جنھیں ہم نے سات آٹھ برس سے نہیں دیکھا تھا۔جس وقت یہ کانگریس کے پنڈال میں داخل ہوئیں تو ہزار ہا آدمیوں نے ''ملا رموزی کی جے'' کا پُرزور نعرہ لگایا۔پولیس والے تو کہتے تھے کہ کوئی پندرہ ہزار کا مجمع ہے مگر 33 کروڑ کی نمائندہ کانگریس میں ان پندرہ ہزار کو دیکھ کر ہم ہندستانیوں کی بیداری اور ذوقِ آزادی کا جشن منا رہے تھے۔پنڈال بہت سادہ تھا۔ڈائس پر گاندھی (بڑے بھیا)،تلک،موتی لال اور باردولی کے موقع پر وائسرائے اور بڑے بھیا سے ملاقات کرنے والے پنڈت مدن موہن مالوی کی تصویریں آویزاں تھیں۔البتہ تلک اور داس آنجہانی کی تصویریں زیادہ صاف نظر آتی تھیں۔چند لیڈروں کے مقولے بھی تھے۔مثلاً بڑے بھیا کا مقولہ تھا 'ایماندار بنو۔' 'اصلاح خاتمہ'،(داس) کا مقولہ تھا۔ڈائس کے سامنے کا مقولہ تھا 'اتحاد طاقت ہے' کاش ہمارا بھی یہ مقولہ کوئی لٹکا دیتا کہ مضمون نگاروں کو معاوضہ دو۔ڈیلی گیٹ اور تماشائی بارہ بجے سے آنا شروع ہو گئے۔مزہ تو اس وقت آیا جب کوئی ڈیڑھ بجے اجمیر کے ڈیلی گیٹوں نے جبراً پنڈال میں داخل ہونے کی کوشش کی اور کانگریسی رضا کاروں نے انھیں لکھنوی لہجہ میں روکنے کی جدوجہد کی،لیکن جب ارجن لال سیٹھی دروازہ پر لیٹ گئے تو لاٹھی اور ڈنڈے کا مشاعرہ منعقد ہو گیا۔اس وقت پنڈال کے اندر بعض سورما بے طرح غزلیں پڑھنے لگے جس کی ردیف 'بھاگو' اور قافیہ 'لاٹھی چل گئی' تھا۔کیوں صاحب اگر اس وقت پنڈال میں نام کو بھی جنرل ڈائر کہیں دکھائی دے جاتے تو مارے بہادری کے ہم سب لوگوں کا کیا حال ہوتا؟ بہرحال واپسی پر یہ سنا کہ ارجن لال سیٹھی،

مولانا حسرت موہانی اور بعض غیر معروف تماشائیوں کے ٹیپ کے بند اچھے رہے اور کانگریسی رضا کاروں نے انھیں خوب خوب داد دی۔

ڈھائی بجے کے قریب باجوں کی آواز آئی۔ سب سے پہلے پنڈت موتی لال نہرو داخل ہوئے۔ ان کے سیدھے بازو پر لالہ لاجپت رائے، پھر ڈاکٹر مراری لال، مولانا ابوالکلام آزاد۔ بڑے بھیا کے داخل ہونے پر پھر لوگوں نے دیر تک ملّا رموزی کی جے کا نعرہ لگایا۔ اب جو سروجنی نائیڈو پنڈال میں داخل ہوئیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی بھی سایہ کی طرح ساتھ ہیں۔ برے بھائی کی پُرسکون آمد کا تو کیا کہنا۔ ایم۔ آر۔ جے کار، سری نواس آئینگر، ڈاکٹر انصاری، پرشوتم داس ٹنڈن، ایم سین گپتا، ولا بھائی پٹیل وغیرہ جب لیاقت سے بیٹھ گئے تو ڈاکٹر بہاری لال صاحب نے اکڑ کر استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد مسٹر گردھاری لال نے وہ پیغامات پڑھے جن میں کانگریس کے اجلاس میں عدم شرکت کی معافی کے ساتھ چند وصیتیں اور نصیحتیں بھی تھیں۔ ان میں لارڈ سنہا، مسٹر جناح، سید رضا علی، ڈاکٹر ٹیگور، مسز اینی بسنٹ وغیرہ کے پیغامات تھے۔ لیکن ان تمام پیغاموں میں سب سے زیادہ کارآمد پیام سی۔ آر۔ داس آنجہانی کی بیوہ کا تھا جنھوں نے لکھا تھا کہ:

''نہ بجھنے والی آگ کو روشن کیجیے تاکہ آزادی کی جنگ اس کے شایانِ شان لڑی جائے''۔

اس کے بعد سروجنی نائیڈو صاحبہ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ پھر منجانب صدارت مسٹر سی آر داس کی موت پر اظہارِ ملال کا ریزولیوشن پیش ہوا، جسے ہم نے بھی کھڑے ہو کر پاس کر دیا۔ اس کے بعد بڑے بھیا نے اردو زبان میں ہندیانِ جنوبی افریقہ کے متعلق ایک تجویز پیش کی، لیکن درمیان میں کھانسی آ جانے کے باعث انگریزی زبان میں تقریر ہونے لگی۔ اب جو مولانا محمد علی نے تقریر شروع کی تو ہم نے سمجھ لیا کہ بس کاروائی ضابطہ شروع ہو گئی۔ لطف تو اس وقت آیا جب ہمارے قریب ایک صاحب دیر سے کانگریس میں کسی کو دیکھ رہے تھے اور ہم انھیں تاک رہے تھے کہ یکایک انھوں نے ہمیں دیکھ لیا اور مارے لطف کے خضاب لاجواب بن کر رہ گئے۔ غرض کانگریس کی تمام کارروائی کے بعد بطریق نتیجہ ہم کو یہ احساس ہوا کہ ریلوے کمپنیوں کو خوب آمدنی ہوئی۔ دکانداروں کو کافی کامیابی ہوئی۔ کئی ہزار ہندستانی جاڑے مرے۔ ہمارا ریل کا کرایہ مفت گیا اور

کانگریس ہوگئی پارسال پھر آسام میں ہوگی اورانشاءاللہ ہم قیامت کے دن آزاد ہو ہی جائیں گے۔

خلافت کانفرنس میں کوئی خاص بات نہ تھی سوائے اس کے کہ اس کے پنڈال بنانے والے ضرور کوئی شیخ الاسلام تھے جنھوں نے اسلامی مساوات کالحاظ فرماتے ہوئے اسٹیج کو اس قدر نیچا بلکہ صندوقی قبر بنادیا تھا کہ عام حاضرین اور اسٹیج میں کوئی خاص بلندی باقی نہیں تھی۔ جن لڑکوں نے قرآن پاک کی تلاوت کی انھیں یہ نہیں بتلایا تھا کہ تم درمیان میں کہیں سانس بھی لے لینا۔ جب صوفی حسرت موہانی نے استقبالیہ کمیٹی کا خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اور سلطان ابن سعود کی مخالفت میں ان پر چند الزامات لگائے تو پنجابی نمائندوں سے نہیں رہا گیا اور انھوں نے ''جھوٹ جھوٹ'' ''غلط غلط'' کے آوازے کسے۔ ان میں سب سے بلند آواز غازی عبدالرحمٰن صاحب کی تھی جب غلط غلط اور ٹھہرو ٹھہرو کے آوازوں کی فٹ بال ہونے لگی تو مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ سکون سے خیالات سنو، مگر جب اس پر بھی پنجابی بھائیوں نے سکوت نہ فرمایا تو قبلہ حسرت موہانی نے آہستہ سے ''معاف کیجیے'' فرما کر پیچھا چھڑالیا۔ خلافت کانفرنس میں بڑے بھیا اور مسز سروجنی نائیڈو داخل ہوئے اور معلوم نہیں کیوں گھبرا کر ایک ایسی جگہ بیٹھ گئے جو بیٹھنے کی نہیں تھی اور ہمیں صاف نظر بھی نہیں آرہی تھی۔ شاید وہ کوئی صندوق تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جب زنانے کا خطبہ ارشاد فرمایا تو تھکن دور ہوگئی۔ نتائج کے لحاظ سے خلافت کانفرنس کسی قدر کامیاب رہی کیونکہ اگر موصل پر جنگ چھڑ گئی تو جیل خانہ کے لیے مسلمانوں کو ورغلا لیا ہے۔ جدہ میں خلافت کمیٹی کا تقرر بھی اچھی تجویز ہے۔ مگر اس کی صدارت سوائے ہمارے کوئی دوسرا قبول بھی نہیں کرسکتا۔

عملی روح اگر کسی کانفرنس میں دیکھی تو وہ صرف کمیونسٹ کانفرنس تھی جس کے اجلاس میں بے موقع بھوک پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہم شریک نہ ہوسکے۔

یہ تھے وہ اجلاس جن میں 33 کروڑ باشندوں کے اعلیٰ ترین دماغ آزادی کے حصول کے لیے جمع ہوئے تھے۔ مگر کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ اس مرتبہ کانگریس اپنا سارا زور صرف ہندو مسلم اتحاد پر صرف کردے۔ آخر میں اپنے محترم میزبان کے موٹے موٹے لحافوں کا شکریہ جن کے اندر ہم شدید جاڑے میں خفیہ پولیس بنے رہے۔

◆◆◆

علی گڑھ جبلی

تانگے والوں، شوفروں، سپاہیوں، بے فکروں، لوہاروں، نجاروں، معماروں، بلفی مہاجنوں اور تاریک خیال مولویوں کی آبادی کو اگر اسلامی ہند کہتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، لیکن اگر اسلامی ہند سے مراد وہ مسلمان آبادی ہے جس میں علماء، فلاسفہ وصلحا، مصنفین، مؤلفین و مؤرخین، ارباب سیاست واصحاب فکر وفراست داخل ہیں تو ہم آپ سے کہتے ہیں کہ ان سب کے نزدیک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا وقار اس کی عظمت وعزت نہایت رفیع ہے، لیکن اس سربرآوردہ جماعت میں یونیورسٹی یا علی گڑھ کالج کی تمام تر توقیر وسربلندی سرسید علیہ الرحمۃ کے اس اعلان کی بنا پر ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ:

> ''یہاں کے فارغین علم وحکمت کے اکتساب کے ساتھ ہی قومیت ومذہبیت کے زندہ کرنے والے ہوں گے''۔

مرحوم کا یہ وہ اعلان تھا جو دنیا کے متمدن سے متمدن ممالک اپنی تعلیم گاہوں کے متعلق کیا کرتے ہیں۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ متمدن ممالک کی ایسی ہی تعلیم گاہوں کے نتائج ہیں جن میں آج انگریزوں سے لے کر وہ بدوی افراد بھی شامل ہیں جو کسی ایسی ہی قومی درسگاہ سے استفادہ کر کے اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے مذہب کے لیے وجۂ افتخار وعزت بنے اور یہی وہ تصور ہو سکتا

ہے جس کے ساتھ ہندستان کا ہر صاحب علم وبصیرت علی گڑھ کو دیکھنا چاہتا ہے۔

لہٰذا ہم جو آج سارے ہندستان میں سب سے زیادہ قابل، لائق ایم۔اے، مولوی فاضل، روشن خیال، بیدار مغز اور مفلس واقع ہوئے ہیں کچھ ایسے ہی تصورات کے عملی نمونے دیکھنے کے لیے علی گڑھ جانے کے لیے تیار ہوئے۔ گو پچاس سال کے عملی نمونے خوب خوب دیکھ لینے کے بعد اس مرتبہ پھر علی گڑھ جانا اور ''آزمودہ را آزمودن کا'' بقیہ حصہ ضرور تھا، لیکن جس طرح ایک اردو شاعر کسی جگہ ''مشاعرہ'' کی خبر سن کر بلا اذن بھی طرح میں غزل کہنے پر مجبور ہے ٹھیک اسی طرح ایک علمی آدمی خصوصاً اخبار نویس کے لیے کسی جگہ بھیڑ اور ہجوم کی اطلاع بس ہے۔ خاص کر ایسے وقت میں علی گڑھ نہ جانا جب کہ ''کارکنوں'' نے ذوق نظر، کے بھی تمام اسباب فراہم کرنے کا اعلان کر دیا۔ تھا نہ کفران تماشہ؟

پس آل انڈیا نیشنل کانگریس کانپور کے قل سے فراغت ہوئی تو وطن واپس ہونا دوبھر ہو رہا تھا اور چشم تماشہ طلب کو ''کسی نئے مجمع'' کی تلاش میں جب جمائیاں آنے لگیں تو کانپوری میزبان کی اجازت کے بعد پوری آن بان سے بستر کو ایک لکڑی میں لٹکا کر کاندھے پر رکھ سانس جوڑ کا تو کانپور کے بڑے اسٹیشن پر جا پہنچے اور پوری عجلت سے بستر فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کے سامنے رکھ دیا تا کہ رخصت کرنے والے احباب اور احبابیات سمجھیں کہ ہم فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والے ہیں۔ اتفاق سے آج مسافروں کی تھی کثرت جب ہم نے ''بابو جی'' سے فرسٹ کلاس ٹکٹ مانگا تو انھوں نے کہا کہ آپ دیر میں آئے، اس لیے فرسٹ اور سیکنڈ کے ٹکٹ تو فروخت ہو گئے۔ البتہ تھرڈ کلاس کے کچھ ٹکٹ امانتاً میرے پاس ہیں ان میں سے ایک دے سکتا ہوں وہ بھی آپ کی لیڈرانہ پوزیشن کے اثر سے، لہٰذا ہم نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا جو ہماری عادت کے قطعاً خلاف تھا، لیکن 1923 میں ایک علی گڑھی بیرسٹر صاحب کے ساتھ فیض آباد سے پٹنہ تک کا سفر کیا تھا جس میں انھوں نے ہمیں یہ سکھا دیا تھا کہ:

> ''صرف انگریزی لباس پہن لو اور تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر فرسٹ میں بیٹھ جاؤ، جب منزل مقصود بقدر دو اسٹیشن رہ جائے تو اس ٹکٹ کو فرسٹ کے ٹکٹ سے بدلوا لو''۔

پس اس حساب سے جب ہم اسٹیشن ''ہاتھرس'' پر پہنچے تو اسٹیشن ماسٹر سے وہی سبق دھرا دیا، لیکن اس کو کیا کہیے کہ اسٹیشن ماسٹر ہاتھرس بھی تھے ہمارے ہی بھائی فوراً تاڑ گئے۔ مگر پورے ضبط کے ساتھ مسکرا کر فرمایا کہ جہاں آپ اتنی دور تھرڈ کلاس میں آئے ہیں وہاں علی گڑھ تک اور تھرڈ ہی میں چلے جایئے۔ اس وقت مارے خوشی کے ہمارے چہرہ کا جو رنگ تھا اسے تو دیکھا صرف خدا نے لیکن ہم نے بھی ارادہ کرلیا کہ اب فرسٹ کلاس ہی میں جائیں گے۔ لہٰذا اس حالت میں کہ بستر تو تھرڈ میں اور ہم فرسٹ میں۔ جوں ہی علی گڑھ کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا کیا دیکھتے ہیں کہ ڈپٹی کلکٹر کے چچا ٹکٹ کلکٹر سلام کررہے ہیں۔ ہم جواب سلام بھی نہ دینے پائے تھا کہ ٹکٹ کا مطالبہ ہوگیا۔ ہر چند اس وقت سوائے خدا کے ہمیں دنیا میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، پھر بھی ہم نے خود کو سنبھال کر یہ ترکیب اختیار کی کہ زناٹے سے انگریزی بولنا شروع کردیا جس کا ایک حرف بھی وہ نہ سمجھے لیکن جب اس پر بھی ٹکٹ کلکٹر ہی بنے رہے تو اردو زبان میں صاف صاف کہہ دیا کہ:

''اودھ کے شاہی خاندان کے مٹے ہوئے رکن ہیں۔ گورنمنٹ نے وثیقہ تک ضبط کرلیا ہے تمھیں کیا خبر کس رنگ میں رہتے ہیں؟''۔

تھا کوئی بھلا مانس خاموش رہ گیا اور ہم مع بستر پلیٹ فارم کے دروازہ سے جا لگے مولوی... ایم۔اے، ایل ایل بی اور مسٹر بی ایس سی، حیدرآبادی علی گڑھ میں ہماری تاریخ ولادت سے باخبر تھے۔ دیکھا تو سامنے کھڑے ہانپ رہے ہیں، ہمیں دیکھتے ہی مارے خوشی کے فٹ بال بن گئے۔ ادھر ہم نے بھی بستر برداری کی خفت یوں دور کی کہ غصہ کا چہرہ بنا کر بستر دے مارا اور کہا لاحول ولا کوئی قلی تک نہیں۔ اب جو نظر اٹھا کر دیکھا تو رضا کاروں کا تھیٹر ہو رہا تھا۔ ایک لیڈر صاحب سے دس بارہ رضا کار جھوے جا رہے تھے۔ کوئی بستر چھینتا تھا تو کوئی صندوق۔ وہ تو لیڈر صاحب نے لباس مضبوط پہن رکھا تھا ورنہ رضا کاروں کا جذبۂ فدویت اسے بھی بستر بنا دیتا۔ معلوم ایسا ہو رہا تھا کہ اس وقت وفد حجاز بندرگاہ رابغ پر اترا ہے اور سلطان ابن سعود کی نیلی وردی والی فوجیں اسے اپنی حفاظت میں مکہ معظمہ تک پہنچانے کے لیے گھیر رہی ہیں۔

آج بڑے سویرے مسلم کا اجلاس ہے۔ خدا علی گڑھ کے تانگے والوں کو نمونیہ کے مرض

سے بچائے رکھے۔ صبح کی اذان ہی کے وقت ''تانگہ حاضر ہے'' کی عدالتی آواز آگئی، گو اس وقت ہم کانپوری سفر کی تھکن اور سردی کے پیاپے حملوں سے شکست کھا کر لحاف سے دلچسپی، سینہ چسپی اور ہاتھ پاؤں چسپی فرمارہے تھے، لیکن وہ تو آئے اسی غرض سے تھے، وضو کے ایمان آزما امتحان سے فارغ ہو کر ساتھیوں کو اٹھایا۔ مگر سردی کا یہ عالم تھا کہ آج صبح کی نماز میں دو سنتیں اور دو فرض ہی پڑھ کر رہ گئے۔ تانگہ نہایت خوش گلو تھا جس کے ہر عضو سے ترنم اور موسیقی کے نغمے بلند ہو رہے تھے۔ چونکہ تانگہ میں ہم پیچھے کبھی نہیں بیٹھتے، اس لیے کہ اس حساب سے آدمی اُلٹا چلتا ہے جو صریح حماقت ہے۔ لہٰذا تانگے والے کے پاس بیٹھ گئے۔ اتفاق سے تانگہ کلاک ٹاور کے پاس سے گزرا اور چونکہ اس سے قبل ہم یہاں کے جغرافیہ سے واقف نہیں تھے لہٰذا یہ سمجھ کر کہ کلاک ٹاور کسی بڑے بزرگ کا مزار ہے گئے فاتحہ پڑھنے۔ تانگہ والے کو جو دیکھا تو مسکرا رہا تھا۔ بس اس کی ہی مسکراہٹ پر ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور معاملہ اس سے آگے نہ بڑھنے پایا۔

بڑی فکر یہ تھی کہ جبلی کے میدان حشر میں خدا دو جماعتوں سے پالا نہ ڈالے، ایک وہ جس میں ہمارے وطن کے بڑے لفظی دوست بڑے لفظی ہمدرد اور بڑے لفظی قدر دان شامل ہیں۔ دوسری وہ جماعت جس میں ایسے ایڈیٹروں کا خطرہ تھا جن کے ساتھ ہم نے کام کیا، روٹیاں کھائیں اور بازاروں میں گھومے، مگر ہم نے ترکیب یہ کی کہ ایک چادر اوڑھ لی تھی جہاں کوئی شناسا ملا فوراً ''زیرِ نقاب'' والا معاملہ کر لیا، پھر بھی سلطان جہاں منزل میں وطن کے تین آدمیوں اور ایڈیٹرس کانفرس میں پانچ ایڈیٹروں نے پہچان ہی لیا۔ اب ہم مع اہل و عیال یعنی ہمراہیوں سمیت اس میدانِ حشر میں داخل ہوئے، جہاں جبلی کے فلک بوس اور خیمے تنے ہوئے تھے۔ جس وقت اس کے دروازہ پر پہنچے تو سائنٹفک تختہ نظر آیا جس کے حروف میں رنگا رنگ پانی دوڑا کر ''ویلکم'' کے الفاظ کو روشن کیا جاتا تھا۔ اس انگریزی زبان کے ''ویل کم'' کے سوا جب ہم نے اس کے قریب اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، پنجابی، گجراتی غرض کسی ایک ہندستانی زبان میں بھی ''خوش آمدید'' کا تختہ نہ پایا تو ہم کسی قدر جھجک گئے اور خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ تمام میدان ''صرف انگریزوں کی آمد'' کے لیے ہے، مگر وہ تو مسٹر بی۔ ایس۔ سی نے کڑک کر کہہ دیا کہ:

''یہ پہلا نمونہ ہے یہاں کی تربیت کا کہ ہم اپنی مادری زبان کی محبت اور عظمت سے

بیگانہ ہو گئے''۔

آگے جو بڑھے تو معاملہ اس سے بھی زیادہ خطرناک نظر آیا۔یعنی ایک بورڈ پر لکھا تھا:
''جہل مرکب''ہم نے فوراً ہی قدم روک لیے اور گھبرا کر بی۔ایس۔سی سے کہا کہ ''بھاگو، بھاگو''
انھوں نے کہا خیر تو ہے۔ہم نے کہا دیکھتے نہیں جاہل گھوڑا اس طرف بندھا ہوا ہے۔انھوں نے کہا
کہ یہ مَرَ کَبْ نہیں مُرَ کّب'' ہے۔یعنی کسی تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اقتصادی پستی دور کرنے کے لیے
رسالہ سودمند کے ساتھ رسالہ ''جہل مرکب'' جاری کیا اور اردو ادبیات میں مسلمانوں کی اس
حالت کو نمایاں کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی نام بھی نہیں تھا اور جو آگے بڑھے تو جبلی کے
محکمات انتظامی کے دفاتر نظر آئے جہاں دفتر تنظیم کانفرنس کے دروازہ پر ڈاکٹر کچلو صاحب کے
سودیشی پرائیویٹ سکریٹری منشی حسین میر ایڈیٹر اخبار لاحول کھڑے مسواک کر رہے تھے۔انھیں
دیکھ کر اور ان کے اخبار کا نام یاد کرکے بی۔ایس۔سی فوراً ہی بولے لیجیے یہ تیسرا نمونہ۔

غرض اب مناسب یہی سمجھا کہ جلد پنڈال میں پہنچ جائیں۔ہمارا داخلہ چونکہ غیر سرکاری تھا
اس لیے کوئی سلامی نہیں اتاری گئی۔پنڈال یوں تو نہایت سائنٹفک اصول سے بنایا گیا تھا۔مثلاً
پھونس کے چھپروں کو نیلے اور سفید رنگ کے کپڑوں سے ایسا من تو شُدم تو من شُدی کر دیا تھا کہ ایک
پختہ عمارت اور اس میں فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔اسٹیج پر سرسید، حالی اور محسن الملک کی تصاویر تھیں۔
چونکہ ہماری تصویر دیر میں پہنچی تھی اس لیے آویزاں نہیں کی گئی۔البتہ اخبار نویسوں اور رپورٹروں کی
نشست اس جگہ بنائی گئی تھی جہاں کسی تھیٹریکل کمپنی آف انڈیا میں ہارمونیم ماسٹر بیٹھتا ہے،یعنی اسٹیج
کے نیچے۔اور اسی لیے ہم نے اس نشست میں بیٹھنا توہین سمجھا۔حاضرین کی تعداد اس لیے کم تھی کہ
مسلمانوں میں صرف ذرا نا اتفاقی کافی پھیل گئی ہے۔جو کوئی نقصان کی بات نہیں۔جب حاضرین
شور و غوغا سے فارغ ہوئے تو ناظم اعزازی مسلم لیگ نے رپورٹ سنانا شروع کی جو خدا ہی کے فضل
سے ختم ہوئی اور سر عبدالرحیم صاحب نے اپنا خطبۂ صدارت شروع فرمایا جو خالص انگریزی زبان
میں تھا گویا ہم سب آئرلینڈ کے رہنے والے تھے۔جلسہ میں تہذیب صرف اس قدر باقی تھی کہ لوگ
خطبۂ صدارت کی کاپیاں لے کر باہر چلے جا رہے تھے۔البتہ خطبۂ صدارت کی خوبیوں پر کہیں کہیں
صاحب صدر خود اکڑ لیا کرتے تھے اور حاضرین تالیاں بجا دیتے تھے۔گویا صدر صاحب کوئی تماشا

ہیں۔ اب اگر مسلم لیگ کی اس حالت پر کوئی شخص جل رہا ہوگا تو وہ محمد علی شوکت علی ہوں گے جو چار و ناچار کی شطرنج کی طرح اپنی اپنی کرسیوں پر اس لیے پیدل بنے بیٹھے تھے کہ آج مسلم لیگ کے بادشاہ کو مات ہی دے کر اٹھیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن انھوں نے فرمایا کہ مسلم لیگ کو چاہیے کہ وہ گورنمنٹ سے صاف اور زوردار الفاظ میں کہہ دے کہ اگر مسئلہ موصل میں مسلمانوں کی مایہ صد نازش قوم ترکی پر کوئی زیادتی کی گئی تو ہم یہ کریں گے وہ کریں گے، مگر وہ تو خدا کا شکر ہے کہ سر علی امام صاحب کا مذہبی جوش کام آ گیا اور انھوں نے اس تجویز کو رد کر کے معاملہ ختم کر دیا ورنہ مسلم لیگ محمد علی کے ورغلانے سے ایسا رزولیوشن پاس کر دیتی تو ہم سب لوگ پنڈال کے اندر ہی گرفتار ہو جاتے اور ہمارے اہل وعیال ہمیں حوضِ کوثر پر ہی دیکھتے۔ مانا کہ محمد علی نے دوسرے اجلاس میں تقریر کر کے ہمارا دل ہلا دیا لیکن اس سے ہوتا ہی کیا ہے۔ بس یہی ہوا کہ ہم تمام حالات کو چھوڑ کر ایک خیمہ میں جا پڑے اور تاثر کا یہ عالم رہا کہ مسٹر بی۔ ایس۔ سی بول اٹھے کہ لیجیے یہ چوتھا نمونہ۔

غرض ان حالات کے ساتھ جب ہم لیگ کے اجلاس سے فارغ ہوئے تو مولوی ایم۔ اے، ایل ایل بی فرمانے لگے کہ چلو جبلی کے میدان کا تماشہ دیکھ لو۔ یہاں سے چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ علی گڑھ اولڈ بوائز کی ایک نہایت نمازی پرہیزگار جماعت آتی ہوئی دکھائی دی۔ اعلیٰ درجہ کے کشمیرے کے سوٹ، خدام ہاتھ باندھے پیچھے پیچھے اور دہنِ مبارک سے سگریٹ اور سگار کے لکّے ہائے ابر بلند ہو رہے تھے۔ سنا ہے کہ یہ لوگ یہاں اس لیے آئے تھے کہ اپنے قومی بھائیوں کو دکھا دیں کہ دیکھو ہم اس چندہ کے کالج سے تعلیم پا کر غریب اور بے کس مسلمانوں پر اس طرح حکومت کرتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس حالت میں ان حضرات سے قومی معاشرت، آدابِ مذہبی، قومی زبان اور خدا ترسی کے اوصاف مٹ گئے ہوں جو کسی صحیح تعلیم کے صحیح نتائج ہو سکتے ہیں۔ لیکن ابھی ہم ان لوگوں کی ان قومی خصوصیات کو ہٹا ہوا پا کر افسوس کے گنبد ہی میں تھے کہ آنکھیں ایک اور تماشہ سے دو چار ہوئیں یعنی یہ کہ یہ اولڈ بوائز تو وہ تھے جو 95 فیصد کے حساب سے نپولین اور گلیڈ سٹون بن کر رہ گئے ہیں لیکن یہاں کہ وہ 5 فیصدی کے طلبا جو آج علم واصول اور سائنس و فلسفہ کی رو سے صحیح طالب علم، فارغ التحصیل اور وطن پرست اور مذہب پسند کہے جاتے ہیں، ان کا حال اپنی جگہ پر کچھ کم نہ تھا مثلاً مولانا شوکت علی جب آپ مسلم لیگ سے نکلے تو اولڈ

بوائز کی کافی تعداد نے آپ کو گھیر لیا۔ اب جو مولانا کو ان لوگوں نے گھیرا تو مولانا لگے معانقہ کرنے اور طریق معانقہ یہ اختیار کیا کہ عربوں کے رسم ورواج کے موافق آپ ہر ملنے والے کی پیشانی اور اس کے قریب کے ان دونوں حصوں کو بوسہ دیتے تھے جہاں ''خالِ مہندؐ'' واقع ہوتا ہے۔ کیوں صاحب اگر علی گڑھ کے اولڈ بوائز نے اپنی قومی زبان، لباس، تہذیب، عمل اور مذہبی آداب کو بھلا کر انگریزی تہذیب اختیار کر لی ہے تو آپ نے یہ رسم کس ہندستانی معاشرت سے اخذ فرمائی ہے؟ اور کیا اس طرح اگر اولڈ بوائز انگریزی کے لحاظ سے نیم انگریز خطرۂ ہندستان ہو گئے ہیں تو کیا آپ اس عربی رسم سے نیم عرب خطرۂ عربستان نہیں ہو گئے۔ پھر بتلایئے کہ علی گڑھ کے طلبا سے عالمِ اسلام رہا نہ گھاٹے میں؟۔

فی الجملہ مولانا کا انداز معانقہ بتلا رہا تھا کہ انھیں اپنے ان قومی و مذہبی بھائیوں سے کس درجہ اُنس ہے۔ خدا مولانا کو اپنے اصول پر توفیق استقامت دے کہ وہ اس جذبہ سے متاثر نہیں ہوئے اور یہی کہتے رہے کہ جب تک آپ سب اصول عمل کو نہ بدلیں گے ہم آپ سے غیر ہی رہیں گے۔

یہاں سے بڑھے تو شبلی کیمپ، حالی کیمپ وغیرہ کے پاس گئے۔ خیال تھا کہ شبلی کیمپ میں مرحوم کی تصویر ہوگی جس کی دائیں طرف سید سلیمان اور بائیں طرف عبدالسلام بیٹھے ہوں گے اور بیچ میں شعر العجم کی جلدیں رکھی ہوں گی۔ اس طرح حالی کیمپ میں تصویر کے ساتھ ان کا مسدس بھی ہوگا، لیکن جب قریب پہنچے تو دیکھا کہ ان میں بڑے خوفناک مسافر ٹھہرے ہوئے ہیں جن کی ہر ادا سے غریب مسلمان ڈر کر الگ ہو جاتے تھے۔ یہاں سے بی۔ ایس۔ سی اس طرف لے گئے جہاں کچھ بک ایجنسیاں تھیں۔ ان میں ''پیالہ بک ایجنسی'' بھی تھی۔ یہاں چونکہ مجمع کافی تھا اس لیے کچھ دیر ٹھہر گئے اور اس ایجنسی پر آنے والے حضرات کے فقرے سنتے رہے۔ پھر جو نظر اٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ غائبانہ دوست مولوی سید سجاد حیدر یلدرم ترکی زبان میں چلے جا رہے ہیں۔ یعنی تیز اور ان کے عقب میں وطن کے چند ملاقاتی آ رہے تھے۔ اس لیے ہم یہاں سے آگے بڑھے۔ یہاں سے بی۔ ایس۔ سی اُس تعلیمی نمائش میں لے گئے جہاں ''عملی تعلیم'' کو پھاڑ کر کے دکھایا گیا تھا۔ مثلاً اگر کسی طالب علم کو ہاتھی کے متعلق کچھ بتلانا ہے یا اونٹ کے اعضا کی تشریح درکار ہے تو ان

دونوں نحیف و لاغر جانوروں کو لاکر کلاس میں باندھ دیا جائے گا اور پھر بتلائیں گے کہ یہ ہیں وہ جانور جن کا قصہ کتاب میں تم پڑھ رہے ہو۔ اسی طرح اردو زبان کے حروف تہجی سمجھانے کے لیے نئے کلاس میں ایک بڑا بانس کھڑا کردیں گے جو الف کی طرح سیدھا ہوگا۔ غرض جو کام ایک منٹ میں پرانی وضع کے "میاں جی" کرتے تھے اب "عملی تعلیم" کے ذریعہ سے وہ تین منٹ میں ہوا کرے گا اور نتیجہ دونوں کا یکساں یعنی سمجھانا۔

آج اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کی کانفرنس تھی۔ پہنچے تو دیکھا کہ خان بہادر مولوی بشیرالدین صاحب خطبۂ صدارت پڑھ رہے ہیں اور کوئی سوسوا سو مسلمان سامنے بیٹھے ہوئے اونگھ رہے ہیں۔ خطبۂ صدارت ختم فرما کر خان بہادر صاحب بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ نہ معلوم کس اذیت کی وجہ سے پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور سینہ تان کر بولے کہ "بس دیکھ لیا مسلم لیگ کے لیڈروں کو" اور "بس دیکھ لیا خلافت کانفرنس کے لیڈروں کو" اور "بس دیکھ لیا اِن کو اور اُن کو" اور "بس دیکھ لیا تم کو اور ہم کو کہ اتنی بڑی ایڈیٹر کانفرنس میں ایک بھی شریک نہ ہوا"۔

غرض خدا خدا کرکے خان بہادر صاحب کو بٹھلادیا تو کھڑے ہوگئے سید جالب صاحب دہلوی اور کھانستے ہوئے فرمایا کہ ہے کوئی جو اردو اخبارات کی شکایت کرے؟ ممدوح کا یہ فرمانا تھا کہ تمام حاضرین لحاف پھینک کر کھڑے ہوگئے اور لگے شکایتیں کرنے، جن میں سے ایک شکایت بھی صدر صاحب نے نہ سنی کہ آپ قدرتاً ضعف کی وجہ سے اونچا سنتے ہیں۔ خیال ہے کہ بدرالحسن صاحب جلالی ایڈیٹر "مدینہ" تھے جنھوں نے اس ہنگامہ کو رفع کرکے اصلی کارروائی شروع کی۔ یعنی تجاویز کا سلسلہ شروع ہوا تو ہم نے بستر باندھ لیا اور یہ وظیفہ پڑھتے ہوئے اٹھ آئے کہ:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

◆◆◆

پنجاب میل

ہندستان کی ان تمام ریلوں میں جنھوں نے ہندستانیوں میں روزانہ اغوا، فرار، چمپت ہوجانے اور لے بھاگ جانے کی عادت عام کردی ہے۔ پنجاب میل ہی وہ ریل ہے جس میں مسافر پانی کی قلت، انگریز گارڈ کے ڈیم فول، دیسی ٹکٹ کلکٹر کی ٹھوکروں، پولیس کی لٹھ بازی اور کسانوں کی چپقلش سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس ریل میں حسب ذیل قسم کے لوگ سفر کرتے ہیں۔

1۔ جس کے پاس قارون علیہ ماعلیہ کے چالیس خزانوں میں سے کم از کم اڑھائی خزانہ کے برابر دولت ہو۔

2۔ جو کسی دوسرے شہر میں اپنے عزیز کی یکا یک علالت یا وفات پر ذریعہ تار بلایا جائے یا بلائی جائے۔

3۔ جو قتلِ عمد، اقدام قتل، اُنگلی دکھانا بقصد قتل عام، آنکھ مارنا بقصد اغوا، چلم پینا بقصد آتش زنی یا محاصل سرکاری کا غبن یا ان میں سے کسی ایک جرم کا مرتکب ہوا ہو یا ہوئی ہو تو اس کی فراری کے لیے پنجاب میل سے زیادہ بہتر کوئی ریل نہیں۔ کیونکہ یہی وہ ریل ہے جو ایسے مجرمین کو اورنہیں تو کم از کم بمبئی تک بیک لحہ پہنچا دیتی ہے۔ پھر مجرم کو اختیار ہے کہ وہ شہر بمبئی کے چور بازار میں ٹھہر جائے یا سیدھا انگلستان پہنچ جائے۔ کیونکہ جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے

بعد جنرل ڈائر بھی اسی پنجاب میل سے بھاگ کر انگلستان میں آج بھی بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں اور ہندستانی اس واقعہ تک کو بھول بیٹھے۔

4۔ یا وہ افسران گورنمنٹ اس ریل سے سفر کر سکتے ہیں جنھیں ہندستان میں سوراج نہ ہونے کی وجہ سے تنخواہ کے ساتھ موٹر، بنگلہ، رشوت اور ڈالی بھی ملتی ہے اور وہ کبھی کبھی اپنے ہندستانی خانساموں کی تلی پھاڑ کر اسے جان سے بھی مار ڈالتے ہیں مگر ان پر جرمانہ تک نہیں ہوتا۔

ان حالات کے بعد اس پنجاب میل میں سفر کرنے کے قاعدے یہ ہیں:

1۔ ان سب سے پہلے اس ریل میں سفر کرتے وقت اپنا قومی پاجامہ اور دھوتی اُتار کر ایک عدد پتلون پہن لیجیے۔ گھٹنوں سے نیچے تک کی شیروانی کی جگہ اپنے میونسپل ڈپارٹمنٹ سے اونچا کوٹ پہنیے۔ ترکی ٹوپی اور پگڑی کی جگہ انگلش ہیٹ لگائیے۔

2۔ چوب عمارتی کے بنے ہوئے بقدر چالیس من نو چھٹانک وزن کے دیسی صندوقوں کی جگہ چمڑے کے سوٹ کیس اور بکس رکھیے۔

3۔ بجائے وردو تاج، حمائل شریف اور بہشتی زیور کے انگریزی ناول، افسانے اور کم از کم پانیئر اخبار کے دو چار پرانے پرچے لے لیجیے۔

4۔ بجائے ہاتھ کے رومال میں موٹی موٹی روٹیاں، بھُنا ہوا گوشت اور انڈوں کا ناشتہ باندھ کر لے جانے کی چلتی ریل کے ڈائننگ کار میں کھانا کھائیے۔

5۔ ہر جنکشن پر کھڑے کھڑے حجامت بنوائیے اگر گھبراہٹ میں داڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی صاف کردی جائیں تو اسے امداد غیبی سمجھئے جو صرف انگریز پرستوں کو حاصل ہوتی ہے۔

6۔ کسی تعلیم یافتہ تجربہ کار اور ذی ہوش رفیق سفر کی جگہ ایک انگریزی کتا بریک میں بند کر لیجیے اور ہر اسٹیشن پر اس کی رسی پکڑ کر ٹہلاتے رہیے، لیکن اسی کے ساتھ منہ سے سیٹی بجاتے رہیے۔

7۔ پنجاب میل میں سوار ہو کر ہمراہیوں سے بجائے خندہ پیشانی سے گفتگو کرنے کے جب تک آپس میں کوئی باقاعدہ انٹروڈیوس نہ کرادے اپنے چہرہ پر قحط اور فاقہ کشی کے آثار پیدا کر کے اخبار پڑھتے رہیے تاکہ کسی کو خیریت دریافت کرنے کی بھی جرأت نہ ہو۔

8۔ گو آپ اپنے وطن میں موٹر ڈرائیور یا حجام ہی کیوں نہ ہوں لیکن پنجاب میل میں سوار ہوتے ہی خود کو کہیں کا بیرسٹر، ڈاکٹر یا ڈپٹی کمشنر ہی ظاہر کیجیے۔

9۔ تمام راستہ اپنے ہندستانی بھائیوں سے انگریزی زبان میں گفتگو کیجیے ورنہ آپ جاہل سمجھے جائیں گے۔

پس جو ہندستانی ان اسباب کے ساتھ پنجاب میل میں بلاٹکٹ بھی سوار ہو جائے تو اس سے قحط زدہ ڈپٹی کلکٹر ٹکٹ کا سوال نہیں کرتا۔

یہ ہیں وہ ترکیبیں پنجاب میل کے سفر کی جو ہمیں علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک سند یافتہ مولانا صاحب نے بتلائی تھیں۔ چنانچہ 24 جون کو امتحاناً ہم نے پنجاب میل سے شہر بمبئی تک کا جو سفر کیا، اُس کی تفصیلات سن لیجیے کیونکہ وہ تو مثل مشہور ہے نہ کہ:

''رکھا ہوا آتا ہے بیچ کام کے''

شب کے ٹھیک بارہ بجے ہم اپنے ایک محترم کرم فرما کو ریلوے اسٹیشن پر ''خدا حافظ'' کہنے گئے۔ جب ریل روانہ ہونے لگی تو ممدوح محترم نے بطریق مداخلت دوستانہ بہ ریل بوقت شب بلاٹکٹ اپنے ساتھ بٹھالیا اور چونکہ محض تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے آج تک کسی مسلمان نے ہمارا خسر ہونا گوارا نہیں کیا ہے اس لیے ہم بھی اہل وعیال کی فکر سے آزاد رہ کر ہر وقت دنیا بھر کا سفر کرنے کے لیے اُدھار ہی کھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ لہٰذا بڑی خوشی سے اس پنجاب میل میں بیٹھ گئے۔ لیکن محترم میزبان کو نیند آتے ہی ہم نے ترکیب یہ کی ہر اسٹیشن پر اُتر کر سوتے ہوئے لیڈیز اینڈ جنٹلمین کو جھانک لیا کرتے تھے۔ اور یہ تفریح ہر شاعر اور ادیب کے لیے ویسے بھی ضروری، مگر اسی کے ساتھ یہ خیال نہ رہا کہ ہم بٹھلائے گئے ہیں بلاٹکٹ ایسا نہ ہو کہ کسی اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر صاحب سے مقابلہ ہو جائے۔ نتیجہ یہی ہوا کہ اسٹیشن کھنڈوا پر ایک دیسی ٹکٹ کلکٹر صاحب نے شب کے کوئی تین بجے پلیٹ فارم پر ٹہلتا دیکھ کر ٹکٹ طلب کیا تو ہم نے بڑی خوبی سے انگریزی زبان میں ڈرانا چاہا، مگر جب دیکھا کہ ''زمیں جنبد نہ جنبد یہ کلکٹر'' تو اس سے کہا کہ بھائی رات کے وقت پنجاب میل کے مسافروں سے ٹکٹ طلب کرنا جائز نہیں، اس نے کہا ہاں یہ قاعدہ سوئے ہوئے مسافروں کے لیے ہے۔ تو ہم نے بھی فی البدیہہ کہا کہ لیجیے تو ہم بھی سوئے جاتے ہیں۔ کہہ کر ڈبے کے اندر

داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ اُدھر ریل نے سیٹی دی اور چل دی تو وہ بھی چل دیے، مگر غصہ میں آ کر ترکیب یہ کرتے گئے کہ آنے والے اسٹیشن پر تار دے دیا کہ ایک صاحب فلاں ڈبے میں بلا ٹکٹ تشریف لا رہے ہیں، مگر وہاں پولیس کے گفتگو میں کسی سے ماننے والے نہیں، لہٰذا دوسرے اسٹیشن پر گارڈ صاحب مع ٹکٹ کلکٹر اور سپاہی کے آ گئے اور یہاں مجبور ہو کر ٹکٹ کے دام دینے پڑے۔ افسوس صد ہزار افسوس۔

اب نیند کسے آتی ہے دیکھا تو ایک سیٹ کے نیچے ایک مسافر صاحب کا ناشتہ دان رکھا تھا، شاید یہ مسافر صاحب بلگرام کے رہنے والے تھے۔ طبیعت میں بے انتہائی صفائی تھی اس لیے ناشتہ بھی نہایت صاف اور نفیس تھا، اور ساتھ ہی ایک مرادآبادی پاندان بھی رکھا تھا۔ ہم نے پہلے تو انھیں بیدار کیا لیکن جب دیکھا کہ غفلت کافی ہے تو ان کا ناشتہ اور پانی کا گلاس بھر کر تھوڑی دیر بیٹھ گئے۔ پان کھا لیا، پھر نہ معلوم صبح یہ صاحب ہم سے کیوں دریافت کر رہے تھے کہ میرا ناشتہ کہاں گیا؟ غرض جب صبح ہوئی تو محترم کرم فرما نے ہمیں اٹھایا اور فرمایا کہ اتنی دیر تک کیوں سوتے رہے تو ہم نے رات بھر کے کارنامے سنائے تو فرمایا کہ ''تم بڑے وہ ہو تمھیں مال کا افسر کر دیں''۔

ان حالات کے ساتھ شہر بمبئی پہنچے تو اتفاق سے اسٹیشن پر حضور گرامی ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر کوروائی کے پرائیویٹ سکریٹری قبلہ مولوی فضل رسول صاحب آ گئے، بڑے تپاک سے پیش آئے اور بمبئی میں جب تک قیام رہا نوازشوں کی ارزانی فرماتے رہے۔ دوسرے دن ہم نے حسب دستور سیاحت یہاں کے حالات کے معائنہ کے لیے چلنے پھرنے اور سیر کرنے کا ارادہ کیا اور کوٹھی سے نکلے تو پہلی مشکل یہ پیش آئی کہ بمبئی کے مکانوں اور سڑکوں کی یکسانیت کی وجہ سے ہر نصف گھنٹے کے بعد پھر اسی جگہ آ جاتے تھے جہاں سے چلنا شروع کرتے تھے۔ تنگ آ کر ایک آدمی خریدا تب اس نے صحیح راستہ بتلایا۔ خیال تھا کہ یہاں سے گاندھی جی کا وطن قریب ہے اور یہاں لیڈروں کا ہر وقت مجمع رہتا ہے اس لیے یہاں کی آبادی بڑی وطن پرست ہو گی، لیکن دیکھا تو بجائے ''بڑی وطن پرست'' ہونے کے ''بڑی انگریز پرست'' نکلی۔ کھدر کا تو نشان تک نہیں ملا۔ البتہ تمام آبادی انگریزی کپڑے استعمال کرتی نظر آئی۔ وہ ترکِ موالات کا معاملہ تو گیا پہاڑ

شریف میں دفاتر سرکاری سے لے کر چپراسیوں تک میں ہندستانی ملازم بھیڑوں اور بکریوں کی طرح بھرے نظر آئے ۔ جب ہر جگہ انگریزی ٹوپی اور انگریزی سوٹ میں ہندستانیوں کو دیکھا تو گھبرا کر پہنچے اخبار خلافت کے دفتر میں ۔ دیکھا تو مولوی قطب الدین، سابق ایڈیٹر کانگریس دہلی و اسسٹنٹ ایڈیٹر ''خلافت'' بجائے کرسی کے میز پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ ہم نے سوچا کہ دفتر خلافت کا دستور ہی یہ ہوگا کہ کرسی تو رہے خالی اور میز سے کرسی کا کام لیا جائے ۔ لہٰذا ہم بھی بلا تکلف میز پر بیٹھ گئے اور کہا السلام علیکم ۔ قطب الدین صاحب نے گھبرا کر کہا وعلیکم مگر آپ ہیں کون؟ ہم نے کہا وہی جو پارسال جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے دفتر میں آپ کے ساتھ حقہ پیا کرتے تھے ۔ کہا کیا ملا رموزی؟ ہم نے کہا ہاں تو جھوم گئے ۔ پھر حضرت قمر احمد چیف ایڈیٹر خلافت اور حضرت علی بہادر خاں بی ۔ ایس ۔ سی ایڈیٹر اخبار اتحاد سے ملاقات کرائی ۔ الحمدللہ قمر صاحب کی صحت کو اتنا اچھا پایا کہ اگر وہ کسی تانگہ کے پچھلے حصہ پر سوار ہو جائیں تو تانگہ مع گھوڑے کے الٹ جائے ۔ علی بہادر خاں صاحب ازل ہی سے جوانی میں پیری کا نمونہ بنے ہوئے ہیں ۔ آپ کو اس وقت (303) ڈگری کا زکام تھا اور اثنائے گفتگو میں کبھی کبھی پورے ضعف کے ساتھ کھانس دیا کرتے تھے ۔ تھوڑی دیر میں حضرت قمر نے چائے منگائی مگر پہلے ہمارے سامنے کوئی آدھ سیر بھیگے ہوئے چنے اور نمک رکھ دیا جو ممدوح کا ''ناشتہ سحر'' تھا ۔ آپ فرصت کے ہر لحہ میں سوت کاتتے رہتے ہیں ۔ غرض جب تک ہم بمبئی میں رہے ان حضرات کی صحبت میں لطف زندگی ملتا رہا ۔ مولانا شوکت علی صاحب کا کمرہ بھی دیکھا، اس کے دروازہ پر انگریزی حروف میں لکھا تھا (آؤٹ) یعنی باہر خدا جانے یہ آؤٹ کے معنی حجاز تک چلے جانے کے کس طرح ہو گئے ۔ نیا آدمی تو شام تک دروازہ پر ہی بیٹھا رہے کہ گئے ہوں گے کہیں تفریح کو، وہ کس طرح سمجھے گا کہ یہ باہر جانے کے معنی موتمر مکہ میں تقریر کرنے کے بھی ہو جاتے ہیں ۔ یہاں سے اخبار غالب کے ایڈیٹر اور تحریک تحفظ قبہ کے سرگروہ حضرت مولوی نذیر احمد خجندی کی خدمت میں گئے ۔ حضرت خجندی بڑی محبت سے پیش آئے ۔ ہم کو پہچان گئے اور فوراً اخبار غالب کا وہ ایڈیٹوریل مضمون سنایا جو اخبار مدینہ کے ایک نوٹ کے جواب میں لکھا تھا ۔ پھر خجندی صاحب نے فرمایا کہ سیٹھ چھوٹانی کے ہاں حضرت اقدس قطب میاں فرنگی محلی ٹھہرے ہوئے ہیں، ان سے بھی مل لو ۔ خجندی صاحب لے گئے اور جب ہم حضرت قطب

میاں سے ملے تو اسلامی اخلاق و تواضع کی ایک دنیا نظر آئی... یہاں ہم نے تحریک قبہ پر ان دونوں حضرات سے ذکر کیا کہ اگر اس تحریک کے سلسلہ میں آپس میں تلخ گفتاری بند کر دی جائے تو مناسب ہے۔ الحمدللہ کہ مولوی خجندی صاحب نے اس استدعا سے اتفاق فرمایا مگر ساتھ ہی خلافت والوں کی جن زیادتیوں کی شکایت کی اگر وہ سچ ہیں تو ضرور قابلِ افسوس ہیں۔

یہاں سے فارغ ہو کر سیدھے ایک تھیٹر میں گئے۔ کیا کہیں کیا دیکھا؟ اپنے پاس کی کرسی پر ایک چلبلی چیز دیکھی کہ تماشہ دیکھنا تو بھول گئے اور رات بھر اسی چیز کو دیکھتے رہے۔ صبح کو جب اس چیز کا نام دریافت کیا تو معلوم ہوا اس کا نام پارسن ہے۔ الامان جو سچ پوچھو تو خلاصۂ بمبئی یہی ''پارسن'' تھی جس کے باپ کو پارسی کہتے ہیں پارسا نہیں، اس کے بعد بمبئی میں جو چیز سب سے زیادہ نظر آئی وہ موٹریں، شراب اور زنان بازاری تھیں۔ پھر کیا انھیں مخرب اخلاق چیزوں پر ''ڈیلی میل لندن'' نے حال میں فخریہ کہا تھا کہ شہر بمبئی کو برطانیوں نے آباد کیا ہے جس کا جواب نہیں، مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو برس ہندستان بھر میں صرف ایک شہر نو بارونق بنا دیا جائے اور باقی شہروں میں افلاس، طاعون اور انفلوانزا آباد رہیں تو یہ بھی کوئی قابلِ فخر تنظیم ہے؟۔

◆◆◆

عورتیں اور ریل کا سفر

ہر پسنجر ٹرین میں مردوں کے لیے ایک سے لے کر دس تک نہایت طویل ڈبّے لگائے جاتے ہیں لیکن عورتوں کے لیے صرف ایک ڈبا ہوتا ہے اور کسی ٹرین میں اس کا بھی نصف کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ریل کے تمام مسافروں کو تنہا سفر کرنے کی اجازت ہے ورنہ اگر کسی وقت دو ہزار مسافروں میں ایک ہزار عورتیں بھی سفر کریں تو ہندستان میں ایک ریل بھی ایسی نہیں جس کے اندر ایک ہزار عورتوں کی گنجائش کے ڈبے موجود ہوں گویا ریلو کمپنیوں کے نزدیک ہندستان کی 33 کروڑ آبادی میں صرف پچاس ساٹھ عورتیں رہ گئی ہیں باقی سب مرد۔ حالانکہ سوراج ایجی ٹیشن اور ترک موالات کے معاملہ میں حالت اس کے برعکس ثابت ہو چکی ہے۔ تمام ریلوں میں صرف ساٹھ عورتوں کی گنجائش کا ایک ڈبا لگایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ دیکھا گیا ہے کہ اس ڈبّے کے کھچا کھچ بھر جانے کے بعد مسافر مردانہ ڈبوں میں چادروں کے تنبو تان کر اپنی اپنی نیک بختوں کو بٹھلا دیتے ہیں جو غریب مردوں کی کشمکش کے حجاب سے کوسوں دور حیوانِ مطلق بنی بیٹھی رہتی ہیں۔ اب یہاں اُس دیہاتی آتش بازی کا تو ذکر ہی نہیں جو ہر کسان صاحب کے ساتھ سفر کرتی ہے اور کسان صاحب جس مردانہ ڈبے میں چاہتے ہیں اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ پس اس پوری ٹرین میں اس بقدر نصف ڈبے کی گنجائش میں جس قسم کی عورتیں سفر کرتی ہیں ان کی تعداد کا صحیح اندازہ تو ہوگا خدا کو البتہ

ان کی قسمیں معلوم فرمالیجیے۔

1۔ اس زنانے ڈبے میں قسم اول عورت وہ تھانیدارنیاں اور تحصیلدارنیاں ہوتی ہیں جن کے برقعے صنعت و دستکاری کے مستقل اسکول ہوتے ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ڈبے میں مرادآبادی وضع کا پاندان کھول کر بیٹھ جاتی ہیں اور ڈبے کی تمام دوسری عورتوں کو اپنے رشوت کے خریدے ہوئے کپڑوں اور پاندان سے مرعوب کرتی رہتی ہیں اور صرف بڑے اسٹیشن پر پردہ کا اہتمام کرتی ہیں۔ درمیانی اسٹیشنوں کے مردآدمی ہی نہیں ہوتے کیونکہ وہ تو کہا ہے نہ کہ:

بس کہ دشوار ہے انساں کا بھی انسان ہونا

2۔ سپاہی میاں کی وہ بیویاں جو افلاس و تنگ دستی کی برکت سے ہمیشہ گود بھری رہتی ہیں یعنی کثیرالعیال۔ ان کے ساتھ چاہے پانی کا ایک لوٹا بھی نہ ہو لیکن کیا مجال جو دس بارہ چھوٹے بڑے بچوں کے ساتھ ایک شور مچانے والا بچہ چھاتی سے نہ چمٹا ہو۔ کسی چھوٹے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہر جانے سے جو سناٹا پیدا ہو جاتا ہے اس میں اس بچہ کی چیں چیں اور پیں پیں سے مسافروں کو ہارمونیم کا گمان ہوتا ہے اور ان کے دوسرے نور چشموں اور رحمت جانوں کے ہنگامہ سے ڈبے کی تمام عورتیں ہر وقت خودکشی کے لیے آمادہ رہتی ہیں، مگر وہ اپنے بچوں کو ہر حال میں پیار ہی کرتی نظر آتی ہیں اور جو کوئی عورت آپ کے بچہ کی ایسی بھنبھناہٹ کو روکنے کے لیے ان بیوی صاحبہ سے کچھ کہہ دے تو بس بھنبھوڑ ہی ڈالیں۔

3۔ وہ مرہنہ نژاد عورت جس کا نصف جسم اس بلند بانگ تہذیب و ترقی کے ساتھ زنانہ میں برہنہ ہی رہتا ہے۔ اس کی زبان نور الحمدللہ کسی عورت کی سمجھ میں نہیں آتی البتہ وہ ہر اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرتے ہی جب اپنے خاوند سے ہم کلام ہوتی ہے تو ڈبے کی عورتوں کو اس کی شیریں کلامی پر کچھ دیر ضرور ہنسنا پڑتا ہے۔

4۔ وہ خالص ہندو عورت جس کے میاں اب اپنی نیک بخت کو ''نیم سرکاری'' پردہ کرانے پر تل گئے ہیں۔ ایسی ہندو عورت کے پاس اگر کھانے کے لیے ایک آدھ سوکھی روٹی بھی ہوئی تب تو ڈبے بھر کی عورتوں کی شامت ہی آگئی۔ جہاں کسی عورت نے حرکت کی اور چلائی کہ روٹی رکھی ہے۔ ''ادھر آنا نہیں'' کا جملہ اس ''تھوکنا نہیں'' کا بڑا بھائی ہے جو ریل کے ہر ڈبا میں

لکھا ہوتا ہے اور کبھی ''ٹھوکونا'' بھی ہو جاتا ہے۔

5۔ وہ عورتیں جنھیں ریل میں سوار ہوتے ہی ہر عورت سے خواہ مخواہ ملاقات کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ پس ایسی عورت سوار ہوتے ہی ڈبے کی ہر عورت سے اس کے آباواجداد کا شجرہ، اس کا وطن، اس کے خاوند کا نام معہ ملازمت اور تنخواہ وغیر دریافت کرتی ہے ورنہ اسے کھائی ہضم نہیں ہوتی۔

6۔ یہ عورت کس قدر خطرناک ہوتی ہے اور اگر یہ عورت کسی زنانہ ڈبے میں سوار ہو جائے تو سمجھ لو کہ ''بہو بیٹیاں'' تو رہیں ایک طرف یہ اچھی اچھی ماں بہنوں کا بھی ناطقہ بند کر دیتی ہے۔ اس میں قدرتاً یہ قوت ہوتی ہے کہ جہاں کسی عورت نے کوئی حرکت کی اس نے زنانٹے سے اس پر اصلاح دے ماری۔ اس کے چہرہ پر قہر و جلال کے آثار نمایاں رہتے ہیں اور ہر وقت کاٹ کھانے کو تیار رہتی ہے۔ ایسی عورت کو حرافہ کہتے ہیں۔

7۔ وہ الّھڑ صاحبزادیاں جن کی اور باتوں سے تو خدا کی پناہ البتہ وہ ڈبے میں کبھی چین سے نہیں بیٹھتیں۔ کبھی اس کھڑکی پر تو کبھی اُس کھڑکی پر۔ اسٹیشن آتے ہی کھڑکی سے ان کا نصف چہرہ ضرور نظر آتا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے پہلے کبھی مرد کو دیکھا ہی نہیں۔ اس قماش کی صاحبزادیوں کو فتر ّانہ کہتے ہیں۔

8۔ وہ خالص جنتی بیبیاں جن کے جاہل ترین شوہروں نے انھیں آج تک ریل ایسی ضروری چیز کو دکھایا تک نہیں اور اسی لیے ایسی عورتیں صرف موت میت ہی میں شرکت کے لیے سفر کرتی ہیں۔ پھر وہ مارے خوف اور وحشت کے اس ڈبے کی میونسپلٹی تک بھی نہیں جاتیں کیونکہ انھیں اس زنانہ ڈبے کے میونسپل ہال کا دروازہ تک کھولنا نہیں آتا، ایسی عورتوں کو ''فترانٹ'' کہتے ہیں۔

یہ ہیں وہ عورتیں جن کے ساتھ سفر کرنے کا کبھی کبھی کسی لکھی پڑھی عورت کو بھی اتفاق ہو جاتا ہے۔ اور ان نو بہ نو مشکلات پر زنانے ڈبے میں پانی کا کسی وقت بھی نہ ملنا طرفہ ستم ہوا کرتا ہے۔

◆◆◆

صحافتِ اردو اور علمی سرمایہ داری

ہم ابھی ابھی بمبئی سے آ رہے ہیں۔ بمبئی کے شراب خانوں سے لے کر یہاں کے وہ ہوٹل، گھوڑ دوڑ، سینما اور تھیٹرکمپنیاں بھی دیکھیں جہاں ہندستان کے مسخ فطرت انسان اپنے باپ دادا کی دولت آنکھیں بند کر کے برباد کرتے ہیں اور فرنگی تاجر مسکرا کر اپنی جیبیں بھرتے جاتے ہیں۔ کسی فرنگی ہوٹل کے مالک کا وہ تبسم آمیز سلام جو وہ اپنے ہندستانی گاہک کو بل وصول کرتے وقت کرتا ہے اس الم انگیز حقیقت کی طرف ایک لطیف ترین اشارہ ہوا کرتا ہے کہ ''تم خاصے بیوقوف ہو'' کہ محض ہماری سفید رنگ صورت اور چمکیلی دکان سے ڈر کر یا مرعوب ہو کر جو دام ہم بل پر لکھ دیتے ہیں تم فوراً ادا کر دیتے ہو۔

لیکن الحمدللہ کہ ہم یورپی تاجروں کی اس مرعوب کن ترکیب سے اس وقت سے واقف ہیں جب ہم یورپ و امریکہ میں تھے اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہاں گاہک سے دام وصول کرنے کا کام بجائے کسی کافر کے کافرہ کرتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے سامنے بقول شاعر:

''چہ بمبئی اور چہ بمبئی کا شوربہ''

اِدھر ہم کو یوں بھی یورپ والوں سے خدا واسطے کی دشمنی ہے لہٰذا ہم نے یہ کیا کہ ہر بڑے ہوٹل میں گئے اور جب انگریزی قسم کا خانساماں بڑے سلیقے سے ہمارے سامنے ایک بڑی رکابی میں

ایک پیالی چائے اور سوکھے ہوئے پارۂ ڈبل روڈی کا بل مرادی 12 رلے کر حاضر ہوا تو ہم نے اس کے ادا کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ٹھیک اسی طرح جھگڑا کر بیٹھے جس طرح ہمارے اور آپ کے بزرگ روزانہ سودا سلف لیتے وقت کونجڑوں اور قصائیوں سے ایک ایک پیسہ پر لڑا کرتے ہیں۔ یا پھر ہم پہلے ہی یہ کرتے کہ انگریز مالک ہوٹل سے صاف دریافت کرتے کہ ایک پیالی چائے کی قیمت کیا لوگے تم؟ اب اس پر اگر انگریز صاحب نے اپنی تہذیب سے ہمیں ناآشنائے تہذیب سمجھ کر یوں مرعوب کرنا چاہا کہ ''جناب جو کچھ عنایت فرمادیں'' تو ہم صاف کہہ دیتے کہ:

> ''سنیے حضرت ہم ان ہندستانیوں میں تو ہیں نہیں جنھیں اگر کوئی انگریز صاحب مسکرا کر سلام کرے تو وہ مارے خوشی کے اپنا تہبند تک اس پر نثار کر دیں اور یہ انگریز بھائیوں کی ایسی مسکراہٹ نے تو آج ہمارے آدھے رئیسوں کو الو بنا دیا ہے۔ لہٰذا ہم تو وہ ہندستانی ہیں کہ اگر خدا محکمہ پولیس کو برطرف کر دے تو تم انگریزوں کی چارپائی تک لے...''

غرض کچھ اسی طرح بمبئی کے مشہور ہوٹل ''تاج محل'' میں کوئی پندرہ دن مقیم رہے اور پھر چلتے وقت اپنے کمرہ کی تمام وہ کتابیں، پنسل، ہولڈر، لفافے اور کاغذ اپنے بکس میں بند کر لائے جو ہوٹل کے ہر کمرے میں ٹھہرنے والے مسافر کو الو بنانے کے لیے بطریق رفع حاجت اور بہ طرز تواضع رکھا جاتا ہے اور بیوقوف ہندستانی مسافر اسے انگریزوں کی خاطر داری اور مسافر نوازی سمجھ کر ہوٹل ہی میں چھوڑ آتے ہیں۔ پس اس طرح گو ہم نے اس ہوٹل کے کوئی پانچ کم سو روپیہ کرایا ادا کیا، لیکن اس کی تین کم ستر روپیہ کی کتابیں اور اسٹیشنری بھی لیتے آئے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں کے خیال میں مالک ہوٹل ہمارے اوپر ''سرقہ'' کا مقدمہ... مگر ہم نے کس قدر رکیلا نہ جواب سوچ رکھا ہے کہ جب عدالت ہم سے دریافت کرے گی کہ ہوٹل کی یہ چیزیں تم اپنے ساتھ کیوں لے گئے تو ہم کڑک کر کہہ دیں گے کہ:

> ''اور جناب ان چیزوں کے لیے جانے کی ممانعت ہوٹل کی کس دیوار پر لکھی تھی۔ البتہ ہوٹل کی دیواروں پر یہ لکھا تھا کہ ''تھوکو نہیں'' سو ہم نے سوائے کھانسنے کے کہیں تھوکا ہو تو مجرم''۔

ہو جائے گی نہ عدالت لاجواب اور ہم بری الذمہ۔

الغرض بمبئی کی اس سیر وتفریح سے فارغ ہوکر ایک دن قسمت کے مارے پہنچ گئے بمبئی کے مشہور ومعروف اخبار ''خلافت'' کے دفتر میں۔ یہاں جو دیکھا تو دوستانِ قدیم و یارانِ صمیم کا ایک پورا تھیٹر موجود تھا۔ ایک کمرے میں محبی مولوی قطب الدین صدیقی، ایڈیٹر کانگریس بلا بستر چارپائی پر پڑے محلوں کے خواب دیکھ رہے تھے۔ دوسری پر مولوی حافظ علی خاں بی۔ ایس۔ سی ایڈیٹر اخبار ''اتحاد'' ایک رومال سر سے باندھے خدا سے لولگا رہے تھے کیونکہ اس وقت ان کے سر میں درد تھا۔ تیسری پر بھائی قمر بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی سابق غیر حاجی وحال حاجی الحرمین الشریفین ایڈیٹر اخبار خلافت نہایت غور سے مضمون لکھ رہے تھے۔ چونکہ ان حضرات سے عرصہ سے یارانہ چلا آتا ہے خاص کر مولوی قطب الدین صاحب کے ساتھ جب وہ دہلی میں ''اسیر فرنگ'' ہو رہے تھے خوب خوب حقہ بازی اور چلم نوشی رہا کرتی تھی۔ لہٰذا بلا تامل وتکلف ایک کرسی پر لحاف ڈال کر ہم بیٹھ گئے اور بلا کسی تمہیدی خیریت وخیر وعافیت از درگاہ خداوند کریم نیک چاہ کر ان لوگوں سے سیاسیات حاضرہ وغیر حاضرہ پر مذاکرہ، مکالمہ اور کبھی کبھی مقابلہ تک شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے نوبت ونقارہ بایں جا رسید کہ علی بہادر خاں صاحب نے اپنے اخبار ''اتحاد'' کے لیے ہمارے مضامین کے ٹھیکہ کا معاملہ شروع کیا اور اسی جگہ سے ہمارے اور ان ایڈیٹروں کے درمیان موجودہ اردو صحافت پر ایک خالص علمی، ادبی، اخلاقی اور ماہوار گفتگو شروع ہوگئی جس نے کچھ دیر میں خاص آل انڈیا پریس کانفرنس کی صورت اختیار کر لی اور اس میں ہر شخص نے اپنی ایڈیٹری اور مضمون نگاری کے انوکھے تجربات بیان کرنا شروع کر دیے، جن میں علی بہادر خاں صاحب بی۔ ایس۔ سی کے تجربات سب سے اہم بلکہ کہیں کہیں خطرناک بھی ثابت ہوئے۔ مگر وہ تو تھوڑی دیر میں کہنے لگے کہ مگر ملا صاحب آپ مضمون عطا فرمانے میں بہت قیل وقال کرتے ہیں۔ بس جناب ممدوح کے اس فقرہ پر ہم بھی لحاف پھینک کر کھڑے ہوگئے اور ''صحافت حاضرہ اور مضمون نگاروں کی قیمت'' کے عنوان پر دل دہلا دینے والی اور آنسوؤں سے بھری ہوئی تقریر کی کہ سب حاضرین بالجبر رونے لگے۔ اس کانفرنس میں ہم نے جو تقریر کی اسے ہمارے پاس کاتب نے قلمبند کر کے آج

پس اس ماہر صحافیات کے اس لیکچر سے نتیجہ نکلا کہ اس وقت ہندستان میں اس معیار کے اخبار و رسالے دیکھے جائیں جو ملک کی صحیح ذہنی خدمت بجالا رہے ہیں؟ مگر اس حساب سے آج ایسے اخبارات کی جو تعداد ملے گی وہ ہوں گے اخبار مشرق گورکھپور، دبدبۂ سکندری رامپور، اہلِ حدیث امرتسر، اخبار عام لاہور، آگرہ اخبار آگرہ، اودھ اخبار لکھنؤ، پیسہ اخبار لاہور، رسالہ صوفی بہاؤالدین، زمانہ کانپور اور الناظر لکھنؤ کہ یہی وہ پرچے ہیں جو خوش و ناخوش اور سرد و گرم حالت میں بھی کسی نہ کسی طرح نکلے چلے جا رہے ہیں، لیکن ان پرچوں کا شمار موجودہ صحافت میں ایسا ہی غیر ضروری معلوم ہوتا ہے جیسے پنجاب میل کی موجودگی میں بیل گاڑی کا سفر۔

لیکن اب موجودہ جرائد کو لیجیے جو مروجہ اصطلاح میں "ترقی یافتہ" ہیں۔ یاد رہا ہے کہ اخبارات میں 'الہلال' کلکتہ اور 'زمیندار' لاہور اور رسالوں میں رسالہ 'معارف' اعظم گڑھ، 'ہمایوں' لاہور نے ترقی کے نمونے پیش کیے اور ہمیں ذاتی طور پر یہ بھی معلوم ہے کہ زمیندار اور الہلال، معارف اور ہمایوں نے اپنے ہاں ملک کے ممتاز اربابِ قلم و قلم کو جمع کیا اور انھیں دل کھول کر معاوضے دیے۔ انھیں مضمون نگاروں میں علامہ عبداللہ عمادی، عبداللہ منہاس، وحیدالدین سلیم، سلطان حیدر جوش، محفوظ علی بغلول، عبدالحلیم شرر اور سجاد حیدر یلدرم ہیں جن کی آج کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور سب اسی معاوضۂ مضمون نگاری سے تعمیر کرائی ہیں۔ ان کے بعد بکثرت جرائد جاری ہوئے اور آج بدتمیز ہی ہے وہ شہر جہاں سے ایک اخبار یا رسالہ نہ نکل رہا ہو، لیکن صورت یہ ہے کہ موجودہ صحافت بجائے خرآنٹ اور دقیہ نوسی لوگوں کے فیشن ایبل نوجوانوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے جن کے پاس علمی بساط کی جگہ انگریزی ناولانہ قابلیت کی چٹائیاں ہیں، مگر وہ ان انگریزی چٹائیوں پر بیٹھ کر لندن ٹائمز اور نیویارک ہیرالڈ کے خواب دیکھا کرتے ہیں، جو لاکھوں روپیہ اپنے مضمون نگاروں پر خرچ کرتے ہیں اور ہمارے ایسے ہی نوجوان جرائد ہیں جو یورپی نقل مطابق اصل کی دُھن میں مرے جا رہے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ بہ اعتبار لکھائی، چھپائی اور بہ لحاظ حسنِ ظاہری تو بعض اخبار اور رسالے یورپی جرائد سے کسی قدر لگا کھا رہے ہیں۔ بعض نے بلاک اور آرٹ کے لحاظ سے اور نہیں تو قصہ گل بکاؤلی اور قصہ علی بابا چالیس چور کی تصاویر کی طرح تصویروں کا انتظام بھی کیا ہے۔ مالی اعتبار سے بھی حالت رو بہ صحت ہے۔ چنانچہ ہر پرچہ میں کتب علمیہ سے لے کر خضاب لاجواب

اور بال صفا پاؤڈر کے یہ کثرت اشتہارات ان کی مالی ترقی کا ثبوت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ عمدہ لکھائی چھپائی، دبیز کاغذ اور رنگین تصاویر کے اہتمام سے کیا کوئی اخبار اور رسالہ ''صحافت'' کا مفید جز بن سکتا ہے اور کیا خوبصورت پرچوں سے ملک کی ذہنی اصلاح و ترقی مقصود ہے؟

ظاہر ہے کہ ان سوالات کا جواب ہر صاحب علم و بصیرت نفی میں دے گا۔ لہٰذا ثابت ہے کہ صحافت کی اصل ترقی اس کے بلند پایہ پختہ کار منیجر مضمون نگاروں سے ہے۔ سو اس لحاظ سے ایک نظر ڈالی جائے ان اخبارات و رسائل پر جو مروجہ الفاظ میں نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے بھی اردو صحافت ترقی یافتہ نہیں بلکہ محتاج ترقی ہے اور اس کے اسباب یہ ہیں:

1۔ کوئی مخصوص و معین نصب العین نہیں بلکہ ایک ہی وقت میں سیاسیات عالیہ، اجتماعیات، مذہبیات اور ادبیات ایسے اہم ترین عنوانات و مقرر و منتخب کر لیے جاتے ہیں جن میں بجائے خود ہر موضوع کی بے شمار و بے قیاس شاخیں ہیں۔

2۔ ہمارے ایڈیٹر ٹرینڈ، تربیت یافتہ نہیں ہوتے جس کا بڑا سبب ملک میں فن صحافت کی تعلیم کا فقدان ہے اور یورپی صحافیوں کے مقابل اردو کا ایک صحافی نہیں جو مقابلتاً پیش کی جا سکے۔

3۔ مسئلہ مال ہے، اس لحاظ سے ایک اردو پرچہ نہیں جو کسی مشترکہ سرمایہ سے نکل رہا ہو، اور اسی لیے وہ بجائے خدمت کو نصب العین قرار دینے کے تجارت کو نصب العین بنانے پر مجبور ہیں اور یہ سراسر غلط ہے کہ وہ قوم کی خدمت کے لیے جاری ہیں۔

4۔ قابل مضمون نگاروں کا فقدان تمام

اور یہی آخر الذکر مسئلہ ہے جس پر ہماری راس کا مدار ہے۔ پس ظاہر ہے کہ مذکورہ تینوں ضرورتیں یعنی نصب العین کی تعیین و تخصیص، تربیت مدیر اور مالیات کے مسائل تو اس طرح حل ہو چکے ہیں کہ آج اس گندہ صحافت کے اثر سے ناظرین و قارئین میں ان مسائل کی اہمیت کا کوئی احساس اندازہ ہی نہیں اور صحافت کے ان اصول اولیہ کو آج کوئی پوچھنا تو درکنار سمجھتا بھی نہیں۔ البتہ مسئلہ مقالہ نگاری ہے جس کے ساتھ آج بھی ناظرین میں صد گونہ احساس و تاثیر موجود ہے اور ہر ناظر و قاری اپنے پرچے میں ایک آدھ بدیع و بے مثال مضمون کا متلاشی رہتا ہے، لیکن ہمارے

مالکان اخبار اور ایڈیٹر اس معاملہ میں قصداً اور جان بوجھ کر جس بے اعتنائی اور بے فکری سے کام لے رہے ہیں نیز اس فن سے عدم واقفیت اور اسی لیے یہ غلط اور سراسر غلط ہے کہ اردو صحافت ملک و قوم کی خدمت گزار ہے بلکہ وہ بے قیاس دلائل سے علمی سرمایہ داروں کی ایک خوفناک جماعت ہے جس کے مزدور مفت کے مضمون نگار ہیں۔ اس موقع پر برادرم علی بہادر خاں بی۔ ایس۔ سی ایڈیٹر خلافت واتحاد بمبئی نے مالکانِ اخبار کی اس فن سے عدم واقفیت اور سرمایہ دارانہ پالیسی کا ایک نادر الوجود اور عبرت انگیز واقعہ سنایا۔ فرمانے لگے اور کسی قدر رکھتا کر فرمانے لگے کہ:

''ہاں جب میں ایک ایسے اخبار کا ایڈیٹر تھا جس کے مالک صاحب مطبع کی ملازمتوں کے بعد ایک ہی سانس میں مالکِ اخبار بن بیٹھے تھے اور خود اخبار کے صحیح معنی تک سے نا آشنا تھے، تو میں نے ''بین الاقوامی مسئلہ زر'' کے عنوان سے ایک مقالے لکھا، جسے میں نے کامل چوبیس گھنٹہ کی مسلسل نشست اور متعدد کتابوں کی مدد سے تیار کیا تھا، جب مالک اخبار کو سنایا تو بڑے غرور سے فرمانے لگے کہ مولانا اسے کون سمجھے گا اور گویا ذات حکمت پناہی نے تو اس کے تمام نکات وغوامض کو سمجھ ہی لیا تھا۔''

مگر وہ تو خدا پناہ میں رکھے اربابِ علم وفضل کی ستم ظریفیوں سے، پس بھائی علی بہادر خاں مالک صاحب کی اس جاہلانہ داد سے جلے تو دوسری مرتبہ آپ نے ''عید نمبر'' کے لیے جو مقالہ لکھا اسے سرتاسر طلسم ہوشربا اور داستانِ امیر حمزہ کے طرز تحریر میں مقفٰی دھر گھسیٹا اور یہ مضمون کوئی دس منٹ میں تیار کر کے جب مالک صاحب کو سنایا تو مالک صاحب نے علی بہادر خاں صاحب کو دوڑ کر گلے لگالیا اور فرمایا کہ:

''مولانا اس مضمون کی ایک ہزار کاپیاں کتابی شکل میں اسی وقت تیار کرا لیجیے اور کل عیدگاہ میں اسے ممبر پر کھڑے ہو کر پڑھیے''۔

علی بہادر صاحب قسم کھا کر فرماتے تھے کہ میرا یہ مضمون عیدگاہ میں پڑھا گیا۔

اربابِ علم وفضل کے مضامین کی یہ تھی وہ قیمت جو مالک اخبار نے علی بہادر خاں صاحب کو عیدگاہ میں اخباری نمائندہ بنا کر لگائی۔

دوسرا تجربہ راقم الحروف کو اس وقت ہوا جب 1922ء میں ایک اخبار کو کامل سات ماہ تک ایڈٹ کیا، آٹھویں مہینے جب مالک اخبار نے وطن سے واپس آ کر راقم الحروف کی ایڈیٹری کی تنخواہ ادا کی تو وہ بحساب 10 روپیہ ماہوار تھی، یہ دونوں تجربے صحیح اور ذاتی ہیں۔

مالکان اخبار کے بعد ایڈیٹروں کا حال ملاحظہ ہو۔

موجودہ ایڈیٹروں کا گزارہ اسکول کے لونڈوں، کج مج تراجم اور چرائے ہوئے مضامین پر ہے اور انھی تینوں چیزوں نے موجودہ ایڈیٹروں کو 'بلند پایہ' مشاہیر ارباب قلم کے مضامین و افکار عالیہ سے مستغنی بنادیا ہے۔ 1918 میں جب راقم الحروف دہلی کے ایک اخبار میں کام کرتا تھا، تو ایک ایسے ایڈیٹر صاحب سے شرف تعارف حاصل ہوا جو دہلی میں پرانے اخبار و رسائل کی قدر دانی اور خریداری کے لیے مشہور خاص و عام تھے۔ معلوم ہوا کہ آپ کے پاس رسالہ 'صوفی' اور 'ادیب' کے پرانے فائل ہیں اور آپ اپنے پرچہ کی اشاعت میں ایک مضمون ان فائلوں سے چرا کر شائع فرمارہے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو انگریزی مضامین کے تراجم میں مشاق ہیں اور اب اسی لیے وہ کسی پختہ کار اہلِ قلم کے افکار عالی سے مستغنی رہتے ہیں اور دنیا بھر کو اپنے مقابل جاہل نہیں تو اہلِ قلم بھی نہیں سمجھتے۔ ایک وہ ہیں جو گھر کا زیور فروخت کر کے چند معززین کے ناموں کو سرِ ورق پر لکھ کر کچھ پیٹ کے لائق پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کے ہاں تمام اسٹاف آنریری ہوتا ہے جو لفظ ''قوم'' کے عنوان سے اپنی اس خدمت کو قوم کی خدمت ثابت کر کے اپنی تمام کمزوریوں کو چھپاتا ہے۔ حال ہی میں راقم الحروف کے پاس ایک ایسے باتصویر رسالہ کا خط آیا جس کی ظاہری صورت نہایت امید افزا، ایڈیٹر صاحب معاوضے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''مولانا اس پرچہ میں چپراسی سے لے کر ایڈیٹر تک آنریری طور پر کام کرتے ہیں۔
اگر آپ مضامین دیں تو گاہے ماہے کچھ (معاوضہ) پیش کیا جاسکتا ہے''۔

یہ پرچہ مصور ہے جس میں ہندستان کے اعلیٰ ماہر تصویر نہایت قیمتی تصاویر شائع کرتے ہیں، مگر مضمون نگار کے لیے گاہے ماہے اور کچھ معاوضہ کا انتظام ہے۔

ان کے بعد کچھ دن سے مالکان اخبار ایڈیٹروں کی ایک اور قسم پیدا ہوئی ہے۔ یہ قسم بہ خیال خود نہایت روشن خیال اور یورپی مقالہ نگاروں کی طرح ہندی مقالہ نگاروں کی قدردان اور

سرپرست ہے اور اس کا خیال ہے کہ جس طرح ہم رسالہ کو اعلیٰ درجہ کا مصور پرچہ بنانے پر کافی رقم صرف کرتے ہیں اسی طرح مشاہیر مقالہ نگاروں کے دماغ کی قیمت بھی ادا کرنا چاہیے۔ چنانچہ بیت المعارف بجنور سے ایک مالک صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''مولانا! فی صفحہ مطبوعہ 10 آنہ دیا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ مالی حالت اجازت نہیں دیتی''۔

صحافت اردو میں مقالہ نگاروں کی یہ ہے وہ عزت و حوصلہ افزائی جو مالکان اخبار اور ایڈیٹران اخبار کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اِدھر ارباب علم وفضل کی ''پراگندہ روزی پراگندہ حال'' کیفیت نے انھیں اس امر پر مجبور کر دیا ہے کہ انھیں جو کچھ ملے اس پر قناعت کر کے اپنے دل و دماغ کے بہترین قطرات خونی سے ان جرائد و رسائل کے صفحات کو رنگین بناتے رہیں جو محض ایسے ہی دماغوں کو خرید کر آج ان یورپی سرمایہ داروں سے زیادہ ظلم ڈھا رہے ہیں جن کے خلاف دنیائے انسانیت میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ ہمارے علم میں تو یہاں تک ہے کہ اکثر بے بس ایڈیٹر اپنے جاہل مالکوں کی ذلیل سے ذلیل سختیاں برداشت کرتے ہیں اور مالک اخبار اور ایڈیٹر کا وہی تعلق ہوتا ہے جو ایک ظالم ہندستانی افسر کا بے کس ہندستانی نوکر کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اردو مطابع کے مالک ہیں جو آج مشاہیر ارباب علم کی گراں پایہ تصنیفات کو چند مطبوعہ جلدوں کے معاوضہ میں لے کر اپنی آمدنی کا خزانہ بھر رہے ہیں۔

پھر کیا ایسی حالت میں اردو صحافت ملک کی ذہنی اصلاح و خدمت کے لیے بہترین لٹریچر فراہم کرنے کی دعویدار ہو سکتی ہے؟

ضرورت ہے کہ اردو صحافت باکمال انشاپردازوں کے دماغ کی قدر پہچانے۔

بس جناب اس تقریر سے ابھی جلسہ پر خموشی چھائی تھی کہ بلی جھپٹی اور تمام... اپنے اپنے... میں جا گھسے، اب یاد کر رہے ہیں اور مٹنے۔

◆◆◆

نئی اور پرانی شاعری

ارباب علم جانتے ہیں کہ انسانی دماغوں کے تاثر و انقلاب اور ذہنی تغیر کے لیے علاوہ ظاہری اسباب و تحریکات کے ایک غیر محسوس مگر اندرونی تحریک بھی ہوا کرتی ہے، جو اجتماعی اور ذہنی حالت کو بدلتی رہتی ہے۔ اسی تحریک کو "ارتقائے طبعی" بھی کہتے ہیں۔ یہی وہ قوت ہے جو ہمارے آداب و رسوم اور تہذیب و خصائل کو زمانے کے موافق بدلتی رہتی ہے اور تمام اشرف المخلوقات اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں، جو زمانہ بدلتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو آج انگرکھا، عمامہ، کرتا، پاجامہ اور دیسی جوتا پہننے والے قدیم لٹھ بند بنی نوع بشر کو جو کوٹ، پتلون، ٹائی، کالر اور موزے پہنے پھر رہی ہے، مگر نہیں شرماتی پھر یہ اس لیے نہیں کہ نیچریوں نے "مشاہیر پرستی" چھوڑ کر اپنے بزرگوں کی وضع قطع سے "ترک موالات" کی تحریک کی ہے۔ بلکہ ارتقائے طبعی کا لازمہ ہی اس حرکت کا محرک ہے جو اپنے تمام متعلقات کو متاثر کرتا ہے۔ اور اسی لیے آج بغیر کسی "مارشل لا" (فوجی قانون) کے ہم خود "السلام علیکم" کی جگہ "گڈ مارننگ" پسند کر رہے ہیں۔ لیکن کیا کہیے گا اردو زبان کے اُس طائفۂ شریفہ کو جس کی ذہنی حالت 27ء میں بھی قدامت و بے خبری کے اسی نقطۂ ساکنہ و جامدہ پر ڈٹی ہوئی ہے، جہاں سے باوا آدم کی بغیر حجامت بنی ہوئی ابتداءً روانہ ہوئی تھی اور یہ مقدس طبقہ اردو شعرا کا ہے جو اردو کے حامی ہیں۔

آپ عرب وعجم کے جس قصبے میں چاہیں چلے جائیں، یہی نہیں سنیں گے کہ شاعری اور مضمون نگاری قوموں اور جماعتوں کی ذہنی اصلاح وترقی اور انقلاب وتغیر کا ایک کامگار آلہ ہے۔ بشرطیکہ اس کے لکھنے اور جاننے والے بیدار اور ضرورت آشنا ہوں۔ لیکن ہندستان جہالت نشان میں اردو شاعری کے لیے موجودہ عہد کی قیامت آفریں ترقیاں اور بیداریاں صرف اتنا اثر دکھا سکیں کہ پنجاب میں ڈاکٹر اقبال اور اودھ میں حسرت موہانی نے ایک ایک دیوان آب وتاب سے شائع کر کے گھر میں رکھ لیا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ اب اردو کے دورِ حاضر کے ان دونوں جلیل القدر شاعروں سے نہ کوئی سند لیتا ہے نہ انھیں کسی مشاعرے میں بلایا جاتا ہے۔ البتہ اردو کے حالی اور مصلح آج بھی غالب ومومن اور آزاد وحالی کی نظم ونثر لیے پھر رہے ہیں۔ یقیناً باوا دلی دکنی سے لے کر آزاد وحالی کے احسانات اردو زبان پر کسی اولاد کی طرح اس کے بزرگوں سے بھی زیادہ ہیں جو کسی طرح قابلِ خاموشی نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر یہ قدما پرستی کب تک؟ ہم تو پیچ در پیچ عبارت کے مقابل صاف کہتے ہیں کہ اچھا اگر ہم آج بھی غالب کے رنگ میں غزل کہیں تو پھر ''انجمن حمایت اسلام'' اور ''مسلم لیگ'' کے جلسوں میں نظمیں کہنے والے کب پیدا ہوں گے؟ حالی اور سرسید کے طرز میں اگر کوئی مضمون لکھیں تو خلافت کمیٹی میں ان سے متاثر ہو کر کون چندہ دے گا؟

امرتسر میں تو غالب پرستی کا سنگ بنیاد ہی رکھ دیا گیا اور مرزا شجاع مردی نے رسالہ غالب جاری فرما دیا۔ لیکن کوئی نہیں جو استاد اقبال اور استاد حسرت ایسے عہدِ حاضر کے اساتذہ کے نام سے رسالہ جاری کرے جن کا کلام ہماری موجودہ فضا میں ہر طرح سند کے قابل ہے، لیکن دیکھا جاتا ہے کہ ''انگریزی یافتہ'' عرف تعلیم یافتہ جماعت ہے کہ غالب کی ذہنیت، غالب کی شرح اور متروکاتِ غالب ہی پر تمام زور ختم کر رہی ہے۔ آج جب کہ غالب کے دیکھنے والے بھی نہیں ملتے ان کے کلام پر وہ شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ اشعار میں وہ معنی پہنائے جا رہے ہیں جو واللہ خود غالب مغفور کو نہ سوجھے ہوں گے۔ اور یہ سب اس لیے کہ ہم آج بھی کلامِ غالب کا اتباع کریں۔ مگر ہمارے نزدیک کسی شاعر یا مصنف کے کلام پر اس کے بعد شرح لکھنا حقیقت میں اس کمی کی تکمیل ہے جو شاعر یا مصنف کی زندگی میں رہ گئی ہو اور جو محض ربطِ کلام کے قیاس واندازہ پر مبنی ہوا کرتی

ہے۔ اگر ولی دکنی اور غالب اکبرآبادی کے زمانے میں لوگ اس قدر بیدار ہوتے تو ان کی زندگی ہی میں ان کے کلام کی شرح لکھ کر ان کے دستخط کرا لیتے اور ایسی ہی شرحیں ہو سکتی تھیں جنھیں ہم آج بھی آنکھوں سے لگا لیتے، لیکن کس قدر ظلم ہے کہ اقبال و حسرت آج بھی خیر سے زندہ ہیں، مگر ان کے کلام پر شرح لکھ کر ان کے پاس کوئی نہیں لے جاتا کہ لیجیے حضرت بعد اصلاح تصدیق کا انگوٹھا لگا دیجیے تا کہ آنے والی نسلوں کو اس کی صحت میں کوئی احتمال نہ رہے اور آپ کا کلام قیاسی ٹھونس ٹھانس سے ابدالآباد تک محفوظ رہے۔ ورنہ کون ہے جو اقبال کے بعد بتلائے گا کہ اقبال ایک شاعر تھے اور اس زمانہ کا ماحول یہ تھا کہ حکومت ترکی کے پاس منصب خلافت تھا اور اس پر یونان، اٹلی، بلغاریہ، سردیہ اور ماٹینگرو اکثر حملہ کرتی رہتی تھیں ترکوں کی شکست سے ہندستان کے مسلمان بے چین رہتے تھے، اس لیے اقبال نے ترکوں کی پے در پے شکست سے متاثر ہو کر ترانہ لکھا، شکوہ لکھا اور جب ترکوں کی حکومت باہمی نااتفاقی کی وجہ سے روز بروز گھٹتی اور کم ہوتی رہی تو ''جواب شکوہ'' لکھ دیا۔

کون بتلائے گا کہ حسرت موہانی ایک سیاسی لیڈر تھے۔ اور جب کانپور میں کھدر کی دکان پر بیٹھے تھے، باغیانہ کوششوں کی وجہ سے انگریزی حکومت کا وارنٹ گرفتاری آیا تو کہنے لگے کہ حوالات چلتا ہوں۔ مگر ترک موالات کی وجہ سے خود قدم نہ اٹھاؤں گا۔ تم میرے بازو پکڑ کر حوالات لے چلو تو چلوں گا پھر وہ جب جیل میں گئے تو قید بامشقت کی سزا میں ان سے کہا کہ چکی چلاؤ۔ تو وہ گیہوں بھی پیستے تھے اور غزل بھی کہتے جاتے تھے، اس لیے ان کی کوئی گیسو والا معشوق نہیں بلکہ ان کا مخاطب معشوق ملک اور اس کی آزادی تھا۔ لیکن دیکھنا جب حسرت کا وقت مقرر پر انتقال پُر ملال ہو جائے گا تو کوئی سو دو سو برس کے بعد ان کے کلام کی قدر ہوگی اور لوگ ان کے دیوان پر شرح لکھیں گے اور ان کے زمانے کا نقشہ یوں تیار کریں گے۔

> ''حسرت موہانی ایک بڑے صوفی اور رندمشرب بزرگ تھے۔ آخر زمانے میں بادشاہ کی ہجو لکھی تو بادشاہ نے دربار سے علاحدہ کر دیا اور وہ افلاس کی وجہ سے آخر عمر میں محلے والوں کا آٹا پیسا کرتے تھے اور چکی چلا کر پیٹ بھرتے تھے، جیسا کہ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی"

اس حیثیت سے میں پنجاب کی اس جدید اردو پسند جماعت کے ساتھ ہوں جو کہتی ہے کہ:

"اردو کے عہدِ ماضی کو چھوڑ دو اور عہدِ حاضر کے مشاہیرِ اردو سے استفادہ کرو اور سندیں لو"۔

اور یہ اس لیے کہ اساتذۂ قدیم کے مقابل اساتذۂ حال کا کلام بہ اعتبار فن اور بلحاظ جذبات ہماری موجودہ فضا کے عین موافق ہے۔ لیکن دہلی اور لکھنؤ کی لڑائیاں اسی طرح جاری ہیں۔ وہ آج بھی داغ، غالب اور امیر دبیر کو زندہ کر رہے ہیں۔ نثر اردو کے حامی ہیں کہ حالی و آزاد اور سرسید کے طرزِ تحریر لیے پھرتے ہیں حالانکہ موجودہ لٹریچر (خواہ شاعری یا نثر) کے لیے یہ چیزیں اب کسی طرح ضروری نہیں ہمارا دور جدید شروع ہونا چاہیے۔ اور نظم میں اقبال وحسرت، عزیز دکھوی اور نثر میں ابوالکلام اور ظفر علی خاں، حسن نظامی اور راشد الخیری وغیرہ سے سند کا کام لیا جائے کہ یہی ہمارے اس ترقی پذیر دور کے اساتذہ اور ناخدایانِ ادب ہیں۔ اگر ان میں اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے مدون کردہ اصولِ ادب و اسالیب انشا کو بھی مرکزیت کا درجہ دیا جائے تو نہایت مستحسن ہے کہ دورِ حاضر کی اردو کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی ہی مسلمہ مرکز و سند ہے اور کچھ کچھ ہم بھی اگر مانو ہم کو تم سب۔

◆◆◆

نکاتِ رموزی

(حصہ دوم)

از

ملّا رموزی

فہرست مضامین

مقدمہ

مُلّا رموزی اور ظرافت نگاری

ایک علمی تبصرہ

(از حضرت پروفیسر عبدالقادر سروری ایم۔اے، ایل ایل بی، ایڈیٹر مکتبہ حیدرآباد دکن)

مسرت طلبی اور لطف اندوزی کا جذبہ انسانی سرشت میں داخل ہے۔ایک خشک مزاج سے خشک مزاج انسان کے لیے بھی فیاضِ فطرت اس جذبہ کو کسی نہ کسی صورت میں خوش وقتی کا ذریعہ بلکہ حقیقت میں اس کی حیات کا سہارا بنا کر پیدا کرتی ہے۔ ورنہ زندگی سے توقعات اور امیدوں کا بالکل منقطع ہو جانا، رشتۂ زندگی کا منقطع ہو جانا ہے۔یہ ایک دوسری بات ہے کہ ہر طبیعت اپنی فطری مناسبت کی بدولت خاص خاص امور میں اپنی تسلی ڈھونڈ لیتی ہے۔ایک دولت مند اپنے عیش و عشرت کے سامان میں جو لطف و سرور حاصل کرتا ہے وہی ایک مزدور دن بھر کی تھکا دینے والی محنت کے بعد اپنی بیوی اور بھولے بھولے بچوں کے درمیان محسوس کرتا ہے۔

جسم کی طرح دماغ کا بھی حال ہے۔سنجیدہ مطالعہ کی کثرت کے بعد طبیعت اپنی غذا یعنی لطیف تحریروں میں اپنی راحت ڈھونڈ لیتی ہے۔اگر یہ غذا اس کو میسر نہ آئے تو بدمزگی پیدا ہو جانے

کا احتمال ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی تحریروں سے خالی نظر نہیں آتی۔ لطیف تحریریں سنجیدہ مطالعہ کا نہ صرف موازنہ بن جاتی ہیں بلکہ ان سے ادبیات کے سارے جسم میں روح کی سی ایک لہر دوڑنے لگتی ہے۔

یہاں ہم کو لطیف تحریروں کے عناصر یا ان کی پیدائش پر بحث کرنا نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ تمام زبانوں میں سنجیدہ تحریروں اور لطیف وظریفانہ تحریروں کا ساتھ روز وشب کا ساتھ ہے۔ ایک کی مدد دوسرے سے ہوتی ہے۔ لطیف تحریریں سنجیدہ تحریروں کے بوجھ کو ہلکا کرتی ہیں۔

وہ شخص جس کی زندگی کی مصروف ساعتوں میں سیر وتفریح کے لیے بدقت کوئی وقت نکل سکتا ہے، لطیف تحریروں کو راحت کا سامان اور اضطراب کے بعد سکون تصور کرتا ہے۔ یہ اس کی ''زندگی کا وقفہ'' ہیں جو اس کو دم لے کر آگے چلنے پر مستعد بنا دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو چیز اس پایہ کی اہمیت رکھنے والی ہو گی اس کی پرورش میں ہر علم دوست حصہ لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لطیف اور ظریف تحریروں کی نوعیت اس قدر ہوتی ہے کہ اس کو فن بنا کر قید و بند میں قطعاً مقید نہیں کر سکتے، جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اعلیٰ ظرافت کی اشاعت اور بدنما تحریروں کو روکنے کے لیے صرف چند عام فہم ضروری حدود قائم کرلی جاتی ہیں، جن کا احترام ہمارے مصنفین کر سکیں اور اس افراط وتفریط کے مذموم راستہ سے بچ کر چلیں جو تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ظرافت نگار اس امر پر مجبور ہے کہ اپنی تحریروں کا مطمحِ نظر کسی واقعۂ خاص کو یا کسی رواجِ معاشرت یا شخص کو بنائے، اسی لیے ہمیشہ ظرافت نگاری، خاکہ کشی کے دائرہ میں شامل ہو جاتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود اس کا لحاظ ضروری ہے کہ اعلیٰ پایۂ ظرافت میں ایک عام فہم کیفیت ہونی چاہیے۔ یعنی یہ نمونوں سے متعلق ہو اور کسی ذی روح انسان کے احساسات کو اس سے ٹھیس نہ لگے، ورنہ ایک اخلاقی بلکہ قانونی جرم تصور ہو گا۔ جس تحریر کا مقصد لطف افزائی ہو اگر اس سے کسی خاص شخص کو تکلیف پہنچے تو وہ اپنے منشائے تخلیق سے بالکل بے گانہ ہے۔ مخصوص چیزوں کو مذاق کا موضوع بنانا صرف اسی حد تک جائز ہے جہاں تک ان کا عوام سے تعلق ہو۔ یہ دشواری اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ظرافت کا موضوع انسان کی وہ خامیاں ہوتی ہیں جو قابلِ اصلاح سمجھی جاتی ہیں۔ ہر حالت میں ایک ظرافت نگار کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ جن چیزوں پر

تنقیدی نظر ڈال رہا ہے ان کے مقابل وہ مخاصمانہ یا مخالفانہ طرز نہ اختیار کرلے بلکہ اس کی ذہنیت ایک استاد کی سی ہونی چاہیے، جس کی تنقید کا مقصد سوائے ہمدردانہ اصلاح کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

ظرافت میں جہاں تک تلخی پیدا نہ ہو تو بہتر ہے۔ لارڈ میکالے نے اس کی خوبی کا ایک اپنا معیار یہ قائم کیا ہے کہ اس کو پڑھ کر قاری کے قلب اور دماغ کے سرور کا تموج صرف ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہر سے ظاہر ہو۔ وہ مشہور فرانسیسی ظرافت نگار والٹیئر کی ہلسی سے تڑپا دینے والی تحریروں کو شوریدہ سری سمجھتا ہے اور اس بنا پر ایڈیسن کو والٹیئر پر ترجیح دیتا ہے۔ اول الذکر کی تحریریں اس کے معیار کی خوبی پر ٹھیک ٹھیک اترتی ہیں۔

ان دو خصوصیات کے علاوہ اس قسم کی تحریروں میں ایک خاص چیز کی اور ضرورت ہے۔ یہ سنجیدگی اور متانت ہے۔ بظاہر تو یہ ایک متضاد سی بات ہے کہ ظریفانہ تحریریں سنجیدہ بھی ہوں، لیکن درحقیقت ظرافت نگار ذرا سی سعی کی بدولت مبتذل خامہ فرسائی سے بچ سکتا ہے۔ حتی الامکان اس کی کوشش کی جانی چاہیے کہ پڑھنے والے کو ایک ذہنی مسرت اور انبساط حاصل ہو جائے۔ یہ منزل نہایت دشوار گزار ہوتی ہے کیوں کہ ذرا سی لغزش سے سنجیدہ خرامی میں فرق آجاتا ہے۔

ہر لطیف تحریر کی طرح ظرافت نگاری کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ جہاں مقصد کا رشتہ گم ہوا لغویات کا شیرازہ بکھرا ہوا دکھائی دے گا، اسی لیے ظریف تحریروں کا کوئی اعلیٰ مفید اور عمومی مقصد ہونا چاہیے۔ یہی عنصر ظریفانہ تحریروں کو وقتی دلچسپی کی منزل سے آگے بڑھا دیتا ہے۔ ایسی مثال میں ملا رموزی کی وہ ظریف تحریریں دیکھیے جو سنجیدہ مسائل پر حاوی ہیں اور اسی لیے وہ دائمی اور ٹھوس مسرت سے لبریز ہیں۔

ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے کہ دنیا کی بہت کم زبانیں لطیف تحریروں کے چٹخاروں سے خالی ملیں گی۔ جہاں تک ہماری زبان اردو کا تعلق ہے ہم دیکھتے کہ ہمارے پاس ظرافت کی ایسی قلت تو نہیں ہے۔ لیکن ان تحریروں کی صورت دوسری ہے۔ ابتدائی زمانہ میں صرف شعرا نے کسی نہ کسی وجہ سے اس دائرہ میں قدم تو رکھا لیکن علمی حلقوں میں ان کا یہ فعل مردود گنا جاتا تھا۔ میر تقی میر سرتاج شعرائے اردو کی سنجیدہ دماغی اور خودداری سب پر روشن ہے۔ ان کی شاعری کی خصوصیت

ظرافت نہیں لیکن جب وہ ایک ''پرخور'' کی ہجو لکھتے ہیں تو کہیں کہیں سنجیدگی کی شاہراہ سے بھٹک جاتے ہیں اور جب میاں جرأت اپنی شاعری کے متعلق ان کی رائے دریافت کرتے ہیں تو وہ اس کو ''چوما چاٹی'' سے زیادہ رتبہ دینا نہیں چاہتے۔

حضرت میر ظریف شاعر نہیں تھے۔ انھوں نے صرف اپنے دق کرنے والوں کی ہجویں لکھی ہیں۔ جہاں یہ تنگ ہوجاتے ہیں لطیف تحریر کی قربانی سے حریف پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر جوش کے فقدان سے ان کی ظرافت پھیکی پڑ جاتی ہے۔ سودا قصیدے کی طرح ہجو کے بھی ''بادشاہ'' ہیں۔ ان کے کلام میں ظرافت کا عنصر مقابلتاً زیادہ نظر آتا ہے۔ ان کی ظرافت ''ستم ظریفی'' ہوتی ہے۔ مقابل کے حق میں ان کی حالت اس بلی کی سی ہوتی ہے جو شکار کو قابو میں کر لینے کے بعد اس سے اس وقت تک خوش فعلیاں کرتی رہتی ہے جب تک وہ بے دم نہ ہوجائے۔ اسی لیے ان کے پاس قارئین کی دلچسپی کا مواد زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے قصائد ''تضحیک روزگار''، ''ہجو اسپ'' وغیرہ اچھی مثالیں ہیں۔

سید انشا، جرأت، رنگین، جان صاحب اور ان کے تابعین کے کلام میں ظرافت کا عنصر زیادہ ہے اور ڈھونڈنے سے اچھے نمونے بھی دستیاب ہوسکتے ہیں۔ لیکن ان کے کلام کا بیش تر حصہ مبتذل ہے۔

متذکرہ بالا شاعروں میں انشا کی اُپج سے بھری ہوئی طبیعت اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھی۔ لیکن کچھ تو شدت طبیعت اور کچھ بگڑے ہوئے مذاق کی رعایت نے ان کی تحریروں کو انسانیت کے مذموم نقطہ تک پہنچا دیا۔ روشن خیال طبقہ کی بے توجہی بھی ان کی بے راہ روی میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ جس طرح غالب کے احباب نے مشکل گوئی کی عادت ان سے چھڑائی اگر مذکورہ بالا طبقہ کے معاصرین اپنے ساتھیوں کو راہِ راست پر لے آتے تو اردو زبان اعلیٰ ظریفانہ تحریروں سے ایسی بے گانہ نہ رہتی۔

جرأت، انشا وغیرہ ایسے مرشدوں کے مریدوں نے ظرافت کو لغویت کے مترادف بنا کر اردو ادب میں ''زٹلیات'' کا خاصا ذخیرہ فراہم کر دیا۔

اردو کے لیے فارغ البالی کی صورت میں لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ کے زمانے کا سا

زمانہ پھر آ ہی نہیں سکتا تھا اور لطیف تحریروں کی پیدائش کے لیے ایسا ہی زمانہ درکار ہے، اسی لیے جس قدر کام اس خاص صنف ادب میں اس وقت ہوا پھر نہ ہوسکا۔ اس کی نوعیت سے ہمیں یہاں بحث نہیں ہے۔

غالب، مومن اور ذوق میں جو قدیم دبستانِ شاعری کے آخری اساتذہ ہیں۔ مومن کی حد سے بڑھی ہوئی خودداری اور ذوق کی سنجیدگی اور علم وفضل نے انھیں اس طرف قدم بڑھانے نہ دیا۔ غالب کی طبیعت اس طرف خاص طور سے مائل تھی۔ ان کی سرشت میں جو اعلیٰ ظرافت مضمر تھی اس کا آئینہ ان کی شاعری خصوصاً غزل گوئی کی سی غیر فطری شاعری نہیں ہوسکتی۔ البتہ غالب کے خطوط ان کی فطرت کے اچھے مظہر ہیں۔ اس ''حیوانِ ظریف'' کے سوانح نگار حالی پانی پتی نے ان کی ''یادگار'' میں غالب کے اس خاص کردار پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔

خود حالی قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے۔ رہے آزاد سوان کی شعری پیداوار قلیل ہے، لیکن ان کے نثری کارناموں میں ''آبِ حیات'' کا نیم ظریفانہ اسلوب خاص آزاد ہی کا پیدا کردہ تھا اور انھیں پر ختم ہوگیا۔

انگریزی اثر کے بعد سے ذہنیتوں کے انقلاب نے قدیم ظرافت نگاری کی طرز بھی بدل دی۔ ''پنچ'' کے نمونے پر ''اودھ پنچ'' کے مرکز سے ظرافت نگاری کی وہ نئی داغ بیل پڑی جو اب منڈھوں چڑھتی نظر آرہی ہے۔ اس کی پیدائش کا باعث تو انگریزی ظرافت کے نمونے ہوئے، لیکن اس کے نشوونما وارتقا میں ملک کی سیاسی فضا بے حد معاون ہوئی۔ پہلے پہلے تو اجنبی حکومت کی سخت گیریوں نے لوگوں کو بھڑکایا، لیکن قانونی احتساب کے خوف نے لب پر آئی ہوئی باتوں کا بھی گلا گھونٹنا شروع کیا، مگر بے چینی کا اظہار پھر بھی ضروری تھا۔ اس کشمکش میں بکارِ خویش ہشیار ''دیوانوں'' نے اپنے اجنبی رہنماؤں کی تقلید میں پردے پردے کے اندر شکوہ وشکایت شروع کی۔ آخرکار ظفر علی خاں اور ملا رموزی کی کوششوں نے اس راستہ کو بالکل صاف کردیا۔

''ملا رموزی'' میں ادبیت کی فراوانی سے اردو ظرافت نگاری کو بے حد نشوونما حاصل ہوا۔ اور پھر ان کی حد سے بڑھی ہوئی حساس اور نکتہ رس طبیعت نے ان کے قلم کی جولان گاہ کو بھی وسیع اور ملک کی تمام سیاسی اور معاشرتی خامکاریوں پر حاوی کردیا۔

ملا رموزی کے لیے:

ہوئی جو صبح رکھ کر کان پر گھر سے قلم نکلے

مگر اس طرح کہ نوٹ بک ساتھ نہیں لیکن واقعات تمام محفوظ اور قلم بند نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین میں کثرتِ واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تلاشِ معاش میں نہیں بلکہ تلاشِ مواد ہی میں تمام سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی اداروں کا چکّر لگایا کرتے ہیں حالانکہ ان وسیع معلومات کے لیے ان کی فقط قوتِ اندازہ کام کرتی ہے، مگر کس قدر عمیق اور وسیع؟ کبھی وہ گھر ہی میں بیٹھے ہوئے مدیرانِ صحائف کی نفسیات کا مطالعہ کر لیتے ہیں، مگر نہایت دقیق اور مکمل۔ کبھی کبھی وہ بے ضرورت ہی سہی مگر ''پنجاب میل'' میں سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ قومی و سیاسی جلسوں، میلے ٹھیلوں میں کانگریس اور کانفرنس میں موجود رہتے ہیں تو پھر ''علی گڑھ جُبلی'' کی تقریب میں ان کی حاضری نہایت ضروری ہو جاتی ہے۔ غرض انسانیت اور نفسیاتِ انسانی کا پوشیدہ سے پوشیدہ اور دور سے دور گوشہ بھی ان کی برق نگاہی سے بچا ہوا نظر نہیں آتا۔

کثرتِ نگارش اور تخصیص اسلوب کے اعتبار سے جو امتیاز ''ملا رموزی'' کی ظریفانہ تحریروں کو حاصل ہے وہ اوروں کے بس کی بات نہیں۔ اخباراتِ اردو میں ظرافت نگاری کا جو لزوم اور فرضیت آج دیکھی جا رہی ہے وہ ہر اردو اخبار میں ''خواہ مخواہ کی ظرافت'' کے جو کالم لازی کر دیے گئے ہیں یہ بھی ''ملا رموزی'' کی کثرتِ پیداوار کا ایک واقعی تاثر ہے، جس نے مدیران صحائف کو یقین دلا دیا کہ ''اب بغیر ظرافت کے اخبار مقبول ہی نہیں ہو سکتا'' ورنہ ''ملا رموزی'' سے قبل کے اخباری فائل لازی ظرافت نگاری سے یکسر خالی کیوں ہیں؟ اب ان کی لطافت نگاری کی مقبولیت نے ملک کے مخصوص مقصد علمی و ادبی رسائل کو بھی متاثر کیا اور بیشتر رسالے ان کے فیضِ تحریر سے بہرہ یاب ہو رہے ہیں۔ کیا یہ ''ملا رموزی'' کے کرداری استقلال کا روشن ثبوت نہیں ہے کہ اپنے مادّی ایثار کے باوجود بھی وہ اپنے اسلوب کی حفاظت میں مشکلات سے تنگ حوصلہ نہیں ہوتے؟ ظرافت نگاری سے انھیں اس قدر گہرا تعلق پیدا ہو گیا ہے کہ ''ملا رموزی'' اور ''ظرافت'' دو علاحدہ چیزیں ہی نہیں معلوم ہوتیں۔

ملا رموزی کی تحریروں پر ایک تجزیاتی نظر ڈالنے کے بعد کئی چیزیں ایسی ہیں جن سے قاری

متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سب سے پہلی اصولی خصوصیت۔

1۔ ظرافت نگاری کی بے تکلفی اور برجستگی ہے۔ اس کے بغیر کلام میں لطافت نہیں پیدا ہو سکتی۔ بناوٹ اور آورد سے بھری ہوئی ظرافت گرانیِ خاطر بن جاتی ہے۔ ملا رموزی کی ظرافت میں بے ساختگی اور برجستگی کا حسن سطر سطر سے جلوہ گر ہے۔

2۔ اصلاحی تحریریں قاری پر ہمیشہ ایک اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ اب یہ کمال صاحب تحریر کا ہے کہ وہ اس اثر کو مغموم بنا دے یا مسرور۔ ملا رموزی کی تحریروں کا یہی کمال ہے جو ان کے معاصرین میں کسی کو حاصل نہیں کہ ان کے مغموم سے مغموم موضوع بھی قاری کے دل پر پُرلطف و پُرسرور اثر چھوڑ جاتا ہے۔

3۔ کسی مفہوم کو عملی مثال سے سمجھانا مضمون نگار کا اصولی فرض ہے اور ایسا کیا بھی جاتا ہے، لیکن اس تکلف سے کہ مثال سے صاحب مضمون خود کو ہمیشہ محفوظ و پوشیدہ رکھتا ہے جو ایک نازک ترین نقص ہے، مگر ملا رموزی اس مثالی حصہ کو اس بے باکی، بے خوفی اور جرأت سے بیان کرتے ہیں جس سے ان کے ذوقیات اور زندگی کا ہر پہلو قاری کے سامنے آ جاتا ہے اور خطاب و مخاطبت کی یہی وہ تکمیل ہے جسے سب سے پہلے ملا رموزی نے پیش کی۔

4۔ عام طور پر ملا رموزی کی تحریریں احاطت و ہمہ گیری کا رنگ رکھتی ہیں، لیکن جہاں کہیں وہ شخصی ہو جاتی ہیں اس لطیف انداز سے کہ مخاطب تحریر بھی اپنی فضیحت پر آپ ہی ہنسنے لگتا ہے۔

5۔ ان کی تحریروں کا وصف قہقہہ کی شوریدگی پیدا کرنا نہیں بلکہ فضائے دماغ کو سرور اور انبساط کے سرمایہ سے مالا مال کر دینا ہے۔ عامیانہ اور سوقیانہ امور میں بھی سنجیدگی اور متانت سے نہیں گزرتے۔ یہ اس قدر نازک راہ ہوتی ہے کہ ذرا سی لغزش بھی قعرِ مذلت میں گرا کر چھوڑتی ہے۔

6۔ مشاہدۂ فطرت انسانی ظرافت کی روح و رواں ہے۔ ظرافت نگار جب تک انسانیت کے ہر نمونے کا بغور مطالعہ نہ کرے اور ان کے قلوب کی گہرائیوں میں غوطہ زن نہ ہو وہ ہر طبقے اور ماحول کے آدمیوں کی نفسیاتی تاریکیوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہی مشاہدہ اس کو ''چھپے رُستموں''

کے ''پتر ے کھولنے'' پر قادر بنا دیتا ہے۔ ''کالا آدمی'' یا'' فیض آباد کے سفر میں'' عوام، پولیس، مسافروں، لیڈروں اور حکومت کی نفسیات پر کیا خوب روشنی ڈالی ہے۔ ہمارے تمدن، معاشرہ اور اخلاق پر ملمع کاری کے لباس کو کیسے چاک کیا ہے۔

7۔ ملا رموزی کی ہمیشہ باقی رہنے والی تحریروں میں بہت کم ایسی ملیں گی جن میں ظرافت صرف ظرافت کی خاطر کا اصول مدنظر رکھا گیا ہو۔ ان کی کسی تحریر کا مقصد ہمارے مذموم رواجات کی برائیوں کا استیصال ہے۔ کسی کے ذریعہ ہماری حالت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ کہیں وہ اڈیسن کی طرح ہمارے معاشرتی عیوب بے نقاب کرتے ہیں جو باتیں مصلحین کی زبانوں پر بھی نہیں آتیں وہ ان کی زبانِ قلم سے بے تامل نکل پڑتی ہیں اور ان کی ادراکی وسعت کا تو جواب نہیں کہ جس مقام تک ہمارے واعظین اور لیڈروں کا گزر بھی نہیں یہ وہاں بے روک داخل ہو جاتے ہیں۔

غرض ابھی ایک وسیع اور شاندار مستقبل ہمارے سامنے ہے جس کا راستہ ملا رموزی نے کھول دیا ہے۔ یقیناً آئندہ ملا رموزی کی ظرافت نگاری اخبارات و رسائل سے نکل کر مستقل ادبیات میں جگہ کر لے گی اور قوم کے پژمردہ دلوں کے لیے مسرت پائیدار ثابت ہوگی اور ملک کے تاریک ترین گوشوں کے لیے بھی روشنی کا کام دے گی۔ اسی لیے میں ملا رموزی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کی نثری اور ادبی خدمات اب بتدریج ادبیات اردو کا جزو لازم بن رہی ہیں اور تاریخ ادبیات اردو آپ کا نام ہمیشہ عزت و شکر گزاری سے محفوظ و برقرار رکھے گی۔ والسلام۔

◆◆◆

گلابی اُردو

نکاتِ رموزی کا دھانی دیباچہ

(از ملا رموزی صاحب بقلم خود)

امابعد اے محترم قلی مزدورو!

البتہ تحقیق گواہی دیتے ہیں ہم اوپر اس بات کے کہ اگرچہ مزدوری کرتے ہو تم اور بستر سوار کرتے ہو تم اوپر ریل کے وقت آنے اور جانے ریل کے مسافروں انگریز اور مسافروں ہندستانی کے، مگر وقت لینے مزدوری کے سلام کرتے ہو تم انگریزی مسافروں کو ٹیڑھے ہوکر، اے جھک جھک کر۔ مگر قسم ہے تمباکو فروشوں ہند کی کہ لڑائی لڑتے ہو تم ساتھ ہندستانی مسافروں کے اور جھگڑتے ہو تم اوپر مزدوری کے ساتھ مسافروں غریب اور افلاس کے مارے ہوئے ہندستان کے اور جو کم دے مزدوری کوئی مسافر ہندستان کا تم کو بستر اس کا اوپر فرش زمین پلیٹ فارم اسٹیشن کے پھینک دیتے ہو تم اور ڈانٹ دیتے ہو تم اس مسافر غریب کو یا پھر چھوڑ دیتے ہو اوپر پلیٹ فارم کے لوٹا اس کا، یا مبلغ ایک صندوق اس کا یا انکار سخت کرتے ہو تم اٹھانے سے بستر کسی غریب مسافر ہندستان کے۔

پس تحقیق سبب سے ایسی زیادتیوں تمھاری کے غالب لایا ہے اللہ انصاف کا کرنے والا

اوپر تمھارے انگریزوں کو کہ اوپر اسٹیشنوں ریل کے مارتے ہیں وہ تم کو نوک جوتے اپنے سے، اسے ٹھوکر۔ یہاں تک کہ مرجاتے ہو تم اور اکثر تمھارے۔ پھر جب وفات پا جاتے ہو تم اور اسٹیشن کے یا اندر شفاخانے انگریزی کے تو بیچ اخباروں کے اعلان کرتے ہیں کہ مرگیا مبلغ ایک قلی مزدور سبب سے پھٹ جانے تلی کمزور اپنی کی کے۔ پس اگر ترک کردو تم بدسلوکی ہمراہ ہندستانی مسافروں کے اور ترک کردیں ہندستانی ٹکٹ کلکٹر پکڑنا اور پولیس کے حوالہ کرنا ہندستانی مسافروں فاقہ کش کا تو کوتوال شہر بنادے اللہ تم کو اور ہر ایک تم میں سے کرے حکومت بیچ عدالتوں ہندستان کے کہ جہاں تباہ ہو جاتے ہیں ہندستانی کر کے فائر مقدمہ اور قومی بھائیوں اپنے کے ذریعہ قرقیوں اور ڈگریوں کے۔ پس اگر ترک کردیں ہندستانی مقدمہ بازی ساتھ قومی بھائیوں اپنے کے تو دور کردے اللہ قدرت والا زنانہ پن مزاج سے ہندستانی طلبا کے کہ سبب سے استعمال کوٹ پتلون ماسٹروں اور پروفیسروں ہندستانی کے دور ہوگئی ہے محبت اور عزت ہندستانی طلبا سے لباس ملکی اپنے کے کی۔

پس لاجرم سب تعریف واسطے اس اللہ مہربان قدرت والے کے ہے کہ جو غالب لایا مصطفیٰ کمال پاشا کو اوپر فوجوں یونان کے اور غالب لایا وہ مارشل رضا شاہ پہلوی کو اوپر فوجوں روسی اور انگریزی کے اور یہی ہیں وہ دونوں مسلمانوں کہ تھے پہلے وہ مبلغ ایک سپاہی، مگر بہ سبب ہمت، جرأت، استقلال اور حوصلے کے بن گئے ہیں وہ بادشاہ ترکی اور ایران کے۔ پس شرم بہت واسطے مسلمان امرائے ہند کے ہوجیو کہ مزاج ان کا مانند مُنّی جان آگرہ والی کے ہوگیا ہے سبب سے کثرت عیش پسندی اور آرام طلبی کے بھی نہیں ہوتی ہمت اندر اور بیچ مل ہندستانی طلبا کے کہ ایم۔اے پاس کریں وہ علوم دین اپنے، مگر اے بے حد بے حیا ہوتے ہیں طلبا ہمارے اور وقت اپنا بال سنوارنے، ہاکی اور فٹ بال کھیلنے میں کرتے ہیں ضائع، اے صرف۔

پس قسم ہے کثرت انگریزی سگریٹوں کی کہ نہیں سکتے ہیں اور البتہ تحقیق نہیں سکتے ہیں کرنا ترقی کا ہندستانی کیوں کہ جب سفر کرتے ہیں ہندستانی سپاہی بیچ ریلوں ہندستان کے تو نہیں جگہ دیتے برابر اپنے ہندستانی مسافروں کو، مگر جب آجاتا ہے مبلغ ایک انگریز سامنے ان کے تو کانپ جاتے ہیں وہ مانند کانپ جانے گائے اور بکری کے۔ پس لعنت بہت اوپر ایسے سپاہیوں کے ہوجیو

کہ تنگ کرتے ہیں وہ قومی بھائیوں اور قومی مسافروں اپنے کے کو بیچ ریل کے۔ بھی یہ ہے سبب اس کا کہ بیچ اس زمانے ہٰذا کے نہیں کرتے شادی لڑکی اپنی کی مسلمان ساتھ غریب آدمی کے موافق حکم شریعت کے، مگر دولت مند ڈھونڈتے ہیں وہ شوہر لڑکی اپنی کا۔ بھی اکثر نوجوان لڑکے سبب سے کثرت مطالعہ ناولوں کے بھاگ جاتے ہیں ہمراہ تھیٹروں کے شہر اپنے سے۔ بھی اگر بے پردہ ہی کرنا ہے تم کو عورتوں اپنی کو تو پہلے بے پردہ کرو تم ایسی بوڑھی عورتوں اپنی کو کہ ہوں وہ تعلیم یافتہ علوم مذہب اپنے کی، مگر بے پردہ کرتے ہو تم ان لونڈیوں اپنی کو کہ نہیں ہیں وہ واقف آداب مذہبی اپنے کے سے۔

پس اگر کیا تم نے ایسا تو وفات تمھاری ہمراہ وفات بد ہو حلال خور کے ہوگی۔ اگرچہ بہت دن گزرے کے شہرت مسٹر لائیڈ جارج شاگرد قدیم ہمارے کی مٹ گئی دنیا تمام سے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں بیچ انگلستان کے سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کے، مانند تاریک خیال ملاؤں مساجد ہند کے، جو نہیں جانتے وعظ کہنا اور تقریر کرنا موافق اس زمانے کے بیچ دن جمعہ کے اور جو یہ ہندستانی افسر لوگ اکڑ کر بات کرتے ہیں ساتھ ہندستانی ماتحت لوگوں کے تو یہ سب کچھ نتیجہ ہے بے خبری کا علوم دینی سے اور غلام کا۔ ورنہ موافق آداب مذہب کے حد سے زیادہ خلیق مہربان اور تواضع کرنے والا ہونا چاہیے ہر ہندستانی افسر کو مانند ہم حضور ملا رموزی صاحب کے، مگر جب کوتوال ہو جاتا ہے یا انسپکٹر ہو جاتا ہے مبلغ ایک لاغر ہندستانی تو بعد دنوں چند کے اکڑ جاتی ہے گردن غرور اس کے کی۔ اگرچہ میوہ چراتے ہیں ریلوے گارڈ لوگ بریک سے وقت چلنے ریل کے اور نہیں ریل کھڑی کرتے یہ واسطے ہندستانی مسافر کے، مگر وقت آنے مبلغ ایک یورپین کے لال جھنڈی ہلاتا ہے ہر گارڈ واسطے روکنے ریل کے۔

پس اگر ہو تم شک کے کرنے والے بیچ باتوں ہماری کے تو مثال مارو مبلغ ایک ایسی کہ غلط ہو جائیں باتیں ہماری کیوں کہ اوپر اسی جگہ کے کہا ہے حکیموں چند نے مبلغ ایک قطعہ کہ یہ ہے وہ قطعہ ہٰذا:

کیا نہ دیکھا تو نے اے لڑکے نیک بخت بیچ ایراج کے
کہ ڈانٹا علماء ایران نے تو پردہ کیا ملکہ افغان نے بیچ تہران کے

پس ایسے ہی اگر متفق ہوجائیں علما ء، مشائخ، صوفیاء، اپنے
اور اصلاح کریں وہ ساتھ روشن خیالی کے تو ترقی کرجائیں مسلمان ہندستان کے
پس کس قدر صحیح اشعار کہے ہیں ہم نے بیچ اس قطعہ کے۔ پس اگر زندہ ہوتے بادشاہ محمود غزنوی یا اکبر بادشاہ یا حضرت خان خاناں تو دیتے ہم ملا رموزی صاحب کو ایک ایک لاکھ روپیہ اوپر ایک ایک سطر مضمون ہمارے کے۔ مگر اب خونِ جگر پیتے ہیں ہم اوپر ہر سطر مضمون اپنے کے۔ پس رحمت خدا کی بہت اوپر ارواح ان علم کے قدر دانوں گزرے ہوئے کے ہوجیو کہ نام ان کا زندہ رہے گا بیچ دنیا قیامت تک سبب سے انعام دینے فردوسی اور عرفی کے کثیر۔

صبر دے اللہ ہم ملا رموزی صاحب کو بیچ اس زمانے موٹر پرور اور تھیٹر نواز کے۔ کیوں کہ آیا ہے بیچ کتابوں مقدس کے کہ شراب اور کباب اُڑاتے ہیں وہ کہ دماغ ان کا ہوتا ہے خالی عقل وعلم سے اور خونِ جگر پیتے ہیں وہ کہ دماغ ان کا ہوتا ہے روشن ساتھ علم وعقل کے کہ کہا ہے:

اب کیا کیا بربادیاں اہلِ قلم ہندستانیوں کی جھٹلاؤ گے؟

امابعد! اب درود اور سلام بھیجو تم اے مسلمانو اوپر نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ تعلیم دی ہے آپ نے ہم کو صبر، جفاکشی، محنت اور عبادت الٰہی کی۔ بھی رحمت خدا کی اوپر آپ کے اور اوپر اولاد اصحاب اور دوسوں تمام آپ کے ہوجیو۔ بھی کچھ اوپر ہمارے۔

ہرگز نہیں مٹے گا نام ہمارا کہ روشن ہے دل ہمارے علم وصبر سے لکھا ہوا ہے اوپر جریدۂ عالم کے کہ تھے ہم بلند حوصلہ مصلح اور۔

مُلّا رموزی

23 ذی الحجہ 1346 ہجری قدسی۔ 14 / جون 1928

◆◆◆

نکات

1914 میں جنگ یورپ کی خبروں کی اشاعت سے مالی فائدہ اٹھانے کے لیے زبانِ اردو کے بے شمار اخبارات جاری ہوئے۔ چونکہ ان نئے اخباروں کا صحیح مقصد پیسہ کمانا تھا نہ کہ عوام کی اصلاح و فلاح۔ اس لیے ان اخباروں میں اخباری اصول و ضوابط کا کامل فقدان رہا۔ مثلاً ایسے اخباروں کے ایڈیٹروں کا زیادہ حصہ ''نیم تعلیم یافتہ نوجوانوں'' پر مشتمل تھا جو اصول رہنمائی سے خود بے خبر تھے اور اسی لیے ان کی اخبار نویسی سے بجائے اصلاح کے عوام کا ذوق تباہ ہو گیا، مگر اس نوجوان اخبار نویس جماعت نے اس کمزوری کو عوام کے سر یہ کہہ کر تھوپ دیا کہ ''عوام ہند بد مذاق ہیں''۔ حالانکہ عوام کی بد مذاقی کی اصلاح ہمیشہ اخبار نویس کے ذمہ عائد ہوتی ہے۔

◆

اخبارات اردو زیادہ تعداد میں چونکہ نااہل لوگوں کے ہاتھ میں رہے اور ان کی تحریر پر حکومت نے سوائے اپنی حکومتی مصالح کے کوئی اخلاقی احتساب و سزا عاید نہ کی، اس لیے ان کی اخلاقی بے راہ روی کے مضر اثرات قوم کے ہر حصۂ زندگی پر پڑے اور قوم کی اجتماعی زندگی کبھی ایک مرکز یا متحدہ مقصد کے تابع نہ ہوئی اور یہی وہ عظیم الشان خسارہ ہے جو اخبارات سے قوم کو پہنچا۔

◆

اخبارات و رسائل میں نااہل لوگوں کے کام کرنے کا یہ ثبوت بھی ہے کہ غلط تصنیفات و تراجم کی اشاعت سے زبانِ اردو میں اغلاط اور گندہ الفاظ وخیالات کا ایک گھناؤنا ذخیرہ جمع ہوگیا اور یہ اس طرح کہ اخبارات کی جدید کتاب پر تعارف وتبصرہ لکھتے وقت اس کی صرف تعریف وثنا کرتے ہیں اور محض جھوٹ بول کر اس کی کمزوریوں کو چھپاتے ہیں اور اسے مصنف کتاب کے ساتھ ''اخلاقی احسان'' ثابت کرتے ہیں۔ پس تنقید وتعارف کے اس جھوٹے اور سراسر غلط عمل سے کم علم اربابِ قلم نے حوصلہ پایا اور اس طرح زبانِ اردو میں ایسا مہمل ذخیرہ آگیا، جس کے مطالعہ سے قوم کا مالی، ذوقی اور ذہنی نقصان ہے۔

◆

اب جو بھی زبانِ اردو دنیا کی طاقت ور یا علمی زبانوں کے برابر ترقی کر گئی تو اس ذخیرہ کے دور یا پاک کرتے وقت اس وقت کی نسل ہمیں برائی سے یاد کرے گی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اخبارات اور رسائل نہایت ایمانداری اور جرأت سے ہر نئے اخبار یا کتاب کی کمزوریوں کو واضح کر دیا کریں تاکہ ان کی اصلاح بھی ہو جائے اور قوم اس کے غلط اثر سے محفوظ رہے۔

◆

ہندستانی مسلمانوں نے اسلامی علوم کو روزی کمانے کے لیے ترک کر کے مغربی قوموں کے علوم کو حاصل تو کیا، مگر اس طرح انھوں نے اپنی ''قومیت'' کو بہت بھاری نقصان بھی پہنچایا یعنی غیر قومی تعلیم سے ان کی اخلاقی اور ذہنی استعداد ایک طرح سے الٹ گئی یا اوندھی ہوگئی۔ لہٰذا وہ ہر ایسی حرکت کو جو اسلامی قومیت کے قاعدے سے غلط ہو، نہایت درجہ صحیح اور مفید سمجھنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اس تعلیم کے اثر سے اپنا قومی لباس ترک کر دیا اور قومی لباس کا فقدان اصل میں قومیت کا فقدان ہے۔ پس ضرورت ہے کہ مسلمانانِ ہند اپنا کوئی ایسا قومی لباس وضع کریں جس میں یکسانیت اور وحدت ہو۔ ان مل بے جوڑ لباس بھی قومیت متحدہ کے لیے نقصان رساں ہے۔

◆

حصولِ آزادی کی کوشش میں وہ جماعت کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، جس کے 95 فیصدی افراد لفظ آزادی کے معانی اور مطالب سے بے خبر ہوں۔

◆

جس جماعت میں لڑکے اور لڑکی کی شادیاں زیادہ عمر میں کی جائیں اُس جماعت کی تباہی یقینی امر ہے۔

◆

طاقت ور جماعت یا قوم اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب نوجوانوں کے اخلاق کو طاقت ور بنایا جائے اور اخلاق کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ابتدائے شباب کی شادی بھی ہے۔

◆

دنیا کی عظیم الشان لڑائیوں کے حالات اور عظیم الشان لوگوں کی سوانح عمریاں رات دن مطالعہ میں رکھنے سے انسان مصائب اور مشکلات کے وقت بہادر ہو جاتا ہے۔

◆

محض خیالی اور جذباتی ناولوں، افسانوں اور اشعار کے مطالعہ میں جو وقت صرف ہوا سے صنعت یا ایجاد و اختراع میں صرف کرنا زیادہ مفید ہے۔

◆

غیر قوموں کے تمدنی اور معاشرتی اثرات کو قبول نہ کرنا ایک ایسی فتح ہے جو میدانِ جنگ کی فتوحات سے افضل و اعلیٰ ہے۔

◆

تحریر میں غلط الفاظ، غلط تراکیب اور غلط جملوں کو لکھ کر یہ کہنا کہ 'غلط العام فصیح'، علمی کمزوری ہے۔ اربابِ علم کی شان 'غلط العام' کی تقلید سے ذلیل ہوتی ہے۔

◆

کسی غلط تحریر کو اس لیے صحیح ثابت کرنا کہ اسی طرح فلاں استاد نے بھی لکھا ہے استناد کا نہایت شرمناک طریقہ ہے کیوں کہ غلطی ہر حال میں غلطی ہی رہے گی چاہے وہ کسی فرشتے ہی سے

سرزد کیوں نہ ہوئی ہو۔

◆

صحتِ زبان یا اصلاحِ زبان کے لیے سند یا استناد کا جو طریقہ آج تک جاری رہا وہ یہ ہے کہ ہر دلیل اور مثال اردو کے حصۂ نظم سے پیش کی جاتی ہے، لیکن اب اردو کے حصۂ نثر سے بھی استناد کی ضرورت ہے، اس سے اصلاحِ زبان میں آسانی ہوگی۔ گو یہ رسم کے خلاف ہے، مگر مفید بدعت بھی کبھی کبھی جائز ہوا کرتی ہے۔

◆

شاعر اور نثر نگار کو ہمیشہ اپنے زمانے کے محاورات، مصطلحات، روزمرہ اور بول چال کو لکھنا چاہیے۔ اس سے زبان کی ترقی اور وسعت کا ہر دور متعین ہو سکتا ہے۔ یہ طریقہ نہایت لغو اور غلط ہے کہ 1929 کا شاعر یا نثر نگار ولی دکنی یا میر امّن دہلوی کی تحریروں سے اصلاح لے۔ پس استناد یا سند کے لیے بھی اپنے ہی دور کے شعرا اور مستند او باموزوں ہیں۔

◆

جس ملک میں کثیر المقاصد انجمنیں بکثرت ہوں اس امر کی علامت ہے کہ اس ملک کے باشندوں میں وحدتِ خیال نہیں اور جن باشندوں میں وحدتِ خیال نہ ہو ان میں وحدتِ عمل بھی نہیں اور جن لوگوں میں وحدتِ عمل نہ ہو ان کی قومی موت یقینی ہے۔

◆

جو قوم کسی دوسری قوم کے اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور فکری آثار و اثرات کو شدت سے پسند کرتی ہو وہ اس کی غلامی کو باعثِ عار نہ سمجھے گی۔

◆

جس قوم کے بچے ابتدائی عمر سے ناز و نعم میں پلے ہوں اس کے جوانوں میں عیش پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی اور جب نوجوان میں عیش پسندی ہوگی تو ان میں بے حیائی اور بے غیرتی یقینی ہوگی اور جب بے غیرتی پیدا ہو جاتی ہے تو انسان اپنے خاندان، اپنے ملک اور اپنی قوم کی عزت و ناموس کی حفاظت سے عاری ہو جاتا ہے۔

◆

جن خاندانوں میں نوکر اور خدمت گار معتمد یا منصرم بنا دیے جائیں سمجھو کہ اس خاندان میں بے حیائی اور بے غیرتی اب پھوٹ پڑے گی اور اس خاندان کا ایک ایک فرد بے حمیت اور بے غیرت ہے۔ دولت مندوں میں یہ وبا عام ہے۔

◆

جو شخص کسی ادنیٰ بے غیرتی کو پسند یا گوارا کر سکتا ہے وہ وقت آنے پر بڑی سے بڑی بے حیائی کو بھی برداشت کر سکتا ہے۔

◆

حساس اور ذی ہوش آدمی کی صحت ہمیشہ خراب اور قویٰ مضمحل رہتے ہیں اور بے قوف، بدعقل اور بے دماغ آدمی ادنیٰ سی فارغ البالی سے بے حد و بے قیاس توانائی اور فربہی کا مالک بن جاتا ہے۔

◆

وطن ایک ایسی محدود سرزمین کو کہتے ہیں جہاں آدمی ہنرمند ہو کر بے ہنر ہو جاتا ہے اس لیے ہنرمند وہی ہے جو اس ذلیل سرزمین کو ٹھکرا کر خدا کی پھیلی ہوئی سرزمین کے جس حصے میں عزت پائے چلا جائے۔

◆

دوست کے معنی ہیں ایک فریب دینے والا انسان جو اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے ہمارے ساتھ ہے، مگر ہم اپنی بیوقوفی سے اسے پہچانتے نہیں۔

◆

صحت کی حفاظت وہی شخص کر سکتا ہے جو بیماری کے خطرات سے ڈرتا ہو اور ہولناک بیماریوں میں وہی شخص مبتلا ہوتا ہے جو بیماری سے نہیں ڈرتا۔

◆

جو شخص کہ اوقات کا پابند نہ ہو سمجھو کہ وہ ہندستانی ہے۔

◆

جو شخص ریل میں سوار ہوتے وقت پریشان اور بدحواس نظر آئے سمجھو کہ وہ ہندستانی ہے۔

◆

جو شخص پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ پر قابو سے باہر نظر آئے۔ سمجھو کہ وہ ہندستانی افسر ہے۔

◆

اکثر احباب کو شکایت ہے کہ ہمارے مخصوص طرزِ تحریر ''گلابی اردو'' میں اب وہ پہلی سی شگفتگی باقی نہیں رہی، ان کا یہ خیال بالکل صحیح ہے، مگر ایسا قصداً کیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ ''گلابی اردو'' کو جانِ شگفتگی اصل میں وہ سیاسی تنقید و نکتہ چینی ہوا کرتی تھی جو اس وقت اس تحریر کا حقیقی نصب العین تھی۔ مگر یہ نصب العین تابع تھا مسلمانانِ ہند کے اُس عظیم الشان اور متفقہ مقصد کا جو منصب خلافت کے حفظ و بقا کے لیے آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند نے طے کیا تھا۔

◆

میں بقائے خلافت کی جنگ میں اس لیے شریک ہوا تھا کہ اپنے قلم کی بہترین قوتوں کو اس جنگ کے مجاہد سپاہیوں کی کمانڈ میں خرچ کروں گا اور اسی لیے ''گلابی اردو'' میں 1921ء تک جو ولولہ انگیز شوخیاں پائی گئیں وہ اصل میں انھی خلافتی لشکروں کی تازگی اور حوصلہ افزائی کے لیے تھیں۔

◆

لیکن جب 1922 میں ہماری بدنصیبی سے تختِ خلافت کو ترکی کے مسلمانوں نے اٹھا دیا اور مسلمانوں کا کوئی مرکز نہ رہا تو ''گلابی اردو'' لکھنے والا قلم جس حسرت و افسردگی سے رکھ دیا گیا اسے کچھ دل ہی خوب جانتا ہے اور واقعی آج جو قلم ''گلابی اردو'' یہ طرز یادگار لکھ رہا ہے وہ قلم نہیں جس سے کبھی جوشِ خدمت اور ولولہ انگیزی کی چنگاریاں بلند ہوا کرتی تھیں۔

◆

ظاہر ہے کہ اجتماعی عمل ہمیشہ عام حالات و ضروریات کا تابع ہوا کرتا ہے۔ چونکہ اب مسلمانانِ ہند کے سامنے کوئی متفقہ مقصد نہیں رہا بلکہ ان کے اندر ہی انتشار اور باہمی پھوٹ پڑی

جو میدانِ جنگ کی پسپا شدہ افواج میں لازمی طور پر پھوٹ پڑتی ہے اس لیے ہم نے بھی اپنے قلم کو ان کی داخلی اصلاح و تنظیم کی طرف پھیر دیا اور داخلی اصلاح و تنظیم سے ہماری مراد مسلمانانِ ہند کے اخلاق کی اصلاح و حفاظت ہے اور ظاہر ہے کہ اگر کسی فوج کی اخلاقی حالت درست ہو جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں کوئی وقتی اور ہنگامی فتح حاصل کر کے اخلاقی بدنظمی کی وجہ سے دوبارہ شکست کھا جائے۔

◆

چند روز سے خدا جانے یہ خطرہ کیوں لاحق ہو رہا ہے کہ ہم مرنے والے ہیں یا مر جائیں گے یا مر کر رہیں گے یا مرنا ہی پڑے گا۔ مرنا تو ہے یا مر گئے تو؟ اس لیے دوسرا خطرہ یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ پھر ہماری صحیح سوانح عمری کون لکھے گا؟ ہماری یاد میں ہمارا مجسمہ کون قائم کرے گا؟ ہمارے عُرس کا انتظام کون کرے گا؟ ہمارے جانشینوں کو حیدرآباد سے وظیفہ کون دلائے گا؟ جب کہ ہماری زندگی ہی میں حیدرآباد سے حج بیت اللہ شریف تک کے دام نہ ملے۔

◆

پھر یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسی کسمپرسی کی حالت میں ہم مر گئے (انا للہ) تو پھر مؤرخین اور سوانح نگاروں کا ایک گروہ لکھ دے گا کہ ملا رموزی صاحب کی عمر تو تھی ساٹھ ستر برس کی، پیشہ تھا ملازمت، وطن تھا شیراز، بیعت کی تھی خواجہ حسن نظامی سے اور قوم کے تھے کے۔ کے زئی لاحول ولا۔

دوسرا گروہ لکھ دے گا کہ اپنی تصنیفات میں ملا رموزی صاحب طلسم ہوشربا اور بغدادی قاعدہ چھوڑ گئے ہیں۔ خدا اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ تیسرا گروہ لکھ دے گا مہاراجہ صاحب محمود آباد سے پانچ سو روپیہ ماہوار وظیفہ علمی پاتے تھے۔ خدا پسماندوں کو بجائے تنخواہ کے صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ چوتھا گروہ لکھ دے گا وہ نہایت خوش حال و فارغ البال تھے۔ بمبئی میں کئی اصطبل اور کوٹھیاں چھوڑ گئے ہیں۔ پانچواں گروہ انتہائی عزت افزائی کرے گا تو لکھ دے گا کہ:

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ استغفر اللہ۔

◆

اس لیے اپنے متعلق خود ہی چند نہایت معتبر اطلاعات قلم بند کیے جاتے ہیں۔ پس مؤرخین اور سوانح نگاروں کو چاہیے کہ وہ ہمارے بعد ہماری سوانح عمریاں لکھیں کہ حضرت ملا رموزی نے جس وقت یہ تحریر لکھی اس وقت تک ان کے ساتھ اخبارات اور رسائل کا برتاؤ یوں تھا کہ ان سے ہر اخبار اور ہر رسالہ مضمون طلب کرتا تھا، مگر مفت اور بے معاوضہ اور وہ ہزاراں ہزار مشکلات و مصائب کے باوجود انھیں جب اپنے خونِ جگر سے لکھ کر کوئی مضمون دیتے تھے تو یہ اخبار اور رسالے اسے بغیر کسی حوصلہ افزا اور تعریفی نوٹ کے اس بے اعتنائی اور پندار کے ساتھ چھاپ دیتے تھے گویا وہ کوئی خضاب لاجواب کا اشتہار ہے جس پر ایڈیٹر کوئی عبارت اپنی طرف سے بڑھا نہیں سکتا، لیکن یہی اخبار اور رسالے جب سر ڈاکٹر محمد اقبال کا کوئی شعر یا نظم چھاپتے تھے تو ان کی تعریف میں ہزاروں فقرے اپنی طرف سے لکھتے تھے۔ حالانکہ دونوں اپنے اپنے فن کے لحاظ سے یکتائے روزگار تھے۔ صرف مالی اعتبار سے ملا رموزی صاحب غریب تھے اور اقبال صاحب امیر اور دونوں کے کمال کا یہ وہ اعتبار تھا جسے خود صحافت اردو نے تسلیم کر لیا تھا۔ پس کیا ایسی صحافت دنیا میں ترقی کی امید رکھ سکتی ہے؟ استغفر اللہ!

◆

ملا رموزی صاحب چاہتے تھے کہ انھیں رہنے کو ایک شاندار کوٹھی ملے جس میں باغ بھی ہو اور بجلی کے پنکھے اور روشنی بھی۔ ان کی خدمت میں خدام بھی ہوں اور سواری کو موٹر بھی۔ وہ کسی کے ملازم بھی نہ ہوں اور نہ کسی کے قرضدار۔ انھیں نہ فکرِ معاش ہو نہ پروائے اقارب بھی۔ وہ چائنا سلک کپڑے کے سوٹ بھی استعمال کریں اور ڈاسن کا پمپ بھی۔ وہ یورپ کی سیاحت بھی کریں اور مکے شریف کا حج بھی۔ ان کی جیب میں ہر وقت نوٹ بھی رہیں اور سگریٹ کیس بھی۔ پھر وہ اس قدر فراغت اور خوشحالی کے بعد جب چاہیں کچھ لکھیں اور جب چاہیں موٹر میں سوار ہو کر تفریح کو چلے جائیں کیوں کہ وہ ان سب اوپر کی چیزوں کے استعمال اور لطف سے واقف تھے لہٰذا ان کو ان میں سے جب ایک چیز بھی حاصل نہ ہوئی تو انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جو شخص اپنی محبوب ترین خواہش کو پامال کرنے کا عادی ہو جائے کامیابی اسی کی غلام ہو گی۔

اس وقت تک یعنی ''تادمِ تحریرِ ہٰذا'' ان کی عمر تھی نواوپر بیس برس کی، قوم کے تھے سید افغانی،

مذہب تھا اسلام، مقلد تھے حضور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے، حافظِ قرآن تھے اور مولوی صاحب بھی۔ وطن کا پتہ آج تک نہ چلا۔ صرف افغانی قوم ان کی ذات پر فخر کرسکتی ہے۔ تعلیم و تربیت کی تکمیل ہوئی تھی کانپور لکھنؤ اور علی گڑھ کے قریب ایک قصبہ میں، اس لیے کچھ آدمیت پیدا ہوگئی تھی۔ جسم کے تھے دُبلے پتلے، مزاج کے بے انتہا غیر معتدل، غصہ کے تیز، حق گو، خوشامد پسند اور لالچی، مقصد کے حصول کے لیے مستقل مزاج اور بے مقصد کسی کے شریک نہیں۔ غرض خدا رکھے اور عمر دراز کرے اپنے ملّا رموزی صاحب کی کہ کہا ہے:

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

ملّا رموزی بقلم خود

◆◆◆

قانونی زندگی

انسانوں کی گرفت، باز پرس، پرسش، رسوائی، ڈر، خوف، ہراس، وحشت، گھبراہٹ، اضطراب، بے چینی، خطرہ، اندیشہ، دھمکی، سزا، ڈانٹ ڈپٹ، تخویف، مار پیٹ، قید، بندش، نگرانی اور تعطل کے کاغذی ذریعہ کو اگر ''قانون'' کہا جائے یا کہتے ہیں یا کہا ہے یا کہنا چاہیے یا کہا گیا ہے یا کہیں گے یا کہا جائے گا یا کہو تو پھر شبہ، نوٹس، سمن، وارنٹ، گالی گلوچ، دھول دھپا، گھونسہ، بید، لاٹھی، ہوائی فائر، گرفتاری، ہتھکڑی، بیڑی، جامہ، تلاشی، حوالات، ریتیلی روٹی، پھیکا ساگ، بغیر روشنی کا کمرہ مع مچھر، بچھو، سانپ، چالان، پیشی پر پیشی، اثبات و دعویٰ، جواب دعویٰ، وکالتاً یا اصالتاً، پیروی، جواب دہی، تحریری بیان، جواب دینے سے انکار، ضمانت، فرد جرم، عینی گواہ، صرفہ خوراک، اقرار صالح، جرح، تنقیحات، فیصلہ، ایک درجن بید، جرمانہ، بصورت عدم ادائے جرمانہ قید محض، قید بامشقت، کال کوٹھری، مونج بٹوانا، بحالت بیڑی کھدر کی قمیص، بحالت قیام جیل تختی نمبر فلاں اور گلو چکی چلانا اس حالت میں کہ قیدی کا تخلص حسرت موہانی ہو جس دوام بہ عبور دریائے شور اس شرط پر کہ مجرم علاقہ بنگال کا فرد ہو۔ قصاد، پھانسی اور سولی جب تک کہ مر نہ جائے یہ سب لوازم قانون یا اثرات قانون کہلائیں گے یا کہے جاتے ہیں۔

لیکن اگر ہم سے کوئی ''قانون'' کی تعریف دریافت کرے تو ہم بریلی کے میلاد خواں لوگوں کی طرح بجائے کسی لغت اور بلاغت کے قانون کو اس عملی مثال سے سمجھا دیں گے کہ

''گھوڑے کی وہ لگام جس کے ذریعہ گھوڑے کو یا گھوڑے پر بیٹھنے والے کو راستہ پر ایسا سیدھا چلایا جائے جو خطرے اور تصادم سے محفوظ رہے اور گھوڑے کی دوڑ یا چال یا رفتار کسی کے لیے اگر مفید نہ ہو تو مضر بھی نہ ہو۔ اب اگر یہ کہیں کہ قانون ان افلاطونی اصول کے مجموعہ کو کہتے ہیں جن کے ذریعہ کبھی کبھی مجرم بھی بلا اخذ جواب رہا ہو کر مدعی کے حق میں الٹا امالہ حیثیت عرفی بن جاتا ہے تو ہم کہیں گے کہ پھر تو افلاطون بھی ذرا بے وقوف تھا کیوں کہ قانون کی صحیح تعریف تو یہ ہوسکتی ہے کہ:

ایسا طریقہ جس سے انسان آزادرہ کر بھی نقصان نہ پہنچا سکے اور نہ نقصان پائے۔

اب اس تعریف پر اگر کچھ اضافہ ہوسکتا ہے تو وہ صرف لفظ ''ہرگاہ'' کا کیوں کہ اصطلاحاً ہر وہ فقرہ اور ہر وہ عبارت قانون سمجھی جائے گی یا قانون کا اثر پیدا کر کے چھوڑے گی جس کے سرے پر یا شروع میں لفظ ''ہرگاہ'' ہو اور بقیہ عبارت اس قدر پیچیدہ اور گنجان ہو کہ اپنے بڑے مولوی صاحب بھی اس کا مفہوم نہ سمجھ سکیں۔

وکیلوں کے خیال میں ''قانون'' وہ ہے جس سے مؤکل یا موکلہ تابع ہو یا بغیر پیشی نصف محنتانہ ادا کر دے یا ادا کرنے کا وعدہ کرے یا ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو یا رکھتی ہو۔ یا بصورت جیت جانے مقدمہ کے دس روپے علاوہ محنتانہ کے ''مٹھائی'' کے نام سے ان کے بچوں کے ہاتھ پر رکھ دے یا ان کے منشی کو دے دے۔

ان تعریفات کے بعد ہمارے نزدیک قانون کہتے ہیں اس قوت کو جو انسان کے اندر دوسرے قوئی کی طرح موجود ہے اور جو اس کی جملہ قوتوں پر احتساب و نگرانی کرتی ہے۔ یہ قوت انسان کو غلط کاری اور غلط روی پیدا کر کے ہر مضرت سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس قوت کی بقا منحصر ہے انسان کی اچھی صحت اور بہترین ماحول پر۔ اگر انسان کی صحت نہایت درجہ معتدل اور صحیح ہو لیکن وہ جرائم پیشہ طبقہ میں رہے یا رکھا جائے تو اس کی قانونی قوت بے کار یا مضمحل ہو جاتی ہے، لیکن اگر وہ ایسے ماحول میں رہتا ہے یا رہتی ہے جہاں سب یا اکثر لوگ ''قانونی زندگی'' کے خوگر ہیں، تو وہ ہر قسم کی غلط کاری یا غلط روی سے محفوظ رہ کر صحیح معنی کا انسان بن سکتا ہے۔ قانونی زندگی والے کی پہچان یہ ہے کہ وہ سوسائٹی یا قوم کی متفقہ یا مروجہ طرز زندگی سے ایک بالشت، ایک انچ، ایک ہاتھ، ایک گز، ایک سوت یا ایک کلومیٹر بھی پیچھے نہ رہے اور آگے بڑھے اور اسی لیے یہ واضعین قانون انسانی نے جو

اصول وضوابط انسانی زندگی کو منتظم اور محفوظ رکھنے کے لیے وضع کیے ہیں وہ سراسر انسان کو وحشت اور درندگی سے پاک کر کے پُرامن اور سلیقہ مند منظم اور نفع بخش بنانے والے ہیں۔ یہاں آپ واضعین قانون سے کہیں مسٹر دی۔ جے۔ پٹیل اور سر ملک عمر حیات خاں ٹوانہ کو نہ سمجھ لیجیے۔ بلکہ وہ مافوق الفطرت انسان مراد ہیں جنھوں نے انسان کے پُرامن رہنے سہنے کے طریقے وضع کیے ہیں۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ قوت آج ہمارے ملک کے افراد میں کہاں تک باقی ہے اور جو نہیں ہے تو کیوں؟ مگر اس کے لیے پہلے ان افراد انسانی کی قانونی زندگی پر ایک نظر ڈالنا ہوگی جو صحیح معنی میں یا بڑی حد تک قانونی زندگی کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس لیے لامحالہ ہم کو یہی سامنے والے لوگ عرف انگریزوں کی زندگی کو مثال بنانا پڑے گا۔ مثلاً آپ ایک انگریز کو لیجیے اور دیکھیے کہ وہ صبح اذان کے وقت نیند سے بیدار ہوگا۔ اور ہو کر رہے گا پھر وہ صبح کی میونسپل کمیٹی کے اجلاس سے فارغ ہو کر غسل کرے گا یا منہ دھوئے گا یا کلی کرے گا یا ٹام میں پانی ڈالے گا تو سر کے بالوں کو سنوارے گا یا مسواک نہ کرے گا تو برش سے دانت صاف کرے گا اور صاف کر کے رہے گا۔ ورنہ چائے سے تو کسی حال میں نہ چوکے گا۔ پھر وہ اخبار پڑھے گا یا خطوط لکھے گا۔ پھر وہ اسکول جائے گا یا دفتر یا دکان پر یا کھیت پر یا پریڈ پر یا روئی کے کارخانے میں یا اسٹیشن پر یا جہاز پر یا کسی کارخانے میں کام سیکھے گا۔ بہرحال وہ کہیں جا کر رہے گا۔ پھر وہ عین دوپہر سے ذرا ہٹ کر کھانا کھائے گا چاہے اس وقت اس کے سامنے کسی ہندستانی کی پھانسی کا مقدمہ ہی کیوں نہ پیش ہو۔ پھر وہ گھر آئے گا اور غسل کر کے پھر چائے بسکٹ یا سیب یا انگور کھائے گا۔ پھر وہ اصالتاً یا کتے کے ساتھ سیٹی بجاتا ہوا کرکٹ، ٹینس یا ٹھنڈی سڑک یا پارک یا بازار کی تفریح کو جائے گا اور جا کر رہے گا تاکہ ہلکا سا پسینہ اس کے جسم سے پیدا ہو جائے۔ پھر وہ مغرب کی اذان کے بعد گھر آ کر غسل کرے گا پھر وہ ڈنر، ضیافت، ایٹ ہوم یا صرف اپنے ننھے میاں کی والدہ کے ساتھ کھانا کھائے گا۔ پھر کچھ دیر اخبار گپ، تاش، بلیئرڈ، قہقہہ، شراب، غور و فکر میں گزار کر پلنگ خفتہ باشد ہو جائے گا یا ہو جائے گی اور دوسری صبح پھر وہ گزشتہ سے پیوستہ ہو جائے گا۔

◆

یہ ہے انگریزوں کی وہ زندگی جسے قانونی زندگی کہا جاتا ہے یا کہنا چاہیے بخلاف اس کے

ہندستانیوں کی زندگی میں قانون کی پابندی یوں نظر آتی ہے کہ وہ صبح سویرے نہ اٹھا ہے نہ اٹھے گا یا کیوں اٹھے؟ اور کیوں اٹھایا جائے؟ یا کون اٹھائے؟ اور کسے غرض؟ یا کون اٹھاتا ہے! اور کس لیے اٹھائے یا اٹھائے تو اس کی جھنجھلاہٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کون سنے؟ اور کسے پڑی؟ پھر اگر وہ اٹھا بھی تو نصف گھنٹہ تک وہ کروٹیں ہی لیتا رہے گا یا لے کر رہے گا۔ پھر وہ پلنگ پر بیٹھ تو جائے گا مگر اس طرح کہ ابھی اس کی آنکھیں بند ہوں گی۔ پھر وہ اونگھنا شروع کرے گا یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو وہ تکیہ پر سر کو رکھ ہی دے گا۔ وہ پھر اٹھے گا اور اب وہ کبھی کان پر ہاتھ مارے گا کبھی ناک پر مگر آنکھیں ابھی بند ہی رکھے گا۔ وہ اب پھر لیٹ جانے کی طرف مائل ہوگا اور لیجیے وہ پھر لیٹ گیا۔ اب پھر وہ ہوشیار ہوگا، لیکن اسی گرانی کے ساتھ اور جواب بھی اس کے پلنگ پر دھوپ نہیں آئی ہے تو وہ پھر سو جائے گا اور سو کر رہے گا۔ اب دھوپ آجانے یا خمار ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ آنکھیں تو کھول دے گا مگر جنبش نہ کرے گا۔ صرف بہ آواز بلند جمائیاں لے اور پانی سے بھرے ہوئے لوٹے کو پلنگ ہی پر سے دیکھے گا۔ اگر قریب تر نظر آ گیا تو وہ اب حقے یا سگریٹ یا بیڑی کا کش لگائے گا اور پھر لوٹا لے کر میونسپل بورڈ جائے گا اور وہاں سر کو دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر ایک مرتبہ پھر سو جانے کی کوشش کرے گا یا اونگھنے میں مصروف ہو جائے گا اور جو یہ کچھ نہیں تو صرف آنکھیں ضرور بند کر لے گا اور بند کر کے رہے گا۔ اب وہ میونسپل بورڈ کے دوسرے ممبر کی کھانسی یا ڈانٹ سن کر باہر آئے گا اور بقدر نصف مشک پانی سے صرف ہاتھ منہ دھوئے گا۔ گویا تمام دنیا کا غبار اسی کے چہرے کو خراب کر گیا ہے۔ اس منہ دھلائی میں بقدر مقدرت خدام کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ ان کاموں میں دس بجے دن تک کا وقت گزر گیا۔ اب وہ گھر کے لوگوں سے گپ شپ کرے گا یا کمرے میں آ کر تاش کھیلے گا یا کھانا کھا کر نوکری پر جائے گا اور کوئی تین گھنٹہ کام کر کے وہ پھر لیٹ جانے کی فکر میں مصروف ہو جائے گا اور لیجیے وہ دوپہر کو کہیں لیٹ ہی گیا اور اگر دکان پر ہوگا تو چاہے گاہک بغیر خرید کیے واپس چلا جائے گا مگر وہ لیٹ کر رہے گا۔ اس طرح وہ چار بجے دن زندہ رہے گا اور اب وہ اس طرح گھر واپس آئے گا گویا چین و جاپان کو وہ اکیلا ہی فتح کر کے ابھی ابھی واپس آیا ہے۔ اس وقت گھر میں اس پر کام کرنے کی گرانی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اپنے کپڑے تک خود نہ اتارے گا اور جو افلاس کی وجہ سے ملازم نہ ہوگا تو خود اتارے گا مگر اس طرح کہ ایک کپڑا بھی اپنی مقررہ جگہ پر نہ رکھے گا۔ اب

وہ کام کر کے آیا ہے اس لیے اس کی ہر بات میں غصہ ہوگا۔ اور گھر والے آپس میں اشاروں سے کہہ دیں گے کہ نوکری پر سے آ رہے ہیں بات نہ کرو۔ اب وہ انگریزوں کی تقلید میں چائے نوش کرے گا اور پھر وہ حقہ لے کر مکان کے باہر بیٹھ جائے گا اور تمام دوستوں کو دن بھر دفتر کے واقعات سنائے گا اور پھر وہ تفریح کو جائے گا۔ اب اگر باغ کی طرف نکل گیا یا ٹھنڈی سڑک پر تو گرانی کا یہ حال ہوگا کہ کوٹ یا شیروانی کے تمام بٹن کھول دے گا اور ٹوپی ہاتھ میں یا بغل میں رکھے گا۔ قدم اس طرح اٹھائے گا گویا وہ اسسے پہلے کسی تانگے کا ٹٹو تھا اور اب اسے تانگہ سے کھول کر ٹہلایا جارہا ہے۔ واپسی بجائے ٹھیک مغرب کے ٹھیک عشا کے وقت ہوگی اور جو راستہ میں کسی بے تکلف دوست نے کھانا بھی کھلا دیا تو اب وہ شب کے بارہ تیرہ بجے ہی گھر واپس آئے گا۔

اس مربوط و مسلسل زندگی کے بعد اس کی متفرق قانونی زندگی یوں ہے کہ جس راستہ سے سپاہی جانے کو منع کرے گا وہ اسی راستہ سے گزرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر سواری میں روشنی لے کر جانے کا حکم ہوگا تو وہ بغیر روشنی کے سواری کو سپاہی کے سامنے سے لے کر گزر جانے کو بڑی زبردست فتح سمجھے گا۔ اگر دعوت یا نوکری کا وقت دس بجے ہوگا تو وہ ہمیشہ گیارہ بجے پہنچے گا۔ البتہ ریلوے اسٹیشن پر ٹھیک وقت پر پہنچنے کی جگہ وہ ہمیشہ دو گھنٹے پہلے پہنچ جائے گا۔ اگر ریل کے کسی ڈبے میں صرف دس آدمیوں کی نشست کا قانون ہے تو یہ اس میں بیس اور پچیس ہو کر بیٹھے گا اور مسجدوں میں سیدھی صف بنا کر نماز پڑھنے کا قانون ہے تو ہمیشہ ٹیڑھی صف بنا کر نماز پڑھے گا۔ اگر اسے ایڈیٹر ہو کر کسی اخبار یا رسالہ کو پابندی سے شائع کرنا ہے تو یہ ہمیشہ ڈبل نمبر شائع کرے گا اور اعتذار میں صاف لکھ دے گا کہ اب دیر نہ ہوگی، مگر پھر ہوگی۔ اگر وہ ریل کے ذریعہ کسی دوسرے شہر جائے گا تو ہمیشہ مقررہ دن سے ایک دن بعد پہنچے گا۔ جب اسٹیشن پر ایک بھی استقبالی نہ آئے۔ اگر وہ کرایہ کے مکان میں رہتا ہے تو کرایہ ہمیشہ دوسرے مہینہ ادا کرے گا اور جو یہ ہندستانی ہوا کہیں کا رئیس اعظم تب تو اس کی ساری زندگی میں قانون کا وجود ڈھونڈے نہ ملا ہے نہ ملے گا کیوں کہ وہ تو ہے رئیس اور رئیس کے لیے ویسے بھی قانون، کاغذ کا ایک پُرزہ ہے کہ کہا ہے جرمن کے وزیر اعظم نے خدا کرے اب ان لوگوں کو سوراج اور مل جائے پھر دیکھنا قانونی پابندیاں!!

◆◆◆

ہماری رائے "سیر گل" کی بابت

(از رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور، جون 1928)

وہ جو اگلے زمانے میں ہم علی گڑھ گئے تھے تو یہاں کے اسکولوں، کالج اور یونیورسٹی کے تمام طلبا، ماسٹر، پروفیسر اور عالی جناب نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر کے سواسب کے سب پہلے ہی سے مانے ہوئے بیٹھے تھے کہ حضرت ملا رموزی نہ فقط ضیاء الملک اور قبلہ مدظلہ العالی ہی ہیں بلکہ وہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز، فاضل، ادیب، جادونگار، مقرر، لیکچرر، ایڈیٹر، نقاد اور مدبر بھی ہیں۔ صرف ذرا اکبر آباد کے "شاعرِ اعظم" نہیں ہیں اس لیے تمام ایسے خیال کے لڑکے لڑکیاں، نوجوان اور بوڑھے اپنی اپنی لکھی ہوئی کتابیں، مضامین اور ناولیں وغیرہ لیے بیٹھے تھے کہ جوں ہی کہ ان سے ملیں وہ اپنی ان کتابوں کو تحفہ اور ہدیہ بنا کر ہمیں پیش کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو ہم کسی قابل آدمی سے ملے، اس نے جھٹ اپنی کوئی کتاب ہمیں مرحمت فرمادی گو کتاب پیش کرنے والوں کو یہ خبر نہ تھی کہ:

"ملا رموزی کو علمی و ادبی کتابیں پیش کرنا اصل میں "پیش کرنا" نہیں بلکہ اس پر لاد دینا ہے (سمجھ گئے؟)"

پس ایسے ہی بھائیوں میں مسلم یونیورسٹی کے مشہور و معروف ادیب حضرت مولوی جلیل احمد

قدوائی بی۔اے بھی ہیں، جنھوں نے ہمیں اپنی بہترین کتاب ''سیر گل'' عطا فرمائی۔لیکن جب یہ سب کتابیں ہمارے اوپر لاددی گئیں تو ہم نے بھی اسی نسبت سے بجائے مطالعہ کے انھیں اپنے اسی کالے رنگ کے صندوق میں بند کردیا جوعلی گڑھ جاتے وقت دہلی کے اسٹیشن سے بغیر ہماری اجازت اور موجودگی کے سہارنپور تک اکیلا چلا گیا کہ جب وطن واپس پہنچیں گے تو وہ ننھے میاں کی والدہ سے کہیں گے کہ لو جی ذرا تم پڑھتی جاؤ اور ہم ذرا سنتے جائیں۔

مگر اس حساب سے یہ خالص علمی وادبی کتابیں ''داستانِ امیر حمزہ'' ہو جاتیں اس لیے یہ ارادہ ترک کردیا۔ادھر ویسے بھی ''ننھے میاں کی والدہ'' کتاب پڑھتے وقت اونگھتی بہت ہیں۔نیز خود کتابیں پیش کرنے والے بھائیوں نے اپنی کتاب پر صرف اتنا ہی لکھ دیا تھا کہ:

''ادیب لبیب حضرت ملا رموزی کی خدمتِ عالیہ میں''۔

''ہیناچیز ہدیہ فقط بقلم خود مصنف''

یہ کہیں نہیں لکھا تھا کہ جناب ملا رموزی صاحب اس کتاب کو آپ بہت غور سے پڑھنا یا پڑھانا یا سن لینا یا سنا دینا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ جو چاہو سو کرو، اس لیے ہم نے بھی علی گڑھ کا قیام معاوضہ کے مضامین لکھنے میں گزار دیا۔لیکن اب جو علی گڑھ سے وطن کی طرف پسپائی عمل میں آئی تو سوچا کہ اس مرتبہ ریل گاڑی میں یہ کتابیں پڑھتے ہوئے جائیں گے، اس سے ذرا اونگھنے میں مدد بھی مل جائے گی۔بس یہ سوچ کر اٹھالی مولوی جلیل احمد صاحب قدوائی بی۔اے کی کتاب ''سیر گل'' اور لگے پڑھنے۔

◆

قبل اس کے کہ اس کتاب کے متعلق کچھ عرض کریں۔اتنا بتائے دیتے ہیں کہ ریل کے سفر میں قاعدہ ہے کہ اگر کوئی ہمراہی ہو تو راستہ آرام سے کٹ جاتا ہے۔ریل کے ڈبے میں کافی جگہ ہو تو راستہ آرام سے کٹ جاتا ہے۔ریل کے تین منٹ والے اسٹیشنوں پر ٹھہرنے کا خطرہ نہ ہو تو راستہ آرام سے کٹ جاتا ہے۔ریل کے ڈبے میں نشست محفوظ ہو تو راستہ آرام سے کٹ جاتا ہے۔

مگر یہ سب باتیں اسی وقت پوری ہوسکتی ہیں جب ہم خود سفر کریں فرسٹ کلاس میں، مگر ہم نے علی گڑھ سے چلتے وقت محترم میزبان سے کرایہ تو وصول کیا فرسٹ کلاس کا اور ٹکٹ لیا انٹر کلاس کا

اور باقی تمام دام'' بحق والدۂ ننھے میاں محفوظ'' اور یہ حرکت اس لیے کی کہ یہ تمام بڑے بڑے عہدہ دار اور افسر لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں کہ سفر تو کرتے ہیں تھرڈ کلاس میں اور سرکار سے دام وصول کرتے ہیں فرسٹ کلاس کے۔ یقین نہ ہو تو قبلہ سید سجاد حیدر صاحب ڈپٹی کلکٹر سے دریافت کرلو۔

غرض انٹر کلاس میں سفر کرتے وقت دعا کی کہ اے مصطفیٰ کمال پاشا ایسے ادنیٰ سپاہی کو تمام یورپ پر غالب کرنے والے خدا ہمارے سفر کے لیے ذی علم انسان دے، کوئی انشاء پرداز دے، کوئی مصنف یا مترجم دے، کوئی لیڈر یا ایڈیٹر دے اور جو یہ کوئی نہ ہو تو کم از کم کوئی علی گڑھ کا والنٹئر یا خلافت کا رضا کار ہی دے دے۔ کیوں کہ ایسے ہی لوگ ہو سکتے ہیں جنھیں ہمارے ذوق سے کوئی مناسبت ہو سکتی ہے، لیکن ذرا دیکھنا فطرت کی فیاضی کو کہ ہمارے وطن تک کے جو ہم سفر ہمیں ملے وہ تھے ''ڈاکٹر صاحب''۔ کہنے کو کتنا معقول جوڑا ملا؟ اب خوبی پر خوبی یہ کہ ان ڈاکٹر صاحب کی جدید معلومات، روشن خیالی اور خوش ذوقی کا یہ عالم تھا کہ اس 1928 میں بھی وہ اپنی داڑھی پر فرید آباد کی مہندی لگائے ہوئے تھے، جس سے داڑھی کا ایک ایک بال سرخ ہو رہا تھا۔ بس انھوں نے بڑے ہی خضوع و خشوع سے ایک مرتبہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور جمائی لے کر ہمارے پاس بستر بچھانے میں مصروف ہو گئے۔ ہم نے سمجھ لیا کہ یہ ہے موقع کہ ہم اور ہمیں رخصت کرنے والے احباب کہیں خدا حافظ۔

◆

ڈاکٹر صاحب کی روشن خیالی کے ثبوت میں ان کے ساتھ مٹی کا ایک ایسا وضو کرنے والا لوٹا بھی تھا جو سیٹ کے نیچے رکھا تھا اور اس کی ''آبپاشی'' سے پاس والے مسافروں کے جوتوں کا چمڑا نہایت نرم اور آرام دہ ہوتا جاتا تھا۔ گویا ریل میں جوتوں پر جم جانے والی خاک کو یہ لوٹا اس قدر خاموشی سے دھوتا جاتا تھا کہ مسافروں کو اس کی اس خدمت کا اس وقت علم ہوتا تھا جب وہ جوتا پہنتے وقت گردن جھکا کر کہتے تھے ارے لاحول ولا! مگر ڈاکٹر صاحب اس پر بھی تاکید فرماتے تھے کہ ''اماں اس میں وضو کا پانی ہے، پھینک نہ دینا''۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لیٹے لیٹے اس زور سے جمائیاں لینا شروع کر دیں کہ تمام مسافروں کے منہ آپ کی طرف خود بخود پھر گئے۔ پس ممدوح کی ان حرکات سے ہم نے اپنی عافیت کا اندازہ کر کے خود کتاب ''سیر گل'' کے مطالعہ میں بڑے زور سے

محو معروف کر دیا۔ پہلے تو ارادہ تھا کہ پڑھنا ڑھنا تو ایک طرف بس کتاب میں خود کو ذرا مصروف سا ظاہر کر کے ان سرخ داڑھی والے بالشویک ڈاکٹر صاحب سے ذرا محفوظ ہو جائیں گے ورنہ مبادا کہیں ڈاکٹر صاحب ہماری داڑی کے فقدان پر سوالات کا تار باندھ دیں، مگر اثر الٹا ہوا کہ اس کتاب میں دل لگ گیا اور اس کے کوئی سو صفحات پڑھ کر ہم نے ایک جمائی لی۔

اس بے نظیر کتاب کے 205 صفحات میں تین اوپر دس افسانے پھیلے ہوئے ہیں یا پھیلے پڑے ہیں جنھیں پڑھ کر جب ہمارا دل و دماغ باغ باغ ہو گیا تو پھر خوش ذوق لوگوں کا کیا حال ہوگا؟۔

ان افسانوں میں انسانی سیرت، خواص، تاثر، محبت، ہمدردی اور اخلاق کے جتنے بھی گر بتلائے ہیں وہ سب کے سب فوائد سے لبریز ہیں اور اسی لیے ہمارے خیال میں کتاب ''سیر گل'' میں وہ سب کچھ ہے جو علی گڑھ میں کامل سولہ برس ہاکی اور ٹینس کھیلنے سے بھی نہیں ملتا۔

◆

بزرجمہر نے کہا ہے کہ افسانہ اسی عبارت کو کہہ سکتے ہیں جس کے ختم ہونے پر انسانی دل و دماغ کوئی برتراز قیاس اور مفید فائدہ کا اثر حاصل کرے۔ سو اس لحاظ سے یہ کتاب ایسے ہی فسانوں کا مجموعہ ہے۔

افلاطون نے کہا کہ افسانہ کی دوسری خوبی یہ ہے کہ سکہ افسانہ نگار کے قلم میں ہر چیز یا ہر حرکت کا صحیح نقشہ کھینچ دینے کی قوت رکھتا ہو۔ سو اس قاعدے سے جلیل احمد صاحب قدوائی کو بی۔ اے ہونے سے پہلے بھی یہ قدرت حاصل تھی اور بی۔ اے کے بعد تو نہایت مکمل ہو چکی ہے جس کا ثبوت یہ افسانے ہیں۔ یہ جلیل احمد صاحب ہی کا قلم ہے جو ہر عبارت میں انسانی جذبات نسوانی جذبات (یہاں نسوانی جذبات کاتب صاحب کی غلطی سمجھیے) فطرت اور جمال فطرت کے تمام نقوش واثرات کو ان کے اُس رنگ میں کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ اور اسی لیے ان حالات واثرات کو دل و دماغ اسی طرح قبول کر لیتے ہیں جس طرح آنکھ کسی اصل شے کو دیکھ کر پسند کر سکتی ہے۔ اور یہ بات اصل میں حاصل ہوتی ہے زبانِ افسانہ یا تحریر افسانہ کی امداد سے۔ یعنی جو افسانہ نگار زبان کے اندر اظہارِ خیال کی مافوق الفطرت قوت رکھتا ہے اور جو زبان کو اس طرح بولتا اور لکھتا ہے کہ اس

میں اسے کسی جگہ تکلف سے کام لینا نہ پڑتا ہوتو ایسا ہی افسانہ نگار ہوسکتا ہے جو کامیاب ہوگا۔ یہ اکبرآبادی افسانہ نگاری نہیں کہ ارتعاش خفی، دیویتِ عظمیٰ، موسیقیتِ رنگیں، نغمۂ لرزاں، شفقستانِ نگاریں اور بہارستانِ مرمریں کے سے الفاظ بھر دیے اور انھیں افسانۂ عریاں کہہ دیا۔

لارڈ کرزن نے کہا ہے کہ افسانہ کی کامیابی اس کے طرزِ ادا پر موقوف ہے (لفظ ادا کے لیے ہمیں قدوائی صاحب معاف فرمائیں) یعنی افسانہ نگار کسی واقعہ کو ایسے الفاظ میں بیان کرے جس کے اثرات یا مقاصد ناظر و قاری کے دماغ سے گزرتے ہوئے سیدھے دل پر جا بیٹھیں۔ پس یہ خوبی کتاب ''سیر گل'' کے ہر صفحہ میں موجود ہے۔

مارشل مصطفیٰ کمال پاشا نے کہا ہے کہ فسانہ میں جن واقعات و حالات کو بیان کیا جائے ان کے اندر ان کے مواقع و مناظر کو اس خوبی سے بیان کر دیا جائے جس میں کوئی صنعت یا تکلف محسوس نہ ہو سکے کیوں کہ واقعات اپنے مواقع کی امداد سے زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھے اور قبول کیے جا سکتے ہیں، مگر یہ اہم مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب افسانہ نگار وسیع العلم اور کثیر حالات سے واقف ہو اور اسی مقصد کو عرفاً ''مناظر کشی'' کہا ہے۔ سو اس حیثیت سے کتاب ''سیر گل'' جس درجہ مکمل ہے اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

بادشاہ رضا خاں پہلوی نے کہا کہ افسانہ کی اصل کامیابی بلکہ ہر تحریر کی کامیابی یہی ہو سکتی ہے کہ اسے بکثرت اشخاص اور اشخاصیاں پڑھیں (یہاں اشخاصیاں جیسے اونٹنی سے اونٹنیاں کی جمع کے قاعدے سے درست ہے) اور یہ مقصد اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جب طرزِ بیان عام فہم ہو لیکن زبانِ اردو کے موجودہ خصوصاً نوجوان اہلِ قلم اپنی کم علمی کے باعث اس اہم نکتہ کو یکسر بھلا بیٹھے ہیں۔ وہ نہیں اندازہ کرتے کہ ہمارے موٹے موٹے اور بلاغت ربود الفاظ اور غیر مانوس تراکیب کو کون سمجھے گا جب کہ ہندستان شریف میں پہلے ہی لکھے پڑھے انسانوں کی تعداد پانچ فیصدی ہے اور اسی لیے اردو کے افسانہ نگار اگر کسی گاؤں یا جنگل کا منظر دکھانا چاہیں گے تو یوں لکھیں گے کہ ''اس فردوس آفریں پہاڑ سے چشمہ ہائے زمزم اس طرح پیدا تھے جس طرح کوئی نظر فریب و بہار افزا ابرآب کوثر کو سطحِ ارضی پر اس طرح برسا دے کہ اس سے ایک عالم آرا اور دلکشا سبزۂ رنگین پیدا ہو جائے''۔ لاحول ولا۔

اب بتلایئے کہ اس قسم کی عبارت سے یہ اپنے یہاں کے لالہ لوگ پٹواری صاحبان، نقشہ نویس، ہیڈ کانسٹبل، داروغہ، چپراسی اور چوکیدار صاحبان کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اور گدھے ہیں وہ اہل قلم جو اپنی تحریر کو صرف مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا احمد سعید صاحب جیسے ذی علم اشخاص کی سمجھ کے قابل کہنا چاہتے ہیں جب کہ ایسے قابل لوگوں کے لیے کوئی تحریر لکھی ہی نہیں جاتی۔ ہمیشہ اصلاحی تحریروں کا مقصد کم علم اور بے خبر لوگوں کو سمجھانا ہوا کرتا ہے اور ایسے لوگ بھی ایسی تحریر سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، جس میں ٹیگوری رنگ کی بلاغت، ربودی ٹھونس دی گئی ہو اور اسی لیے تو مارشل رضا شاہ پہلوی اور امیر امان اللہ خاں غازی کہتے ہیں کہ زبانِ اردو کے تمام اخبارات کی تحریر کو نہایت درجہ آسان اور عام فہم ہونا چاہیے۔ پس اس نہایت اہم کلیہ کے موافق حضرت جلیل احمد صاحب قدوائی کے تمام افسانوں کی مناظر کشی اس درجہ صحیح اور مناسب یا عام فہم ہے کہ باید وشاید۔ مثلاً وہ ایک جگہ گاؤں یا دیہات کے ایک موقع کو یوں لکھتے ہیں کہ:

''دس بیس چھوٹے چھوٹے دیہات ملا کر پورا قصبہ یہاں کی سڑکیں کچی اور تنگ۔ اکثر پگڈنڈیاں ہیں جو کھیتوں کی مینڈوں پر ہو کر باغوں کے درمیان سے گزرتی ہیں''۔

دیکھیے یہاں دیہاتی موقع کی مناسبت سے پگڈنڈیاں، کھیتوں کی مینڈیں اور کچی سڑکیں وغیرہ الفاظ کس درجہ سمجھ میں آجانے والے ہیں۔ اسی طرح وہ ایک جگہ ایک شخص کے خیالات کو بیان کرتے ہیں:

''(شوہر نے کہا) میں نے اسکول کی تعلیم ختم کی اور بنارس یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے مجھے بھیجا گیا تھا۔ میں پہلے پہل اپنے والدین سے جدا ہوا۔ شروع شروع میں تو میں قریب قریب ہر مہینہ اپنے گھر آ کر سب کو دیکھ جاتا، مگر رفتہ رفتہ جدائی کا عادی ہو گیا''۔

دیکھا اس عبارت میں زبان۔ روزمرہ، سادگی، سلاست اور فصاحت کو؟ اور کمال تو یہ ہے کہ قدوائی نے اپنے اہم سے اہم علمی و اخلاقی افسانے اسی سلیس عبارت میں لکھے ہیں اور علی گڑھ جیسی بلاغت نگار فضا میں رہ کر لکھے ہیں۔

غازی عبدالکریم فاتح ریف نے کہا ہے کہ ہر تحریر جو کتاب یا عام مطالعہ کی غرض کو لے کر لکھی جائے اس کا مقصد یا فائدہ کبھی کسی ایک جماعت یا قوم سے متعلق اور مخصوص نہ ہو بلکہ اس کا

انداز بیان ایسا ہو کہ اسے ہر جماعت اور ہر قوم صرف اپنے لیے خاص سمجھے، مگر یہ نکتہ سوائے ہمارے اب تک کسی اہلِ قلم نے بھی نہیں سمجھا بلکہ نئی جماعت نے تو اس کے خلاف ہمیشہ اپنی تحریروں کو تعصب و جانبداری کے رنگ میں پیش کیا اور اسی لیے آئے دن تمام بھلے مانسوں کو ہندو مسلم فساد کے بہانے سے کوتوالی میں جانا پڑتا ہے۔ یہ تو ماشاءاللہ ہمارے ہی مضامین میں خوبی ہے کہ ہوتے تو ہیں صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے مگر انھیں یہ اپنے ہاں کے تمام ہندو بھائی، سکھ بھائی، پارسی بھائی اور جب سے خلافت کا خاتمہ ہوا ہے تو یہ انگریز بھائی بھی انھیں اپنے ہی لیے سمجھتے ہیں۔ مگر اب کتاب ''سیر گل'' میں یہ بات دیکھ کر مسرت ہوئی کہ قدوائی صاحب کے افسانے اس قابل ہیں کہ انھیں مسلمانوں سے زیادہ ہندو بھائی خریدیں اور ہندو بھائیوں سے زیادہ مسلمان بھائی۔

◆

''سیر گل'' کی یہ خوبیاں ہیں کہ جو کتاب کے مطالعہ کے وقت ان سے کہیں زیادہ اچھی اور اثر انداز میں نظر آئیں گی۔ تنقید یا تبصرے کے قاعدے سے قدوائی صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ آئندہ کسی فسانے کا ترجمہ کرتے وقت اس میں مواقع اور اشخاص کے نام بھی ہندستانی ناموں پر رکھیں تاکہ وہ میانہ آسانی سے سمجھے اور پہچانے جا سکیں اور ترجمہ کا یہ طریقہ کوئی غلط یا معیوب بھی نہیں مثلاً ظاہر ہے کہ ''موسیو ٹراٹسکی یا مارشل دوبی فو اور ہنڈنبرگ کے مقابل عبداللہ خاں، رام لال اور عطر سنگھ کو ہندستانی زیادہ آسانی سے سمجھ جائیں گے۔

کتاب ''سیر گل'' کی لکھائی چھپائی اس قدر اچھی اور صاف ہے کہ دعا کرنا پڑتا ہے کہ ہماری کتابیں بھی ایسی ہی چھپ جائیں۔ کاغذ بے حد مضبوط اور اس قدر مضبوط ہے کہ اگر کتاب سنبھال کر رکھی جائے تو دس برس تک ٹوٹ نہیں سکتی۔ لکھائی چھپائی کی عمدگی کا سبب یہ ہے کہ اس کے چھاپنے والے ملک کے مشہور منتظم مطبع حضرت ''باہتمام مولوی مقتدیٰ خاں شیروانی ہیں''۔ اس کتاب کو جب خریدو تو خط پر لکھ دینا:

بخدمت شریف مولوی جلیل احمد صاحب قدوائی بی۔ اے یونیورسٹی علی گڑھ اور ہاں قیمت ہے ڈیڑھ روپیہ۔

◆◆◆

مصلحین

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی کے اصول وضوابط ہیں جن کی تعمیل و اتباع سے انسان دینی و دنیوی نجات و کامیابی حاصل کر سکتا ہے اور جن مسلمانوں کو علومِ اسلامی اور شریعتِ مصطفوی کے نکات و رموز سمجھنے کی توفیق ارزانی ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ شریعتِ عالیہ اسلامیہ نے انسانی ضروریات اور زندگی کا کوئی ایک حصہ بھی ایسا باقی نہیں چھوڑا جس کے بغیر زندگی نامکمل سمجھی جاتی۔

پس اسی شریعتِ مطہرہ نے چند ایسے فرائض بھی مقرر کر دیے ہیں جن کے ذریعہ نظمِ قومی اور حیاتِ اجتماعی کا بقا مقصود ہے اور انھی فرائض کے بجالانے والوں کو ''مصلح'' کہا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ''مصلح'' کے فرائض کیا ہیں؟ سو اس کا نہایت جامع جواب یہ ہے کہ مصلح کی بہترین تعریف یہی ہے کہ ''تبلیغ و اصلاح'' کے لیے اس کی زندگی کا ہر فعل اور ہر عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا نمونہ ہو۔ اخلاقی حیثیت سے مصلح کے لیے خلوص، صداقت، ہمدردی، بے غرضی، جفاکشی، ایثار، خوش خلقی، عفو و کرم، صبر و رضا کے ساتھ ہی اعلاء اللہ کلمۃ الحق کے لیے شدت، بہادری اور بعض اوقات ''اقدام'' تک کا حکم دیا گیا ہے۔ پس اس وقت سے کہ حضورِ اقدس و اعلیٰ ذاتِ رسالت پناہی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آرام فرمایا ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کی اصلاح و تنظیم، حفاظت و

نگہبانی اور تہذیب و ترقی کے یہی لوگ ذمہ دار ہیں جنھیں اصطلاح میں ''مصلحین'' کہتے ہیں، لیکن کیا سبب ہے کہ ہندستان میں مسلمان مصلحین کی تعداد کافی سے زیادہ ہے، لیکن مسلمانوں میں زندگی اور ترقی کی جگہ تباہی اور بربادی پھیلی پڑی ہے؟

بظاہر اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ ''مصلحین'' کی حالت خود قابلِ اصلاح و احتساب ہے اور اس لیے ہم نے حال ہی کے ایک سفر میں جس میں ہمارے پندرہ روپیہ نو آنے خرچ ہوئے، مصلحین کی حالت کا اندازہ کرلیا۔

صوبہ جات متحدہ کے ایک ''بڑے قصبے'' کے رہنے والے ہیں، علی گڑھ میں جو بی۔اے، ایل ایل بی تک تعلیم پالی ہے تو نام خدا اب ایک جگہ ''افسر'' ہوگئے ہیں۔ ہمارا یارانہ اس وقت سے ہے جب نومبر 1927 میں ہم علی گڑھ کے اس مشاعرہ میں شریک تھے جس میں ہم نے بے طرح بھی کوئی غزل نہ پڑھی۔ ہمیں خط پہ خط لکھ رہے تھے کہ ایک ہی دن کے لیے آجایئے تفریح ہوجائے گی اور بہت سے مشتاقانِ رموزی فیضیاب ہوجائیں گے۔

ہم نے بھی سوچا کہ آج کل وہ بھی مہمان گئی ہوئیں ہیں گھر میں بیٹھے بیٹھے کیا کریں؟ اس لیے کوئی 27 مارچ 1928 کے دن ریل میں بیٹھ گئے۔ ٹکٹ وہی فرسٹ کلاس کا تھا۔ صرف انکسار کے طور پر تھرڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ اس لیے ہر قسم کی تکلیف کا سامنا رہا، جس کے یہ معنی ہیں کہ محض غلامی کی وجہ سے ہندستانی لوگ ہندستانی ریلوں میں نہ آرام پاسکتے ہیں نہ پاسکیں گے۔ کیوں کہ اگر کونسلوں میں ریلوے والوں کو ڈانٹ بھی دیں تو کیا؟ وہ جواد پر ''گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل'' بیٹھے ہیں وہ جب تک اپنے دوست نہ بن جائیں کچھ بھی نہیں ہوسکتا اور اسی لیے سچ کہا کرتے تھے اللہ بخشے اپنے ''بڑے مولوی صاحب'' کہ یہ ریل گاڑیوں سے تو اپنی بیل گاڑیاں ہی اچھی، جہاں چاہو روک لو، جتنا چاہو تیز چلالو اور جتنا چاہو آہستہ۔

غرض چل پہ چل پہنچ گئے اسی اسٹیشن پر جہاں سے قصبہ جاتا تھا۔ کوئی ایک اوپر بیس احباب نے بغیر سیاہ جھنڈوں اور ''سائمن کمیشن گو بیک'' کے نعروں کے ہمارا استقبال کیا اور ایک بیل گاڑی قسم اول میں بٹھا کر لے چلے ہمیں اُس طرف کہ قصبہ کہیں جسے۔ اسٹیشن سے کوئی چار میل دور تھی وہ کہ ''منزل کہیں اسے۔ گاڑی روانہ ہوگئی، صرف سڑک تھی ''کوفتہ بخنہ'' اس لیے کوئی ایک میل جا کر

کمر ٹوٹی تو کیا مگر ہاں ٹوٹ سی گئی۔ لیکن مشرقی آداب کا تقاضا تھا کہ جب احباب دریافت کریں:

''ملا صاحب کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

تو کہہ دیا جائے کہ ''جی نہیں حضرت بڑے آرام سے ہیں''۔

اب اتفاق تو کیا عذاب الٰہی کہیے کہ راستہ میں ایک نالہ آیا۔ گاڑی کے بیل تھے گاما اور زبسکو، اس لیے اتار کے بعد چڑھاؤ چڑھائی پر انھوں نے پوری طاقت سے جو گاڑی کھینچی تو گاڑی کا جوا تو رہ گیا ان کی گردن پر اور گاڑی ہم لوگوں کو لے کر نالہ کی گہرائی کی طرف اس زور سے پسپا ہوئی کہ ہم ایک دوسرے سے یہ بھی نہ کہہ سکے کہ ''کہا سنا معاف کیجیے گا''۔

آپ سمجھ لیجیے کہ یو پی کی طرف کے تعلیم یافتہ باشندوں کا یکا یک کسی عمیق گڑھے میں ایک کے اوپر ایک ہو کر جا پڑنا یا جا گرنا کس قدر عظیم یا عظیم الشان حادثہ ہو سکتا ہے۔ بس فوراً ہی آوازیں آنے لگیں ''ہائیں ہاں! بسم اللہ بسم اللہ! دیکھیے دیکھیے، اٹھیے اٹھیے، اف توبہ! دیکھیے دیکھیے۔ وہ ہاتھ سے خون بہہ رہا ہے۔ یہ دیکھیے میرے کس قدر خراش آ گئی، سر میں تو نہیں لگی؟ آپ تو بچ گئے۔ اماں بڑی خیر ہوئی۔ اف چودھری صاحب بیٹھ جائیے بیٹھ۔ کیا غش آ رہا ہے؟ ہائیں یہ کیا؟ ناک سے خون آ رہا ہے۔ اماں اچھن قمیص اتارو قمیص۔ ویسے کیا نظر آئے گا حضرت بے پروائی نہ کیجیے۔ تازہ چوٹ معلوم نہیں ہوتی۔ یہ دیکھیے نا دونوں گھٹنے کس قدر زخمی ہو گئے۔ اچھا اچھا شیروانی تو جھاڑیے۔ لاحول ولا۔ چشمہ تو بے کار ہی ہو گیا۔ ذرا بھئی میرے تین روپیہ بھی دیکھ لینا۔ اوہ میرے پاؤں میں سخت سوزش ہو رہی ہے۔ خیر چلیے شکر ہے کہ جانیں محفوظ رہیں۔ اماں اچھن تم کیسے چپ سادھے بیٹھے ہو۔ دیکھیں بھلا۔ اماں قمیص سے جھاڑ لو۔ اچھا تو ہڈی تو بچ گئی؟ ذرا لیٹ رہو لیٹ۔ یہ لو شیروانی نیچے ڈال لو۔ اماں ذرا ٹانگ جھٹک دو۔ ہائیں ہائیں زور کیوں لگا رہے ہو؟ لاحول ولا یہ لیجیے وہ پانوں کی ڈبیہ تو ریزہ ریزہ ہو گئی۔ چودھری صاحب کیا چکر آ رہا ہے؟ خیر ملا صاحب تو بچ گئے۔ پھر بھی بڑی خیریت رہی مگر ملا صاحب ذرا ٹہل کر دیکھ لیجیے گرم چوٹ معلوم نہیں ہوا کرتی۔ جی نہیں ہمارے کوئی چوٹ نہیں اور اگر ہو بھی تو مطمئن رہیے۔ ہم کوئی شکایت نہیں کریں گے کیوں کہ ہم ہیں یو۔ پی کے باشندے اور ''شیرانی الافغانی بھی''۔

اب اس ہنگامے کے بعد گاڑی چلانے والے سے باقاعدہ جرح شروع ہوئی ''تو کیا تجھے

نظر نہ آتا تھا؟ ابے تو اندھے ذرا جوئے کی رسی کو پہلے ہی دیکھ لیا ہوتا۔ ایسا بھی کوئی گاڑی چلاتا ہے؟ اور جو ابھی کوئی مرجاتا تو؟ تو بیل کو مارنے کی کیا ضرورت تھی؟ ابے رہنے بھی دے۔ حیلے تراش رہا ہے۔ چل فضول بکواس نہ کر۔ تو رسی نہیں ٹوٹی تو کیا فرشتوں نے گاڑی گڑھے میں پھینک دی؟ ہاں ٹھیک ہے تو بھیایوں کیوں نہیں کہتا؟ چل چل دیکھ بائیں کو بچاتا چل، دیکھ دیکھ پھر تو نے گاڑی دوڑائی۔ لاحول ولا اماں اچھن تم لے لو یہ تو گنوار ہے گنوار خیر الحمد للہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت اماں۔ ملا صاحب آرام سے بیٹھیے۔ تو آگے آجایئے۔ تو تکیہ تو لگا لیجیے۔

اس حادثے سے فارغ ہو کر قصبے پہنچے۔ تحصیلدار صاحب نے بڑے تپاک سے اس لیے ...لیا کہ علی گڑھ کی جگہ دیو بند میں تعلیم پائی تھی۔ گاڑی سے اترتے ہی کوئی پندرہ منٹ تک ...گاڑی کے حادثہ کی تفصیلات قصبے والے احباب کو سنائیں۔

اماں خدا نے بڑی ہی خیر کی۔ واللہ میں تو بال بال بچا۔ خدا کی قسم کلو بھائی تم ہوتے تو دیکھتے۔ اماں چوہدری صاحب تو از سر نو زندہ ہوئے۔ ملا صاحب نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا اور جو کبھی تین منٹ ہی گاڑی سیدھی نہ ہوتی تو واللہ گئے تھے سب خدا گنج وغیرہ وغیرہ۔

یہ عمر میں پہلا موقع تھا جب لوگ ہمارے استقبال کے ساتھ رسم عیادت بھی انجام دے رہے تھے اور بار بار خیال آتا تھا کہ بھلا یہ لوگ بھی انگریزوں سے سوراج لے سکتے ہیں؟

میزبان کے یہاں پہلی مرتبہ کھانے پر بیٹھے تو کوئی دو منٹ بعد تمام احباب کھڑے ہو گئے اور کہا گیا کہ ''میاں صاحب تشریف لے آئے میاں۔ خدا معاف فرمائے، ہم بھی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ایک صاحب تشریف لائے ولایتی سلک کی عبا، ولایتی چکن کا نیچا کرتا، کرتے کے نیچے گلابی رنگ کی بنیائن، بمبئی کی قیمتی صدری، ولایتی موزے اور دہلوی جوتا، خاص لندن کا چشمہ آنکھوں پر، ویسٹ اینڈ واچ کمپنی کی ایک گھڑی جیب میں اور ایک کلائی پر۔ تمام حلقی تو تیں خرچ کر کے فرمایا ''السلام علیکم!'' احباب نے بغیر وعلیکم کے ہاتھوں کو بوسہ دینا جو شروع کیا تو ہم نے گھبرا کر پاس والے دوست سے کہا۔ ''یہ کون صاحب ہیں؟ کہنی مار کر کہا ''اماں ایک بزرگ ہیں''۔

ہم تاڑ گئے کہ یہ حضرت خود ان بزرگ صاحب کی بزرگی کے قائل نہیں ورنہ یہ تعارف کے وقت ہمارے کہنی کیوں مارتے اور لفظ ''اماں'' کیوں استعمال فرماتے؟ بزرگ صاحب کے لیے

وسط میں جگہ خالی کر دی گئی اور موصوف نے خاص الخاص مراد آبادی لہجہ میں دیر حاضری کی معافی کیا چاہی داستانِ امیر حمزہ شروع کر دی اور خلاصہ یہ تھا کہ میں ڈپٹی صاحب کے بنگلہ پر تھا، وہ مجھے اٹھنے نہیں دیتے تھے کیوں کہ مجھ سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔ان کی اس قسم کی بے تکی باتوں پر ہمیں پھر غصہ آیا تو انھوں نے بھی پھر کہنی مار کر کہا ''اماں تمھیں کیا پڑی تم کھانا کھاؤ''۔

احباب کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو کہا میاں یہ ہیں حضرت ملا رموزی صاحب۔ میں نے اُخو کہہ کر بے ساختہ فرمایا، مگر ملا صاحب یہ داڑی تو ذرا...مناسب یہی سمجھا کہ کہہ دیں بہت اچھا، اس لیے کہہ دیا ''بہت اچھا'' میاں نے فرمایا:

''لو ملا صاحب پھر شام کو غریب خانے پر ہی ماحضر تناول نہ فرمایئے؟''

یہ ایک قسم کا اذن بھی تھا اور گریز بھی۔ استفسار بھی تھی اور ٹال بھی۔ مگر ہم نے فوراً ہی کہا ''بہت اچھا تو کے بجے حاضر ہونا چاہیے؟'' اب تو میاں کو کہنا ہی پڑا ''وہی عشاء کے بعد''۔

◆

میاں کا شرعی لباس تو اوپر ملاحظہ فرمالیا اب میاں کا ''غریب خانہ'' بھی ملاحظہ ہو۔ عشاء کے بعد آدمی آیا ''چلیے میاں یاد فرماتے ہیں''۔ گئے تو ایک شاندار کوٹھی نما عمارت میں بٹھائے گئے۔ وسط میں باغ تھا۔ باغ میں فوارے چھوٹ رہے تھے، صحن اور کمروں کے اندر بڑے بڑے فانوس روشن تھے۔ کھانے کے کمرہ میں بڑی بڑی الماریوں میں بجائے کتابوں کے قسم قسم کے کھانے کے برتن اور چائے کے برتن عرف سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ دیواریں قدِ آدم آئینوں سے آراستہ تھیں۔ کہیں کہیں مکے مدینے کے شاندار نقشے بھی تھے۔ ایک حصہ میز کرسی سے آراستہ تھا، دو بڑی بڑی گھڑیاں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ وسط میں اعلیٰ درجہ کے قالین تھے، جن پر کہیں کہیں ہرن کے چمڑے کی جانمازیں بچھی تھیں کیوں کہ بزرگ کا مکان تھا اور ویسے بھی آج کل چٹائی کی جانماز پر نماز مکروہ ہو جاتی ہے۔ ایک طرف بڑے بڑے مراد آبادی اُگالدان اور آفتابے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ خدام کے ہاتھوں میں ولایتی صابن اور تولیے تھے اور کمال یہ کہ اس خاص لیفٹنٹ گورنرانہ کوٹھی کا نام تھا ''دار الفقراء'' کہیے ملاحظہ فرمایا فقیروں کا مکان اور فقیروں کا لباس؟ اخلاق کے متعلق وہی کہانی ماردوست فرماتے تھے کہ جو شخص موٹر سواری میں بیٹھے، بس اسی کے

مکان پر میاں تشریف لے جاتے ہیں اور موٹر والے لوگ ہی میاں کی توجہ کے قابل ہیں۔ موٹر والے افسروں کے گھر میاں کبھی کبھی خود ہی بغیر موٹر کے بھی چلے جاتے ہیں۔ غریبوں سے پیشانی پر شکن ڈال کر بات کرتے ہیں۔ اب ان شاہانہ حالات کو ملایئے ذرا رسولِ گرامی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُس محترم زندگی سے جس میں سادگی، فقر و رضا اور مشقت کے وہ برگزیدہ نمونے ملتے ہیں، جن کی تقلید ان مصلحین کا فرضِ اول تھا۔

دنیا پرستوں کا یہ ''بزرگ نما'' گروہ ہے جو انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر ان پر ٹوٹ پڑا ہے اور علمِ دین سے بے بہرہ رؤساء و امراء کو خوب لوٹ رہا ہے۔

اس آنکھوں سے دیکھے ہوئے نمونے کے بعد اور بھی خواہ مخواہ کے بزرگ سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ ہے جس کے افراد نے اپنی کمائی حلقۂ دیہات اور قصبات کی بے خبر اور معصوم آبادی کو قرار دے رکھا ہے۔ اس گروہ کے افراد کا لباس اکثر رنگین ہوتا ہے۔ نیچا رنگین کرتا، لمبے لمبے بال، تہمد اور گلے میں تسبیح کے ہار۔ ان بزرگوں کے ہمراہ ان کے چیلے بھی ہوتے ہیں۔ یہ کسی قصبے یا گاؤں میں پہنچ کر برگد کے سایہ دار درخت کے نیچے قیام فرماتے ہیں۔ گاؤں والے صورت دیکھتے ہی چارپائی، حقہ، پانی کا مٹکا اور آٹا دال وغیرہ فراہم کر کے ان کے ارشادات سننے جمع ہو جاتے ہیں اور چارپائی پر لیٹے لیٹے اُلٹے سیدھے قصے سنایا کرتے ہیں اور چیلے ان قصوں پر کبھی گردن ہلاتے ہیں، کبھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور کبھی روتے روتے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ جس دن گاؤں میں ''بڑا بازار'' ہوتا ہے اُس دن یہ بزرگ صاحب وعظ یا میلاد شریف کی ٹھہراتے ہیں۔ ان میں سے بعض طوطیِ ہند بھی ہوتے ہیں۔ ان کی علمی قابلیت مولانا روم کی مثنوی کے چند حصوں میں بند ہوتی ہے یا اس قسم کے قصے سنایا کرتے ہیں کہ ایک بزرگ نے ایک مرتبہ ایک بھینس پر کچھ پڑھ کر دم جو کیا تو وہ فوراً ہاتھی ہوگئی۔ اس گروہ کا گاؤں والوں کی طرف سے سالانہ لگان یا محصول یا باج بھی مقرر ہوتا ہے۔

مصلحین کا ایک اور گروہ ہے جس نے ہمیں اور آپ کو چھوڑ کر صرف رنڈیوں ہی کی اصلاح و تہذیبِ نفس کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ اِس طبقے کے افراد رنڈیوں کے یہاں مہمان بھی رہتے ہیں۔ ان کا لباس نفاست کا نمونہ ہوتا ہے۔ لمبے لمبے بالوں میں اصغر علی محمد علی کے کارخانہ کا چنبیلی

قسم اول کا تیل، کوئی رنگین کرتا عطر میں بسا ہوا، آنکھوں پر نہایت فینسی چشمہ، کلائی پر کوئی قیمتی گھڑی اور مثنوی شریف پڑھنے کے لیے گلا صاف۔ علم و فضل کی جگہ اللہ کا نام، مذہبی دلائل کی جگہ امیر و داغ کے عاشقانہ اشعار۔ بعض کو ستار بجانے کی بھی مشق ہوتی ہے۔

ایک طبقہ وہ ہے جسے علوم دین سے دور کا بھی علاقہ نہیں، مگر گزارہ صرف گنڈے تعویذ کی آمدنی پر اور ہر تعویذ ایسا کہ بس ''مشکل کشا'' اور اولاد انگیز۔

◆

یہ ہیں وہ چند گروہ مصلحین ہند کے جو مسلمانوں پر سوار ہیں اور یہ سات آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند ایسے ہی مصلحین میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ مصلحین انھیں جس طرف چاہتے ہیں بے چوں و چرا لیے جا رہے ہیں۔ اب کوئی ان مصلحین کی خدادانی، علوم آگہی، معاشرت، اخلاق اور اعمال کو رسولِ گرامی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی سے ملائے اور پھر بتلائے کہ کیا ایسی ہی خالص دنیا پرست زندگی کے ساتھ رسولِ محترم علیہ السلام کی قائم مقامی اور اصلاح و ہدایت کا دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے؟

ضرورت ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ ایسے مصلحین کی اصلاح و نگرانی کی طرف مائل ہو جو گھن کی طرح مسلمانانِ ہند کی اجتماعی اور دینی زندگی کو تباہ کر رہا ہے۔ تعجب ہے کہ علم و فضل کی روشنی میں بھی مسلمانانِ ہند کو ایسے مصلحین نظر نہیں آتے اور خصوصیت سے یہ علی گڑھ کے بیرسٹر لوگ اور ڈپٹی کلکٹر لوگ ہی زیادہ ان کے قبضے میں ہیں۔

یہ ہے اصل میں نتیجہ علم دین سے بے خبری اور غفلت کا۔

(رسالہ صوفی پنڈی بہاءالدین اپریل و مئی 1928)

◆◆◆

پشاور تک مگر علی گڑھ تک

28 نومبر 1927 کو مفتی اعظم حضرت علامہ محمد کفایت اللہ جمعیۃ العلماء ہند کا گرامی نامہ ملا کہ ''جمعیۃ کے سالانہ اجلاس پشاور کی شرکت کے لیے آپ کا نام پشاور کی مجلسِ استقبالیہ کو بھیج دیا گیا ہے۔ تیار رہو''۔

ننھے میاں کی والدہ سے پشاور تک سفر کا تذکرہ جو کیا تو انھوں نے جو طویل جوابات عطا فرمائے ان کے ''جملہ حقوق بحق راقم الحروف محفوظ'' رہنا ہی زیادہ مناسب ہیں۔ بستر باندھ دیا، کپڑے رکھ دیے، کھانا پکانے بیٹھ گئیں۔ صرف ہم سے خندہ پیشانی سے بات کرنا ترک کر دیا۔ ننھے میاں پر بات بات میں جھنجھلانے لگیں۔ برتن کو زمین پر رکھنے کی جگہ پٹک دیتی تھیں۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹہ تک تازہ پان بھی نہ کھایا۔ ہر بات میں ''آگ لگ جائے'' کا استعمال زیادہ فرمانے لگیں۔ بس ان تیوروں سے ہم تاڑ گئے کہ یہ سب کچھ ہمارے سفر پر نہیں بلکہ ''سفر خرچ'' پر اظہار ناراضی ہو رہا ہے اور چونکہ اس سے قبل بھی انھیں روپے پیسے کے معاملوں میں آزمائے ہوئے ہیں اس لیے آہستہ سے کھانستے ہوئے اٹھے اور اپنے علم پرور معارف نواز کرم فرما حضرت رُشدی سے کرایہ کو کہہ دیا۔ علم نواز رُشدی صاحب پہلے تو ان کے ہمارے اس معاملہ پر بہت ہنسے اور پھر نوٹ دے دیے۔

کہتی ہی رہ گئیں ''کب تک واپس آ ؤ گے؟'' مگر ہم نے جو بستر اٹھایا تو پھر ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ صرف ننھے میاں کی طرف ایک روپیہ پھینک کر چل دیے۔

ریلوں میں اب یہ ہوتا ہے کہ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر بھی ہندستانی تھرڈ کلاس میں مارے مارے پھرتے ہیں اور کوئی ممبر کونسل سوال نہیں کرتا کہ آخر یہ ریلوں میں مسافروں کی تعداد کے برابر ڈبے پورے کیوں نہیں ریل میں جوڑتے ہو؟ ممکن ہے رائل کمیشن کے بائیکاٹ سے ریلوے کے انگریز کچھ ڈر جائیں۔ ادھر ہماری یہ ایسی بری عادت ہے کہ جب تک ہمارے ڈبے میں کوئی انگریز ''مع اہل و عیال'' کے نہ سفر کرے ہمارا جی نہیں لگتا اور ان مراد آبادی وضع کے رسّی سے بندھے ہوئے لوٹے لے کر سفر کرنے والوں کے ہمراہ تو سفر دوبھر ہو جاتا ہے، مگر وہاں جو سیٹی ہوئی تو منہ کے سامنے والے ہی ڈبے میں خود کو مع بستر ٹھونس دیا۔ بغیر قلی کے خود بستر لے کر ریل میں سوار ہونے کو ٹھونس دینا ہی کہنا زیادہ مناسب ہے۔

کوئی چار پانچ اسٹیشنوں تک وہی ننھے میاں کی والدہ کی غضب ناک باتیں یاد آتی رہیں اور برابر سوچتے رہے کہ اب کی بار پشاور سے آکر ان سے یہ کہہ دیں... دیکھو جی... غرض اس خانگی مذاکرۂ علمیہ و ادبیہ کی مصروفیت میں ڈبے کے ساتھیوں کا کوئی خیال نہ رہا۔ بارے ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو دیکھا کہ نوعمر بےفکرے پوری مستعدی سے اس ڈبے کے آس پاس چکر لگا رہے ہیں، جس کے اندر ہندو مسلمان ''ماں بہنیں'' سوار ہوتی ہیں اور جنھیں ہر مذہب نے ناموس بتلایا ہے۔ مگر کالجوں کی تعلیم کا زمانہ ہے اور پروفیسروں کی تربیت۔

خدا جانے یہ کنگ پرائمر پڑھے ہوئے ہندستانی اپنے قومی لباس چھوڑ کر کوٹ پتلون کس جذبے کے ماتحت استعمال فرما رہے ہیں اور کچھ نہیں تو لباس کی اس یگانگت سے ہمیں تکلیف یہ ہوتی ہے کہ ہم ہر پتلون پوش کو مسلمان سمجھ کر السلام علیکم کہہ کر گزرتے ہیں اور وہ آہستہ سے معاف کیجیے میں ہندو ہوں کہہ کر شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ بس اس اسٹیشن پر ایسے ہی ایک ہندو بھائی ہمارے ڈبے میں عین اس وقت گھس پڑے جب ہم صبح کے ناشتے کے لیے ڈھائی آنے پاؤ والی پوریاں لوگوں کی نظریں بچا کر لینے کے لیے پلیٹ فارم پر گھوم رہے تھے۔ انھوں نے ڈبہ ذرا خالی پا کر ایک سیٹ پر اپنا انگریزی وضع کا بستر بچھایا اور مع کوٹ پتلون اس پر لیٹ گئے اور ایک کتاب کھول

کر سینے پر تان لی۔ پھر ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں لیٹے لیٹے اس طرح ڈال لیا گویا سر آسٹن چیمبر لین وزیر خارجہ وکٹوریہ اسٹیشن لندن سے جمعیۃ الاقوام کی شرکت کے لیے اپنے خاصے کے اسپیشل میں جینوا جارہے ہیں۔ کبھی کبھی پتلون کی جیب سے ہاتھ نکال کر سر سہلا لیتے تھے گویا کسی بڑے ہی زبردست سیاسی معاہدے کو ملاحظہ سے حل فرمارہے ہیں۔ ادھر موصوف کی اس کتاب بینی سے ہم بقیہ چار مسافر خود بخود جاہل، بے ذوق، بدمذاق اور بے وقوف ثابت ہوئے جارہے تھے اور یہ بھی کچھ موزوں نہ تھا کہ ہم باقی مسافر بھی ان کی طرح کتابیں کھول کر لیٹ جائیں ورنہ اس حساب سے یہ ریل کا ڈبہ کا ہے کو رہتا۔ خاصی علی گڑھ کی لٹن لائبریری ہو جاتی۔ اس لیے نہ رہا گیا اور ہم ممدوح کے قریب جا کر بیٹھ گئے اور ان کے ساتھ ساتھ ان کی کتاب کو پڑھنا جو شروع کیا تو بھائی صاحب نے ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ہم نے عرض کیا کیا اس کتاب کو ہم بھی دیکھ سکتے ہیں؟ جواب ملا "پانچ صفحے اور رہ گئے ہیں، انھیں دیکھ لوں"۔ مگر ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جس طرح طلبا سے لحاظ اور بہادری اٹھ گئی ہے اسی طرح ہمارے ڈبے سے کتاب بینی ہی اٹھ جائے۔ اس لیے اب ترکیب یہ کہ کہ ان سے خواہ مخواہ سوالات شروع کر دیے اور کوئی سوال ایسا نہ کیا جس کے جواب سے وہ پندرہ منٹ سے پہلے فارغ ہو جاتے۔ یہاں تک کہ شیر کے شکار ایسے دور از عقل موضوع پر اظہار رائے پر مجبور کر دیا۔ تو اب بھی بھائی صاحب نے کتاب کو سر کے نیچے رکھ کر جوابات سے مشرف فرمانا شروع کیا۔ مگر ابھی کہ موصوف نے کتاب بند ہی کی تھی، ایک اسٹیشن آیا اور ایک اور ان کے ایک پتلون بھائی آن بان سے اس ڈبے میں سوار ہوئے۔ اب برادر ماقبل اور اس برادر مابعد میں صرف ایک اخبار "پانیر" کا فرق تھا۔ یعنی یہ درجۂ دوم اپنے ساتھ کہیں سے اخبار "پانیر" کا ایک پرچہ بھی اٹھا لائے تھے۔ ہم تو اسی شش و پنج میں رہے کہ انھیں بندگی یا سلام مگر ان کی خوش تہذیبی ملاحظہ ہو کہ ہم لوگوں کو سلام بندگی کیے بغیر آپ نے بیٹھتے ہی اخبار کا ملاحظہ شروع کر دیا اور جیب سے ایک قینچی چھاپ سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس نکال کر اپنے پاس رکھ لی، جس کا مطلب صاف یہ تھا کہ ہم باقی چار مسافروں نے نہ کبھی اخبار "پانیر" دیکھا اور نہ قینچی چھاپ سگریٹ۔ آگ سی لگ گئی۔ فوراً اٹھ کر ہم نے بھی اپنے بکس سے نیوی کٹ سگریٹ کا وہ ڈبہ نکالا جس کے اندر اماں نے ہمارے پانوں کے لیے چونا بھر دیا تھا اور اوپر سے ایسا معلوم ہوتا تھا

گویا اس کے اندر سگریٹ ہی سگریٹ بھرے ہوئے ہیں۔ بس یہ ڈبہ نکال کر ہم نے قینچی چھاپ والے پتلون بھائی کو دور سے دکھایا اور کہا ''سگریٹ ملاحظہ کیجیے''۔

تھے آخر کو گوالیاری اپنی ڈبیہ لے کر فوراً ہمارے سامنے لائے اور کہا ''یہ سگریٹ بھی آپ ہی کا ہے''۔ ہم نے ڈبیہ لے کر کہا ''آداب'' پھر جوان کے سگریٹ پینا شروع کیا تو تمت بالخیر تک معاملہ پہنچا دیا اور پتلونی بھائی صاحب کو ہم سے ڈبیہ واپس لینے کی جرأت نہ ہوئی اور مارے سوالات کے ان پہلے والے صاحب کو کتاب پڑھنے کی مہلت نصیب نہ ہوئی۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ پتلونی بھائی مسلمان تھے۔

◆

ساتھیوں میں ایک ایسے بزرگ بھی تھے جن کی رکاب کے ساتھ ان کے کوئی شش سالہ طولعمرہٗ بھی تھے۔ ہندستانیوں کا لاڈ پیار تو مشہور ہی ہے، اس لیے ہم نے ان کی شفقت دیکھتے ہوئے دہلی کے اسٹیشن پر ان کے طولعمرہٗ کی انگلی پکڑ کر کہا ''حضرت ہم آپ کے بچے کو مسافرانہ دنگل سے صاف اور سالم بچا کر لے جائیں گے تو کیا آپ ہمارا بستر اور صندوق قلی سے اترا کر باہر لے آئیں گے؟'' فرمایا:

"هَل جزاء الإحسان إلّا الإحسان"

اب ہم تو ان کے طولعمرہٗ کو ریل سے اتار کر اسٹیشن سے باہر لے آئے اور آپ بستر لے آئے۔ ہم نے کہا ہمارا صندوق تو گھبرا کر بولے إنا للہ وإنا! ہم سمجھ گئے کہ مارے شرم کے عربی میں کہہ رہے ہیں کہ صندوق بھول آیا۔ اس وقت انگریزی حساب سے شب کے کوئی تیرہ چودہ بجے ہوں گے۔ بس فوراً خیال آیا کہ ابھی ریلوے کا انتظام انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے لاؤ دوڑ کر تار دے دیں، صندوق مل جائے گا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر اسٹیشن ماسٹر سہارنپور کو تار دیا کہ:

''اس قسم کا۔ اس رنگ کا، اتنا بڑا''۔ اس نمبر کی ریل میں، اس نمبر کے ڈبے میں۔ آرہا ہے، بحفاظت اتار کر دہلی، اس نام پر اس ہوٹل پر، اس منیجر کی وساطت سے اور اس محلے میں پہنچے''۔

اتنی باتوں کا تار کے ذریعے کہنا تھا کہ تار بابو نے تار کے فارم پر دو چار جگہ پنسل کے زور

سے پٹک کر کہا ''چار روپے چودہ آنے کا ہوا''۔ ہم نے پانچ روپیہ کا سکہ نوٹ کہ نصف جس کا صرف کاغذ کا ہوتا ہے، نکال کر بابو صاحب کو جو دیا تو بابو صاحب نے رسید دے کر ہمیں سلام بھی کیا۔ ہم بابو صاحب کی تہذیب اور اس غیر متوقع خلق پر حیران رہ گئے، مگر فوراً ہی سمجھ گئے اور کہا کہ ''بابو صاحب اور وہ باقی کے دو آنے؟'' تو ہنس کر فرمایا ''وہ تو ہمارا حق ہیں''۔

اب جو اس معاملے سے فارغ ہوئے تو صندوق کی فکر میں نیند کسے آنی تھی؟ اس لیے دہلی کے ہوٹلوں کی مشہور روایات کے تجربے کے لیے ایک ہوٹل میں جا ٹھہرے۔

◆

رات کو صندوق کی گھبراہٹ میں تار گھر کے قریب مولانا محمد عرفان، مجاہد اعظم سرحد ناظم جمعیۃ العلماء خوش رنگ شیروانی پہنے ملے۔ چونکہ یارانہ بہت پرانا ہے اس لیے ہماری صورت دیکھتے ہی جھوم گئے اور فرمایا ''چلو چلو گاڑی جا رہی ہے، مجھے پانچ دن سرحد میں چلے جانے کی اجازت مل گئی ہے''۔ ہم نے بقدر پانچ دن مبارکباد کہہ کر فوراً کہا کہ ''اور جو ہمارا صندوق'' تو فرمایا ''تار دو تار اور دیکھو صبح کی گاڑی سے جلد پشاور پہنچ جاؤ'' یہاں صبح جو ہوئی تو سہارنپور سے صندوق مع الخیر والعافیت واپس آ چکا تھا۔

اس وقت خیال آیا کہ اگر آج کو ریلوے کا انتظام ہندستانیوں کے ہاتھ میں ہوتا تو اوّل تو رات کو دفاتر اور کچہریاں ویسے ہی بند ہوتیں، پھر دوسرے دن بعد دوپہر کہیں ہمارے صندوق کی رپٹ متعلقہ تھانے میں لکھی جاتی اور جو تھانے دار کسی مقدمہ کی تفتیش میں باہر گئے ہوتے تو ایک ہفتہ تک ان کی آمد کے انتظار میں ہمارے صندوق کی تحقیق ملتوی رہتی۔ پھر اثبات دعویٰ کے لیے صندوق کے عینی گواہ جہاں سے یہ صندوق خریدا تھا اس دکاندار کی تصدیق، جن لوگوں کے سامنے خریدا تھا ان کا حلیہ اور گواہی پھر ریل میں ہمارے قبضہ میں اس صندوق کو دیکھنے والوں کے نام لکھانا ہوتا، پھر تھانے کے منشی جی کی خدمت میں روزانہ حاضری اور سلام پھر بھی تھانیدار صاحب اتنی ڈانٹ ضرور پلاتے:

''کیوں آپ اپنے مال سے بے خبر رہے؟ اب اس کا ملنا محال ہے، کوشش کروں گا، آپ کو کن لوگوں پر شبہ ہے؟''

اب اگر ہم ساتھ سفر کرنے والوں کا نام شبہ میں بتا دیتے تو تھانیدار صاحب انھیں آگے کے اسٹیشن پر شبہ میں روک لیتے اور وہ تا برآمدگی صندوق اپنے اپنے وطن پہنچنے سے محروم دہلی کے تھانے ہی میں دھرے رہتے۔

اب جو صندوق مل جاتا تو اس کا اور ہمارا چالان عدالت میں ہوتا۔ یہاں پھر گواہان ثبوت کے بیانات قلمبند ہوتے۔ وکیل کیا جاتا۔ دو چار پیشیاں عدالت کی مصروفیت کی وجہ سے بڑھ جاتیں، جس میں گواہوں کی خوراک ہم سے وصول کی جاتی۔ پھر کہیں عدالت سے ہمیں صندوق ملتا تب بھی حاکمِ عدالت ہم سے اتنی بات زبانی کہہ دیتے کہ:

''دیکھو جی آئندہ ایسی غفلت نہ کرنا۔ خبردار''۔

مگر یہاں صرف رات کے تیرہ بجے سہارنپور کے اسٹیشن ماسٹر کو تار دیا اور صبح دس بجے پارسل بابو نے ایک رسید لے کر ہمیں یہ صندوق واپس کر دیا۔

اب ہم پشاور جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ یکا یک ایک موٹر منہ کے سامنے آ کر کھڑا ہوا اور اندر سے آواز آئی:

''اماں مُلّا صاحب۔ کہاں کہاں؟''

ہم نے بھی گھبرا کر کہا ''پشاور پشاور'' تو فرمایا:

''اجی کہاں کا پشاور ادھر آئیے اب کون جانے دیتا ہے؟ چلیے مشاعرہ میں۔ شاندار علی گڑھ ہو رہا ہے''۔

یہ ہمارے وہی کرم فرما تھے جو ادبیاتِ اردو اور علومِ اردو کے سرپرست اور ادبائے اردو کے محسن و کفیل ہیں۔ اس لیے زیادہ تکرار مناسب نہ سمجھی اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ پھر یہ خوشی بھی ہوئی کہ اجلاس جمعیۃ کے لیے پشاور تک کے مصارف سے خدا نے بچایا۔ ننھے میاں کی والدہ کے تحفے کی خریداری سے خدا نے بچایا۔ ہندستانیوں کی کبھی عمل میں نہ آنے والی تجویزیوں کی تائید سے خدا نے بچایا۔ جلسے والوں کی روٹیوں کے احسان سے خدا نے بچایا۔ کسی لیڈر کے ساتھ کیمپ میں قیام کر کے ان سے چندے کے مشوروں سے خدا نے بچایا۔ اس لیے ہم نے بھی کھدر کا لباس اتار کر عمدہ گرم انگریزی کوٹ پہن کر موٹر میں قدم رکھا۔ موٹر کے ہمراہیوں میں ایک صاحب ایسے

بھی تھے جو ہر سواری میں میل دو میل چل کر اونگھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، مگر وہ جو کہا ہے کہ:

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا

ساتھی صاحب تو کچھ دور تک اونگھ کر رہ گئے اور ہم نے ہندستان کے دیہاتی بھائیوں کی زندگی کا مطالعہ شروع کر دیا۔ چل پہ چل دہلی سے کوئی اڑھائی کوس ہی دور گئے ہوں گے کہ گودڑ کی گٹھریاں باندھے، پھٹے پرانے پیوند لگے ہوئے چیتھڑے لگائے اور کہیں کہیں ننگ دھڑنگ لوگ باگ نظر آئے۔ یہ گویا غریب مسافر لوگ تھے۔

پھر کیا دیکھتے ہیں کہ سڑک کے کنارے ہر پتھر کے میل کے پاس سینے سے لاٹھی لگائے سرخ پگڑی باندھے کھڑے سوکھیا رہے ہیں۔ ایک قصبے کا بازار جھنڈیوں سے آراستہ ہے۔ بے علم باشندے، میلے ملگجے کپڑوں میں قطار اندر قطار اپنے اپنے ننھے میاں کو گود میں لیے ٹہل رہے ہیں اور جھونپڑوں کے دروازوں پر وہ یعنی ''ننھے میاں کی والدائیں'' بھی کھڑی ہوئی ہیں۔ ایک پُل پر چند تاریک خیال دفتری لوگ باگ استری کیے ہوئے پاجامے پہنے اس طرح بیٹھے ہیں گویا کوئی بڑی بارات آ رہی ہے جس کے لیے یہ سب منتظر ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ تمام اہتمام اس لیے کہ چھ بجے شام تک اس راستہ سے ایک افسرِ اعلیٰ اپنے دورے سے واپس ہوں گے۔ ایک تھانے کے دروازے پر تھانیدار صاحب بڑے کروفر اور بڑے دبدبے سے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ مونچھوں کو اس قدر تاؤ دے رکھا تھا گویا سرنا کی لڑائی میں یونانیوں کو آپ ہی نے بھگایا تھا، مگر وحشت اور مردم ناشناسی کا یہ عالم تھا کہ ہمارا موٹر جو قریب سے نکلا تو گھبرا کر یہ سب کھڑے ہو گئے۔ اس وقت ہمارے دل میں شرم محسوس ہوئی کہ ہم پہلے ہندستان کے ان اصل باشندوں کو تو درست کر لیں جو آج تک نرے ادھورے ہوتے ہیں پھر سوراج کا تقاضا کریں۔ تھوڑی دور آگے چند گاڑیاں ملیں، جن کے اندر خیمے، میزیں، کرسیاں اور گملے تھے۔ ان گاڑیوں میں اگر مرادآبادی اُگالدان اور نظر آ جاتے تو ہم سمجھ لیتے کہ ضرور کسی والیٔ ریاست کا دورہ ہو رہا ہے۔

◆

رات کے کوئی آٹھ بجے ہم علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ سڑکوں پر بجلی کی روشنی تھی، مگر جس سڑک پر سے ہم گزر رہے تھے اس میں بجلی کا تیل کم ڈالا گیا تھا، اس لیے روشنی اس قدر میلی اور کم تھی

جیسے اپنے بڑے مولوی صاحب کے حجرے کی لالٹین۔ سڑکوں پر خاک اس قدر کہ اگر آگے کوئی گاڑی نکل جائے تو دوسری گاڑی کو صاف راستہ نظر نہ آئے۔ یہ یوپی کی مٹی کا قصور تھا، کمیٹی بے قصور ہے۔

مشاعرہ اُس مکان میں ہو رہا تھا جس کا نام بہت ٹیڑھی انگریزی میں ہے، اس لیے ہمیں یاد نہیں رہا۔ دو راتوں تک مشاعرہ ہوتا رہا۔ جو لوگ ہندستانیوں میں مشہور ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں ان میں سے سب سے پہلے ہم خاکسار مُلّا رموزی صاحب، پھر ابوالاثر حفیظ جالندھری ایڈیٹر مخزن لاہور، پھر مولوی بدرالحسن جلالی بدر بی۔ اے، ایڈیٹر اخبار 'مدینہ' اور پھر تو جناب سیماب اکبرآبادی، جناب صفدر مرزا پوری، جناب جگر مرادآبادی، جناب حامد سعید خاں حامد بھوپالی، جناب ساحر دہلوی، جناب اطہر ہاپوڑی۔ جامعہ علی گڑھ کی سمت سے حضرت مولانا علی احسن صاحب احسن مارہروی، حضرت رشید احمد صدیقی ایم۔ اے ایڈیٹر 'سہیل'، حضرت پروفیسر حاذق ایم۔ اے، حضرت جلیل احمد قدوائی بی۔ اے، حضرت خواجہ مسعود علی ذوقی بی۔ اے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور ہاں وہ ساغر اکبرآبادی بھی تو تھے۔ مشاعرے کے حالات چونکہ:

''حسب فرمائش مولانا احسن مارہروی باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شیروانی مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے شائع ہوں گے''۔

شمالی ہند کے ادیب لبیب اور شیوہ بیان شاعر حضرت حفیظ جالندھری اور جریدہ فریدہ مدینہ بجنور کے چیف ایڈیٹر مولوی بدرالحسن جلالی بی۔ اے کو ہم نے مشاعرہ کے اسٹیج پر پہلی مرتبہ جو دیکھا تو بے چین ہو گئے۔ کیوں کہ ممدوحین گرامی سے رقمطرازی کے سلسلہ سے بڑی پرانی دوستی ہے، لیکن صورتاً وہ ہمیں نہیں جانتے تھے، اس لیے اسٹیج پر جا کر ان دونوں سے آہستہ سے کہا ''یہ ہیں ہم مُلّا رموزی!''۔

بس یہ کہنا تھا کہ برادرم حفیظ جالندھری تو مارے مسرت اور برادرانہ شفقت کے بے خود سے ہو گئے اور کچھ ایسا ہی حال برادرم بدر جلالی ایڈیٹر مدینہ کا ہوا۔ مختصر یہ کہ اب جوان ہم پیشہ بھائیوں سے معانقہ ہو چکا اور ادھر مشاعرے میں حضرت حفیظ جالندھری نے اپنے سحر آفریں اشعار اور جادو اثر طرز سے جو عظیم القدر کامیابی حاصل کی تو ممدوح کو ہر چہار سمت سے چائے اور

روٹی کی دعوتیں آنے لگیں۔ ہم نے موقع غنیمت جان کر برادرم حفیظ کا دامن تھام لیا اور جہاں حفیظ صاحب چائے پر مدعو کیے جاتے ہم بھی ان کے ساتھ اس طرح چلے جاتے گویا ہمیں سو ہزار خوشامدوں سے کسی نے اذن دیا ہے۔ خیر ہم پیشہ یا ہم ذوق ہونے کے لحاظ سے برادرم حفیظ کے ساتھ ہمارا بے اذن چلا جانا تو چنداں قابلِ اعتراض نہ تھا لیکن شاعری کے ایک بڑے ہی ''رنگیلے چیتھڑے'' تھے جو نظموں کا ایک پلندہ بغل میں دبائے ہر اُس مجلس میں پہنچ جاتے تھے جہاں حفیظ پسندوں کا مجمع ہوتا تھا۔ حاضرین دل ہی دل میں ہنستے تھے۔ خیر یہ بھی کوئی ایسی معیوب بات نہ تھی لیکن وہ کمال یہ کرتے کہ جب حفیظ صاحب کوئی مؤثر نظم سنا چکتے، سامعین پر ایک کیفیت کا عالم ہوتا تو یہ صاحب منمناتی آواز سے کہتے:

''میں بھی ایک اور نظم عرض کرنا چاہتا ہوں''۔

ملاقاتیں:

بے ذوق، بد مذاق، ناقص تعلیم وتربیت والوں اور طرزِ تحریر کے صحیح مطلب ومفہوم کو نہ سمجھنے والوں سے ہم عید ہی کے دن مل لیتے ہیں۔ پھر سال بھر بات نہیں کرتے لیکن جو لوگ کہ فطرت سے سلجھا ہوا ذوق اور خوش فہمی لے کر آئے ہیں جو نرے پانیرٔ خواں ہی نہیں بلکہ فارسی، عربی علوم کے ساتھ ادبیاتِ اردو کے بھی نکتہ شناس ورمز آگاہ ہیں ان سے ملاقات کے لیے جانا، معانقہ کرنا، رسم بڑھانا، ان کے ہاں چائے پی لینا ہمارے ہی کیا ہر بلاغت ربود اہلِ قلم کے لیے قابلِ فخر ہے۔ پس ایسے مشاہیر میں علی گڑھ کے اندر سب سے پہلے ہم نے ادبیاتِ اردو کے دیرینہ محسن حضرت مکرم مولانا سید سجاد حیدر یلدرم بی۔ اے رجسٹرار علی گڑھ یونیورسٹی کے ہاں چائے کی ٹھہرائی۔ چار بجے کا وقت مقرر ہوا۔ مولوی صاحب کی تیاریوں کا تو علم نہیں البتہ ہم عینک اور گاندھی کیپ سے مزین ہو کر ذریعہ موٹر کار جب ممدوح کی کوٹھی پر پہنچے تو ایک ترکی وضع کے مدبر کو محو مطالعہ پایا۔ ہمارے موٹر کی ہنگامہ گستری سے ممدوح آگے بڑھے اور بڑے تپاک سے معانقہ فرمایا۔ اب جو گفتگو ہوئی تو خدا گواہ ہے کہ سید صاحب کے ہر فقرے سے خلوص، اخوت اور انکسار وتواضع کے وہ اثرات نمایاں تھے جو اب صرف مشرقی مذاق کے بزرگوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ خلوص وشفقت کا یہ حال تھا گویا قبلہ محترم ہمارے مضامین کے ملاحظہ کے بعد ہمیں اپنے سامنے پا کر غایت درجہ

مسرور وشاداں ہیں۔ وحدتِ مذاق اور ہم خیالی کے باعث ممدوح نے اکثر بار اٹھ کر ہمیں موجودہ سیاسی تحریکات کے متعلق متعدد کتابیں دکھلائیں۔ پھر دیر تک کمالی سیاسیات پر گفتگو ہوتی رہی اور لطف اس سے زیادہ آتا تھا کہ ہر مسئلہ پر ہمارے اور ممدوح کے خیالات متحد ہو جاتے تھے۔ ممدوح کی انتہائی محبت کا اظہار اس امر سے ہوتا تھا کہ آپ نے اپنی دو نایاب کتابیں ''حکایات و احساسات'' اور ''جلال الدین خوارزم'' ہمیں تبرکاً عنایت فرماتے وقت ارشاد فرمایا کہ:

''میری اور کتابیں بھی ہیں مگر میں آج ہی اس لیے نہیں دیتا کہ آپ ان کے سلسلہ سے میرے پاس پھر آئیں''۔

خدا اردو کے اس محسن اور بزرگ کو تا دیر سلامت رکھے۔ آئندہ ملاقات پر ارادا ہے کہ جس کرسی پر ہم بیٹھے تھے اس پر سید صاحب کو بٹھا دیں گے اور سید صاحب کی کرسی پر ہم خود بیٹھ جائیں گے کیوں کہ مہمان کو آرام کرسی پر بیٹھنے کا ہر طرح حق حاصل ہے۔

ہم اجنبی ہونے کی وجہ سے علی گڑھ میں پھرتے کیا تھے، خاصے مارے پھرتے تھے۔ اس لیے ایک دن قبلہ مکرم حضرت مولانا ابرار حسین فاروقی بی۔ اے مولوی فاضل پروفیسر دینیات کے کرسی خانے کی طرف جانکلے۔ یہ دولت خانہ کی جگہ کرسی خانہ مولوی صاحب کی بکثرت کرسیوں کی نسبت سے عرض کیا ہے۔ خدا زندہ رکھے اس تواضع کے مجسمے کو۔ دوڑ کر جھوم گئے اور فرطِ محبت سے فوراً ارشاد فرمایا کہ ''شام کو کھانا یہیں کھایئے''۔ شام کو حاضر ہوئے تو برادرم حفیظ جالندھری بھی ڈٹے ہوئے تھے۔ انھیں بہترین کھانے کھلائے، چائے پلائی اور شب کے کوئی بارہ بجے تک وہی۔

''ہاں حفیظ صاحب کوئی نظم'' کا سلسلہ جاری رہا اور حق تو یہ ہے کہ حفیظ بھائی نظم کیا پڑھتے تھے وجد و کیف کے ساگر لنڈھاتے تھے۔

ہم نے احباب کی فرمائش سے مشاعرہ پر بیٹھے بیٹھے ایک تبصرہ گھسیٹ دیا تھا جو صرف احباب کی محفل میں پڑھ کر خوش ہو لینے کے لیے تھا مگر ایک صاحبزادے نے دہلی سے حضرت مولانا پروفیسر علی احسن صاحب احسن مارہروی کو لکھ دیا کہ ''وہ ملا رموزی نے مشاعرہ پر ایک مضمون لکھا ہے اور اس میں آپ کی توہین کر ڈالی ہے''۔

اس خبر سے مولوی صاحب قبلہ کے ایک تلمیذ الرحمٰن عرف شاگرد غصہ کے مارے بھنّا گیے اور ہر چہار طرف منہ کر کے لگے کہنے کہ:

''بس تو اب ہم بھی''

اور

''بس تو اب ملّا رموزی کو بھی''

اور

''بس تو ہماری پوری جماعت بھی''

اور

''بس تو اخبارات میں بھی''

اور

''بس تو اب بتا دیں گے''

اور

''بس تو انھیں سمجھا دینا''

اور

''بس تو وہ ہوتے ہی کون ہیں؟'' وغیرہ۔

شدہ شدہ موصوف کی یہ ''بس تو'' ہم تک جو پہنچی تو ہمیں قبلہ احسن صاحب مارہروی کے تحمل پختہ کاری، اصابت ذوق اور ادب دانی پر جو اعتماد تھا اس کے سہارے مسکراتے ہوئے قبلہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ممدوح اپنے وقار کے لحاظ سے بے حد لطف و کرم سے پیش آئے اور فوراً ہی فرمایا میں تو حاذق صاحب اور رشید صاحب کو لے کر آپ کی قیام گاہ پر خود آنے والا تھا۔ مگر ہم نے فوراً اس غلط فہمی کا تذکرہ کیا تو مولانا موصوف نے غصہ سے فرمایا:

''اماں تم بھی لونڈوں کی باتوں میں آ گئے۔ بھلا میں اور تمھارے کسی مضمون سے ناراض ہوتا، کیسی باتیں کرتے ہو؟''

قبلہ محترم کی اس غایت درجہ شفقت کے بعد ہم نے وہ اصل مضمون بھی مولانا کو سنایا تو

مولانائے گرامی نے اپنی مسلمہ ادب شناسی کے اثر سے فوراً مضمون ہم سے لے کر فرمایا ''اب میں اسے اپنی روداد مشاعرہ میں شائع کروں گا''۔

اس قصہ کے بعد شام کو ہم بغرض کسب فیض مولانا کے دولت خانہ پر حاضر ہوئے۔ تو بزرگانہ شفقت، خاطر داری اور بزرگانہ الطاف سے مولانا نے جس درجہ متاثر فرمایا اس کے لیے دل و دماغ ثنا گستر ہیں۔ قبلہ محترم نے از راہِ غایت نوازش اپنا بیش قیمت اردو نسخہ دکھایا جس میں ابتدائے اردو سے اس وقت تک جتنے اسالیب تحریر ہیں انھیں ممدوح نے انتہائی کاوش اور تاریخی صحت کے ساتھ مرتب فرما کر زبانِ اردو کا ایک عدیم المثال خزانہ جمع کر دیا ہے اور جو عنقریب تاجدار دکن کی سر پرستی میں شائع ہوگا۔

مولانا احسن مارہروی کے علمی و ادبی لطائف کا وہ روح پرور سلسلہ جاری رہا جس کے اثر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ یہاں ممدوح گرامی کے برادر زادے حضرت مولانا سید جان صاحب ایم۔اے، ایل ایل بی نے ہماری قلمی تحریر کا ایک نمونہ تبرکا لیا، اس وقت ہمیں یہ غرور ہوا کہ:

> ''لہٰذا ہم بھی مشاہیر اردو میں شمار ہونے لگے جو لوگ ہماری اصل تحریریں لے رہے ہیں۔ دیکھ لینا ہمارا جلوس نکلنے کے بعد یہ ہمارے خطوط کے عکس کو رسالوں میں چھاپا کریں گے۔ معلوم نہیں اس وقت تک تصویریں چھاپ کر بیچنے والے رسائل بھی ہوں گے یا نہیں؟''

یہاں بھی تبادلۂ کتب عمل میں آیا اور ممدوح نے ہمیں اپنی کتابیں 'چپ کی فریاد' اور احسن عطا فرمائیں۔

یونیورسٹی میں ایک جماعت ہے جو ادبیاتِ اردو کی خدمت و ترقی کے لیے اپنی بہترین قابلیت سے کوشاں ہے۔ اسی جماعت کے نمایاں اور کامیاب ارکان میں حضرت برادر مکرم جلیل احمد قدوائی بی۔اے مصنف ''سیر گل'' وغیرہ، حضرت برادرم خواجہ مسعود علی ذوقی بی۔اے، حضرت برادرم خواجہ انصار احمد صاحب بی۔اے، حضرت برادرم مولانا محمود الحسن صاحب بی۔اے تھے جنھوں نے محض ہمارے مضامین کے تعارف پر ہمیں یونیورسٹی میں چائے پر مدعو فرمایا۔ گئے تو علاوہ

ان کے یونیورسٹی کے بکثرت اہلِ ذوق طلبا موجود تھے اور افسوس کہ ہم ان حضرات کے ناموں سے واقف نہیں۔ بہر حال ان حضرات نے قیمتی نوالہ اور انگریزی مٹھائیوں کے ساتھ چائے پلائی اور کوئی دو گھنٹہ لطفِ کلام کا سلسلہ جاری رہا۔ دل تو نہیں چاہتا مگر کہہ دیتے ہیں کہ یہاں بھی بھائی حفیظ جالندھری مدعو تھے۔ دوسرے دن ان عزیز از جان بھائیوں نے ہمارا گروپ لیا۔ حضرت جلیل احمد قدوائی سے علم ہوا کہ وہ ہمارے مخدوم زادے بھی ہیں۔ غرض خواجہ مسعود ذوقی، خواجہ انصار، خواجہ محمود الحسن اور خواجہ جلیل احمد قدوائی کے خلوص، محبت اور نوازش کا جو نقش ہمارے دل پر ہے وہ ننھے میاں کی والدہ سے لڑائی کے وقت سوا کبھی نہیں بھولا جائے گا۔ خدا ان سب بھائیوں کو بامراد ہمارے ساتھ زندہ وسلامت رکھے۔ یہاں بھی پٹنہ لائبریری کے لیے ایک بھائی نے ہماری قلمی تحریر حاصل کی، جن کا نام افسوس کہ یاد نہیں رہا۔

وہ جو دوسرے روز انھیں احباب کی طرف سے ہمارا اور حفیظ صاحب کا گروپ بھی لیا گیا تھا اس میں بھی اکبرآباد کے ان دونوں میں سے ایک ہمارے شریک ہیں کہ کہا ہے:

"شاعری در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست"

آخر میں دعا ہے کہ علی گڑھ کے احباب کو خدا سلامت رکھے اور ہمیں بھی۔ آمین! خدا اس جلیل القدر میزبان کو بھی خوش اور زندہ رکھے جس کے معارف نواز الطاف سے ہم نے پشاور کی بجائے علی گڑھ دیکھا۔

◆

گھر واپس آئے تو فرمانے لگیں "لو دفتر میں تمھارے اوپر جرمانہ ہوگیا اور جاؤ سفر میں"۔

فقط۔

(از رسالہ مخزن لاہور، مارچ 1928)

◆◆◆

''سالگرہ عید نمبر'' پر کچھ

انقلاب کے سال گرہ عید نمبر کا بہت انتظار کرنا پڑا۔ عین عید کے روز عیدگاہ جاتے ہوئے ڈاکخانہ گئے۔ مگر عید نمبر نہ آیا اور ہم منہ بسورے عیدگاہ چلے گئے۔ عیدگاہ میں لوگ اپنے کپڑوں، ننھے میاں کے کپڑوں، صفوں کی برہمی اور قاضی صاحب کے اشد من الموت انتظار میں ہنگامے کر رہے تھے اور ہم تھے کہ گھٹنوں میں گردن ڈالے عید نمبر کے نہ آنے کے اسباب پر بحث کر رہے تھے۔ بارہا سر پر سے گزرنے والے عید کے نمازیوں کے دیسی اور انگریزی جوتوں کی رگڑ سے ہماری ترکی ٹوپی ہمارے سر ہی پر کسی قدر ترچھی ہو ہو گئی، مگر ہم فوراً ہی چونکتے اور پھر عید نمبر کے نہ آنے والے معاملہ میں غرق ہو جاتے۔ اسی طرح عید کی نماز کے بعد جب کوئی پڑھا لکھا سا آدمی ہم سے معانقہ کرتا تو آہستہ سے اس کے کان میں کہتے:

''کیا انقلاب کا عید نمبر آپ کے پاس بھی نہیں آیا؟''

غرض جب گھر پہنچے تو ننھے میاں کی والدہ کو دیکھتے ہی کہا۔ ''کیوں جی وہ انقلاب کا عید نمبر تو ڈاکیہ نہیں دے گیا؟'' اس کا جواب انھوں نے چونکہ نہایت ہی عمدہ اور بہت ہی خوب دیا اس لیے نقل نہیں کرتے کیوں کہ وہ تو کہا ہے نہ کہ عقل والوں کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا اب جو ہر طرح سے مایوسی ہو گئی تو اخبار انقلاب میں عید نمبر کے مضامین اور شان وشوکت کے لیے اس سے

قبل جو اشتہار میں شائع ہوتا رہتا تھا اسے ذہن میں تازہ کر کے ایک دیوار کے سہارے بیٹھ کر عید نمبر پر یوں اظہار خیال کرنے لگے کہ کہنی تو رکھی گھٹنے پر اور سر کے بائیں حصہ کو ہتھیلی پر جما کر دل میں کہا۔

جی ہاں! وہ تو آج تمام لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیے پھر رہے ہوں گے۔ بے شک وہ عید نمبر تھا، اس لیے کس قدر عمدہ چھپا ہوگا اور اس وقت اسے ہزاروں آدمی پڑھ رہے ہوں گے یا سنا رہے ہوں گا یا سن رہے ہوں گے یا پڑھ بھی چکے ہوں گے یا سن بھی چکے ہوں گے اور اس کی خوبیوں کے چرچے ہو رہے ہوں گے یا ہونے والے ہوں گے یا ہو بھی چکے ہوں گے۔ واقعی حضرت مہر اور حضرت سالک کو اخبار کا تجربہ بہت ہی خوب ہے۔ اس لیے انھوں نے اسے بڑی ہی آب و تاب سے شائع کیا ہوگا اور اب ہزاروں دعائیں لے رہے ہوں گا یا لے بھی چکے ہوں گے۔ اس کی روشنائی نہایت چمکدار ہوگی اور اس کا کاغذ نہایت چکنا اور دبیز۔ اس کا سرِ ورق نہایت نفیس اور رنگین ہوگا اور اس پر ہلال نہیں تو ایڈیٹروں کے نام کے طغرے بنے ہوں گے یا بن بھی چکے ہوں گے۔ اس کے مضامین نہایت بلند پایہ ہوں گے خاص کر ہمارے مضمون کا تو جواب ہی نہ ہوگا اور اکثر لوگ یہ کہہ رہے ہوں گے کہ:

''بس بھئی ملا رموزی صاحب کا مضمون پڑھ کر دام وصول ہو گئے''۔

اس کی تصویروں میں خصوصیت سے مشرق کے فاتح اعظم اور سیاست و حکمرانی کے استادِ اول حضرت مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی تصویر ایسی ہوگی جس سے یہ ثابت ہو رہا ہوگا یا ہو بھی چکا ہوگا کہ ایشیا اور اسلام کا یہی وہ بلند ہمت اور صاحبِ فہم و فراست انسان ہے جس نے ایک سپاہی کی حیثیت سے سارے یورپ کو ذلت اندوز شکست دی اور خود یورپ کو یہ داغ لگا ہے یا لگ بھی چکا ہے کہ اگر اس جنگ میں ترکوں کے ''بادشاہ سلامت یورپ سے جیت جائے تو اتنی پرواہ نہ تھی، جتنا رنج اس امر سے ہوا کہ مصطفیٰ کمال نے ایک سپاہی کی حیثیت سے سارے یورپ کو اوندھا کر دیا''۔

پھر عید نمبر میں اشتہارات بھی کافی ہوں گے جن میں عامل کریم الدین صاحب کا یہ اشتہار ضرور ہوگا کہ:

''ساری دنیا کے عامل ایک جیسے نہیں ہوتے''۔

اس کے افکار و حوادث میں کسی مصنوعی پیر یا کسی مریدنی یا مریدن کا حال لکھا ہوگا (یہاں مریدنی بروزن شیرنی اور مریدن بروزن دھوبن لایا گیا ہے)۔

عید نمبر کی ہندستانی خبروں میں سید برادران کا مقدمہ اور اپیل مسترد ہوگیا یا ہوگئی لکھا ہوگا۔ اس کی برقیات میں شاہ افغانستان کے شاندار استقبال کی تفصیلات ہوں گی، جن پر ہندستان کے بیوقوف اہلِ قلم یہ رائے دیں گے کہ بس جناب اب شاہ افغانستان عمر بھر ہندستان پر حملہ نہ کریں گے۔ کیوں وہ تھے پہلے معمولی سے آدمی، مگر لندن میں جو استقبال ہوا اس سے وہ بادشاہت کرنا اور اپنی حکومت کو محفوظ رکھنا یا جہاں گیری اور جہاں کشائی کے تمام اصول بھول گئے وغیرہ۔

عید نمبر پر اس دل ہی دل میں رائے زنی سے دوپہر کا وقت تو کٹ گیا۔ اب شام کی ڈاک سے بھی عید نمبر نہ آیا تو پھر یوں سوچنا شروع کیا کہ اجی یہ مہر و ہر اور سالک والک بڑے ہی مطلبی لوگ ہیں۔ بس انھوں نے تو ہم کو خط لکھ کر مضمون وصول کرلیا اب ان کی بلا سے ہمیں اخبار ملے یا نہ ملے۔ خیر کیا آئندہ وہ کبھی مضمون طلب نہ کریں گے ۔ انشاء اللہ تعالیٰ ایسا روکھا اور خشک جواب دیا ہو کہ یاد ہی کریں۔ اتنے میں ہمارے اور سالک صاحب کے دوست حضرت بشیر احمد صاحب رفیق امرتسری المعروف بہ بیمہ کمپنی نے آواز دی۔ باہر آئے تو رفیق صاحب نے فرمایا:

> ''مُلا صاحب!
>
> الحمدللہ کہ میں اب سری نگر کشمیر میں بدل گیا۔ لیجیے کہا سنا معاف کیجیے۔ میں اس وقت کی گاڑی پر جارہا ہوں اور ہاں سالک صاحب کو کوئی پیغام دینا ہو تو مجھ سے کہہ دیجیے''۔

فوراً ہی تو کہا کہ بس کہہ دینا کہ اگر آج کے بعد بات بھی کی ہے تو حق میں اچھا نہ ہوگا۔ لاحول ولا اماں وہ تو بڑے ہی بے پروا آدمی ہیں۔ بھائی بشیر! آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ بھی سالک صاحب کی کوئی خوبی ہے کہ انھوں نے میرے نام عید نمبر بند کردیا؟ یہاں عید نمبر میرے نام بند کردیا۔ پر بھائی بشیر ہنس پڑے اور فرمایا کہ نہیں نہیں ملا صاحب! عید نمبر آپ کے نام ضرور آئے

گا، میرے پاس تو آچکا اور اس میں خدا کی قسم آپ کے مضمون کو پڑھ کر میں دیر تک وجد کرتا رہا اور کر بھی چکا۔ چونکہ بھائی بشیر نے ہمارے مضمون کی تعریف کا سلسلہ شروع کر دیا اس لیے سالک صاحب کی طرف کا غصہ ذرا کم ہو گیا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور ڈاکیہ ڈاک لایا تو قریب تھا کہ عیدنمبر پھر نہ دے، مگر اس نے دوسرے اخبارات دے کر کہا کہ مولوی صاحب! ٹھہر نا آج اشتہاروں کا ایک بنڈل بھی آیا ہے۔ دیکھا تو ''انقلاب'' کا ''عیدنمبر'' تھا۔ اس کے لیے ڈاکیے صاحب سے کہا کہ آئندہ اخبارات کو اشتہار کہو گے تو اپنے حلقے سے بدلوا دیں گے۔ دروازہ کے باہر ہی کھڑے ہو گئے اور عیدنمبر کو دیکھنا جو شروع کیا تو اب ختم ہی نہیں کرتے۔ کبھی دیوار سے سہارا لیتے کبھی سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں، کبھی اسی جگہ بیٹھ کر پورا پڑھ لینے کے لیے ارادہ کرتے ہیں، مگر شارع عام ہونے کی وجہ سے پھر گھر کا رُخ کرتے ہیں۔ غرض دروازہ سے اندر جو داخل ہوئے تو عیدنمبر پڑھتے پڑھتے اور چونکہ عیدنمبر پڑھتے پڑھتے مکان میں داخل ہو رہے تھے آنکھیں تھیں عیدنمبر...کی سطروں پر' اس لیے دروازہ سے اس زور سے ٹکرائے کہ ننھے میاں کی والدہ مارے ڈر کے کمرے کے اندر بھاگ گئیں، مگر اب جو ہم نیم غضبناک صورت لیے اندر داخل ہوئے تو کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ کہا ارے تم تھے؟

غرض ان خانگیات سے جو فارغ ہوئے تو عیدنمبر پر رائے لکھنا شروع کیا۔ یہاں لفظ ''خانگیات'' میاں ساغر اکبرآبادی کی کتاب ''شبابیات'' کے وزن پر لایا گیا ہے۔ پس اگر وہاں لفظ شبابیات صحیح ہے تو یہاں بھی لفظ خانگیات صحیح ہے۔ الغرض عیدنمبر میں ہمیں جو چیز سب سے پہلے پسند آئی اور جس سے ہم بہت خوش ہوئے وہ یہ کہ ایڈیٹر صاحب نے اس کا پہلا ورق الٹتے ہی مضمون نگاروں کے نام لکھ کر ان کا شکریہ ادا کر دیا ہے جس میں ہمارا شکریہ بھی خاص طور پر درج ہے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ مضمون نگاروں کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور اسی لیے اب ہم نے تمام ایڈیٹروں کو لکھ دیا ہے کہ ہمارے ہر مضمون پر ہماری تعریف کا ایک نوٹ ضرور لکھا کرو ورنہ کیا ہم مضمون کی داد قیامت کے دن پائیں گے؟ اس پر بعض نے یہ چلتا ہوا آوازہ بھی کسا:

''پھر یہ تو ہوئی خودستائی، خودپسندی، شہرت پسندی اور شہرت طلبی''۔

مگر ہم نے یہ لکھ دیا کہ ہونے دو جو بھی ہو، مگر تم تو تعریف لکھو۔ تو یہ سب کے سب منہ سا لے کر رہ گئے۔

عید نمبر کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کے مضامین کی متانت اور سنجیدگی بہت بلند ہے۔ فائدے اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں مارشل مصطفیٰ کمال پاشا، غازی ریف، مارشل رضا شاہ پہلوی، امان اللہ خاں غازی اور ان کی تحریکات کے حالات تو اس درجہ موزوں اور مناسب ہیں کہ زبان تعریف ان کی تعریف سے قاصر ہے کیوں کہ ایسے ہی مضامین ہو سکتے ہیں جن کے پڑھنے سے مردہ اور غلام قومیں نئی زندگی حاصل کر سکتی ہیں۔ پھر ان سب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت والا مضمون تو اس درجہ قابلِ تقلید و احترام ہے کہ باید و شاید۔ یہ مصطفیٰ کمال اور مارشل رضا شاہ پہلوی کے مضامین پر آج ایک صاحب نے فرمایا کہ:

''اور گاندھی جی کی سوانح عمری کیوں نہ لکھی؟''

ہم نے انھیں ایسا جواب دیا کہ بغیر سلام کیے گھر کے اندر چلے گئے۔ ان تصاویر کی تہذیب و متانت بھی قابلِ قدر خوبی ہے ورنہ ڈر تھا کہ کہیں بمبئی کے اخباروں کی تقلید میں اس کے سرِ ورق پر کوئی اشتہار تصویر بال صفا پاؤڈر کی شیشی نہ دے دی جائے یا کسی تھیٹر کے ایکٹر صاحب یا ایکٹرنی صاحبہ کو نہ چھاپ دیا جائے۔ تصاویر میں یہ خوبی خاص ہے کہ تمام تصاویر مردانہ ہیں ''عورتانہ'' نہیں۔ واضح ہو کہ لفظ مرد سے اگر مردانہ بن سکتا ہے تو آج سے لفظ عورت سے ''عورتانہ'' بھی بنا کرے گا۔ پس اس قسم کی تصویروں سے شجاعت، شہامت، دلیری، حوصلہ، جفاکشی اور بہادری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ منی جان آگرے والی کی تصویر کے نیچے لکھ دیا ''شہیدِ وفا'' اور کہہ دیا یہ ہے ''ادبِ لطیف'' لاحول ولا۔

اس کے ایسے ہی قابلِ تعریف مضامین میں آئندہ جنگ حکیم یوسف حسن صاحب ایڈیٹر رسالہ ''نیرنگ خیال'' کا ہے، جس میں بڑی ترکیبوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ''آئندہ جنگ'' ہو کر رہے گی۔ حکیم صاحب اگر آئندہ بھی ایسے ہی مضامین لکھتے رہے تو ان کی بڑی شہرت ہو جائے اور یہ رسالہ ''نیرنگ خیال'' کے مضامین کو لوگ اتنا پسند بھی نہیں کرتے ایسے مضامین بہت مقبول ہوں گے۔ اس مضمون میں حکومت روس کے اقدام کو ناقابل کہہ کر حکیم صاحب نے حربی واقفیت

سے تجاہل عارفانہ فرمایا ہے۔ پھر بھی مضمون بہت ہی پرلطف و پُر مغز ہے۔ غرض تمام مضامین بہت ہی خوب ہیں۔

حصۂ نظم میں ے حانہ، اے محبوب، لطف سحر اور وہی حفیظ جالندھری کا 'عید کا گیت' بہت عمدہ ہے۔ سفرِ آخرت والی نظم مارے ڈر کے ہم نے نہ پڑھی مگر ہوگی عمدہ۔ حفیظ جالندھری کے گیت کو کئی بار پڑھا تو حفظ یاد ہو گیا، مگر اتنا نہیں کہ حفیظ صاحب کی بیاض سے اگر کہیں کھو جائے تو ہم لکھ کر پھر بھیج دیں۔

سب سے آخری مگر حیرت انگیز خوبی عید نمبر کی یہ ہے کہ عظیم الشان نمبر عین اس مہینے میں تیار کیا گیا ہے جب مسلمان روٹی نہیں کھاتے اور پانی بھی نہیں پیتے بلکہ کچھ بھی نہیں کھاتے پیتے، یعنی ماہ رمضان میں، جس کے دو معنی ہوئے ایک یہ کہ یا تو ارکانِ ''انقلاب'' بھوک پیاس میں کام بہت زیادہ کرنے کے قدرتاً عادی ہیں یا پھر یہ لوگ کام اسی وقت عمدہ کرتے ہیں جب انھیں بھوکا پیاسا رکھا جائے۔ پھر اس نمبر میں تمام مضامین کی یہ خصوصیت تو حد سے زیادہ عمدہ ہے کہ اس کے تمام مضامین ہر مذہب والے کے پڑھنے کے قابل ہیں۔ فی الجملہ ہم اس عید نمبر کی اشاعت پر جس طرح ارکانِ ''انقلاب'' کو مبارکباد دیتے ہیں اسی طرح سات کروڑ مسلمانوں اور ایک اوپر بیس کروڑ ہندوؤں کے نمائندے ہونے کے اعتبار سے ہم ارکان ''انقلاب'' کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے زبانِ اردو میں ایک ایسا نفیس عید نمبر شائع کیا جو ان سے پہلے اخبار ''پانیئر'' کے قوم والے ہی شائع کیا کرتے تھے۔ خدا جانے اس کا ایک آدھ نمبر سائمن کمیشن والوں کے ہاتھ بھی آیا یا نہیں؟

اب تنقید کے صحیح قاعدے کے موافق عید نمبر کی چند غلطیاں بھی بتلائے دیتے ہیں۔ لہٰذا:
پہلی غلطی اس کے کاتب نے یہ کی کہ ہمارے مضمون میں تین چار فقرے غلط لکھ دیے۔
دوسری غلطی یہ کی کہ ہمارا مصرع تھا:

کر تو کر نہیں تو ایڈیٹر سے ڈر

اسے لکھ دیا'' کر تو کر نہیں، تو نوکری کے ڈر سے ڈر''۔
تیسری غلطی یہ کہ کہ ہمارے نام کے آگے ہمارے خواہ مخواہ کے وطن کا نام بھی لکھ دیا جس پر

ہمیں بے حد تاؤ آیا، لہٰذا کہہ دیتے ہیں کہ ہم آئندہ "حج نمبر" میں کوئی مضمون نہ لکھیں گے۔ لوگ اس کے خریدار ہرگز نہ بنیں، مگر ہاں یاد آ گیا وہ سالک صاحب پھر ہمیں ڈانٹ دیں گے اور ہم ضرور لکھیں گے یا لکھ بھی چکے ہوں گے۔ انشاءاللہ۔

(اخبار انقلاب لاہور، 8 اپریل 1928)

افسانہ نمبر دیکھ کر

مکرمی وصل صاحب ایڈیٹر مرقع، لکھنؤ

آج حسب وعدہ آپ کے مرقع کا ''افسانہ نمبر'' ملا جسے میں ''خطوط نمبر'' بھی کہہ لیتا ہوں۔ مان لیجیے کہ میں نے عمر بھر میں پہلی مرتبہ مرقع کو دیکھا اور اسی لیے مجھے بے حد مسرت ہوئی اور ساتھ ہی آپ پر کئی دفعہ غصہ بھی آیا۔ یہ کئی دفعہ اس طرح کہ جب رسالہ ''مرقع'' اس درجہ سلیم المذاق اور رفیع المنزلت ادبی پرچہ ہے تو آپ نے اب تک کیوں نہیں میرے پاس بھیجا؟ پھر اس طرح کہ جب مرقع ادبیات اردو کے ایک مخصوص حصے افسانہ کا ناشر دحامل ہے تو آپ نے میرے پاس کیوں بھیجا؟ کیا آپ نے مجھے بھی کہیں کا ''سدرشن صاحب'' سمجھ لیا تھا؟ دیکھیے یہ تمنا اور اعتراض گویا خاصی منطقی شکل کی عبارت ہے جسے غور سے پڑھیے۔

(1) مرقع کے ''افسانہ نمبر'' یا افسانہ نمبر کی خوبیاں بہت زیادہ ہیں۔ پہلی خوبی تو یہ ہے کہ وہ جو لاہور سے رسالہ ہزار داستان جاری ہوا تھا اور اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ افسانے ہی افسانے شائع کرے گا مگر دیکھیے کہ اب بند ہو کر رہ گیا (میرے پاس جو رسالہ نہیں آتا میں سمجھ لیتا ہوں کہ وہ بند ہو گیا) تو اب ادبیات اردو کے اس نہایت اہم اور مفید حصہ کی ترقی کے لیے آپ نے قدم اٹھایا ہے۔ واقعی بڑا کام کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ

آپ نے اردو افسانہ نگاری کے ذوق کو ارفع بنانے کا تہیہ کر لیا ہے اور اس حساب سے آپ ہی پہلے ایڈیٹر صاحب کہ اپنی تمام توجہات صرف ایک مقصد کے لیے صرف فرما رہے ہیں جو کامیابی کی یقینی دلیل ہے۔ بہت اچھا کیا کہ صرف ایک فن کے لیے مرقع کو مخصوص کر دیا اور اسے خواجہ حسن نظامی مدظلہ کا رسالہ ''دین دنیا'' نہ بننے دیا۔

(2) آپ نے ''مرقع'' میں ہر مضمون نگار کی تحریر کا عکس شائع کیا۔ اس سے مضمون نگاروں کا امتیاز کم ہو گیا یعنی مشاہیر ایسے مضمون نگاروں کی تحریر کے ساتھ اپنی تحریر دیکھ کر ذرا جل مریں گے کیوں کہ غلام ہندستانی مشہور ہو کر مغرور ہو جاتے ہیں اور پھر بجائے خود لکھنے کے اپنے پندرہ روپیہ تنخواہ والے ''پرائیویٹ سکریٹری'' سے خط کے جوابات لکھوا دیا کرتے ہیں اور اسی لیے تو برطانیہ انھیں سوراج نہیں دیتی اور نہ دے۔ ہاں ان تحریروں کے عکس سے مجھے بعض افسانہ نگاروں کی بدمذاقی کا انداز ہو گیا، خصوصاً بھائی جلیل احمد قدوائی بی۔ اے اور میاں احسن سمبھی کی تحریر سے پتہ چلا کہ ان جناتی خط والوں کے مضامین لکھتے وقت بیچارے کاتبوں کی جان پر ہی آبنتی ہوگی۔ بعض تحریروں سے یہ اندازہ ہوا کہ ان کے لکھنے والے خود کو تھوڑا سا برا آدمی بھی سمجھتے ہیں اور اسی لیے انھوں نے آپ کو نہایت ہی مختصر جواب عطا فرمایا ہے۔ یہ خطوط میں مختصر نویسی آج کل لیڈری کی علامت سمجھی جاتی ہے اور اعلیٰ قابلیت کی سند۔ چنانچہ آپ ایسے لوگوں کو مضمون کے لیے خوشامد سے بھرا ہوا طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدوں کے برابر خط لکھ دیجیے، وہ بڑی آن بان سے صرف اتنا جواب دیں گے کہ:

''بہت مصروف ہوں، معاف کیجیے''۔

مگر میں اسی مختصر نویسی کو مشرقی آداب اخلاق کی توہین سمجھتا ہوں اور غلامی کی علامت۔

(3) افسانوں کو میں کبھی نہیں پڑھتا کیوں کہ ان کے پڑھنے سے ''ذرا عشق پیدا ہو جانے کا خطرہ'' یقینی ہوا کرتا ہے، مگر ''مرقع'' کا افسانہ ''گوپال اور چرواہا'' نوشتہ پروفیسر بابو رگھوپت سہائے صاحب فراق بی۔ اے کو میں نے بسم اللہ کہہ کر پڑھ بھی ڈالا جو بے انتہا عبرت آموز اور شائستہ ہے۔ میاں احسن سمبھی کے افسانے ''تین بجلیاں'' کے اندر ''ریشمی

ساری کا آنچل' پر جونظر پڑی تو گھبرا کر ورق الٹ دیا کیوں کہ اس میں وہی اوپر والا خطرہ محسوس ہوا، مگر زیادہ افسانوں میں عبرت آموزی، ہدایت اور اصلاح کے مقاصد موجود معلوم ہوتے ہیں۔ جلیل احمد قدوائی بی۔اے کا افسانہ "گوشۂ مظلوم" میں نے اس لیے نہیں پڑھا کہ وہ میرے بڑے اچھے دوست ہی نہیں بلکہ عزیز بھی ہیں، اس لیے میں ان کے ہر مضمون کو سمجھتا ہوں کہ لاجواب ہی ہوگا۔

(4) آپ نے ہندو بھائیوں کو مسلمانوں کے برابر افسانے لکھوانے کا انتظام تو ایسا عمدہ کیا کہ زبان ستائش سے عاجز ہے اور اسی حساب سے آپ بھی ایک قسم کے ادیب مولانا محمد شوکت علی ہو جاتے ہیں۔ واقعی ملکی لحاظ ہی سے نہیں بلکہ قومی، ادبی، علمی اور اخلاقی تعلقات کے لحاظ سے ہر ماہوار پرچہ میں یہ ضرورت یا اتحاد نہایت اہم اور مفید ہے۔ میں بھی ہندو بھائیوں کے حق اور حصہ کو زبانِ اردو پر تسلیم کرتا ہوں بلکہ ان سے شکایت ہے کہ انھوں نے اپنی اس مادری زبان کو کیوں صرف مسلمانوں کے قبضہ میں دے رکھا ہے اور کیوں نہیں ہندو بھائیوں کو ان مسلمانوں پر غصہ آتا ہے جو زبانِ اردو کو غیر ضروری عربی اور فارسی کا جامہ پہنائے چلے جارہے ہیں۔ واللہ مجھے مسلمانوں کی حسب ذیل تراکیب "برقیت، مقناطیسیت ساغر در بر اور سیماب بدوش" کے مقابل بابو رگھوپت سہائے اور حضرت رامان گیان صاحب ایم۔اے کے افسانوں کے یہ فقرے بھلے معلوم ہوئے کہ "بھگوان تمھاری سرپرستی کریں گے"، "ہماری چھتانہ کرو"، "اس دیس میں یہ بات شروع سے چلی آئی ہے"، "جو کچھ بدا ہوگا، ہو جائے گا"، "اس کے بھاگ چھوٹے"، "مہاراج مجھ سے بڑی خطا ہوئی"۔

کیوں کہ بھاشا یا پرانی ہندو مسلم زبان کے الفاظ سے ذوق جس قدر آچکا ہے اب ان ٹیگوری تراکیب سے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور ویسے بھی زبان کا حسن تباہ ہوتا ہے۔ پس اس کے لیے میں جس طرح مرقع کے ہندو اربابِ قلم کا مدح گستر ہوں اسی طرح آپ کا شکر گزار۔ میں تو پھر ہندو بھائیوں سے کہتا ہوں کہ وہ آئیں اور اپنی قدیم روایات کے موافق بھاشا اور روزمرہ کے سلیس اور عام فہم جملوں سے بجائے مسلمانوں کے اردو کی شدھی کر ڈالیں جس کا خزانہ ہندو ادبا

کے انتخاب رنگین سے آج بھی جگمگا رہا ہے، مگر خدا کے لیے اس جوش میں آ کر کہیں اپنے افسانوں کے عنوانات تیج، ساچار، بھیشم، ودیا آرمبھ اور بھکشا مقرر نہ کر دیجیے گا ورنہ یہ مسلمان افسانہ نگار بھی اپنے افسانوں کے عنوانات فتنہ بلقویہ، لمحۂ فکریہ، مقاطعہ جوگی، بصائیر وعنبر، حوادث محلیہ وغیرہ رکھ کر اردو کو غارت ہی کر ڈالیں گے۔

(5) اب چند مشورے سن لیجیے۔ وہ یہ کہ اگر سال بھر میں ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ تمام افسانے ایک ہی موضوع پر لکھوائے جائیں مثلاً عید کے موقع پر مرقع کا ''اتفاق نمبر'' شائع کیجیے اور اس میں ہر افسانہ نگار سے عرض کیجیے کہ وہ اتحاد کے فوائد پر افسانہ لکھیں۔ پھر محرم پر انسانی ہمدردی پر سب سے لکھوا کر محرم نمبر شائع کیجیے۔ پھر شب برأت پر ''حلوہ نمبر'' شائع کیجیے مگر اس کے لیے مولویوں اور ملانوں سے کچھ بھی نہ لکھوایئے ورنہ وہ اس کے فوائد بہت تفصیل اور مذہبی دلائل سے لکھیں گے اور آپ کو خواہ مخواہ دو نمبروں میں یہ تمام مضامین شائع کرنا پڑیں گے۔

(6) افسانے شائع کرنے سے پہلے صحت زبان کا لحاظ بھی دیکھ لیا کیجیے تاکہ زبان کی غلطی نہ رہ جائے کیوں کہ افسانہ نمبر میں بعض مضمون نگاروں کے مضامین میں زبان کی غلطیاں موجود ہیں۔ اس پر غصہ آ گیا ہو تو لکھ دینا میں ان غلطیوں کو نقل کر کے بھیج دوں گا۔

(7) وہ بولیں کہ ''مرقع'' میں تصاویر کا انتظام بھی ہو تو اچھا ہے آپ سمجھے؟ مطلب یہ تھا کہ ''مرقع'' سے تصاویر پھاڑ کر تختے پر لگا دیں گے اور ان کے ننھے میاں طولعمرہٗ ان سے کھیلا کریں گے۔ جب ہی تو ہم یہ ننھے میاں کی ماؤں سے گھبراتے ہیں مگر مرد اور تمام ادبی لوگ بھی کہا کرتے ہیں کہ صنفِ نازک مرد کے لیے بمنزلہ روح کے ہے۔ لاحول ولا۔

(8) ہاں میں نے آپ کو جو پہلے خط میں لکھا تھا کہ میرے کسی خط کی عکسی نقل شائع نہ کیجیے گا کیوں کہ مجھے اس حرکت سے سخت نفرت ہے۔ یہ دراصل غلط لکھا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے کے تمام خطوط پوری بے خبری اور گھبراہٹ میں لکھے تھے، یہ کسے خبر تھی کہ آپ کے ہاں ہر ادنیٰ و اعلیٰ خط پر ''عمل چغتائی'' ہوا کرتا ہے؟ اس لیے مجھے خوب معلوم ہوا کہ اگر میرے یہ بھونڈے خطوط عکسی کر دیے گئے تو لوگ ہاگ کہیں گے کہ ماشاءاللہ یہ بھی کوئی ملا رموزی

ہیں۔ اماں ان کے خطوط سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت ہی معمولی قسم کے آدمی ہیں۔ ادھر آپ کو میرے پورے آداب القاب اور خطابات کا بھی علم نہ تھا۔ لہٰذا آپ زیادہ سے زیادہ یہ لکھ دیتے کہ "تحریر دست وقلم ملا رموزی جل شانہ" اور ظاہر ہے کہ اس سے عوام پر خاک بھی اثر نہ پڑتا۔ اس لیے اپنے خط کی عکسی نقل کے لیے یہ خط لکھتا ہوں، اسے ضرور عکسی کر کے "مرقع" میں شائع کر دیجیے۔

◆◆◆
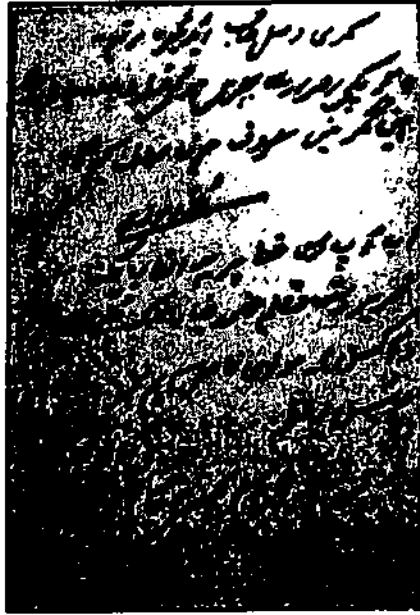
قربانی اور موٹر لاری

یہ حلال جانوروں کو کسی نہ کسی طرح پٹک کر، دبوچ کر اور پچھاڑ کر ذبح کر ڈالنا تو جلا ہوں کی قربانی کہلاتی ہے لیکن ارباب علم اور اللہ والوں کی قربانی نام ہے نفسیاتی خواہشات کو مار ڈالنے کا خواہ وہ خدائے جن و بشر کے احکام کی تعمیل میں ہو یا ترک عیش و راحت اور ملک و ملت کی کسی خدمت کے سلسلہ میں۔ اور یہ ملکہ پیدا ہوتا ہے خطرے کی زندگی اختیار کرنے سے۔ مثلاً جو قومیں کہ حرب وضرب اور جنگ و پیکار کے مجاہدانہ ماحول واثرات سے دور رہتی ہیں، جو امن و سلامتی کی زندگی کو پسند کرتی ہیں، ان سے قربانی کی قوت ایسی ہی فنا ہو جاتی ہے جیسی ہندستانی پیروں اور مریدوں سے روشن خیالی اور زمانہ شناسی اور وہ کسی خطرے میں پڑنے کے تصور تک سے کانپ اٹھتی ہیں۔ ایسی اقوام کے نوجوانوں میں جفاکشی، حوصلہ مندی، بہادری اور محنت کی قابلِ تعریف قوت کی جگہ ہاکی، کرکٹ، ٹینس اور علی گڑھی رنگ کی جسمانی آرائش اور بال سنوارنے کے نسوانی مشاغل اور جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ معمولی سے خطرے کی اطلاع پر "اف! ارے معاذ اللہ۔ توبہ توبہ! اور خدا خیر کرے کہہ کر اس خطرے سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا یہ قول ہے کہ انسان کو بشرطیکہ وہ قوم کا جلاہا نہ ہو ساری عمر میں ایک مرتبہ خواہ مخواہ بھی کسی خطرے میں خود کو مبتلا کر کے مردانہ قوت کو زندہ کر لینا چاہیے۔ اس حساب سے وہ سوراج کے زمانہ میں تو زبان

بندی، نظر بندی، مطبع بندی، اخبار بندی، ایڈیٹر بندی، وارنٹ، مچلکہ، ضمانت، گرفتاری، کوتوالی، حوالات، چالان، قرقی اور قید بامشقت کے خطرات سے اس ملکے کی مشق ہو جایا کرتی تھی، لیکن اب صرف احمد آباد گجرات میں کھدر کا پرچار باقی رہ گیا ہے اور بس۔

ادھر اس میدان عمل و امتحان کی سرد بازاری کے بعد دوستوں میں ہیں سب کے سب بی۔ اے پاس جنھیں بجز ٹھنڈی سڑک کی چہل قدمی کے کوئی شغل ہی پسند نہیں۔ تنگ آ کر ایک دن عزیزم مولوی عبدالہادی انصاری صاحب سے کہا:

"اماں لاحول ولا۔ یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے؟ کھایا، سو گئے۔ اٹھے اور ٹینس کھیل آئے۔ انسان وہ جو سپاہیانہ ہمت و حوصلے اور خطرے کی زندگی اور قربانی کے مشاغل سے دلچسپی پیدا کرے، یعنی ہمت"۔

اس وقت تو ہادی صاحب سن کر چپ سے ہو گئے، مگر دل میں ٹھان لی تھی کہ کسی دن ملا صاحب کو جفاکشی اور خطرے کی زندگی کا مزہ چکھا چھوڑیں گے۔

عام قاعدہ ہے کہ بی۔ اے پاس مسلمانوں کو بغیر نماز پڑھے بھی ہر صبح کو پلنگ ہی پر چائے، بسکٹ اور انڈے ناشتے کے لیے مل جاتے ہیں اور جو ہوئے کسی اسلامیہ کالج کے تعلیم یافتہ اور کہیں کے "ذرا افسر بھی" تو پھر علاوہ ناشتے کے ایک سفید وردی والا ایسا خانساماں بھی مل جاتا ہے جسے ہر وقت یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "ابے جا کام چور کان پکڑ کے نکال دوں گا" لیکن ان کے لیے جنھیں علم و خرد کی احساس فزا دولت عطا ہوئی ہے اور جن کے دماغ کمال و معرفت کی روشنی سے جگمگار ہے ہیں ہر نئی صبح مصیبت و اذیت کی کوئی نہ کوئی بلا لے کر آتی ہے اور وہ اس کی مدافعت میں اپنے دل و دماغ کی ان برگزیدہ قوتوں کو صرف کرتے ہیں، جنھیں اگر کسی حکومت کے نظم و انصرام میں صرف کیا جاتا تو دنیا ان لاجوابی پر عش عش کر اٹھتی، مگر ایسے ہی ارباب عقل و تیز ہوا کرتے ہیں جنھیں مسلسل مصائب و آلام کا سلسلہ مالیخولیا، دق، مراق، ضعف معدہ اور کبھی کبھی کھانسی کا تسلسل ختم ہی کر کے چھوڑتا ہے۔ دور کیوں جاتے ہو؟ ہمیں حفیظ جالندھری، سالک بٹالوی اور سید جالب دہلوی ہی کو دیکھ لو اور ایسے ہی مصیبت کے ماروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ محض رد انکار یا بقائے حواس کے لیے کبھی کبھی ایسے مشاغل کو بھی اختیار کر لیتے ہیں جو ان کی شان متانت و ذوق کے یکسر منافی ہوا کرتے

ہیں۔ مثلاً ایک اخبار کا ایڈیٹر ہو کر افیون نوش بن جانا یا ذی علم لوگوں کو چھوڑ کر کالج کے طلبا کو غزلیں سنانے جانا۔ پہروں وہیں پڑے رہنا، مگر ہمارے خیال میں افکار و حوادث کا مارا ہوا وہ انسان سب سے زیادہ ہمدردی کا مستحق ہے جو بجائے کسی شغل و مرض کے دوستوں میں مبتلا ہو جائے۔ پھر وہ بڑی آسانی سے خطرے کی زندگی، مصیبت اور قربانی کے معانی و مطالب سمجھ لیتا ہے یا سمجھ لیتی ہے۔

◆

14 مئی 1928 کو طے کر کے ہادی صاحب تو رہے اپنے گھر اور برادرم لیفٹننٹ نعمت علی خاں صاحب کو صبح کی اذان کے وقت ہمارے غریب خانے پر یوں بھیج دیا جیسے فحش نویسی کے سلسلہ میں کسی عدالت کا آدمی سمن لے کر مولانا حبیب کے گھر جائے۔ انھوں نے دروازے پر سے فرمایا:

ملا صاحب اماں اٹھو تو! تو آخر کب تک کھڑے رہیں؟

اماں موزے پہننے کی کون سی ضرورت ہے؟

آ بھی جاؤ، ہاں ہاں یونہی آ جاؤ۔

لاحول ولا۔ اماں ذرا زور سے تو جواب دو، کیا کہا؟

خدا کی قسم مذاق نہیں، واقعی کام ہے۔

میں نے بھی تو منہ نہیں دھویا۔

اجی تو پان میرے پاس تو بہت کافی ہیں، بس تم تو شیروانی پہن لو، اٹھے بھی یا پلنگ پر سے ہی بول رہے ہو؟

اور جو وہ ابراہیم کہیں چلے گئے تو؟

میں نے کہا، سنو ذرا جلد باہر آؤ۔

اماں عجیب آدمی ہو۔ بھلا یہ مذاق کا کون سا موقع ہے؟

لاحول ولا، کوئی احمق ہوا تھا جو اتنے سویرے تمھیں اٹھانے آتا؟

تو ذرا باہر تو قدم نکالو۔

اچھا اچھا تو لو جاتے ہیں، کافر ہی ہو، جو اب تمھارے در پر قدم دھرے۔

جی بس بس نہ آیئے، آرام ہی کیجیے۔

بے تکلف احباب کا یہ وہ دوستانہ مارشل ہوا کرتا ہے جس کے مقابل کوئی نہیں جو ایک منٹ کے لیے بھی گھر میں ٹھہر سکے۔ اب جو باہر آئے تو خیر مقدم یوں شروع ہو جاتا ہے:

وعلیکم السلام

شرم تو نہیں آتی؟

کیا افیون کھاتے ہو؟

اماں یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ اجازت نہیں دیتی تھیں؟

لاحول ولا قرآن کی قسم میری بیوی ہوتی تو دوست..

اماں آخر اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے۔

تو کوئی آپ کے غلام ہیں؟

اماں ملو ملو نہ ملو نہ ملو۔

کیا کہا؟ خدا کی قسم ہر مرتبہ اتنا ہی چیخنا پڑتا ہے۔

کوئی دولت تو دے نہیں دیتے ہو۔ بس اتنا ہی کہ مل لیتے ہو ذرا طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔

اب جو ساتھ چل پڑے اور راستہ میں آپ نے کہیں اتنا ہی کہہ دیا کہ ''یار تمھاری چیخ پکار میں سگریٹ ہی بھول آیا'' تو جواب ملے گا ''اچھا تو اب بندہ تو ٹھیرنے کا نہیں'' یہ کہا اور صاف چل دیے۔ لامحالہ آپ ضبط کر کے بغیر سگریٹ ہی ساتھ ہو لیے۔

◆

یہ تو تھا لیفٹننٹ صاحب کے دروازے پر آواز دینے کا معاملہ، مگر ایسے مواقع پر یعنی دوستوں کے آواز دینے پر گھر میں جو میدانِ جنگ قائم ہو جاتا ہے وہ چین میں جاپانی افواج کی زبردستی سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آپ تو پکارنے والے مسلسل تقاضوں سے ہو جاتے ہیں بدحواس، لیکن اسی پر ''ننھے میاں کی والدہ'' بھی قابو سے باہر ہو جاتی ہیں۔ اب جو آپ نے ضروریات کے لیے کوئی فرمائش کی تو جوابات یوں ملیں گے:

تو کوئی خدا ہوں؟ مجھے کیا خبر؟ دیکھ لو۔

وہیں کہیں میز کے پاس ہوگا (یا ہوگی)۔

مجھے کیا خبر موزے کہاں ہے؟

تو کوئی میں تمھاری چیزوں کی چوکیدار ہوں؟

اور اب یہ ترکاری ورکاری کون لائے گا؟

تو اگر آج نہ جاؤ گے تو کون سا خدائی قہر نازل ہو جائے گا؟

توبہ توبہ بیوی دوست کیا ہیں فرشتے ہیں۔ کسی کل چین ہی تو نہیں لینے دیتے؟

اچھا اچھا تو جو آپ کا مزاج چاہے کیجیے، ہمارا تو خود ہی جی گھبرا رہا ہے۔

تو تم سے نہ کہوں تو اچھا کس سے کہوں؟

غرض ان معرکوں سے فارغ ہو کر ہادی صاحب کے مکان پر پہنچے۔ یہاں مجمع جائز کی حد سے بڑھا ہوا تھا اور سب طرح کی ضروریات از قسم بستر، کپڑوں کی گٹھریاں، تمباکو، پان، چھالیہ اور دو چار بغیر لائسنس کی بندوقیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ سفر ہو گا سفر۔

لیفٹیننٹ نعمت علی خاں نہ فقط ہمارے علمی و ادبی کارناموں کے قدر دان ہیں بلکہ وہ خلوص و ہمدردی اور اخلاق و محبت کے بھی مجسمے ہیں۔ اسی لیے وہ ہمارے مزاج سے بہت کافی واقف ہیں۔ لہٰذا ہمیشہ یہ کرتے ہیں کہ ہمارا غصہ شروع ہونے سے پہلے وہ اُلٹا ہمیں کو اس طرح ڈانٹ دیا کرتے ہیں جس طرح اثبات و جرم سے پہلے پولیس والے ہر آدمی کو ڈانٹ، تو، تڑاق، گھونسہ وغیرہ مار دیتے یا تان لینے کا حق رکھتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم غصہ ہونے سے پہلے ان کی ڈانٹ سے اعتدال پسند ہو جیا کریں۔ لہٰذا فوراً ہی کہا "گھورتے کیا ہو، تم سے گھر پر اس لیے نہ کہا کہ اول تو تم اپنے گھر کے لوگوں سے اجازت نہ ملنے کا بہانہ کرتے، پھر کہتے کہ ابھی کپڑے دھوبی کے ہاں سے نہیں آئے ہیں، دفتر جا کر رخصت لینا ہے اور آخر میں صاف کہہ دیتے کہ بھائی میں تو آج نہیں جا سکتا، اس لیے بغیر کہے تمھیں گھر سے لے آئے۔ اب غصہ کی کون سی بات ہے؟ سب چیزیں موجود ہیں اور جو کہو گے بازار سے لیتے چلیں گے۔ چلو چلو اب بحث و حث تو رہنے دو۔ لو تم پان تو کھاؤ۔

دریافت کرنے پر بتلایا گیا کہ یہاں سے گوالیار اور اگر موقع ملا تو گوالیار سے آگرہ بھی ہو آئیں گے۔ وہاں تربوز یہاں سے آج کل عمدہ ہوتے ہیں۔

کوئی آٹھ بجے دن کو اس طویل قامت موٹر لاری میں سوار ہوئے جس پر سفید کھریا سے لکھا تھا "موٹر سروس گوالیار، فی کس 8 آنہ۔ ٹکٹ خود ڈرائیور صاحب نے عطا فرمایا، جس پر ہندی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا اور ٹکٹ کا کاغذ مضبوطی کے لحاظ سے اللہ بخشے اپنے دہلی والے بڑے حکیم جی کے نسخۂ نوش دارو کی طرح تھا۔ موٹر لاری میں مشکل سے کوئی پندرہ آدمی کی جگہ تھی۔ اس وقت اس میں 26 آدمی سوار ہو چکے تھے۔ سواروں میں بھی اکثر بست سمیت۔ البتہ بستر موٹر کی چھت پر یوں رکھ دیے گئے تھے جیسے کسی بزرگ کے مزار پر رابعہ صاحب محمود آباد نے چار پانچ قبے بنوا دیے ہوں۔ اب یہ خالص ہندستانی ریل جو روانہ ہوئی تو کوئی تین میل پر ایک گڑھے سے گزرتے ہوئے چھت پر سے دو بستر نیچے گر پڑے اور ان کے لیے موٹر تین منٹ ٹھہر گیا۔ آگے بڑھے تو ایک درخت کے سایہ میں موٹر ٹھہر گیا اور یہاں سے چار کسان سوار ہوئے۔ یہ گویا بغیر پان، بیڑی، پوری گرم چائے ہندو۔ پانی مسلمان، دودھ گرم اور گاڑی تین منٹ ٹھہرے گی کا اسٹیشن تھا۔ اب بلحاظ گنجائش یہاں سے مسافر ایک کے اوپر ایک ہو کر سوار تھے۔

صحرا کی گرم ہوا اور خاک نے ہمارے چہروں کی دیہاتی رونق کو دوبالا کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کی کسی سرحدی چوکی سے آفریدیوں پر بم باری اور گولہ باری کے لیے کوئی ہندستانی فوجی دستہ عجلت سے بھیجا جا رہا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ انگریزی نسل کے سولجر کے پاس ڈبل روٹی، سوڈا واٹر، برف، کمبل اور قینچی چھاپ سگریٹ ہر حال میں ہوا کرتی ہے، مگر ہم ہندستانی سولجروں کے پاس اس وقت پانوں کے ڈبے، بیڑی کے بنڈل، ماچس اور ہاتھ کے رومالوں میں موٹی موٹی روٹیوں کے بیچ میں قیمہ گوشت تھا۔ پانی کا بندوبست اللہ میاں پر چھوڑ دیا تھا۔ گرمی اور لو کی شدت سے پسینہ ہندستانی مزدوروں کے خون کی طرح بہہ رہا تھا۔ اب جو ہماری پیاس حد ادب سے بڑھ گئی تو ہم نے کہنی مار کر ہادی صاحب سے کہا کہ پانی؟ تو جواب عطا ہوا "مرے کیوں جاتے ہو آگے ندی آنے والی ہے"۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد ندی آئی تو یہاں سایہ دار درختوں کے نیچے کوئی پانچ کھدر کی چادریں بچھائے لیٹے ہوئے تھے۔ ہم لوگ تو پانی پر ٹوٹ پڑے۔ اور یہ

پانچوں کسان چادریں جھاڑ کر موٹر میں نہایت آن بان سے آ کر بیٹھ گئے۔ پانی سے فراغت کے بعد جب ڈرائیور صاحب سے اس ''دخل در موٹر لاری'' کی شکایت کی تو انھوں نے ان کسانوں سے فرمایا'' آجاؤ میرے پاس اس مڈگارڈ پر'' (یعنی پہیوں کے اوپر)۔ ادھر ہندستانی قناعت پسندی ملاحظہ ہو کہ یہ کسان صاحبان بے چوں و چرا اس مڈگارڈ پر جا کر یوں جم گئے جیسے بمبئی میں تلک مہاراج کا مجسمہ نصب کر دیا گیا ہو اور جواب جنبش بھی نہیں کر سکتا۔ موٹر روانہ ہوا اور اب سورج نے سامنے سے ''دھوپ افشانی'' شروع ہوئی تو پاس بیٹھے ہوئے کسانوں کے تازہ تازہ پسینے سے عنبر بار ہوائیں آنے لگیں۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ موٹر کے آگے کے پہیے میں پنچر ہوا تو تمام مسافر سایہ درخت ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیٹھ گئے، کھڑے ہو گئے، ٹہلنے لگے، اونگھنے لگے، سو گئے، باتیں کرنے لگے، چلم چھالیا کا مشغلہ شروع کر دیا لیکن کسانوں نے یہ کیا کہ ڈرائیور صاحب کا محاصرہ کر لیا کہ دیکھیں یہ پنچر کیا بلا ہے اور اب کیا ہوتا ہے۔ ڈرائیور نے کسانوں کی تماشا پسندی سے یوں فائدہ اٹھایا کہ کسی سے کہا:

ابے کھڑا کیا ہے؟ جا وہ پتھر اٹھالا۔

لے ذرا یہ چکا (پہیہ) تو اٹھا۔

ہاں ٹھونک ٹھونک۔ ابے زور تو لگا زور۔

چل ہٹ گنوار کہیں کا۔

اس عرصہ میں ہم نے بغیر اس تحقیق کے کہ پانی یہاں سے کئے میل دور ہے، تیمم کر کے ظہر کی نماز پڑھ ڈالی، تو ہادی صاحب بولے'' مگر نماز سے نہیں چوکتے'' لیجیے گویا ہم نے بڑی حماقت کی۔ اتنا خوب باقی رہ گیا ہے اب مسلمانوں میں اللہ میاں کا۔ پھر ان سے توقع کرنا ایسا ہی ہے جیسے مولانا اشرف علی تھانوی قبلہ سے یورپ و امریکہ کی سیاحت کی امید باندھنا۔ یہاں سے روانہ ہوئے تو پھر دو کسان ملے، انھیں بغیر کسی دلیل کے موٹر کی چھت پر بٹھا دیا گیا اور ان کی ضرورت مندی ملاحظہ ہو کہ یہ بیٹھ گئے۔ صرف چھت کے اوپر کی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے اس زور سے پکڑے بیٹھے تھے گویا اب انھیں موٹر میں کوئی کام ہی نہیں کرنا۔ یہ گر جانے کے خطرہ سے ایسا بندوبست کیا گیا تھا۔ ابھی موٹر پوری رفتار سے چلی جا رہی تھی یا چلا جا رہا تھا کہ یکا یک ایک طرف

سے ایک عورت مع تین بچوں کے موٹر کی طرف جھپٹی یا جھپٹا تو ڈرائیور نے اشارے سے کہا "جگہ نہیں ہے جگہ" مگر جب موٹر آگے نکل گئی تو ہم ہندستانیوں کے جگر پانی ہو گئے اور سب نے مل کر ڈرائیور سے سفارش کی کہ جس طرح بھی ہو اس عورت کو تو سوار کر ہی لو کیوں کہ اس بے کس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں (یہاں موٹر کی سابقہ گنجائش ملحوظ خاطر رہے) اب یہ عورت یوں سوار کی گئی کہ اس کے تینوں بچے ہم ہمدرد مسافروں کی گود میں تقسیم کر دیے گئے یہ کہہ کر کہ لینا بھائی صاحب، اس بے کس کی مدد کرنا۔

◆

اب یہاں سے وہ عظیم الشان خطرہ سامنے آ گیا، جس کے خیال سے ہندستانی کا دل کانپ جاتا ہے۔ بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حواس میں ترتیب باقی نہیں رہتی۔ بلکہ یہ لکھنوی کنکوے تو چکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔

اب سن لیجیے وہ عظیم الشان خطرہ یہ تھا کہ ایک ذرا بڑی سی ندی آئی جس کا پل ایک طرف سے اس طرح گر گیا تھا کہ اس پر سے موٹر گزرتے وقت احتمال تھا کہ کہیں موٹر نیچے نہ گر جائے۔ بس جناب اس پر ہولناک خطرہ کا نظر آنا تھا کہ موٹر میں قیامت کبریٰ بپا ہو گئی:

نہیں نہیں، موٹر ہرگز نہیں گزر سکتا۔

اُفوہ کس قدر خطرناک راستہ ہے۔

کیوں جی ڈرائیور صاحب جب یہ راستہ اس قدر خوفناک تھا تو تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا؟

اماں کیا سب کی جان لو گے؟

ہم تو مر بھی جائیں تو اس پر سے موٹر لے جانے کی رائے نہ دیں گے۔

اماں رہنے بھی دو اور جو خدانخواستہ موٹر گر گیا تو؟

خدا کی قسم ہڈیاں بھی نہ ملیں گی۔

غرض خوف و ہراس اور وحشت و بدحواسی کا ایک طوفان تھا جو ہر شخص کے دماغ کو معطل کر چکا تھا۔ اکثر نے یہی رائے دی کہ اگر کوئی دوسرا راستہ نہیں تو پھر واپسی ہی مناسب ہے۔ بعض

نے نہایت قابلیت سے یہ رائے دی کہ یہاں سے ایسی سمت لے چلو جہاں سے کوئی ریلوے اسٹیشن قریب ہوتا کہ ریل کے ذریعہ گوالیار پہنچ جائیں کیوں کہ بھائی کوئی جان دینا تو بدا نہیں ہے۔
آخر صاحب نہ ہوا ضبط تو کھڑے ہو گئے ہم ایک بلند ٹیلے پر اور ایک ایسی "جہاد انگیز" تقریر کی کہ اگر ہمارے مخاطب اس وقت انگریز ہوتے تو آگ میں کود پڑتے، مگر یہاں یہ اثر ہوا کہ خود ہمارے ساتھیوں نے بیک زباں کہا:

"بے وقوف ہو گئے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی موقع ہے ہمت کا؟ ہمت ہی دیکھنا ہے تو دیکھو کسی موقع پر؟"

گویا یہ تو ہمت کا موقع ہی نہ تھا۔

پھر بھی ہم نے سوچ لیا تھا کہ ایک صاحب علم کے نزدیک کسی جماعت کو تابع کر لینا بات ہی کون سی ہے فوراً کہا کہ اچھا یوں کرد کہ موٹر میں سب سے پہلے بیٹھ کر اس جگہ سے ہم گزرتے ہیں۔ پس اگر ہم سلامتی سے گزر جائیں تو آپ لوگ ایک ایک ہی کر کے آجانا۔ اس پر ایک حکیم الامت اور رئیس الاحرار بولے کہ "اور کیوں صاحب جو ہمارے ہی نمبر پر موٹر جا پڑا تو؟" تو ہم نے بھی چھتری کو زمین پر ٹیک کر کہا:

"اور صاحب جو اس شدید گری سے ابھی آپ ہیضے میں مبتلا ہو جائیں تو؟ اور پھر ابھی آپ بیہوش ہو جائیں تو؟ اور پھر ابھی آپ مر ہی جائیں تو؟"

"خدا کی قسم جو ذرا موٹر کا پچھلا پہیہ کھسک جائے تو اللہ حضرت ہڈیاں نہیں ملتیں"۔

"مگر واہ ملا رموزی صاحب حق تو یہ ہے کہ آپ ہی کا کام تھا کہ آپ نے اس کشتی کو پار لگایا۔ ہاں صاحب پھر آپ صاحب علم ہیں اور ماشاءاللہ اور ویسے بھی افغانی خون کے آدمی ہو"۔

اس کے بعد کچھ دیر دیسی سڑکوں کی خرابی پر تیز و تند تنقیدیں اور نکتہ چینیاں ہوئیں۔

یہ ہیں وہ حضور ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس جلیل الشان قربانی کے مقلد جس میں حضور گرامی علیہ السلام نے خدائے جلال و جمال کے حکم کی تعمیل میں جان سے زیادہ عزیز بیٹے کے گلے پر چھری چلادی تھی، مگر حوصلے اور ایثار کی قوت نے جواب نہ دیا اور کیا ایسے بے شمار ہندی مسلمان نہیں ہیں جو آج بھی فریضۂ حج کو اس لیے ترک کیے بیٹھے ہیں کہ جو جہاز ڈوب گیا تو؟ جو بدوؤں

نے مار ڈالا تو؟ اور میدانِ حج میں پانی نہ ملا تو؟ اور زمانہ حج میں وطن میں کوئی عزیز مر گیا تو؟ مگر ایسے نہیں جو کہیں کہ ہم دریا میں گرتے ہیں، اگر پار ہو گئے تو؟ یہی وہ بے ہمتی ہے جو طلبا سے انٹرنس کے بعد تکمیل تعلیم کی قوت کو ضائع کر دیتی ہے۔ اسی سے تاجر خفیف خسارے پر تجارت کا پیشہ ہی ترک کر دیتا ہے، اسی سے صنعت و حرفت کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ غرض زندگی کا ہر شعبہ ہے جو جذبۂ قربانی کے فقدان سے مضمحل ہو رہا ہے اور اسی قربانی کا دوسرا نام ہے حوصلہ۔ اور کوئی شب کے گیارہ بجے گوالیار پہنچ گئے کہ کہا ہے۔

◆◆◆

مخزن کی سالگرہ

اخباروں اور رسالوں کے سالگرہ نمبروں پر ہمارے ''ننھے میاں کی والدہ'' کو بہت ہنسی آتی ہے جو اصل میں حیرت کا جاہلانہ اظہار ہوا کرتا ہے۔ کیوں کہ اب تک شریف عورتوں کی طرح وہ اتنا ہی سمجھتی ہیں کہ بس سالگرہ تو کہتے ہیں سال میں ایک مرتبہ صبح ہی صبح ننھے میاں کے نہلانے کو۔ پھول کے کپڑے پہنانے کو۔ سرمہ اور کاجل لگانے کو۔ مٹھائی تقسیم کرنے کو۔ محلے کی ماں بہنوں کو جمع کر کے رات بھر گانے کو اور اگر ہماری نظر نہ پڑے تو کسی پرانی قبر پر چادر چڑھانے کو، مگر اب جو انھیں اخباروں اور رسالوں کی سالگرہ کے معانی مطالب سمجھائے تو بس اس قدر سمجھی ہیں کہ ہر سالگرہ نمبر سے تصاویر نوچ کر ننھے میاں کے کھیل کے لیے احتیاط سے صندوق میں بند کر لیتی ہیں اور ہم سے اطلاعاً کہہ دیتی ہیں کہ:

''وہ پڑا ہے تمھارا سالگرہ نمبر''

(یہاں ان کی اس ادب سوز حرکت پر غیر محرم اشخاص کو لاحول ولا کہنے کا حق حاصل نہیں)

اس لیے جن رسالوں کو ہم دل سے چاہتے ہیں ان کے سالگرہ نمبروں کو محفوظ رکھنے کے لیے خاص کوشش کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ پھر بھی مخزن کا سالگرہ نمبر پانچ دن کے بعد ایک دوست ہی کے گھر سے برآمد ہوا اور انھوں نے اس احسان سے دیا گویا بخطِ مستقیم وہ ان ہی کے نام لاہور سے آیا

تھا۔ لے کے جو بیٹھے تو ان کی آنکھیں آشوبی تھیں۔ درد کی شکایت سے سو نہ سکے اور مخزن پڑھ بھی نہ سکے۔ صبح سویرے چہل قدی کے نام سے بستر سے جو بھاگے تو ایک باغ کے کنارے بیٹھ کر اس طرح پڑھ ڈالا گویا اسے ہم سے کوئی لے بھاگے گا یا لے بھاگنے والا ہے۔ بہرحال آپ سمجھ لیجیے کہ ہم نے رسالہ مخزن کا سالگرہ نمبر پڑھ لیا، ختم کرلیا، دیکھ لیا یا دیکھ چکے اور پڑھ چکے، اس کی ایک ایک سطر پر غور کرلیا یا غور کر چکے لہٰذا رائے لکھتے ہیں کہ:

یہ سالگرہ نمبر بے حد نفیس اور عمدہ ہے اور اس لیے کہ متانت سنجیدگی اور بلند معیاری کے اعتبار پر یہ رسالہ اگر خدارسیدہ نہیں تو عمر رسیدہ ضرور ہے اور جہاں یہ عرصۂ دراز سے ادبیات اردو کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے وہاں ایک نہایت سلیم وسنجیدہ ذوق کا ناشر و مبلغ بھی ہے۔ اس کی نفاستِ ذوق کا ثبوت اس کے سرِ ورق ہی سے اس طرح ملتا ہے کہ باوجود سالگرہ نمبر ہونے کے اس کا سرِ ورق نہایت خواجہ حسن نظامیانہ ہے یعنی صوفیانہ۔ اس کے سرِ ورق پر بجائے گوٹے کنارے کے پھول، بیل کی ایک سنہری جدول ہے اور نصف سفید و نصف نیلی زمین۔ یہ نہیں کہ رسالہ کے نام کا عربی خط میں طغرا بھی ہے تو ایڈیٹروں کے ناموں کا کتبہ بھی۔ جامع مسجد دہلی بھی بنی ہوئی ہے تو پرچم ہلالی بھی۔ ابن سعود کے شہر کی ایک کھجور بھی ہے تو ملک معظم کا تاج بھی۔ گویا رسالہ کا سالگرہ نمبر کیا ہوا خاصا مداری کا بیل ہو گیا یا ہمارے ''ننھے میاں'' جن کی آنکھوں میں کاجل بھی لگایا جاتا ہے اور سرمہ بھی۔ پیشانی پر ایک سیاہ نشان بھی ہوتا ہے اور سر پر گوٹے کی ٹوپی بھی۔ گلے میں بڑے مولوی صاحب کے تعویذ بھی ہوتے ہیں اور نادِ علی بھی۔

غرض مخزن کے سالگرہ نمبر کے پہلے صفحہ ہی سے سنجیدگی کا اظہار شروع ہو جاتا ہے۔ اب جو مضامین کی باری آتی ہے تو یہ نہیں کہ ایڈیٹر کی جانب سے اعتذار بھی ہے اور شکریہ بھی۔ صرف زرِ کثیر کا اعلان بھی ہے اور خسارہ کا نقشہ بھی۔ معاونین سے التماس ہے اور خریداروں سے اپیل بھی اور تو اور سالگرہ نمبر میں منیجر صاحب نے یہ تک نہ لکھا کہ ''خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیں'' اور یہ نہ لکھا کہ ''مخزن میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے''۔ اسی طرح نمبر میں اشتہارات تو ہیں مگر نہ اس قدر کہ شہر دہلی کا ''دین و دنیا'' کہیں اسے نہ اس درجہ کہ پنڈی بہاؤالدین کا رسالہ ''صوفی'' کہیں جسے۔ صرف چند اشتہارات ہیں تو وہ بھی ''فحش نگاری'' کی زد سے بچے ہوئے۔

البتہ ان اشتہاروں میں مرادآباد میں مردہ زندہ ہو گیا اور لاہور کے عامل کریم الدین کا اشتہار نظر نہ آیا۔

اب سرِ ورق اور اشتہارات کے بعد 145 صفحات میں مضامین ہی مضامین نظر آتے ہیں۔ جس ورق کو دیکھو مضمون یا نظم سے بھرا پڑا ہے۔ علامہ یوسف علی صاحب کے ایک خط کو 'پیغام' کہہ کر شائع کیا گیا ہے کیوں کہ علاوہ قابل ہونے کے وہ ''بڑے آدمی'' بھی ہیں۔ ہم تو ایڈیٹر صاحب کو اس وقت منصف مزاج سمجھتے جب وہ علامہ یوسف علی صاحب اور اپنے سر شیخ عبدالقادر صاحب کے مضمون کو ہمارے مضمون کے بعد شروع کرتے۔ مضامین میں بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تنوع ہے اور اسی سے مخزن کی ادبی خدمت گزاری کے معیار و مقصد کا قابلِ تعریف ثبوت ملتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ مضامین میں تحقیق اور استدلال کا کافی لحاظ رکھا ہے۔ مولوی محمد اسرائیل صاحب کا مضمون ''جنوب مشرقی یورپ میں اسلام'' بہت کام کا مضمون ہے، مگر موصوف نے اس کو لکھا ہے پڑھا نہیں کیوں کہ اس کے صفحہ 84 پر ریاست رومانیہ کو مجموعی آبادی کے لیے الفاظ اور ہندسوں میں صاف لکھا کہ وہ سترہ کروڑ پندرہ لاکھ تین ہزار نو سو بتیس ہے (171503932) اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس حساب سے انگلستان کی آبادی کئی ارب ہوئی حالانکہ وہ کل چار کروڑ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ رومانیہ کی واقعی آبادی سترہ کروڑ ہی ہو کیوں کہ ہم بھی تو بہت دن سے جغرافیہ وغیرہ بھول گئے ہیں۔

برادرم حفیظ جالندھری کا افسانہ واقعہ کے لحاظ سے نہایت درجہ نتیجہ خیز اور زبان کے اعتبار سے بے حد دلچسپ اور مفید ہے اور ہمیں یہ افسانہ اس لیے بھی پسند ہے کہ اس میں ''ان'' کا تذکرہ کئی جگہ کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی کی فارسی شاعری والا مضمون بھی بالکل نیا ہے اور یہ مضمون اس لیے غنیمت ہے کہ ہمارے زمانے کے ایک واقف یا عہدِ حاضر کے ایک مستند اور فاضل اہلِ قلم کو نوجوان دنیا نے یاد تو کیا ورنہ یہاں تو جب حوصلہ افزائی کی جاتی ہے غالب و مومن ہی کی بوسیدہ اور دوراز زمانہ شاعری کی اور عہدِ حاضر کے بے چارے شعرا اور اربابِ قلم ان لوگوں کے مقابل چاہے مصری کی ڈلیاں کیا قند کے ہزاروں من تھیلے کھول کر رکھ دیں مگر ان پر کوئی کچھ لکھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ کوئی ان

سے دریافت کرے کہ آخر غالب و مومن کے زمانے کی نثری تحریر جس طرح آج آپ کے لیے بیکار سی ہوکر رہ گئی تو ان لوگوں کی شاعری کے سوا آپ کو کوئی عہدِ حاضر کا ایسا شاعر کیوں نہیں مل جاتا جس کی شاعری پر آپ کچھ لکھ کر اس کا حوصلہ بڑھائی؟ مگر جب کسی قوم کی ذہنیت ہی برباد ہو چکی ہو تو اسے کون سمجھائے؟ امید ہے کہ آئندہ لوگ غالب و مومن، انیس و دبیر، میر و ذوق اور داغ وامیر کو چھوڑ چھاڑ کر ملا رموزی، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، یاس عظیم آبادی، جگر مرادآبادی، عزیز لکھنوی اور ہری چند اختر وغیرہ کی شاعری پر مقابلے، موازنے اور تبصرے لکھا کریں گے کیوں کہ عہدِ حاضر کے یہی وہ اربابِ سخن ہیں جن سے ہمارے دور کی زبان کو خاص علاقہ ہے۔ دیکھو ہماری اس تحریر سے غالب پسند طبقہ کیا بھنائے گا۔

سالگرہ نمبر میں یہ خوبی ہے کہ اس کے جملہ مضامین کی زبان نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ اس میں یہ بھی نہیں کہ ایک حصۂ مضامین کو صرف ''عورتانہ'' کر دیا گیا ہو جس کا اہتمام بقول رسالہ نورجہاں امرتسر ''کلیم نسوانی ہاتھوں میں ہوگا'' یہ لفظ ''عورتانہ'' مردانہ کا جواب ہے۔ تو اہلِ قلم نوٹ کرلیں اور ہاں مضامین کے اندر اکبر آبادی ادب لطیف بھی نہیں ہے جس کا نتیجہ کبھی کچھ نہیں نکلتا۔ صرف دیویت، مقناطیسیت، صاعقہ پاش، ارتعاشِ منجمد اور علی گڑھ میں دیوان در بردوش، شیروانی بردوش ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں، مگر سالگرہ نمبر کے جملہ مضامین بڑی آسانی سے علی گڑھ والے پڑھ سکتے ہیں۔ صرف بنگالی طلبا کہیں کہیں اٹک جائیں گے کیوں کہ وہ تو اخبار ''نئی دنیا'' تک کو نائی دھنیا کہتے ہیں۔ سالگرہ نمبر کا حصۂ نظم بھی نہایت مختصر مگر معنی آفریں ہے اور غنیمت ہے کہ تمام نظموں کے ساتھ تصاویر کا اہتمام نہ کیا گیا۔ حفیظ صاحب کا 'پریت کا گیت'، تلوک چند محروم کی 'مرجھائی ہوئی کلیاں'، تپش کا حسنِ نظر، ہری چند اختر کے شعر بہت خوب ہیں۔ بس 'عطیہ فلاں' ''غیر مطبوعہ'' اور اکبر آباد کے شاعرِ اعظم کی کمی ہے۔

تصاویر کا انتخاب ایڈیٹر کے جذبات اور حسنِ نظر کا نمونہ ہے۔ محبت والی تصویر کی عمر بہت کم ہے۔ اس کی عمر بھی شبلی علیہ الرحمۃ کے برابر دکھائی جاتی تو تینوں تصویریں ہم عمر ہو جاتی۔ سبھی تصاویر میں عریانی کی جگہ بے حد شائستگی اور تہذیب موجود ہے۔ یہ نہیں کہ منی جان آگرہ والی کی تصویر کے نیچے لکھ دیا ''جوانی'' اور کبھی سینہ برہنہ میم کے نیچے ''ایک نظر''۔ عمل چغتائی کی تصویر میں چونکہ بقول

حضرت سالک بٹالوی پھر آنکھیں ہیں اس لیے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

مضامین نگاروں کی تعریف تو کی گئی ہے مگر نہ ایسی کہ رسالہ خیال جاناں کی طرح مضامین نگاروں کا ایک جھنڈا ہی بنادیا گیا ہو۔ ہمارے مضمون پر نوٹ لکھا ہے مگر اس میں ہماری تعریف بہت کم ہے۔ اب دیکھ لینا حفیظ صاحب غصہ میں آ کر ہماری تعریف میں نہایت طعن آمیز نوٹ لکھیں گے۔

فی الجملہ مخزن کا سالگرہ نمبر اس قابل ہے کہ اسے ہر پڑھا لکھا خریدے اور سالگرہ نمبر کی اس بے نظیر ترتیب پر ہم اس کے مضمون نگاروں، اس کے کاتبوں، اس کے منیجر، اس کے معاون ایڈیٹر کو داد دیتے ہیں اور ڈاک خانے والوں کے اس ضبط کی تعریف کرتے ہیں کہ انھوں نے مخزن کا کوئی سالگرہ نمبر نہیں چرایا۔ رہ گئے حفیظ صاحب تو ہم ان کی اتنی ہی تعریف کریں گے کہ وہ ہر سہ ماہی پر ایسا ہی عدیم النظیر سالگرہ نمبر شائع کیا کریں۔

بعض باتیں اس نمبر کے متعلق بھول گئے ہیں جو انشاء اللہ پھر لکھیں گے۔ ہاں شیخ سر عبدالقادر صاحب کے مضامین کو درمیانی صفحات پر شائع کیا جائے اور کسی غریب مضمون نگار کا مضمون صفحہ اول پر شائع ہوا کرے تو اس سے مضمون نگاروں کے حوصلے بڑھیں گے۔ کیوں کہ شیخ صاحب تو پھر اپنے ہی شیخ صاحب ہیں کہ کہا ہے:

گر قبول افتد یہ مشورہ زہے عز و شرف

(رسالہ مخزن، لاہور، جو 1928)

◆◆◆

ٹورنامنٹ

ہندستان جہالت نشان کے لیے ہندو بھائیوں کی طرح یہ انگریز بھائیوں کا دم بھی غنیمت ہے۔ ہر سال کوئی نہ کوئی کھلونا ایسا بنا دیتے ہیں جس کے شغل میں پڑ کر ہندستانی اپنی دولت ان کے گھر منی آرڈر کرتے رہتے ہیں اور پھر خوبی یہ کہ اس کھلونے کو خرید کر ہندستانی خوش بھی ہوتے ہیں۔

چنانچہ آج کل ''ٹورنامنٹ'' کی ایجاد ہوئی ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ کئی ہزار ہندستانی ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے ریل والے انگریزوں کو کرایہ ادا کرتے ہیں، جس کی سالانہ تعداد کئی لاکھ روپیہ سکہ کلدار تک پہنچتی ہے۔ ٹورنامنٹ کے لیے انگریزی کپڑے بنواتے ہیں جن کی مجموعی قیمت کئی کروڑ تک پہنچتی ہے اور نفع صرف اتنا ہوتا ہے کہ ٹورنامنٹ میں شریک ہو کر تفریح فرما لیتے ہیں اور بس۔ شاید اسی لیے یہ دیوبند والوں نے اپنے ہاں نہ ہاکی رکھی نہ فٹبال، نہ کرکٹ نہ ٹینس۔ بس یہ کہہ دیا کہ مدرسہ سے چھٹی کے بعد بھی کسی پُر فضا مقام پر لے بیٹھو موٹی موٹی کتابیں اور کرتے رہو بحث مباحثہ تاکہ تازہ رہے علم کیوں کہ علم ''دریا'' ہوا کرتا ہے۔

مگر ہم اس سودیشی تعلیم سے پہلے ہی خوش نہ تھے اس لیے خدا بخشے ''بڑے مولوی صاحب'' کے انتقال کے بعد ہم نے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اسلامیہ کالج میں تبادلہ کرالیا اور گو

اسلامیہ کالجوں میں بھی ''ہیڈ مولوی'' ہوا کرتے ہیں مگر ان کا علم دین اتنا ہی ہوا کرتا ہے جتنا بی۔ اے میں عربی اور فارسی کورس اور اسی لیے تمام بی۔ اے پاس ہیڈ کلرک تو ہو جاتے ہیں لیکن کبھی قاضی یا مفتی ہوتے نہ سنا۔ بہر حال ہمارے اسلامیہ کالج کے ہیڈ مولوی صاحب یوں بھی ''خلافت'' کے جلسوں میں جانے سے منع فرماتے رہتے تھے، اس لیے چھٹی کے بعد بڑی آسانی سے ہاکی اور فٹ بال کی مشق کر لیتے تھے اور وہ جو کہا ہے کہ:

قطرہ قطرہ آپس میں ہو جاتا ہے دریا

سو تھوڑے ہی دنوں میں وہ ہاکی میں طاق ہو گئے اور ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد سے آج تک اس ''ہاکی'' کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ سال میں چھ ماہ گھر سے باہر رہتے ہیں اور جب تک ''ٹورنامنٹ'' میں رہتے ہیں ''ننھے کی اماں'' کے اس تقاضے سے محفوظ رہتے ہیں کہ ''خرچ ہو چکا''۔

الغرض طے پایا کہ 24 دسمبر کو ہماری ہاکی ٹیم لکھنؤ کے ''آل انڈیا رام لال ہاکی ٹورنامنٹ'' میں شریک ہوگی اور فی کس مبلغ 25 روپیہ خرچ ادا کرنا ہوگا۔ آپ ہی بتلائیے کہ پچیس روپیہ میں لکھنؤ ایسے شاہی شہر کی سیر ایسا کہاں کا گراں قیمت سودا تھا؟ لہٰذا خوشی خوشی گھر آئے اور ''ننھے کی اماں'' کو ذرا علاحدہ بلا کر کہا:

''ہم 24 کو لکھنؤ جا رہے ہیں۔ صرف پچیس روپیہ دے دو۔ ایک ہفتہ میں لوٹ آئیں گے اور سنو تمھارے لیے لکھنوی بالیاں بھی لیتے آئیں گے جو واللہ بہت ہی عمدہ ہوتی ہیں''۔

یہ ''بالیوں'' کا فقرہ اس لیے تھا کہ وہ زیور کا نام سن کر نرم ہو جائیں اور ہمیں سفر خرچ عطا فرمائیں، مگر نہ پوچھیے روپے کا نام سن کر ان کا کیا حال ہوا۔ چہرہ تو مغرب کے وقت کا پھولا ہوا شفق بن گیا۔ آنکھوں کی سرخی پر خون کا شک ہونے لگا اور غصہ کا یہ عالم کہ کوئی تین منٹ تک تو ہمیں گھورتی رہیں پھر بولیں تو یوں کہ:

''تمھارا لکھنؤ جائے... میں! یہاں تو یہ حال ہے کہ ننھے کی کھانسی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ جمیلہ کا بخار ہے کہ جانے کا نام نہیں لیتا۔ دو مہینے سے گلاب چند کی قسطیں ادا نہیں ہوئی ہیں۔ زیور ہے کہ سود میں گھل رہا ہے۔ میری ایک جان ہے، کیا کروں''۔

''ننھے کی اماں'' کا یہ وہ چاٹلا جواب تھا جو آج ہر ''ننھے کی اماں'' اپنے ''ننھے کے ابا'' کو

روپیہ طلب کرتے وقت دیتی ہے لیکن ہم کوئی پرانے فیشن کے "ننھے کے ابا" تو تھے نہیں اس لیے سگریٹ کو ہاتھ سے پھینک کر کہا "سنو جی! آخر تم ہماری "نیک بخت" ہو یا مشیر مال جو پچیس روپلی دینے میں اس طرح ڈانٹ ڈپٹ، غصہ، دھمکی، ترش روئی، تلخ گفتاری، تو تڑاق، کج روی، کج خلقی، بے مروّتی، طعن، ملامت، نصیحت، وعظ، تنبیہ، تخویف، جھونج اور تشدد سے کام لے رہے ہو تو پھر اس حساب سے ہم تو ہم تمھارے ننھے کے ابا کاہے کو رہے۔ خاصے عبداللہ ملازم ہو گئے"۔ مگر صاحب لاکھ ڈانٹو وہ پھر ٹھہریں "گھر کے لوگ" اور جن بھائیوں کو آج "گھر کے لوگ" حاصل ہیں وہ ان کی چالوں سے خوب واقف ہیں۔ ادھر بھائی "ننھے کی اماں" سے ہمیں یوں بھی محبت ہے کچھ کچھ اور ان سے ڈرتے بھی ہیں کچھ کچھ۔ دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھیں۔ نہ رہا گیا اور پھر سگریٹ اٹھا کر کہا:

"اچھا اچھا رہنے دو اپنے پچیس روپیہ۔ ہم یوں ہی چلے جائیں گے"۔ جواب ملا "مگر جاؤ گے ضرور!"

◆

مایوس ہو کر پہنچے سیدھے انہی کرم فرما کے پاس جس کی شفقتوں کے سہارے آج زندگی کے بقیہ دن گزار رہے ہیں۔ یہ کرم فرما حضرت گرامی سردار بہادر نصرت جنگ کرنل سید عبدالعزیز بادشاہ مرحوم، اے ڈی سی وائسرائے آف انڈیا و میر بخشی افواج بھوپال صاحبزادے عالی قدر لیفٹننٹ سید ابراہیم پاشا تھے جو برٹش انڈیا کے علمی طبقوں کی طرح ہمیں اپنے دل میں جگہ دے چکے ہیں۔ یہی اس لکھنؤ جانے والی ٹیم کے سرکردہ رکن تھے۔ فرمانے لگے:

"کہیے مولانا! لے آئے روپیہ؟"

ہم نے عرض کیا کہ روپیہ کیسا جان ہی سلامت لے آیا۔ اس پر پاشائے ممدوح نے اپنی دیرینہ شفقت سے کام لیتے ہوئے جیب سے پچاس روپیہ کا ایک نوٹ ہمیں دے کر فرمایا:

"جایئے اور جلد انتظام کیجیے"۔

اب جو گھر آئے تو ننھے کی اماں کو بلایا اور کہا:

تیار کرو پراٹھے۔

تیار کرو انڈے۔

تیار کرو حلوہ۔

تیار کرو کباب۔

تیار کرو مرغ۔

تیار کرو مچھلی۔

رکھ دو مولی۔

باندھو بستر۔

نکالو ہا کی شوز۔

باندھو ہا کی سوٹ اور نکر اور ٹائی۔

قریب تھا کہ ننھے کی اماں ہمارے ان زوردار احکام پر بھڑک اٹھتیں اور پھر کوئی بے طرح غزل سنا دیتیں کہ ہم نے فوراً پاشا صاحب کا نوٹ نکال کر بے وجہ دیکھنا شروع کیا تو ننھے کی اماں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ بس اب تو وہ ہماری ہی ہو گئیں۔ پہلے مسکرائیں پھر فرمایا اور بڑے پیار سے فرمایا ''دیکھیں یہ کیا ہے؟'' یہ کہا اور ہمارے ہاتھ کی طرف ہاتھ بڑھا کر فرمایا ''ہو تو بڑے وہ'' اس ترکیب کا مطلب صاف تھا کہ اب میں نوٹ کی وجہ سے تم سے بہت خوش ہوں۔ لاؤ اس میں سے کچھ ننھے کے لیے بھی دیتے جاؤ۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ابھی معاملہ اس حد تک پہنچا تھا کہ پاشا صاحب نے دروازہ پر سے کہا:

''اماں آتے بھی ہو یا نہیں؟''

بس نصیب دوستاں! ہم مع نوٹ کے باہر اور بے چاری ننھے کی والدہ...

◆

شام کو ''دہلی ایکسپریس'' سے روانگی تھی۔ اسٹیشن پر ٹیم کو رخصت کرنے معزز و مقتدر احباب جمع تھے۔ پاشا صاحب کو ہار پہنائے گئے۔ گو اس وقت ہم پاشا صاحب کے بالکل ہی پاس کھڑے تھے لیکن ہار پہنانے والوں کی نظر اتفاقاً چوک گئی اور ہم بغیر ہار کے ریل میں بیٹھ گئے اور جہاں تک یاد ہے تھرڈ کلاس میں نہیں بیٹھے تھے۔ جب ریل روانہ ہوئی تو احباب نے تالیاں بجائیں اور

رومال ہلائے تو ہم سمجھے کہ سوار ہونے میں ہم سے کوئی غلطی ہوگئی۔ اس لیے احباب مذاق اڑار ہے ہیں۔ مگر پاشا صاحب نے فرمایا کہ اب بجائے 'خدا حافظ'، 'خدا کی امان' اور 'فی امان اللہ' کہنے کے مسلمان رخصت کرتے وقت ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں، تب معلوم ہوتا ہے یہ سب تعلیم یافتہ ہیں۔

چونکہ سفر میں ہم مونچھوں کا معاملہ بھی طے کر دیتے ہیں۔ اس لیے فرنگی جل مانس ہمیں ''کالا آدمی'' نہیں کہتے اور خاصا کرسٹان سمجھ کر ٹکٹ کا سوال بھی نہیں کرتے اور ریل میں کرسٹان بن جانے سے ایک یہ فائدہ بھی ہے کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر اُس ڈبے میں بیٹھ جاتے ہیں جو فرنگی رعایا پروری اور مساوات نوازی کی رو سے صرف ''فار یورپین اینڈ اینگلو انڈین'' خالی پڑا رہتا ہے، مگر اس میں اپنے ہندستان کا کوئی کالا آدمی نہیں بیٹھ سکتا چاہے وہ گاندھی جی ہی کیوں نہ ہوں اور اسی لیے ایسے مواقع پر ہم اپنا نام بھی ''جی آئی پی''، ''مارشل لاء'' وغیرہ بتلاتے ہیں۔ کیوں کہ آج کل کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان ایسے ہی نام رکھتے ہیں۔

ناگاہ ایک اسٹیشن پر ریل گاڑی کھڑی ہوگئی۔ ابھی ''گاڑی تین منٹ ٹھہرے گی'' کی پہلی صدا اسی تھی کہ آ گئے دس بارہ ننگ دھڑنگ سادھو اور دروازہ پکڑ کر کہنے لگے:

''مہاراج بھوک کے مارے ہیں، گرم کپڑا نہیں، ٹکٹ کے دام نہیں، کانپور تک جانا ہے۔ اپنے ڈبے میں بیٹھ جانے دو...''

ابھی ان بیکس ہندستانیوں کی استدعا پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ آ گئے فرنگی گارڈ صاحب اور لال جھنڈی کا ڈنڈا رسید کر کے ان لوگوں سے فرمایا ''بھاگو ڈیم ٹیسن کا بار'' (اسٹیشن سے باہر) مگر اف ری ہندستانیوں کی بے کسی کہ ڈنڈا کھا کر بھی یہ ہندو سادھو گارڈ صاحب کے قدموں پر گرنے لگے کہ آ ہی تو پہنچے ہندستانی نسل کے ریلوے پولیس مین صاحب اور ڈنڈا تان کر ان تمام ہندو سادھوؤں کو ہانکنا شروع کر دیا اور اس پر بھی ''تمھاری... اور تمھاری... بھلا تمھاری... اور اب تمھاری...'' بھی سناتے جاتے تھے۔ گویا یہ ہندی نسل پولیس والے اپنے محتاج ہم قوم اور ہم وطن گداگروں کو اس شدت سے کیا ہانک رہے تھے خود کو دکٹوریہ کراس کا مستحق بنا رہے تھے، لیکن اس سے ہوتا ہی کیا تھا؟

جس اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری ہندستانی افلاس کے ماروں کا یہی ہجوم پایا اور کوئی اسٹیشن نہ ملا جہاں ریلوے ملازمین کی آوازوں کے ساتھ ایک آواز ''بھلا ہو مہاراج'' کی نہ آئی ہو۔

اب صبح ہوئی تو ہندو بھائیوں نے اٹھتے ہی ''رام رام'' کہا۔ گاڑی ٹھہری تو لوٹے ہاتھ میں لے کر نل پر گئے اور اسٹیشن پر لگے ہوئے پیپل کے درخت پر پانی ڈالا۔ مذہبی بھجن پڑھے اور اس طرح صبح کی عبادت سے فارغ ہو کر ڈبے میں آبیٹھے، لیکن ہم اٹھے تو صرف ایک مرتبہ تو کہا ''لا الہٰ الا اللہ'' اور پھر فوراً ایک سگریٹ پیا، بکس سے تولیہ، صابن، استرا اور پاؤڈر لے کر ریل کے غسل خانے میں گئے۔ داڑھی مونچھوں کا حساب صاف کیا۔ نہائے اور نیا سوٹ بدل کر آگئے اور دوستوں سے انگریزی زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ گویا ہم نے صبح صرف لفظ لا الہٰ ایک مرتبہ پڑھ کر خدا کے تمام عباداتی احکام کی تعمیل کر دی، مگر مجبور تھے کیوں کہ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے مسلمان مسافر صبح اٹھ کر صرف اتنا ہی کام کرتے ہیں۔ یہ تو فقط دیوبندی ہوتے ہیں کہ سفر میں قرآن مکرم کی تلاوت اور نماز سے نہیں چوکتے۔

ایک اسٹیشن پر دیکھا کہ چند مسلمان پولیس والے ایک محتاج ہندستانی مسلمان کے ہاتھ پاؤں زنجیر سے باندھے کھڑے ہیں اور زنجیر اس درجہ سخت باندھی ہے کہ وہ حرکت بھی نہیں کرسکتا۔ اگر اسے اپنے منہ تک ہاتھ لے جانے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ بجائے ہاتھ کے اپنے منہ کو کسی اور چیز سے جانور کی طرح رگڑ لیتا ہے۔ پھر اس شدید جکڑ بند پر اس کے سر پر اس کا وزنی بستر بھی رکھوایا گیا تھا جو اس سے کسی طرح نہیں سنبھلتا تھا، مگر سنبھالے ہوئے تھا اور چہرہ سے فاقہ کی علامتیں ظاہر تھیں۔ نہ رہا گیا۔ جا کر پولیس کے ان ہندستانی بھائیوں سے کہا کہ آپ نے اس بے کس انسان کو انسان ہو کر کیوں اس درجہ شدت سے جکڑا ہے؟ تو جواب ملا اس نے ایک مسافر کا لوٹا چرالیا ہے۔ ہم نے ''چور'' سے سوال کیا کہ کیوں بھئی تم نے لوٹا کیوں چرایا؟ اس پر ملزم رو کر کہنے لگا:

''حضور بے روزگاری کا دورہ ہے۔ اچھے اچھے لکھے پڑھے مارے پھرتے ہیں۔ نہ سفارش کام کرتی ہے اور نہ مزدوری ملتی ہے۔ بیوی بچوں کا ساتھ ہے۔ بھوکا تھا اس لیے یہ حرکت کی''۔

اس جواب پر ہم نے ان خالص ہندستانی پولیس والوں سے کہا ''کیوں بھائیو! اگر صرف

ایک لوٹا چرا لینے پر آپ اس مظلوم کے صرف ایک ہی زنجیر ڈال دیتے تو کیا یہ افغانستان بھاگ جاتا؟''۔

اس پر ملزم نے پھر رو کر کہا:

''ارے حضور آپ نے تو ابھی زنجیر ہی دیکھی ہے۔آپ میرے کپڑے اٹھا کر دیکھیے، رات بھر حوالات میں مجھے جانور کی طرح پیٹا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ میں ان کا قومی اور ملکی بھائی ہوں''۔

یہ سن کر ہم نے کہا ''اچھا ہی ہوا کہ ہندستانیوں کو سوراج نہ ملا''۔

کانپور کا اسٹیشن آیا تو یہاں سے فروٹ، سگریٹ اور پانیئر اخبار خریدا اور گو اردو اخبار بھی فروخت ہو رہے تھے مگر ان پر اس لیے نظر تک نہ ڈالی کہ وہ تھے ہمارے ملکی اور قومی اخبار اور اپنی مادری زبان کے اخباروں کو فرسٹ اور سیکنڈ کلاس میں بیٹھ کر پڑھنا صریح ''انسلٹ'' ہے اور کمپارٹمنٹ کی توہین! اور ہیٹ کی ہتک۔

لکھنؤ پہنچے تو احباب کی جماعت نے شاندار استقبال کیا۔ چیف کمشنر لکھنؤ دورہ پر گئے ہوئے تھے، اس لیے ہمارے استقبال میں شریک نہ ہو سکے۔

شام کو کھیل تھا اس لیے دن بھر تیاری میں مصروف رہے۔کبھی دعا کی، کبھی وظیفہ پڑھا اور ضبط نہ ہوا تو لکھنؤ کے مشہور ''پیر جی عامل'' کے پاس پہنچے جو صرف اڑھائی روپیہ کے تعویذ سے معشوق اور وائسرائے ہند تک کو تابع فرمان بنا کر چھوڑتے ہیں۔تعویذ لیا تو اطمینان ہوا کہ اب فتح ہماری ہے۔ فیلڈ پر پہنچے تو دیکھا کہ آل انڈیا کے چیدہ کھلاڑی جمع ہیں اور تماشائیوں کی بھی کمی نہیں۔

ہندستانی ٹورنامنٹ اور انگریزوں کی ٹورنامنٹ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ انگریز تماشائیوں کے لیے کافی کرسیوں اور گیلریوں کا انتظام کرتے ہیں اور تماشائی پورے سکون سے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب کوئی کھلاڑی گیند لے کر بھاگتا ہے تو انگریز مرد اور عورتیں صرف تالیاں بجا دیتے ہیں لیکن ہندستانی ٹورنامنٹ میں یہ ہوتا ہے کہ بعض اہلِ محلہ سے کرسیاں عارضی طور پر لے لی جاتی ہیں اور وہ بھی صرف چند مخصوص احباب کے لیے۔باقی تمام تماشائی فیلڈ کے چاروں محاصرہ کر کے

ایک کے اوپر ایک کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی ٹانگوں میں سے سر نکال کر دیکھتا ہے، کوئی دھکا دیتا ہے، کوئی کاندھے کو چیرتا ہے، کوئی کمر پر زور دے کر دو زانو کھڑا رہتا ہے اور بعض منچلے پاس کے درختوں پر چڑھ کر مزے سے محو نظارہ ہوتے ہیں اور جب کوئی کھلاڑی گیند نکال لے جاتا ہے تو داد یوں دی جاتی ہے:

''واہ بھائی! واہ رے وا! ہاں لینا! لگے! مارے! ڈٹے رہو! چل چل! بڑھ! توڑ دے ٹانگ! دے اسٹک! مار مار! ہاں یہ یہ! ایک اور! دے بڑھ کر! نوچ لے کرتا! پھاڑ دے سر! چھین لے اچکن!'' وغیرہ۔

لیکن یہاں تھا معاملہ لکھنؤ کا، اس لیے چاروں طرف سے ''ہاں حضرت! بڑھنا حضرت! لینا حضرت! واللہ حضرت! باللہ حضرت!'' کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ الغرض ان حالات کے ساتھ ہماری ٹیم کا پہلا میچ ''بنگال ینگ مین بی'' سے شروع ہوا۔ اس وقت دیکھتا کوئی ہماری ''سلطانیہ پائنیر ٹیم'' کے جوانوں کو جن میں کا ہر ایک ماشاء اللہ کچھ اس درجہ مستعد اور ذی حوصلہ تھا کہ فیلڈ والوں نے دیکھتے ہی فیصلہ کر دیا کہ یہی جیت جائیں گے۔ مگر ابھی کھیل شروع ہوا ہی تھا کہ بنگال ینگ مین کے کھلاڑی کا ایک ہاتھ ہماری پنڈلی پر کچھ اس خوبصورتی سے پڑا کہ ہم نہایت انکسار سے شہنشاہ تیمور بن کر فیلڈ کے کنارہ پر جا بیٹھے۔ ہماری اس حالت کو دیکھ کر ہماری ٹیم والوں نے اس جرأت اور تیزی سے کھیل شروع کیا کہ مسلسل سات نو سے ینگ مین بی کو گھر جانے پر مجبور کر دیا۔

دوسرا میچ لکھنؤ ''بنگال ینگ مین اے'' سے شروع ہوا۔ اس میں چند سفید رنگ کے بزرگ شریک تھے۔ خصوصاً مسٹر ہابل جو کبھی ہارنا ہی نہیں جانتے تھے۔ مگر سلطانیہ پائنیر کے مسٹر سعید بھی ایک ہی کھلاڑی ہیں۔ چونکہ ینگ مین اے نے ہمیں چار گول سے شرطیہ شکست دینے کا دعویٰ کیا تھا اس لیے بھائی سعید کو آ گیا تاؤ اور انھوں نے باقاعدہ طور پر ایک ہاتھ جو رسید کیا تو حضرت سلامت فیلڈ پر لیٹے ہوئے نظر آنے لگے۔ ادھر مسٹر نعمت اللہ خاں جمعدار نے بڑی سرعت سے گول کر دیا تو ینگ مین اے کے تمام بھائی بند حیران ہو کر ایک سو کی شکست سے اپنے وطن واپس ہو گئے۔

تیسرے میچ میں مسٹر منظور حسین کی برکت سے کامیابی حاصل ہوئی۔ کیوں کہ انھوں نے کارنر سے ایسا بے نظیر گول نکالا کہ سبحان اللہ! آج آخری میچ تھا مگر اس ٹیم کے ارکان چونکہ مسلمان تھے اور ہم بھی مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں اس لیے کھیل میں ہنگامہ آرائی کے مقابل محبت و اخوت کے مناظر آرہے تھے۔ پھر بھی کھیل نہایت شدت سے ہو رہا تھا، خصوصاً پاشا صاحب اور مسٹر عبدالمجید صاحب کا کھیل نمونہ تھا۔ یہ میچ ''رودرس'' کلب سے تھا جس میں نہایت نامور کھلاڑی شریک تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا وقت گزر گیا لیکن دونوں ٹیمیں برابر رہیں اور آخر میں جو وقت ملا اس میں جب رودرس ٹیم گیند ہمارے گول کے قریب لائی تو سلطانیہ پائنیرؔ والوں اور رودرس والوں کو دھوکا ہو گیا کہ وسل ہو گئی تو دونوں ٹیموں کے کھلاڑی رُک گئے، لیکن رودرس کے ایک کھلاڑی نے بڑھ کر گیند کو گول سے نکال دیا اور لوگوں نے شور مچا دیا کہ ہم پارسال ضرور کپ لے جائیں گے انشاء اللہ!

کھیل کے بعد سلطانیہ پائنیرؔ والوں کو ہار پہنائے گئے اور انعام میں شیلڈ دی گئی۔

پاشا صاحب قبلہ کو فرسٹ میڈل ملا۔ ہمارے انعام کا معاملہ ابھی عدالت کے زیر غور ہے۔

بہر حال سلطانیہ پائنیرؔ کی اس بے مثل شہرت، مقبولیت اور بے نظیر کھیل پر ٹیم کے سرپرست عالی جناب کرنل انعام اللہ خاں صاحب بہادر کمانڈر آفیسر سلطانیہ پائنیرؔ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں جن کے حسن خلوص اور سرپرستی سے یہ ٹیم اس درجہ ترقی پر پہنچی۔ اسی طرح ہم رام لال ٹورنامنٹ کے بانی حضرت ڈاکٹر چکرورتی کے حسنِ اخلاق کے شکر گزار ہیں۔

آئندہ کسی اشاعت میں ہم انشاء اللہ سلطانیہ پائنیرؔ کے آل انڈیا آغا خاں ٹورنامنٹ کی شرکت کے حالات پیش کریں گے بشرطیکہ ہماری ٹانگ پر پھر کوئی اِسٹک نہ پڑے۔

مشاعرہ کا علی گڑھ

وہ جو اخباروں میں اعلان ہوا تھا کہ ''مشاعرہ میں علی گڑھ'' ہونے والا ہے، سو وہ 29 و 30 نومبر کی راتوں میں علی گڑھ کالج کی ''المعروف بہ یونین'' میں بپا ہو گیا۔ یہ اعلان چونکہ ادبیات اردو کے دیرینہ محسن حضرت قبلہ مارہروی احسن صاحب مدظلہ کی طرف سے کیا گیا تھا، اس لیے جب ہم مشاعرہ میں داخل ہوئے تو ممدوح صدارت کی کرسی سے کرسی ملا کر بیٹھے نظر آئے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ دور بیٹھنے والے کبھی کبھی آپ ہی کو صدر صاحب سمجھ لیتے تھے۔ ایک صاحب نے محض اتنی سی بات پر صدارت کی کرسی سے اپنی کرسی ملائی تھی کہ شعرا سے غزلیں لے کر ایک کے اوپر ایک کر کے رکھتے جائیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ کو اس کا حق تھا۔

◆

اصولاً ہر شخص کو امید تھی کہ اس عظیم الشان مشاعرہ کے صدر بھی کوئی عظیم الشان سلطان الشعرا ہی ہوں گے اور ہوا بھی یہی کہ مولانا حسرت موہانی کو صدارت دی گئی، لیکن خدا جانے وہ کس ''مشق سخن'' اور ''چکی کی مشقت'' کے باعث تشریف نہ لا سکے تو صدارت کا معاملہ محترم پرنسپل صاحب کو پیش کیا گیا اور ''معتبر ذرائع'' سے اطلاع ملی کہ عالی جناب پرنسپل صاحب نے صدارت سے صاف انکار کر دیا، لیکن جب ممدوح کو ہر طرح مجبور ہی کر دیا تو آپ نے بھی جھنجھلا کر افتتاحی

تقریر انگریزی زبان میں کرڈالی۔

◆

مشہور اور قابلِ ذکر لوگوں میں سب سے زیادہ ہم خاکسار ملا رموزی، ابوالاثر جالندھری حفیظ صاحب ایڈیٹر 'مخزن' لاہور، مرادآبادی مولوی بدر جلالی بی اے، ایڈیٹر اخبار مدینہ بجنور، مرادآبادی حضرت جگر، اکبرآبادی حضرت سیماب ثم الاکبرآبادی حضرت ساغر، حضرت دہلوی ساحر، حضرت مرزاپوری صفدر صاحب، حضرت ہاپوڑی اطہر صاحب، حضرت بی اے ایل ایل بی شاد صاحب، کالج اور یونیورسٹی کی سمت سے حضرت رشید احمد صدیقی ایم اے ایڈیٹر سہیل، حضرت پروفیسر حاذق، حضرت جلیل قدوائی بی۔ اے، حضرت مسعود ذوقی بی۔ اے وغیرہ خاص تھے۔ بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ ان میں سے ہر شخص نے حسبِ توفیق گا کر غزل پڑھنے کی کوشش کی۔ صرف قبلہ احسن صاحب نے اس حرکت سے اظہارِ بے بسی فرمایا۔

◆

کالج کے آئین وضوابط میں آیا ہے کہ جلسہ کے شروع میں قرآنِ محترم کی تلاوت ہو لہٰذا عالی قدر صدر نے تلاوتِ قرآن کا اعلان فرمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند موچھیں منڈے طلبا کو بھی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا پڑا۔ قاری صاحب کا شاید آموختہ کچا تھا، اس لیے وہ جو ایک جگہ بھولے تو قبلہ احسن صاحب نے بھی لقمہ دینے میں کمی نہ کی۔ پہلے کالج کے طلبا نے غزلیں پڑھیں جو بہ مقدارِ علم اچھی تھیں۔ ایک طالب علم جو اب تک کالج بھر میں صرف مولانا محمد علی شوکت علی اور ظفر علی خاں ہی کو 'مایۂ ناز' سمجھے ہوئے ہیں، ایک غلط شعر پڑھنے پر روک دیے گئے، جس میں ''غلام السیدین'' کا وزن غلط تھا۔

◆

کالج اور یونیورسٹی کے لوگوں میں حضرت مسعود ذوقی، حضرت جلیل قدوائی، حضرت حاذق صاحب پروفیسر اور حضرت قبلہ احسن صاحب کا کلام بے حد پسند کیا گیا۔ اس کے بعد مہمان شعرا کی باری آئی اور سب سے پہلے وہی ''اودھ کے اہلِ زبان'' لوگوں کی یادگار کے طور پر حضرت زرّہ کانپوری کام آئے جنھوں نے پہلے اپنے پاس ایک مرادآبادی اُگالدان اور ایک گلاس پانی رکھوالیا

اور بجائے کرسی زمیں دوز ہوکر بیٹھ گئے اور معاً اچھل پڑے یعنی مطلع ارشاد فرمایا اور تمام اشعار میں کودتے رہے۔ ایک جگہ جیب سے تمغہ بھی نکال کر ڈال دیا جس کے یہ معنی تھے کہ مجھے سمجھا کیا ہے؟ مگر لوگوں کی بے مروّتی دیکھیے کہ کسی نے اس تمغہ پر نظر بھی نہ ڈالی اور ممدوح کمبل سنبھال کر اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔

◆

گانے والے شعرا میں وہی جو مقبولِ عالم جنتری کی طرح مشہور ہیں۔ نہایت آن بان سے اسٹیج پر تشریف لائے۔ نظم ارشاد فرماتے وقت کہیں کہیں اکڑ کر خاص دوست کو نام لے کر پکارتے اور ڈانٹ ڈانٹ کر پڑھنے کی خدائی فوجداری کی مزید توفیق بھی صرف آپ ہی کو حاصل تھی۔ پھر طرفہ یہ کہ آپ ''موسمی حوائج ضروری'' سے بھی مرتب ہوکر تشریف لائے تھے۔ چنانچہ کرسی پر جو آپ آئے تو نصف سگار پیتے اور بغیر پہنے گرم دستانے اس طرح ہاتھوں میں لیے ہوئے تھے گویا کہیں کے بڑے ہی ''ہز میجسٹی'' ہیں جو اپنے اسٹیچو کے لیے تصویر کھنچوانے جا رہے ہیں۔ پھر کمال یہ کر دکھلایا کہ نظم سے پہلے دو چار رٹے ہوئے الفاظ کی معرکتہ الآرا تقریر بھی کی۔

◆

جناب مذکورہ کے بعد حضرت جالندھری حفیظ صاحب کا نام ناگاہ جو پکارا گیا تو حاضرین میں ہندو مسلم فساد کے رنگ کا شور پیدا ہوا اور جس وقت حفیظ صاحب نے اپنا باسی کلام تازہ لے میں ارشاد فرمایا تو تحسین و آفریں کے نعروں میں اصل کلام سننا محال تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ پر بے چین تھا، مگر وہ جو کہا ہے کہ:

''خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد''

تو کالج کے ایک نوجوان پروفیسر بھی تھے جو ٹس سے مس تک نہ ہوئے البتہ کہیں کہیں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ گویا ان کے سامنے ان کے اہل و عیال کھیل رہے تھے اور وہ مارے بزرگی کے ان کی طرف سے اعراض فرما رہے تھے۔

◆

گانے والے شعرا میں حضرت سیماب اکبر آبادی، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری کا کلام

نہایت درجہ پسند اور مقبول ہوا۔ خدا اپنے بڑے مولوی صاحب کو ان حرکات سے محفوظ رکھے۔
دوسری رات کو عالی مرتبہ صدر نے بے حد تپاک اور مہربانی سے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور مہمانوں کی طرف سے بغیر مشورہ کیے حضرت بدر جلالی ایڈیٹر مدینہ جہاد کے لہجہ میں کالج کا شکریہ ادا کر کے معاملہ طے کر دیا۔ مشاعرہ کو کامیاب بنانے کے لیے حضرت گرامی قدر قبلہ مولوی احسن صاحب مارہروی، محترم پرنسپل صاحب کالج اور تمام چائے پلانے والے حضرات حامیانِ اردو کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

◆◆◆

نکات ولطائف

تمام دنیا کی شہری آبادی کا امن اسی وقت برہم ہوتا ہے جب شہر کا افسر اعلیٰ ظالم ہو یا اس شہر میں مارشل لا کا نفاذ ہو جائے یا کوئی ہنگامہ ہو یا کوئی غنیم حملہ آور ہو، لیکن دنیا یہ سن کر کیا کہے گی کہ براعظم ہندستان کے دارالحکومت عرف دہلی کا امن برہم ہو رہا ہے گائے بیلوں سے؟ چنانچہ اس سے قبل اسی دہلی میں سانڈوں کے ایک شورش پسند گروہ نے بازار پارچہ فروشی میں اطلس، کمخواب اور ریشم کے ہزاروں روپے کے کپڑے تباہ کر ڈالے، مگر پولیس ان سانڈ ملزمین میں سے ایک کو بھی اب تک گرفتار نہ کر سکی تھی کہ پھر 24 رجولائی کو بازار بلی ماران میں ان سانڈ لوگوں کا معرکہ بپا ہوگا جس کی وجہ سے نصف گھنٹہ تک راستہ بالکل رکا رہا اور الجمعیۃ کے نامہ نگار کے الفاظ میں خطرہ کی وجہ سے لوگ باگ دونوں طرف رُکے رہے۔

◆

بارے خدا خدا کر کے جب ایک سانڈ کو شکست فاش ہوئی اور وہ دفتر اخبار الامان کی طرف پسپا ہوا تب کہیں دفتر اخبار الجمعیۃ کی طرف سے پناہ گزیں چلنے پھرنے کے قابل ہو سکے۔ واقعی ہم نے قیامِ دہلی کے زمانہ میں بہ چشم خود دیکھا ہے کہ جب ان سانڈ حضرات کا کوئی عظیم الشان دنگل وسط بازار میں شروع ہو جاتا تھا تو باشندگانِ دہلی ایک کے اوپر ایک ہو کر دکانوں میں پناہ تو لیتے تھے

مگر مارے خوف کے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکتے تھے اور ان لوگوں کے بیچ بچاؤ یا صلح و مصالحت کی تمام ذمہ داری پولیس پر چھوڑ دی جاتی تھی، لیکن رہ روانِ دہلی کی اس وحشت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پولیس سے کسی قسم کی شکایت اس لیے بے کار معلوم ہوتی ہے کہ آخر کو پولیس بھی دہلی ہی کی ہے، اس لیے دعا ہے کہ خدا ان مردم خوار سانڈوں سے ساکنانِ دہلی کو جلد نجات دے، مگر کیوں صاحب اگر ان سانڈوں کا کوئی معرکہ شہر لکھنؤ میں واقع ہو جائے تو باشندگانِ لکھنؤ کا مارے خوف کے کیا حال ہو؟

◆

پھر بھی ہم کوتوال صاحب دہلی سے بہ ادب سوال کریں گے کہ آخر جناب والا کی یہ سانڈ پروری اور سانڈ نوازی کب تک؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان سانڈ لوگوں کی شورش سے ساکنانِ کلیجے منہ کو آرہے ہیں۔ پس ضرورت ہے کہ آپ ان سانڈ لوگوں کی تنبیہ کے لیے ایک ہفتہ کا اس طرح نوٹس دے دیجیے کہ:

> ''ہرگاہ تمھاری شورش پسندی دہلی کی غیر مصافی آبادی کے حق میں نہایت مضرت رساں ہے لہٰذا تم کو ذریعہ ہٰذا مطلع کیا جاتا ہے کہ تم ایک ہفتہ کے اندر شہر دہلی کو خالی کردو ورنہ پولیس چالیس گز کے فاصلہ سے تمھارے اوپر ہوائی فائر کرنے پر مجبور ہو جائے گی پھر ہم نہیں جانتے کہ گولی تمھارے سر یا سینہ میں لگ جائے''۔

امید ہے کہ پولیس کے اس نوٹس پر یہ سانڈ حضرات باز آجائیں گے ورنہ پھر اپنے سر مائیکل اوڈوائر صاحب سے اس باب میں مشورہ لینا پڑے گا۔ اللہ پاک ان سانڈ درندوں سے اپنے دہلی کے تمام بندوں کو محفوظ رکھے۔ افسوس تو یہ ہے کہ دہلوی خلافت کمیٹی کے رضا کار اور سیوا سمیتی کے والنٹیئر بھی اس خطرہ سے لوگوں کو بچانے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔

◆

دہلی کے اس سانڈ شاہی عہد میں یہ خطرہ نہایت گراں ہے کہ اگر کسی دن یہ سانڈ حضرات کسی دہلوی اخبار اور مطبع کے بیچوں بیچ زور آزما ہو گئے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اخبار اور مطبع کے ارکان مارے خوف کے دونوں طرف رُکے رہیں اور اس دن کا اخبار ہی شائع نہ ہو سکے؟ کیوں کہ اب تو

دہلوی اخبارات کو یہ عذر ساتڈ یا نہ ہاتھ آگئی ہے اور وہ دوسرے دن اعتذار کی جلی سرخی کے ساتھ یہ لکھ سکتے ہیں کہ چونکہ دو ساتڈ مین دفتر اخبار کے سامنے بری طرح گتھ گئے تھے اس لیے کل کا اخبار شائع نہ ہو سکا، آئندہ اشاعت میں اس کی تلافی کردی جائے گی، ناظرین اور ایجنٹ حضرات معاف فرمائیں۔

کالا آدمی

جنوبی افریقہ میں گول میز کانفرنس کیجیے چاہے کوہ ہمالیہ پر بیٹھ کر تالیاں بجایئے یہ جو ہندستان کے تیس تیس کروڑ انسان ''کالا آدمی'' ہو چکے سب اب سفید نہیں ہو سکتے۔ یقین نہ ہو تو شریک ہو جایئے وائسرائے کے استقبالی ہجوم میں۔ جمع ہو جایئے کسی بازار میں اور مجمع کیجیے کسی ریلوے پلیٹ فارم پر۔ بس ایک انگریز صاحب آئیں گے اور ''اے کالا آدمی'' کہہ کر آپ کو ہٹا دیں گے، علاحدہ کر دیں گے اور کبھی آپ کے اوپر سے گھوڑا دوڑا کر منتشر کر دیں گے مگر یہ کبھی نہ کریں گے کہ ''کالا آدمی'' سمجھ کر ریل کا کرایہ، لفافوں کی قیمت یا میونسپل ٹیکس آپ سے کم کر لیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انگریزوں نے ہندستانیوں کا تخلص ''کالا آدمی'' ہی کیوں رکھا؟ اس کا جواب قادیان کے مسیح موعود نے یہ دیا ہے کہ جب کہ ہم ہندستانی پانی پت کے میدان میں انگریز بھائیوں کے مقابلہ سے بھاگ چکے تو اب انگریز ہو گئے ''اولی الامر منکم'' لہٰذا اب ان پر کوئی اعتراض، سوال، تنقید غرض سب کچھ حرام ہے، لیکن ان تمام وجوہ کو ہم نے رد کر دیا اور فکر باقی ہی رہی کہ آخر کالا آدمی کسے کہا جاتا ہے، تو ایک علی گڑھی فرمانے لگے:

کالا آدمی وہ جو کسی عہدہ کا چارج لیتے ہی اپنے ہم قوم ماتحتوں کا گلا کاٹے۔

جو ہندستانی ہو کر بھی کتا اور میم ساتھ رکھے۔

جواردو جانتے ہوئے بھی خواہ مخواہ انگریزی بولے اور لکھے۔

جوایف اے پاس ہوکر بھی رشوت کے لیے پولیس میں نوکری کرے۔

جوایل ایل بی ہوکر مسلمانوں کومقدمہ بازی میں پھنسائے۔

جوعلم دین کی تکمیل کیے بغیر اخبارات میں قرآنی آیات سے بحث کرے۔

جونظام حیدرآباد کی مخبری کرے۔

جواپنے گھر میں نااتفاقی کی آگ لگا کر ابن سعود کی اصلاح کو دوڑے۔

جولیڈر بھی ہواور کونسل کا ممبر بھی۔

جونفس کش صوفی بھی ہواور موٹا تازہ بھی۔

جوقومی جلسوں میں بیٹھ کر روتا بھی ہواور سی آئی ڈی بھی۔

جوزنانہ رسالہ کا ایڈیٹر بھی ہواور بداطوار بھی۔

جومولانا بھی ہواور بے نمازی بھی۔

غرض کالا آدمی کے اس قدر معنی بیان کرنے پر بھی جب ہمیں یقین نہ آیا تو خدا نے ایک غیبی ترکیب سے ہمیں ''کالا آدمی'' دکھادیا جو کسی قدر رقصہ طلب ہے۔

◆

وہ جو کہا ہے کہ ''پاؤں میرے کو لنگڑا اپنی نہیں اور ملک خدا کا تنگ نہیں ہے'' سو اس خالص فارسی مثل کے موافق ہم ''تلاشِ معاش'' میں چلے جارہے تھے۔ ناگاہ ایک اسٹیشن پر ہماری ریل کھڑی ہوگئی کیا دیکھتے ہیں کہ چلے آرہے ہیں۔ حال یہ کہ تھے تو قوم کے صرف غلام ہندستانی لیکن محض انگریزی پڑھ لینے کی وجہ سے دماغ آسمان پر اور مزاج عرش پر تھا۔ کوئی اڑھائی سو روپیہ کا سوٹ، سیاہ بوٹ، آنکھوں پر چشمہ اور ہاتھ میں چھڑی، مگر آپ کہ خرچ سے تھے تنگ، اس لیے ملازم نے بستر رکھ دیا تھرڈ کلاس میں اور جب گاڑی روانہ ہونے لگی تو لنک گئے بے چارے تھرڈ کلاس میں، مگر ڈبے میں داخل ہوتے ہی ہم مسافران کوئے تھرڈ کلاس پر گلیڈ سٹونی نظر ڈالی اور بیٹھ گئے ایک کسان کی کمر سے کمر جوڑ کر۔ البتہ انداز نشست بتا رہا تھا کہ سر آسٹن چیمبرلین وزیر خارجہ برطانیہ جمعیۃ الاقوام میں بیٹھے کسی اہم بین الاقوامی معاہدہ کو مرتب فرمارہے ہیں، جس میں

ہم ایشیا والوں کو ہر طرح ذلیل رکھنے اور ذلیل سمجھنے کی دفعات زیرِ غور ہیں۔ نہ رہا گیا تو ان کے ملازم کو علاحدہ بلا کر دریافت کیا کہ آخر یہ حضرت ہیں کون؟ ملازم نے ان کا تعارف جن الفاظ میں کرایا وہ یوں ہے کہ:

''جنابِ من تسلیم!

یہ حضرت یوپی کے ایک گاؤں کی پیداوار ہیں۔ ایف اے تک اس طرح تعلیم پائی کہ قومی چندہ سے آپ کو تعلیمی وظیفہ ملتا رہا۔ ایف اے کے بعد ایک بڑے شخص نے آپ کی سفارش کر دی تو آپ ہو گئے ایک افسر۔ بس افسری کا ملنا تھا کہ آپے سے باہر ہو گئے۔ ہندستانیوں سے بات کرنا ترک کر دیا۔ سلام کا جواب ایک انگلی سے دینے لگے۔ اردو زبان ہمیشہ کھڑی ترچھی یا آڑی بولتے تھے۔ نماز کے وقت ٹینس یا کرکٹ کھیلتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ پر قہرِ الٰہی کا نزول شروع ہوا اور ایک رشوت کے مقدمہ میں آپ تین سال سے بر طرف پھر رہے ہیں اور گو آپ ایف اے ہیں لیکن کہیں جگہ نہیں ملتی۔ مجھے صرف ایک مہینہ کے لیے ملازم رکھ لیا ہے تا کہ پردیس گردی میں آپ کی شان قائم رہے''۔

ان حالات کو سن کر ہمیں ان سے گفتگو کرنے کا بے حد شوق پیدا ہوا، مگر ان کی ظاہری اکڑفوں کو تباہ کرنے کی بھی فکر ہوئی۔ خدا کا کرنا ایسا کہ ایک جگہ ریل میں کسان بھائیوں کی غیر معمولی درآمد برآمد سے آپ تنگ ہو کر ہمارے پاس ہی آ بیٹھے۔ اِدھر ہمارے سفر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم سیٹ پر ایک لحاف بچھا لیتے ہیں پھر اس پر آہستہ آہستہ لیٹنا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں اس پوری نشست کے اسی طرح مالک بن جاتے ہیں جس طرح یہ انگریز بھائی تجارت کے بہانے رفتہ رفتہ ہر ایشیائی ملک کے مختارِ کل۔ پھر یہی نہیں کہ صرف سیٹ پر ہی قبضہ کر لیتے ہیں بلکہ ہر بیٹھنے والے کو بدتر از بی۔ اے پاس سمجھتے ہیں اور چہرہ کو اس وجہ غضب ناک بنا لیتے ہیں کہ اکثر سر میں درد پیدا ہو جاتا ہے اور آنکھیں پیے بغیر ہی لال رہا کرتی ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مارے خوف کے ایک کے اوپر ایک تو بیٹھ جاتے ہیں لیکن ہمارے پاس بیٹھنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی اور ہم تمام راستہ آرام سے سوتے چلے جاتے ہیں، لیکن اب جو مذکورہ بالا ہمارے بالکل پاس ہی آ بیٹھے تو جی میں تو آیا کہ آپ کو خیرآبادی شاعر کا یہ

مصرع سنا دیں کہ:

تم اپنا منہ اُدھر کرلو ہم اپنا منہ ادھر کرلیں

لیکن محض تہذیب کے خیال سے انھیں مرعوب کرنے کی ترکیب یہ نکالی کہ اپنا بکس کھولا اور کوئی دس بارہ اخبار انگریزی زبان کے نکال کرالٹے سیدھے پڑھ ڈالے۔ پھر یہ کیا کہ واٹرمین فونٹین پین نکال کر ذرا ان سے قریب ہو گئے تاکہ یہ ہماری فی البدیہہ انشا پردازی سے ہماری علمی قابلیت کا بھی اندازہ کرلیں۔ یہ کرکے ہم نے فوراً عنوان لکھا ''گورنمنٹ جابر ہے''۔ گورنمنٹ کو نکال دو، گورنمنٹ کو قید کردو وغیرہ۔ بس ان عنوانوں کا پڑھنا تھا کہ بھائی صاحب کے حواس جاتے رہے۔ سانس پھول گیا۔ جسم کے بال کھڑے ہو گئے اور گھبرا کر بولے ''جناب کا نام؟'' ہم نے کہا ''خاکسار کا نام ضیاء الملک حضور ملا رموزی فاضلِ الٰہیات ندوی، ایم اے علیگ، آکسن کینٹب، نائٹ، آنریبل خاں بہادر، سر، خاں صاحب، رائے بہادر، کے سی ایس آئی، ہز ہائی نس مہاراجہ اور اعلیٰ حضرت'' فرمایا یہ نام کے ساتھ اس قدر الفاظ کا کیا مطلب؟ ہم نے کہا جناب یہ تو تھا صرف ہمارا تخلص تو گھبرا کر فرمایا پھر جناب کا اصل نام؟ ہم نے کہا ''ندوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، خلیفۃ المسلمین، مسیح موعود، حکیم الامت، رئیس الاحرار، مصورِ فطرت، ترجمانِ حقیقت، خواجہ، علامہ، مفتی، احمد رموزی، قادیانی، دیوبندی، بریلوی، نظامی، قادری، چشتی، حنفی، نقشبندی، محدث علی پوری عفاعنہ اور غفرلہٗ''۔ فرمایا ''اس قسم کے نام کس قوم میں ہوتے ہیں؟'' ہم نے کہا ''اس قسم کے نام صرف ہندستانی مسلمان ہی رکھتے ہیں''۔ فرمایا ''وطن؟'' ہم نے کہا ''وہی جہاں دوست اس لیے دشمن ہو گئے کہ ہم مشہور ومعروف اہلِ قلم کیوں ہیں؟''۔ فرمایا ''مشغلہ؟'' آہ کہ ان کے اس سوال پر ہماری آنکھوں سے ساون بھادوں کا موسم شروع ہو گیا اور ہم نے کہا کہ حضور مشغلہ یہی کہ تلاشِ معاش میں نکلے ہیں۔ یہ سن کر آپ بھی آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا ''مولانا میں بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوں''۔ ہم نے کہا کہ ''آپ انگریزی زبان نہیں جانتے جو نوکری نہیں ملتی؟'' فرمایا ''مولانا آج کل نوکری ملتی ہے سفارش سے نہ انگریزی سے اور سفارش ملتی ہے غلامی، خدمت گاری، مخبری، جاسوسی اور رشوت سے''۔ تو ہم نے کہا ''پھر ٹھہر جایئے آپ بھی آج فیض آباد کے تھرڈ کلاس مسافر خانے میں''۔

◆

خدا کسی شخص کو جاڑے کے موسم میں فیض آباد نہ لے جائے۔ کیوں کہ یہاں جاڑا قہرِ خدا بن کر نازل ہوتا ہے۔ ہم نے مسافر خانے کے ایک صوفیانہ گوشہ میں بستر اس طرح بچھا دیا گویا ہم کہیں کے بڑے ہی تہجد گزار پیر صاحب ہیں اور اب صبح تک ہو حق ہی کرتے رہیں گے۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو کچھ ہندو سادھو مارے جاڑے کے گناہوں کی گٹھریاں بنے پڑے گنگنا رہے تھے جو علامت تھی اس امر کی کہ ہمیں سردی ستا رہی ہے، مگر افلاس سے ایک کے پاس بھی لحاف نہیں۔ غرض کوئی دس بجے ہوں گے کہ مسافر خانے کے ایک گوشے سے آواز آئی "اے مار ڈالا، ارے رحم کیجیے، ارے توبہ ہے"۔ نہ رہا گیا اور تسبیح بجاتے ہوئے پہنچے اس طرف۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ریلوے پولیس کے خاص الخاص ہندوستانی داروغہ جی ایک برہنہ مسافر کو بے تحاشا مار رہے ہیں اور وہ کہہ رہا ہے:

حضور کانپور کا رہنے والا ہوں، محنت مزدوری ملتی نہیں، بچے بھوکے مرتے ہیں اوڑھنے کو لتّا نہیں، مزدوری کرنے آیا ہوں، صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔

مگر یہ ہندوستانی داروغہ جی اس فریاد پر جو کچھ فرما رہے تھے وہ یہ کہ:

"نائیں نائیں ڈیم کالا آدمی، تم چور ہے، چلا جاؤ مسافر خانہ میں سونے کا حکم نائیں"۔

یہ پہلا موقع تھا جب ہم نے یہ کالا آدمی اپنی آنکھ سے دیکھا۔ لیکن ساتھ ہی خوف پیدا ہوا کہ اب کہیں ہمارا بستر نہ اٹھایا جائے کیوں کہ یہ ہیں پولیس والے اور یوں بھی ان کی ہر حرکت الٹی اور قانون کے خلاف ہی ہوا کرتی ہے۔ مثلاً یہ لوگ رات کو رعایا کی نگرانی اور حفاظت یوں کرتے ہیں کہ رعایا کے سوتے ہوئے لوگوں کو اٹھا کر اپنی حفاظت کراتے ہیں اور صاف صاف کہتے پھرتے ہیں کہ "جاگتے رہو" ورنہ ہونا یوں چاہیے تھا کہ "سوتے رہو، مطمئن رہو"۔ آخر بستر اٹھا کر اسٹیشن کے فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کا رخ کیا اور سوچا کہ اب یہ مسافرانہ انکسار تو کر دو ترک اور اٹھا دو سکہ اپنی علمی وقار کا۔ یہ تہیہ کر کے کھول دیا دروازہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کا۔ دیکھا کہ ایک سفید آدمی قیمتی کمبلوں میں خواب فرما رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر غصہ آیا کہ حاکم قوم کے افراد تو یوں آرام کریں اور محکوم یوں جاڑے مریں۔ بس اسی طیش میں ترکیب یہ کی کہ ایک کرسی کو ویٹنگ روم میں اس زور سے گھسیٹا کہ یہ سفید آدمی چمک کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا "کون ہے تم؟" ہم نے آہستہ سے کہا

''وہی شردھانند والے عبدالرشید'' مگر یہ نہ سمجھے اور پھر فرمایا ''ول کون ہے تم؟'' تو ہم نے کہا ''عربی میں ضیاء الملک، فارسی میں حضور، اردو میں ملا رموزی، انگریزی میں جرنلسٹ، اخبارات میں موجدِ گلابی اردو، رئیسوں میں ملا صاحب، غریبوں میں ملا جی، عوام میں مولانا، دفتر میں منشی جی، دوستوں میں مُلّا، شاگردوں میں قبلہ، مریدوں میں حضرت اور گھر میں وہی ننھے کے ابا'' ۔اس نام کو سن کر رہ گئے حیران تو ہم نے انگریزی میں کہا کہ ہماری تحقیق تو کر و ختم اور اب:

تم اپنا منہ اُدھر کرلو ہم اپنا منہ اِدھر کرلیں

کیوں کہ گو ہم انگریزی زبان جانتے ہیں لیکن اس میں گفتگو کرنا اپنی مادری زبان کی توہین سمجھتے ہیں۔تو یہ سفید رنگ والے بولے کہ میں عربی زبان بھی جانتا ہوں۔ان کا یہ کہنا تھا کہ ہم نے فوراً مابعد شروع کر دیا۔انھوں نے بسوال جرح کہا کہ میرا نام جی۔ دی رمبولڈ ہے۔ میں آکسفورڈ یونیورسٹی کا ایم۔ایس سی ہوں، امریکہ میں اشتہار نویسی کی تعلیم پائی ہے اور پانچ سال سے لندن کے مشہور عالم اخبار ''ڈیلی میل'' کے شعبۂ اشتہارات کا ایجنٹ ہوں۔میرا مستقر مصر کا دارالحکومت قاہرہ ہے اور اسی لیے میں عربی زبان خوب جانتا ہوں۔اس پر ہم نے کہا ''تو آیئے بسم اللہ کیجیے کوئی سوال پھر سنیے اس کا جواب''۔فرمایا ''یہاں اسٹیشن پر اس وقت چائے بھی ملے گی یا نہیں؟'' ہم نے کہا یہ ''تو دریافت کیجیے کسی ریلوے قلی سے،ہم سے اگر بات کرنا ہے تو لکھے پڑھے انسان کی سی بات کیجیے''۔اس پر رمبولڈ مسکرائے مگر مسکرا کر قیامت ہی ڈھائی کہ لگے ہندستانی سیاسیات کے اہم حصوں پر سوالات کرنے۔اس وقت خیال پیدا ہوا کہ دیکھو ان انگریزوں کے مذاق کو اور دیکھو ان کی سیاسی اور بین الاقوامی مسائل سے دلچسپی کو یہ خرافیات کی طرف رغبت ہی نہیں کرتے۔ تنگ آکر ترکیب یہ کی کہ دو تین لمبی لمبی جمائیاں لیں اور ان سے کہا کہ قبلہ اب رات کے بارہ بجے ہیں اس لیے اب:

''تم اپنا منہ اُدھر کرلو ہم اپنا منہ اِدھر کرلیں''

شب بخیر صبح دیکھا سنا جائے گا،مگر وہ کاہے کو باز آتے تھے فوراً سگریٹ پیش فرمادیا۔اب تو ہم سمجھ گئے کہ ہوئی صبح۔ چار و ناچار جواب دینا شروع کیا،مگر چال یہ چل گئے کہ ہندستان میں انگریزی حکومت کی خرابیاں گن گن کر سنانا جو شروع کیں تو انگریزی خون میں اشتعال سا ہونے

لگا۔ اِدھر لحاف کو پاؤں پر ڈالا اور پھر آہستہ سے اسے گھٹنوں تک لے آئے۔ پھر سینہ تک اور جب اطمینان ہو گیا کہ لحاف کا اب ایک ہی زینہ باقی رہ گیا ہے، ادھر رمبولڈ صاحب بھی کچھ خفا ہو کر مضمحل سے ہو رہے ہیں تو ہم نے ایک دم... اس پر رمبولڈ بے ساختہ ہنس پڑے اور فرمایا "یہ کیا؟" تو ہم نے کہا "بس قبلہ اب:

"تم اپنا منہ اُدھر کرلو ہم اپنا منہ اِدھر کرلیں"

◆

صبح ہوئی تو ملازمت کی درخواست لکھی۔ قابلیت کے سرٹیفکیٹ شامل کیے اور بھائی یقین مانیے کہ ایک ایک محکمے اور دفتر میں گئے۔ ہر جگہ یہی جواب ملا کہ دو سال سے بی۔ اے پاس ہمارے ہاں امیدوار ہیں مگر جگہ خالی نہیں۔ اتفاق سے مل گئے ایک گلابی اردو کے قدر دان۔ فرمایا "مولانا نوکری ووکری کہاں ملتی ہے؟ فی الحال پان سگریٹ کی دکان لگا لیجیے، اللہ رزاق ہے کیوں کہ آج ہندستان کا کوئی شہر نہیں جہاں کالا آدمی بی۔ اے پاس کر کے بھی مارا مارا نہ پھرتا ہو، اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ تجارت کیجیے، جس سے ہم مالدار ہو جائیں گے اور جب مالدار ہو جائیں گے تو بغیر تحقیق قابلیت کونسل کی ممبری کے ووٹ بھی مل جائیں گے۔

(رسالہ 'نگار' بھوپال، فروری 1927)

◆◆◆

مضمون نگاری

تحریر کو قوموں کے عروج و زوال سے جو اہم علاقہ ہے اس کی نسبت اس چودھویں صدی میں ایک مضمون نگار میں ذیل کی قوتوں کا ہونا ضروری ہے۔

1۔ وہ علومِ متعارفہ کا عالم ہو۔

2۔ وہ مخلوقاتِ عالم خصوصاً انسان صاحب کے خواص سے کلیتہً واقف ہو۔

3۔ وہ چار بڑی اور علمی زبانیں جانتا ہو یا جانتی ہو۔

4۔ اس میں احساس، تاثر، بصیر، نقد و تنقید اور حافظہ کی قوتیں غیر معمولی ہوں۔

5۔ جس زبان کا وہ مضمون نگار ہو، اس میں انسانی خواص و حالات کو مؤثر صورت میں بیان کرنے پر قادر ہو۔

6۔ وہ ایک خیال کو ظاہر کرنے کے لیے الفاظ کا کافی ذخیرہ رکھتا ہو یا رکھتی ہو۔

7۔ وہ دنیا جہاں کا سفر کر چکا ہو یا کر چکی ہو۔

8۔ وہ افکار و آلام سے محفوظ ہو۔

9۔ اس کے مزاج میں اعتدال ہو۔

مضمون نگاری کی یہ وہ قطعی اور ضروری شرطیں ہیں جنھیں وہابی، قادیانی، اہلِ حدیث اور

بریلی والے بھی مانتے ہیں اور انھیں چیزوں کے بل پر آج یورپ کی مضمون نگاری ترقی کے فلک الافلاک پر پہنچی ہوئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اردو مضمون نگاری نے ان اعتبارات سے کس قدر ترقی کی ہے اور اس کے مضمون نگار مضمون کس طرح لکھتے ہیں؟

دیوبند اور علی گڑھ میں جس قدر علوم پڑھائے جاتے ہیں اگر ان کے طلبا میں مضمون نگاری کی مشق اور صلاحیت بھی اتنی ہی ہوتی تو یہ لوگ اپنے دماغ قلم سے اردو زبان اور امت اسلامیہ کی وہ خدمات انجام دیتے جو سان و گمان میں بھی نہیں۔ مگر ان لوگوں میں بعد تحصیل علوم دو قسم کے ارمان پیدا ہوتے ہیں ایک کسی مدرسہ کا ''صدر مدرس'' ہو جانا۔ دوسرے کہیں کا ڈپٹی کلکٹر ہو جانا اور جو ان دونوں کے مقابل کوئی صاحب مضمون نگار نکل آئے تو صرف اس طرح کہ ہمارے ایک دوست نے اردو رسالہ ایک دم جاری کر دیا اور مقالہ اختتامیہ میں دن دہاڑے شبلی علیہ الرحمۃ کی مشہور کتاب ''الفاروق'' کے تین صفحات اپنے نام سے نقل کر ڈالے۔ جب لکھنؤ کے ایک اخبار میں سعید انصاری نے اس کی قلعی کھولی تو بے چارے آج تک ''ضربِ خفیف'' بنے پھرتے ہیں۔ واقفیت کا یہ حال کہ لکھنؤ سے ذرا آگے والے شہر کے ایک ایڈیٹر صاحب نے لکھا کہ:

''بندرگاہ قاہرہ سے سعد زاغلول جہاز پر سوار ہو گئے''۔

مضمون نگار لیڈر:

قومیاتِ ہند میں سب سے اونچا مرتبہ لیڈروں کی مضمون نگاری کا ہے اور ویسے بھی یورپ اور دوسرے متمدن ممالک میں بادشاہ سلامت کے بعد لیڈروں ہی کی تقریر و تحریر معزز و مقتدر سمجھی جاتی ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ ہندستان میں لیڈر وہی جو اپنے ساتھ روزانہ ایک نئی تحریک لے کر نکلے۔ مثلاً اگر شردھانند جی ''شدھی'' کی تحریک فرمائیں تو مالوی جی لیڈر ہی نہیں اگر وہ ''سنگھٹن'' کو نہ لے دوڑیں۔ اگر ڈاکٹر کچلو علی غول بنا ڈالیں تو ڈاکٹر منجی ڈاکٹر صاحب ہی نہ رہیں، اگر وہ ''مہابیر ول'' نہ پیدا کر دیں۔ حالانکہ پہلے زمانہ میں لیڈری کے لیے صرف ایک دل ہلا دینے والی تقریر اور گورنمنٹ کو ''بے لفظ تحریر'' کافی سمجھی جاتی تھی۔ اب البتہ کچھ دن سے لیڈری کے ساتھ ایڈیٹری بھی شامل ہو گئی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو بڑے لیڈر صاحب سے لے کر چھوٹے لیڈر صاحب

تک ایک نہ ایک اخبار کے ایڈیٹر بنے ہوئے ہیں۔ اور اسی لیے آج کل ان لوگوں کی مضمون نگاری سب سے پہلے ملاحظہ کے قابل ہوگئی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ لیڈر صاحب ''کوٹھی'' یا ''ٹیلی فون والے مکان'' سے کم حیثیت والے مکان میں نہیں رہتے کیوں کہ جناب ان کے پاس اگر رپورٹر کے نہیں تو دہلی والی ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نمائندے تو سوال کرنے کبھی کبھی آ ہی جاتے ہیں۔ باوجود تحریک مقاطعۂ مال برطانیہ ان لوگوں کے مکانوں میں ایک کمرہ ''ڈپٹی کلکٹر'' کے کمرہ کے مشابہ ہوتا ہے۔ اس میں الماریاں، آئینے، برقی روشنی، برقی پنکھا، میز، کرسی، تصاویر اور ایک طرف صابن و استرہ بھی رکھا ہوتا ہے۔ پس جب لیڈر صاحب کسی جلسہ میں اپنی تحریک کو ناکامیاب دیکھ کر آتے ہیں تو مضمون نگاری شروع کر دیتے ہیں اور جو منہ میں آتا ہے وہی لکھ مارتے ہیں۔ ان کی تحریروں کا طول ایک سے لے کر 17 کالم تک ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں زیادہ تر ذاتی بغض، حسد اور غرض پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے قوم کا کوئی متفقہ مقصد نہیں ہوتا بلکہ ان کی ہر تحریر وقتی جوش کی تابع ہوتی ہے اور اسی لیے ان کے اندر زبان کی بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں اور کہیں کہیں سیدھی نہیں تو ترچھی بھی سنا دیتے ہیں۔ ان کے مضمون کا عنوان نہیں ہوتا بلکہ اپیل یا پیغام کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ مثلاً ''سوامی جی کا پیغام جاتی کے نام'' اور ''مولانا کا اپیل قوم سے''۔ انداز تحریر نہایت پیغمبرانہ ہوتا ہے۔ مثلاً کہیں کہیں یہ لوگ ہم لوگوں سے ''اے غافلو!'' بھی کہہ دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں لیڈرانہ وقار، متانت، پختگی اور تاثیر ان کے شایانِ شان نہیں ہوتی۔ یہ لوگ مضمون لکھنے کے بعد انگریزی چائے بسکٹ، مکھن اور فروٹ کھاتے ہیں۔

مضمون نگار ایڈیٹر:

یہ وہ مقدس طائفہ جس کی بے تحاشا مضمون نگاری سے آج برطانیہ کلاں و آئرلینڈ کا لڑکا لڑکا اور لڑکی لڑکی تک کانپ رہا ہے اور کانپ رہی ہے۔ مضمون نگار ایڈیٹروں میں زیادہ حصہ علی گڑھ کے ان جواں ہمت اور صاحبِ ہوش و خرد نوجوانوں کا ہے جو بغیر علمِ دین کی آگاہی کے ہمارے نام نہاد مولوی صاحب سے کہیں زیادہ ملک و ملت اور مذہب کا درد و احساس رکھتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ ایڈیٹروں اور صرف ایڈیٹروں کی مضمون نگاری ہے جو زبان، مذہب، ملک اور قوم کے لیے مفید و مؤثر ہے۔ ان کی مضمون نگاری نے وہ اثرات پیدا کیے ہیں جو ڈاکٹر ٹیگور کے ملفوظات کر سکتے ہیں اور نہ بڑے مولوی صاحب کی ''تنبیہ الغافلین''، مگر ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور آج بھی شاہانِ فرنگ کے مہمان بنے پھرتے ہیں اور یہ بے چارے ایڈیٹر ہر وقت دفعہ 144 کی ضربیں کھاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے والدین کی دولت سے لکھتے پڑھتے ہیں اور پھر محض فرائض کے احساس پر مالکانِ اخبار کی نوکری کرتے ہیں۔ بے نہایت و بے پایان مصائب برداشت کرتے ہیں مگر اظہارِ حق اور خدمتِ خلق کے لیے پھر بھی تیار رہا کرتے ہیں۔ یہ لوگ گھر سے صرف دال روٹی کھا کر پیادہ یا چھتری لگائے ہوئے اخبار کے دفتر میں آ جاتے ہیں اور قوم کی ضرورت پر لکھتے ہیں۔ مالک اخبار یا قوم کی طرف سے انھیں کوئی صلہ نہیں ملتا البتہ کبھی کبھی ...ال صاحب شہر بلا کر ڈانٹ دیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ آنکھوں پر عینک ضرور لگاتے ہیں۔ شام ...ریح گاہوں اور بازاروں میں ذرا گھوم لیتے ہیں۔ بعض بالاخانوں پر بھی ہو آتے ہیں جو اس قدر خدمات کے بعد کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ ان کی تحریروں میں زبان اور قواعد کی غلطیاں ہوتی تو ہیں مگر کثرتِ کار کی وجہ سے معافی کے قابل ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ان کے قلم سے آئے دن نئی نئی اصلاحات، ناموں اور الفاظ کا اضافہ بھی ہوتا ہے، جو زبان کی ترقی کا باعث ہے۔ ان کے مضامین میں ''جوشِ انگریزی کا حصہ'' غالب ہوتا ہے جو تحریر کا صحیح مقصد ہے۔ ان کے دماغوں کو نیا مضمون سوچنے سے کسی وقت فرصت نہیں ملتی۔ یہ لوگ میلے اور گندے کپڑے پہنتے ہیں۔ ان کی شیروانیوں سے ان کی قمیصوں کی آستینیں نکلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ لوگ شیروانی کے بٹن نہیں لگاتے جو ان کے علمی انہماک کا ثبوت ہے۔ ان کے املاء کی غلطیاں کاتب کے سر تھوپ دی جاتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں دو باتیں نہایت غیر ذمہ دارانہ ہوتی ہیں ایک یہ کہ صرف گورنمنٹی قسم کے ہیڈ مولوی صاحب کی بتائی ہوئی قرآنی آیات کو مضمون میں جہاں دل چاہا لے آئے۔ دوسرے اگر کسی لیڈر یا جماعت سے اختلاف ہو گیا تو تحریر میں متانت قائم رکھنے کی جگہ ''غیر طرح'' سنانے پر بھی اتر آتے ہیں اور ان کی اسی حرکت سے تو یہ انگریز لوگ بگڑ جاتے ہیں۔ باقی سب طرح خیریت و خیر عافیت ہے۔

نوجوان انگریزی داں مضمون نگار:

اسلامیہ کالج پشاور کے ہوں یا انجمن حمایت الاسلام لاہور کے، عینک ضرور لگاتے ہیں۔ ان لوگوں کی مضمون نگاری انٹرنس کے درجہ سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ انگریزی ناولوں کے بڑے عاشق ہوتے ہیں اور اس لیے شروع شروع میں ناول ہی کا ترجمہ فرماتے ہیں۔ اور کسی رسالہ کو یہ ترجمہ ''بغرضِ اشاعت'' بھیج کر لکھ دیتے ہیں کہ اگر پسند نہ ہو تو جلد واپس کیجیے۔ بعض اصلاح کی تاکید بھی فرما دیتے ہیں۔ ایسے نوجوان مضمون نگاروں سے ایڈیٹر صاحب ''نگار'' بے حد تنگ اور ناراض ہیں اور یہ ایسی ہی فوجداری کی مضمون نگاری سے جملہ رسالوں نے واپسی اور جواب کے لیے ایک آنے کے ٹکٹ کی شرط قواعد میں لکھ دی ہے، مگر یہ کہاں مانتے؟ مضمون ارسال کرتے ہی رسالہ مفت جاری کرنے کی استدعا کی جاتی ہے۔ ان لوگوں کی مضمون نگاری کے موضوعات فنِ تاریخ میں اورنگ زیب، عالم گیر، محمود غزنوی۔ ادبیات میں از غالب و مومن کی شاعری، حالی و سرسید کا طرزِ تحریر، سیاسیات میں گورنمنٹ برطانیہ بفضل ایز دی آئر لینڈ و ماورائے بحر کو چند بے نقط تک محدود ہوتے ہیں۔ ایک ٹولی صرف ''ٹیگوریات'' کے ترجموں اور افسانوں کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ان لوگوں کے پیشِ نظر خدمت سے زیادہ شہرت ہوتی ہے، اس لیے زبان کی صحت اور فصاحت و سلاست وغیرہ کی پابندی نہیں فرماتے ہیں۔ اس محترم طبقہ کے لوگ پرانے مضامین چرا لینے سے بھی نہیں چوکتے مگر مضمون نگارانہ غرور اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ عینک لگا کر شام کو کسی پُر فضا مقام پر ضرور جاتے ہیں۔ نصف آستین کی قمیص پہن کر مضمون لکھتے ہیں اور دنیا کا کوئی حصۂ مضمون نگاری باقی نہیں رکھتے۔ ان کے مضامین میں صرف شوکت لفظی ہوتی ہے اور بس...

عربی داں مضمون نگار:

دنیا جانتی ہے کہ عربی کا جو نصاب اس وقت ہندستان میں پڑھایا جا رہا ہے وہ بے حد ناقص اور بے کار ہے۔ پھر بھی اس میں جو علوم ہیں وہ ایک ذی ہوش اور صاحبِ احساس انسان کو ایم۔اے سے زیادہ قابل لائق بلکہ سقراط بنا سکتے ہیں۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ یہ عربی کے طلبا پورا

درسِ نظامی چٹ کر جاتے ہیں مگر چاہو کہ ملازمت کی درخواست بھی قابلیت سے لکھ دیں تو ناممکن ۔ان میں تو بڑا قابل آدمی بس وہی سمجھا جاتا ہے جو کہیں کا صدر مدرس بن جائے ۔مضمون نگاری کی صلاحیت ان میں نہ پیدا ہوئی ہے اور نہ ہو ۔وجہ یہ ہے کہ ''خود بڑے مولوی صاحب'' بھی کورے ہی دھرے رہتے ہیں ۔عمر بھر عربی پڑھاتے ہیں مگر خود عربی زبان میں ایک منٹ بھی گفتگو نہیں کر سکتے ۔دوسری وجہ یہ ہے کہ جب سے اخبار پائنیر نے لکھ دیا ہے کہ خاکم بدہن مذہب صرف اعتقادی قصہ ہے، اُس وقت سے مسلمانانِ ہند نے مذہبی تعلیم اور عربی زبان چھوڑ کر بیرسٹر ایٹ لا ہونا شروع کر دیا ہے ۔اب عربی پڑھتے ہیں تو شہر بخارا اور افغانستان کے طلبا ۔لہٰذا ان سے اردو زبان میں تقریر و تحریر کی امید ایسی ہے جیسے پارلیمنٹ والوں سے سوراج کی ۔ہاں زمانے کے موجودہ فولادی گھونسہ نے ان طلبا کے دماغوں میں جو خفیف سی سنسنی پیدا کر دی ہے اور اس کے اثر سے ان میں ماشاء اللہ مضمون نگار پیدا ہونے لگے ہیں سو وہ بھی فی سبیل اللہ نہیں بلکہ منشی، فاضل اور مولوی فاضل کی ملازمانی ڈگریوں کے حصول تک اور اس کے بعد پھر وہی ''صدر مدرسی'' ۔غرض مضمون نگاری کی ابتدا جمعرات والے ''مذاکرۂ علیہ'' عرف ڈبیٹ سے ہوتی ہے جہاں ظہر یا عشا کی نماز کے بعد جمع ہو کر کوئی تقریر کرتا ہے اور کوئی مضمون سناتا ہے ۔سو وہ بھی کانپتے ہوئے جسم اور لرزتی ہوئی زبان سے ۔مضمون ہمیشہ الف خانی روشنائی اور کلک کے قلم سے لکھا جاتا ہے ۔مضمون میں تازہ حالات و واقعات سے بحث نہیں ہوتی بلکہ اس میں بارش کے فوائد، قادیانیوں کے عقائدِ باطلہ اور احناف کے عقائدِ صادقہ وغیرہ سے بحث ہوتی ہے اور جو کہیں درمیان میں خود اپنے متعلق کچھ کہنا ہوا تو اپنے نام کو 'میں' یا 'ہم' کہہ کر نہیں پکارتے بلکہ خود کو کمترین، فقیر، ناچیز، عاصی اور مسکین کے الفاظ سے یاد فرماتے ہیں ۔نام کے آخر میں عفی عنہٗ، غفرلہٗ یا حنفی اور نقشبندی ضرور لکھیں گے ۔اندازِ تحریر ایسا کہ سن کر بجائے اثر کے غنودگی طاری ہو جائے ۔مضمون کے ہر جملہ اور ہر فقرہ کو صرف و نحو سے حل کرنا جانِ انشا سمجھتے ہیں ۔تیاری کے وقت کوئی جھگڑا نہیں کرتے بلکہ سیدھی طرح چارپائی پر بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتے ہیں ۔مضمون کی لفظی آرائش کے لیے مادھورائے اور غیاث کے جملہ لغات جمع کر دیے جاتے ہیں اور یہ ایسی ہی مضمون نگاری ہوتی ہے عربی کے طلبا کی جس سے الحمدللہ، اردو زبان اور اردو رسائل و جرائد خالی

نظر آتے ہیں۔ بس ہم تو قائم ہیں قبلہ مولانا احمد سعید صاحب دہلوی ناظم جمعیۃ العلما کے جو خوب ہی لکھتے ہیں۔ غفرلہٗ

بوڑھے مضمون نگار:

گو غدر 1857 میں ہندستان کے بے شمار مضمون نگار بھی مارے گئے مگر خدا کے فضل سے اب بھی ہمارے دادا صاحب مرحوم کی عمر کے مضمون نگار موجود ہیں اور کمال یہ ہے کہ نظام حیدرآباد کے وزرائے سلطنت انھیں اب بھی وظائف و مناصب سے سرفراز فرما رہے ہیں اور گو یہ لوگ اگلے زمانے کے مضمون نگار ہیں۔ مگر قومی درد اس قدر کہنہ ہے کہ اب بھی لکھے جاتے ہیں۔ خیر ہمارا لیتے ہی کیا ہیں؟ اپنی ہی عمر عزیز برباد کر رہے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ لوگ ضعف اور پیری کی وجہ سے انگریز بھائیوں کے مظالم پر اس زناٹے سے نہیں لکھتے جس زناٹے سے کبھی مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں لکھا کرتے تھے۔ یہ حضرات مضمون لکھنے سے پہلے ''تازہ دم'' ہونے کے لیے حقہ استعمال فرماتے ہیں۔ ان میں ایک صاحب تو ''گولی'' بھی کھا لیتے ہیں جس کے اثر سے مضمون لکھتے لکھتے کبھی کبھی خود ہی چونک پڑتے ہیں۔ یا پھر مسلسل غنودگی اور جمائیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، مگر لکھے جاتے ہیں۔ ان کے مضمون کا کاغذ پے در پے کھانسی کی وجہ سے غالب کے رنگ کا سرخ ''پرافشان'' بن جاتا ہے۔ ان کے پیرانِ پیر دستگیر اٹاوہ میں رہتے ہیں۔ امام اول لاہور میں اخبار زمیندار کے سامنے اور خلیفۂ اول لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ ان کے پچھلے مضامین کا مقصد ملکہ وکٹوریہ کی خوشنودی ہوا کرتا تھا اور موجودہ مضامین کا مقصد ''کلکٹر ضلع'' کی رضاجوئی ہوتا ہے۔ ان میں کے ایک صاحب گورکھپور اور دوسرے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں چارپائی پر لیٹ کر بھی مضمون لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں تجربہ، استدلال، تحقیق غیر ضرور نہیں تو ضروری بھی نہیں ہوتی۔ ان کی تحریر میں بجائے بیداری اور جوش کے اس امر کی تاکید ہوتی ہے کہ ''تقریر نہ کر تاثیر دکھا''۔ یہ لوگ ہر معاملہ میں سرسید علیہ الرحمۃ کی تحریروں کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ البتہ تحریر میں انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے انگریزی الفاظ نہیں ہوتے بلکہ خالص اردو زبان لکھتے ہیں جس میں کہیں کہیں حضرت داغ دہلوی اور امیر مینائی کے اشعار ضرور ٹھونس دیے جاتے ہیں۔

ہماری مضمون نگاری:

اگر یہ صحیح ہے کہ بڑے بڑے لارڈ ''آپریشن'' سے شفاخانوں میں مرجاتے ہیں۔ اگر ہندستانی راجے مہاراجے قوتِ باہ اور طلا کی گولیوں سے ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہندستانی قلی صاحب لوگوں کی ٹھوکر سے مرجاتے ہیں۔ اگر سرحدی قبائل ہوائی جہازوں سے فنا ہوتے ہیں تو دیکھ لینا ہم کسی نہ کسی دن مضمون نگاری میں... یہ ہوجائیں گے اور یار لوگ انا للہ پڑھ کر فارغ ہوجائیں گے۔ آپ ہی غور کیجیے کہ یہ بھی کوئی مضمون نگاری ہے کہ چوبیس گھنٹے قلم دربغل اور کاغذ بدوش پھرتے رہتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ ہم نے تعلیم تو معقول ہی پائی ہے، مگر وہ تو کہیے کہ:

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کے موافق جہاں دنیا میں کسی نے غلطی کی اور ہم نے قلم سنبھالا۔ اب اگر مضمون نگاری میں ''آمد'' اور ''آورد'' کوئی چیز ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ہم آمد سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں اور وہ تو قوم نے مالداری کی وجہ سے کچھ دن سے خواجہ حسن نظامی صاحب کو ''مصورِ فطرت'' کہہ دیا ہے ورنہ اصل میں 'مصورِ فطرت' تو ہم تھے جب کہ ہم ہر شخص کا حلیہ کھینچ کر رکھ دینے میں عبدالرحمٰن چغتائی سے کیا کم ہیں اور ہمارا کون سا مضمون ہوتا ہے جو ''عمل چغتائی'' کا کام نہ دیتا ہو؟ اور اسی حلیہ نگاری کی وجہ سے اکثر لیڈر لوگ ہمیں اپنے داموں سے ہوٹل میں تو مہمان رکھتے ہیں مگر کبھی لوگ ہمیں اپنے داموں سے ہوٹل میں تو مہمان رکھتے ہیں مگر کبھی اپنے گھر میں نہیں ٹھہرنے دیتے کیوں کہ جانتے ہیں کہ اگر ہمیں وائسرائے بہادر کی بھی کوئی کمزوری نظر آجائے تو ہم اس پر کچھ لکھ مارنے سے نہیں رہ سکتے۔ اور وہ تو اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب ہمیں منع کرتے رہے ورنہ اب تک تو ہم 'باغیانہ مضامین'' بھی لکھ چکے ہوتے۔ ادھر ویسے ہی ہمیں جیل خانوں کی آب و ہوا موافق نہیں کیوں کہ ہم نے بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھ لیا کہ جوں ہی جیل خانے سے واپس آئے یا تو سوراج اور خلافت کا کام ہی چھوڑ بیٹھے یا پھر انگریزوں پر پہلا سا دندنانا چھوڑ دیا اور بڑی وجہ یہ ہے کہ ایسے مضامین کی وہ بھی مخالفت کرتی ہیں۔ الغرض ہمیں آمد ہوتی ہے تو مضمون شروع کرتے ہیں اور مضمون کا عنوان لکھ کر بیٹھ جاتے ہیں کیوں کہ ننھے میاں کی ایک ہی چیخ سے سارا مضمون خبط ہوجاتا ہے۔ پھر سوچتے ہیں مگر جب نہیں آتا تو قلم کو میز پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور حیدرآباد کے منصرم

وظائف کو بد دعا دیتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے وظیفے کی بھی فکر کر دیتے تو کیوں اس وقت دماغ پریشان ہوتا۔ پھر حقہ پیتے ہیں مگر مضمون سمجھ میں نہیں آتا تو سیٹی بجاتے ہیں۔ پھر آئینہ میں خود کو منہ چڑاتے ہیں، کبھی بالوں کو سنوارتے ہیں۔ کبھی قلم کو پیشانی پر رگڑتے ہیں کبھی کوئی مصرعہ گنگناتے ہیں۔ کبھی بے وجہ مسکراتے ہیں۔ اتنے وقفہ میں دفتر کا وقت ہو جاتا ہے اور چھڑی اٹھا کر دفتر چلے جاتے ہیں۔ شام کو آتے ہیں تو ان کے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یعنی سودا سلف لینے جاتے ہیں اور اگر کوئی بھی نہ ہو تب بھی وہ ننھے میاں کو یہ کہہ کر دے دیتی ہیں کہ لو ذرا انھیں باہر ٹہلاؤ یہ ننھے میاں کو ''ذرا باہر ٹہلانے کا معاملہ'' مغرب تک جاری رہتا ہے اور اگر کسی دن دنیا بھر کا کوئی کام بھی باقی نہ رہے تو وہ ہماری خوش دامن صاحبہ کے ہاں خیریت معلوم کرنے بھیج دیتی ہیں، مگر ہم بھی کسی مسجد میں بیٹھ کر مضمون پورا کر ہی لیتے ہیں اور آ کر کہہ دیتے ہیں کہ تمھاری والدہ نہایت اچھی ہیں۔ تمھیں درجہ بدرجہ دعا کہی ہے اور ننھے میاں کو پیار۔ یہ کہہ کر پھر وہ عنوان لکھا ہوا مضمون شروع کرتے ہیں کہ محلے والے یار دوستوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ اب اگر محلے والوں سے نہ ملیں تو ان کے ''ترکِ موالات'' سے موٹ مٹی خراب ہونے کا خوف۔ اس لیے عشا کی نماز تک مضمون نہیں لکھ سکتے۔ بعد عشا جب وہ سو جاتی ہیں تو مضمون شروع کرتے ہیں اور جو کبھی 'جمیلہ' رونے لگی تو انھوں نے بغیر گفتگو کے... ننھے میاں کو ہمارے بستر پر لا کر ڈال دیا اور خود جمیلہ کو لے کر سو گئیں۔ اب ہم ہیں کہ مضمون وضمون چھوڑ کر ننھے میاں کو بارہ تیرہ بجے رات تک لوریاں دیا کرتے ہیں اور کچھ دیر میں خود بھی خور خور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس طرح لکھا کرتے ہیں اردو زبان کے مضمون نگار۔ اب اردو زبان کی ترقی اور تنزلی کے اسباب آپ خود ہی معلوم کر لیجیے۔

(رسالہ بہارستان، لاہور، ستمبر 1927)

◆◆◆

میٹھی عید

اگر عید کی سی خوشی ہر وقت چاہو تو تارک دنیا بن جاؤ۔ اور تارک دنیا اس شخص کو کہتے ہیں جو شہر کی آبادی سے نکل کر کسی گھنے جنگل کے اونچے پہاڑ پر جا بیٹھے۔ چنانچہ اسی خیال سے 5/مارچ 1928 کی صبح ایک ایسے ہی پہاڑ پر ہوئی جہاں آدمی کم اور جانور زیادہ تھے۔ ہم بھی کاندھے پر بندوق دھرے، سانس روکے، جسم چرائے اور آہستہ آہستہ پہاڑ کی ایک ایسی سمت روانہ ہوئے جس کے نشیبی حصہ میں شیر بیٹھا تھا یا کھڑا تھا یا لیٹا تھا یا اونگھ رہا تھا یا سو رہا تھا یا چل رہا تھا یا چلنے والا تھا۔ بہر حال شیر ضرور تھا، اس لیے کہ ساتھیوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گھورا جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کیوں شور کرتے ہو؟ کیا اندھے ہو دیکھتے نہیں ہو کہ شیر کی جگہ ہے اور تم ہو کہ شور کر رہے ہو؟ یہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ڈانٹنے والے اس وقت یہ سمجھتے تھے کہ بس ہم سے تو کوئی غلطی ہوتی ہی نہیں۔ ادھر ہم مرے جا رہے تھے کہ کچھ بھی ہو، آج شیر کو مار کر دنیا کے نپولین اعظم بن کر رہیں گے۔ غرض ایک اونچی جگہ بیٹھ کر شیر کو اس طرح دیکھا گویہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہم مارے خوف کے اس سے خود کو چھپا رہے ہیں۔ کبھی سانس روکتے، کبھی ناک بند کر کے منہ میں سانس لیتے کیوں کہ اکثر خشکی کی وجہ سے ناک سے ہارمونیم کے سُر پیدا ہو جاتے ہیں۔ کبھی دوزانو ہو جاتے ہیں۔ کبھی پالتی مار لیتے ہیں مگر فوراً ہی خوف سے پہلو بدل لیتے۔ اِدھر شیر سے زیادہ ڈر

کھانسی کا تھا کہ کہیں کھانسی نہ چل جائے ورنہ شیر تو رہا اپنے گھر یہ ساتھی مارے غصہ کے ہم کو نہ مار ڈالیں۔ اور یہ غدر کریں گے کہ تم نے کھانس کر کیوں شیر کو بھگا دیا؟ غرض کوئی پندرہ منٹ تک خوب خوب رکوع اور سجدے کیے، مگر شیر نظر نہ آیا تو پھر اسی تہذیب و شائستگی سے سانس روکے اور قدم سنبھالے پہاڑ سے روانہ ہو کر واپسی عمل میں آئی اور تمام راستہ ٹھوکر پر ٹھوکر کھاتے اتار پر اتار، چڑھاؤ پر چڑھاؤ، دھکے پر دھکا، خاموشی پر خاموشی، ہلسی پر ہلسی اور شیر نہ ملنے پر افسوس پر افسوس اور لاحول پر لاحول پڑھتے گھر پہنچے تو سیدھے ڈاک دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

◆

ایڈیٹر لوگ بڑے فخر سے اپنی ڈاک کے دلچسپ حالات یا دلچسپ خطوط اخبار میں نقل فرمایا کرتے ہیں، مگر ہم بھی اپنے وقت کے ایک ہی لیٹر بکس ہیں جس میں روزانہ خطوط اخبار اور رسالے چلے آتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو مضمون طلبی میں روزانہ کوئی ڈیڑھ درجن خطوط ہمارے نام آتے ہیں جن میں یہ ایڈیٹر لوگ ہم سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر مضمون طلب کرتے ہیں، مگر وہ جو کہا ہے کہ:

ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ علیہ السلام

سو اس حساب سے ہمارے بعض ایسے مخلص ایڈیٹر بھی ہیں جو ہاتھ جوڑ کر مضمون طلب کرنے کی جگہ حکم دے کر ہم سے مضمون وصول فرماتے ہیں۔ پس ایسے مخلصین میں یہ جالندھری حفیظ صاحب، ایڈیٹر مخزن اور بٹالوی صاحب سالک، ایڈیٹر انقلاب بہت تیز ہیں۔ اب یہ ڈاکیہ نہ ''حسن توارد ہوگا'' کہ آج کی ڈاک سے ان دونوں بھائیوں کے خطوط آئے۔ ابوالاثر مولانا حفیظ جالندھری نے مخزن کا سالگرہ نمبر ارسال فرماتے ہوئے جو خط لکھا اس میں ایک تازہ مضمون کی رسید تو کیا دی خاصا پتھر کھینچ مارا۔ ارشاد ہوتا ہے:

> ''مضمون مل گیا ہے۔ پسند ہے۔ چھپے گا۔ کب؟ یہ نہیں معلوم۔ بھلا اس کے پوچھنے کی کیا ضرورت؟''۔

اس خط کے بعد حضرت سالک کا لفافہ کھولا تو لکھا تھا:

''کچھ خبر بھی ہے؟ انقلاب کا سالگرہ نمبر نکل رہا ہے سوا سو صفحات کی ضخامت اور 21،

22 مارچ کو چھپ چھپا کر، کٹ کٹا کر اور سل سلا کر شائع بھی ہو جائے گا"۔

آخر میں اور مہر من الناس ہی میں "من الجنۃ" تو نہیں کہ پورا رسالہ خود بنائیں اور احباب کو آوازیں دیں کہ تشریف لائیے رسالہ تیار ہے۔ 9/مارچ تک آپ کا فرض ہے کہ ایک عدد پُرلطف اور مبسوط مضمون روانہ کر کے اس خاص نمبر میں ہمارا ہاتھ بٹائیں"۔

یہ دونوں خطوط پڑھ کر اندازہ کیجیے کہ مضمون کی ضرورت ان دونوں کو ہے یا نہیں؟ جو اس طرح ہمیں ڈانٹے جا رہے ہیں۔ سالک صاحب فرماتے ہیں اور قل اعوذ برب الناس میں فرماتے ہیں کہ آخر میں اور مہر من الناس ہی میں من الجنۃ تو نہیں ہیں؟

تو اب سوال یہ ہے کہ اگر آپ من الجنۃ نہیں تو ہم کہاں کے وسواس الخناس ہیں جو ہر حال میں ایک عدد مضمون تیار ہی کر دیں؟ اور پھر اوپر سے ڈانٹیں بھی سنیں؟ مگر صاحب وہ تو کہتے ہیں کہ:

کر تو کر نہیں تو ایڈیٹر سے ڈر

لہٰذا اسی وقت قلم اٹھایا۔ جو حاظر ہے۔

◆

یہ زمانہ ہے ہائی اسکولوں کی تعلیم و تربیت کا اس لیے اب اسلامی آداب اور مشرقی اصول تو گئے گزرے۔ اب تو سوسائٹی کا حکم چلتا ہے جو نہ مانے سو جاہل۔ پس اس سوسائٹی کے ضابطہ سے آج کل مسلمان جس طرح عید مناتے ہیں وہ یہ ہے:

امراء کی عید:

یہ تو شوکت پناہ شہنشاہ عالم گیر علیہ الرحمۃ اور ان کے زمانے کے سلاطین اور امرائے اسلام ہی تھے جو علوم دینی اور شریعت مطہرہ کی تعلیم سے بہرہ ور اور نکاتِ شریعت کے ماہر ہوا کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا ہر حصہ احکامِ اسلامی اور اسوۂ رسول کا تابع ہوا کرتا تھا، لیکن یہ آج کل کے "کالج یافتہ" امرائے اسلام سوائے "موٹر انجینئری" کے اور کچھ جانتے بھی نہیں اور بعض تو قل ہو اللہ شریف میں بھی اٹک جاتے ہیں۔ یہ تعلیم یافتہ کی جگہ "کالج یافتہ" ان لوگوں کی علوم دین سے بے خبری کی بنا پر کہا ہے کیوں کہ صرف "پائنیر" اخبار پڑھ لینے کی قابلیت کو "تعلیم یافتہ" کا رتبہ دینا اصلاً غلط ہے۔

غرض یہ لوگ بڑے کروفر اور بڑے نخرے سے کسی شاندار سواری پر عیدگاہ جاتے ہیں۔ غریب مسلمان انھیں جھک جھک کر سلام کرتے ہیں تو یہ منہ سے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہنے کی جگہ صرف ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ ان کے عید کے کپڑے ایک ہزار روپیہ کی لاگت سے کم نہیں ہوتے۔ بس اسلامی کفایت شعاری تو تجہیز و تکفین ہی کے کپڑوں میں برتی جاتی ہے۔ ان کی عورتیں آج کے دن ان سے بھی زیادہ ریشم و اطلس پر دولت تباہ کرتی ہیں۔ ان کے نوعمر سفید سفید رنگ کے لڑکے اسکول کی تعلیم کے اثر سے آج انگریزی وضع کی آرائش کا خاتمہ ہی کر دیتے ہیں اور عیدگاہ میں خاصی "نیلم پری" بن کر آتے ہیں۔ یہ لوگ تمام رمضان گھر میں تاش کھیلا کرتے ہیں اور ایک روزہ بھی نہیں رکھتے۔ عید کی نماز کے بعد ان کے گھر عید ملنے ان کی برابر کی حیثیت ہی کے لوگ جاتے ہیں۔ غریب مسلمانوں کو ان سے ملنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ جو لوگ ان کے گھر جاتے ہیں انھیں انگریزی وضع کے برتنوں میں سوئیاں کھلاتے ہیں اور ہاں نیوی کٹ سگریٹ بھی۔

ان کی عورتیں بھی اعلیٰ درجہ کے لباس میں عید کی نماز کے بہانے عیدگاہ جاتی ہیں اور راستہ میں ان کے ہمراہ ان کا وہ نوجوان ملازم ہوا کرتا ہے جس کے اوپر ان کے میاں کو کامل اعتماد ہوتا ہے اور اس سے پردہ بھی نہیں ہوتا اور بھائی ان شرعی باتوں میں اب دھرا ہی کیا ہے؟ ذرا تعلیم نسواں کو عام تو ہو جانے دو یہ پردہ وردہ سب طاق ہی میں رکھ دیا جائے گا۔ اور دیکھ لینا یہ عورتیں عیدگاہ میں بھی مردوں کے شانہ بشانہ صف میں کھڑے ہونے کے مساویانہ حقوق کے لیے آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں اگر تحریک نہ کریں تو ہمارا ذمہ؟ اور پھر یہ علی گڑھ کے مولوی عبداللہ صاحب بھی اس تحریک کی تائید پر مجبور ہوں گے کیوں کہ بالآخر عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینا بھی تو ایک طرح کی "کلید کامیابی" ہے۔

افسروں کی عید:

کہتے ہیں کہ مرض گنج ہی نہایت مہلک اور تباہ کن مرض ہے۔ پھر اس پر اگر ناخن بھی بڑھ جائیں تو ایسے انسان کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی۔ بس یہی حال مسلمانانِ ہند کی انگریزی تعلیم اور اس پر کسی عہدہ کے مل جانے کا ہے بڑے مولوی صاحب سے چٹائی پر بیٹھ کر علوم اسلامی کا سبق پڑھنے سے، لیکن جب کوٹ پتلون والے ہندستانی پروفیسر ہوں جن کے دماغ پہلے

ہی مغربی اثرات سے ماؤف ہو چکے ہیں تو ان کے شاگردوں کو عہدہ مل جانا خاصی مصر کی فرعونی بادشاہت ہوا کرتی ہے۔

پس ایسے المعروف بہ مسلمان لوگ اپنے ملاقات کے کمرے کو بانماز جمائل شریف اور مکے مدینے کے نقشوں سے آراستہ کرنے کی جگہ جہاں رابرٹ کمپنی کی میز کرسی اور کلکٹر صاحب ضلع کی تصویر سے آراستہ کرتے ہیں، ان کے ہاں عید کے دن جایئے تو پان، گلگلے اور لکھنؤ والے اصغر علی محمد علی کے عطر کے عوض یا سنگ شو سگریٹ اور فرانس کا لونڈر یا سینٹ ملتا ہے۔ حالانکہ اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ لونڈر لگا کر مسجد میں جانا تک مکروہ ہے۔

عید کے دن ان لوگوں سے ملاقات کو دوست کم اور ماتحت زیادہ جاتے ہیں۔ یہ دوستوں سے بہت تکلف سے معانقہ کرتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ دوست کسی کالج میں ان کے کلاس فیلو رہے ہوں یا پھر ان کے برابر عہدہ پر مامور ہوں۔ ماتحت ملازم بھی آج کے دن ان کے پاس خلوص قلب سے نہیں جاتے بلکہ ملازمتی خوشامد کے سلسلہ میں ان کے گھر جاتے ہیں۔ افسر صاحب اندر سے دریافت فرماتے ہیں۔ کیا نام ہے اگر ملازم نے جا کر نام بتا دیا تو افسر صاحب نے اس کی تنخواہ پر غور کیا۔ اگر پندرہ بیس روپیہ ہوئی تو خادم سے کہلا دیا کہ ابھی سو رہے ہیں۔ کلاں کو تشریف لایئے گا اور جو سو روپیہ تنخواہ کا ماتحت ہوا تو بڑی شان سے باہر تشریف لائے اور عید کا معانقہ فرما کر کرسی پر بیٹھ گئے، مگر خاموش۔ اب اگر ماتحت ہی نے کچھ عرض کیا تو جی ہاں، ٹھیک ہے۔ درست وغیرہ کہہ دیا ورنہ اخبار "پائنیر" میز پر سے اٹھا کر دیکھنے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں فرمایا:

"میں معافی چاہتا ہوں ذرا کام کر رہا ہوں"۔

یہ کہا اور اندر چل دیے۔ ماتحت صاحب نے میز پر رکھا ہوا سگریٹ خود ہی اٹھا لیا اور پیتے ہوئے گھر واپس آ گئے۔

غریبوں کی عید:

انسانی خلوص، محبت، مساوات، رسم و راہ اور احکام اسلامی کی تعمیل و تعظیم اگر ہے تو ان غریب مسلمانوں میں۔ ان کے ہاں عید کیا آتی ہے مصیبت ہی آ جاتی ہے۔ مہاجن کا قرض ہو جائے یا گھر نیلام ہو جائے مگر جب تک بیوی بچوں اور خود بدولت کے کپڑے حیثیت سے بھی

زیادہ قیمتی نہ ہوں عید نہیں ہوسکتی۔ اور یہ سب نتیجہ ہے جمعہ اور عید کے عربی خطبوں کا ورنہ اگر امام لوگ اردو میں خطبہ پڑھتے اور ان کا کندۂ ناتراش مسلمانوں کو اسراف کے لیے ایک دن بھی یہ کہہ دیتے کہ ''دوزخ میں جھونک دیے جاؤ گے'' تو قیامت تک بھی یہ لوگ قرض دار نہ ہوتے۔ یہ حضرات خلوصِ اسلامی کا مجسمہ بن کر عید گاہ ہی سے معانقہ شروع کر دیتے ہیں اور اس میں دوستی یا ملاقات کا کوئی لحاظ نہیں بلکہ جو مسلمان بھی سامنے آ گیا معانقہ کر ڈالا اور ہاں مصافحہ بھی۔ کیوں کہ ان کے ہاں جس کثرت سے دوست آتے ہیں کسی دوسرے طبقہ میں نہیں جاتے، جو سامنے آ گیا ''بھائی صاحب دو چار لقمے'' کا اذن ضرور دے دیتے ہیں۔ ان سے ملاقات کرنے والوں کا تار بہت کم ٹوٹتا ہے کیوں کہ مصیبت یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی معانقہ نہ کرے تو یہ خود جا کر چمٹ جاتے ہیں۔ عید کے بعد ہی سے ان لوگوں کی کمائی کا کافی حصہ قرض میں وضع ہونے لگتا ہے اور پھر سال بھر میٹھی عید کا کھایا پیا یاد آتا رہتا ہے۔ بدقسمتی سے انگریزی معاشرت کا اثر اس طبقہ پر بھی اتنا آ گیا ہے کہ بوٹ، جوتا اور ریشمی موزے خریدے بغیر نہیں رہتے۔ ان کی عورتیں عید گاہ ہر حال میں جاتی ہیں اور ان کے بچوں کے تمام پیسے انگریزی کھلونے خریدنے میں تباہ ہو جاتے ہیں۔

ہماری عید:

رمضان شریف کے عشرۂ آخری سے وہ بات بات پر ہم سے لڑنا شروع کر دیتی ہیں اور یہ سب کچھ عید کے شاہانہ مصارف کے لیے ہوتا ہے۔ ہم چاہے کھدر کا تہہ بند باندھ کر عید گاہ چلے جائیں، مگر ان کے لیے سیاہ پمپ، بنارس کی ساڑی، شلوار اور کلائی پر گھڑی کے ساتھ ہی تمام اعضائے رئیسہ کے لیے زیور بھی لا دیں تب تو شوہر ورنہ خدمت گار۔ (یہاں اعضائے رئیسہ سے وہ اعضا مراد ہیں جو زیور سے آراستہ کیے جاتے ہیں) اور یہ سب کچھ اس لیے کہ کسی معمولی گھرانے کی تو ہیں نہیں بلکہ ایک رئیس خاندان کی چہیتی بیٹی ہیں اور گرلز اسکول کی تعلیم یافتہ بھی۔ اس لیے انگریزی فیشن کی تمام ترکیبوں سے واقف ہیں۔ صرف شوہر کی فرماں برداری سے ذرا ناواقف ہیں جو آج کل کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اِدھر ہمارا یہ حال کہ عید قریب ہوتے ہی بجائے مسرت کے غم والم اور حیرت و یاس کا ہجوم اس لیے ہو جاتا ہے کہ دماغ پایا ہے حساس اور بیدار لہٰذا آج کے دن افلاس کی ہر اذیت بے چین کر دیتی ہے۔ کبھی بھائیوں کے معمولی لباس کو دیکھ کر جی بھر آتا ہے، کبھی اماں بی

کے معمولی کپڑے دیکھ کر کلیجہ خون ہو جاتا ہے، کبھی بہنوں کے پاس زیور نہ ہونے پر آنسو بہاتے ہیں اور بار بار خیال آتا ہے کہ قضاوقدر کے اس بے تکے پن پر تبصرہ کر ڈالیں کہ:

بے ہنر ارجمند و عاقل خوار

مگر پھر بڑے مولوی صاحب کے کفر کے فتوٰی سے ڈر کر چپ تو کیا گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں عید عید ہی نہیں معلوم ہوتی، مگر انھیں گرلز اسکول میں اپنے شوہر کے ساتھ قناعت، صبر و رضا اور ہمدردی کی تعلیم ہی نہیں دی گئی ہے، اس لیے وہ تو بغیر ساڑی کے نماز ہی نہیں پڑھ سکتیں۔ جب دیکھی یہی کہ:

''جاتے نہیں بازار؟''

''عید سر پر آ گئی ہے''

''ننھے میاں کے پاس ایک چیتھڑا بھی نہیں۔''

''میرے کپڑوں کا بھی کچھ خیال ہے؟''

''اور وہ بالیاں کب لاؤ گے؟''

''تو کیا اسی حال سے مجھے میکے بھیجو گے؟''

''اور یہ محلے کی عورتیں مجھے اس حال میں دیکھ کر تمھیں کیا کہیں گی؟''

اتنے میں ہمشیرہ بولیں کہ بھابی جان آپ تو بھائی جان کو اس طرح سمجھا رہی ہیں گویا وہ خود کچھ جانتے ہی نہیں۔ بس ہمشیرہ کا اتنا کہنا تھا کہ ان سے چمٹ گئیں لہٰذا ہم اٹھے اور باہر چبوترے پر جا بیٹھے۔

یوں گزر جاتی ہے غریبوں کی عید، جس کی خبر نہ گورنمنٹ کو ہوتی ہے نہ پولیس کو۔ دعا ہے کہ خدا مسلمانوں کو مسرت و شادمانی کی ایسی ہزار عیدیں دکھائے۔ آمین!

(اخبار 'انقلاب'، لاہور، 23 مارچ 1928)

◆◆◆

رائے

1927 کے انگریزی ماہ نومبر کی خدا جانے کس تاریخ کو حضرت قبلہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب عفران مکان کے ہمراہ برادر مکرم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم۔اے، پی۔ایچ ڈی، پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی ایک بڑی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ یکا یک موصوف کی نظر ہمارے اوپر آپڑی (یہ دور بیٹھنے والے پر نظر جا پڑی کی ضد ہے (آپڑی) ہم نے فوراً ادب سے سلام عرض کیا۔ تو اقتاہ فرما کر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے فرمایا۔

''جی یہ ہیں ملا رموزی''

تو ذاکر صاحب بڑے تپاک سے اٹھے اور ہم سے مصافحہ فرمایا (حالانکہ موقع معانقہ کا تھا) اور یہ بھی فرمایا کہ:

''میں تو جرمنی میں بھی آپ کے مضامین سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔آج آپ کی صورت بھی دیکھ لی''۔

ہم یہ سمجھے کہ او ہو اب تو ہمارے مضامین ڈاکٹر سر محمد اقبال کے پیامِ مشرق اور مثنوی وغیرہ سے بھی بڑھ گئے اور ان کی خوبی اور مقبولیت کا اب یہ عالم ہے کہ وہ جرمنی زبان میں بھی ترجمہ ہونے لگے، مگر ڈاکٹر صاحب کے بیان سے یہ حسرت انگیز تردید بھی ہوگئی کہ جرمنی میں مضامین

پڑھنے سے قیام جرمنی مراد ہے نہ کہ زبان جرمنی۔ ظاہر ہے کہ اس تردید سے ہمارے دل پر ایک ضرب شدید تو پڑی، مگر ہم نے خود کو سنبھال کر فوراً رسالہ ''جامعہ'' کا تذکرہ شروع کر دیا اور ڈاکٹر صاحب کو اپنا یہ احسان بتایا کہ:

''ہم نے جامعہ کے علی گڑھی دور میں وہ مضامین لکھے ہیں جو اصطلاح میں ''معرکۃ الآرا'' کہلاتے ہیں''۔

تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''مگر اب تو آپ نے جامعہ کو بھلا ہی دیا''۔

تو ہم نے بھی فی البدیہہ یہ عرض کیا ''جامعہ تو اب بالکل ہی متین اور علمی رسالہ ہو گیا ہے اور ہمیں متانت سے اتنی ہی وحشت ہوتی ہے جتنی ہندستانی پولیس والوں کو ہڑتالوں سے''۔

تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''آپ اپنے ہی رنگ میں لکھیے''۔

اس لیے بہ الفاظ اخبار ریاست، دہلی ان اوپر کے حالات کی وجہ سے جامعہ میں یہ بدعتی مضمون پیش کرتے ہیں۔ خدا اسے قبلہ مولانا اسلم جیراجپوری کی نظر سے بچائے کہ کہا ہے:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

◆

اس مضمون کا عنوان ہے ''رائے'' اس سے مراد کوئی رائے بہادر یا رائے سینا دہلی نہیں جہاں سرجان سائمن ڈیرے جمائے پڑے ہیں بلکہ رائے سے مقصود قدرت کا وہ گراں منزلت انعام و عطیہ ہے جس پر انسانی عروج و ترقی، اصلاح و رہنمائی، امن و سلامتی کا مدار و انحصار ہے اور اگر یہی چیز برطانوی پارلیمنٹ کو بھی روزی ہوتی تو وہ قیامت تک کمیشن کو ہندستان نہ بھیجتی جس کی وجہ سے دن بھر اپنے شہروں کی دکانیں بند رکھی گئیں۔ ہمیں جہاں تک یاد ہے 'رائے' اس فکری قوت کا نام ہے جو انسان کو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نہایت درجہ صحیح اور مفید مشورہ دیتی ہے اور جہاں تک علم ہے یہی وہ قوت ہے جس کے فقدان، کمی یا غلط روی سے انسان پھر ''دواخانہ یونانی دہلی'' ہی کا محتاج ہو جاتا ہے یا پھر اسے کچھ دن کسولی میں رہنا پڑتا ہے۔ انفرادی حیثیت سے رائے کی قوت انسان کے مزاجی اعتدال یا عمدہ تندرستی سے طاقتور ہوتی ہے اور اجتماعی حیثیت سے افراد ملک کی رائے اسی حالت میں صحیح رہ سکتی ہے جب وہ کسی جامعۂ قومی کے تابع ہوں یا ان پر کسی منتظم

حکومت کا احتساب ہو۔ برخلاف اس کے جن لوگوں کی صحت میں اعتدال نہیں ان سے یہ قوت سلب ہو جاتی ہے اور اسی سے تلون پیدا ہوتا ہے اور وہ چند دن بھی کسی ایک رائے پر قابو نہیں پا سکتے۔ یہی حال ان غلام افراد کی رائے کا ہوتا ہے جن پر ان کو قومی حکومت کا احتساب نہیں ہوتا۔

رائے کی اصابت اور پختگی کا ایک ذریعہ تعلیم و تربیت بھی ہے مگر یہ اپنے ہندستان کا بی۔اے یا ایم۔اے پن نہیں کیوں کہ اس سے تو صرف انگریزی زبان بولنا اور لکھنا آ جاتا ہے (یہ ایم۔اے پن جلاپاپن کے وزن پر ہے) برخلاف اس کے جن لوگوں کو اپنی قومی حکومت حاصل نہیں ان کی رائے میں اصابت اور پختگی نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنی اینٹوں والی مسجدوں میں نمازیں پڑھنے کا طابل نظر آتا ہے اور ایسی ہی قومیں ہوتی ہیں جو عروج و ارتقا اور وحدت و جامعیت کا کبھی منہ نہیں دیکھ پاتیں اور ان میں ہمیشہ افتراق و براہی موجود رہتی ہے، لیکن تم ترکی جامعۂ قومی یا جامعۂ ایران پر ایک نظر ڈالو جہاں مصطفیٰ کمال پاشا اور شاہ رضا خاں کی ایک آواز پر وہاں کے بڑے بڑے ارباب رائے بغیر کسی اختلاف و تردید کے آمادۂ عمل ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے رہنمائے اعظم کے خلاف اپنی کوئی علاحدہ رائے ہی نہیں رکھتے، لیکن ایک اپنا ہندستان بھی ہے جس کے اندر آج 23 کروڑ افراد کی 33 کروڑ قسم کی رائیں بھی ہیں جہاں ہر شخص مختار ہے کہ جب چاہے گا کانگریس، مسلم لیگ، جمعیۃ العلما، ہندو مہا سبھا وغیرہ سے کنارہ کشی کر لے یا لیڈروں میں سے کسی کا مخالف ہو جائے گا۔ پس اس اختلاف رائے کے اسباب یہ ہیں:

(1) کوئی قومی احتساب و سزا نہیں، جس کے خوف سے افراد کی رائے ایک متحدہ مرکز عمل کے تابع رہ سکے۔

(2) صحیح تعلیم و تربیت نہیں جو ان کو ایک متحدہ مرکز کے تابع بنائے رہے۔

(3) قوم کے سامنے خود لیڈروں کا کوئی متفقہ مقصد نہیں۔ گویا خود لیڈروں کی بھی کوئی رائے نہیں۔

(4) قوم کی صحت یقیناً معتدل نہیں اور اس میں امراض یا آلام کو کثرت سے دخل ہے، جس کے اثر سے ان کے دماغ معطل نہیں تو متاثر ضرور ہیں۔

(5) جن لوگوں کی صحت اچھی ہے، جو تعلیم یافتہ بھی ہیں اور صحیح رائے قائم کرنے کے اہل بھی ہیں

ان پر کوئی سزا یا احتساب عائد نہیں۔ لہٰذا ان کی رائے بھی صحت کے اعتبار سے ناقص اور بعض مواقع پر غلط ہو سکتی ہے۔ جیسے ہندستانی لیڈر جن کے اعمال پر کوئی گرفت و پرسش نہیں بخلاف اس کے مغربی ممالک میں ایسے آزاد رائے رکھنے والے لیڈر ہلاک کر دیے گئے ہیں جنھوں نے اظہارِ رائے میں غلطی کی، لیکن ہندستان میں مذکورہ غلطیاں یا کمزوریاں موجود ہیں۔

نپولین بونا پارٹ کے متعلق ایک نہایت پرانے مولوی صاحب نے کہا تھا کہ جب وہ کسی رائے کو ظاہر کرنا چاہتا تھا تو ایک کھلے میدان میں اکڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر گردن کو سینہ کی طرف جھکا تا تھا اور کئی گھنٹہ سوچا کرتا تھا، پھر جو رائے وہ اس غور کے بعد قائم کر لیتا تھا اس پر شدت سے عمل کرتا تھا، لیکن دنیائے انسانیت کے مصلحِ اعظم حضور اقدس و اعلیٰ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا تھا کہ تم اپنی قائم کی ہوئی رائے پر دوسرے ذی شعور لوگوں سے رائے لے لو تا کہ اس کی پختگی پر تمھیں کامل اعتماد ہو جائے اور اسی کو اصطلاح میں ''مشورہ'' کہا گیا تھا اور حضور اقدس علیہ السلام کے اس حکمت افروز کلمہ ہی سے اس امر کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ''رائے'' کس درجہ ذمہ دارانہ یا اہم قوت کا نام ہے جس کے لیے اس قدر اہتمام کی ضرورت ہے، لیکن ہندستان میں یہ کچھ بھی نہیں بلکہ یہاں کا کمسن، کم علم اور نادان طالب علم بھی کانگریس اور جمعیۃ علما کے اعمال و احکام پر رائے دے سکتا ہے اور اس سے وہ اپنے ساتھیوں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ بس اخبار کا پڑھ لینا آ گیا کہ رائے کی تمام ذمہ داریاں گویا آئینہ ہو گئیں۔ اور حق یہ ہے کہ اجتماعی حیثیت سے یہی فکری آزادی یا آزادئ رائے ہے جو ہندستان کی ہر اجتماعی تحریک کی بربادی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ اب ذیل میں ایسے آزاد رائے طبقات کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

علمائے کرام:

مسلمانوں کے اعتقادی نقطۂ نظر سے یہی وہ مقدس و محترم طائفہ ہے جس کی رائے پر مسلمانوں کی جملہ تحریکات کا مدار ہے اور اسی طرح از روئے ضوابط اسلامی یہی وہ طبقہ ہے جس پر مسلمانوں کی زندگی کا انحصار ہے، لیکن مجھے جرأت سے کہنے دیجیے کہ اس محترم طبقہ میں رائے کی ذمہ داری کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ گو ایسے بھی قابلِ احترام علماء موجود ہیں جو رائے کی ذمہ داری کو

بطریق احسن محسوس فرماتے ہیں لیکن ایسے بیدار مغز علماء کرام کی تعداد کم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی متعدد جماعتیں ہیں جو ایسے علمائے کرام کے تابع غیر اصول بلکہ تباہ کن زندگی میں مبتلا ہیں جو اپنی رائے کی ذمہ داری کو محسوس نہیں فرماتے اور جو اجتماعی اور انفرادی رائے کے فرق اور اثر سے بے خبر تو کیا بے پرواہ ہیں۔ جہاں کوئی اجتماعی تحریک رونما ہوئی اور علمائے کرام میں اظہار رائے کا مجادلہ شروع ہو گیا۔ جس نے جو چاہا کہہ دیا۔ ہاں علی گڑھ اسلامیہ کالج، پشاور اسلامیہ کالج، لاہور کے مسلمان طلبا کے لیے جس قسم کی رائے چاہے دے دی جائے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ علمائے کرام اپنی رائے ان مسائل کے خلاف بھی ظاہر فرماتے ہیں جو مجلس مرکزی یعنی جمعیۃ عالیہ علمائے ہند کی متفقہ رائے ہوتی ہے اور علماء محترم کا ایسا آزادانہ اختلاف بھی حقیقت میں کسی قومی یا ریاستی احتساب کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ اور ہندستان میں تو اختلاف رائے نے عقائد تک کو متاثر کر کے جماعتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اکثر ان نیچری لیڈروں کے جلسوں میں لٹھ لے کر گھس جاتی ہیں، جن کے مظاہرے سلطان ابن سعود کی مخالفت میں کثرت سے دیکھے گئے۔

لیڈروں کی رائے:

جب سے مسلمانوں نے علوم دین کی تحصیل و تعلیم بغیر انگریزی تعلیم پر اکتفا کر لیا اس وقت سے یہ قابل نفرت اور نقصان رساں خیال مسلمانوں میں جڑ پکڑ گیا کہ دین اور سیاست دو علاحدہ چیزیں ہیں اور یہ سمجھ لینے کا سبب بھی اسلامی حکومت کا فقدان تھا۔ گو یہ خیال ابھی ہندستان میں جرأت سے ظاہر نہیں کیا جاتا لیکن غیر دینی تعلیم نے اس خیال کو راسخ ضرور کر دیا ہے اور یہ غیر محسوس رفتار سے پوری سرعت سے ترقی کر رہا ہے اور بعض معاملات میں عملی صورت بھی اختیار کر چکا ہے ورنہ علمائے کرام کے بعد لیڈر کوئی دوسری چیز نہیں تھے، لیکن بے دینی کا اثر ہے کہ آج علمائے کرام اور لیڈر دو علاحدہ علاحدہ چیزیں سمجھی جاتی ہیں حالانکہ شرعی اور اخلاقی اعتبار سے دونوں کی ذمہ داری ایک ہی ہے اور اسے جس وجہ سے مضبوط اور صائب ہونا چاہیے وہ ظاہر ہے۔ اور یہ صرف اجتماعی حیثیت سے تو آج تمام ہندستانیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ کہہ دیں کہ صبح سویرے بغیر انگریزی چائے پیے ڈکار لینا بھی حرام ہے۔ یا ہم یہ کہہ دیں کہ ہندستانیوں کا موجودہ کثرت کے ساتھ چائے پینا بھی مغربی لوگوں کی تمدنی یا معاشرتی غلامی ہے۔ پس اجتماعی حیثیت سے ملک کے موجودہ

لیڈروں کی رائے آج جس درجہ ارزاں اور اختلاف افزا ہوا کرتی ہے ظاہر ہے۔ ان حضرات میں اختلاف رائے کی بڑی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے مقابل کی اتباع کو برداشت نہیں کر سکتے اور اسی سے ان کے مزاج یا صحت کے غیر معدل ہونے کا علم ہوسکتا ہے۔ یقین نہ ہو تو قبلہ مکرم حکیم محمد احمد صاحب کو نبض دکھا کر معلوم کر لیجیے اور اسی طرح اظہار رائے میں جو عجلت اس طبقہ کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے وہ بھی لیڈری کی ذمہ داری کے منافی ہے۔ پھر بڑی مصیبت یہ ہے کہ عوام میں ذہنی استعداد نہ ہونے کے باعث اس اختلاف رائے کو بھی اسی طرح قبول و اختیار کیا جاتا ہے جس طرح علمائے کرام کی جماعتوں میں دکھایا گیا ہے۔ اور یہ لیڈروں کے اختلاف رائے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ملک میں بے شمار انجمنیں اور کانفرنسیں نظر آتی ہیں جو کسی صحیح مرکز سے وابستہ نہیں ورنہ اصولاً ہونا یوں چاہیے تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں جمعیۃ علما سے وابستہ ہوتیں کہ ہر اعتبار سے یہی مجلس مسلمانوں کے تمام مسائل کی ذمہ دار ہوسکتی ہے اور مجلس خلافت، مجلس تبلیغ اور مسلم لیگ اس کی شاخیں سمجھی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہندو بھائیوں کے ہاں ''ہندو سبھا'' کو مجلسِ اعلیٰ بنایا جاتا ہے اور اس کا اقتدار شدھی سبھا، آریہ سبھا، ہندو آدی سبھا اور گئو رکھشا وغیرہ پر ہوتا ہے، لیکن ایسا جو نہیں ہو رہا ہے وہ اسی لیے کہ لیڈروں کی رائے پر بھی کوئی احتساب و سزا نہیں۔ یہ ہر جگہ لفظ سزا کے معنی آپ بہ عبور دریائے شور والی سزا نہ سمجھ لیجیے بلکہ اس سے مقصد اعمال کی پرسش یا گرفت ہے یا خوف پرسش مثلاً یہ جو انگریزوں کے خلاف باغیانہ مضامین لکھنے میں ہم انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں سو اسی لیے کہ کہیں ذرا سی غلطی پر کوتوال صاحب ہم سے ملاقات کو نہ آ جائیں یا لالہ لاجپت رائے کوئی باغیانہ کتاب لکھنے میں جو تامل کرتے ہیں سو اسی لیے کہ کہیں جلاوطنی کا معاملہ پھر نہ شروع ہو جائے، لیکن انگریزوں سے بے خوفی اور عدم پرسش کی آزادی دیکھنا ہو تو اپنے مولانا محمد علی و شوکت علی مدفیوض ہما کو دیکھ لیجیے کہ جو انگریزوں کے خلاف یہی لکھتے رہتے ہیں کہ:

''ڈرنا برحق نہیں مرنا برحق ہے''

غرض لیڈروں کی رائے کی ذمہ داری خود لیڈروں کے ذہن میں نہیں، اور اسی لیے ملک بے شمار جماعتوں پر تقسیم ہو چکا ہے۔

ایڈیٹروں کی رائے:

علمائے کرام اور لیڈروں کے بعد ایڈیٹروں کی جماعت ہے جس کی رائے اجتماعی حیثیت سے بے حد عظمت واثر کی مالک ہے ورنہ انفرادی حیثیت سے تو اپنے پیسہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب بھی زندہ ہیں۔ پس اس جماعت کی رائے میں بھی بے حد اصابت، وحدت، اتباع اور سنجیدگی کی ضرورت تھی، لیکن اس جماعت میں تعلیم وتربیت کے نقائص زیادہ کارفرما ہیں اور کوئی ایڈیٹر نہیں جو کسی دوسرے اخبار کی پختہ اور صحیح رائے کی اتباع کو پسند کرتا ہو اور اس لیے اسلامی جرائد کے سامنے کوئی متفقہ مقصد نہیں بلکہ الٹی ترکیب یہ اختیار کر لی ہے کہ بجائے رہنمائی کے عوام کے ذوق کی پیروی کرتے ہیں اور جو کبھی اظہار رائے کا موقع آ جائے تو پھر اس کثرت سے رائیں شائع ہوتی ہیں کہ ان سے ''باہتمام مولوی مقتدیٰ خاں شیروانی'' ہزاروں کتابیں شائع کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اظہار رائے میں انتہائی عجلت سے کام لیا جاتا ہے۔ گویا اخبار کا مقصد ہی یہ ہوا کہ اگر وہ روزانہ ہے تو روزانہ ایک نئی رائے کی اشاعت بھی اخباری فرض ہے اور یہ اسی بے اصول رائے زنی کا اثر ہے کہ ناظرین اخبارات میں بھی کسی اجتماعی رائے کی اتباع کی صلاحیت نہیں بلکہ خود ناظرین اخبارات میں بھی اہل الرائے ہونا ہر خریدار کے لیے ضروری چیز ہو گیا ہے اور یہ طے شدہ معاملہ ہے کہ اخبار کا ہر مضمون پڑھ کر اس پر اظہار رائے بھی کیا جائے جیسا کہ جنگ یورپ میں جرمنی فتوحات پر ناظرین اخبارات میں اظہار رائے ہوا کرتا تھا اور یہ اخبار میں طبقہ ہی کی رائے تھی کہ جرمنی مصر کو فتح کر چکا اور قیصر جرمنی جمعیۃ الوداع کی نماز جامع مسجد دہلی میں پڑھے گا۔ کیوں کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے۔ اس وقت ہم نے بھی رائے دی تھی کہ دیکھنا قیصر جرمنی مسلمان ہونے کے بعد اگر مرید ہو گا تو اپنے خواجہ حسن نظامی کا ورنہ وہ پیر اسی پھرتا رہے گا۔ اس بے راہ روی اور فکری آزادی کا نتیجہ یہ ہے کہ خود اخبار نویسوں اور اخبار بین حضرات کی رائے میں وحدت نہیں اور یہ بھی نتیجہ ہے عدم احتساب کا۔

ہماری رائے:

اس معاملہ میں جہاں تک تجربہ ہوا بس ایک ہم بہت محتاج انسان ہیں۔ قوم تو قوم انفرادی حیثیت سے بھی ہم کبھی اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے اور اس کے ''جملہ حقوق بحق جمعیۃ العلما'' محفوظ

رکھتے ہیں۔ اس کا بڑا فائدہ تو یہی دیکھا کہ آج تک ہم قوم کی نظر میں ''بیوقوف قرار نہ پائے'' اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ خدا کے بے گناہ بندے ہماری رائے کی غلطی سے محفوظ رہے، مگر وہ جو فارسی زبان میں کہا ہے:

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

سو ہمارے دوستوں میں ایک دوست مولوی سید محمد عسکری وکیل مصطفیٰ آبادی بھی ہیں جو علاوہ ایک بے مثل قانون داں ہونے کے ''اہل الرائے'' بھی ہیں۔ وکیل صاحب آج کل ریاست بھوپال میں وکالت کرنے تشریف لے گئے ہیں، مگر ایک زمانہ تھا جب آپ کو علامہ شبلی اور اکبر الٰہ آبادی کے قریب تر بیٹھنے کا فخر حاصل تھا اور ممدوحین مغفور کی یہ انہی علمی وادبی، تاریخی و معاشرتی صحبتوں کا ماحول اثر ہے کہ وکیل صاحب موصوف کو ہم سے اس وقت سے محبت ہے جب ہمارے افلاس کی وجہ سے امیر آدمی ہماری عزت ذرا کم کیا کرتے تھے، مگر وکیل صاحب اس وقت بھی ہمارے پاس یہ کہہ کر تشریف لاتے تھے کہ ''ملا صاحب! جس طرح ارباب ذوق واصحاب علم و فضل علامہ شبلی اور اکبر کی خدمت میں کسب فیض کے لیے جاتے تھے، میں بھی اسی حیثیت سے آپ کے پاس حاضر ہوتا ہوں''۔

وکیل صاحب کے اس خیال میں ایک بات ان کے فائدے کی بھی تھی۔ یعنی وہ خود کو پہلے ہی سے ارباب ذوق واصحاب علم وفضل کے ہم پایہ سمجھ کر ہمارے پاس آتے تھے۔ وکیل صاحب کا دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ میں علاوہ قانون دانی کے مذہب اور سیاست دانی میں بھی فرد ہوں۔ گویا گاماں پہلوان سے لڑنے والے زبسکو ہی ہیں جو وکیل تھا اور پہلوان بھی۔ غرض وکیل صاحب کی ملاقات کا خلاصہ یہ ہوا کرتا تھا کہ ہر بات کے شروع میں وہ فرماتے تھے کہ:

''مگر میری رائے میں تو کانگریس کا وجود ہی بے کار ہے''۔

تو ادھر ہر بات کے خاتمے پر فرماتے تھے کہ:

''جی ہاں۔ مگر میری رائے میں بھی یہ اسلامیہ کالج قوم کی ذہنی حالت کو تباہ کرنے والے ہیں اور میری رائے میں اخلاق ومذہب تو ان کالجوں کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے''۔

غرض لفظ ''میری رائے میں'' کا ہم دونوں اس کثرت سے استعمال کرتے تھے کہ ایک

دوسرے کو فضیلت اور فتح کا موقع ہی نصیب نہ ہوتا تھا، مگر آخر میں وکیل صاحب نے ایک بصیرت افروز نکتہ یہ بتلایا کہ:

''ملا صاحب! یہ جو کچھ اظہار رائے ہوتا ہے، اسے صرف ''خانگی'' ہی رہنے دیجیے''۔

پہلے تو ہم نے کسی قدر غصہ سے اس ''خانگی'' پر غور کیا مگر فوراً ہی سمجھ گئے کہ وکیل صاحب کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنی رائے کو صرف ایک ذاتی خیال سمجھے، ورقومی وملکی مسائل میں ہمیشہ اپنے لیڈروں اور اپنی ملکی وقومی مجالس کی رائے کو قابلِ اتباع سمجھے تاکہ قوم کے متفقہ اور اجتماعی مسائل میں افتراق و برہمی نہ پیدا ہو، مگر یہ تو ہوا اس لیے کہ ہم دونوں قابل ترین انسان تھے، لیکن ان باقی 23 کروڑ ہندستانیوں کا کیا بندوبست ہوگا جو ہر ایک اپنی ذاتی رائے کے موافق اجتماعی مسائل میں رخنہ انداز ہوتا ہے؟ ترکیب یہ ہے کہ جب تک سوراج نہ ملے اس وقت تک قوم کے متفقہ فیصلہ کو اپنی تنہا رائے سے ٹکرانے والوں کا مقاطعہ عرف ''بائیکاٹ'' کیا جائے جس کے خوف سے وہ کسی متفقہ فیصلہ کے خلاف اپنی رائے ظاہر کر سکیں اور جب سوراج مل جائے تو پھر ایسے لوگوں کے لیے وہی وارنٹ گرفتاری، حوالات، گالیاں، چانٹے، گھونسہ، قید، چالان، قید بامشقت، بے نمک مرچ کا سالن۔ پھر عبور دریائے شور اور آخر میں گلے میں باریک سا پھندا۔

خدا ان سزاؤں سے ہمیں اور بڑے مولوی صاحب کو بچائے۔ آمین! ضرورت ہے کہ قوم و ملک کے متفقہ فیصلوں پر پورے زور واحتیاط سے اظہار رائے کیا جائے اور بہتر یہ ہے کہ اتباع کی کوشش کی جائے۔

(رسالہ جامعہ دہلی، فروری 1928)

انیسویں صدی کا خدمت گار

یہ تو اب بڑھاپے کی وجہ سے ہندستان کے "کالا آدمی" سے ہم بہت کم ملتے ہیں ورنہ ایک وہ وقت بھی تھا جب ہر نیا وائسرائے ہندستان کا چارج لیتے ہی سب سے پہلے ہم سے ملاقات کرتا تھا اور ہم پوری وفاداری سے اپنے ہندستانی بھائیوں پر انگریزی قبضہ مضبوط کرنے کے لیے بعض مشہور غدار لیڈروں کی طرح یہاں کی تمام کمزوریوں اور راز کی باتوں کو اس سے کہہ دیا کرتے تھے اور وائسرائے اس کے شکریہ میں ایک آدھ گاؤں، ایک آدھ خطاب، ایک آدھ عہدہ دے کر ہم سے "تھینک یو" کہتا تھا اور لاٹ صاحبوں کی یہ اس ہم نشینی اور مصاحبت کا اثر ہے کہ جناب آج بھی جس امیر و جس رئیس، جس وثیقہ دار، جس تعلقہ دار اور جس راجہ غرض جس قسم کے "کالا آدمی" کے پاس جاتے ہیں وہ بے پردہ کرائے ہمیں اپنے گھر کے اندر بلا لیتا ہے کیوں کہ سوائے پنڈت مدن موہن مالوی کے تمام لوگ جانتے ہیں کہ ہم انگریزوں کے خاص الخاص ہیں اور ہمارے ایک ہی اشارے پر قادیان دارالامان سے لے کر مرکزی خلافت کمیٹی تک پر گورنمنٹ پہرہ اٹھا دے گی۔

پس بڑے بڑے لوگوں کی اس ملاقات اور راہ و رسم سے ہمیں آج کل کے خدمت گاروں کے جو عبرت آموز تجربے حاصل ہوئے ہیں وہ آپ کے لیے ارسالِ خدمت ہیں۔ چنانچہ ایک وہ

وقت بھی تھا جب سرکار معلّی حضور عمر فاروقؓ خلیفۂ اسلام ایسا عظیم القدر بادشاہ اپنے خدمت گار کو اونٹ پر بٹھا کر اس کی مہار پکڑے بیت المقدس میں داخل ہوا تھا اور خدمت گار کے ساتھ اس مساوات ونوازش کا سبب یہ تھا کہ اس زمانے کے خدمت گار زہد و پاکدامنی، امانت وخدا پرستی میں آج کل کے فتویٰ نگار سرکاری علمائے کرام سے کہیں اشرف واعلیٰ ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج کل جس قسم کے خدمت گار مسلمانوں کے محلوں، کوٹھیوں، بنگلوں، عدالتوں اور گھروں میں ملتے ہیں ان کے چند نمونے یہ ہیں:

درجہ اوّل خدمت گار:

وائسرائے ہند کا ہوتا ہے۔ اس کی تعریف اسی قدر ہے کہ یہ علاقہ پنجاب کا کوئی نمازی، پرہیز گار مسلمان ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے وائسرائے ناواقف اور یہ وائسرائے کی بولی سے گھبراتا ہے۔ اس کی داڑھی خاصی سفید ہوتی ہے اور یہ سرخ باناتی شیروانی پر طلائی پیٹی باندھتا ہے۔ اس کا کام صرف وائسرائے کے حق میں دعائے خیر کرنا اور اپنے پیٹ کی خیر منانا ہوتا ہے اور بس۔

درجہ دوم خدمت گار:

رئیسوں کا ہوتا ہے۔ اس کے کارنامے نہ بیان کرنا ہی مناسب ہے۔ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ اصل میں یہ خود رئیس ہوتا ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کرالیتا ہے۔ اس کو خوش رکھنے کے لیے حکومت کے وزراء، علماء، حکماء اور فقہاء تک نماز قضا کر دیتے ہیں مگر یہ پھر بھی کسی سے خوش نہیں رہتا اور آخر وقت تک رئیس سے سلام کرنے کا موقع نہیں دیتا۔ کبھی کہتا ہے حضور چائے پی رہے ہیں۔ کبھی کہتا ہے حضور حجامت بنا رہے ہیں۔ کبھی کہتا ہے حضور آرام میں ہیں۔ کبھی کہتا ہے حضور شکار کی تیاری فرمارہے ہیں۔ غرض ہر طرح عصر کی نماز کا وقت تنگ کر دیتا ہے۔ سنا ہے کہ حشر میں ایسا خدمت گار صرف ذرا دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

درجہ سوم خدمت گار:

ہندستانی جج یعنی "ہائی کورٹ" کا ہوتا ہے۔ یہ دن بھر عدالت کے دروازے پر نہایت غرور سے کھڑا رہتا ہے۔ تمام ماتحت جج، مدعی، مدعا علیہم اور وکلاء جب اندر جانا چاہتے ہیں یہ کہہ دیتا ہے

کہ "صاحب فیصلہ لکھ رہے ہیں"۔ یہ صرف جج صاحب کے لیے رشوتیں فراہم کرتا ہے۔ چہرے پر نہایت مولویانہ انکسار نمایاں رہتا ہے۔

درجہ چہارم خدمت گار:

خانقاہ والے فقیروں اور صوفیوں کا ہوتا ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ یہ ہر نئے مرید کو پیر صاحب کے من گھڑت معجزے اور کرامات سناتا رہے۔ اس کا ٹھکانہ دنیا ہی میں جہنم ہوتا ہے۔ مثلاً وہ پیر صاحب کی ملازمت کی وجہ سے چار و ناچار آدھی آدھی رات لمبے لمبے وظیفے پڑھتا ہے۔ مریدوں کے سامنے دن بھر تسبیح بجاتا ہے تاکہ لوگ اسے کہیں کا بڑا ہی عابد حسین وذاکر حسین اینڈ کو سمجھیں۔

درجہ پنجم خدمت گار:

گھر کا ہوتا ہے اور یہی وہ خطرناک خدمت گار ہے جس کی داستان ملحوظ بیان رہے۔ آج کل جن مالدار مسلمانوں کے گھروں پر خدمت گار ہوتے ہیں وہ عموماً ان کے گھر کے "پروردہ" بچے ہوتے ہیں جو جوان ہو کر ستم ڈھاتے ہیں۔ مسلمان کا مالدار ہونا علامت ہے اس کی غفلت، عیش پسندی، عیاشی اور آرام طلبی کی اور آج کل کے "پروردہ نوجوان خدمت گار" ہر کوتوالی کے رجسٹر میں جاہل، مکار، بدکردار، چور اور دغاباز لکھے ہوئے ہیں۔ نہ ان میں آقا کے حقوق، اس کے نمک اور مرچ سمجھنے کی اہمیت ہوتی ہے نہ یہ خدمت گار خداپرست متقی، پارسا اور تعلیم یافتہ ہوتے۔ بس یہ تو یہ کرتے ہیں کہ آقا صاحب کو ہر وقت خوش رکھ کر ان کے پورے خاندان کے اسی طرح مالک بن جاتے ہیں جس طرح بادشاہ ایران کے پیرس میں عیش فرمانے کے زمانے میں رضا خاں پہلوی نے کر دکھایا اور آج بادشاہ ایران اپنے دارالحکومت کا فاتحہ پڑھنے تک سے محروم ہو چکے۔

گوہاٹی کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی میں ہمیں تقریر کرتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور ہمارے کیمپ پر آئے۔ کچھ دن پہلے "گورنمنٹ پسند" تھے مگر اب "سوراج پسند" ہو گئے ہیں، لیکن کوئی اعتدال پسند یا انتہا پسند نہیں بلکہ "ابتدا پسند ہیں" صوبہ متحدہ کے وسیع و عریض صوبے میں ایک طرف کے ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ ایک میدان میں بہت ڈرتے ڈرتے آ ملے، کہنے لگے:

"مولانا رات کو آپ کی تقریر نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ پہلے بھی گلابی اردو

اخبارات میں پڑھ کر لطف اندوز ہوا کرتا تھا کیا یہ ہوسکتا ہے کہ یہاں سے فارغ ہوکر آپ میرے غریب خانہ کو شرف مہمانی عطا فرمائیں؟"۔

چونکہ یہ "ملا" "مولوی" اور "حافظ جی" قسم کے لوگ، مہمانی، دعوت اور تحفے کو مذہبی عبادت سمجھ کر کبھی ٹالا نہیں کرتے اس لیے مذہبا مہمانی قبول کر کے ان کے ساتھ ہو گئے۔ وطن پہنچے تو دیکھا کہ "جدا مجد کی شاندار کوٹھی" موجود ہے جس کے اندر علی گڑھ کی تعلیم کی رو سے باتھ روم، بیڈ روم، ڈرائنگ روم، ڈریسنگ روم اور باغ میں "بحیرہ روم" تک بنا ہوا ہے، جس میں گھر کے لوگ نہاتے تھے۔ اسی کے ایک کمرے میں ہماری مہمانی والا معاملہ ہونے والا تھا۔ یہ کمرہ بھی سائنس کے بالکل موافق آراستہ تھا، جس میں مہمان کے لیے بجائے مصلٰے، تسبیح، مسواک اور حمائل شریف کے میدانِ انگلینڈ سیفٹی ریزر، بلجیئم کی ایک روپیہ چودہ آنے والی سفید سلی، فرانس کی قینچی، آئینہ، کنگھی، پاؤڈر، تولیہ، پری جمال صابن، بال صفا پاؤڈر اور خضاب لاجواب کے ڈبے کچھ اس قرینے اور سلیقے سے رکھے تھے کہ ہمیں "ہمدرد دواخانہ یونانی دہلی" کا دھوکہ ہوا۔ ایک خاندانی اور نخالص ہندستانی ڈپٹی کلکٹر کے "غریب خانے" میں انگلستانی لوگوں کے برتنے اور استعمال کرنے کے لیے یہ تمام برتن دیکھ کر ہمیں تو غصہ آیا ان انگریزوں پر جواب بھی کہے جاتے ہیں کہ:

"ہندستانی ابھی حکومت کرنے کے قابل نہیں"۔

ڈپٹی صاحب کی اس انگلستانی کوٹھی کے اس "شاندار وہائٹ ہاؤس" میں داخلے کے وقت سامنے والے آئینے میں ہمیں اپنا حلیہ نظر آیا کہ فرقدان مبارک پر کھدر کا نصف تھان بغل میں خواجہ حسن نظامی صاحب کا قرآن آسان قاعدہ۔ ہاتھ میں انگریزی بھینس کی لاٹھی۔ ڈاڑھی بقدر شرع شریف، نصف پنڈلی تک کا دیوبندی چار جامہ عرف پاجامہ۔ پاؤں میں بقدر ڈھائی سیر وزنی جوتا مگر ڈپٹی صاحب کا تحمل دیکھیے کہ انھوں نے اس علی گڑھ کوٹھی میں ہمارے اس "دیوبندی فل ڈریس" پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم اس کوٹھی کے قیمتی قالینوں پر جوتا پہنے ٹہلتے رہے اور چہرے پر کوئی گھبراہٹ پیدا نہ ہوئی تو ڈپٹی صاحب سمجھ گئے کہ ملا صاحب بھی اس کوٹھی کی جدید تہذیب سے واقف ہیں کچھ کچھ اور انگریزی معاشرت اور ایٹی کیٹ کو جانتے ہیں کچھ کچھ۔ بہر حال ڈپٹی صاحب نے فرمایا کہ:

''اسی کمرے میں آرام فرمایئے اور دیکھیے مولانا میرے کچہری کے اوقات میں کوئی تکلیف نہ اٹھایئے گا۔ غفورا آپ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہے گا۔

◆

جان لیجیے اور خبردار ہو جایئے کہ غفورا ڈپٹی صاحب کا اسی قسم کا پروردہ، نمک حلال اور وفادار خدمت گار ہے جس کی علامتیں اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ پس اس غفورا پر ڈپٹی صاحب کو اتنا ہی بھروسہ تھا جتنا وائسرائے کو مالوئی جی اور لاجپت رائے صاحب پر اور یہ تمام بھروسہ محض اس لیے کہ غفورا ڈپٹی صاحب کی عیاشی میں خاصا معاون اور پاؤں دبا کر گھربار کے حالات سے بے خبر کر دینے میں طاق تھا۔ ڈپٹی صاحب کچہری سے آئے کہ غفورا موٹر پر پہنچ گئے۔ آفس بکس لیا، مفلر اٹھالیا، ہیٹ سنبھال لی اور پانیئر اخبار بھی اٹھالیا پھر پوری سرعت سے اس سامان کو مقامات مقدسہ تک پہنچا کر ڈپٹی صاحب کی کرسی پر آ گیا اور اپنے ہاتھ کے رومال سے ڈپٹی صاحب کا جوتا صاف کیا۔ جوتا کھولا، اتارا، رکھا اور جھٹ نیا پانیئر اخبار لا کر ہاتھ میں دے دیا تو ڈپٹی صاحب لیٹ گئے کرسی پر واسطے دیکھنے اخبار کے اور غفورا بیٹھ گئے واسطے دبانے پاؤں کے۔ اس وقت قدرتاً ڈپٹی صاحب کا دماغ کچہری کے دن بھر مدعی حاضر ہے؟، حسب دفع فلاں اور تعزیرات فلاں کی رو سے ویسا ہی معطل تھا۔ اب جو تازہ پانیئر الٰہ آباد ملا تو ڈپٹی صاحب دنیا و مافیہا سے بھی گئے گزرے۔ اب ہیں خاص محویت کے عالم میں اللہ دے اور غفورا لے۔ غفورا نے جو دیکھا کہ ڈپٹی صاحب غفلت، کاہلی اور اعتماد کی وجہ سے کبھی غفورا کی بات کی تحقیق ہی نہ کرتے تھے لہٰذا غفورا نے فوراً نہایت بیمار لہجے میں کہا:

''ہوں۔ آج چھوٹی بیا نے پانچ مرتبہ بازار سے پان منگائے جو کہا کہ اتنے پان کیا کرو گی تو ہزاروں گالیاں دیں اور مارنے کو دوڑیں''۔

ڈپٹی صاحب کے حقیقت ناشناس کانوں میں غفورا کی جو یہ آواز پہنچی تو جھنجھلا کر اخبار پھینک دیا اور فرمایا مگر کس قدر معقول فرمایا:

''ہاں گالیاں بھی دیں؟ اچھا چھوٹی بیا کے آج سے پان بند''۔

لیجیے وہاں چھوٹی بیا کو ان معاملات کی خبر تک نہیں لیکن یہاں غفورا نے اپنا الو سیدھا کر لیا

اور موقع پاتے ہی فوراً پہنچے زنان خانے کے دروازے پر۔ چھوٹی بیا چہاردہ سالہ معصوم سن کے اعتبار سے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اپنی سہیلیوں میں بیٹھی دل بہلا رہی تھی کہ غفورا کی آواز سنی۔ چھوٹی بیا ارے چھوٹی بیا۔ کیا بہری ہو گئی ہو؟ معصوم چھوٹی بیا اس ڈاکو کی آواز سن کر کانپ گئی اور لرزتی ہوئی آئی۔

چھوٹی بیا: غفورا کیا کہتے ہو؟ لو ہم آ گئے۔

غفورا: کہتے کیا ہو خبر بھی ہے کیا ہوا؟

چھوٹی بیا: بدحواسی سے۔ کہو کہو خیر تو ہے کیا ہوا؟

غفورا: خیر ویر کیسی۔ آج میاں آپ سے بے حد ناراض ہیں اور حکم دیا ہے کہ چھوٹی بیا کے پان بند۔

اس حکم کا سننا تھا کہ بے چاری چھوٹی بیا کے ہوش جاتے رہے۔ گھبرا کر کہا تو اب؟

غفورا: تو اب کیسی؟ اور مجھے تنگ کیجیے اور میری باتوں کو ٹال جایئے۔

چھوٹی بیا: غفورا خدا کے لیے کوئی تدبیر نکال کہ میاں ہم سے خوش ہو جائیں۔

غفورا: جی ہاں میں تو میاں کو آپ سے خوش کر دوں، مگر آپ میری بات... کو کبھی نہ مانیے۔

چھوٹی بیا: غفورا اللہ قسم اب ہم تمھاری باتیں مان لیا کریں گے، لیکن تم کسی طرح میاں کو راضی کر دو۔

غفورا: دیکھو چھوٹی بیا سچ کہو۔

چھوٹی بیا: اللہ قسم ہم سچ کہتے ہیں اور دیکھو قسمیں بھی تو کھا رہے ہیں۔

◆

رات کو جب ڈپٹی صاحب احباب کے ساتھ تاش کھیل کر فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ غفورا چاندنی پر بیٹھے ہیں اور دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑے خاموش ہیں۔

ڈپٹی صاحب: غفورا، او غفورا۔ ابے کیسا خاموش بیٹھا ہے؟

غفورا: (ضعیف آواز سے) کچھ نہیں سرکار۔

ڈپٹی صاحب: ابے کچھ تو؟

غفورا: کیا کہوں حضور۔ میرے تو ماں باپ ہیں تو حضور اور دین وایمان ہیں تو حضور۔

ڈپٹی صاحب: اچھا اچھا مگر کچھ کہہ تو سہی؟

غفورا: کہوں کیا حضور مجھے چھوٹی بیا سے جس قدر محبت ہے (گویا پدرانہ) وہ حضور پر حاضر ہے۔ (یہاں پہنچ کر ذرا غفورا نے آواز بھاری کر کے آنکھیں جو ملیں تو ڈپٹی صاحب سمجھے کہ غفورا رو رہا ہے، اس لیے پوری شفقت سے غفورا کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔)

ڈپٹی صاحب: ابے تو کیا لونڈیا نے تجھ سے کچھ کہہ دیا؟

غفورا: جی نہیں سرکار۔ وہ تو میری ہی غلطی ہے۔ میری ہی جہالت ہے کہ میں نے حضور سے چھوٹی بیا کے پانوں کی شکایت کر دی۔ بس بیا نے جو سنا تو اس وقت سے حضور کے خوف سے کانپ رہی ہیں اور مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ (چونکہ ڈپٹی صاحب کو یہ اطمینان ازل ہی سے تھا کہ واقعی غفورا کو چھوٹی بیا سے محض پدرانہ محبت ہے اس لیے چمک کر فرمایا)

ڈپٹی صاحب: چل چل چھوٹی بیا سے کہہ دینا کہ ہم نے معاف کیا۔ اٹھ جا کھانا کھا رات بہت گئی۔

لیجیے ڈپٹی صاحب غفورا ہی کے کہنے پر ناراض ہوئے تھے اور غفورا ہی کی سفارش پر خوش ہو گئے۔ مگر یہ نہ کیا کہ ذرا معصوم و بے گناہ چھوٹی بیا سے بھی اصل معاملہ کی تحقیق فرما لیتے۔

صبح ہوئی تو ڈپٹی صاحب کے ننھے میاں گھبرائے ہوئے غفورا کے پاس آئے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ غفورا آج تو اسکول جانے میں بہت دیر ہو گئی۔ لاؤ ہماری کاپی کے پیسے جو میاں نے تمھارے پاس ہمارے لیے رکھوائے ہیں۔

غفورا: چلو چلو میں اس وقت میاں کے جوتے پر پالش کر رہا ہوں، کچہری کا وقت ہو چکا ہے۔

ننھے میاں: تو غفورا او جو ہمیں ماسٹر صاحب سزا دیں گے؟

غفورا: (بھنا کر) تو میں کیا کروں، میری ایک جان ہے اب چاہے تم لے لو یا میاں لے لیں۔

ننھے میاں: اچھا اچھا غفورا خفا نہ ہو۔ ہم دوپہر کی چھٹی میں آ کر لے لیں گے۔ یہ کہا اور بے چارے آہستہ سے اسکول چلے گئے۔

اسکول جو پہنچے تو ماسٹر صاحب نے کاپی نہ لانے پر ننھے میاں کے نازک اور پھول سے جسم پر پہلے تو رسید کیے دو اوپر دس بید اور پھر بنچ پر کھڑا کر دیا۔ اب بے چارے ننھے میاں یہ بھی نہ کہہ سکے کہ والد بزرگوار نے ہم لوگوں کو اپنے معتمد غفورا کے چارج میں دے رکھا ہے بلکہ آنسو پونچھ کر آ گئے چپ چاپ گھر۔

◆

یہ تھے انیسویں صدی کے وہ نمک حلال خدمت گار غفورا جو اپنے غافل و عیش پسند آقا کی اولاد اور ان کے خاندان پر اس طرح حکمراں تھے اور کیا کہیں کہ کیا تھا۔

ڈپٹی صاحب کے خاندان کے بعد غفورا ڈپٹی صاحب کے ماتحت ملازمین اور ڈپٹی صاحب کے مفلس دوستوں پر بھی حکومت فرمانے کے عادی ہو چکے تھے اور ہم دیکھا کرتے تھے کہ جب کسی غریب اور مفلوک الحال دوست نے آ کر غفورا سے دریافت کیا کہ کیا ڈپٹی صاحب تشریف رکھتے ہیں؟

غفورا نے صاف کہہ دیا آرام میں ہیں۔ باہر نہیں آ سکتے۔ مہمانوں نے اگر غفورا سے کوئی خدمت لی تو اول صاف انکار یا پھر صبح کی فرمائش شام کو پوری کی۔ آخر جناب کب تک۔ ایک دن غفورا نے ہمیں جو ڈانٹا تو ہم نے بھی یا علی کہہ کر پہلے تو ان کے رخسارے پر...رسید کیا اور پھر ڈپٹی صاحب جو آئے تو رکھ دیا ہم نے اپنا سوت کی رسّی سے بندھا ہوا بستر ان کے سامنے اور سفری لوٹا ہاتھ میں لے کر کہا۔ السلام علیکم۔ ڈپٹی صاحب نے گھبرا کر کہا ہیں ہیں مولانا! خیر تو ہے۔ کہاں کہاں؟ ہم نے کہا۔ بس جناب ہم سے آپ کے غفورا کی حکومت دیکھی نہیں جاتی۔ یہ کہہ کر ملعون غفورا کے تمام پوست کندہ حالات انھیں سنائے اور بتا دیا کہ دیکھو یہ ڈاکو تمھاری اولاد اور گھر بھر کے لوگوں سے کس قسم کا ناگفتہ بہ سلوک کر رہا ہے...وغیرہ۔ مگر ڈپٹی صاحب نے اس بد کردار کی تمام ابدا عمالیاں سن کر جو جواب دیا اس سے ڈپٹی صاحب کی غیرت کا اندازہ فرمائیے۔ ارشاد ہوا کہ:

''ہاں مولانا غفورا ہے تو بہت شوخ''

لیجیے ہم نے آٹھ دن گھر پر رہ کر غفورا کے جو راز ہائے درون پردہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ڈپٹی صاحب کو سنائے، ان کا اثر آپ کی غیرت پر اتنا ہی ہوا کہ آپ نے غفورا کو صرف شوخ کہہ دیا اور بس۔

آہ! آج مسلمان امراء اور دولت مندوں کے کتنے خاندان ہیں جو نوجوان لونڈوں کو اپنا معتمد ملازم بنا کر اپنی عزت وناموس اور دولت کو برباد کر رہے ہیں۔ مگر ملازم کے ادنیٰ آرام کو ترک کر کے اس کی دیکھ بھال نہیں کرتے۔ اگر تہذیب اجازت دیتی تو میں ایسے بدکردار ملازمین اور خدمت گاروں کے وہ سیاہ اعمال بھی پیش کر دیتا جو اکثر خاندانوں کی تباہی کا باعث ہوئے ہیں اور غیور وباحیا گھرانوں میں تو جانیں بھی ضائع ہو چکی ہیں۔

پھر کیا میرے عزیز از جان مسلمان امراء اپنے خدام اور بظاہر وفادار ملازمین سے اپنی اولاد اور خاندان کو محفوظ رکھنے پر متوجہ ہوں گے؟

بہترین تدبیر یہی ہے کہ آج کل کے ملازمین سے صرف خدمت گار کا سا سلوک رکھا جائے اور بس:

من آں چہ شرط بلاغ است باتو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر، خواہ ملال

◆◆◆

مشاعرہ

باعث تحریر آں کہ مشاعرہ ایک ایسی چیز ہے جو نہ فقط شعر و شاعری کے لیے ایک معیار اور کسوٹی کا کام دیتا ہے بلکہ اسی کے ذریعہ اقوام اور جماعتوں کی ذہنی فضا بدل جاتی ہے۔ وہ جب کہ دنیا کے کسی شہر سے بھی اخبار 'زمیندار' اور رسالہ 'حسن خیال' شائع نہیں ہوتا تھا یعنی دنیا میں عام مخاطبت اور تبلیغ کے لیے اخبارات اور رسائل کا وجود نہیں تھا تو مکے شریف کے بدوؤں نے یہ ترکیب اختیار کی کہ میدان میں ایک میلہ لگایا اور لگے اس میں مطلع عرض کرنے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک شاعر کا کلام دوسروں تک پہنچ گیا، لیکن آج شاعری کا بہترین معیار یا مبلغ اخبار اور رسالہ ہو گیا ہے۔ معیار اس لیے کہ اگر غزل غلط ہو، لغو ہو، بے فائدہ ہو تو اخبار اسے شائع ہی نہیں کرتا اور شاعر صاحب خون کا گھونٹ پی کر سمجھ جاتے ہیں کہ غزل صحیح نہیں تھی اور مبلغ اس لیے کہ جو غزل اخبار یا رسالہ میں چھپ گئی وہ وائسرائے ہند کی روبکاری تک پہنچ کر رہتی ہے۔ پس غزل کی اشاعت کے اس نئے طریق کے ساتھ ہی مشاعرہ کا ڈھنگ بھی بدل گیا اور اب بجائے مکانوں، کوٹھیوں، بنگلوں اور اٹاریوں کے یہ میدانوں میں برپا ہو جاتا، جہاں بے شمار آدمی تالیاں بجا دیتے ہیں اور ایسے میدانی مشاعروں کو "آل انڈیا مشاعرہ" کہتے ہیں۔ پس جب یہ "آل انڈیا شاعر" پیدا ہو گئے ہیں اس وقت سے مشاعرہ ایک کچہری بن گیا ہے، جس میں حاکم عدالت یعنی صدر بھی

ہوتا ہے اور پیش کار یعنی میر مشاعرہ بھی۔ جس طرح یہ انگریز لوگ قتل کے مقدمہ کو بھی چھوڑ کر بارہ بجے لنچ کھانے کے لیے اٹھ جاتے ہیں اسی طرح مشاعرہ میں دَور رکھے جاتے ہیں اور غزل پڑھتے پڑھتے تمام شاعر باہر جا کر خوب خوب جمائیاں لیتے ہیں، انگڑائیاں لیتے ہیں اور بیڑی سگریٹ یا حقہ پی کر پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسے مشاعرہ کا دورِ ثانی کہتے ہیں، مگر یہ تمام باتیں ابھی لکھنؤ، دہلی، لاہور اور بمبئی میں شروع ہوئی ہیں۔ کہتے تو یوں ہیں کہ دنیا میں ہر چیز کی متوسط حالت اچھی ہوا کرتی ہے لیکن یہ ہندستان کے ایک ''صوبہ جات متوسط'' بھی ہیں جن کی کوئی کل سیدھی نہیں ورنہ ہونا تو یہ چاہیے تھے کہ ہندستان کی ہنر، علمی، ادبی، تاریخی، قومی، سیاسی اور ماہوار تحریک اسی خطہ ہند سے پیدا ہوتی بڑھتی اور کامیاب ہوتی لیکن حالت یہ ہے کہ وسط ہند نام ہے مگر نہ یہاں سے ایک اخبار نکلتا ہے اور نہ ایک رسالہ اور مشاہیر اربابِ علم و فضل کا تو وجود ہی عنقا ہے۔ بس ایک تان سین پیدا ہوئے تھے سو ان کا بھی عرصہ سے ریاست گوالیار میں معاملہ بالخیر ہو گیا۔ اب سالانہ عرس ہوا کرتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ صوبہ جات متوسط میں بس قوال ہی پیدا ہوتے ہیں دوسری نامور ہستیوں میں حضرت ملا دو پیازہ کا نام آتا ہے لیکن وہ بھی مقام ہنڈیا ہردہ میں مزار پُر انور بنے پڑے ہیں اور کوئی فاتحہ تک کو نہیں جاتا۔ رہ گئے ہم حضور ملا رموزی سو اگر قدر دانی کی یہی فضا طاری رہی تو سن لینا کہ ہمارا بھی ''شاندار جلوس'' نکل گیا۔ پھر ایسی علم سوز اور مردم کش سرزمین میں مشاعرہ کا برپا ہو جانا خواجہ حسن نظامی کا فیض نہیں اور کیا ہے؟

◆

اول تو شاعری کا ذوق اربابِ علم و فضل میں پیدا ہی نہیں کیوں کہ لازمہ تحصیل علوم خشکی ہوا کرتی ہے تازگی نہیں۔ علوم میں کامل دستگاہ ہو گئی تو بس ہنسی، مذاق، لطفِ کلام اور عشق و عاشقی سے کام نہیں۔ جب دیکھیے خاموش و ساکت اور دستار فضیلت کے بعد جب تک دن بھر خاموش نہ رہے تو کوئی قابل ہی نہیں کہتا۔ اس لیے اب شاعری بجائے اربابِ علم و فضل کے ''نابالغ لونڈوں'' دفتر اور کچہریوں کے ''منشی جی'' میں پیدا ہوتی ہے اور ایسے ہی کم عمر اور کم علم آج کل ملک الشعرا، استاد الشعرا، حمار الشعرا اور خدا جانے کیا کیا شعرا ہوا کرتے ہیں۔ پھر ایسے حضرات اردو شاعری کو جس درجہ ترقی دے سکتے ہیں اور ان کے مشاعرے جس درجہ باوقار اور علمی ہو سکتے ہیں آپ ہی

اندازہ کر لیجیے۔

ایک لفافہ ملا جس میں لکھا تھا کہ ذیل کے مصرعہ پر طبع آزمائی فرما کر مشاعرہ کو ممنون فرمائیے اور اپنے احباب کو بھی ساتھ لائیے۔ اوپر کی عبارت تو مشاعرہ کا اذن سمجھا مگر یہ "احباب کو بھی ساتھ لائیے" کو کچھ نہ سمجھے۔ وقت مشاعرہ ٹھیک ساڑھے نو بجے شب تھا، مگر جب تہجد کی اذان کا وقت شروع ہوا تو آواز آئی۔

"شروع کیجیے"

صفِ اول کے کوئی پانچ اوپر بیس صاحبزادوں نے جو مطلع عرض کیے ہیں تو آئی نیند غارد اور خواجہ حسن نظامی صاحب کے ہاں کی "قوالی" کا لطف آ گیا۔ جہاں مارے "سبحان اللہ" اور "واہ وا" کے انسان سو نہیں سکتا۔ ان لونڈوں کے بعد طبقہ متوسط کے شعرا نے عرض کیا اور ہم واہ واہ کے گنبد میں جھومتے رہے۔ اب اساتذہ کی باری آئی تو محفل کی تمام لالٹین آپ کے سامنے جمع کر دی گئیں۔ استاد صاحب نے بھی دامن سنبھالے، چشمہ نکالا، لگایا، سنبھالا پھر مسکرائے، پھر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر کھانسے، پھر سکوت فرمایا۔ استاد کے اس بناؤ سنگھار میں شرکاء کی پچھلی صفیں اگلی صفوں کو چیر کر مع "جوتوں" کے استاد تک پیش قدمی کر آئیں اور اب جو استاد صاحب نے "عرض کیا" تو نہ پوچھیے عالم تہ و بالا نظر آتا تھا۔ موافق طبقہ "سبحان اللہ" کے سوا لاحول ولا جانتا ہی نہ تھا۔ البتہ مخالف طبقہ پھبتیوں سے تواضع کر رہا تھا اور اس پھبتی پر دونوں جماعتوں میں "چل گئی" تو پھر کیا تھا ایسا معلوم ہونے لگا کہ کہیں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے اور جوتا، لاٹھی اور اینٹ سے خوب خوب کام لیا جاتا رہا ہے۔ خدا خدا کر کے ہنگامہ فرو ہوا تو ہم نے فوراً یہ مقطع عرض کیا کہ:

غزل وزل تو نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مشاعرہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

یوں ہوا کرتے ہیں اردو کے مشاعرے، جن کے اندر علمی وقار، سکون، تہذیب اور ادبی شان کی جگہ بازاری پن کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ کیا اربابِ مشاعرہ اس خالص علمی و ادبی مجلس کے وقار کے لیے اپنے رنگ کو بدلنے کی کوشش کریں گے؟

◆◆◆

غنودگی

انسان کے اندر ''غنودگی'' بھی خدائے فیاض کی دی ہوئی نعمتوں میں سے وہ لطیف تر نعمت ہے جس کے شکر سے عہدہ برآ ہونا کم از کم ہمارے امکان سے تو قطعاً باہر ہے۔ دنیا کے عظیم الشان مدبر، جلیل القدر، سپہ سالار، باوقار علما، صاحب عظمت وزرا اور شوکت پناہ شہنشاہ سب اس نعمت سے بقدر ظرف بہرہ یاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ یعنی سب ''اونگھتے ہیں''۔ غلط ہے کہ اس کیفیت کا نمایاں اثر صرف افیونی حضرات پر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ گانجا، چرس اور بھنگ اس تاثیر کے محرک ہیں۔ بلکہ یہ جان پرور کیفیت ان سب کی امداد کے بغیر پیدا ہوتی ہے اور جب پیدا ہوتی ہے تو انسان دنیا و مافیہا سے یک لخت...

اس کمترین نے جہاں تک غور کیا غنودگی کا تعلق تین چیزوں سے بہت کافی پایا۔ عمر، موسم اور قوائے جسمانی۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ پچاس برس کی عمر کے بعد لوگ دیوار کے سہارے بیٹھے بیٹھے یکا یک... اگر انھیں کسی نے زور سے آواز دی تو نیم باز آنکھوں سے ذرا دیکھ لیا اور پھر...

موسمی لحاظ سے غنودگی کا غلبہ گرمی کے موسم میں خاص شدت اختیار کر لیتا ہے۔ اکثر یہی ہوا ہے کہ کھانا کھا کر پلنگ تک جانا محال ہو گیا ہے اور بعض بزرگ تو دسترخوان ہی پر... مگر قوائے جسمانی کے لحاظ سے مذکورہ دونوں اصول غلط ثابت ہوتے ہیں جب کہ ہم ریل گاڑی میں معاملہ

اس کے بالکل برعکس پاتے ہیں۔ چنانچہ آپ ریل گاڑی میں چاہے جس قدر نوجوان تندرست آدمی کو سوار کردیجیے اور چاہے جس موسم میں سوار کردیجیے وہ ایک اسٹیشن تک تو کھڑکی سے مناظر قدرت کی سیر میں مصروف رہے گا مگر دوسرے اسٹیشن سے تیسرے اسٹیشن تک کے درمیانی فاصلہ میں وہ کم ازکم ایک سوا ایک مرتبہ... اگر اسٹیشن پر ''گاڑی تین منٹ ٹھہرے گی'' کی آواز سے وہ بیدار ہوجائے تو گاڑی روانہ ہوتے ہی وہ پھر... غنودگی کا غلبہ یوں تو بے حد راحت بخش اور حلاوت اندوز ہے لیکن یہ بعض جگہ نہایت نقصان رساں بلکہ توہین انگیز ہوتا ہے۔ جہاں غنودگی کے پہلے ہی حملہ میں بستر اور صندوق ندارد اور اس لیے اللہ بخشے ہمارے بڑے مولوی صاحب ریل میں اپنا صندوق اپنے کمربند سے باندھ کر بیٹھتے تھے۔ دوسرا نقصان مطالعہ کے وقت ہوتا ہے۔ جہاں آپ نے کتاب کا صفحہ ڈیڑھ صفحہ پڑھا کہ... خصوصاً ایسے طلبا پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جو انٹرنس کے امتحان کے لیے تیاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ اگر چہ نوجوان طلبا بھی اس کے انسداد کی تدابیر اختیار کرتے ہیں مگر سب بے سود مثلاً ہمارے ایک مستند شاگرد نے غنودگی سے تنگ آکر کرسی پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا جو اس حد تک مفید ثابت ہوا کہ وہ مسلسل بارہ صفحات پڑھ گئے لیکن اس کے بعد کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مع کرسی... غصہ میں آکر انھوں نے دوسری تدابیر اختیار کی یعنی اس مرتبہ انھوں نے انگریزی کرسیاں پھینک کر مشرقی قالین کے فرش پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا جس کے معنی یہ تھے کہ اب غنودگی کا کوئی حملہ کامیاب نہیں ہوگا۔ بے شبہ وہ دیر تک پڑھتے رہے لیکن اس کے بعد انھوں نے صرف دونوں کہنیاں قالین پر جمادیں، پھر آہستہ سے دونوں پاؤں پھیلا دیے اور مطمئن تھے کہ غنودگی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی کہ... ہم نے جاکر دیکھا تو کتاب پر سر دھرا ہوا تھا اور خود... بیدار کیا تو جھنجھلا کر رہ گئے اور منہ ہاتھ دھوکر آئے اور اس مرتبہ بہت زور سے چلا چلا کر پڑھنا شروع کیا مگر ابھی آواز میں کوئی دل پسند سُر بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ...

یہ تو تھے غنودگی کے نقصاں رساں پہلو۔ توہین انگیز پہلو نماز باجماعت اور محفل وعظ و میلاد میں دیکھے گئے ہیں۔ مثلاً موسم گرما کی نماز ظہر میں امام صاحب کوئی طویل تر سورت پڑھتے ہیں، لہٰذا اگر آپ مسجد کی صف میں کسی معزز آدمی کے برابر نماز کے لیے کھڑے ہوگئے تو سمجھ لیجیے کہ توہین ہوکر رہے گی۔ مثلاً جہاں امام صاحب الحمد شریف سے آگے بڑھے کہ آپ کو تمام جسم میں

ایک لطیف سنسنی محسوس ہوگی تو آپ ایک پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے اور دوسرے پاؤں کو آرام دیں گے، لیکن سنسنی بڑھتی جائے گی اور آپ کی گردن خود بخود گریبان کی طرف جھک جائے گی۔ پھر کچھ دیر بعد آپ نیت باندھے باندھے پاس والے نمازی پر دھڑا دھڑ... اب اگر اس حالت میں امام نے رکوع کیا تو آپ کو رکوع کرنا محال سا معلوم ہوگا۔ مثلاً آپ نیت کے ہاتھ تو چھوڑ دیں گے مگر رکوع کے لیے خیدہ ہونا معلوم۔ اسی طرح پہلے سجدہ کے بعد جب امام صاحب ہاتھوں کو دوسرے سجدہ میں جانے کے لیے جنبش تو دیں گے مگر درمیان ہی میں... پھر کچھ سر اٹھا کر پڑھنا چاہیں گے کہ... یہاں تک کہ امام صاحب سجدہ سے سر اٹھالیں گے تو آپ گھبرا کر یا تو سجدہ میں بغیر امام کے چلے جائیں گے یا نادم ہو کر ایک ہی سجدہ پر قناعت کر لیں گے اور ہمیں تو نماز باجماعت میں غنودگی کا یہاں تک تجربہ ہے کہ امام صاحب نے نماز ختم کرتے ہوئے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ، مگر یہاں قاعدۂ اخیر ہی میں بیٹھے رہے۔ جب پاس والے نمازی نے کہنی مار کر بیدار کیا تو معلوم ہوا کہ نماز ختم ہوگئی، مگر فوراً سبحان اللہ اور الحمدللہ کہہ کر غنودگی کی خفت کو کم کیا جو تا کام رہی۔ اور اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب چلا کر کہتے تھے کہ جب ایسی ہی نیند آتی ہے تو جماعت سے نماز ہی کیوں پڑھتے ہو؟ اور امرا نے شاید اسی لیے نماز جماعت ترک کر دی ہے؟

وعظ یا میلاد کی محفل میں اگر کہیں جگہ ناکافی ہو اور لوگوں میں گھر کر بیٹھ جایئے اور وعظ کہنے والے قسمت سے بریلی، بدایوں، مرادآباد یا دیوبند کی طرف کے ہوں تو پھر دس بجے رات کے بعد سے غنودگی کا سلسلہ یقینی طور پر شروع ہو جاتا ہے۔ اور لوگ پہلے آہستہ سے آنکھیں کھولنا اور کبھی بند کرنا اختیار کرتے ہیں اور اگر کسی ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں محفل کی روشنی چہرہ تک نہیں آتی تو پھر غنودگی نہایت اطمینان سے آپ کی گردن کو گریبان کی طرف جھکا دیتی ہے۔ پھر دونوں گھٹنے کھڑے کر لیے جاتے ہیں اور ان پر دونوں ہاتھ رکھے جاتے ہیں اور اب جیسے ہی گردن جھکائی کہ... آنکھ کھلی تو کہا سبحان اللہ اور پھر... اس موقع پر سبحان اللہ کے یہ معنی ہوا کرتے ہیں کہ ہم وعظ بہت غور سے سن رہے ہیں اور اونگھتے نہیں ہیں۔ حالانکہ لحہ بہ لحہ... تا آنکہ وعظ ختم ہوگیا لیکن یہاں ہیں کہ... اور اگر وعظ والے مکان میں غنودگی کے وقت سہارے کے لیے کوئی دیوار ہاتھ آگئی تو پھر تمام محفل والے اپنے اپنے گھر جا پہنچے، لیکن یہاں دیوار سے تکیہ دیے... آخر کار صاحب مکان آتا ہے اور کہتا ہے کہ اٹھیے حضرت یہ تبرک لیجیے۔ تب کہیں ایک بڑی سی جمائی لے کر لاحول ولا کہتے

ہیں اور بادل نخواستہ گھر تک آنا پڑتا ہے۔

ہم کوئی حیدرآباد کے وظیفہ یافتہ یا منصب دار اہلِ قلم تو نہیں ہیں کہ فکرِ معاش سے بالکل آزادرہ کر دن کی بہترین روشنی میں انشاپردازی فرماتے ہیں بلکہ دن بھر تو رہتے ہیں دفتر کے ''منشی جی'' ادھر شب کے ابتدائی حصہ میں ننھے میاں کو کھلاتے رہتے ہیں جب وہ سو جاتے ہیں اور وہ بھی سو جاتی ہیں تو آنکھ بچا کر مضمون شروع کرتے ہیں اور کوئی ایک او پر تمیں اخباروں اور رسالوں کے لیے اس وقت مضامین تیار کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس شب بیداری سے خدا معاف کرے صبح کی نماز... مگر اس کو کیا کہیے کہ دین و دنیا کی وجہ نجات محترمہ والدہ صاحبہ اذانوں کے وقت سے اٹھانا شروع کر دیتی ہیں۔ ادھر ممدوحہ کا اثر اور رعب اس قدر ہے کہ چوں نہیں کر سکتے۔ جہاں ممدوحہ نے آواز دی بھیّا! اور آنکھیں مل کر دیکھا کہ اماں بی کدھر ہیں۔ اگر وہ اپنے کمرہ میں نماز کے لیے تشریف لے گئیں تو اب غنودگی نے ہمیں آلیا اور ہم نے پھر تکیہ کی طرف رُخ کیا اور درمیان ہی میں... مگر اماں بی بھی خوب جانتی ہیں کہ ہم آدھ گھنٹہ تک اونگھتے رہتے ہیں، اس لیے وہ بھی آوازوں کا تار باندھ دیتی ہیں۔ جہاں ہمیں دیکھا کہ ہم... کہ انھوں نے فوراً ہوں ہوں اور ہم فوراً تیزی سے ہوشیار تو ہو گئے مگر پھر... اب چارپائی سے نیچے پاؤں لٹکا دیے مگر آنکھیں بند اور... کہ پھر انھوں نے پکارا بھیّا سورج نکلنے والا ہے۔ اب ہم نے تکیہ کو پاؤں پر رکھ کر جھومنا شروع کیا کہ پھر بھیّا! اور ہم فوراً سنبھل گئے۔ ایک دو مرتبہ منہ پر ہاتھ پھیرا، کبھی داڑھی کی طرف ہاتھ لے گئے کہ پھر... یہاں تک کہ اب ننھے کی اماں نے ہمارے پاس پانی کا لوٹا بھی لا کر رکھ دیا تو ہم نے انھیں بہت غصہ سے دیکھا، مگر انھوں نے اماں بی کو سنانے کے لیے مسکرا کر اور بھی زور سے کہا کہ اٹھتے کیوں نہیں ہو، بیٹھے اونگھ رہے ہو۔ وہ تو یہ کہہ کر ہنستی ہوئی کمرے سے بھاگ گئیں اور ہم جھنجھلا کر لوٹا ہاتھ میں لیے گنر کے ''میونسپل بورڈ'' کی طرف چلے۔ اب حسبِ دستور عام صبح چونکہ ہر گھر کے ''میونسپل بورڈ'' میں حاجت مندوں کی کثرت ہوا کرتی ہے لہٰذا اگر اندر سے کسی کے کھانسی کی آواز آ گئی تو ہم وہیں لوٹا ہاتھ سے رکھ کر بیٹھ گئے اور لگے... یہاں تک کہ خاصی صبح ہو گئی اور ہم... غرض دعا ہے کہ خدا صبح کی غنودگی سے ہر شریف آدمی کو بچائے۔ اگر دہلی کے بڑے حکیم جی اس کا کوئی نسخہ تجویز فرمائیں تو ایک بوتل کے خریدار ہم بھی...

◆◆◆

پھر بمبئی تک

اور تو جو کچھ بھی سہی لیکن یہ غنیمت ہے کہ ہمارے ہندستان کے مہاجن لوگ ریل کے سفر میں کسی "خاں صاحب قسم کے مسافر" کے دو چار چانٹے کھا کر اب بھی خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ البتہ یہ انگریزی تعلیم کے باغیانہ اثرات سے اس قدر تبدیلی ضرور ہوگئی ہے کہ یہ لوگ کبھی کبھی سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا کرتے ہیں، لیکن اگر سیکنڈ کلاس میں ایک درجہ سوم کا انگریز بھی انھیں نظر آ گیا تو بے چارے مع ٹکٹ تھرڈ کلاس میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کسی سے کوئی شکایت نہیں کرتے۔

ان لوگوں کے پاس ایک نیلام شدہ ٹین کا بکس، کثیف دغلیظ کپڑوں کی گٹھری میں ایک میلی سی دھوتی، مونگ کے چند خشک لڈو اور پیتل کا ایک لوٹا ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ ریل میں تمام راستہ گلا پھاڑ پھاڑ کر باتیں کرنے کے عادی ہوتے ہیں، اس لیے جس ڈبے میں ایک مہاجن آ بیٹھے ایمان لے آؤ کہ اس ڈبے کا امن عامہ برہم ہو کر رہے گا۔ اب اگر اس شور پر آپ ان کو ایک ہلکی سی ڈانٹ پلا دیجیے تو پھر سیٹھ جی راستہ بھر آپ کو غصہ کے تیوروں سے گھورتے تو جائیں گے مگر زور سے بات نہ کر سکیں گے۔ بریلی، بدایوں اور دیوبند والے مسواک، رسّی سے باندھا ہوا ٹین کا لوٹا، مصلّے، حمائل شریف، تہہ بند، رسّی کے ٹکڑوں سے کسا ہوا موٹا سا بستر اور سلسل بول کے لیے مٹی کے ڈھیلے لے کر ریل پر سوار ہو جاتے ہیں۔ ٹکٹ گھر کے ہجوم، پلیٹ فارم کے قتل عام اور ریل کے اندر

کسانوں کی چپقلش پر لاحول ولا سے عظیم تک کی عربی بولتے رہتے ہیں۔ اودھ اینڈ روہیل کھنڈ کے طرف کے لوگ غسل کے بعد آنکھوں میں سرمہ لگاتے ہیں، عینک لگاتے ہیں، بازو پر امام ضامن اور ہاتھ میں مرادآبادی پاندان لے کر ریل پر سوار ہوجاتے ہیں۔ پھر ریل میں مسافروں سے تمام راستہ تقریر کرتے جاتے ہیں اور تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ ہم شاہی خاندان سے ہیں۔ دادا مرحوم ضلع بارہ بنکی کے رئیس تھے۔ والد مرحوم اودھ کے ممتاز تعلقہ دار رہے اب ڈپٹی کلکٹر سے جو نااتفاقی ہوگئی سو اس نے وثیقہ بھی ضبط کرلیا ہے۔ نواب لڈن میرے بہنوئی اور نواب اچھن میرے خسر ہوتے تھے وغیرہ...

یہ لوگ مرادآبادی پاندان سے راستہ بھر گلوریاں پیش کرتے جاتے ہیں۔ یعنی بہت متواضع ہوتے ہیں۔ امیروں کے سفر میں بہرے خدام اور سکریٹری لوگ شامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تمام درمیانی اسٹیشنوں پر ڈائنگ کار سے انگریزی چائے اور بسکٹ کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ بک اسٹالوں سے انگریزی زبان کے اخبار، رسالے اور ناول خریدتے جاتے ہیں۔ یورپ کے لوگ ہندستانی ریلوں میں نہایت شاندار سفر کرتے ہیں۔ ان کے ہمراہ بے شمار بکس اور بستر ے ہوتے ہیں۔ اُن کی ''اُن'' کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر ہوتی ہے۔ کہیں کہیں ہندستانی مسافروں کو ڈیم بھی کہہ دیتے ہیں اور قلی کو ٹھوکر مار دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا ٹکٹ سیکنڈ کلاس کا ہوتا ہے لیکن پکڑے جاتے ہیں فرسٹ کلاس میں۔

مذکورہ مسافروں میں سب سے زیادہ خوفناک مسافر ہندستانی افسر ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ سوٹ کیس، ہیٹ کیس، شیپ کیس، سگریٹ کیس، سگار کیس اور شب خوابی کے لیے انگریزوں کا ڈھیلا پاجامہ، پری جمال صابن، بال صفا پاؤڈر، سیفٹی ریزر اور اخبار پانیئر ہوتا ہے اور اگر رشوت کی آمدنی معقول ہوئی تو ایک قحط زدہ ہندستانی ملازم بھی ساتھ ہوتا ہے۔ جب اس ٹھاٹھ کے ساتھ یہ ہندستانی افسر ریل میں سوار ہوجاتا ہے اور ریل روانہ ہونے پر لیٹ کر اخبار پانیئر پڑھنا شروع کردیتا ہے تو مارے غرور کے اپنے پاس بیٹھنے والے بڑے سے بڑے شریف ہندستانی کو لالہ مرلی دھر سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔

اتفاق تو دیکھیے کہ اس مرتبہ بمبئی تک کے سفر میں ہمارا ساتھ ایک ایسے ہی فرعون مزاج

بزرگ کا ہو گیا۔

آپ سب صاحب خوب جانتے ہیں کہ جب کوئی ہندستانی ریل کا سفر کرتا ہے تو اس پر اور اس کے تمام گھر والوں پر ایک عام وحشت اور گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے اور جوں جوں ریل کا وقت قریب آتا جاتا ہے یہ گھبراہٹ جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر اس وقت مسافر صندوق میں ٹوپی رکھنا چاہتا ہے تو گھبراہٹ میں جوتے بند کر دیتا ہے۔ شیروانی کی جگہ پاجامہ اور پاجامہ کی جگہ عمامہ بند کر دیتا ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ نہایت اطمینان سے تمام سامان صندوق میں بند کر کے اس کی چابیاں بھی صندوق میں رکھ کر قفل ڈال دیتے ہیں اور پھر تمام گھر میں چابیاں تلاش کی جاتی ہیں۔ کبھی ریل کے کرایہ میں یہی نوٹ تمام گھروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ قریب قریب ایسی ہی وحشت ہمارے اوپر سوار ہو جاتی ہے۔ اور جب سفر کا دن آ ہی جاتا ہے تو ہم مارے وحشت کے کسی بھلے مانس سے ملنے کے قابل نہیں رہتے اور گو وہ نہایت سلیقہ مند اور اسکول کی تعلیم پائی ہوئی ہیں مگر اس کو کیا کہیے کہ سفر کے دن ہماری پیش از قیاس وحشت سے وہ بھی حواس باختہ ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ اس مرتبہ خود انھوں نے ہمارے سفری ناشتہ دان میں پان بند کر دیے اور ہم سے کہا کہ میں نے ناشتہ دان میں انڈے بھی رکھ دیے ہیں۔ غرض ایسی وحشت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مسافر ضروریات سفر تو گھر میں چھوڑ جاتا ہے اور غیر ضروری چیزیں ساتھ چلی جاتی ہیں۔ پھر تمام راستہ وہ ہوتا ہے اور لفظ استغفر اللہ ہوتا ہے۔ پھر ضروریات سفر کے عین موقع پر نہ ملنے سے جس قدر غصہ پیدا ہوتا ہے اس کا اثر کبھی کبھی یہ بھی ہو جاتا ہے کہ ہم آدھے راستے سے گھر واپس ہونے پر تیار ہو جاتے ہیں اور جو کبھی ریل کے لائن کلیر کی طرح ٹکٹ بھی ہر اسٹیشن پر نیا خریدنا پڑتا تو آپ سن لیتے کہ ہم مارے غصہ کے کئی مرتبہ آدھے راستہ سے گھر لوٹ آئے ہوتے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ٹکٹ سیدھا بمبئی تک کا دیتے ہیں اور اسے واپس نہیں لیتے اور اسی لیے تو کہتے ہیں کہ اگر سوراج مل گیا تو جہاں چاہیں گے ریل گاڑی روک لیا کریں گے۔ جس دوست کو چاہیں گے بغیر ٹکٹ کے سوار کر لیا کریں گے اور افسروں کا ٹکٹ تو ہوا ہی نہ کرے گا۔ جیسے ہندستانی تھیٹر والے پولیس افسروں کا ٹکٹ تو ہوا ہی نہ کرے گا۔ جیسے ہندستانی تھیٹر والے پولیس افسروں کے لیے الٹے ہاتھ جوڑ کر پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔ ہمارا سفر دو صورتوں میں واقع ہوتا ہے یا کہیں سے تار آئے کہ:

''اگر صورت دیکھنا ہو تو جلد آؤ''

یا کوئی مخلص مسلمان ہماری تکالیف سے متاثر ہو کر ہمیں تفریح کرانے یا آب و ہوا تبدیل کرانے کے لیے بہ مراسم خسروانہ اپنے ساتھ لے جائے اور چونکہ دونوں صورتوں میں کرایہ آمد و رفت بہ ذمہ خریدار یا طلب گار ہوتا ہے اس لیے ہمیں سفر کے لیے کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑتا۔ بس اپنا ہنڈ بیگ اٹھایا اور سیٹی بجاتے ہوئے گھر سے چل دیے۔ پس ایک ایسے ہی فیاض فطرت اور علم پرور محترم نے ایک دم کہا چلتے ہو ملا صاحب بمبئی؟

یہاں خدا سے چاہتے تھے کہ کسی طرح ان سے کچھ دن علاحدہ ہو کر دماغ کو افکار و آلام سے پاک کرلیں۔ فوراً اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ فیشن پسندی دیکھیے کہ گاڑی روانہ ہونے میں جب کوئی پانچ منٹ رہ گئے تب ہم مع بستر پلیٹ فارم پر بغیر قلی کے داخل ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھبراہٹ میں ایک سیکنڈ کلاس کے اندر باہر سے بستر پھینک مارا جو ایک ہندستانی افسر صاحب کے اوپر جا پڑا۔ خیال تھا کہ ہمارے محترم میزبان نے ہمارا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے لیا ہوگا، بس اس غرور میں آکر جو اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک ہندستانی افسر صاحب نشۂ افسری میں چور اعلیٰ درجہ کے وقار الملک بنے بیٹھے ہیں۔ چہرے سے غرور و نخوت اور اکڑفوں کے نیم انگریزی آثار نمایاں ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ خیر سے نسل کے تھے ہندستانی مگر کسی اسلامیہ کالج میں تعلیم پا کر آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ ادھر سوا سو روپیہ کی نوکری مل گئی تھی بس ہم تاڑ گئے کہ اب یہ افسر صاحب اپنی خاموشی اور غضب آلود چہرے سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے ان کے غرور کے آئینہ کو چور چور کرنے کی تیاریاں شروع کیں اور وہ اس طرح کہ گوڈبے میں ایک سیٹ خالی تھی مگر ہم ان کے برابر جا کر بیٹھ گئے۔ تو انھوں نے نہایت نخرے کے ساتھ ہم سے کہا کہ یہ بستر آپ کا ہے؟ ہم نے پہلے تو ان کے سوال کا جواب ہی نہ دیا۔ وہ سمجھے کہ ہم نے سنا نہیں۔ دوبارہ جب انھوں نے پھر سوال کیا تو ہم نے منہ پھیر کر صرف ''اونہہ'' کہہ دیا۔ اب تو افسر صاحب کا نشہ اور تیز ہو گیا اور آپ نے پہلا انتقامی حملہ یہ کیا کہ اٹھ کر برقی پنکھا اپنی طرف کھینچ لیا۔ ہم نے جواب یہ دیا کہ بغیر کسی انتظار کے فوراً کھڑے ہو کر پنکھے کا رُخ اپنی طرف کرلیا تو افسر صاحب کے غصہ کا پارہ کھول کر قارورہ بن گیا مگر غرور کا تقاضا یہ تھا کہ جو کچھ کریں ہم سے گفتگو کیے بغیر کریں۔ اس لیے اب افسر صاحب نے

آہستہ سے اخبار پائنیر پڑھنا شروع کر دیا ہم نے بھی ایک آنہ کا اخبار زمیندار تان لیا بجائے آہستہ پڑھنے کے بازاری اور دکانداروں کی طرح لگے اسے چلا چلا کر پڑھنے، جس سے افسر صاحب کی تمام انگریزی خراب ہو گئی اور وہ سکون سے پائنیر نہ پڑھ سکے اتنے میں ہوشنگ آباد کا اسٹیشن آ گیا تو افسر صاحب نے بڑے نخرے سے ڈائنگ کار سے انگریزی چائے طلب فرمائی تو ہم نے جھپٹ کر اڑھائی آنے پاؤ والی پوریاں خرید لیں۔ واضح ہو کہ ریلوے اسٹیشنوں پر جو ہندوستانی کھانا ملتا ہے وہ کاغذ یا پتے پر دیا جاتا ہے اور کمال یہ ہے کہ پوریوں کے ساتھ جو آلو یا ترکاری دی جاتی ہے اس کا شوربا بھی اسی کاغذ پر دھر دیا جاتا ہے اور جب تھرڈ کلاس مسافران پوریوں کو ریل چلے جانے کے خطرہ سے پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے کھاتے ہیں تو پوریوں کا یہ شوربا ان کی انگلیوں سے آبشار بن کر پلیٹ فارم پر چھڑکاؤ کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا ہم نے اس بدتہذیبی سے بچنے کے لیے یہ کیا کہ پوریاں لاکر افسر صاحب کے بستر کے قریب رکھ دیں تو شوربے نے اپنا رخ افسر صاحب کی طرف کر دیا اور ہم پوریاں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ اب افسر صاحب نے ہمارے شوربے کو اپنے بستر کی طرف آتا دیکھ کر پہلے تو اپنے بستر کو کچھ کھینچنا شروع کیا پھر ایک دم وائسرائے ہند کا سا چہرہ بنا کر کہا:

''بھائی صاحب دیکھیے میرا بستر خراب ہو جائے گا''۔

مگر ہم نے ان کی اس اضطراب انگریز تنبیہ کا جواب تک نہ دیا۔ اونہہ کہہ کر پھر مصروف خورد و نوش ہو گئے اور جب فارغ ہوئے تو بغیر ہاتھ منہ دھوئے ایک سات نمبر بیڑی سلگا کر پینا شروع کر دی تو اس اندام سے کہ بیڑی کا تمام دھواں ان کی طرف جانے لگا۔ اب جو افسر صاحب کا اس دھوئیں سے دم گھٹنے لگا تو آپ نے لائڈ جارج کے فیشن کا رومال جیب سے نکال کر اپنی ناک پر رکھ لیا مگر ہم کہاں باز آتے تھے کش پر کش تھے کہ لگائے چلے جا رہے تھے۔ آخر کار تنگ آ کر افسر صاحب نے ہم سے انگریزوں کی زبان میں کہا:

''کہاں ہو تم جاتے ہوئے''

اس وقت ہمارے منہ میں بیڑی کا کوئی نصف دھواں باقی تھا اسے ان کی طرف اُڑا کر ہم نے اپنی ملکی اور مادری زبان اردو میں کہا:

''یقیناً آپ ہندستان کے رہنے والے ہیں اور اس لحاظ سے آپ کی مادری زبان اردو ہے اور ہم بھی مولا کے فضل سے ہندستانی ہیں اور اسے آپ خوب جان گئے ہیں پھر کہیے کس لیے آپ ہم سے زبانِ انگریزی میں سوال فرمانے کی جرأت فرما گئے''۔

اس پر افسر صاحب ضرب خفیف تو بہت ہوئے مگر افسرانہ وقار قائم رکھنے کے لیے اب جو اردو بولے تو لہجہ بگاڑ کر۔ پھر ہم نے کہا جناب کا وطن؟ فرمایا بریلی تو ہم نے کہا کہ پھر آپ کا لہجہ تو انتہائی شیریں اور خدام الحرمین ہونا چاہیے یہ آخر زبان میں اکڑ کیوں ہے؟ افسر صاحب کی اس قدر اصلاح کے بعد اب ہم نے ان پر اپنا رعب یوں گانٹھا کہ ان کے پہلے سوال کے جواب میں کہا:

ہم گورنمنٹ ہند کے انتخاب پر جرمنی میں پی۔ایچ۔ڈی کی تعلیم کے لیے جا رہے ہیں۔

افسر صاحب: تو کیا آپ نے ہندستان میں کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کی ہے؟

ہم: جامعہ ملیہ دہلی کے ایم۔ایس سی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایل ایل بی ہیں اور ان تمام امتحانات میں صوبہ بھر کے طلبا کے مقابل اول نمبر پاس مانے گئے ہیں۔

افسر صاحب: مگر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو تو گورنمنٹ اپنے وظیفہ پر منتخب نہیں کرتی، پھر آپ کا انتخاب کیسے عمل میں آیا؟

ہم: جی ہاں یہ صرف جامعہ ملیہ کے اعلیٰ نصاب اس کے طلبا کے اعلیٰ اخلاق اور مسلمانوں کے طاقتور قومی اتفاق پر موقوف ہے۔ اگر آج مسلمان جامعہ ملیہ ایسے قومی وملکی مرکز علم کو اپنا قرار دے کر اپنی تمام طاقتیں اس کی امداد پر صرف کر دیں اور اپنے اہل وعیال کو جامعہ ملیہ میں بکثرت داخل کریں تو گورنمنٹ مجبور ہو کر جامعہ کے طلبا کو بھی وہی قیمت دے جو دوسرے کارخانوں عرف کالجوں کے طلبا کو ملتی ہے (اوپر لفظ اہل وعیال قومی جوش سے لکھ دیا ہے۔ اسے کاتب صاحب کی غلطی سمجھ لیجیے)

افسر: اچھا تو جب آپ انگریزی میں اتنی قابلیت رکھتے ہیں تو آپ انگریزی میں گفتگو سے اس قدر برہم کیوں ہیں؟

ہم: سنو جی! زبان انگریز اس لیے سیکھی ہے کہ بڑی تنخواہ کی ملازمت حاصل کریں اور جو زبان

انگریز میں ہمارے اوپر کوئی حملہ ہوتو جواب دے سکیں۔

افسر: مگر مسلمانوں کی موجودہ "انگریزی یافتہ" جماعت تو مغربی آداب اور معاشرت تک پر سو جان سے قربان ہے۔ پھر آپ اسے کیوں نہیں پسند کرتے اور پھر آپ تو جرمنی جا رہے ہیں۔

ہم: تو اس سے یہ مقصد کہاں ہے کہ ہم جرمنی میں بھی ہندستانی لنگوٹ باندھے پھریں گے۔ یا وہاں کے لوگوں سے واللہ چنانچہ کے ساتھ گفتگو کریں گے۔ اماں تم نے یہ نہ سمجھا کہ ضرورت کے تو ہم اوپر ہی قائل ہو چکے ہیں (یہاں لفظ اوپر بہ معنی پہلے ہی استعمال کیا تھا) ہم تو صرف بے ضرورت مغربی تقلید کے مخالف ہیں۔

واضح ہو کہ اس وقت تک ہماری سلگی ہوئی بیڑی جلتے جلتے ہماری انگلیوں کے قریب آ گئی تھی اور اس کے جلنے والے پتے کی چڑ چڑ آواز سے ہم سمجھے کہ اب بیڑی ختم ہوگئی۔ تو ہم نے ایک آخری کش جو اور لیا تو افسر صاحب نے جلد سگریٹ پیش کیا، مگر ہم نے شکریہ کہہ کر واپس کر دیا اور دم بخود رہ گئے۔ واضح ہو کہ اس تمام مکالمے کے درمیان ہم ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے رہے اور کسی طرح افسر صاحب سے مرعوب نہ ہوئے۔ پس آنے والی نسلوں کو چاہیے کہ ہندستانی افسروں سے ایسا ہی برتاؤ کریں تا کہ ان کے اخلاق ہندستانی ہو جائیں۔

(رسالہ 'پروانہ' دربھنگہ)

◆◆◆

1926 کا مہمان

ایک تو غلامی پھر اس پر تعلیم سے اسلامی تعلیم کا فقدان۔ مسلمانانِ ہند کی عقل ہی نہیں بلکہ فطرت تک مسخ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ ''مہمان اور میزبان'' کے وہ اصول وضوابط جو اسلام نے سکھائے تھے اور جن سے اخوت و برادری کے ان حیات پرور جذبات وتعلقات کا بقاو استحکام مقصود تھا جن پر قوموں اور جماعتوں کی بین الاقوامی بنیادیں رکھی جاتی ہیں، مسلمانانِ ہند سے یکسر فنا ہو چکے۔ چنانچہ آج مسلمانانِ ہند میں جس قسم کے مہمان پائے جاتے ہیں ان کے چند نمونے ذیل میں پیش ہیں۔

علی گڑھ والے کہتے ہیں کہ انسانی تمدن اور سوسائٹی کے لیے سائیکل، موٹر، ریل، جہازوں کا ہونا ہر طرح مفید اور ضروری ہے، لیکن دیوبند والے کہتے ہیں اور بہت ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں قریب قیامت کے وہی فتنے ہیں جن کے بعد دجّال کا جلوس نکلے گا اور ثبوت یہ دیتے ہیں کہ انہی چیزوں کے باعث آج ملک کا غلّہ، گھی، چمڑا، کپڑا، معدنیات اور جوتے تک باہر چلے جا رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ننگے بھوکے اور پیادہ پا پھر رہے ہیں۔ پھر آپ ہی کہیے کہ ان موٹروں اور ریلوں نے کیا فائدہ دیا؟ اور چونکہ ہم مذہبا دیوبند والوں کے طرفدار ہیں اس لیے ہم کہتے ہیں کہ انہی چیزوں نے ''مہمانی اور میزبانی'' کا حساب کتاب بھی تباہ کر دیا ہے۔ مثلاً خدا بخشے جب

ہمارے دادا صاحب زندہ تھے تو ان کے پاس بھی مہمان آیا ہی کرتے تھے۔ طریق یہ تھا کہ جب کوئی مہمان آنا چاہتا تھا تو وہ اپنے وطن سے ہماری طرف آنے والے قافلوں کے ہاتھ خبر بھیجتا تھا۔ اول تو اس زمانے میں تمام قافلے ''اونٹ نشین'' اور ''خچر سوار'' ہوا کرتے تھے اس لیے اول تو ان کا صحیح سلامت پہنچنا ہی موہوم ہوتا تھا پھر اگر پہنچ بھی گئے تو مہمان صاحب کی اطلاع یوں ہوا کرتی تھی کہ:

''اگر ہو سکا تو فلاں ماہ میں آئیں گے ورنہ بارش بعد''۔

گویا اطلاع سے چار ماہ تک تو موسمی رکاوٹ سے میزبان بے فکر ہو جاتا تھا پھر اگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سردی بھی پڑ گئی زناٹے کی تو مہمان صاحب چار مہینے اور ٹھہر گئے۔ اب رہ گئے چار مہینے گرمی کے تو ان مہینوں میں قافلے پانی کی قلت سے سفر ہی نہیں کرتے یا پھر یہ ہوتا تھا کہ طویل راستوں میں ندی، نالے، جنگل، پہاڑ، چور، ڈاکو، رہزن، اونٹ، بیل، گاڑی، خچر اور غازی مرد کی سواری سے مہمان صاحب راستہ ہی میں سلفہ ہو کر پسپا ہو جاتے تھے اور میزبان ان کی میزبانی کے جملہ مصائب سے محفوظ رہتا تھا۔ اکثر یہی ہوتا تھا کہ دادا صاحب مرحوم کے زمانے میں سوائے عزیزوں، رشتہ داروں کے اور کوئی مہمان آتا ہی نہیں تھا لیکن اگر سفر کی مذکورہ مشکلات کے بعد بھی کوئی مہمان آ ہی جاتا تھا تو ایسے مہمان کے لیے دادا صاحب مرحوم ہی کیا ان کے زمانے کے تمام لوگ بکرا یا مرغی ہی ذبح کیا کرتے تھے کیوں کہ برسوں میں آنے والے مہمان کی قدر ایسی ہی ہوتی ہے جیسا کہ کہا ہے:

قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا

لیکن ایک یہ زمانہ ہے کہ ندی چڑھے، طوفان آئے، اولے گریں، بجلی چمکیں لیکن جہازوں اور ریلوں کے ذریعہ مہمان صاحب کی اطلاع تین دن کے اندر اندر دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک نہیں تو ہندستان کے گاؤں گاؤں میں پہنچ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میزبان کیل کانٹے سے لیس بھی نہیں ہونے پاتا کہ مہمان صاحب حاضر۔ پس اس صورت سے آج ملک میں مہمانوں کی درآمد برآمد کی جو رفتار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اس کے نتیجہ میں دیکھنا ایک نہ ایک دن ہندستان میں قحط اور کال پڑ کر رہے گا اور اسی لیے علی گڑھ سے مولوی طفیل احمد ایڈیٹر رسالہ

''سودمند'' چلا رہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سود لینا مسلمانوں کے لیے جائز کردو ورنہ ان کی اقتصادی حالت تباہ ہو جائے گی۔ بہر حال اس وقت جس قسم کے مہمان ملک میں پائے جاتے ہیں ان کی قسمیں ملاحظہ ہوں۔

سرمایہ داروں کے مہمان:

سرمایہ داروں کے ہاں کسانوں اور مزدوروں کی کافی کمائی ہوتی ہے، اس لیے ان کے ہاں سائیکل، موٹر، بگھی، اونٹ، محل، کوٹھی، باغ، بنگلہ وغیرہ بہت کچھ ہوتا ہے۔ ان کے ہاں آنے والا مہمان صرف نصف گھنٹے پہلے بذریعہ تار اطلاع دیتا ہے اور سرمایہ دار کے ملازم اسٹیشن پر ''پرتپاک خیر مقدم'' کے بعد اسے ایسے نظر فریب و روح پرور محل میں ٹھہرا دیتے ہیں جو اگر اپنے ہاں کے بدھو خاں تمبا کو فرش کو مل جائے تو مارے خوشی کے دو منٹ ہی میں بلغ العلے بکمالہ ہو جائیں۔ یہ مہمان ایک ہفتہ سے لے کر ایک مہینہ اور ایک برس بھی رہ سکتا ہے۔ اپنے سرمایہ دار میزبان کے ہاں سے پاسنگ شو سگریٹ، نیوی کٹ اور امپیریل سگریٹ کے بکس پینے کو۔ ناشتے میں چائے، کیک، ولایتی بسکٹ، انڈے، حلوہ، انار، سیب، انگور اور کیلا۔ کھیلنے میں ہاکی، کرکٹ بلیرڈ، تاش۔ کھانے میں مرغ مچھلی کے کباب، مزعفر پلاؤ، چٹین، قورمہ۔ سوتے وقت بجلی کا پنکھا، بجلی کی روشنی۔ پاؤں دبانے کے لیے خدام ملتے ہیں۔ اس قسم کے مہمان اور میزبان ہر وقت انگریزی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ گویا یہ مادر زاد یورپین ہی تو ہوتے ہیں۔ ان میں کبھی قومی، مذہبی، اصلاح اور ہمدردی کے عنوان پر گفتگو نہیں ہوتی۔

ملازم مہمان:

اس حصہ میں وہ مسلمان شریک ہیں جو ''صرف انگریزی زبان دانی پر'' تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ گویا ان کے بعد تمام دنیا کے علوم پڑھے ہوئے جاہل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کالجوں سے نکل کر سیدھے ملازمت میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ ان کی مذہبی ناواقفیت کا یہ حال ہوتا ہے کہ سیدھی طرح اذان دینا بھی نہیں جانتے۔ جب یہ ملازمت شروع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ''صاحب'' سال کے آخر میں طویل چھٹی پر ولایت جاتا ہے، اس لیے یہ بھی چھٹی لے کر ''وطن'' جاتے ہیں۔ اب اگر راستہ کے کسی شہر میں ان کا کوئی کلاس فیلو، اسکول فیلو یا یونیورسٹی فیلو رہتا ہے تو یہ اس کے

ہاں ایک ہفتہ ضرور قیام فرماتے جاتے ہیں اور کلاس فیلو صاحب ان کی تواضع میں علاوہ مالی مصائب کے ''اپنے دفتر سے رخصتِ اتفاقیہ لے کر'' انھیں شکار اور سیر و تماشے دکھلانے کی مصیبت بھی برداشت کرتے ہیں۔اس قسم کے مہمان اور میزبان میں بجائے قومیت، مذہبیت کے ملازمانی ،دفتری اور کالج کے واردات ماضیہ پر گفتگو رہتی ہے۔

عزیز مہمان:

رشتہ داری کا وسیع ہونا تو چنداں مضائقہ کی بات نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ دولت بھی کافی ہو ورنہ ان رشتہ دار مہمانوں کی صورت پر میزبان کو کبھی نور ہی نظر نہیں آتا۔ان کے آنے سے میزبان کو روحانی مسرت ضرور ہوتی ہے اور اگر ان کے ساتھ چار چھ من وزن کے بچے کچے بھی ہوئے تو تب تو دن عید اور رات بھر شب برأت کا مزہ آتا ہے۔لیکن ان کے جانے کے بعد میزبان کو گھر کی صفائی، گھر کا انتظام، گھر کے بستر ے اور گھر کے برتن خصوصیت سے دوبارہ خریدنے پڑتے ہیں۔ عزیز مہمانوں کے سلسلہ میں میزبان کے لیے سیٹھ جمنالال بقال کا قرض دار ہونا لابد ولازم ہے کیوں کہ ابھی مسلمانوں میں شیخی کا مادہ فنا نہیں ہوا۔ایسے مہمانوں اور میزبانوں کے درمیان حمیدن، وحیدن، بنّے میاں اور ننھے میاں کی منگنی اور نکاح کی باتیں ضرور ہوتی ہیں۔

ہم وطن مہمان:

یہ مہمان اگر آپ کو پردیس میں مل جائے تو سمجھ لو کہ بہت جلد آپ کو دیوالیہ نہیں تو کہیں کا ''داروغۂ جیل'' ضرور بنا دے گا۔ہم وطن مہمان دو صورتوں سے خالی نہیں ہوتا۔یا وہ کہیں سے اغوا، اقدام قتل، مداخلت، سرقہ یا مارشل لا کے کسی نہ کسی جرم میں مبتلا ہو کر فرار ہوتا ہے اور پردیس میں آپ کو ہم وطن پا کر آپ کے ہاں پناہ لیتا ہے اور دوسرے ہی دن بذریعۂ وارنٹ آپ کو بھی پناہ دہی کے الزام میں جیل تک نہیں تو ''کوتوال صاحب'' کے سامنے لے جا کر ان سے دو چار بے طرح غزلیں ضرور سنوا دیتا ہے۔یا پھر وہ مفلس، مفلوک اور برطرف ہو کر تلاشِ معاش میں آپ کے پاس پردیس میں آتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ علاوہ میزبانی کے جملہ مصارف کے بہ تلاشِ معاش اور سفارش کی گھوڑ دوڑ میں بھی میرے ساتھ شرکت کیجیے یہاں تک کہ وہ ایک دن اس شہر میں آپ کے نام سے کسی بھلے مانس سے کوئی رقم لے کر سیدھا گھر...اس قسم کے مہمان اور میزبان میں اپنی

اپنی پریشانیوں کا اظہار ہوتا رہتا ہے اور بس۔

علمی مہمان:

اب وہ دن تو گئے جب ارباب علم وفضل اور اصحاب کمال کی قدر و عزت کائنات عالم کی ہر چیز سے زیادہ تھی۔ وہ دن بھی گئے جب محمود و اکبر بادشاہ کے دربار میں شیراز سے سعدی، مکہ معظمہ سے خواجہ حافظ اور افغانستان سے فردوسی بلائے جاتے تھے اور ہر صاحب علم وکمال کے استقبال کے لیے خود بادشاہ بذریعہ سائیکل کوسوں دور جاتا تھا اور جب تک یہ علمی مہمان ان کے ہاں رہتا تھا بادشاہ اور امرائے شہر اس پر زر و جواہر نثار کیا کرتے تھے۔ اللہ بخشے خود دادا صاحب جب اکبر بادشاہ کے دربار میں جاتے تھے تو تین تین ماہ مہمان رہتے تھے اور رخصت ہوتے تو علاوہ جواہر و خلعت کے انعام میں ''مواشی'' بھی لاتے تھے اور دادا صاحب مرحوم کے یہ انہی انعام مواشی کی وراثت کا سلسلہ تو ہے کہ آج ہم صاحب علم وقلم ہو کر بھی ''ہل ہی چلا رہے ہیں''۔ غرض اب تو علمی میزبانی یہ ہے کہ آپ فلسفۂ عالم اور نظم کائنات پر حکمت و معارف سے لبریز کتاب لکھ دیجیے اور جا ٹھہر یے کسی شہر کی سرائے میں، پھر مہینوں پڑے رہے اگر اس عرصہ میں آپ کی یہ معرکۃ الآرا کتاب کوئی ''بک ایجنسی'' چند جلدوں کے معاوضہ میں خرید لے تو اسے ''حسنِ اتفاق'' سمجھیے قدر دانی نہیں اور جو یہ کتاب لے لے کوئی ٹیکسٹ بک ایجنسی تو بس خود کو ہندستان کا شیکسپیئر تصور کیجیے۔ غرض آج کل لیڈر، مقرر، مصنف، ناول نویس، ڈراما نگار، شاعر اور ایڈیٹر خصوصیت سے علمی مہمان کہلاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے آنے سے مسرت ہوتی ہے۔ ایسے مہمان کے لیے میزبان دن اور رات کے کسی گھنٹہ میں خاموش نہیں رہ سکتا کیوں کہ اس قسم کے مہمان اور میزبان میں دن رات کسی نہ کسی علمی موضوع، سیاسی مسئلے اور قومی مرحلے پر تھکا فضیحتی ہوتی رہتی ہے۔ ایسے مہمان کو شہر کے ''بہترین'' اور نظر نواز مناظر دکھانے پڑتے ہیں۔ چلتے وقت مہمان بہ اجازت نہیں تو بے اجازت میزبان کے کتب خانے سے چند نادر کتابیں لے جاتا ہے کیوں کہ سنا ہے کہ کتابوں کے سرقہ پر علمی لوگ حشر میں پکڑے نہیں جائیں گے۔

مان نہ مان مہمان:

یہ مہمان تمام قسم کے مہمانوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ ہمیشہ

بلا بلائے اور بلا اطلاع آتا ہے اور پھر ٹالے نہیں ٹلتا۔ اس قسم کے مہمان ذیل کے وجود سے پیدا ہوتے ہیں:

1۔ یا وہ نوعمری ہی سے آوارہ ہو۔
2۔ یا اس کی سوسائٹی اور احباب متمول اور فارغ البال ہوں اور اس کی کفالت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہوں۔
3۔ یا اسے بے ٹکٹ دنیا بھر کے شہر دیکھنے کا شوق تو کیا انفلوائنزا ہو گیا ہو۔

اس قسم کے مہمان کی عملی قوتیں مردہ اور بے کار ہو جاتی ہیں اور اس میں ذیل کی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں:

1۔ وہ بے بلائے معمولی سے معمولی ملاقاتی کے ہاں مع ایک خفیف سے بستر اور ایک صندوق کے حاضر ہو جاتا ہے۔
2۔ اس میں شرم و حجاب کا مادہ باقی نہیں رہتا۔
3۔ وہ بلا وجہ میزبان کی ہر بات پر ہنستا اور خوب خوب داد دیتا ہے۔
4۔ وہ قصہ گو اور لطیفہ گو ہوتا ہے۔
5۔ وہ عامل، رمّال اور وقت پڑے تو نجومی بھی ہو جاتا ہے۔
6۔ وہ ہمیشہ میزبان کے ذوق کے موافق باتیں کرتا ہے۔
7۔ وہ عیاشی کے متعلق بھی قیمتی معلومات بہم پہنچاتا ہے۔
8۔ وہ برمحل اشعار خوب چست کرتا ہے۔

اس قسم کا مہمان میزبان کی روٹیاں ہی تناول نہیں فرماتا بلکہ کپڑا، جوتا، بستر اور بس پڑے تو اہل و عیال کے لیے منی آرڈر بھی وصول کر ڈالتا ہے۔ اس کی عمر اسی گداگری میں گزرتی ہے۔ اس کی گفتگو کا موضوع وہی ہوتا ہے جو میزبان کی دلچسپی کا باعث ہو۔ یہ میزبان کے گھر سے عزت کے ساتھ رخصت نہیں کیا جاتا بلکہ نکالا جاتا ہے، مگر اس پر بھی وہ بجائے سیدھا گھر جانے کے پھر کسی دوسرے شہر میں مہمان بن جاتا ہے۔ خدا راقم الحروف کے دوستوں کو اس مرض سے بچائے۔

◆

اب اسی قسم کے ایک مہمان اور راقم الحروف سے جو پالا پڑا اور جس کے اثر سے یہ مضمون لکھا گیا وہ بھی سن لیجیے۔ سچ کہا ہے کہ اس زمانے میں بی۔اے پاس نہ کرنا افلاس و تنگ دستی کا مستند سرٹیفکیٹ۔ پس جب ان دیوبند والوں کے کہنے سے ہم انگریزی زبان ایم۔اے تک پڑھ کر بھولے ہیں آج تک وہی میر صاحب بنے پھر رہے ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ انھیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ ایک کم دس متعلقین اور پانچ اوپر تیس روپیہ ماہوار آمدنی میں جیسی گزر کرتے ہیں ہم جانتے ہیں یا وہ جانتی ہیں۔ پس رات کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے کہ آ گئے۔ آواز آتے ہی ہم پہچان گئے اور سمجھ لیا کہ اب دو تین ماہ تک ٹلنے کے نہیں۔ اس لیے گھبراہٹ میں ترکیب یہ کی کہ 'اُن' کے ذریعہ کہلا دیا کہ وہ تو کانپور گئے ہیں اور کوئی دو تین ماہ میں واپس آئیں گے، مگر مہمان صاحب کا جواب ملاحظہ ہو ارشاد ہوا کہ:

اچھا بیٹی میں ہوں... لو یہ ذرا بستر رکھ لو اور اندر سے کمرہ کھول دو۔ اس کو کہتے ہیں مداخلت بے جا بہ خانہ بوقت شب۔ پھر حکم صادر ہوا کہ بیٹی تانگے والے کے پیسے ہاتھ بڑھا کر دے دو۔ اسے کہتے ہیں استحصال بالجبر۔ احکام کی تعمیل کی گئی تو کمرہ میں آ گئے۔ پہلے دو چار مرتبہ بے ضرورت کھانسے پھر فرمایا کہ بیٹی اگر کچھ کھانا ہو تو دروازہ سے دے دو وغیرہ۔ اب کے بلا وساطت ہمارے اُن سے یہ باتیں کرنا ''اغوا'' نہیں تو اور کیا ہے؟ اِدھر ہم اس شش و پنج میں کہ یا خدا ہم نے تو کہلا دیا ہے کانپور کا اب جو کل ہم اسی گھر سے برآمد ہوئے تو پھر؟

غرض چار و ناچار پہلے دن تو کھڑکی کے راستہ سے دفتر چلے گئے، مگر شام کو جب گھر آئے تو معلوم ہوا کہ ''بیٹی بیٹی'' کہہ کر اس وقت تک ہزاروں فرمائشیں کر چکے ہیں۔ اب کوئی ان سے دریافت کرے کہ یہ پانچ ہزار زرِ نقد مہر ادا کرنے کے بعد ہماری منکوحہ جائیداد ان کی بیٹی کہاں سے ہوگئی؟ بہرحال ان سے ملے تو گھبرا کر فرمایا کہ ہیں آپ کہاں؟ آپ تو کانپور گئے تھے؟ جی میں تو آیا کہ کہہ دیں کہ اچھا جب ہم کانپور جا چکے تھے تو پھر آپ ہمارے گھر میں کہاں؟ مگر آئیں بائیں شائیں کر کے چپ کر دیا تو انھوں نے بھی زیادہ تحقیق گوارا نہ فرمائی کیوں کہ انھیں تو مہمانی سے کام، کسی کے افلاس سے کیا واسطہ؟ اِدھر تعلیم کے زمانے میں مولویوں میں جو رہے ہیں تو انھوں نے آخرت کے عذابوں سے ڈرا ڈرا کر ہمیں اس قدر خلیق، متواضع اور ملنسار بنا دیا ہے کہ اب ان

نیچریوں کی طرح بے مروت اور خودغرض بھی نہیں بن سکتے، اس لیے تھوڑی دیر کے لیے اخلاقاً ان کے پاس جو بیٹھ گئے تو بس آ گئی مصیبت اور مہمان صاحب نے ہمارے ذوقیات کا اندازہ کر کے سیاسیات عالیہ سے لے کر گاندھی، محمد علی، شوکت علی اور شدھی سنگھٹن کے جملہ لوازم واسباب پر تقریر کرڈالی اور ستم بالائے ستم یہ کہ فنِ انشاء پر اعتراض کر کے ہمارے مضامین پر تنقید بھی کرگزرے، مگر داد دیجیے ہم کو کہ ہم نے مہمان کو یوں خاموش کیا کہ جمائیوں کا تار باندھ دیا اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو فی منٹ ایک سوایک ضرب جمائی کی سرکیں تو مضمحل ہو کر فرمایا کہ اچھا تو آپ آرام فرمایئے۔

پورے ڈھائی مہینے کی مہمانی کے بعد نے ہم یہ ترکیب کی کہ انسپکٹر صاحب سی آئی ڈی سے اپنے نام اس مضمون کا فرضی خط لکھوایا کہ آپ کے ہاں جو صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں وہ مشکوک ہیں۔ ہم نے جب سی آئی ڈی کا یہ خط قبلہ مہمان صاحب کو دکھایا تو گھبرا گئے اور اسی دن کی ریل سے...

◆◆◆

خوش طبعی

اگر آپ کو کسی قوم کی علم دوستی، صحت فکری، تحقیق فاتحانہ اور جہاں کشا جذبات، بلند حوصلگی، مروّت اور عزم کامل ایسی عدیم النظیر قوتوں کا اندازہ کرنا ہے تو اس کے افراد میں ظرافت اور خوش طبعی کی قوت کو تلاش کیجیے۔

خوش طبعی کو بعض لوگ خوش دلی، ظرافت، تلفن، زندہ دلی، مزاح، مذاق، ہنسی، دل لگی بھی کہتے ہیں، لیکن اردو اخبارات میں اس لطیف ملکہ کو افکار و حوادث، دو دو باتیں، مطائبات، فکاہات، نکات و لطائف، گپ شپ، نمکداں، سر راہے، افکار حاضرہ، باغ و بہار، کف گلفروش، راز و نیاز، پھلجھڑیاں اور دیوبند میں خواطر و سوانح بھی کہتے ہیں۔ کہیے کیا سمجھے؟

خوش طبعی ایک ایسی قوت ہے جو ہر انسان میں موجود ہوتی ہے بشرطیکہ وہ لندن سے ہندستان میں افسر ہوکر نہ آئے۔ مگر اس قوت کے زندہ رکھنے یا ابھارنے والے چند مخصوص محرکات ہیں مثلاً وہ مرد یا مردنی کسی ایسے حصۂ زمین پر پیدا ہوا ہو یا پیدا ہوئی ہو جس کی آب و ہوا میں اعتدال، ترقی اور علو و برتری کے اثرات ہوں اور وہ شخص 18 یا 20 سال کی عمر تک دریائے گومتی کا پانی بھی نوش نہ فرمائے اور یہ اثرات ایسی ہی زمین کو حاصل ہوتے ہیں جہاں گرمی سے زیادہ سردی اور ژالہ باری سے زیادہ برف باری ہوتی ہو۔ پس ایسی ہی زمین والوں کو آزاد خیالی درجہ اول،

تندرستی درجہ اول اور ظرافت پسندی درجہ اول عطا کرتی ہے، لیکن جو قومیں کہ سورج کے بالکل ہی نیچے آباد ہیں خواہ وہ ہندستانی ہی کیوں نہ ہوان کے اندر افسردگی درجہ اول اور بدصورتی درجہ اول۔ پست ہمتی درجہ اول، بدمذاقی درجہ اول، خشکی درجہ اول اور بلغم درجہ اول عطا ہوتا ہے اور اگر ایسی قوموں کو غلامی بھی نصیب ہو جائے تب تو ان میں بے حسی، جمود، تاریک خیالی اور مردہ دلی درجہ اول بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسے افراد جو زندہ دلی کے جوہر سے عاری ہوتے ہیں ان کی صحت اور دماغی جودت ہمیشہ بے تک سی ہوا کرتی ہے۔ جیسے اپنے ہاں کے مہاجن کے پاس سوائے موٹاپے اور چپ سادھے رہنے کے اور کچھ نہیں، لیکن اگر غلامی کی فضا اور غلامی کی تعلیم کسی قوم میں طاری و ساری ہو تو اس کے جملہ اقسام کے افراد پر مردہ دلی، وحشت، چپ، غصہ، مالیخولیا، مراق، بدحواسی اور جنون کے ساتھ ہی غرور، نخوت، خود پسندی، اکڑفوں اور غرفیش کا بھوت، جن اور چڑیل تک سوار ہوگی اور جب دیکھو وہ مارے نخرے کے ''گورنر جنرل باجلاس کونسل'' بنا ہوا نظر آئے گا۔ چنانچہ ثبوت میں ہندستانیوں ہی کو دیکھ لو۔

◆

قاعدہ کی رو سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سب سے زیادہ خوش طبع لوگ وہ ہوتے جو علم و عقل کی دولت سے سرفراز ہیں، لیکن گیہوں اور گھی کی گرانی کے لیے یا پولیس والوں کی فوجداری کہ ہندستان کا تعلیم یافتہ آدمی ہی خشکی، مردہ دلی اور نخوت میں سب سے آگے نظر آتا ہے اور پھر غلامی کی عقلمندی یہ کہ اس جاو بے جا خشکی کا نام رکھا ہے وقار و متانت۔ چنانچہ آپ کسی بڑے فاضل ہندستانی کے مکان پر جا کر صرف آواز دے دیجیے بس وہ اگر گھر میں بیٹھا قہقہہ بھی لگا رہا ہے تو باہر آ کر آپ سے یوں ملے گا گویا وہ گھر میں بیٹھا رو رہا تھا یا رونے والا تھا یا رونے ہی کو تھا یا آپ نہ آتے تو وہ رو ہی پڑتا یا رو کر رہتا۔ یا روتا ہی رہتا۔ یا آپ کی ملاقات کے بعد وہ رو کر ہی رہے گا یا رہے گی۔

آپ کسی پرانے تعلیم یافتہ کے پاس جایئے وہ گھر سے باہر دانتوں میں خلال کرتا ہوا آئے گا پھر ڈکار بالجبر اور انگڑائی بالمشافہ لیتا ہوا دو چار جمائیاں بھی لے گا اور ضرور جمائی لے گا (یہاں ڈکار بالجبر اور انگڑائی بالمشافہ کی صرفی نحوی ترکیب پر غور نہ کیجیے) پھر وہ آپ سے خیریت و خیر

وعافیت از درگاہِ خداوند کریم شب و روز نیک چاہ کر دیگر احوال جو کہے گا تو اس قدر کہ مسواک اور جانماز، وضو کا لوٹا اور صرف و نحو یا منطق پر بحث کے بعد اگر زیادہ خوش دل ہوگا تو ملکہ افغانستان کی بے پردگی پر دو چار سنا دے گا۔ خلافت والوں کو چندے کا چور ثابت کرے گا اور اخبارات کی خبروں پر بھروسہ کرنے کو حرام قطعی ثابت کرتا ہوا گھر میں چلا جائے گا۔ اس وقت آپ زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ لاحول ولا استغفراللہ نعوذ باللہ اور یرحمک اللہ کہتے ہوئے واپس آجائیں گے مگر آپ اسے کبھی مسکراتا ہوا بھی دیکھ پائیں بلکہ وہ گھر میں یہی کہتا ہوا سنا جائے گا کہ:

''اجی تم بڑی مسرف ہو پانی اس قدر کیوں صرف کرتی ہو، وضو مکروہ ہو جاتا ہے''۔

پھر آپ نئی جماعت کے صاحبِ علم و فضل کے پاس جائیں گے تو یہ بھی سگار پیتے ہوئے یا سیٹی بجاتے ہوئے باہر آجائیں گے اور آتے ہی خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلما، کانگریس، سر آغا خاں، مولانا محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاں، سالک بٹالوی، مقاطعہ جوگی یا لیٹ جانا بہ امید سوراج، یا پولیس کے ڈنڈے کھانا بحصولِ سوراج کو برا بھلا کہہ کر کسی پہاڑ پر ایک ''شانتی نکیتن'' عرف اسکول بنانا مفید عام و خاص ثابت کر کے پھر گھر میں چلے جائیں گے، مگر بقدر نصف سیکنڈ بھی ان کے چہرے پر خوش دلی، مسرت یا لطافت یا تبسم نظر نہ آئے گا اور الٹا حلیہ یوں بنالیں گے کہ چہرے کی داڑھی، مونچھ، بھوں، پلک اور عمامہ باندھنے کی جگہ کو استرے سے اتنا گھونٹ کر رکھ دیں گے کہ آپ اسے کبھی کبھی تانبا بھی کہہ سکیں۔ کھدر کی ایک ساڑی نما چادر بدن پر ہوگی یا پا برہنہ یا پاؤں میں دو آنے والی چپلی ورنہ کھڑاؤں۔ یہ گویا ہندستانی فلاسفۂ حکما اور اربابِ عقل و خرد کا خلعتِ فاخرہ ہوا کرتا ہے جس میں تفنن، خوش دلی اور خوش طبعی کا کہیں گزر ہی نہیں اور ان لوگوں کو دیکھ کر آپ کو مان لینا پڑے گا کہ ہندستان کا علامہ نہ کبھی مسکرایا تھا، نہ آج مسکرائے گا، نہ کل نہ پرسوں، نہ ترسوں نہ سرسوں۔ اب یہاں سے آپ اگر کسی کالج زدہ یا یونیورسٹی رسیدہ نوجوان عرف گریجویٹ کے مکان پر پہنچ گئے تو آپ اس کے دروازہ پر نہ دستک دے سکیں گے نہ یہ کہہ کر آواز دے سکیں گے کہ:

اماں ذرا باہر تو آؤ۔

تو آخر کب تک کھڑے رہیں؟۔

لو یہ جاتے ہیں۔ تم خود شام کو میرے گھر آجانا۔

نہ آپ اس کے دروازے کی کنی کھٹکھٹا سکیں گے نہ ہلا سکیں گے نہ بجا سکیں گے نہ چھو سکیں گے اور نہ اس گھر کے کسی بچہ سے یہ کہہ سکیں گے کہ:

جاؤ اپنے ابا کو بلا لاؤ یا اپنے ابا کو باہر بھیج دو یا اپنے میاں سے کہنا کہ کوئی باہر بلاتا ہے یا اپنے ابا جان سے کہہ دینا کہ کالے خان آئے تھے سلام کہہ گئے ہیں یا اپنے ابا کو ہمارے گھر ٹھیک پانچ بجے بھیج دینا دیکھو بھولنا نہیں۔ اچھا سن لیا یا سنا بھی کہ نہیں؟ یا سنتے بھی ہو کہ نہیں؟ یا سمجھے بھی کہ نہیں؟ یا کہو گے بھی کہ نہیں؟ یا بلاتے ہو کہ نہیں؟

اور یہ گھر سے باہر بلانے کے تمام دیسی طریقے آپ اس خوف سے اختیار نہ کریں گے کہ صاحب مکان ہیں گریجوٹ ایسا نہ ہو کہ اس قسم کی حرکات سے وہ ناراض ہو جائیں؟ کیوں کہ مزاج کے ہیں بہت تیز یعنی خشک، اس لیے آپ یہ کریں گے کہ ایک ایسا ''کارڈ زادہ'' ان کی خدمت میں پہنچائیں گے جس پر آپ کا نام انگریزوں کی زبان میں لکھا ہوگا۔ پھر آپ ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیے جائیں گے مگر انتظار کا وقت آپ اس طرح نہیں گزار سکتے کہ کرسی پر بیٹھ کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ لیں اور اس میں سے ایک ٹانگ کو دوسری ڈانگ پر رکھ کر مسلسل ہلاتے بھی رہیں یا کوئی مصرع گنگناتے رہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ گریجویٹ صاحب خانہ سگار پیتے ہوئے آپ کے پاس آئیں گے۔ اب اگر انھیں معلوم ہو گیا کہ آپ ان سے عہدے، تنخواہ اور دولت میں کم ہیں تو یہ گریجویٹ صاحب آپ کے ہر مسئلہ پر گفتگو تو کریں گے لیکن ہنسی، شگفتگی اور تبسم کو چہرہ کے قریب نہ آنے دیں گے کہ وقار و متانت میں کمی نہ آ جائے۔

◆

اب لکھے پڑھوں کی اس خشک دنیا سے نکل کر آپ ایک ہندستانی تاجر کے پاس جائیں گے۔ یہ شخص دکان کے دروازہ پر ایک گول میز کے اندر بیٹھا ہوگا۔ خواہ یہ دکان بمبئی، کلکتہ یا کم از کم دہلی کے کسی ایسے حصہ میں ہو جہاں شام کے وقت اپنے خواجہ حسن نظامی صاحب کے بیٹھ جانے کا امکان ہو۔ عام اس سے کہ اس دکان کا نام ''بھیا احسان'' کی دکان ہی کیوں نہ ہو؟ پس اس ہندستانی تاجر کا نام اگر جنرل مرچنٹ نہیں تو ''اینڈ سنز'' ضرور ہوگا۔ اس کا لباس کثیف سے بھی زیادہ کثیف ہوگا۔ چہرہ کا رنگ قند سیاہ اور قد اپنے مولانا احمد سعید صاحب جمعیۃ والوں کے برابر،

جسمانی توانائی کا یہ عالم ہوگا گویا ابھی ابھی پٹیالہ میں زبکسو کو چت کر کے آرہے ہیں۔ یہ تاجر تہمد ضرور باندھے ہوگا یا باندھے بیٹھا ہوگا یا باندھ رہا ہوگا یا باندھنے کے لیے کھڑا ہوگا یا باندھ کر بیٹھ رہا ہوگا یا باندھنے کے لیے اٹھ رہا ہوگا یا باندھتا جائے گا اور آپ سے بھی باتیں کرتا جائے گا یا باندھ ہی رہا ہوگا کہ آپ پہنچ جائیں گے۔ پھر آپ اس سے کھانے پینے کے متعلق جس قدر سوالات کریں گے ان کے جوابات یہ نہیں بلکہ اس کے دوسرے لنگوٹ بند ملازم دیں گے جو ہوٹل میں ادھر اُدھر چائے کی پیالیاں بجاتے پھرتے ہوں گے۔ پھر آپ دام ادا کرتے وقت اگر اس تاجر سے کوئی سوال کریں گے تو یہ تاجر چھ لیبارٹری کا سارا دھواں آپ پر اُڑا کر جو جواب دے گا اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ:

لینا ہو تو لو ورنہ رستہ صاف کرو۔

اور جو آپ نے کسی چیز کے داموں میں کمی چاہی تو یہ تاجر آپ کے تمام پیسے پھینک کر لڑنے مرنے کو بھی کھڑا ہو جائے گا، مگر اس کے چہرہ پر ہنسی، خوش طبعی یا تبسم کی کوئی خفیف سی حرکت بھی محسوس نہ ہوگی۔

پھر آپ یہاں سے ہندستانی فوجی آدمی کے پاس جائیں گے تو آپ اس کو مونچھوں کو اوپر کی طرف چڑھا ہوا پائیں گے۔ وہ تو تڑاق سے بات کرنے کو بھی تیار ملے گا لیکن اگر اسے یہ اطلاع مل جائے کہ تم کل ملک چین کے لام پر جاؤ گے تو اس کی تمام آن بان کافور ہو جائے گی اور یہ گھر میں والدہ، والد، بھائی اور ان سے مل مل کر روئے گا اور روتا رہے گا اور والدہ سے لام پر نہ جانے کے لیے دعا کرائے گا۔ تعویذ باندھے گا اور جب بس نہ چلے گا تو ملازمت سے استعفا دے دے گا، مگر یہ نہ ہوگا کہ وہ ہنسی خوشی لام پر چلا جائے۔ یا جاتے وقت بھی اس کے چہرے سے تبسم اور خوش طبعی کے آثار نمایاں ہوں۔

یہ سب کچھ نتیجہ ہے غلامی، افلاس، بے ہنری، جہالت اور ضعف صحت کا اور ہندستان میں دماغی اور ذہنی لطافت کا فقدان اب اس قدر بڑھ گیا ہے کہ جن لوگوں کے نام عبداللطیف، لطیف بیگ اور لطافت حسین ہیں ان کے چہروں پر بھی کبھی تبسم اور خوش دلی نظر نہ آئے گی۔ خوش طبعی کو تباہ کرنے والی چیزوں میں ''ننھے میاں کی والدہ'' تفریحات سے گریز، بڑے مولوی صاحب کے ہم

عمر لوگوں کی صحبت میں رہنا اور ہمارے مضامین کا مطالعہ نہ کرنا بھی داخل ہے۔ آج کل خوش طبعی کو زندہ رکھنے کا بہترین ذریعہ کسی کلب کا ممبر بن جانا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندستانی کثرت سے ایسے کلب بنائیں جہاں سب کے سب جمع ہو کر خوش طبعی کی قوت کو بڑھانے، زندہ رکھنے اور حاصل کرنے کی تدابیر پر عمل پیرا ہوں کیوں کہ جس قوم سے خوش طبعی رخصت ہو جائے وہ دنیا میں مشکلات اور مصائب کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور سوراج بغیر مصائب برداشت کیے حاصل نہیں ہو سکتا۔
اس لیے کوشش کیجیے کہ آپ دن رات میں ایک گھنٹہ بہت زور سے یا ذرا زور سے یا کسی قدر تیزی سے ہنس لیا کریں یا ہنسا دیا کریں اور اس کا بہترین ذریعہ اخبار ''ہمدرد'' کی خریداری ہے اور وہ بھی مستقل خریداری۔ یہ نہیں کہ آپ محلہ کے کسی خریدار سے مانگ کر پڑھ لیں۔ کیوں کہ ''ہمدرد'' میں آپ ہمارے مضامین انشاء اللہ تعالیٰ پڑھیں گے۔ یہاں لفظ انشا اللہ آئندہ کے معاوضہ میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''ہمدرد'' کی اشاعت انشاء اللہ تعالیٰ میں ہمارا نہایت پر لطف مضمون شائع ہوگا انتظار کیجیے۔

◆◆◆

شادی

از

حضرت ضیاءالملک مُلّا رموزی، فاضل الٰہیات ایم۔اے۔آر۔ایس (لندن)

یعنی

حضرت مُلّا رموزی مشہور لطافت نگار کی شادی کے خودنوشتہ حالات کی دلفریب تفصیلات

از

مُلّا رموزی

فہرست مضامین

انتساب

اپنے والدین کے نام

قبلہ محترم وکعبہ مکرم حضرت عالی شاہ سید صالح محمد مدظلہ العالی اور حضرت صاحبۃ العظمت سیدہ صغریٰ خانم مدظلہا نام ہیں، اُن عزیز از جان بزرگوں کے جن کی بلند پایہ خدمتوں اور درد میں ڈوبی ہوئی دعاؤں کے سہارے آج ملا رموزی کو اس کتاب کے لکھنے کی صلاحیت حاصل ہوئی ہے اور ان بزرگ و برتر ہستیوں کی عظمت پر جب قرآن محترم ایسی جلیل المراتب کتاب گواہ ہے تو ملا رموزی کی بساط کیا جو وہ ان کے برتر از قیاس حقوق کو ادا کر سکے۔ چونکہ کتاب ہٰذا کے مسائل انھی بزرگوں کی مسرت کی یادگار ہے اس لیے بھی نیز اس لیے کہ اگر یہ کتاب قومی خدمت سمجھی جا سکے تو اس کے اجر و ثواب کی سعادت کو بھی میں انھی ممدوحین محترم کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ والسلام

خدمت گزار

مُلا رموزی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

انسانی زندگی کی تکمیل کا ایک اندازہ معین ''شادی'' بھی ہے۔ یہ وہ مرتبۂ حیات و زندگی ہے جہاں انسانی عقل و فراست، اخلاق و عادات اور کاروباری حالات، پختگی، سنجیدگی اور تجرباتی اشارت کی ایک ایسی حد کو پا لیتے ہیں جس پر مدار ہے، اجتماعیات ہے انسانی کا، تمدن و تہذیب کا، علم و معرفت کا، ترقی و اصلاح کا، ہدایت اور بین الاقوامی تاثرات و مسائل کا۔

دنیا جہان کی ہر قوم اور جماعت میں شادی ایک محمود و مسعود اور ضروری کام سمجھا گیا ہے کہ اس کے بغیر انسانی ترقیاں بے کار اور غیر یقینی ہیں۔ مسلمانوں میں بھی ''شادی'' خیر و برکت اور تکمیل زندگی کا ایک لائق عمل سبب مانی گئی ہے، بلکہ بعض حالات و شروط کے ساتھ ایک سے لے کر چار عورتوں سے شادی کرنا بھی انسانی فلاح و کامرانی کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے اور یہ ایک ایسے حکیم و بالغ نظر رسولؐ خدا کا عمل ہے جس کی مقدس و محترم زندگی کا کوئی ایک فعل بھی آج تیرہ سو برس تک عقلا و ارباب فضیلت کے نزدیک غلط ثابت نہ ہو سکا۔

ہندستان میں آٹھ کروڑ مسلمان آباد ہیں، لیکن اس طرح کہ وہ محکوم ہیں، اس لیے کامل

دوسو برس کی غلامی اور مغلوبیت یا غیر اقوام سے میل جول اور ربط وعلاقے سے مسلمانانِ ہند کی قومی زبان، قومی لباس، قومی آداب و عادات اور دینی اخلاق و اوصاف میں بے شمار غلط کاریاں پیدا ہوگئی ہیں، ان کی دینی اور قومی حکومت کے مٹ جانے سے ان پر جو کوئی احتساب و سزا باقی نہیں رہی تو ان میں فکری اور فعلی آزادی اور بے اندازہ فضولیوں اور بے اعتدالیوں نے راہ پائی اور اسی سے ان کی اجتماعی زندگی کچھ سے کچھ ہو کر رہ گئی۔ اب نہ ان میں قومی حمیت اور عصبیت کا پتہ، نہ قومی وحدت و جامعیت باقی، نہ قومی رسوم و اخلاق کا نشان، نہ قومی مرکزیت حاصل اس لیے شادی ایسا اہم اور اجتماعی کام بھی آج مسلمانوں کے لیے بجائے فلاح و کامیابی کے نقصان و ہلاکت کا سبب بن گیا ہے۔

ملا رموزی مسلمانانِ ہند میں ایک مضمون نگار، انشا پرداز، ادیب، مصنف اور تحریری مصلح یا ادبی لیڈر مشہور ہیں اور ان تمام ناموں کی ذمہ داری مصلحانہ اور واعظانہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ ایسا آدمی ہر اُس چیز کو قوم کے سامنے پیش کردے جو اس کی نظر میں قوم کے فائدے کی چیز ہو، لہٰذا ملا رموزی کی شادی بھی ایسے بے شمار حالات و اثرات کو لیے ہوئے ہے جن میں مسلمانوں کو تباہی سے بچنے کا راستہ مل سکتا ہے اس لیے ان حالات کو بصورتِ کتاب محفوظ اور پیش کیا جارہا ہے۔

ملا رموزی کو ''گلابی اردو'' اور ''نکاتی اردو'' کا موجد کہا جاتا ہے اور عہدِ حاضر کے تمام اربابِ فن نے اپنی اپنی تحریروں کے ساتھ ملا رموزی کے جس کمال کو تسلیم کیا ہے وہ یہی کہ ملا رموزی زبانِ اردو میں دو بالکل ہی اچھوتے اور بے مثل اسالیبِ انشا و خطاب ہے کے موجد و مالک ہیں، لیکن ملا رموزی کی تحریر کی ایک خصوصیت ''اصلیت نگاری'' بھی ہے جسے کتاب ہٰذا کی نسبت سے یہاں بیان کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ یہ امر واقع ہے کہ ملا رموزی کی ہر تحریر واقعات نگاری یا ''اصلیت نگاری'' سے لبریز ہوتی ہے یعنی ملا رموزی کے مضامین میں علم و حکمت، منطق، فلسفے، بیان و کلام اور بلاغت سے جو بحث نہیں ہوتی تو اسی لیے ملا رموزی کا بیان ایسی علمی کتابوں کے حوالے اور استدلال سے بھی خالی ہوتا ہے بلکہ تمام مضامین تازہ حالات و تاثرات اور فطری کیفیات اور اصل اسباب و ضروریات سے آراستہ کیے جاتے ہیں اور اسی لیے ملا رموزی نے اپنے

مضامین میں کبھی غیر اصول مصنوعی اور نا قابل یقین کیفیت کو پیش نہیں کیا مگر کسے خبر کہ اپنی اس ''اصلیت نگاری'' میں ہمیں کن صبر آزما مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے؟

مثلاً پہلی تکلیف جو ہمیں ''اصلیت نگاری'' میں برداشت کرنا پڑی وہ یہ کہ بے خبر اور کم نظر احباب نے ہمیں بے وقار انسان کہا اور سمجھا۔ دوسری تکلیف یہ کہ ہماری ''اصلیت نگاری'' سے ہماری شہرت کے وقار کو صدمہ پہنچا۔ تیسری تکلیف یہ کہ اپنی لطافت نگاری کے باعث بعض کم رتبہ اور کم علم افراد کو ہم سے بے خوف ہو جانے کی جرأت ہوئی۔ لیکن ہم نے قوم کے فائدے کی خاطر ان چیزوں کی کبھی پرواہ نہ کی اور ہمیشہ انھی حالات کو لکھا جو فطرت اور قانونِ فطرت کے عین موافق تھے۔

مضمون نگاری کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہی ''اصلیت نگاری'' ہے اور اصلیت نگاری کا آلہ ''ایکٹ'' ہے یا ''نقل'' اور کسی حالت کو ظاہر کرنے کے لیے ''ایکٹ'' کرنا اربابِ بصیرت کے نزدیک تو مستحسن اور لائقِ ستائش فعل ہے کہ قوم کے فائدے کی خاطر علامہ شبلی، حالی اور سرسید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایسا ہی کیا ہے لیکن کم نگاہوں کے نزدیک معیوب سی بات ضرور ہے۔

لیکن انشا و خطاب کی اس صنعت کو ہم نے اس تکمیل کے ساتھ اختیار کیا کہ خود ہماری اصلیت مشکوک سی ہو کر رہ گئی اور آج کم ہیں وہ جو ملا رموزی کی اصل زندگی یا اصل حیثیت سے واقف ہوں، جب کہ مضامین کے اندر کبھی ایک بالکل ہی تہی دست، قلاش، مفلس اور تنگدست کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی یوں کہ حکومت برطانیہ کے وزیر خارجہ ہیں تو ہم اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل ہیں تو ہم اور یہ اس لیے کہ ہم نے اپنی تحریروں میں ان تمام مراتب کے لوگوں کا ایکٹ کیا ہے۔

بالجملہ مقصد یہ ہے کہ اس کتاب میں بھی ہم نے اصلیت کو اپنے ہی ساتھ منسوب و متعلق ثابت کر کے ان تمام مدارج کو واضح کر دیا ہے جن سے مسلمان شادی کرتے وقت گزرتے ہیں اور سوائے ان چند باتوں کے جو قانوناً یا اخلاقاً نا قابلِ بیان ہیں باقی کی تمام باتیں یوں بیان کر دی ہیں گویا واقعی ہماری ہی شادی ہوئی ہے؟

چونکہ یہ کتاب محض اصلیت اور فطری کیفیات پر مشتمل ہے اس لیے اس میں کسی ایک

کتاب سے ایک حرف او رلفظ کی امداد بھی نہیں لی گئی ہے اس لیے دعا ہے کہ خدائے خطا پوش ارباب نظر کی نظر سے حسن قبول عطا فرمائے اور اصحاب علم وخرد اس کی خامیوں کو بھی اس کی او رملا رموزی کی خوبیاں ہی سمجھیں۔ آمین۔

ملا رموزی

27 رجب المرجب 1348 ہجری اسلامی، مطابق 30 دسمبر 1929

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شادی کی ضرورت

انسانیت کی تکمیل وتہذیب، عروج وترقی اور نظم وانصرام کے لیے شادی کی فرضیت اور ضرورت ہر قوم اور ملک میں مسلّم ہے۔ ہندستان میں بھی اس ضرورت سے انکار تو نہیں کیا جاتا لیکن اسے ''خوفناک'' اور ہلاکت بار ضرور کہا جاتا ہے، جس کا اصل سبب آگے بیان کیا جائے گا۔

دنیائے انسانیت اور بنی نوع بشر کے مصلح اعظم اور مسلمانوں کے ہادی ومرشد رسول خدا حضور احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو ''عمل خیر'' کہا ہے اور ایسے اشخاص کو جن کی مالی اور جسمی مقدرت مسلّم ہو چار عورتوں سے شادی کرنا جائز فرمایا ہے اور آج دنیا جہان کے حکماء اور ارباب فضل وتحقیق بھی بیک وقت چار شادیاں کرنے کے حق میں ہیں بشرطیکہ شوہر ان چار عورتوں کے حقوق وفرائض کو مساوی طور پر ادا کرنے کے ساتھ ہی ان میں ربط ویگانگت بھی قائم رکھ سکے۔

انسانی ضروریات کے لحاظ سے شادی اس درجہ ضروری چیز ہے کہ بغیر اس کے انسان اپنی کسی تحریک اور ضرورت کو اچھی طرح سے پورا نہیں کرسکتا، یہاں تک کہ وہ خود اپنی زندگی کو سہولت، دلجمعی، سکون، نظم وجامعیت اور تنظیم وتہذیب کے ساتھ بسر نہیں کرسکتا۔ جماعت میں بھی اس کو کوئی

وزن و وقار حاصل نہیں ہوتا اور خاندان میں بھی وہ باوصف خاصی عمر کے ''لونڈا'' اور چھچھورا ہی بنا رہتا ہے۔

اہلِ شہر، اہلِ محلہ اور کوتوال شہر کی نظر میں بھی اگر وہ رات کو اپنے گھر پر موجود نہ ملے تو مشتبہ ہی رہتا ہے اور عورت ذاتوں میں تو اس کی کوئی عزت ہی نہیں۔

مذہب محترم اسلام کی نظر میں بھی اس کا کوئی وقار اس لیے نہیں کہ وہ ایک مسنون طریق و ضابطہ سے گریز کرنے والا ہے۔

ہائی کورٹ کی نظر میں بھی وہ حقوقِ وراثت اور جانشینی مراعات سے بنی نوع بشر کو دانستہ طور پر محروم رکھنے کا مجرم ہے۔

حکیموں اور ڈاکٹروں کی نظر میں بھی اس کا دماغ ''پاگل'' ہوتا ہے یا وہ خود مجنوں ہوتا ہے۔ یعنی غیر شادی شدہ انسان کی صحت نہ معتدل سمجھی جا سکتی ہے نہ قابلِ اعتبار گویا وہ ایک طرح کا گدھا بھی ہوتا ہے اور پھر انشا پردازوں اور مدبرین وقت کی نظر میں صرف ''بے جوروا آدمی'' ہی ہو سکتا ہے جو الفت و عاشقی، رحم و کرم، عدل و انصاف، عفو درگزر، کفایت و انصرام، مساوات و رواداری، صبر و تحمل، اضطراب و اشتعال اور بین الانسانی اخلاق و روابط اور خواص و خصائل سے یکسر محروم سمجھا جا سکتا ہے کہ بے شادی کیے ان جذبات و تاثرات کا تجربہ ناممکن ہے اور اسی لیے ایسے انسان کا احساس، عمل اور ذہنی صلاحیت قابلِ اعتماد نہیں۔

پھر اس لیے بھی شادی ضروری ہے کہ ہندستان کے انسان کو صرف علی گڑھ میں بی۔اے پاس کرنا اور انگریزوں سے اپنی حکومت بغیر لڑے چھین لینا تو باقی نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس کے ذمہ اور دوسرے اور بے شمار کام بھی ہیں جن میں سب سے بڑا کام روزی کمانا بھی ہے، جسے ملازمت بھی کہتے ہیں اور تجارت و زراعت بھی مگر تمدن یا جماعتی قاعدوں کے حساب سے انسان روزی اسی وقت کما سکتا ہے جب وہ کافی محنت اور مستعدی سے کام لیے، پھر جب وہ روزانہ کافی محنت اور مستعدی سے کوئی کام کرے گا تو اسے سات بجے شام سے صبح کی اذانوں تک آرام اور کامل راحت کی بھی ضرورت ہوگی اور ہاں پکی ہوئی روٹی بھی چاہے گا یعنی اسے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ انسانوں میں رہ کر ''جامۂ انسانیت'' میں بھی رہے اور ''جامۂ انسانیت'' کہتے ہیں اس کو کہ انسان کا

ایک مکان میں اس کے پاس صاف ستھرے کپڑے ہوں، پمپ جوتا ہو، اوڑھنے بچھانے کو لحاف ہو، کمبل ہو، چادر ہو اور روٹی پکانے کے برتن ہوں، مرغا مرغی ہوں، بکرا بکری ہوں، صندوق ہوں، الماریاں ہوں، سر کے انگریزی بال سنوارنے کے لیے آئینہ ہو، روشنی کے لیے بجلی کا ہنڈا نہیں تو ایک دیا تو ہو اور جو ذرا بڑا انسان ہو تو پھر اس کے لیے داڑھی صاف کرنے کے اُسترے، صابن، لونڈر، آئینہ، تولیہ، ٹینس کا بلا، ہاتھ کی گھڑی، پتلون، کوٹ، پان کا ڈبہ، سگریٹ کیس اور ہیٹ کے ساتھ ہی صبح سویرے انڈے، پراٹھے، چائے، کیک، بسکٹ اور حلوہ بھی ہو۔ پس ان تمام چیزوں کی حفاظت، صفائی اور دیکھ بھال کے لیے بیوی اور فقط بیوی ہی درکار ہے اور جو آپ یہ کہیں کہ ایک ملازمہ یا پال بیجیے ایک لڑکی پھر رہنے دیجیے تھوڑے دن اسے اپنے گھر میں۔ کچھ دن بعد ہی یہ نتیجہ نکلے گا کہ کوتوالی میں رپٹ لکھاتے پھریں گے اور گواہ ڈھونڈتے پھریں گے اور اس سب پر آپ سے یہ کبھی نہ ہوگا کہ ملازمہ کو آپ اشرفیوں، گنیوں، نوٹوں اور روپیوں کا بکس بھی دے دیں یا اسے اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر کھانا بھی کھلائیں یا یہ کہ آپ اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں انڈے، پراٹھے، کباب، قیمہ گوشت، متھرا کے پیڑے، آگرے کے دال موٹ، علی گڑھ کا مکھن، الٰہ آباد کے امرود، ملیح آباد کے آم، بھوپال کا گنکا، لکھنؤ کا خمیرہ، جبل پور کی بیڑی، پنجاب کی لسی، مصر کا سگریٹ اور لندن کا جوتا دیتے جائیں اور خوش بھی رہیں یا اپنی بھانجی کی شادی میں اسے دلہن کے کپڑے پہنا کر بھیج دیں اور ساری عورتیں اسی کا استقبال کریں اور جو آپ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ بھی کریں تب بھی وہ ایک دن کسی محلے والے کے ساتھ بمبئی بھاگ جائے گی، لہٰذا ثابت ہوا کہ بیوی ہی ہو سکتی ہے جو انسان کے گھر کے اندر رہ کر اس کی ہر طرح کی معاون اور خدمت گزار رہ سکتی ہے۔

ان سب کے سوا پھر یہ دیکھیے کہ انسان کی فطرت ذرا چور بھی واقع ہوئی ہے اور بعض معاملات و مسائل میں انسان بہت سی باتیں اپنے دل میں محفوظ رکھتا ہے، مگر وہ قدرتاً اس ذخیرہ کو ہر وقت محفوظ بھی نہیں رکھ سکتا اور ایسے حالات میں اسے ایک معاون، رازداں اور رازدار کی ضرورت بھی لاحق ہوتی ہے۔ مثلاً آپ دل میں ارادہ کریں کہ مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر اخبار ''زمیندار'' لاہور کو اپنے ساتھ لے کر شہر کابل پر حملہ کریں اور بچہ سقا کو نکال کر غازی

نادر خان کو تخت کابل پر بادشاہ بنا کر بٹھا دیں یا بادشاہ امان اللہ خاں کو اٹلی سے لا کر پھر کابل کا بادشاہ بنا دیں یا ہندستان کی قانون بنانے والی مجلس واقع دہلی کے بھرے اجلاس میں بم کا گولا ایسے ممبروں پر پھینک ماریں جو انگریزوں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں یا آپ لاہور کے کسی بند مکان میں بیٹھ کر بم کے گولے بنائیں اور چاہیں کہ سی۔آئی۔ڈی کا کوئی آدمی ہمیں جھانک نہ لے۔ یا آپ اسٹیشن منماڑ پر ریل کے ڈبے میں بم کا گولا چلا دیں۔ یا نئی دہلی کے قریب آپ وائسرائے کی ریل گاڑی کو بم کے گولے سے بچا کر اڑا دینا چاہیں۔ یا آپ جناب سائمن کمیشن صاحب کو کالی کالی جھنڈیاں دکھا کر ڈرائیں تا کہ وہ ہندستان میں انگریزوں کی حکوت قائم رہنے کا کوئی پیچدار قانون بنائیں۔ آپ رات کے وقت انگریزوں کو ڈرانے کے لیے دیواروں پر سرخ رنگ کے اشتہار چسپاں کریں۔ آپ سمرقند او شہر بخارا جا کر روسی لوگوں سے اس لیے روپیہ لانا چاہیں کہ اس روپیہ سے ہندستان میں انگریزوں کے خلاف لوگوں کو فساد اور بے چینی پھیلانے پر آمادہ کریں گے یا اس روپیہ کو اخبارات کو دے کر ان سے انگریزوں کے خلاف مضامین لکھوائیں گے یا اس روپے کو آپ ہندستان کے کسانوں میں یہ کہہ کر تقسیم فرمائیں کہ جب ہندستان پر حکومت روس کی فوجیں حملہ کریں تو تم بھی کلہاڑی ہاتھوں میں لے کر انگیزوں پر ٹوٹ پڑنا۔ یا تم کلہاڑیوں سے حملہ نہ کرسکو تو روسی فوجوں کو غلہ، چارپائیاں، لوٹے، گھی، چاول، دال، قیمہ گوشت اور حقہ دینا۔ یا آپ چاہیں کہ شہر بمبئی کے مزدوروں کو یہ کہہ کر تاؤ دلائیں کہ تمھاری دن بھر کی مزدوری سے یہ کارخانوں کے مالک تو پیتے ہیں شراب اور موٹروں پر بیٹھے پھرتے ہیں اور تمھیں دیتے ہیں فقط چار آنے روزانہ۔ اس لیے تم کام چھوڑ دو اور عرف ہڑتال کر دو تو پھر یہ لوگ تمھاری اُجرت میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے یا آپ چاہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی اور ہندستان کے ہر اسکول میں جا کر کہہ دیا جائے کہ تم ہندستانی طالب علم ہو کر اپنے ملک کے بنے ہوئے کپڑے اور اپنی ملکی زبان کو استعمال نہ کرو گے تو تمھارا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ یا آپ شہر لاہور کی کسی رنڈی پر فریفتہ ہو کر اس کے دوسرے دوست کو قتل کر کے اس کی نعش کو ایک صندوق میں بند کر کے کسی دریا کے کنارے پھینکنا چاہیں یا چلتی ہوئی ریل میں آپ مسافروں کا سامان چرانے کے لیے رات دن ریلوں میں چڑھے پھریں۔ یا آپ خفیہ پولیس کی ملازمت کر کے سادھوؤں اور مولویوں کا لباس

پہن کر اِدھر سے اُدھر چکر لگاتے پھریں یا افلاس سے تنگ آ کر اور تنخواہ کی کمی کے باعث اغوا، ڈاکہ، مداخلت بیجا بخانہ بوقت شب یا بوقت دوپہر یا استحصال بالجبر اقدام قتل، قتل عمد یا خودکشی کے ارادہ سے ایڈیٹر اخبار ''ہمت'' لکھنؤ مولانا جالب دہلوی کے برابر افیون کھانا چاہیں یا ان میں سے کسی ایک جرم کا ارتکاب کر گزریں یا ارتکاب کا ارادہ فرمائیں یا ارادہ کر کے باہر نکلیں کہ پولیس والے آپ کو آگے دھرلیں یا ریل میں سوتے ہوئے مسافروں کے صندوق ریل سے باہر اپنے مقرر کیے ہوئے دوستوں کے لیے پھینک دیں اور خود پولیس کے سپاہی بھی بنے رہیں یا کانگریس کے اجلاس اجمیر شریف کے عرس اور خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کی قوالی میں آپ لوگوں کی جیب کاٹنے تشریف لے جائیں۔ یا اپنا نام سیماب اکبرآبادی اور ساغر علی گڑھی رکھ کر رئیسوں کو قصیدے سنانے جائیں اور جب وہاں سے ناکام واپس ہوں تو ملا رموزی کے خلاف مضامین لکھنا چاہیں اور نہ شرمائیں تو ان تمام قسم کے اعمال اور جرائم میں رازداری کی ضرورت ہوگی اور اس رازداری کے لیے آپ کو بیوی سے زیادہ محبوب صادق، مستقل مزاج اور پابند عہد کوئی دوسرا رازدار نہ ملے گا کیونکہ عورت جب کسی کی بیوی ہو جاتی ہے تو اس کی ساری زندگی اسی شخص سے متعلق ہو کر رہ جاتی ہے جس کی وہ بیوی ہو چکی ہے۔ لہٰذا کسی راز کو ظاہر کر کے وہ نہ اپنے شوہر کو کوتوالی پہنچائے گی نہ خود کوتوالی جائے گی پھر فرض کیجیے کہ آپ بچپن میں محلے کے لونڈوں کے ساتھ بیڑی اور سگریٹ پینا شروع کریں پھر آپ تھوڑی سی چرس بھی پینا شروع فرما دیں، پھر ذرا سی شراب بھی کہ اتنے میں آپ کی شادی ہو جائے اور اب آپ گانجا اور چانڈو بھی پینا شروع کر دیں تو اس سے آپ کے جسم کی تمام بجلی ایک دم ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اب نہ آپ ملازمت کے قابل رہیں گے نہ تجارت کے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ فاقہ کشی کی حد پر پہنچ جائیں گے۔ اس وقت بس ایک آپ کی بیوی یوں کام آئے گی کہ آپ اگر اس کا زیور جہیز کے برتن اور کپڑے فروخت کر کے کھاتے رہیں گے تو زندگی کے بقیہ دن بغیر جیل خانے کے کٹ جائیں گے اور بیوی کی نالش سے بھی محفوظ رہیں گے کیونکہ وہ بیوی، بیوی ہی نہیں سمجھی جاتی جو اپنے شوہر پر نالش کر دے۔

فرض کیجیے کہ آپ کو چلتے چلتے بخار آ جائے اور آپ گھر میں آ کر کہیں ارے لحاف تو اُڑھا دو۔ ارے اللہ میاں میں تو مر گیا۔ پھر آپ کے لیے ڈاکٹر انصاری بلائے جائیں۔ وہ آ کر

آپ کے سینہ پر ایک آلہ لگائیں اور سینہ کو خوب ٹھونکیں اور اتنے داموں کی ایک دوا دی جائیں کہ ان سے سارہ شہر خرید لیا جائے، مگر آپ کو آرام نہ ہو تو آپ کے لیے پھر کوئی ''شفاء الملک'' قسم کے حکیم صاحب بلائے جائیں اور یہ آپ کو دے جائیں گل بنفشہ، تخم خطمی، گاؤزبان، عناب اور شربت شکنجبین، مگر آپ اسی حالت میں کھالیں آم کا آچار تو ہو جائے آپ کو دوسری بیماری پھر اسی حالت میں آپ کو زکام بھی ہو جائے اور نمونیہ بھی اور اسی حالت میں آپ الہ آباد کے امرود بھی کھالیں اور آپ کو سورۂ یٰسین سنانے میں بہت کم مدت رہ جائے تو ظاہر ہے کہ آپ رات کو نہ خود سوئیں گے نہ دوسروں کو سونے دیں گے اور جب اس طرح آپ پر کئی راتیں گزر جائیں گی تو ایک دن آپ کی والدہ صاحبہ تک تہجد کی نماز پڑھنے میں مصروف ہو جائیں گی۔ اب اس وقت اگر آپ کو معلوم ہوگی پیاس تو ایک شخص اس حالت میں خاموشی سے آپ کو پانی کا گلاس دے گا اور آنسوؤں کو صاف کرتا جائے گا اور یہی آپ کی بیوی ہوگی جو آپ کی بیماری کی ہر حالت میں کام آئے گی۔

فرض کیجیے کہ کسی دن آپ کا دل چاہے گا کہ آج مچھلی کھائیں مگر ملازمت کی حاضری کا وقت پورا ہو جانے کی وجہ سے آپ کسی راہ گیر کے ہاتھ اس مچھلی کو گھر بھیج دیں اور تاکید فرما دیں کہ اس میں خوب خوب گھی ڈال کر اسے پکانا، میں دفتر سے آکر کھاؤں گا، مگر اتفاق سے آج ہی آپ کے دفتر کا افسر بدل جائے اور اس کی جگہ کوئی علی گڑھ کا پڑھا ہوا افسر ہو کر آ جائے اور آتے ہی اپنا رعب بٹھانے کے لیے وہ رات کے گیارہ بجے تک کام کرتا رہے تو یاد رکھیے کہ اس عرصہ میں اس مچھلی کو آپ کے والد صاحب، والدہ صاحبہ، بہن اور بھائیوں نے چٹ کر لیا ہوگا اور آپ بارہ بجے رات کو اس خوشی میں گھر پہنچیں گے کہ مچھلی کھاؤں گا۔ پھر گھر پہنچ کر علی گڑھ کے پڑھے ہوئے افسروں کی فرعونیت، غرور اور کرشمائی خواص پر آپ تاؤ بھی کھاتے جائیں گے اور مچھلی کھانے کے لیے ہاتھ بھی دھوتے جائیں گے کہ کوئی آہستہ سے کہے گا کہ ارے لاحول ولا وہ مچھلی تو ہم نے کھالی ورنہ خراب ہو جاتی۔ اس وقت اس خبر سے آپ اس قدر کھول جائیں گے کہ اپنے تمام خاندان کو یہ کہہ کر گورنمنٹ کے حوالے کر دیں کہ انھیں یا پھانسی پر لٹکا دیا جائے یا کالے پانی بھیج دیا جائے کہ بس اسی تاؤ کی حالت میں اسی مچھلی کا ایک نہایت نظر نواز پیالہ آپ کے دستر خوان پر آ جائے گا اور یہ پیالہ وہ ہوگا جو آپ کی بیوی نے سارے خاندان کی نظر بچا کر پہلے ہی کسی طاق میں رکھ دیا ہوگا کہ

ایسی محبت اور ہمدردی قدرت نے بیوی ہی کو عطا فرمائی ہے، علی گڑھ کے لونڈوں کو نہیں۔ فرض کیجیے آپ ملا رموزی کی طرح دن بھر نوکری کی پابندی اور افسروں کی خوشامد سے تھک کر رات کو مضمون نگاری کے لیے تازہ دماغ ہونے کے واسطے قوالی کی محفلوں سے تہجد کی نماز کے وقت گھر واپس آنے کے عادی ہوں، لہٰذا جب اس قدر رات گزر جانے پر آپ آ کر دروازہ کھٹکھٹائیں گے تو آپ کے والد صاحب چارپائی پر ہی سے آپ کو نالائق، مردود، خبیث اور آوارہ کہیں گے۔ والدہ صاحبہ اگر بیدار ہو جائیں گی تو بددعا فرمائیں گی یا اتنا ضرور کہیں گی کہ یہ روزانہ کہاں جا کر مر جاتے ہو۔ بہن بھائی آپ کی آواز سن کر لحافوں میں منہ چھپا کر فرضی سونا سو جائیں گے، مگر ایک اور ذات ہوگی جو اپنے بچہ کو روتا چھوڑ کر کچھ گنگناتی ہوئی آئے گی اور آپ کے لیے دروازہ کھول دے گی اور یہ وہ ذات ہوگی جسے بیوی کہتے ہیں۔

فرض کیجیے آپ بھی علی گڑھ میں پیدا ہو گئے تھے، مگر آپ تھے رنڈی کے پیٹ سے، اس لیے آپ کی اعلیٰ تعلیم و تربیت پر کسی نے توجہ نہ کی کہ اتنے میں کسی اکبرآبادی شاعر کی نظر آپ پر پڑی اور اس نے راتوں رات آپ کو گانا سکھایا اور لے کر گیا امیروں کے پاس اور آپ کے گانے سے خوب روپیہ کمایا، اتنے میں ہوگئی آپ کی آواز خراب۔ جاہل تو پہلے ہی تھے اس لیے اب آپ بجز چوری کے اور کیا کرتے لہٰذا آپ نے چوری کی اور کوتوالی میں مار کھائی اور جیل خانے گئے پھر جیل خانے میں کسی پٹھان قیدی کی امداد سے آپ رات کے وقت جیل خانے کو پھاند کر بھاگ گئے اور پھر دہلی یا آگرہ میں پکڑے گئے اور پھر جیل خانے میں بھیجے گئے اور اسی طرح آپ کو گزر گئے تیس برس۔ تو اب آپ ساری دنیا میں بجائے شاعر اور ایڈیٹر کے ''نمبری بدمعاش'' مشہور ہو جائیں گے اور کوئی نہ ہوگا جو آپ کے سلام کا جواب تک دے، کہ اسی حالت میں آپ اپنے پچھلے گناہوں سے توبہ کر کے کسی مسجد میں جا بیٹھیں گے اور محلے کے لوگ کسی یتیم خانہ کی لڑکی سے آپ کی شادی کرا دیں گے تو یہ لڑکی آپ کی ''نمبری بدمعاشی'' کو کبھی خاطر میں نہ لائے گی اور عمر بھر آپ کی عزت اور خدمت میں اپنا سب کچھ خرچ کر دے گی کہ ایسی ہی محبت ہوا کرتی ہے بیوی کو اپنے شوہر سے خواہ وہ آگرہ کا بھانڈ ہو یا علی گڑھ کا قوال۔

فرض کیجیے کہ آپ دنیا کے زبردست اور لاجواب ادیب اور علامہ ہوں، لیکن غلامی کی

ماؤف ذہنیت کی وجہ سے آپ کے کمال اور ہنر کی قدر باہر کے لوگ تو کریں مگر شہر والے آپ کو کوئی خاص وقعت نہ دیں۔ آپ حکمت وموعظت کے لاکھوں سبق دیں اور اپنے کمال کی بنا پر سارے ہندستان کی آنکھ کے تارے بن جائیں لیکن دفتر کے افسر لوگ ''پائنیر'' اخبار کے سوا کبھی آپ کے جواہر ریزوں پر نظر بھی نہ ڈالیں تو آپ اس صدمہ سے دل تنگ ہو کر گھر میں آئیں اور گھر والے بھی آپ کو گھر کی مرغی سمجھیں تو اس سے آپ کا صدمہ دو چند ہو جائے گا، مگر ایک آپ کی بیوی ہوگی جو آپ کی نیک شہرت، بلند قابلیت اور اعلیٰ ذہانت پر یوں فخر کرے گی کہ آپ کی فضیلت کی دھاک وہ اپنی ساری سہیلیوں پر بٹھادے گی اور آپ کی شہرت کی اطلاع پا کر وہ آپ پر خود کو نثار کرتی رہے گی۔

پس یہ اور اسی قسم کے بے شمار و بے قیاس اسباب ہیں جو شادی کی ضرورت، اس کی فرضیت اور فوائد کو ثابت کرتے ہیں اور انھی اسباب کے تحت دنیا کی ہر قوم اور ہر فرد کے نزدیک شادی ایک ضروری کام ہے۔

◆◆◆

مخالف اسباب

ہندستان میں تقریباً 99 فیصدی افراد شادی کے مخالف نظر آتے ہیں اور یہی وہ جذبۂ مخالف ہے جس کے اثر سے ہندستان میں دنیا کی دوسری اقوام کے مقابل غیر شادی شدہ مرد اور عورتیں زیادہ تعداد میں موجود ہیں، اس لیے اس مخالف جذبہ کے صحیح اور واقعی اسباب کی تحقیق کے لیے یہ مقالہ مرتب کیا جاتا ہے جو شاید ہی اردو کی کسی کتاب میں آپ کو ملے۔

ظاہر ہے کہ شادی کا زمانہ لڑکے اور لڑکی کے لیے عین شباب اور جوانی کا عالم ہوا کرتا ہے اِلّا بعض خاص حالتوں میں کم عمری اور کمسنی میں بھی شادی کردی جاتی ہے، مگر اس قسم کی شادیاں ہندو قوم میں زیادہ اور مسلمانوں میں کم ہوتی ہیں، لیکن یہی شباب اور جوانی کا زمانہ انسانی کسب کمال ہنر آموزی، حصول دولت، جسمی ترقی، آزاد خیالی، عیش پسندی اور لہو ولعب کو طلب کرنے والا زمانہ ہوا کرتا ہے اور انسان ان تمام حالات میں اپنے لیے کسی قید و گرفت کو پسند نہیں کرتا بخلاف اس کے شادی انسانی زندگی کے لیے ایک شدید احتساب و نگرانی اور قید و پرسش کا آلہ کہا گیا ہے۔ اس لیے شادی کا پہلا مخالف تو عمر و جذبہ کی فطری آزادی اور بے راہ روی ہے۔

اس کے بعد ہندستان کی آبادی چونکہ دو سو برس سے غلامی اور ماتحتی میں زندگی بسر کر رہی ہے اور کسی غلام ملک میں ذہنی بلندی، ہمت، بہادری، اولوالعزی اور مردانہ جفاکشی کے جذبات

کے ساتھ ہی فراغت اور دولت مندی بھی باقی نہیں رہتی اس لیے غلام ممالک کے باشندوں میں جوش اور عمل کی جگہ جمود، غفلت، سستی اور کاہلی کے جذبات ترقی پاتے ہیں اور اسی لیے غلام ممالک کے باشندے ہمیشہ اضمحلال اور سکون کی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہوتے ہیں۔ اور شادی نام ہے ایک ذمہ دارانہ عمل اور حرکت کا اور یہی جذبہ ہندستانیوں میں بیدار نہیں۔

ان حالات میں جغرافیائی یا ارضی اثرات بھی معاون اور اثر انداز ہوا کرتے ہیں مثلاً آزاد اور سرد ممالک کے باشندوں میں غیر معمولی ذکاوت، ہمت، جنگجو خصلت اور عملیت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ غلام ممالک کے باشندوں میں اور خیر سے ہندستان غلام ملک بھی ہے اور گرم تر بھی پھر غلام یا گرم تر ممالک کے باشندوں میں مزاجی اعتدال بھی باقی نہیں رہتا اور ان میں اشتعال، غصہ، خوف اور بے ہمتی زیادہ اور شجاعت، تہور اور دلیری کم ہوتی ہے اور ایسے ہی لوگ طبعی عمر کو بھی پہنچتے اور ایسے ہی ہوتے ہیں جو کسی ذمہ دار زندگی سے ہمیشہ پُرخوف اور بددل رہا کرتے ہیں۔ اور چونکہ شادی یقیناً ایک اہم ذمہ داری ہے جس سے ہراس، خوف، وحشت، ناامیدی اور شکوک کا پیدا ہونا ہندستانیوں کی طبعی خاصیت ہونا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ جو بے شمار ہندستانی لڑکیاں گھروں میں محض اس لیے بیٹھی ہیں کہ انھیں اچھا شوہر نہ ملنے پر کہیں فاقے اور مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

شادی نام ہے ایک خوشگوار تعلق کا اور اس کی بقا و استحکام موقوف ہے مرد اور عورت کے باہمی اتفاق، الفت اور پسند پر اور یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں اعتدال، مزاج، تعلیم اور عقلمندی سے، لیکن ہندستانی طرز تمدن اور طریق معاشرت نے ان تمام اسباب کو بند یا بے کار کر دیا ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان ربط و علاقہ اور محبت و شیفتگی کے اثرات پیدا ہونے کی راہ میں ہندستانیوں کی جماعتی پابندیاں، پہاڑوں سے زیادہ سخت رسوم اور بندشیں حائل ہیں جو کسی طرح اس قسم کی پسند اور رضامندی کو حاصل نہیں ہونے دیتیں اور اگر کسی جگہ مرد و عورت کو ایسے مواقع حاصل ہو بھی جائیں تو پھر اعلیٰ تعلیم کی کمی ان میں وہ خوشگواری پیدا نہیں ہونے دیتی اور اسی لیے طلاق اور علاحدگی بھی ساتھ ہی رہا کرتی ہے، جو دوسروں کے لیے عبرت اور نفرت کا اثر پیدا کرتی ہے۔

زبردست مخالف ہندستان میں تعلیم کا فقدان ہے اور جو تعلیم آج دی جارہی ہے وہ ہندستانیوں کے طبعی اور جغرافیائی خواص اور اخلاق کے قطعاً مخالف ہے۔ اسی لیے آج کل کے تعلیم

یافتہ افراد میں بجائے حسن اخلاق اور حسن سیرت کے بے ایمانی، ریاکاری، غرور، تعلّی، منافقت اور بداعمالیوں کی کثرت ہے۔ حالانکہ تعلیم کا لازمہ یہ چیزیں نہیں بلکہ شجاعت، حلم، حسن سلوک، ایثار، عفو و کرم اور باہمی الفت ہے، مگر غلط تعلیم اور طرزِ تعلیم کے نقائص سے شادی ایسا اصولی اور ضروری مفہوم بھی غلط سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ عہد کی شادیاں اتنی خوشگوار اور مفید نہیں جتنی ہمارے آپ کے دادا صاحب مرحوم کے زمانے کی ہوا کرتی تھیں اور انھی حالات و مشاہدات نے شادی کو شیخ سدّو کی قبر والا بھوت قرار دیا ہے۔

شادی کے دوسرے مخالفوں میں ایک مخالف اخبارات اور نشر و اشاعت کے ذرائع کی زیادتی بھی ہے کہ ان سے طلاقوں کی کثرت، میاں بیوی کے ناگوار مقدمات کی تفصیلات، عورتوں کی فراری اور اغوا وغیرہ کے حالات کی شہرت بھی شادی کی طرف سے ایک غیر محسوس اثر پیدا کرنے کا باعث ہو رہی ہے۔

شادی کی مخالفت کا ایک باعث ہندستان کے موجودہ بورڈنگ ہاؤس عرف دارالاقامے بھی ہیں کہ ان میں گھر سے آزاد رہ کر ہر قسم کی آزادی نصیب ہوتی ہے اور صحیح معنی کا اخلاقی احتساب نوجوانوں پر باقی نہیں رہتا۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کی طرف سے بورڈنگ ہاؤس یا کسی اسکول اور کالج کے دارالاقامہ میں رہنے کی پابندیاں نہایت محفوظ اور کافی ہیں لیکن عملاً یہ پابندیاں نہایت محفوظ اور کافی ہیں لیکن عملاً یہ پابندیاں باقی نہیں رہتیں اور نوجوان طلبا انھی مقامات سے آزادی اور خیالی بے راہ روی کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک مخالف ہندستانیوں کی نہایت شدید اور ناقابلِ برداشت رسوم و شروط بھی ہیں جو کم استطاعت لوگوں کو شادی سے باز رکھتی ہیں یا پھر ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔

اسی قسم کی مخالفتوں میں ایک شدید مخالفت یہ بھی ہے کہ ہندستان میں شادی کے بعد مرد کو عورت کے سارے خاندان کی کفالت اور خدمت کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ سسرال، ساس، سالی اور سالوں کے سوا عورت کے خاندان کے ایک ایک فرد کی غلامی، اطاعت، خدمت، امداد اور خبر گیری مرد کے اخلاقی فرائض میں داخل سمجھی جاتی ہے اور یہ قاعدہ مرد کے اوقات، مال اور خیالات کے انتشار اور تباہی کا باعث بن جاتا ہے مثلاً مرد کے لیے فرض ہے کہ وہ بیوی کے باوا کے گھر پر حاضر

ہوکر سلام کرے۔ بیٹھار ہے، سودالا کر دے، علاج کرائے، روپیہ دے، سالے ہوں تو انھیں تعلیم دلائے، نوکر رکھا جائے، ساتھ رکھے، ادب سکھائے اور سالی ہو تو تعلیم، کشیدہ کاری سکھائے اور شادی کرائے اور بیوہ ہو جائے تو اپنے گھر رکھ کر وفات تک اس کی کفالت کرے، پھر ضروری نہیں کہ بیوی کا باوا ہی آپ کے گھر آ کر مہمان رہے بلکہ بیوی کا چچا، ماموں، خالو، بھائی، پھوپھا، بھانجہ، بھتیجا، نانا۔ پھر ہر قسم کا ''زاد'' یعنی ماموں زاد بھائی، چچا زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد وغیرہ قسم کے افراد بھی اسی شان سے مہمان رکھے جاتے ہیں، جس شان سے لڑکی یا عورت کا باپ۔ اسی طرح عورت کی ماں، بہن، چچی، پھوپھی، بھابی، خالہ اور سہیلیوں تک کو مہمان رکھنا اور ان پر دولت اور وقت صرف کرنا مرد کی ''شرافت'' کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ گویا اس حساب سے شوہر یا تو اپنی بیوی کے پورے خاندان کا شوہر ہوتا ہے، جس کے ہر فرد کی تواضع اور کفالت اس کا بیویانہ فرض ہوتا ہے یا پھر اسے کسی پاگل خانہ داروغہ سمجھتے جس کا دماغ بے شمار پاگلوں کی نگرانی کرتے کرتے کبھی خود پاگل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ تو فقط بیوی کے خاندان کی نہایت مختصر اور اصولی ذمہ داریاں ہیں لیکن اگر ان ذمہ داریوں کی جزئیات اور تفصیلات کو بھی بیان کر دیا جائے تو پھر آپ جنت کی حور سے بھی شادی پر تیار نہ ہوں۔ مثلاً بیوی کے خاندان میں اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو بیوی بھی اس کی عیادت میں رات بھر جاگتی رہے اور آپ بھی جاگتے رہیں تب تو شوہر ورنہ دہریے، ملحد، ظالم، کمینے اور خدا جانے کیا کیا؟

ایک مخالف ہندستان میں عورتوں کا عام طور پر پردہ میں رہنا اور جاہل رہنا بھی ہے۔ بدصورت ہونا، بدمزاج ہونا غرض جہالت کی ہر خاصیت کا عام ہونا۔ بیوی کا ہمیشہ بیمار رہنا۔ یکا یک بے شمار بچوں کی ماں ہو جانا۔ اپنے عزیزوں کے گھر زیادہ جانے کا عادی ہونا وغیرہ۔

ایک مخالف قوم میں مذہبی تعلیم کا فقدان بھی ہے۔ مذہبی تعلیم و تاثر سے دماغ کا خالی یا آزاد ہونا ہر مخرب اخلاق تحریک کا محرک ہوا کرتا ہے اور مذہبی اثر سے آزاد دماغ ہی کسی غیر طبعی جذبے کے انسداد سے معذور رہتا ہے۔ مذہبی تعلیم کے فقدان سے فکری آزادی کا جذبہ مشتعل اور طاقتور ہوتا ہے اور اسی سے دماغ کی غلط کاریوں پر کوئی احتساب باقی نہیں رہتا۔ مذہبی تعلیم کے فقدان سے جماعت اور خدا کے احکام و ضوابط توڑ ڈالنے پر انسان عادی ہو جاتا ہے اور ایسا ہی

دماغ ہوتا ہے جو غیر قومی آداب واخلاق اختیار کر لینے میں بے باک اور دلیر ہو جاتا ہے۔

شادی کا ایک مخالف غیر قوموں سے غیر معمولی میل جول بھی ہے۔ اس طرح کہ ہم اس قوم کے اصول وآداب کے دلدادہ ہو جاتے ہیں اور اپنے ہاں کی ہر چیز کو برا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایسے دماغ پیدا ہو چکے ہیں جو میز کرسی پر بیٹھ کر بھرے مجمع کے اندر نکاح کی تقریب چاہتے ہیں۔ اور وہ وقت بھی قریب ہے جب ایک مجمع کے اندر ایک عورت کسی مرد کا ہاتھ پکڑ لیا کرے گی اور مجمع تالیاں بجا کر کہہ دے گا کہ نکاح شد۔

ہندستان میں شادی کا ایک مخالف ہندستانی تمدن کی بلندی یا تبدیلی بھی ہے اور اس کا تعلق براہِ راست انسانی معاشرت کو بھی بلند کرتا ہے اور یہ وبا جہاں ہندستان میں انگریزوں کی آمد ورفت سے پھیلی ہے وہاں اصل میں یہ وہ ارتقا طبعی ہے جس کی رو آہستہ آہستہ سارے ایشیا کو گھیر چکی ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ ارتقا طبعی آزاد ممالک کے باشندوں کو ہنر مند، موجد، مخترع اور صاحب کمال ہونے کی رہنمائی کرتا ہے اور غلام ممالک کے باشندوں میں عیش اور فضولی کی قوت کو مشتعل کرتا ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ یورپ میں سائنسداں اور ہوائی جہاز اڑانے والے افراد بڑھ رہے ہیں اور ہندستان میں تھیٹر اور سینما دیکھنے والے زیادہ ہو رہے ہیں۔ یورپ والے کوہ ہمالہ کی بلندی پر پہنچ کر علمی واثری تحقیق میں مصروف رہتے ہیں اور ہندستانی لندن پہنچ کر اپنا قومی لباس بھی چھوڑ آتے ہیں۔ غرض تمدن کی بلندی سے اختراعات جدیدہ کی کثرت ہو رہی ہے اور اختراعات کی کثرت اقتصادیات یا مالیات کو متاثر کرتی ہے جس کا لازمہ افلاس اور تنگدستی ہے اور افلاس وتنگدستی شادی کے لیے جس درجہ اہم رکاوٹ ہے وہ ظاہر ہے اور یہ اسی تمدنی انقلاب کا اثر ہے کہ آج شادی بیاہ میں ذات، خاندان، علم وفضل اور اخلاق کی تلاش کے عوض مرد کی دولت مندی تلاش کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ 95 فیصدی گھرانوں میں لڑکیاں دولت مند لڑکوں کی تلاش میں بیٹھی ہیں۔

ایک مخالف یہ بھی ہے کہ مرد جب تک برسرِ کار نہ ہو یا ملازم نہ ہو، اس وقت تک شادی نہ کی جائے خواہ اس کی طبعی حالت شادی کے قابل ہو چکی ہو۔

یہ تو فقط اصولی موانع اور مخالف ہیں شادی کے لیکن ان کے بعد بھی ایسے بے شمار موانع ہیں جو گو بہت چھوٹے مگر بہت زیادہ طاقتور ہیں مثلاً مہر کی رقم کا بے تعداد و بے اندازہ مقرر کرنا یا شادی

سے پہلے مرد کی طرف سے عورت کے لیے بھاری جوڑا اور گراں قیمت زیور پیش کرنا جیسا کہ صوبہ پنجاب و سرحد میں باقاعدہ ہے یا کسی جائیداد کا عورت کے نام پر عدالت سے رجسٹری کرادینا وغیرہ۔

پیغام یا شادی کی تحریک

پیغام یا پیام اُس ابتدائی گفت وشنید کا نام ہے جو فریقین میں بے واسطہ یا بہ واسطہ کی جائے۔اس کارروائی کے جتنے طریقے بھی رائج ہیں ان میں سے بہت سے طریقے نقصان رساں اور بے حد تکلیف دہ ہیں۔ کچھ دن سے انگریزی قوم کے میل جول سے بعض نئے طریقے ضرور ایجاد ہوئے ہیں مگر وہ بھی نقصان رساں اور اذیت بخش ہیں۔ بعض شہروں میں ''شادی بیاہ ایجنسیاں'' قائم ہوگئی ہیں، جو بظاہر تو ایک نیک خدمت کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں، لیکن اصل میں بعض بے کار لوگوں کی روزی کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ایسی جماعتوں کے مطبوعہ ضوابط کتابی صورت میں بہ قیمت ایک روپیہ یا اس سے زیادہ پر ملتے ہیں۔ایسی جماعتوں کو مرد یا عورت اپنے اپنے تفصیلی حالات لکھ دیتے ہیں اور یہ جماعتیں صاحب غرض سے اپنے کام کی مقررہ اجرت لے کر خطوط کے ذریعہ شادی کراتی ہیں جس میں 95 فیصدی دھوکے اور غلطی کا امکان باقی رہ جاتا ہے۔

ایک طریقہ اخبارات یا رسالوں میں شادی کی ضرورت کا اعلان کر دینا بھی ہے اور اس میں بھی دھوکے اور غلطی کا امکان ہے۔ چنانچہ ایسی تحریک سے جس کے نقصانات پہنچ رہے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے جو عین اس وقت صوبہ جات متحدہ کے مشہور اور نامور اخبار ''مدینہ'' بجنور مورخہ 21 اگست 1929 نے اپنے بہرۂ نکاحات میں ان الفاظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ جب یہ مقالہ لکھا جارہا تھا، واقعہ یہ ہے:

"ضرورت شوہر کا ایک اشتہار ہم نے "مدینہ" کے کسی پچھلے پرچہ میں چھاپا تھا۔ اس کی اصلیت یہ نکلی کہ "حسینہ بیگم" اشتہار دینے والی کوئی عورت نہ تھی بلکہ مرد تھا، اس نے ایک نوجوان شوہر کا اشتہار دیا تھا اور طالب سے 4 / کے ٹکٹ جواب کے لیے طلب کیے تھے، اس پر الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے 4 / کے ٹکٹ لفافہ میں بند کر کے نکاح کی عرضی روانہ کی، لیکن افسوس کہ دوسروں کو تو انکاری جواب بھی، لیکن اس طالب علم کو یہ جواب بھی نہ ملا۔

ایک دوسرے عرضی گزار کا خیال ہے کہ یہ عورت کے پردہ میں کوئی مرد ہے جو راجپوتانہ کے کسی والیِ ریاست کے ہم مشرب ہیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ ان کی غلط فہمی ہے بلکہ یہ کوئی ٹھگ ہے جس نے کئی سو روپیہ اس دھوکے سے کما لیا ہے خدا اور پولیس اس سے سمجھے"۔

اس قسم کے طریقے ابھی ابھی رائج ہوئے ہیں جو زیادہ مقبول نہیں، البتہ شادی کی تحریک کے عام طریقے یہ ہیں۔ مثلاً شہر میں ایسی عورتیں ہوتی ہیں جو مرد اور عورتوں کے پیغامات کو لے جاتی ہیں اور بعد شادی اس کا کافی معاوضہ وصول کرتی ہیں۔ ایسی عورتیں اکثر جاہل اور معمولی اخلاق کی ہوا کرتی ہیں۔ انھیں مرد عورت کے باہمی تعلقات، حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کی تلاش کا کوئی خاص ملکہ نہیں ہوتا بلکہ وہ عورت یا مرد کے بتائے ہوئے نمونے تلاش کرتی ہیں۔ اخلاقاً یہ بے انتہا جھوٹی اور کاذب اور اکثر خود بداعمال ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ جس گھر میں لڑکی کا پتہ پاتی ہیں اس گھر میں کسی بہانے سے داخل ہو جاتی ہیں اور اس طرح یہ لڑکی کا ظاہری حسن دیکھتی ہیں پھر یہی مرد کی طرف سے اس لڑکی کے ورثا کو پیغام کا خط دیتی ہیں۔

مرد کی جانب سے ایک نہایت حسین اور قیمتی لفافے میں مرد کے ملازمانی اور خاندانی حالات لکھ کر اسے ایک نہایت قیمتی رومال میں رکھ کر عورت کے ورثا تک پہنچایا جاتا ہے اور اس پر عورت کے ورثا مرد کے مزید حالات کی تحقیق شروع کرتے ہیں جس میں تین تین سال کا عرصہ بھی گزر جاتا ہے اور ایسی عورتوں کے انعامات کی رقوم بھی خاصی ہو جاتی ہیں مثلاً ایسی عورتیں ہر لمحہ انعام کی طالب ہوتی ہیں۔ کھانا بھی آپ کے ہاں کھاتی ہیں اور ہر ملاقات پر کسی نہ کسی چیز کا سوال

کرتی ہیں اور اس سوال کو پورا نہ کرنا عورتوں میں بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ان عورتوں کی مزاجی کیفیت بھی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے مثلاً اس گھمنڈ کے ساتھ کہ وہ آپ کی لڑکی یا لڑکے کی شادی کرا رہی ہیں، آپ پر خاصا غصہ اور نخرہ کرسکتی ہیں۔ بات بات پر یہ خفا ہوتی ہیں اور جاہل شریف زادیاں انھیں مناتی ہیں کیونکہ ان عورتوں سے خطرہ یہ رہتا ہے کہ دوسرے گھروں میں جا کر وہ لڑکی یا لڑکے کی برائیاں بیان نہ کر دیں اور چونکہ جماعت کا قاعدہ ہی یہ ہے اس لیے انھیں ان کی غلطی پر زیادہ برا نہیں کہا جاتا۔

یہ کام بعض جگہ مرد کرتے ہیں اور ان کے خواص اور ضوابط بھی وہی ہوتے ہیں جو ان عورتوں کے ابھی بیان ہوئے۔

ہندستان میں غیر قومی حکومت، غیر مرکزی زندگی اور جہالت کے باعث تقریباً ہر شہر اور ہر صوبے کے ضوابط ایک دوسرے سے مختلف اور بالکل علاحدہ ہوا کرتے ہیں۔اس لیے سارے ہندستان کی رسوم یا طریقے معلوم کرنا تو اسی وقت آسان ہوسکتا ہے جب ہمیں کوئی حکومت جاگیر دے کر ملازمت سے آزاد کر دے اور سفر کے تمام رئیسانہ مصارف کی کفیل ہو لیکن ادیبوں، مصنفوں اور اربابِ تحقیق کے ساتھ ایسا برتاؤ یا تو ہوتا تھا خلفائے عباسیہ کے عہد میں یا پھر شہنشاہ اکبر کے عہد میں یا آج کل حکومت جرمنی میں ہوتا ہے اور ہندستانی اربابِ قلم و تصنیف تو دن بھر ملازمت کرتے ہیں اور اپنے سے سوا جاہل افسروں کی خوشامد میں وقت پورا کرتے ہیں۔اس لیے ملا رموزی کو اپنے ہی گھر بیٹھے بیٹھے جس قدر طریقے معلوم ہوسکے وہ بیان کر دیے جاتے ہیں جو یقیناً بہت کم ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے جب پیغام کا لفافہ لڑکی والوں کی خدمت میں پہنچتا ہے تو لڑکی کے رشتہ دار اس خط پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ لڑکے کے حالات کی خفیہ تحقیق شروع فرماتے ہیں۔ اطمینانِ خاطر اور احتیاط کے لحاظ سے تو یہ خفیہ تحقیق از بس کہ مفید و ضروری ہے لیکن طریقِ تحقیق نہایت نقصان رساں ثابت ہوتا ہے مثلاً لڑکی کے رشتہ دار، لڑکے کے محلے والوں سے اُس کی خاندانی علمی اور مالی حالات کی تحقیق کرتے ہیں اور چونکہ عوام تعلیم کی روشنی اور صلاحیت سے کورے دھرے ہوئے ہیں اور تعلیم کے فقدان سے منافست، حسد، بغض، کینہ اور خدا واسطے کی دشمنی

کے جذبات ہر وقت بیدار رہتے ہیں اس لیے ہر محلے میں ایسے بداندیش، کمینہ مزاج اور سفلے رہا
کرتے ہیں جو پیغام کی تحقیق کرنے والوں کو لڑکے اور لڑکی کے متعلق نہایت غلط، شرمناک اور
سرتاسر لغو حالات بتاتے ہیں کہ معاملہ اسی جگہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس میں بھی خطا تحقیق کرنے
والوں کی ہے کہ وہ محلے اور شہر کے دوسرے لوگوں سے تحقیق حالات کرتے ہیں ورنہ طبعی قاعدہ یہ
ہے کہ ہر معاملہ اہل معاملہ سے دریافت کیا جائے کہ وہی کچھ بہتر اور صحیح جواب اور ثبوت دے سکتا
ہے۔ اپنے معاملہ کے متعلق اور دوسروں کے جوابات محض سماعی اور خیالی ہوتے ہیں جو وہ کسی کے
خاندان کے ذلیل ہونے یا شریف ہونے کے متعلق پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ملا رموزی کے خاندان
کے صحیح حالات اُن لوگوں کو کیا معلوم ہو سکتے ہیں جو خود ملا رموزی کے خاندان سے نہ ہوں۔ یہ
طریقہ چونکہ غیر طبعی، غیر اصولی اور جاہلانہ ہے، اس لیے ایسی تحقیق میں وقفہ اور زمانہ بھی زیادہ
صرف ہوتا ہے۔

تحقیق و تکمیل کار کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مرد یا عورت کے ماں باپ باوصف، خود صاحب
عقل و اختیار ہونے کے شادی کے معاملہ میں خاندان کے ایک ایک فرد سے رائے یا منظوری لیتے
ہیں اور جب تک خاندان کا ہر رکن منظوری نہ دے دے اس وقت تک چاہے مرد عورت کے
حالات کتنے ہی موافق ہوں شادی نہیں ہو سکتی۔ پھر اگر خاندان کے دوسرے ارکان کسی دوسرے
شہر، گاؤں یا قصبہ میں رہتے ہیں تو خطوط کے ذریعہ ان سب کی منظوری حاصل کی جاتی ہے اور جو
ایسا نہ کیا جائے تو خاندان کے تمام دوسرے ارکان رسمی جہالت اور پابندی کی وجہ سے لڑکی یا لڑکے
کے ماں باپ سے رشتہ منقطع کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک افغانی خاندان میں ہمارا پیغام لڑکی کے ماں،
باپ، چچا، چچی اور پھوپھی نے منظور کر لیا، لیکن لڑکی کے ماموں زاد بھائی شہر بریلی میں تھے، انھوں
نے اس طرح منظور کیا کہ اگر لڑکی کا نکاح ملا رموزی کے ساتھ کر دیا گیا تو میں عمر بھر کے لیے لڑکی
اور لڑکے کے ماں باپ سے تعلقات منقطع کر لوں گا۔ اب اس پر ماں باپ اور چچا صاحب کی
عقلمندی ملاحظہ ہو کہ انھوں نے بھی بغیر ہمارے حالات کی تبدیلی کے شادی سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ
کہ لڑکی آج تک ایک گاؤں میں بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہے اور کوئی پوچھتا نہیں۔ پس یہ طریق تحقیق
بھی ایک سال سے لے کر دو سال گزار دیتا ہے پھر اس پر جہالت اور رسم کی لعنت یہ کہ اس عرصہ

میں مرد کسی دوسری جگہ تحریک نہیں کرسکتا جب تک کہ ایک گھر سے اُسے کامل جواب نہ مل جائے خواہ اس جواب میں اُسے دو سال کا انتظار کرنا پڑے یا دس سال کا۔

بعض گھرانوں کی جہالت اس درجہ بلند ہوتی ہے کہ اگر کوئی مرد پسند بھی آجائے اور سارا خاندان اسے لڑکی دینے پر راضی ہو جائے تب بھی مرد کو منظوری کی اطلاع جلد نہیں دیتے اور پہلے انکار کر دیا جاتا ہے جس کا جاہلانہ مقصد یہ ہے کہ بیک وقت منظوری دے دینے کے یہ معنی ہیں کہ لڑکی کو کوئی مرد نہیں ملتا تھا اس لیے فوراً ہی منظوری دے دی گئی۔

تحقیق و منظوری کے ان طریقوں کے جزئی حالات ان سے سوا ذلیل اور جاہلانہ ہیں مثلاً بعض گھرانوں میں مرد کا فقط صحیح خاندان والا ہونا ضروری ہے چاہے اس کی اخلاقی حالت کتنی ہی ذلیل ہو۔ وہ بے ہنر ہو، جاہل ہو، بے ذریعہ ہو لیکن اگر خاندان کا اچھا ہے تو منظور ورنہ نامنظور۔ بعض گھرانوں میں مرد کا بی۔اے پاس ہونا اور شریف خاندان ہونا ضروری نہیں صرف خوبصورت اور تندرست ہونا ضروری ہے خواہ وہ افغانستان کا بچہ سقا ہو یا ریلوے اسٹیشنوں پر "چائے مسلمانی" فروخت کرتا ہو یا دہلی اور علی گڑھ میں تانگہ چلاتا ہو یا جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کباب بیچتا ہو یا کسی درزی کی دکان پر کام سیکھتا ہو یا کسی موچی کی دکان پر بیٹھ کر دن بھر کتاب طلسم ہوشربا چلا چلا کر سناتا ہو یا علی گڑھ کے ایک نوجوان شاعر کی طرح بغیر بلائے رئیسوں کو قصیدے سنانے جاتا ہو یا چلتی ہوئی ریل سے صندوق لے بھاگنے کا عادی ہو۔

بعض گھرانوں میں شوہر کے انتخاب و پسند کے لیے صرف جائیداد معیار شوہری قرار دیا گیا ہے، عام اس سے کہ وہ جائیداد ترکوں کے نام سے چندہ وصول کر کے حاصل کی گئی یا مسلمانوں کی تنظیم کے نام سے شہر امرت سر میں جمع کی گئی ہو یا تھانیداری کے ذریعے رشوت لے کر فراہم کی گئی ہو یا کسی روزانہ اخبار کو بند کر کے خریداروں کا بقیہ چندہ ضبط کر کے جمع کی گئی ہو یا کسی مسجد و یتیم خانے کی تعمیر کے نام سے فراہم کی گئی ہو یا کسی دیسی رئیس کا پرائیویٹ سکریٹری بن کر کمائی گئی ہو یا کسی عزیز کے یکایک مر جانے سے آپ کو حاصل ہوئی، یا وکالت میں بے خبر اور بے بس مؤکلوں سے حاصل کی گئی ہو، یا کسی رئیس کے مر جانے اور بغیر قابلیت اور حکومت کی اہلیت کے محض آپ کے بیٹا ہونے کی وجہ سے آپ کے قبضہ میں آئی ہو، یا ترکوں کے خلاف لڑنے کے لیے گورنمنٹ کو

مسلمان رنگروٹ دینے کے صلہ میں ملی ہو، یا امیروں کو خلاف عقل وایمان دن رات ''بجا ہے حضور'' کہنے سے حاصل ہوئی ہو، یا ایشیائی حکومتوں کو آپس میں ٹکرا دینے اور بغاوتیں کرانے سے آپ کو کرنل لارنس کے نام سے ملی ہو، یا ریل کی پٹری اکھاڑ کر ریل گرا دینے سے ہاتھ آئی ہو، یا زنان بازاری کے دن رات حقے تیار کرنے سے ملی ہو یا کچھ بھی نہ کیا مگر بے وقوفوں کے نصیب کی طرح گھر بیٹھے مل گئی ہو کہ اسی قسم کے ذرائع عام ہیں دولت مندی کے۔

بعض گھرانوں میں مرد کا صرف ایم۔اے پاس ہونا کافی سمجھا جاتا ہے، عام اس کے کہ وہ ذات کا چمار ہو یا علی گڑھ کا شاعر۔ وہ یتیم خانے میں پرورش کیا گیا ہو یا کسی بنئے بقال نے اسے اپنا بیٹا بنالیا ہو، خواہ وہ ہوٹل میں شراب پیتا ہو یا رنڈی کے گھر کباب کھاتا ہو۔ خواہ وہ چماروں ایسی اردو بولتا ہو اور بھنگیوں ایسی انگریزی۔ وہ ہر وقت سوٹ بوٹ پہنتا ہو خواہ وہ کسی دوست ہی کا کیوں نہ ہو یا چور بازار بمبئی کا۔

بعض گھرانوں میں فقط بڑی سی داڑھی، ٹخنے سے نیچا پاجامہ، چار تھان کا عمامہ، لمبی لمبی عبا اور موٹی سی لاٹھی درکار ہوتی ہے خواہ وہ دن رات کفر کے فتوے لکھتا ہو یا خواہ کلکٹر صاحب کے نام سے لرزتا ہو اور گورنمنٹ کے خوف سے ممبر پر سے نیچے گر جاتا ہو۔

بعض گھرانوں میں خاندانی شرافت، متوسط آدمی اور متوسط قابلیت درکار ہوتی ہے مگر ایسے گھرانے صرف غریبوں اور جاہلوں کے ہوتے ہیں۔

پس یہ ہیں وہ ضرورتیں جو شوہر کے اندر آج کل تلاش کی جاتی ہیں۔ ''شوہری معیار'' کے بعد ''بیویانہ معیار'' بھی ہے جو مرد کی طرف سے عورت میں تلاش کیا جاتا ہے:

1۔ عمر اور جوانی کے تاثرات کے تحت مرد کا پہلا مطالبہ عورت کی ظاہری خوبصورتی ہوتا ہے، مگر اتنی کہ وہ نیلم پری کو بھی شرمائے۔ عام اس سے کہ وہ جاہل ہو، کندۂ ناتراش ہو، بے شعور و بے تمیز ہو، خاندانی لحاظ سے وہ دھوبی زادی ہو یا چمار زادی اور کوئی 75 فیصدی ایسی ہی عورتیں تلاش کی جاتی ہیں۔

2۔ دوسرا معیار یہ ہے کہ لڑکی ''اسکول یافتہ'' ہو۔ ہارمونیم، پیانو اور چوڑی کا باجا بجا سکتی ہو۔ سائیکل اور موٹر اگر نہ چلا سکے تو ان پر سوار ہونے سے گھبرائے نہیں۔ پاجامے کی جگہ ساری کو

پسند کرتی ہو۔ کلب میں جا کر تقریر نہ کر سکے تو شریک ضرور ہو جائے۔ چنبیلی، حنا، گلاب اور کیوڑے کے عطر اور تیل کی جگہ فرانس اور لندن کا لونڈر اگر روزانہ استعمال نہ کر سکتی ہو تو پسند ضرور کرے، عام اس سے کہ وہ اخلاقاً حرافہ ہو۔

3۔ تیسرا معیار یہ ہے کہ وہ صورت میں چڑیل ہو۔ بڑے نالے کا بھوت یا بھوتنی لیکن جہیز میں ایک تعلقہ، ایک موٹر کار، ایک ملازمہ، ایک مکان اور دس ہزار کا زیور لائے۔ یعنی امیر گانے کی ہو اس کا بھی جاہل ہونا عیب نہیں۔

ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ آج 99 فیصدی مرد بے شادی بازاروں میں گھومتے نظر آتے ہیں اور لڑکیاں گھروں میں بند، مگر لطف یہ ہے کہ ان تمام امور کی تکمیل وتلاش دوسروں کے ذریعے ہوتی ہے اور مرد اور عورت ایک دوسرے سے براہ راست کوئی اطمینان نہیں کر سکتے۔ مثلاً عورت کو مرد قبل شادی دیکھ نہیں سکتا۔ اسی طرح عورت مرد کی سماجی قابلیت پر قانع رہتی ہے۔ حالانکہ 75 فیصدی گھرانوں میں مرد کے تفصیلی حالات قبل شادی عورت کو بتانا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے بس جو کچھ عورت کے ماں باپ طے فرمادیں اسی پر مرد اور عورت کو قناعت یا صبر کرنا ضروری ہے اور مرد و عورت کی ایک دوسرے سے یہی بے خبری اور ناواقفیت اکثر خاندانوں کی تباہی کا باعث ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ پھر ان حالات سے کسی نہ کسی طرح گزر بھی جایئے تو قبل شادی عورت کی طرف سے ذیل کی شرطیں مرد کے ذمے عائد کی جاتی ہیں:

1۔ ماں باپ عورت کو جس وقت اپنے گھر بلائیں اور جتنے دن اپنے گھر مہمان رکھیں، مرد اس میں کوئی تامل، بہانہ اور عذر نہ کرے اور نہ اس عرصہ میں مرد عورت کو طلب کرے۔

2۔ مہر اتنے ہزار، اتنے لاکھ اور اتنے کروڑ سے کم نہ ہو ورنہ جایئے اور گھر بیٹھ جایئے۔ خواہ شوہر اس قدر رقم حشر میں پہنچ کر بھی ادا نہ کر سکے۔

3۔ عورت کے لیے قبل شادی شوہر اتنے سے اتنے روپیہ کا زیور دے، اتنا روپیہ نقد دے اور اتنے جوڑے کپڑے کے۔

4۔ عورت کے نام پر مرد اپنی کوئی جائیداد عرف مکان گھوڑا، موٹر کار، گاؤں یا غلہ ہی سہی، مگر عدالت سے رجسٹری کرادے۔

5۔ منگنی سے لے کر ولیمہ تک کی تمام تقریبات نہایت شان اور دھوم سے کی جائیں۔ مثلاً بارات میں اتنی روشنی ہو، اتنی آتش بازی اور اتنی رنڈیاں ہوں اور وہ بھی آگرے کی جہاں سیماب شاعر رہتے ہیں اور ان سے اصلاح لینے علی گڑھ سے ساغر شاعر جاتے ہیں۔

6۔ مرد عورت کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کرے۔ یعنی عورت کو گالی نہ دے، انگلی نہ دکھائے، منہ نہ بنائے اور زبان نہ دکھائے خواہ عورت مرد کو جوتا ہی کیوں نہ مار دے۔

7۔ مرد ہر حال میں عورت کے باوا کے گھر میں رہے اور اپنے ذاتی ماں باپ کو اپنے گھر میں پڑا رہنے دے، ایسے شوہر کو "گھر داماد" کہتے ہیں۔

8۔ شوہر عمر بھر کوئی دوسری شادی نہ کر سکے گا خواہ اس کی پہلی بیوی مارے بیماری کے رات دن چارپائی ہی پر پڑی رہتی ہو اور بے اولاد ہو۔

یہ اور اسی قسم کی متعدد شرطیں ہوتی ہیں جو منظوری کے بعد اور نکاح سے قبل بعض گھرانوں میں مرد سے لکھوالی جاتی ہیں۔ ایسی شرطوں والی عورت اپنے شوہر کو عمر بھر اپنا خانساماں سمجھتی ہے اور عورت کے رشتہ دار شوہر کو ہر آن اور ہر لحظہ مقدمہ چلانے کی دھمکی دینے کے قابل بنے رہتے ہیں۔

اب جو ان تمام حالات کے ساتھ منظوری عمل میں آتی ہے تو عام طور پر پہلی تقریب منگنی سے شروع ہوتی ہے۔

◆◆◆

منگنی

شادی کے معاملہ میں یہ ابتدائی تقریب ہوتی ہے، جس کا مقصد تو فقط جانبین کا باہمی اطمینان ہوتا ہے مگر اس کی مالی تباہیاں اور فضولیاں بے اندازہ ہیں۔ بعض جاہل خاندانوں میں بہت کم عمری میں منگنی کی رسم ادا کر دی جاتی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آئندہ یہ لڑکا اور یہ لڑکی کسی دوسری جگہ شادی نہ کر سکے۔ ایسی منگنی کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی صاحب عقل وشعور ہوکر ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہیں مگر وہ اب ''منگنیا'' باہم شادی پر مجبور ہوتے ہیں۔ نتیجہ میں عمر بھر قاضی صاحب کے گھر پر یا عدالت میں پھرتے رہتے ہیں۔

صوبہ جات متوسط یا وسطی ہند میں منگنی کا قاعدہ یہ ہے کہ دولھا کے گھر سے ایک مقررہ دن پر بے شمار لوگ جمع ہوکر مع باجا رنڈی دلہن کے گھر جاتے ہیں اور ساتھ ہی خدا جانے کئی من مٹھائی، میوہ اور شکر لے جاتے ہیں۔ شرکاء کو خدا جانے کے سو روپیہ کے ہار، پان، عطر اور سگریٹ پیش کیے جاتے ہیں۔ اس تقریب میں دولہا شریک نہیں ہوتا اور کہیں کہیں دولھا میاں بھی چلے جاتے ہیں۔

جب دولہا کے والد صاحب مع بے شمار ساتھیوں کے باجا بجاتے ہوئے دُلہن کے گھر پہنچتے ہیں تو دُلہن والے بھی اپنی شان دکھانے میں کمی نہیں کرتے۔ دولہا کے والد صاحب کے لیے سب سے اونچی اور نمایاں جگہ پر ایک عمدہ سا قالین اور اس پر موٹا سا گدّہ لگایا جاتا ہے اور دولہا کے والد صاحب اس پر بہت کافی اکڑ کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں، بالکل اکڑفوں کے ساتھ۔ تھوڑی دیر میں دلہن کے والد صاحب تشریف لاتے ہیں اور ''یہ دونوں قسم کے والد'' برابر برابر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر

دولہا کے رشتہ دار یا طرفداران ''دونوں والدوں'' کے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع کراتے ہیں۔ کہیں کہیں دولہا کے باوا خود ہی بول اٹھتے ہیں مگر ایک دوسرے پر عالمانہ قسم کا رعب ضرور ڈالتے رہتے ہیں اور اس وقت ان کی ہرادا میں اس قدر صنعت اور بناوٹ ہوتی ہے کہ دیکھی نہیں جاتی۔ یہی حال دوسرے رشتہ داروں کی بناوٹ کا ہوتا ہے اور وہ اپنے لباس اور گفتگو میں دنیا کی ہر شان دکھانا کچھ بڑی ہی قابلیت سمجھتے ہیں۔ کہیں کہیں ''پوپلے قسم کا مذاق'' بھی کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر عام گفتگو اس قسم کی ہوتی ہے:

دولہا کے والد: بس تو پھر 27 رجب ہی مبارک تاریخ ہے اور دن بھی جمعہ کا ہوگا۔

شرکا: سبحان اللہ! بس تو پھر یہی تاریخ رکھیے۔

دلہن کے والد: مگر وہ میرے خالو میاں اس تاریخ تک گاؤں سے نہیں آسکتے اور ان کی شرکت بہت ضروری ہے اس لیے اگر جمعہ کے بجائے پیر کا دن رکھا جائے تو مناسب ہے اور ویسے مجھے آپ کی تاریخ سے بھی انکار نہیں اب جب اس کام کو کرنا ہی ہے تو پھر دن اور تاریخ کی تکرار ہی فضول ہے، مگر جو بات تھی وہ عرض کردی۔

دولہا کے والد: بہتر ہے، بہتر ہے، خیر پیر کا دن بھی مبارک ہے۔

شرکا: بیشک دوشنبہ کا دن یقیناً مبارک ہے۔

اس موقع پر دن اور تاریخ کے مبارک ہونے پر یوں بحث ہوتی ہے گویا دونوں طرف کے شرکا بڑے ہی اول نمبر کے پابند شریعت ہیں اور بغیر شرعی احکام کے قدم ہی نہیں اٹھاتے حالانکہ یہ منگنی کی تقریب اور اس کے مصارف ہی ''شرعاً غیر مبارک ہوتے ہیں'' جنھیں بیٹھے وہ طے فرمارہے ہیں مگر جہالت سے اتنی سمجھ کسے اور کون جانے کہ ان معاملات کی وجہ سے دوزخ پیچھے ہی چلی آرہی ہے۔

غرض تاریخ طے ہوجانے کے بعد شرکا مبارک سلامت کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور دلہن کی جانب سے دولہا والوں کو شربت پلایا جاتا ہے خواہ طبی اور ڈاکٹری لحاظ سے اس وقت شربت کا پینا کتنا ہی مضر کیوں نہ ہو لیکن دولہا والے پینے میں کسر نہیں رکھتے۔ اسی طرح ہار، پان، عطر اور سگریٹ نہیں تو حقہ پلایا جاتا ہے۔ اس تقریب میں دولہا کی جانب سے بھاری جوڑا اور کچھ

نقد رقم بھی دی جاتی ہے جس کی مقدار دولہا کی تنخواہ اور حیثیت کے موافق ہوتی ہے۔

بالکل اسی اہتمام سے مردوں کے بعد دولہا کی طرف سے عورت ذاتیں تشریف لے جاتی ہیں اور ان کے ساتھ بھی کچھ کم اہتمام نہیں ہوتا۔ عورتوں میں کچھ قدرتی کمبختی یہ ہے کہ یوں تو وہ گھر سے باہر نہ آئیں وائسرائے کا جہاز تک دیکھنے لیکن اگر انھیں شادی بیاہ کی کسی تقریب میں اذن بھی نہ دیجیے تو بغیر اذن کے بھی آجاتی ہیں۔ پھر اذن والیوں کے آنے کا تو کیا ہی کہنا۔

غرض منگنی کی تقریب میں جانے والی عورتوں کی صدر دولہا کی والدہ ہوا کرتی ہیں۔ یہ بھی انھی مصارف سے تشریف لے جاتی ہیں۔ ان کا کام تو فقط دلہن کی منگنی کا جوڑا پہنانا ہوتا ہے مگر شان اور مصارف کا عالم مردوں سے چہار گونہ ہوا کرتا ہے۔ ان کے ساتھ تانگے، موٹریں اور ڈولیاں ہوتی ہیں اور آگے پیچھے باجا بجانے اور گانا گانے والی عورتیں ہیں جو تہذیب و شائستگی کو دکانوں پر رکھ کر بازاروں سے چلا چلا کر گاتی جاتی ہیں اور دلہن کے گھر پہنچ کر ان کا اور دلہن کی طرف کی عورتوں کا وہی حال ہو جاتا ہے جو اس تقریب میں مردوں کا بیان کیا گیا ہے۔

◆◆◆

نکاح

درمیان کی بے شمار اور مسرفانہ رسوم و تقریبات کو چھوڑ کر اگر نکاح کی تقریب کو بتایا جائے تو شرح یوں ہو گی کہ اس تقریب پر ہر شہر اور ملک کے قاعدے کے موافق خوب خوب روپیہ برباد کیا جاتا ہے۔ پہلی ہی بات یہ ہے کہ دولہا اور دلہن کے خاندان کے ہر فرد کے تمام رشتہ دار، دوست، احباب، محلے والے، شہر والے، ملاقاتی اور ملاقاتیوں کے ملاقاتی تک اس تقریب سعید میں شریک کیے جاتے ہیں۔

شاندار فرش، شامیانے، قالین اور پھولوں وغیرہ سے سجے ہوئے مکان میں یا کسی میدان میں شرکا جمع ہوتے ہیں یا جون اور رنڈیوں سے آسمان سر پر اٹھالیا جاتا ہے بشرطیکہ ایک ہی آسمان مانا گیا ہو ورنہ ساتوں آسمان اٹھالیے جاتے ہیں۔

پھر دولہا سو دو سو یا ہزار دس ہزار روپیہ نقد کا جوڑا پہن کر آتا ہے۔ رئیسوں میں باوصف مرد ہونے دولہا کو زیور بھی پہنایا جاتا ہے مگر اس تعلیم کے زمانے میں اس زیور سے شرمایا نہیں جاتا بلکہ اظہار دولت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور نکتہ رس لوگوں کے مذاق کا آلہ۔ شرکا کو وہی چاندی اور سونے کے ورق جمے ہوئے پان، الائچیاں، ہار، عطر اور سگریٹ پیش کر کے دولہا کو گھوڑے یا ہاتھی پر سوار کیا جاتا ہے۔ کچھ دن سے علی گڑھ والے موٹر پر سوار ہو کر جاتے ہیں، جو اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب کے خیال میں دجّال کی سواری ہے۔ آگے آگے بینڈ باجے، رنڈی اور مٹھائی اور میوں کے خوان اندر خوان روانہ ہوتے ہیں۔ نکاح کی تقریب کہیں دلہن کے مکان میں کہیں ہا کی اور فٹ

بال کے میدان میں اور کہیں مسجد میں ادا کی جاتی ہے۔ بالکل اسی شان سے دولہا کی طرف سے عورت ذاتیں تشریف لے جاتی ہیں۔ اس تقریب کے مصارف کہیں ہزار دو ہزار، کہیں سو پچاس اور کہیں اتنے کہ ملا رموزی صاحب کی چار نسلیں بغیر ملازمت کے پیرس اور لندن میں رہ کر کھائیں تب بھی کمی نہ آئے۔

◆◆◆

بارات

بعض جگہ نکاح اور بارات کا معاملہ ایک ہی ساتھ طے ہو جاتا ہے اور بعض جگہ نکاح آج اور بارات ایک سال کے بعد اور کہیں بارات پانچ سال کے بعد۔ یہ تقریب اس طرح عمل میں آتی ہے کہ نکاح کی طرح پھر ساری دنیا کو اذن دیا جاتا ہے اور اسی اہتمام کے ساتھ تواضع کی جاتی ہے جو اوپر بیان ہو چکا۔ بارات میں بجلی کی روشنی، باجے، رنڈیاں اور مٹھائی کے خوان جس کثرت سے خدا دے، لے جانا بڑی قابلیت، بڑی مالداری اور بڑی فیاضی مانا جاتا ہے۔ بارات امکان اور حیثیت سے زیادہ شان کے ساتھ جاتی ہے۔ دلہن کے گھر ٹھہرتی ہے۔ رات بھر قوالی ہوتی ہے یا رنڈی گاتی ہے، یا بے تکلف دوست بیٹھے مذاق فرماتے ہیں اور جو علی گڑھ کے ہوئے تو تاش بھی کھیلتے ہیں۔ صبح کو دلہن کے گھر پلاؤ کھاتے ہیں اور دوسرے دن دلہن کو بیاہ کر لے آتے ہیں۔

◆◆◆

ولیمہ

اس تقریب کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ دولھا کی تقریبات میں شریک ہوئے ہیں، اپنا وقت اور روپیہ خرچ کیا ہے، تکالیف برداشت کی ہیں، امداد کی ہے، انھیں کھانا کھلایا جائے کہ اس سے باہمی محبت، خلوص اور اتفاق کے جذبات مضبوط ہوتے ہیں، لیکن اس قسم کے کھانے کا اہتمام ہر شخص کی مقدرت اور مالی استطاعت پر موقوف ہے، لیکن جہالت، شریعت اسلامی سے ناواقفیت اور غیر شرعی تمدن کے اثرات نے اس تقریب کو اس درجہ شدید اور لازم بنا دیا ہے کہ ایک ہم کیا لاکھوں مسلمان آئے دن اس تقریب کے لیے اپنا زیور، مکان، بھینس، بکرا بکری، گھوڑا گاڑی غرض سب کچھ فروخت کر کے اس رسم کو ادا کرتے ہیں اور اگر ایسا نہ کریں تو پھر سارے شہر کی لعنت، طعن، طنز اور تالیاں ہوں اور آپ کا سر۔

اس لیے اس میں فقط یہ ہوتا ہے کہ حسب ذیل کھانے پکا کر بکثرت لوگوں کو کھلائے جاتے ہیں۔ کھانوں کے نام یہ ہیں جو فقط ہندستانی ہیں حالانکہ علی گڑھ والے اب انگریزوں کے کھانے بھی کھلاتے ہیں اور ان سب کا اکٹھا نام ہوتا ہے "ڈنر":

پلاؤ، زردہ، نان، بورانی، فیرنی، کباب، مزعفر، اچار، قورمہ، مُرغ، بریانی، تنجن، چٹنیاں، مربّے۔

یہ اور ان سے بھی کچھ سوا کھانے ہوتے ہیں جو ولیمہ کی ضیافت میں کھلائے جاتے ہیں۔ اب ان میں جو شخص کچھ کم کھانے کھلائے وہ غریب اور جو سب کے سب کھلا دے وہ امیر۔

◆◆◆

ہماری شادی کی ضرورت

اگر ہم ذرا اور جاہل ہوتے تو اب تک ہماری شادی کبھی کی ہو چکی ہوتی، مگر وہ تو کہیے کہ مضمون نگار واقع ہو گئے اور مضمون نگار بھی کیسے کہ بڑے مشہور، اس لیے ہمیں یہ غرور ہو گیا کہ ہم ہیں عقلمند اور عقلمند آدمی شادی اسی وقت کرتا ہے جب اس کے پاس بے اندازہ دولت ہوتی ہے اور اسے کسی کی ملازمت میں روزانہ حاضری دینے نہیں جانا پڑتا۔

لیکن اس خیال کی شکست لکھی تھی حضرت والدہ صاحبہ مدظلہا کے دلائل سے، لہٰذا سب سے پہلے یہ خیال حضرت محترمہ والدہ صاحبہ مدظلہا نے ظاہر فرمایا۔ سلسلہ شروع ہو گیا یعنی محترمہ ممدوحہ نے ارادہ فرما لیا کہ اپنے بیٹے ملا رموزی کی شادی کر دی جائے۔ ادھر سے ہم نے انکار کا سلسلہ شروع کر دیا مثلاً ہم نے کہا کہ:

ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے؟

یہ اتنی قلیل آمدنی سے ہم دونوں میاں بیوی کیسے گزر کریں گے۔

ہماری مضمون نگاری چھوٹ جائے گی۔

ہمیں یقین نہیں کہ بیوی کے آ جانے سے ہمارے تعلقات خاندان والوں سے باقی بھی رہیں گے یا ہم اُن کو لے کر علاحدہ ہو جائیں گے۔

تو ابھی ایسی عجلت ہی کیا ہے؟

تو آخر آپ کے ماشاءاللہ دو بیٹے اور بھی تو ہیں، ان کی شادی کیجیے۔

مگر ہم تو اس قلیل آمدنی پر شادی نہیں کر سکتے۔
آپ دیکھتی نہیں ہیں کہ ہر سال ملازمت کا بجٹ بدل دیا جاتا ہے۔
افسر کا مزاج ہے تلوّن، اُسے استقلال نہیں تو ایسی حالت میں پھر؟
اور ہمیں تو ایسے شہر میں کرنا ہی نہیں، جہاں ہماری کوئی حوصلہ افزائی ہی نہیں۔
جی ہاں ہم تو ہندستان کے انھی لوگوں میں شادی کریں گے جو ہماری قلمی خدمات کے صلہ میں اپنی آنکھیں تک ہمارے لیے بچھائے ہوئے ہیں۔

حضرت والدہ صاحبہ مدظلہا کے دلائل یہ ہوتے تھے کہ:
بس تم کو بولنے کا کوئی حق نہیں۔
ہم جو چاہیں گے کریں گے اور جہاں چاہیں گے کریں گے۔
بس بس اللہ اور اس کے رسولؐ کا یہی حکم ہے۔
اب میری زندگی کا خدا حافظ ہے اس لیے میں اپنے سامنے تم کو اس فرض سے فارغ کر دینا چاہتی ہوں۔ مجھے تمھاری دولت کی کیا پرواہ، خدا نے مجھے سادات سے پیدا کیا ہے، یہ شرف کیا کم ہے۔
پھر یہ تو خدا اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے، اس کے سامنے تم کیا اور میں کیا؟
تو پھر تم کون؟

حضرت محترمہ والدہ صاحبہ مدظلہا کے ان دلائل کی تائید میں جب ہمارا سارا خاندان کھڑا ہو جاتا تھا تو نہ پوچھیے ہماری قابلیت، ہماری منطق، ہمارے فلسفے، ہمارے علم الکلام، ہمارے علم البیان، ہمارے علم البلاغت اور ہماری ساری انشاپردازی کی بے کسی؟ اور یہ آخر دنیا جہان کے تمام علی گڑھ پاس لوگ اسی لیے تو شادی کی بلا میں پھنس جاتے ہیں کہ ان کے والدین ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں، اس لیے بے چارے مجبور ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اب جو ہم نے دیکھا کہ شادی کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے تو دل میں طے کر لیا کہ خیر یہ لوگ شادی کرا دیں مگر ہم بھی اس کام میں اگر انکار نہ کریں گے تو تاخیر تو اتنی پیدا کر دیں گے کہ جوانی کا عالم تو گزر جائے گا مضمون نگاری یا قوم و ملک کی خدمت میں، اس وقت تک کے لیے ہزاروں بہانے اور لاکھوں حیلے ایسے تراشتے

رہیں گے کہ انھیں انکار سمجھا جائے گا نہ اقرار اور سب ہم سے اس معاملہ میں خوش بھی رہیں گے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ اندازہ جو ہو گیا کہ اب شادی بہرحال ہو کر رہے گی تو بیوی کے انتخاب کے لیے دل و دماغ میں یہ شرطیں پیدا ہونے لگیں کہ بیوی کیسی ہو، اس لیے اپنی بیوی کے اندر جن صفات کو ہم چاہتے تھے وہ دماغ میں پھرنے لگیں۔

الحمدللہ کہ ہم ملا رموزی صاحب ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ملا رموزی جو ہندستان کے اس سرے سے اُس سرے تک یوں مشہور ہیں جیسے یہ خلافت والے مولانا محمد علی شوکت علی۔ ملا رموزی ہندوستان کے علمی و ادبی طبقوں میں یوں ممتاز ہیں جیسے یہ پنجاب کے ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال اور یہ اس طرح کہ اقبال مدظلہ بھی اپنے طرزِ شاعری میں یکتا ہیں اور ہم بھی ایک چھوڑ دو قسم کے طرزِ انشا کے موجد ہیں۔ تو اس قدر لیاقت کے ہوئے تا یہ معنی کہ بفضلِ ایزدی ہم صاحبِ عقل و احساس ہیں اور ایک احساس والے انسان کی خواہشات بھی اُتنی ہی زیادہ ہوا کرتی ہیں جتنا کہ اس کا احساس قومی اور معلومات وسیع ہوتی ہیں۔

رسول گرامی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کے صدقہ سے بڑی سے بڑی لائق سے لائق اور شاہانہ مجالس اور رئیسوں کی قربت کا تجربہ رکھتے ہیں، اس لیے زندگی، تہذیب، تمدن، معاشرت اور آدابِ انسانیت کے ہر سلیقے اور ہر قرینے سے واقف ہیں اور اگر یہ واقفیت نہ ہوتی تو پھر یہ برٹش پارلیمنٹ سے لے کر ریلوں کے تھرڈ کلاس مسافروں اور مناظرِ قدرت کی ندرت آفریں نکتہ سنجیوں اور اخلاقِ انسانی پر آئے دن مضامین کیسے لکھا کرتے؟

برقی روشنی، برقی پنکھوں، سوٹ بوٹ، رولز رئیس موٹر کار کے اگر فوائد اور مزے سے واقف ہیں تو مراد آباد کے مولویوں، بریلی کے میلاد خوانوں، خلافت کے کھدری لبادوں سے بھی کامل طور پر واقف ہیں۔ اماں اور تو اور یہ ہندستان کے وائسرائے تک کو مہمان بلانے اور مہمان رکھنے کے طریقے یاد بھی ہیں اور ایجاد بھی کر سکتے ہیں کہ اربابِ علم و قلم تو وہ ہوتے ہیں جو نظم حکومت سے لے کر آدابِ شاہی وضع و ایجاد کرتے ہیں۔ کوئی بدھو خاں تمباکو فروش تو ان قواعد کو بناتے نہیں، بس اس ذہنی وسعت اور ہمہ گیر احساس کے موافق ہماری بیوی بھی ہو تو ایسی کہ:

(1) حسن صورت میں یوں درجہ اول ہو کہ خود حسن و عشق اور شاعری اس کی قسم کھائے۔

(2) جسم کی ساخت میں یوں اعتدال اور تناسب ہو کہ نزاکت سو بار قربان ہونے پر آمادہ ہو۔
تیسری قابلیت جو سب سے ضروری چاہتے تھے یہ تھی کہ تعلیم یافتہ ایسی ہو کہ کائنات عالم کی آخر سے آخر وسعت بھی اس کی حدِ نگاہ نہ بن سکے اور یہ اس لیے کہ ملا رموزی اگر کوئی وسیع النظر انشا پرداز ہیں تو وہ ضرور گھر میں بیٹھ کر اپنی بیوی سے کسی دن کہیں گے کہ ''سنتی ہو جی'' یہ جو آج کل لندن میں کرنل ویجوڈ بین کے نام سے ایک انگریز صاحب وزیر ہند بنے بیٹھے ہیں۔ یہ جب برطانوی حکومت کی پارلیمنٹ میں مزدوروں کی طرف سے ممبر تھے تو ہندستانی سیاست پر یوں اظہارِ خیال فرمایا کرتے تھے جیسے وہ ہندستانیوں کے بڑے ہی خیر خواہ ہیں اسی لیے وہ 1923 میں ہندستان سیاحت کے لیے آئے تو ہندستانیوں نے اُن کے استقبال میں ایسے جلوس نکالے اور ایسی شاندار دعوتیں دیں کہ اب اگر وہ ہندستان کے بادشاہ بھی ہو جائیں تو ان کی وہ شان نہ ہو لیکن اب جو 1929 میں وزیرِ ہند بنا دیے گئے تو ہندستان کو آزادی دلانے میں ان کا وہ پہلا سا خلوص کیوں کم ہو گیا؟ تو ہمارے اس اظہارِ خیال یا سوال پر ہماری بیوی کہیں کہ وہ ملا صاحب یہ وہ کرنل ویجوڈ بین ہیں اور نہ ان کو تنہا ایسی مقدرت حاصل کہ وہ ساری پارلیمنٹ اور سارے وزیروں کی زندگی میں ہندستان کو آزادی کا حکم لکھ کر دے دیں۔ پھر ان کے اس جواب پر ہمیں صرف اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو جانا پڑتا کہ مگر وہ اپنی ذمہ دارانہ رائے ہی دے دیں یا وزارتِ ہند سے استعفا دے دیں۔ اس پر وہ جواب دیتیں کہ واہ ملا صاحب کیا آپ کو خبر نہیں کہ انگریز ایک تعلیم یافتہ اور ہنرمند قوم ہے۔ پھر بے شمار ممالک پر فتح حاصل کرنے سے اس کے افراد کی ذہنی قوتیں بھی بلند سے بلند تر ہو گئی ہیں، اس لیے انگریزوں میں قومی مفاد کی عظمت دنیا کی ہر چیز سے سوا ہے اور ظاہر ہے کہ ہندستان انگریزی قوم کے لیے ایک لاجواب دولت ہے پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنے لمبے چوڑے ہندستان کو انگریز یوں اٹھا کر واپس کر دیں گویا ہندستان ان کے لیے ایک بڑی مصیبت تھا یا کبھی ہم اپنی بیوی سے کہتے کہ بیوی سنتی ہو کہ نہیں کہ یہ جو ہندستانیوں میں آئے دن ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے ہیں، یہ قیامت تک اس لیے دور نہ ہوں گے کہ ان کی بنیاد ہے مذہبی اختلاف وعقیدہ پر اور جس خیال میں مذہب کا رنگ ہو وہ قدرتاً دائمی اور شدید ہوتا ہے مثلاً قیامت تک یہ نہیں ہو سکتا کہ ہندو ختنے اور عقیقے کی رسوم میں وہی طریقہ اختیار کر لیں جو مسلمانوں میں رائج

ہیں اور اسی لیے ہندستان میں متحدہ قومیت کا پیدا ہونا آج بھی محال ہے اور کل بھی محال ہی رہے گا۔ تو اس پر ہماری بیوی جواب دیتیں کہ اجی رہنے بھی دیجیے آپ بھی بس نام کے ملا رموزی صاحب بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک دن میں ہوسکتا ہے بشرطیکہ ہندستانیوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت نصیب ہوجائے۔ اس لیے کہ ذہنی صفائی اور صلاحیت ہر قسم کے اختلاف کو مٹادیتی ہے اور یہ ملک مصر اور ملک آئرلینڈ کو نہیں دیکھتے آخر ان میں بھی تو مختلف عقیدے کے لوگ برابر کی تعداد میں آباد ہیں مگر ملکی اور وطنی آزادی کے معاملہ میں سب کے سب یوں متفق و متحد ہیں گویا ایک ہی ماں کے سارے بچے ہیں۔ یا جب ہندستانیوں کو اپنی قومی حکومت مل جائے گی بشرطیکہ تعلیم بھی مکمل اور عام ہوجائے تو پھر حکمرانی کی ذمہ داری بھی عقائد کے اختلاف و تعصب کو مٹادیتی ہے اور کیا دیکھتے ہیں کہ یہ ہندستان کی دیسی ریاستوں میں بھی تو ہورہا ہے کہ مسلمان رئیس ہندو رعایا کو اور ہندو رئیس اپنی مسلمان رعایا کو مساوی حقوق و مراعات دیے ہوئے ہیں یا نہیں؟ یا کبھی ہم اپنی بیوی سے کہتے کہ:

کیوں جی تمھارا خیال اس معاملہ میں کیا ہے کہ یہ زبان اردو اور ادب اردو میں جو لوگ آج سے تین سو ساٹھ برس پہلے استاد یا ادیب مانے گئے تھے یہ آج کل کے اخبارات اور رسالے ان کے حالات اور کارناموں پر تو بڑی بڑی تعریفیں، تقریظیں اور تنقیدیں لکھتے ہیں حالانکہ اب نہ ان کے زمانے کی زبان ہمارے زمانے کے لیے درکار نہ ان کا طرزِ تحریر ہمارے زمانے کے موافق اور بے چارے موجودہ زمانے کے ادیب اور شاعر ہیں کہ لکھتے لکھتے بیمار ہوتے چلے جارہے ہیں مگر یہ اردو کے اخبارات اور رسالے ان کی تعریف اور حوصلہ افزائی میں ایک حرف بھی نہیں لکھتے۔ اس سے یہ نتیجہ اور اثر پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے اہلِ دماغ بے حوصلہ ہوکر کام نہیں کرتے جس سے ادبِ اردو اور زبانِ اردو کی ترقی پذیر رفتار میں کمی واقع ہورہی ہے تو ہمارے اس خیال پر ہماری بیوی فرماتیں کہ ہاں ملا صاحب آپ کے خیال کے ایک حصے سے مجھے اختلاف ہے اور ایک سے اتفاق۔ اختلاف اس سے ہے کہ مشاہیرِ ادب کے کارناموں کو سرے سے بھلا دیا جائے اور اتفاق اس سے ہے کہ عہدِ حاضر کے ادیبوں اور شاعروں کو جتنا بھی ہو بلند کیا جائے کہ یہی فائدہ ہونا چاہیے روشن خیالی، تعلیم اور ذمہ داری کے احساس سے ورنہ پرانے ہی پرانے اور مرے ہوئے اربابِ شعر و انشاء ہی کی تعریفوں

کے پُل باندھنا عہدِ حاضر کے اصحابِ شعر و انشا کی حق تلفی ضرور ہے۔

یا کسی دن ہم اپنی بیوی سے کہتے کہ:

کیوں جی کیا سو رہی ہو؟ خیر اگر جاگ رہی ہو تو ذرا یہ تو بتاؤ کہ یہ کانپور میں رہنے والے حضرت رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی اور الٰہ آباد میں رہنے والے شری سوامی پنڈت موتی لال نہرو کچھ دن پہلے تو ہندستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے میں بے حد سرگرم اور مستعد تھے اور اس معاملہ میں ہر قسم کی قربانی کو جائز قرار دیتے تھے مگر اب کیا ہو گیا ہے کہ یہ دونوں اس معاملہ میں بے حد ٹھنڈے ہو چکے؟ تو اس پر بیوی فرماتیں کہ لاحول ولاقوۃ سونے بھی نہیں دیتے۔ خیر تو سنو کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی خیالات تابع ہوا کرتے ہیں۔ انسانی عمر کے جتنی عمر ہوتی ہے اتنی ہی عقل پھر عقل بھی تابع ہو جاتی ہے قویٰ کی صحت کی مثلاً شروع جوانی کے عالم میں انسان کے مزاج میں قدرتاً جوش، ولولہ، ضد، قہر اور ہمت آزمائی کی قوتیں زیادہ مشتعل اور مستعد ہوا کرتی ہیں بخلاف اس کے عمر کی زیادتی سے ان قوتوں میں اضمحلال بھی واقع ہوتا ہے اور پختگی بھی اور پختگی کا اثر سکون، سنجیدگی، علم اور مآل اندیشی ہوتا ہے۔ پس اس عالمانہ قاعدہ کی رو سے ان دونوں لیڈروں میں اب بھی بات ہو گی جسے آپ بطریق شکایت یا تحقیر فرما رہے ہیں۔ وہ پہلے ایسا جوش اور ولولہ ان میں باقی نہیں رہ سکتا تو اس پر ہم کہتے کہ واہ بیوی واہ۔ اگر ٹھنڈا پڑ جانے کا یہی قانون ہے تو پھر بتایئے کہ یہ سلطان ابن سعود، سعد زغلول پاشا مرحوم، نادر خاں بادشاہ افغانستان، کامریڈ لینن صدر جمہوریہ روس وغیرہ بھی تو بوڑھے تھے پھر ان کے اندر یہ جوش کہاں سے اور کیوں آیا کہ ان سب سے نوجوانوں کی رہنمائی اس جوش سے کی کہ بالآخر اپنے اپنے ملک کو دشمن سے آزاد کرایا تب جا کر دم لیا، تو اس پر وہ فرماتیں کہ اب تو بالکل ہی نیند آ گئی او نہہ دیکھو یہ آنکھیں خود بخود بند ہوتی جا رہی ہیں مگر آپ کو اتنا جواب پھر بھی دیتی ہوں کہ جن بوڑھے لوگوں کے نام آپ نے لیے ان کے عمل میں اور ہندستان کے بوڑھے لیڈروں کے عمل میں اس لیے فرق ہے کہ وہ آپ کے بوڑھے تھے پھر آزاد ممالک کے افراد جنھوں نے آزادی کی فضا میں ہوش سنبھالا تھا اور ہندستان کے بوڑھے لیڈر جب پیدا ہوئے تھے اس وقت بھی غلام تھے، جوانی میں بھی وہی اور بڑھاپے میں بھی وہی۔ اب اگر غلامی اور آزادی کی سرزمین کے اثرات کا قدرتی فرق معلوم کرنا ہو تو کسی حکیم یا

ڈاکٹر کے پاس تشریف لے جایئے میں تو اب سوتی ہوں۔

یا ہم اس پر بھی کہتے کہ اور یہ ہندستانی مسلمانوں میں اسلامی شریعت کے احکام کی پابندی کیوں نہیں؟ تو وہ بھی لحاف پھینک کر فرماتیں کہ علی گڑھ کی وجہ سے اور سو جاتیں۔

تو اب سمجھے آپ کہ اس قابلیت پر یہ بھی چاہتے تھے کہ بیوی کا خاندان بھی اتنا ہی قابل ہوتا کہ جب سسرال میں جائیں تو اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ سسرال کی مالی حالت بھی اس قدر بلند ہو کہ خسر صاحب کبھی ہمارے موٹر پر سیر کو جائیں تو کبھی ہم ان کے موٹر پر۔ ہم جو کہیں 'اُن' کی طرف والے سمجھ لیں اور 'وہ' جو کچھ کہیں ہماری طرف والے سمجھ لیں۔

اب فرمایئے سمجھ لیا نا آپ نے کہ اس قابلیت کی بیوی چاہتے تھے ملا رموزی صاحب اور یہ محض اس لیے کہ ملا رموزی اپنے رحیم و رحمان خدا کے فضل سے اسی قسم کی بیوی کے قابل پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں بشرطیکہ کوئی چاہے۔ پھر اس خیال کی تائید ہوتی تھی اس امر واقع سے کہ موجودہ زمانہ میں پہلے کے زمانے سے تعلیم، تربیت، صلاحیت، بیدار مغزی اور روشن خیالی میں کہیں زیادہ آگے ہے اس لیے غرور سا ہو گیا تھا کہ اب تو ضرور ملا رموزی صاحب کے لیے ایسی بیوی آسانی سے مل جائے گی اور بعید نہیں کہ اہلِ قلم خواتین ہی میں سے کوئی بی بی اس قسم کی تحریک فرمائیں۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر ملک و قوم اور علم و ادب کی خدمت میں بجائے ایک ملا رموزی کے دو ملا رموزی شریک ہو جائیں گے۔ مگر ان خیالات کے ساتھ ایک بات بھول گئے تھے اور وہ یہ کہ ہندستانیوں نے علم و ہنر اور روشن خیالی میں لاکھ ترقی کی ہے مگر افلاس اور تنگدستی تو اس وقت تک انھیں گھیرے ہی رہے گی جب تک کہ وہ غلام ہیں لہٰذا اس حساب سے ان کی ذہنیت میں ذلت اور پستی برابر قائم رہے گی، جس کے صاف معنی یہ تھے کہ اس شان کی بیوی ملے گی اس وقت کہ ملا رموزی صاحب اپنی ساری لاجواب ادبیت کو طاق پر رکھ کر کہیں کے ڈپٹی کلکٹر ہو جائیں لیکن اس معاملہ میں سارے دفتری قابلیت کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ادیب ہونے کے یہ معنی تو ہیں کہ ادیب ایک مرتبہ حکومت اور محکمات حکومت کی بنیادی تجاویز تک مرتب کر سکتا ہے اور اپنے علم و قلم کے زور سے وہ ڈپٹی کلکٹری کے تمام ضوابط و اصول وضع تو کر سکتا ہے مگر خود ڈپٹی کلکٹری اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنا تمام علم و فلسفہ بھول کر پہلے ہیڈ کلرک نہ بن جائے اور پھر کسی انگریزی کی سفارش

سے ڈپٹی کلکٹری تک ترقی نہ کر جائے۔ اس لیے ملا رموزی جو اس قسم کے ڈپٹی کمشنر نہ بن سکے تو اس نے ان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ بیوی کے معاملہ میں بے شمار رخنے ڈال دیے مگر یہ تجربہ ہوا اس وقت جب کہ ننھے میاں کی یہ تازہ والدہ ہمارے گھر میں آگئیں اس لیے دماغ تھا کہ مذکورہ بالا خیالات سے لبریز اور گرم اس لیے محض علم وادب اور قلم کی شہرت کے غرور پر اپنی شادی کا سلسلہ اس طرح شروع کر دیا کہ اِدھر تو محترمہ والدہ صاحبہ مدظلہا سے اپنی معمولی سی رضامندی کی اطلاع کر دی اور اُدھر اپنے ہندستان کے ان دوستوں سے اشارہ کر دیا جن کی واقعی اور سچی قدر دانی اور عزت افزائی نے ہمیں اپنے سارے محروم شہرت دوستوں تک میں محسود بنایا ہے۔

پس یہ واقعہ ہے 1926 عیسوی کا۔ اُس زمانے میں لاہور سے ایک نہایت بلند معیار علمی وادبی رسالہ ''بہارستان'' نکل رہا تھا اور سب سے پہلی مرتبہ اسی رسالہ کی اشاعت بابت ماہ نومبر 1926 میں ہماری نہایت شاندار تصویر شائع ہوئی تھی لہٰذا اسی رسالہ کے مالک اور ایڈیٹر حضرت نازش رضوی نے اپنی طرف سے ایک اشتہار دے دیا کہ حضرت ملا رموزی کو شادی کی ضرورت ہے۔

اب یہاں یہ بتا دینا اپنے حقیقی دوستوں کی مسرت کا باعث ہوگا کہ ان کے ادنیٰ خادم ملا رموزی کو چونکہ خدائے رحیم ورحمان نے علمی وادبی اور اخباری حلقوں میں ایک ایسی شہرت عطا فرمائی ہے کہ ملا رموزی کے متعلق اگر کسی ایک اخبار یا رسالہ میں کوئی تذکرہ چھپ جائے تو پھر سارے اخبارات اسے چھاپ کر رہتے ہیں اور اس لحاظ سے ملا رموزی صاحب ایک طرح کے ''بین الاقوامی جمعیۃ'' بن گئے ہیں۔ بس اتنی اطلاع کا شائع ہونا تھا کہ چھڑ گیا سلسلہ پیام وکلام کا۔ اِدھر ہم نے بھی اپنے ایک ظریف مضمون کے آخر میں صرف اتنا لکھ دیا کہ ملا رموزی کو شادی کی ضرورت ہے، اسے جو اخبار ''زمیندار'' لاہور نے شائع کیا تو اتنے خطوط مل گئے کہ بیک وقت جواب دینا محال تھا۔ ان خطوط میں زیادہ حصہ احباب کی شرکت کے تقاضوں کا تھا اس لیے چارو ناچار لکھنا پڑا کہ ''ابھی شادی ہی نہیں ہوئی تو دعوت کیسی؟ اس جواب نے اخبارات میں اس لیے اور ہنگامہ برپا کر دیا کہ دوستوں کے خیال میں صاحبانِ کمال وشہرت کا ہر ادنیٰ واقعہ بھی اخبار میں آتا ہے اور بے ہنروں کی ساری زندگی کا علم ان کے محلے والوں کو بھی نہیں ہوتا۔ اب ذیل میں چند

اخبارات کے ایسے خیالات نقل کرتے ہیں جن سے ہمارے گاؤں کے مخلصین کو ہماری بین الاقوامی عرف ''پبلک شہرت'' کے اندازہ میں آسانی ہوگی اور ہندستان کے ان عزیز از جان بھائیوں کے حوصلہ افزا تعلقات کی بے تکلفی ثابت ہوتی جن کی قلبی قدر افزائی ملا رموزی صاحب کی حوصلہ مندی کی محرک بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند کی سب سے بلند و باوقار مجلس ''جمعیۃ العلما ہند، دہلی'' کے اس اخبار ''الجمعیۃ'' نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا جو تقدس مآب علما اور مشائخ ہند کا واحد اور نہایت محترم ترجمان ہے۔ پھر یہ بھی بتائے دیتے ہیں کہ اس اخبار کے لکھنے والے حضرت گرامی مولانا حاجی حافظ احمد سعید صاحب دہلوی ناظم جمعیۃ العلما ہند ایسی مقدس و محترم ذات تھی۔ چنانچہ اس اخبار کی اشاعت مورخہ 26 جنوری 1927 کے صفحہ 37 کالم 2 پر ممدوح گرامی نے پُر لطف مقالہ مدیری شائع فرمایا:

''ملا رموزی سے کم و بیش اخبار بین طبقہ اچھی طرح واقف ہے۔ آپ مختلف لباسوں میں اکثر اخبارات میں روشناس ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ عام لباس آپ کا گلابی ہوتا ہے مگر گزشتہ دنوں آپ کی شادی خانہ آبادی کی خبر اخبار ''زمیندار'' لاہور میں شائع ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ پنجاب کے مشہور اور بڑے بڑے نجدیوں کے نام دعوتی خطوط بھی گئے ہیں۔ چونکہ ہمیں بھی ملا رموزی صاحب نے نیازمندانہ تعلق ہے اس لیے ہمیں امید تھی کہ شاید ہم کو بھی اس نکاح میں مدعو کیا جائے گا؟ لیکن ہماری مایوسی کی یہ سن کر کوئی انتہا نہ رہی کہ ملا صاحب نے اس موقع پر برادری کا کھانا نہیں کیا اور صرف مولانا سالک اور مولانا مہر ایڈیٹرس اخبار ''انقلاب'' لاہور ہی کو اس مسنون تقریب کے لیے منتخب کیا۔ ابھی دنوں یہ بھی سنا کہ مولانا سالک نے اپنی شرکت سے معذوری ظاہر کر دی تھی اور فقط ایک سہرا لکھ کر بھیج دیا تھا۔

ہمارا خیال تھا کہ ملا صاحب کی شادی ہو چکی ہوگی اور بہت دھوم دھام سے ہوئی ہوگی۔ ابھی ہم اس خیال پر قائم تھے اور اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ شاید نکاح میں نہ سہی تو ملا صاحب کسی تقریب نکاح کی تقریب کے موقع پر ہمیں یاد کریں گے، کہ دفعتاً ملا صاحب کا ایک خط ہماری نظر سے گزرا جس سے معلوم ہوا کہ آنجناب دہلی

میں ورود فرمانے والے ہیں اس لیے ہم نے بحیثیت نیازمندی دریافت کیا کہ اگر آپ تنہا تشریف لائیں تو آپ کے لیے مردانہ بالا خانہ لب سڑک تلاش کیا جائے لیکن اگر آپ ''گھر کے آدمیوں'' کو دہلی دکھانے کے لیے لا رہے ہیں تو پھر کسی محلہ کے اندر اور گلی کے بیچ میں کوچۂ سربستہ کو دیکھ کر جناب کے لیے کوئی مکان مقرر کیا جائے۔ اس کا جو حسرت آمیز اور یاس انگیز جواب ملا اس کا ایک فقرہ ہم اپنے احباب کے لیے درج کرتے ہیں تاکہ نکات و لطائف کے ناظرین بھی ہمارے ساتھ اس غم میں شریک ہوں اور ملا صاحب کے ساتھ اظہار ہمدردی فرمائیں۔ چنانچہ ملا صاحب فرماتے ہیں:

''رہا اہل و عیال کا معاملہ سو اس کے متعلق عرض ہے کہ آہ وہ چیز یہاں ابھی حاصل نہیں''۔

اس خط کو پڑھ کر ہمیں حیرت و استعجاب ہی نہیں ہوا بلکہ ملا صاحب کی اس اندوہناک ناکامی پر سخت ملال بھی ہوا۔ اب اگر قسمت ملا صاحب کے ساتھ ایسی ہی بے وفائی کر رہی ہے اور زمانہ مخالفت پر تلا ہوا ہے تو پھر ہماری رائے ہے کہ ''زمانہ با تو نہ ساز دتو با زمانہ بساز'' اب آپ بھی شادی کا بائیکاٹ کر دیجیے یا پھر دہلی میں 'مخلصین کی جماعت'' سے یہ کام لیجیے جو ہر پردیسی بزرگ کے لیے اسی قسم کی کوشش کے لیے بغیر کسی گراں مہر کے مستعد رہتی ہے۔ پس اگر آپ کی شادی دہلی میں ہوئی تو پھر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ حضرت مولانا سالک اور مولانا مہر ایڈیٹرس اخبار ''انقلاب'' لاہور کی شرکت بھی ممکن ہوگی، صرف مولوی ہونے کی شرط کافی ہے''۔

صوبہ جات متحدہ کے سب سے نامور اور شہرۂ آفاق اخبارات ''ہمدم'' لکھنؤ اور روزنامہ 'حقیقت'' لکھنؤ نے اسی سلسلہ میں حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیال کیا:

''مُلّا رموزی صاحب ایک بزرگ آدمی ہیں مگر بزرگ بہ لحاظ ''اپنی ملائیت'' کے نہ بہ لحاظ سن و سال کے۔ ہمیں تھوڑے عرصہ قبل ہی اس بات کا انکشاف ہوا کہ ملا صاحب اپنی شادی کے معاملہ میں ابھی تک 'ہنوز روز اول'' ہی ہیں لہٰذا اس لحاظ سے ابھی آپ

ادھورے ہیں۔ حضور ضیاء الملک ملا رموزی صاحب اکثر "گلابی اردو" کے عنوان کے ماتحت اپنے مخصوص انداز میں اخبار "زمیندار" لاہور اور "انقلاب" لاہور وغیرہ کے صفحات پر ظرافت آفرینی فرمایا کرتے ہیں۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے ملا صاحب موصوف کے چند مضامین "حقیقت" میں بھی شائع ہوئے تھے۔ اب ملا صاحب کی یادآوری کا محرک وہ مختصر سا اشتہار ہے جو "زمیندار" کے سنڈے ایڈیشن میں ملا صاحب کی "گلابی اردو" کے اختتام پر بایں الفاظ درج ہے کہ:

"ملا رموزی کو نکاح کی ضرورت"

ملا رموزی صاحب کی اس جدت کی ہم داد دیتے ہیں کہ آپ نے مضمون کے ذیل میں "نکاح کی ضرورت" کا اشتہار بھی دے دیا جس سے آپ کے مضمون کی حیثیت ایک سفارش نامہ کی سی ہوگئی ہے۔

امید ہے کہ اس "گلابی اردو" کو پڑھنے کے بعد ضرور ملا صاحب کی خدمت میں شادیوں کے پیغامات اور درخواستوں کی بھرمار ہو جائے گی اور عجب نہیں کہ کچھ عرصہ تک اخبار "زمیندار" کے صفحات آپ کے ظرافت نگار قلم کی برکات سے محروم رہیں کیونکہ نئی شادی کے انتخاب میں آپ کو اتنی فرصت کہاں ملے گی کہ آپ خطوط کے جوابات لکھ دینے کے بعد اخبارات کے لیے بھی کچھ وقت دے سکیں۔"

(دیکھو اخبار 'ہمدم' لکھنؤ مورخہ 16 فروری 1927، صفحہ 2، کالم 3 و اخبار 'حقیقت' لکھنؤ مورخہ یکم ستمبر 1927 صفحہ 2، کالم 4)

شہر امرتسر کے ایک ہندو اخبار 'ویمد وت' نے اپنی اشاعت مورخہ 6 ستمبر 1927 میں صفحہ 2، کالم 3 پر لکھا ہے کہ:

"حضرت ملا رموزی کو اخباری دنیا میں کون نہیں جانتا۔ آپ کا اسم مبارک ہی خود اپنا تعارف ہے۔ آپ زبردست ظرافت نگار ہیں۔ ہمیشہ آپ کا طرز تحریر انوکھا، رنگ ڈھنگ نرالا اور مضمون البیلا ہوتا ہے۔ 28 اگست 1927 کے اخبار "زمیندار" لاہور میں آپ کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کا خاتمہ یہ ہے کہ:

''مُلّا رموزی کو شادی کی ضرورت''

ہم ہرگز یہ گوارا کرنے کو تیار نہیں کہ ملا رموزی صاحب کی زندگی بے کیف رہے، اس لیے ہم اس خدمت کی سرانجام دہی کے لیے حاضر ہیں بشرطیکہ ملا صاحب داڑھی کا معاملہ صاف فرمادیں''۔

ان تذکروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان کے ہر حصہ میں ہمارے قدردان بزرگوں اور بھائیوں نے ہماری شادی کے لیے کوششیں شروع فرمادیں اور جن جن شہروں میں جن جن حضرات نے کوشش فرمائی ان کے اسمائے گرامی شکریہ کے ساتھ درج ذیل ہیں:

حضرت گرامی ابوالاثر حفیظ جالندھری، ایڈیٹر رسالہ ''مخزن'' لاہور، حضرت گرامی نازش رضوی ایڈیٹر رسالہ ''بہارستان'' لاہور، محترمہ ح۔ب صاحبہ ایڈیٹر رسالہ ''نور جہاں'' امرتسر، محترمہ والدہ صاحبہ، پروفیسر احتشام علی صاحب ایم۔ایس۔سی فیض آباد، حضرت مولانا حافظ حاجی احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلما دہلی، حضرت محترم پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہرہ، ضلع ایٹہ یوپی، مشہور افسانہ نگار حضرت گرامی جلیل احمد صاحب قدوائی بی۔اے علی گڑھ، حضرت گرامی محمود الحسن صاحب بی۔اے علی گڑھ، ایڈیٹر رسالہ ''علی گڑھ میگزین''، پروفیسر مولوی عبدالعزیز صاحب، ندوۃ العلما لکھنؤ، لیفٹنٹ شاہ محمد خاں صاحب پشاور، لیفٹنٹ سید قمر علی بادشاہ جڑانوالہ پنجاب، مولوی حافظ عبدالمعبود صاحب سوداگر عطر، شہر سورت، گجرات، استاذی قبلہ پروفیسر محمد حسین صاحب محوی لکھنوی اورنگ آباد دکن، مشہور ادیب مولانا تمکین کاظمی صاحب ایم۔آر۔اے۔ایس۔لندن، منشی فاضل حیدرآباد خاص، مولوی محمد اسحٰق صاحب مالک کارخانہ بادشاہ پسند چٹنی مارہرہ۔

یہ اُن حضرات کے اسمائے گرامی ہیں جن کی کوششیں اس معاملہ میں نہایت کامیاب رہیں اور ہر بزرگ کی کامیابی کی اطلاع پر ہم نے بخدمت اقدس والدہ صاحبہ مدظلہا حاضر ہوکر ذیل کے دلائل سے ممدوحہ محترمہ کو آمادہ کرتے کہ:

1۔ یہ لڑکی بے حد حسین، خاندانی، اتنی اتنی جائیداد کی مالک ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، اس کے فلاں فلاں رشتہ دار فلاں فلاں عہدوں پر مامور ہیں۔

2۔ پردیس کی شادی تعلقات اور شہرت کے اضافہ کی باعث ہوتی ہے۔ اس سلسلہ سے ہم بھی پردیس چلے جائیں گے جہاں کی آبادی ہمارے لیے آنکھیں بچھاتی ہے۔

3۔ اس لڑکی کی خوبیوں کا تو جواب ہی نہیں۔ یہ دیکھیے یہ فلاں صاحب کیا لکھ رہے ہیں؟

4۔ یہ دیکھیے تو قدر دانی کی انتہا کہ لکھ رہے ہیں کہ اگر ملا رموزی صاحب آپ لڑکی کو ایک پیالہ شربت کا بھی نہ دیں تب بھی ہم لوگ اس لیے راضی ہیں کہ آپ ایسا فاضل اور صاحب شہرت بزرگ تو ہمارے خاندان میں داخل ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

مگر ان تمام دلائل کے جو جوابات حضرت محترمہ والدہ صاحبہ مدظلہا کی جانب سے ملتے تھے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ:

1۔ میں اپنے خاندان کے سوا کسی دوسرے خاندان میں راضی نہیں۔

2۔ میں اپنے گاؤں کے باہر کی حور کو بھی پسند نہیں کرتی۔

3۔ پردیس کی شادی میں مصارف کثیر اور نقصانات یقینی ہیں۔

4۔ پردیس میں مصیبت اور تکلیف کی حالت میں کوئی کام نہیں آتا۔

ممدوحہ محترمہ کے ان دلائل کے ساتھ قبلہ محترم والد صاحب مدظلہ العالی اور خاندان کے ایک ایک رکن نے یوں اتفاق فرمایا کہ ملا رموزی صاحب کا تمام ملا رموزی پن دھرا رہ گیا اور ان لوگوں کے جن دلائل نے ہمیں ٹھنڈا کر دیا وہ فقط حضرت محترمہ والدہ صاحبہ کی وہ فطری شفقت تھی جس کے سامنے انسان کائناتِ عالم کی ہر عزیز شے کو قربان کر دیا کرتا ہے۔ اس لیے طے پا گیا کہ اب ملا رموزی کی شادی اپنے ہی قبیلہ میں کی جائے۔ لہٰذا تحریک سے پہلے ہمارے اس قبیلے کی صورت ملاحظہ فرما لیجیے جس میں ہماری شادی ہو رہی تھی۔

یہ قبیلہ افغانی خون کے چند بگڑے ہوئے دماغوں سے مرکب ہے اور ان لوگوں کو اس زمانے کی ہوشربا ترقیوں میں سے کسی ایک ترقی یا کسی تحریک نے بقدر ضرورت بھی بیدار نہیں کیا ہے۔ جذبات، خیالات، احساسات اور اعمال میں اس قیامت کا ''پرانا پن'' بھرا ہوا ہے کہ آج بھی یہ لوگ جاڑے کے موسم میں روئی کا موٹا سا لبادہ اور روئی کا ٹوپا یا ٹوپ ہی استعمال فرماتے ہیں۔ مزاجوں میں تند خوئی، تلخ گفتاری، منافقت، دھوکہ، غرور، اکڑ اور مزاج کی ہر آخر سے آخر

ذلت موجود مسلّم ہے۔ تعلیم کا نہ مردوں میں پتہ نہ عورتوں میں۔ لڑکیوں کی تعلیمی اور ذہنی استعداد بس اس قدر کہ روٹی پکالیں اور جس ترکاری سے کہیے کھالیں۔ ان میں پمپ جوتا، موزے اور کوٹ کا استعمال اگر گناہگاروں کی علامتیں سمجھی جاتی ہیں تو ''سوڈاواٹر'' کو خالص شراب کہا جاتا ہے۔ پھر اخلاق و دماغ کی ان اخس اوارذل حالتوں پر خدائی قہر بصورتِ افلاس نازل جس نے رہی سہی اور فطری استعداد و صلاحیت کو بھی برباد و برہم کر دیا ہے۔

اسی طرح رسوم و ضوابط کے وہ پرانی لکیر کے بگڑے ہوئے فقیر کہ نہ صحیح معنی کے مقلد نہ غلط معنی کے غیر مقلد۔ یوں سمجھو جیسے سلطان ابن سعود نے چند شیعہ بھائیوں کو تلوار کے زور سے وہابی بنالیا ہو۔ اس لحاظ سے حسن سیرت تو رہا ایک طرف حسنِ صورت کا یہ حال کہ ہر شخص بحال خود افلاس و تنگدستی کا قحط زدہ نمونہ۔ پس اس حالت کا اثر یہ کہ شادی کے معاملات بھی یکسر غلط۔ مثلاً کہیں حسب و نسب پر وہ زور کہ لڑکا بازاری غنڈوں کا سردار بھی ہو تو پرواہ نہیں، لیکن نسب اور خاندانی شرف یہ ہو کہ ہر شخص اسے ''پٹھان'' کہہ کر پکارتا ہو۔ گھر میں ایک وقت کے گزارہ کو بھی کچھ نہ ہو، لیکن باہر سب لوگ ''سید صاحب'' کہتے ہوں۔ مزاج و خواص میں خاصا سفلہ پن موجود ہو، مگر ساری دنیا ''مرزا صاحب'' کہتی ہو۔ اب آپ ہی از راہِ انصاف بتا دیجیے کہ ملا رموزی اس گروہ میں کیا رُتبہ پاسکتے تھے مگر وہ جو کہا ہے کہ اللہ ری بد قسمتی۔

سلسلہ تھا کہ شروع ہو گیا اور انھی اصول کے ساتھ شروع ہو گیا جن کا اوپر تذکرہ آچکا ہے۔ اس لیے ہر پیغام اور تحریک کا تکمیلی اور آخری جواب ملنے تک چھ سات ماہ صرف ہوتے تھے اور نتیجہ میں یا اُدھر کے لوگ ناراض یا ہماری طرف کے لوگ خفا۔

القصہ ہمارے ذوق اور ذہنیت کا قدرتی مطالبہ یہ تھا کہ ہم اس معاملہ میں جس طرح بھی ہو کسی صاف اور ستھرے ذوق کے گھرانے سے تعلق پیدا کریں اور ایسے گھرانے بہ الفاظ اصطلاحی طبقۂ اعلیٰ ہی میں مل سکتے تھے، سو وہ بھی پوری مناسبت سے بہت کم تعداد میں۔

ہمارے خیال میں اگر آج سے ایک ہزار سال قبل کی وہ کتابیں دیکھی جائیں جو اُس زمانہ کے طبقہ اعلیٰ کے لوگوں کے اخلاقی ذمائم سے لبریز ہیں تو اس نسبت سے آج کا اور اس عہد کا طبقۂ اعلیٰ ایک ہزار سال قبل کے طبقۂ اعلیٰ سے اخلاقی ذلت میں کچھ آگے تو بڑھ گیا ہے مگر اس میں کوئی

اصلاحی ترقی جو آج بھی نہیں پائی جاتی اس کا سبب خود ہم نے یہ پیدا کیا کہ ہر دور کے طبقاتِ اعلیٰ پر چونکہ طبقاتِ متوسط وادنیٰ کا کوئی اخلاقی دباؤ اور احتساب نہیں ہوا کرتا تھا اور نہ آج ہے اس لیے طبقۂ اعلیٰ کی ذہنی اور مزاجی حالت کسی ضبط وضابطہ کی پابند نہیں رہتی اور طبقۂ اعلیٰ کے تمول واقتدار کا دباؤ ہمیشہ سے طبقاتِ متوسط وادنیٰ پر رہا ہے۔ اس لیے ان دونوں طبقوں کے افراد کو کبھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ طبقۂ اعلیٰ کی بداعمالیوں اور غلط کاریوں پر کچھ کہتا۔ اسی طرح اسلامی حکومت کا وہ دور بھی گیا گزرا جو کبھی مقتدر سے مقتدر انسانوں پر بھی شرعی حدود دسزا نافذ کرنے میں خوف نہ کھاتا تھا۔ لہٰذا آج نہ پوچھیے اس طبقہ کی اخلاقی بے اعتدالیاں۔ واللہ کہ اگر تحریر کی متانت اور تہذیب اجازت دیتی تو ملا رموزی اس طبقۂ اعلیٰ کے دو چار ہی ایسے واقعات لکھ دیتے جن کے مطالعہ سے تہذیب وشرافت کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور عقل وفراست اسی لمحہ رخصت ہوتی کہ خدا ہی رحم فرمائے اس انسانی گروہ پر۔

تو ہاں بس اسی غرور کے ساتھ کہ اب اگر ملا رموزی کی ذہنیت اس کی صحیح حالت کو کوئی پہچان سکتا ہے تو وہ وہی شخص ہو سکتا ہے جو تعلیم یافتہ ہو اور ہماری بدقسمتی سے ہمارے اس معاملہ میں بھی ہمیں وہی شخص پہچان سکتا تھا جو خود صاحب علم وبصیرت ہو اور ہمارے قبیلے میں ایسے افراد بس طبقۂ اعلیٰ ہی میں نظر آتے تھے باقی سب خیریت تھی۔ اس لیے کیا خطا کی ملا رموزی نے جو طبقۂ اعلیٰ کے دو چار خاندانوں میں اپنی شادی کا پیغام پہنچا دیا؟

اور الحمدللہ کہ غلطی نہ ہوئی اور ایک بڑا مقصد یہ ضرور حاصل ہو گیا کہ ایسے خاندانوں کے ایک ایک فرد نے ہماری مسلمہ شہرت اور ان کے خاندان کو چار چاند لگا دینے والی ہماری علمی وادبی منزلت کا سب نے پورے جوش سے اقرار کیا اور الحمدللہ کہ بڑے زور سے کہا گیا کہ اگر ملا رموزی اپنے خاندان کے لیے فخرِ خاندان ہو سکتے ہیں تو ہمارے خاندان ہی کے لیے نہیں بلکہ ہمارے سارے قبیلہ کے وہ سردار بن سکتے ہیں، پھر لڑکی کیا چیز ہے، مگر — مگر — مگر — آہ نہ پوچھیے طبقۂ اعلیٰ کے اس ''مگر'' کی حقیقت۔ یعنی اس اعتراف واقرار پر جواب یا انکار صرف اس لیے کیا گیا کہ ملا رموزی کی آمدنی فقط ایک سو پچاس روپیہ ماہوار ہے۔ اس کے پاس سواری میں موٹر نہیں ہے اور کسی حکومت کا عہدہ دار نہیں ہے، اس لیے اسے لڑکی دینے سے انکار ہے۔

کہیے اس ذہنیت اور اس خیال سے کیا اندازہ کرتے ہیں آپ ان لوگوں کی عقلی پختگی اور فراست کے متعلق؟ یہی تو ہے غلامی کی وہ ذہنی ذلت جس کے ہاتھوں آج سارے ہندستان کی 95 فیصدی بے زبان لڑکیاں باوصف خود صاحب علم و ہنر ہونے کے بے حس، بے علم اور بدذوق تھانیداروں، انجینئروں اور سوداگروں کے حوالے کر دی گئی ہیں۔ محض اس لیے کہ ان لوگوں کے پاس دولت ہوتی ہے، مگر دنیا شاید اس حقیقت سے افلاس کے ہاتھوں بے خبر ہو چکی ہے کہ عورت کی فطرت جہاں زر پسندی ہے وہاں وہ اپنے شوہر کو جہالت اور بے حسی کا بدھوخاں تمبا کو فروش بھی دیکھنا یا سننا برداشت نہیں کر سکتی، لیکن ماں باپ کی اس عام ذہنی کوتاہی کو کیا کیجیے کہ وہ اپنی بیٹی کے ذوق اور خیالات کو شوہر کے متعلق کسی تدبیر سے معلوم کر لینا بھی ایک ایسا شرمناک گناہ سمجھے بیٹھے ہیں جس کی سزا ان کے نزدیک بس خودکشی ہے۔ بعض گھرانوں میں لڑکیاں اپنی عمر کے خطرناک دور تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ بے بسی کی اس حد تک پہنچ کر طبعاً شوہر کے اندر کسی تمول یا افسری کو نہیں چاہتیں لیکن ماں باپ اس نازک وقت میں بھی اپنے برابر کا مالدار اور صاحب اعزاز و امتیاز مرد ہی کی تلاش میں رہتے ہیں۔

پھر اس موقع پر جماعتی ذہنیت اس سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ اس طرح کہ اگر کوئی مالدار اور مقتدر خاندان کی لڑکی کسی مفلس یا لڑکی کے خاندان سے کم حیثیت کے مرد سے بیاہ دی جائے تو ایسی لڑکی اور ایسا لڑکا جماعت میں عمر بھر مطعون کیے جاتے ہیں اور دونوں کے اخلاق پر حملے کیے جاتے ہیں۔ بعض اس لیے کہ دونوں کا اپنی اپنی حیثیت میں برابر نہ ہونا کسی خاص کمزوری کا باعث ہے۔ پس اگر جماعت کی اس طعنہ زنی کو معقول کہا جائے تو اس میں سوائے اس کے کہ جماعت کی عقلی کمزوری ہے اور کچھ نہیں۔

پس ان حالات کے ساتھ ملا رموزی صاحب کے لیے طبقۂ اعلیٰ میں شادی ابھی بالکل محال نہ ہوئی تھی کہ حضرت والدۂ محترمہ کو ہماری اس کوشش کا علم ہو گیا اور ممدوحہ محترمہ نے طبقۂ اعلیٰ میں شادی کو ذیل کے دلائل سے منع فرمادیا:

(1) امیر گھرانے کی لڑکی غریب گھرانے افراد کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی۔

(2) امیر گھرانے کے دوسرے افراد غریب شوہر کی کوئی وقعت نہیں کرتے۔

(3) امیر گھرانے کی لڑکی غریب شوہر کی فرماں بردار نہیں رہتی۔

(4) امیر گھرانے کے افراد کی نظر میں غریب شوہر کے گھرانے والے اپنی خودداری کے جذبات سے از خود شرمسار اور سرنگوں رہا کرتے ہیں۔

(5) امیر گھرانے کی شادی سے ہمیشہ غیر معمولی مصارف کا سامنا رہتا ہے وغیرہ۔

ان تمام دلائل کی پختگی سے معمولی ذہن کے لوگ کبھی انکار نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ ہمارے آس پاس رہنے والے لوگ دوست جو خود کو لیڈر، ایڈیٹر اور کسی حکومت کے صدر اعظم سے کبھی کم نہیں سمجھتے ہیں والدہ صاحبہ کے ان دلائل سے مرعوب نظر آتے تھے اور ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم طبقۂ اعلیٰ میں شادی کے خیال سے گزر جائیں، لیکن ان تمام دلائل کا توڑ ہمارے پاس صرف یہ تھا کہ اگر شوہر میں ذہنی صلاحیت اور قابلیت قابلِ اطمینان ہے تو وہ ان تمام حالات پر قابو پا سکتا ہے اور اپنی برتری سسرال کے ایک ایک رئیس سے منوا سکتا ہے، ورنہ لوزان کانفرنس میں مارشل عصمت پاشا ایسے معمولی جنرل کا ان یورپین مدبرین پر فتح پانا محال تھا جن میں کا ایک ایک کئی کئی لاکھ روپیہ کا وزیر اعظم تھا۔ اس لیے یہاں سے ہماری حکمت عملی میں تو کوئی فرق نہ آیا البتہ طریق کار بجائے ظاہری پولیس کے خفیہ پولیس کے سپرد کر دیا اور اب پوشیدہ طور پر ہم نے تحریک کو آگے بڑھایا۔ محض اس وجہ سے کہ صاف ذہنیت، اعلیٰ تعلیم اور موجودہ طرزِ معاشرت سے واقف لڑکی متوسط یا غریب گھرانوں میں آسانی سے مل نہیں سکتی تھی۔

خوش بختی کہیے اور بد بختی بھی کہ ملا رموزی کے چند ذی مقتدر قدر دان بھی تھے جنھوں نے ازراہِ نجات قدر دانی ہمارے اس مقصد کی تکمیل میں اپنے اثرات کو صرف فرمانے کا وعدہ فرمایا اور عملاً ہماری تحریک کی واقعی تائید بھی فرمائی۔ اب کیا تھا ملا رموزی صاحب کے غرور میں اور اضافہ ہو گیا اور ہر وقت یہ خیال تازہ رہنے لگا کہ عنقریب ملا رموزی کسی بہت بڑے لاٹ صاحب کے داماد صاحب بننے والے ہیں۔ تھوڑے ہی دن میں نتائج پیدا ہونے لگے اور ہماری تدابیر مؤثر ثابت ہوئیں۔ ایک چھوڑ تین خاندانوں سے منظوری دے گئی، لیکن ان منظوریوں کے ساتھ ہم نے ان خاندانوں اور لڑکی کی اخلاقی حالت کی تحقیق کی تو فیصلہ وہی کرنا پڑا جس پر حضرت محترمہ والدہ صاحبہ کا اصرار تھا۔ ایک خاندان ایسا بھی ملا جس کے نسبی مجد و شرف میں کوئی کلام نہ تھا۔ عہدہ

داریاں اس گھر کی غلام تھیں، دولت بے شمار اور جاگیریں بحال، لیکن لڑکی کی عمر اپنے بڑے مولوی صاحب کے برابر لہٰذا فیصلہ وہی کرنا پڑا جس پر حضرت والدہ صاحبہ مد ظلہا مصر تھیں۔

ان حالات سے بظاہر اتنا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ملا رموزی نے دو چار امیر خاندانوں میں شادی کی تحریک کی۔ دو چار امیروں کی سفارشیں بہم پہنچائیں، دو چار امیر خاندانوں نے ملا رموزی کو خود بخود پسند کیا مگر حالات کی ناموافقت سے ایسا نہ ہو سکا لیکن واقعات اس کے خلاف اور ناقابلِ برداشت ہیں۔ مثلاً ان حالات کی تکمیل تک جس بڑی مقدار میں وقت ضائع ہوا، بڑی سفارشوں کے حصول میں شرافت النفس اور خودداری ایسے عظیم الاثر جذبہ کو اس کی ایک ایک اذیت پر کوہ قاف کی لاکھوں پریاں قربان کر دینے سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، بس ان ناقابلِ برداشت کوششوں کے سلسلے میں ہر تحریک پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس لڑکی سے ہم شادی کرنا چاہتے ہیں اس لڑکی کو تو عمر بھر شادی کی ضرورت نہیں ہے، بس ضرورت ہے تو فقط ہم کو ہے اور یہ فرق محض طبقۂ اعلیٰ کی زرطلبی اور ''عہدہ دار خواہی'' کا اثر تھا ورنہ بادصف علمی مقابلوں کے یہ طبقہ اب تک ملا رموزی کو نااہل ثابت نہ کر سکا، لیکن اس پر بھی جو اس طبقہ میں مشکلات کا سامنا ہوا وہ صرف اس لیے کہ ملا رموزی صاحب کے پاس موٹر کار نہیں تھی اور کوٹھی نہیں تھی اور ملا رموزی صاحب کے پاس زبان میں دستخط کرنے والے افسر نہیں تھے اور ماشاء اللہ فخرِ خاندان تھے، فخرِ دوستاں تھے، فخر قوم تھے اور فخر گاؤں تک تھے۔ بالآخر جس قوت نے اس طبقہ میں شادی کے لیے محرک بنایا تھا اسی قوت نے اس طبقہ کا مخالف بنا دیا۔ یعنی ہمارا احساس۔ چنانچہ اس طبقہ کی ناگفتہ بہ ذہنیت اور زرطلبی سے متاثر ہو کر اب جو طبقہ متوسط میں آئے تو یہاں رسوم و عوائد اور جہل و بے خبری کی جکڑ بند میں ڈال دیے گئے۔ مثلاً اس طبقہ میں تاریک خیالی کا دور دورہ تھا اور یہاں سب سے پہلی چیز چالاکی، دھوکہ اور تدبیر وغیرہ ذرائع پر کامیابی موقوف تھی لہٰذا اس سلسلہ میں پھر دوستوں کی امداد و دستگیری کا طالب ہونا ضروری ہو گیا اور اب وہی وقت اور دماغ کو تباہ کرنے والی کوششیں یہاں بھی شروع ہو گئیں۔ چنانچہ اب موقع آیا دوستوں کی آزمائش کا، اس لیے یہاں سے اخلاقیاتِ انسانی کا ایک نہایت ہی عبرت آموز تجربہ یا حصہ شروع ہو گیا۔

یعنی ملا رموزی اس عالم خیال کو کوئی وقعت نہیں دیتے کہ دنیا میں صحیح معنی کے دوستوں کا

وجود نہیں بلکہ رموزی کا یہ خیال ہے کہ صحیح دوستی اور رفاقت کے اصول دو انسانوں میں جمع نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ دوست نہیں ملتے۔ صحیح معنی کے دوستوں کا ایک سبب عام جہالت اور صحیح یا بلند تربیت کا فقدان ہے۔ غلامی کی ذہنیت ہندستانیوں کے اعلیٰ اخلاق کو تباہ کر چکی ہے، لیکن ان موانع کے باوجود بھی آج ایک سے لے کر بارہ درجن ایسے دوست مل سکتے ہیں جنھیں صحیح معنی کا دوست کہا جائے بشرطیکہ خود ہمارے اصول صحیح اور پختہ ہوں۔ پس ملا رموزی صاحب کے اس خود ایجاد کردہ معیار کے موافق ہمارے گاؤں میں اس بلند حیثیت کے دوستوں کا ملنا محال تھا البتہ اس کے مخالف بہت، لیکن اجتماعی مسائل میں یہ بھی غلط ہے کہ کوئی اکیلے ملا رموزی صاحب اٹھیں اور جا کر کابل فتح کر لیں، اس لیے انھی بھائیوں سے اس ضرورت میں امداد چاہی گئی جو ہر وقت منہ کے سامنے رہا کرتے تھے۔

اس تحریک میں دوستوں سے یوں امداد لی جاتی ہے کہ وہ لڑکی کے پاس جائیں، پھر جائیں، پھر جائیں، پھر جائیں اور ہزار بار جائیں اور منظوری تک جاتے رہیں لڑکی والوں کے سامنے لڑکے کی ہر طرح اور ہر قسم کی تعریف کریں۔ اگر لڑکے کے خلاف لڑکی والوں کو کوئی غلط احتمال ہو اس کی تردید کریں، دلائل اور ثبوت بہم پہنچائیں اور اگر معاملہ یوں نہ طے ہو تو موقع پا کر لڑکی والوں کا گلا نہ گھونٹ سکیں تو ان کی خوشامد ضرور کریں، پھر اگر اس پر بھی معاملہ طے نہ ہو تو کوئی دوسرا گھر جا کر دیکھیں اور وہاں بھی انھی حرکتوں کو جاری رکھیں پھر یہاں سے بھی جواب صاف مل جائے تو تیسرا گھر جا دیکھیں اور اگر مقدرت اور توفیق شامل حال رہے تو سارے شہر میں اس تحریک کو پہنچائیں اور اس پر بھی اگر کامیاب نہ ہوں تو پھر دوستی کے حق کو یوں پورا کر دیں کہ قرار، اغوا، اقدام قتل، قتلِ عمد، قتلِ عام، ستیہ گرہ، عدمِ تعاون، ترکِ موالات، مقاطعہ جوئی، ہڑتال، گو بیک سائمن، دھمکی، سرخ اشتہارات، بم، بغاوت یا پھر وارنٹ، گرفتاری، حوالات، مار پیٹ، چالان، جیل، کالا پانی، جلاوطنی، پھانسی، پریوی کونسل لندن، ہیگ کی عدالت اور جمعیۃ الاقوام میں سے جو چیز کارآمد نظر آئے اسے حصول کا ذریعہ بنالیں کہ دوستی کے حق کو ادا کرنا ہر حال اور ہر صورت سے فرض کہا گیا ہے، نفل کہیں نہیں کہا گیا۔

اور دوستوں پر شادی کی تحریک کے سلسلے سے یہ تمام ذمہ داریاں محض اس لیے عائد ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا جماعتی قانون یہ ہے کہ شادی کرنے والا شخص خود اپنے لیے کسی سے اس معاملہ

میں ایک بات بھی نہیں کرسکتا چاہیے وہ ایک کی جگہ ایک ہزار باتیں کرنے کا اہل ہو اور اپنے سارے رشتہ داروں میں بات کرنے کا سلیقہ صرف شادی کرنے والے شخص ہی میں موجود ہو، اس لیے اس جاہلانہ ضابطوں کی پابندی میں یا لڑکے کے رشتہ دار تحریک فرمائیں یا اس کے دوست۔ پھر دوستوں کی علامتیں اس معاملہ میں یہ قرار دے گئی ہیں کہ:

(1) لڑکے کے والد کی عمر کا دوست ہو، نوجوان دوست اس تحریک کے لیے معتبر نہیں۔

(2) شہر میں ذی اثر ہو، مشہور ہو، ملازم ہو۔

(3) جو ایک دو بچوں کا باپ ہو۔

اس لیے ملا رموزی صاحب کے ایسے دوستوں کی تعداد اگر چہ بہت کم تھی، لیکن دنیا میں جب ہر چیز مل سکتی ہے تو ایسے احباب بھی مل گئے اور جہاں اس عمر اور ان علامتوں کے دوست نہ ملے وہاں نوجوان دوستوں، پرانے اور بے کار عرف بوڑھے بزرگوں میں سے کسی کو تیار کیا گیا۔ انداز ہ فرمالیجیے کہ اس کوشش میں کتنا عرصہ گزر گیا ہوگا؟

اب تحریک کا آغاز ہوا مگر تاکید یہ کردی گئی کہ طبقۂ متوسط سے نیچے یہ تحریک نہ جانے پائے اس لیے تحریک کو طبقۂ متوسط کی ذہنیت سے ٹکرانا پڑا۔

طبقۂ متوسط کی ذہنیت کا کوئی معیار قائم کرنا محال ہے اس لیے کہ اس طبقہ میں نرے بریلوی قسم کے مولوی بھی ہیں اور خالص ایم۔اے علیگ بھی۔ کوٹھیوں اور موٹر والے بھی ہیں اور پاپیادہ بھی۔ ٹخنے سے اونچا پاجامہ پہننے والے بھی ہیں اور سوٹ بوٹ والے بھی۔ یہی حال اس طبقے کی عورتوں کا ہے۔ کلب اور ناٹک میں جانے والیاں بھی ہیں اور وعظ و میلاد کی مجالس تک سے ناواقف بھی۔ ڈھیلے ڈھیلے کپڑے والیاں بھی ہیں اور ساڑی پہننے والیاں بھی۔ رسالہ 'عصمت' دہلی، 'نور جہاں' امرت سر کی خریدار بھی اور جاہل محض بھی۔ اس لیے ان حالات کی نسبت سے ہمارے دوستوں کے انتخاب میں بھی سینکڑوں رکاوٹیں حائل تھیں جن کا مقابلہ محض قابلیت اور دماغی صلاحیت سے تو کیا جاسکتا تھا، مشین گن اور کوتوالی سے نہیں۔

مگر ملا رموزی کے دوستوں نے اس معاملہ میں جو کچھ کیا وہ یہ کہ ملا رموزی خود ان حضرات کی خوشامد کو روزانہ یوں جاتے تھے گویا خود انھی سے شادی کرنا چاہتے ہیں یا ان کی ملازمت کے

خواستگار ہیں۔اور جو ایک صاحب نے بڑی مہربانی سے ایک جگہ تحریک فرمائی تو شکست یوں کھا آئے کہ آپ نے تردید کیوں نہیں فرمائی؟ تو وہ چپ ہو گئے اور ہم بھی چپ ہو گئے۔واضح ہو کہ یہ ان دوستوں کا برتاؤ اور طریقِ عمل تھا جن میں کا ہر ایک خود کو احساس، علم وفضل، بیدار مغزی، روشن خیالی، وقوف وشعور اور دوستانہ ذمہ داری کا مالک کہتا ہے اور مدعی ہے۔اس لیے ان لوگوں سے ان کی اس کمزوری پر منطق، فلسفے، علم الکلام، علم الالسنہ، جغرافیے، ریاضی، صرف ونحو اور تعزیرات ہند وغیرہ سے بحث کر کے قائل کرنا وقت اور دماغ کی تباہی کا باعث تو تھا اور کچھ نہ تھا۔

ادھر طبقۂ متوسط کے احساس اور ذوقیات کے لحاظ وانداز ے کی بنا پر ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے اس معاملہ میں مقتدر طبقے کی کسی مقتدر شخصیت سے کام لیا جائے تو مقصد حاصل ہوگا۔پس اس خیال سے اپنی اس تحریک کو مقتدر طبقہ کی ایک صاحب اقتدار وشہرت ذات کے سپرد کر دیا گیا۔ حیرت انگیز وعبرت آموز بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں خدائے رحیم ورحمان نے جس شخص کو ہماری ذات سے ہمدردی وخلوص عطا فرمایا وہ نہ دیرینہ دوستوں میں سے کوئی تھا نہ رشتہ داروں میں سے بلکہ خلوص وایثار کا یہ خداداد مجسمہ ایک غیر مسلم شخص تھا، جس نے اس تحریک کو انتہائی خلوص وصداقت اور واقعی معنی کی ہمدری کے ساتھ کامیابی کی انتہا تک پہنچا دیا۔اسی طرح وہ صاحب اقتدار وحشم ہستیاں لائقِ شکر وستائش ہیں جنھوں نے اپنے ملا رموزی صاحب کی اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اپنے اثرات سے دریغ نہ کیا۔اب تو کچھ بھی نہ تھا جہاں اور جس حیثیت کے خاندان میں ملا رموزی صاحب کا پیغام جاتا، ایک ہی ہفتہ کے اندر اس خاندان کے جملہ افراد راضی ہو جاتے۔ یہاں تک تو دخل رہا صرف ملا رموزی کی پسند ادا کوشش کو لیکن اس کے بعد معاملہ کی تکمیل تھی ملا رموزی کے والدین کے اختیار واجازت پر، لیکن ان کی مرضی کے خلاف ان ساری جھوں میں بس یہ ایک چیز تھی کہ اس وقت تک کی ہماری پسند کی ہوئی لڑکیاں تھیں سب کی سب ''اسکولوں کی'' لہٰذا ناپاس یا فیل کر دی گئیں۔اب نہ پوچھیے ہمارے افسوس اور تاؤ کا علم، مگر یہ سب کچھ اور اس سے بھی سوا حیثیت کی ہر دولت قربان تھی والدین کی مرضی اور ان کی پسند پر۔

واضح ہو کہ ابھی ہماری کوششوں کا سلسلہ اس حد تک پہنچا تھا، اُدھر ہمارے والدین کی تحریک بھی جاری تھی کہ یکا یک حضرت محترمہ والدہ صاحبہ مدظلہا کو ایک مہلک اور خطرناک مرض کا

نہایت شدید دورہ پڑا، جس نے ہمیں ان کی زندگی سے مایوس سا کر دیا، مگر بفضل ایزد و برتر چند دن میں طبیعت رو بہ صحت تو ہو گئی، لیکن مہلک مرض کے اثرات نے ممدوحہ محترمہ کو بے حد نحیف اور پست حوصلہ بنا دیا، اس لیے اب دن رات کا سلسلۂ کلام یہ تھا کہ:

بنے پھرتے ہیں ملّا رموزی

میری آخری تمنا تھی کہ میں اس کی شادی کی خوشی اس آخر وقت میں دیکھ لیتی۔

ہاں اچھا ہے میاں تم تو کسی رئیس کی بیٹی ہی سے شادی کرنا۔ ہمارا کیا بس اب چند دن کے اور مہمان ہیں۔

محترمہ ممدوحہ کے ان تاثرات سے ہمیں حد درجہ متاثر ہونا چاہیے تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم پھر ایک آخری کوشش کے لیے تیار ہو گئے، مگر اس اندیشہ کی بنا پر کہ کہیں اس معاملہ کا طول دے دینا ممدوحہ محترمہ کی ناراضی کا سبب نہ بن جائے۔ اُدھر اطباء کی رائے تھی کہ ایسا خیالی شغل بہت مفید ہوگا، جس کے ذریعہ ممدوحہ کا خیال اپنے مرض کی طرف سے ہٹ جائے۔ چونکہ ہم اس خیال کو محترمہ ممدوحہ کی خدمت سمجھتے تھے اس لیے خدائے رحیم و رحمان کی تائید بھی ہمارے شاملِ حال ہوئی اور کہیں ہمارے فقط نام اور تنخواہ کا علم فوج کے ایک افسر اعلیٰ کو ہوا، اس ضرورت کے ساتھ کہ ملّا رموزی صاحب کو شادی کی ضرورت ہے، اس لیے ایک دن راستے میں ملے تو فرمایا کہ کیا آپ کا کوئی دوسرا ہم نام آدمی بھی اس گاؤں میں رہتا ہے۔ ہم نے کہا کہ گاؤں تو گاؤں اس وقت ساری دنیا میں ہمارا ہم نام نہیں تو فرمایا کہ بس تو پھر آج آپ مجھ سے کسی وقت مل لیجیے۔

اب جو ملے تو موصوف نے پہلے تو بتایا کہ وہ اخبارات کے ذریعے آج سے نہیں بلکہ جنگ یورپ کے زمانہ سے ملّا رموزی کو جانتے ہیں اور جب اخبارات کے ذریعے سے جانتے ہیں تو اب ملّا رموزی کو کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں اس لیے پہلی ہی ملاقات میں فرمایا کہ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کی شادی کا بندوبست اپنے ہی عزیزوں میں کر سکتا ہوں، جو ریاست ٹونک واقع راجپوتانہ کے جاگیردار اور محکمۂ پولیس میں افسر ہیں۔ چونکہ اس گھرانے کی ذہنی استعداد کا ہمیں کوئی علم نہ تھا، اس لیے ہم نے اس واقعہ کو حضرت محترمہ والدہ صاحبہ مدظلہا سے لفظ لفظ عرض کر دیا۔ اس اطلاع پر ممدوحہ نے اپنے ضابطوں کے موافق تحقیق حال کے بعد فیصلہ صادر فرمایا کہ

بس اسی جگہ ہو۔

والدہ محترمہ کا یہ فیصلہ ان کی علالت کے ایسے نازک دور میں ہوا جب کہ ہم ان کی مرضی کے خلاف کوئی ادنیٰ حرکت بھی ان کے مرض کی خطرناک حالت میں اضافہ کا باعث سمجھتے تھے اور اس فیصلہ کا ایک نمایاں اثر یہ دیکھا کہ محترمہ مدظلہا کے خیالات مرض کی تشویش سے ہٹ کر ہماری اس منظور شدہ شادی کے مسائل پر مبذول ہونے لگے اور لحظہ بہ لحظہ مرض میں تخفیف شروع ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ ملا رموزی ایسے ''والدہ پرست بیٹے'' کے لیے اس سے سوا کوئی دولت، کوئی مسرت اور کوئی سعادت نہ تھی کہ وہ بے چوں و چرا اپنی رضامندی بھی ظاہر کردے، اس لیے ملا رموزی نے اپنی شادی کے لیے کوشش کرنے والے مخلص ترین احباب حضرت گرامی کپتان عبدالعزیز خاں صاحب اور حضرت عزیز ایڈ جونیٹ سید ابراہیم بادشاہ سے کہہ دیا کہ اب وہ ملا رموزی کے بتائے ہوئے اصول کی کوششوں کو ختم کردیں اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ یہی وہ دونوں مخلص بھائی ہیں جنھوں نے ہمارے اس سلسلہ کو کامیاب بنانے میں واقعی معنی کا خلوص صرف کیا یا پھر وہ محترم و مقتدر ہستیاں تھیں جن کا تفصیلی شکریہ ہم آگے ادا کریں گے۔

بس یہ وہ وقت ہے کہ ملا رموزی کو مناسبت کے اسباب ختم ہوچکے اور اب صرف والدہ محترمہ کی مرضی کے موافق کام کا آغاز ہوگیا۔ اب جس ماحول میں ملا رموزی داخل ہورہے تھے اس کے آثار یہ ہیں:

(1) حسب دستور لڑکی کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی گئی نہ دکھایا گیا نہ اس کی تربیت کا کوئی صحیح پتہ دیا گیا۔ بس یہ کہہ دیا گیا کہ لڑکی جاہل ہے۔

(2) جس ماحول میں اس کی تربیت ہوئی ہے وہ قدامت پسند ہے اور عہدِ حاضر کی تحریکات نے ان کی ذہنیت میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔

(3) لیکن خاندانی وقار نہایت مسلّم ہے اور والدہ صاحبہ مدظلہا کی رضامندی کے لیے یہی ایک ''جوہرِ اعلیٰ'' کافی تھا۔ اس لیے آغاز کار کے طریقے پر ''گفت و شنید'' اس طرح شروع ہوئی کہ حضرت محترمہ والدہ صاحبہ مدظلہا مٹھائی کے خوان کے ساتھ تشریف لے گئیں اور اب آمدورفت کے تانگے اور ڈولیاں دوڑنے لگیں، جن کا سلسلہ کوئی دو ماہ مسلسل جاری رہا۔ حالانکہ منظوری پہلے ہی دن بلکہ لڑکی والوں ہی کی جانب سے ہوچکی تھی۔ قریب تھا کہ اس منظوری کو کوئی تقریبی استحکام

حاصل ہو کہ ذہنی ذلت، جہالت اور خاندانی رذالت کے تاریک اثرات سے اس سلسلہ کی مخالفت میں بعض حضرات نے جو حصہ لیا وہ ایسے مواقع پر دوسرے مسلمانوں کی عبرت کے لیے بتاتے ہیں۔مثلاً سب سے پہلے جو بزرگ اس دینی تعلق کی مخالفت میں کھڑے ہوئے ان کا حلیہ یہ ہے گول مول جسم جیسے فٹ بال میں تازہ ہوا بھر دی گئی ہو۔سر پر 308 قبل مسیح کا عمامہ، بغیر کوٹ یا شیروانی کے چوبیس گھنٹے فقط ایک کرتا کبھی کبھی کرتے پر ایک ''نیا آستین'' یا صدری، بغل میں کچھ کاغذات، ہاتھ میں ایک بید اور دوسری بغل میں ایک ہاتھ کا رومال، منہ کے اندر کوئی ایک چھٹانک چھالیہ اور ہونٹوں سے باہر تھوک کی نالی جاری۔

آپ کی معاشرتی قابلیت تو اس لباس سے عیاں ہے، اس کے بعد ذہنی اور دماغی قابلیت کے لیے آپ صرف یہ معلوم فرمالیجیے کہ چھ بجے صبح سے بارہ بجے دن تک اور پانچ بجے شام سے سات بجے شام تک آپ خاک روبوں میں نشست فرماتے ہیں۔پس ایسے حالات کے انسان کی شرعی معلومات اور دنیوی علوم اور ترقیوں سے متعلق جو واقفیت ہوسکتی ہے وہ ظاہر ہے اور ایسا جاہل اور تیرہ دماغ انسان جب کسی مسئلہ میں مخالف ہو تو اس کی مخالفت کے طریقے جہالت بے تکے پن کے دلائل اور حماقت کے اور کیا ہوسکتے ہیں؟

آپ کے ساتھ چند دوسے مسلمان بھی شریک ہوئے اور خدا کی شان کہ ذہنی ناقابلیت، علمی بے خبری اور شرعی نااہلیت میں ان میں کا ہر فرد بے مثل تھا۔دن اور رات کے طویل وقت میں پندرہ بیس روپیہ کی ملازمت کر کے باقی تمام وقت جمائیاں لے کر اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے سوا ان کے پاس کوئی اور کام تھا نہ ان کے بزرگوں نے کبھی کیا۔

دماغی پستی اس قدر کہ اگر کوئی پچاس روپیہ کا افسر سامنے آجائے تو ہاتھ پاؤں کی روح نکل جائے۔صرف محلے کے جاہلوں اور عورتوں میں رعب ڈالنے پر حادی، اولاد کا یہ حال کہ دن رات آوارگی، قمار بازی، چوری اور بداخلاقی میں مصروف، مگر اس ادبار و ذلت اور بربادی و خواری پر فخر یہ کہ ہم ''خالص پٹھان ہیں''۔

ہر ایسے شخص کے پیچھے صبح سے شام کردیں جو کسی خاندان میں شادی کی تحریک کرے۔لڑکے کی برائیاں لڑکی والوں سے کریں اور لڑکی کی خرابیاں لڑکے والوں سے جا کہیں، تب کہیں جاکر روٹی ہضم ہو اور نتیجہ یہ نکلے کہ ہر خاندان کی شادیاں بھی ہو جائیں اور نکاح اور منگنی بھی، مگر اپنی

آبائی جہالت کے ہاتھوں پھر بھی نہ شرمسار نہ رنجیدہ۔ ایسے اوباش اور سفلے تقریباً ہر شہر اور ہر قصبہ میں موجود رہتے ہیں۔ اور اگر فریقین میں جہالت اور قدامت پسندی کافی ہے تو ایسوں کی کوششوں کا نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ شادی ایسی شرعی رسم اور دینی سلسلہ رک جاتا ہے، مگر ملا رموزی کے یہاں خدائے حکیم و رحیم کی دی ہوئی علمی اور ذہنی دولت کافی تھی اس لیے ایسے مقہور اور کمینوں کی تمام دراندازیاں خاک میں مل گئیں اور سسرال کے جن تاریک خیال اور فرسودہ دماغ ارکان کو انھوں نے بڑی محنت سے اپنا ساتھی اور ہم خیال بنالیا تھا، انھیں بھی ملا رموزی کی اُس ضرب کو کھانا ہی پڑا جو خدا کی تائید کے سہارے ان پر لگائی گئی تھی اور آج ان میں سے ایک کے پاس بھی بجز شرم، ذلت، ندامت، رسوائی، خواری اور حسرت کے اور کچھ باقی نہیں۔

ایسے خدائی قہر کے مارے ہوئے لوگوں کی مخالفت کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ لڑکے یا لڑکی کے خاندانی حالات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش فرماتے ہیں، پھر اس کے اخلاق کو اور پھر اس کی ملازمت یا مالی ذرائع کو غلط اور گندہ ثابت فرماتے ہیں، مگر رونا چاہیے ان بدنصیب افراد کو، جو ان جاہلوں کے کہے پر عمل فرماتے ہیں اور اپنی اولاد کی زندگی کو تلخ کر دیتے ہیں۔

بارے ان تمام گندہ اور لائقِ لعنت مخالفتوں سے ہم بھی گزرے اور بالآخر طے پایا کہ ملا رموزی صاحب ہر حال میں منظور ہیں، اس لیے تکمیل کار کے لیے اب شروع ہونے دیجیے سلسلۂ جاہلانہ رسوم اور ان تقاریب کا جن کا اصولی تذکرہ ہم نے اوپر کیا ہے اور جو سبب بنی ہوئی ہیں مسلمانوں کی ذہنی اور مالی تباہیوں کا، مگر جب تک ہندستانی مسلمانوں میں یہ ''پرانے خیال کے بزرگ'' موجود ہیں اس وقت تک اگر سارے علی گڑھ والے ''جاں بحق تسلیم'' بھی ہو جائیں تب بھی ان رسوم کو نہیں مٹا سکتے۔ لہٰذا باوصف ہماری شدید مخالفت کے طے پا گیا کہ ''منگنی'' کی رسم ادا کر دی جائے۔

اس موقع پر ہم حیران تھے کہ ''منگنی'' کی رسم ادا ہو رہی ہے، مگر لڑکی کے متعلق ہمارے خاندان میں سے ایک کو بھی یہ علم نہیں کہ اس کی عمر کتنی ہے اور حلیہ کیسا؟ مگر یہاں سب کچھ طے ہو گیا تھا محض لڑکی والوں کے زبانی بیانات پر اور یہی وہ لعنت خیز اور ہلاک کر دینے والا طریقہ ہے جو 95 فیصدی خاندانوں کی تباہی کا باعث بنا ہوا ہے اور اس حماقت کا جواب صرف یہ ہے کہ ''ہمارے خاندان میں لڑکی کو دکھانے کا قاعدہ نہیں'' مگر ایسے بے عقلوں کو کیا خبر کہ اس طرح لڑکی بیاہنا خود

اس لڑکی کی قبل از وقت موت کا سامان کرنا ہے، مگر کرتے کیا کہ ''بزرگوں کی مرضی ہی یہ تھی'' اور ہمیں بھی فخر تھا اپنے بزرگوں کی رضامندی کا اس لیے منگنی شروع ہوگئی یعنی ہماری مالی اور اخلاقی زندگی کی تباہی کا آغاز۔ صرف اتنا پتہ ضرور مل گیا کہ لڑکی جاہل ہے تو ملا رموزی کے لیے یہ ایسی کون سی تکلیف دہ خبر تھے جس سے ملا رموزی پریشان ہو جاتے۔ کیونکہ ملا رموزی خود اس عمر میں جاہل تھے یہ تو اب کچھ دن سے ذرا لکھے پڑھے مشہور ہو گئے ہیں اس لیے ان یک نظر میں کسی ایسی عورت سے شادی کر لینا کہاں کی مصیبت ہو سکتی تھی جو جاہل محض ہو اور یہ اس لیے کہ خود ملا رموزی کیا کم لکھے پڑھے ہیں اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے سے صرف خواب غفلت کے گھنٹے وضع کر کے دیکھ لیجیے کہ ملا رموزی کتابوں، اخباروں، رسالوں اور مضامین کے اندر ہی بیٹھے یا لیٹے مل جائیں گے تو پھر ایسے خالص علمی زندگی کے انسان کو اگر نری جاہل اور کودن بیوی مل جائے تو وہ ملا رموزی کو تکلیف ہی کیا پہنچا سکتی ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اس جہالت کے عذاب میں مبتلا ہندستان میں جاہل بیوی کے لیے ذیل کی تعریف کرنے والے لوگ ابھی موجود ہیں۔ مثلاً:

(1) جاہل بیوی اس لیے اچھی ہوتی ہے کہ اسے شوہر جس طریقے پر چاہے تربیت دے سکتا ہے۔

(2) جاہل بیوی شوہر کی فرماں بردار ہوتی ہے۔

(3) جاہل بیوی شوہر سے ہر وقت مرعوب رہتی ہے۔

(4) جاہل بیوی فسادات کا باعث نہیں بنتی۔

پھر ان تعریفات پر اگر بیوی بھونڈی، بدصورت اور بدرنگ بھی ہو تو کیسے رہیں گے نا ملا رموزی صاحب عمر بھر خوش اور بے فکر؟ الغرض طے پا گیا کہ فلاں تاریخ کو ملا رموزی صاحب کی منگنی ہو کر رہے گی اس لیے ہمارے تمام خاندان کو اس مسرت نے بے خود سا بنا دیا تھا کہ ''منگنی ہو تو رہی ہے'' خواہ کیسی ہی ہو اور یہی خوشی ہمیں تھی اور کیا غلط تھی؟

◆◆◆

منگنی

منگنی کی تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے ہی خالہ بی مہمان ہو کر تشریف لے آئیں۔ ان کے پانچ بچے ہیں جو خدا کا انعام سمجھے جاتے ہیں۔ ایک دن بیچ میں چھوڑ کر ملا رموزی کی تین بھاوجیں مہمان آئیں، الحمدللہ کہ ان کا ایک بچہ بھی نہیں جو خدا کی لعنت سمجھا جاتا ہے۔ اسی دن شام کو دوسری خالہ بھی مہمان آگئیں، ان کے تین بچے ہیں۔ صبح سے محلے کی ایک بی بی تشریف لائیں جن کے دو بچے چھوٹے اور تین ان سے ذرا بڑے ہیں اور مختصر یہ کہ جس دن یہ تقریب ہونے والی تھی، اس دن صرف بچوں سے ایک دالان بھرا ہوا تھا گویا یہ بڑا دالان خدا کی رحمت اور انعام سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت گھر کا تمام نظام یوں برہم تھا گویا کابل پر نادر خان کے لشکر گولہ باری کر رہا ہے یا لندن پر جرمنی کے ہوائی جہاز بم برسا رہے ہیں یا علی گڑھ کا کوئی یتیم خانہ آباد ہو چکا ہے یا کسی پلیٹ فارم پر کوئی ریل گاڑی آکر ابھی کھڑی ہوئی ہے یا لاہور میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔

شام کے کوئی چار بجے سے مردانہ مکان میں بڑی تکلف کا فرش بچھایا گیا۔ بینڈ باجے والے بھی آگئے اور بزرگوں کے ملنے والوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ملنے بھی تشریف لانے لگے۔ تھوڑی دیر میں مٹھائی کے خوان اندر سے لائے گئے۔ پھر ہار، پان، عطر اور سگریٹ لائے گئے۔ ہم سے کہا گیا کہ اگرچہ اس تقریب میں تمھارے جانے کی رسم نہیں پھر بھی تم کوئی ''فاخرہ سا لباس'' پہن لو، اس لیے ہم نے بھی ''فاخرہ یہ شیروانی'' فاخرہ سا پاجامہ، فاخرہ سے موزے، فاخرہ سی قمیص اور فاخرہ سی ٹوپی پہن لی۔ جو آتا تھا ''مبارک ہو'' کہتا تھا۔

بینڈ کی پہلی ہی آواز پر کوئی ڈھائی سو لونڈے جمع ہو گئے اور بڑے غور اور توجہ سے باجا سننے میں محو ہو گئے، مگر اسی محویت کے عالم میں کبھی کبھی ایک دوسرے کے چانٹا بھی رسید کر دیا جاتا تھا تو ایک کو دوسرے لونڈے سے جھوم جانے، دے مارنے، کاٹ لینے، نوچ لینے اور چڑھ جانے کی ضرورت ہو ہی جاتی تھی کہ اسی موقع پر ہماری خالہ بی نے بھی اپنے چھوٹے بچے کو اس سے ذرا بڑے بچہ کی گود میں لاد کر باجا والوں کے پاس بھیج دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں خالہ بی کے اس لائے ہوئے بچہ کے پاؤں میں کسی دوسرے بچہ نے چٹکی لی کہ قیامت آ گئی۔ کوئی ایک کم بارہ لونڈے تو ہو گئے طرفدار ہماری خالہ بی کے بچہ کے اور کوئی سوا سو بچے ہو گئے طرفدار محلے کے اس لونڈے کے جس نے خالہ بی کے بچے کے چٹکی لی تھی۔ وہ باجا تو رہا بجتا ہوا اور ایک طرف جوان قانون سے آزاد لونڈوں کا دنگل شروع ہوا ہے تو بس پوری رفتار سے وہ ایک دوسرے کے لیے ایک دوسرے کو جھپٹ کر وہ کاٹا، وہ مارا، وہ نوچا، وہ دے مارا، وہ جھوما، وہ رویا، وہ چلایا، وہ بھاگا، وہ گالی دی، وہ پتھر مارا، وہ گھر میں جا چھپا، وہ دروازہ کی اوٹ میں آ گیا، وہ پھر پتھر مارا، وہ چپتی رسید کی، وہ طمانچہ مارا نتیجہ یہ کہ تین چار بزرگ اس ہنگامے کو رفع کرنے جو گئے تو انھیں عدالتِ انصاف کا کام کرنا پڑا۔ کسی نے لڑائی کا ابتدائی سبب بیان کیا، کسی نے اپنی مظلومیت پر گواہ پیش کیے، کسی نے اپنا پھٹا ہوا کرتا دکھا کر فریاد کی، کوئی ان بزرگوں کی اوٹ میں آ چھپا اور کسی نے اس پناہ گزین کے پھر پتھر رسید کیا کہ دوسرے لونڈے نے چک کر اس پوشیدہ لونڈے کو جا لیا۔ کسی نے انصاف کرنے والوں کی غلطی پر انھی کو منہ چڑانا شروع کر دیا۔ کسی نے اپنے چھوٹے بھائی کو سنبھالتے ہوئے پھر کسی کو گھونسہ رسید کیا۔ کسی نے کرتے کے دامن سے آنسو صاف کرتے کرتے تین چار گالیاں دے دیں۔ انصاف کرنے والے بزرگوں نے بھی یہی کیا کہ کسی کے طمانچہ رسید کیا، کسی کو دھکا دیا، کسی کی ٹانگ پکڑ کر کسی سے چھڑایا، کسی کو ڈانٹا، کسی کو گالی دی، کسی کا منہ صاف کیا، کسی کو گود میں اٹھا لیا۔ موقع غنیمت پا کر باجا بجانے والے بھی اس ہنگامے میں خلافت کمیٹی کے والنٹیئر بن کر لگے ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنے، سمجھانے، مارنے، بھگانے اور ڈانٹنے کہ ایک صاحب نے باجے والوں کو اس لیے گادی دے دی کہ اس نے انھی کے بچہ کو مصلحتاً ایک چانٹا مار دیا تھا۔ اس پر باجے والے بدل گئے تو دوسرے بزرگوں نے باجے والوں کو گھیر لیا۔ باجے والوں کے انصاف

میں ایک بزرگ سے جو خطا ہوئی تو قریب تھا کہ تمام بزرگوں میں پھیل جاتی کہ عین اسی موقع پر ملا رموزی صاحب نے اپنی خداداد فصاحت اور خطابت سے کام لے کر اس ہنگامے کو دور کیا۔ مگر منگنی کی تقریب میں تمام شرکا اسی ہنگامے کے واقعات کو دُہراتے رہے اور اب بینڈ نے روانگی کا ''ترانہ بجایا'' اور تمام بزرگ بڑی شان سے ہماری سسرال روانہ ہوئے۔

راستہ کا حال تو معلوم نہیں اس لیے کہ ہم خود شریک نہیں تھے البتہ سسرال میں جو کچھ ہوا، اسے اپنے عزیز از جان دوست مولانا عبدالہادی انصاری کے حلفی بیان کے موافق بیان کرتے ہیں۔

سسرال کا ایک مکان بڑی شان سے آراستہ تھا۔ وسط میں ہماری طرف کے بزرگوں کے لیے ایک نمایاں جگہ بنائی گئی تھی۔ جا کر بیٹھے کہ اب سسرال کے لونڈوں نے جمع ہونا شروع کیا۔ کوئی ہماری طرف کے لونڈوں کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور بغیر اصولی تعارف کے باتیں شروع کر دیتا۔ کوئی بے سوال کیے اپنی شیروانی کے کپڑے کی قیمت بیان کرتا۔ کوئی منہ کھول کر دکھاتا کہ میں نے ایک ساتھ دو پان کھا لیے ہیں۔ کوئی پوری زبان باہر نکال کر بتاتا کہ میرے پان کی سرخی تمھارے پان سے زیادہ ہے۔ کوئی مع جوتے کے فرش پر آ بیٹھتا تو ڈانٹا جاتا۔ کوئی ہمارے بزرگوں کے عین منہ کے سامنے آ کر بیٹھ جاتا تو ہاتھ پکڑ کر نکال دیا جاتا۔ کوئی زنانہ دروازہ کو زیادہ کھول دیتا تو گالیاں سنتا۔ کوئی لڑکی کسی لڑکی کو گود میں لے کر راستہ میں کھڑی ہو جاتی تو اندر بھگا دی جاتی کہ عین اسی حالت میں ہماری طرف کے کسی بزرگ کو خیال آتا اور وہ اپنی جگہ سے چلا کر کہتے اماں یہ باجے والے کیا چلے گئے جو بجاتے نہیں؟ ہمارے دوستوں نے ہمارے سسرال کے ہر فرد کا ایک دوسرے سے رشتہ دریافت کیا ہوگا جسے ہادی صاحب نے اس لیے چھپا لیا ہوگا کہ وہ خود دوست تھے مگر دوستوں نے جو کچھ کیا ہوگا وہ یہ کہ ہمارے ہونے والے رشتہ داروں کے تمام حالات دریافت کیے ہوں گے۔ مکان کے ایک ایک گوشے پر نظر ڈال کر سسرال کی مالی حیثیت کا اندازہ کیا ہوگا۔ خسر صاحب کو ضرور دیکھا ہوگا اور رسالوں کو بہت زیادہ غور و فکر سے۔ اس کے بعد یہ سوال جرح ہادی صاحب نے سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بس پھر کیا ہوا کچھ بھی نہیں۔ وہ آپ کے پھوپھا سسر آئے اور آپ کے والد صاحب کے برابر بیٹھ گئے۔ پھر اندر سے شربت آیا

اور اپنی طرف کے ایک ایک فرد کو پلایا گیا۔ اِدھر اور اُدھر کے بزرگوں میں کچھ "یو پلا سا مذاق ہوا" پھر بزرگوں ہی بزرگوں میں کچھ باتیں ہوئیں یعنی تاریخ نکاح قرار پاگئی اور سسرال کی طرف سے ہمارے بزرگوں کو ہار پہنائے گئے اور بڑی شان کی تواضع سے ہماری طرف کے لوگ یوں واپس آئے کہ کوئی دروازہ ہی سے سب سے آگے روانہ ہوگیا۔ کوئی آدھے راستہ سے۔ کوئی بازار ہی میں رہ گیا۔ کوئی راہ گیر سے مصافحہ کے بہانے رہ گیا پھر بھی ایک خاصی تعداد ہمارے گھر تک آئی اور دوستوں نے مبارک باد کے ساتھ ہی تھوڑا سا ہمارا مذاق بھی اڑایا۔ یہ ہنگامہ ہوا عین مغرب کے بعد ختم کہ تیاریاں شروع ہوگئیں عورتوں کے جانے کی اور اب اسی شان سے عورتوں نے سسرال کا رُخ فرمایا، موٹروں پر موٹریں اور جو عورتوں کا سوار ہونا شروع ہوا ہے تو الاماں:

اے وہ میرا ابٹنا تو رہ گیا۔
دیکھو موٹر کے پاس آدمی تو نہیں ہیں؟
اتنی دور تو موٹر کھڑا کیا ہے۔
ارے میرا برقعہ تو ملتا نہیں۔
تو کیا چادر بھی ساتھ لے لوں۔
اور جو زیادہ رات ہوگئی؟
اچھا تو وہ پھول بھی پہنچا دیے؟
اوئی بیوی تم تو کسی کی بات ہی نہیں سنتیں
تو آخر آپا میں نے ایسی کون سی گالی دی تھی۔
وہ تو خالو میاں نے مجھے ذرا سامنے کھڑا دیکھا تھا تو وہ مجھ پر خفا ہو رہے تھے۔
ہاں ہاں تم نے پہلے کہا۔
اور جو نہ کہا ہو؟
یہ پھوپھی خدا لگتی کہیں گی۔
خیر میں ہی جھوٹی۔
اے لڑکی اندھی ہوگئی ہے، وہ سر پر موٹر کھڑا ہے۔

اور وہ دیکھو وہی ہوا۔

وہ خوان تو اب تک واپس آئے نہیں۔

تو ذرا ملا جی ہی سے کہو کہ میاں بیٹھے کیا ہو ذرا وہ "نوری" کو سائیکل پر دوڑا دو، تمھارے ماموں کے پاس۔

ارے ہے کیا کل کو تمھاری ہی ممانی جان شکایت کریں گے۔

اچھا میاں تو پھر ہمارے ساتھ یہ باجا جو جا رہا ہے یہ وہی بڑا اینڈ ہے نا؟

دیکھو میاں اور وہ پیش کار صاحب کی بیوی آنے والی ہیں تو انھیں تم کسی اور موٹر میں روانہ کر دینا۔

ارے بیٹے تم اپنا ملا پن تو رہنے دو، یہ باتیں ہم عورتوں کی ہیں۔

کون؟ وہ سپڑوں صاحب کی سواریاں؟

بھیا ان کی بڑی لڑکی تو ہمارے ساتھ جا رہی ہے، مگر ان کی بیوی نے یہ کہا تھا کہ:

لو خوب یاد آئی اور وہ مٹھائی کے خوان بھی گن لیے ہیں؟

تو آخر موٹر گھر ہی کا ہے، اسے جانا کہا ہے؟

لو آپا یہ دُلہن کا جوڑا تو ذرا دیکھ لو۔

اور اس کے ساتھ کا وہ ریشمی رومال یہی ہے؟

میں تو جانتی ہوں کہ آپا تم اسے اپنے پاس ہی رکھنا۔

معاملہ ہے عورتوں کا غرض جب مارے جھگڑوں اور ہنگاموں کے ہم لوگوں کو نزع کی حالت پر پہنچا دیا تب کہیں یہ عورت ذاتیں منگنی کی رسوم ادا کرنے تشریف لے گئیں۔ اس پر بھی یہ عورتیں باہم سب خوش نہ تھیں ایک دوسری سے ضرور کوئی نہ کوئی شکایت لیے ہوئی تھیں۔

سسرال پہنچ کر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہزاروں طعنے، ہزاروں فقرے اور ہزاروں آوازے تو کسے ہوں گے ہماری طرف کی عورتوں نے اور لاکھوں طعنے، لاکھوں فقرے اور لاکھوں آوازے کسے ہوں گے ہماری سسرال کی عورتوں نے، اس لیے کہ ابھی ہندستانی مسلمان عورتوں میں تعلیم پاس سے بھی نہیں گزری ہے۔

افسوس کہ عورتوں نے رسوم ادا کرتے وقت ہمیں بحیثیت نامہ نگار داخلہ کی اجازت نہ دی اس لیے رسم کے تفصیلی حالات لکھنے سے مجبور ہیں۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کہ ہماری طرف سے مٹھائی کے جو خوان گئے تھے انھیں ہماری طرف کی عورتوں نے سسرال کی عورتوں کو بڑے غرور سے پیش کیا۔ سسرال کی ایک کرتا دھرتا بی بی نے ان خوانوں کو ذرا حقارت کی نظر سے دیکھا، مگر ہماری طرف کی ایک بی بی نے جب خوان پوش اٹھا کر زرق برق معاملہ دکھایا تو بے چاری منہ سا لے کر رہ گئیں اور آج تک دل میں قائل ہیں۔

◆◆◆

نکاح

منگنی کی باقاعدہ رسم ادا ہوگئی جس کا مقصد یہ تھا کہ اب نکاح ہونا از بس یقینی ہو چکا، لیکن ہمارے مخالفین کی جہالت کا مور ابھی کم نہ ہوا اور یہ بے چارے مارے جہالت کے سمجھے کہ اس تقریب سے بھی کچھ نہیں ہوسکتا، لہٰذا کوشش جاری رکھنا ہی کامیابی کی دلیل ہے، مگر ان غریبوں کو کیا خبر تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ملا رموزی صاحب کا قلم ان کی حجامت بنا کر ہزاروں انسانوں کے سامنے رکھ دیں گے۔ لہٰذا پھر مخالفت شروع ہوئی۔ اس مرتبہ اتنا زور بڑھ گیا کہ اس سلسلہ میں چند سسرالی عزیز بھی شریک ہوگئے اور اب ثابت کرنا شروع کیا گیا کہ:

(1) ملا رموزی کا خاندان صحیح نہیں۔

(2) ملا رموزی مفلس اور فاقہ کش انسان ہے۔

(۳) ملا رموزی خود لکھا پڑھا آدمی نہیں بلکہ ایک اور صاحب پردہ میں رہ کر اسے مضامین اور کتابیں لکھ کر دیتے ہیں اور وہ اپنے نام سے چھپواتا ہے۔

(4) ملا رموزی شراب پیتا ہے اور خود ہم نے دیکھا کہ وہ شراب پی رہا تھا۔

ان الزامات کے ثبوت میں ایک ''خاک روب'' مزاج مخالف نے اپنی جاہل بیوی اور جاہل سالے کی شہادت بھی پیش کی۔

ادھر ہماری طرف کے دوست نما حاسدوں نے ہم سے کہنا شروع کیا کہ:

(1) جس گھرانے میں آپ شادی کرنے چلے ہیں، ان کا نسب صحیح نہیں ہے۔

(2) اور قرآن کی قسم لڑکی تو نری جاہل ہے۔ آپ ہیں ذی علم اور رات دن لکھنے پڑھنے کا مشغلہ رہتا ہے، آپ کے لیے ایسی جاہل عورت کہاں تک رفیق زندگی ہوسکتی ہے۔

(3) اور صورت سیرت کی بھی ایسی بھونڈی اور بدقوارہ ہے کہ آپ کے لیے نظری مصیبت بن کر رہ جائے گی۔ آیئے ہم فلاں بنت فلاں سے آج ہی آپ کا نکاح پڑھائے دیتے ہیں۔ پھر کیوں اس گھرانے میں اپنا وقت اور روپیہ برباد کرتے ہو؟

مگر سب بے خبر تھے کہ نکاح اُسی جگہ ہوا کرتا ہے جہاں مخالفت پورے زور سے کی جائے۔ لہٰذا طے پا گیا کہ 7 جون 1929 کو نکاح کی رسم ادا کردی جائے، اس لیے سب سے بڑا مسئلہ ''مہر'' کا تھا اور اب تحریک ہوئی کہ مہر کا معاملہ طے کیا جائے۔ پس واضح ہو کہ شریعت اسلامیہ نے ہر فرض کا ادا کرنا اس شرط کے ساتھ ضروری قرار دیا ہے کہ فرض ادا کرنے والے میں اس فرض کے ادا کرنے کی مقدرت ہو ورنہ وہ قابلِ عفو و درگزر ہے، مگر سسرال کی طرف سے کہا گیا کہ مہر کی مقدار گیارہ ہزار گیارہ سو گیارہ روپیہ ہوگی، مگر ہماری طرف کے جاہل لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ گیارہ، گیارہ کے اتنے قافیے کیوں جمع کیے گئے ہیں، اس لیے سوال کا جواب سسرال کے عالموں کی طرف سے یہ ملا کہ ہمارے خاندان میں ہر ایک کی مہر کی مقدار انھی قافیوں کے ساتھ رکھی گئی ہے۔ یعنی ہم میں کا ہر ایک شخص مہر کے معاملہ میں بہت بڑا قابل اور عالم شاعر واقع ہوا ہے، اسی لیے اس نے اپنے مہر میں لفظ ''گیارہ'' کے تلازمہ کو ٹوٹنے نہ دیا، مگر افسوس کہ ہماری طرف کے رشتہ داروں نے اپنی جہالت سے اتنا کام لیا کہ مہر کی مقدار کو بصد مشکل سات ہزار روپیہ نقد قرار دے دیا اور اس پر سسرال راضی ہوگیا۔ اب کوئی دریافت کرے مسلمانوں سے کہ اتنی مقدار ملا رموزی اور ہر مسلمان بہ خلوص قلب اپنی بیوی کو ادا بھی کرسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی تعلیم یافتہ عورتوں نے جنوری 1930 میں شہر لاہور میں ایک بڑے جلسے کے اندر اعلان کیا کہ شادی میں مہر کی مقدار کو اڑا دیا جائے اور اس رقم کی تعداد کو شوہر کی مقدرت کے موافق کردیا جائے۔

بارے ہمارے مہر کی مقدار مبلغ سات ہزار روپیہ قرار پا گئی جس کے طے کرنے میں دس بارہ دن صرف ہوئے اور اب کامل یقین ہوگیا کہ نکاح ہوکر رہے گا۔ اس لیے تاریخ نکاح سے ایک ماہ قبل ہی سے مہمانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کبھی خالہ آگئیں تو کبھی چچی، کبھی ممانی تو کبھی

بھاوج۔ یہی حال ہمارے گھر کے نظام کا تھا۔ ہر وقت شادی کے کپڑے پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ جب دیکھیے شادی کے آنے والے حالات پر جھگڑا ہو رہا ہے، اختلاف ہو رہا ہے اور بحث و مباحثہ کی محفلیں گرم رہتی تھیں، مگر ملا رموزی صاحب جس ایک خدمت پر مقرر کر دیے گئے تھے وہ ہر ذی علم اور ہوشمند انسان کے لیے لعنت اور قہرِ خداوندی سے کم نہیں۔ یعنی جس طرح ہو اور جہاں سے ہو اس شادی کے لیے ''ہزاروں روپیہ لاؤ'' اس لیے ملا رموزی صاحب کی شادی ہے، کسی ایسے ویسے آدمی کی شادی تو ہے نہیں جو سو دو سو روپے میں کر دی جائے۔ پس نہ پوچھیے اس عالم اسباب میں ہماری اس وقت کی کوششوں کی روح کو ہلاک کر دینے والی تگ و دو؟ بس انتہائی سرگری کا یہ عالم تھا کہ خواب میں بھی، ہمیں یہی نظر آتا تھا کہ روپیہ حاصل کرنے میں مصروف ہیں، مگر گھر کی عورتیں کہہ رہی ہیں کہ ابھی کم ہے۔

یاد رکھیے کہ اس دوڑ دھوپ اور انتہائی بدحواسی کے عالم میں چونکہ ہم تھے تنہا اس لیے مبلغ دو ایسے دوستوں سے ہم نے درخواست کی کہ وہ گاہ گاہ ہمارا ہاتھ بٹائیں جو ہر آن و ہر لحظہ ہمارے ساتھ رہتے تھے اور جس میں سے ایک کو اپنے متعلق لیڈر اور مصلح اعظم ہونے کا دعویٰ ہے اور دوسرے کو نہایت بلند خیال شاعر ہونے کا۔ اس لیے لیڈر دوست نے یوں امداد کی کہ ایک مرتبہ بھی گھر پر آ کر دریافت نہ فرمایا کہ کس قسم کی ضرورت ہے اور بتاؤ کیا کام کریں؟۔ شاعر دوست نے یوں امداد کی کہ جب ہم خود ہی ان کے دولت خانہ پر حاضر ہوئے تو وہ انگڑائی لے کر ہمارے ساتھ ہو گئے اور ساری شادی میں فقط یہ امداد فرمائی کہ عورتوں کے جانے کے لیے ایک مرتبہ موٹر خانہ سے جا کر ہماری موٹر کو ہمارے گھر پر روانہ کرتے ہوئے اپنے دفتر چلے گئے۔

الغرض اب سب سے پہلا کام یہ تھا کہ نکاح کی تقریب کا اذن دیا جائے اس لیے کہ شرکا کے ناموں کی خدا جانے کہ ہزار فہرستیں تیار ہوئیں اور چاک کر دی گئیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ملا رموزی جس طرح ہندستان کے ہر شہر اور قصبے میں مشہور اور پہچانے جاتے ہیں اسی طرح اپنے قبیلے میں تو ''سردار صاحب'' ہی مشہور ہیں، گویا اس حساب سے ہماری شادی میں انھیں بھی شریک کرنا تھا جنھیں عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ کسی بازار میں سلام کر لیا تھا۔ صرف محترم عورتوں کا معیار یہ تھا کہ جس شخص کی تقریب میں وہ خود شریک ہوئی ہیں صرف اسی کو بلایا جائے۔ ملا رموزی

صاحب کے دو چھوٹے بھائی بھی ہیں اور قبیلے میں یہ بھی اپنے اپنے وقت کے ''رستمِ دوران'' اور ''حاتم طائی'' مشہور ہیں اور حلقۂ رسم و ملاقات اس درجہ وسیع کہ محکمۂ مردم شماری بھی ان کی تعداد معلوم کرنے سے قاصر، اس لیے ہر شخص کی فہرستیں اتنی کہ الاماں! مگر جہالت کی پابندیوں سے مجبور اس لیے طے پا گیا کہ بس اذن شروع ہو جائے۔

معلوم کیجیے کہ ہمارے ہاں اذن کے جو طریقے رائج ہیں وہ یہ ہیں:

1۔ کوئی ایک دوست یا محلے کا آدمی فی سبیل اللہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس شرکاء کے ناموں کی فہرست ہوتی ہے اور وہ ہر گھر کے دروازے میں منہ ڈال کر بہ آواز بلند کہتا ہے آج ملا رموزی صاحب کا چار بجے موتی مسجد میں نکاح ہوگا۔ آپ کو اور آپ کے دونوں بچوں کو اور ماموں صاحب کو اور چچا میاں کو بھی اذن ہے۔

2۔ زیادہ قریب کے دوستوں اور بے تکلف احباب سے یوں کہتے ہیں کہ:

''دیکھیے بھول نہ جایئے گا۔ کیونکہ بھائی بس یہی ایک موقع ہے۔ پھر آپ ہی شریک نہ ہوئے تو کیا کرایہ پر لوگوں کو بلائیں گے؟ اور دیکھیے چھوٹے بھائی کو ضرور ضرور لایئے گا واللہ مجھ سے ملا صاحب نے تمھارے بھائی کا نام لے کر کہہ دیا تھا اور ویسے بھی ملا صاحب کا اور آپ کا معاملہ ایک ہی ہے، پھر تکلف کیسا؟''

3۔ ایک پیشہ ور اذن دینے والے کو نقد معاوضہ دے کر اذن والوں کے ناموں کی فہرست دے دیتے ہیں اور وہ ہر گھر پر جا کر وہی کچھ پکارتا ہے جو اوپر پکارا گیا۔

4۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک کاغذ کی پیشانی پر اذن کی تفصیل اور وقت و مقام لکھ دیا اور نیچے تمام شرکاء کے نام لکھ دیے اور کسی آدمی کے حوالہ کر دیا۔ وہ ہر گھر پر گیا اور پڑھنے والے نے اپنا نام پڑھ کر اسی پر پنسل سے ایک چھوٹا سا (ص) بنا دیا۔ بعض زیادہ لکھے پڑھے یا قابل ہوئے تو انھوں نے اپنے نام پر لکھ دیا ''بسر و چشم'' یعنی بڑی خوشی سے حاضر ہوں گا۔ اذن کے ایسے طریقے غرباء میں رائج ہیں، لیکن اگر آپ کی تنخواہ مبلغ پچاس روپیہ بھی ہے تو آپ کو اذن یوں دینا ہوگا کہ اپنی حیثیت کے موافق بازار سے رنگین کارڈ خرید کر اس کی پیشانی پر ذیل کی عبارتوں میں سے کوئی نہ کوئی عبارت چھپوا کر تقسیم کریں گے۔ مثلاً پیشانی پر یہ اشعار

ہوں گے کہ:

گر قدم رنجہ کنی جانبِ کاشانہ ما
رشکِ گلزار شود از قدمت خانہ ما

آنے جانے میں ہے تھوڑی سی اذیت تو مگر
آپ کے آنے سے ہو جائے گی عزت میری

ان اشعار کے بعد اس قسم کی عبارت ضرور ہوتی کہ:

''الحمد للہ بتاریخ فلاں، بوقت فلاں اور بمقام فلاں نورچشمی فلاں، طولعمرہٗ یا سلمہٗ یا طولعمرہا یا سلمہا کی تقریب سعید ہے۔ امید ہے کہ جناب والا اپنے الطافِ قدیمانہ و رواسم دیرینہ کی بنا پر شرکت فرما کر مجھے معزز و مفتخر فرمائیں گے۔

المکلف فلاں، متصل فلاں، عقب فلاں اور محلّہ فلاں''

مصیبت یہ ہے کہ جماعت کی ذہنیت ہے جاہل اور کوری اس لیے اگر اس قسم کے کارڈ اور لفافے اذن کے لیے تقسیم نہ کیجیے تو آپ اور آپ کا سارا خاندان کمینہ، جاہل، مفلس اور قلاش مانا جاتا ہے اس لیے ملا رموزی صاحب کو بھی لال رنگ کے کارڈ چھپوانا پڑا۔ صرف گھر کے مضمون نگار ہونے کی وجہ سے اپنے ہاں کے کارڈوں پر فقط یہ عبارت چھپوا دی:

بسم اللہ

حضرتِ محترم!

7 جون 1929 کو برخوردار ملا رموزی کی تقریب نکاح موتی مسجد میں ہوگی۔ ازراہِ کرم پانچ بجے شام شرکت فرما کر ممنون فرمائیے۔

المکلف شاہ سید محمد صالح''۔

باوصف اس حد سے سوا سادہ اور عام فہم عبارت کے مارے ہاں کے ''مطبع علویہ'' کے کاتب نے ہمیں کہیں کا لالہ خوشحال چند سمجھ کر ہمارے لکھے ہوئے لفظ ''بسم اللہ'' کی جگہ ''786'' لکھ دیا اور کارڈوں پر جب "786" چھپ کر آیا تو ہمارے تاؤ اور غصہ کی حد نہ رہی، مگر کرتے کیا؟ اس لیے بڑی بے دلی کے ساتھ ہم نے ان کارڈوں کو تقسیم کرا دیا۔ الحمد للہ کہ کارڈوں کے معاملہ

میں کوئی شکایت وصول نہ ہوئی ورنہ اس پر بھی لڑائی ہوتی ہے۔

اس "کارڈی ہنگامہ" کے بعد یہی کارڈ ہندستان کے بعض ممتاز ترین لیڈروں، ادیبوں، شاعروں، اخبار نویسوں، رسالہ نویسوں اور پروفیسروں کو بھی بھیجا گیا کہ اصل میں یہی وہ طبقے ہیں جو ہماری قدر افزائی اور واقعی محبت میں ہمارے قبیلے میں سب بہت آگے ہیں اور انھی کارڈوں کا اثر تھا جو ہماری شادی پر اخباری اور ادبی دنیا میں ایک دھوم مچ گئی، جس کی تفصیل حاسدوں کو جلانے اور مخلصین کو خوش کرنے کے لیے ہم آئندہ نقل کریں گے۔

اس کام کے بعد اب نکاح کی تقریب سر پر آ پہنچی تو نہ پوچھیے ہماری اور ہمارے خاندان کے ایک ایک رکن کی بدحواسی، پریشانی اور مالیخولیا کی شدت کا عالم دوست تو صرف یہ کہتے تھے کہ بھائی مبارک ہو اور ہمیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ بھی کسی رسم کے لیے ہم سے روپیہ مانگ رہے ہیں۔ ہر لمحہ دماغ پر اس قسم کا "مذاکرہ نکاحیہ" سوار تھا کہ:

اور جو عین وقت پر اتنی مٹھائی کافی نہ ہوئی تو؟

خدا جانے کوتوال صاحب کو بھی اذن پہنچا یا نہیں؟ کیونکہ ان لوگوں سے بے مروّتی اچھی نہیں آخر یہ ہیں پھر پولیس کے لوگ، خدا جانے کس وقت ان سے کیا معاملہ اٹک جائے؟

لاحول دلا وہ لیجیے وہ جج صاحب کو تو کارڈ بھیج دیا اور ان کے دونوں صاحبزادوں کے کارڈ دھرے رہ گئے۔

اماں کون چھوٹے میاں؟ ذرا بھئی دوڑنا تو سائیکل پر اور یہ لو، یہ دونوں کارڈ جج صاحب کو دینا اور میری طرف سے دست بستہ کہنا بس جناب سہو ہو گیا، شادی کا گھر ہے بے حد مصروفیت میں ہوں ورنہ خود حاضر ہوتا۔

کیا کہا؟ خوان اماں وہ کیا دھرے ہیں سامنے والے کمرہ میں، مگر تم غور سے دیکھو جب!

تمھیں کیا بحث تم تو بس چار روپے کے لے آنا، دیکھتے نہیں ہو کہ روپیہ ہے کہ پانی کی طرح خرچ ہو رہا ہے اور جب تم ہی خیال نہ کرو گے تو کیا غیر لوگ آ کر تمھارے بندوبست کریں گے؟ خیر بھئی تمھارا احسان ہو گا اور سنو تو! تم میری طرف سے کہنا کہ بھئی اس وقت تو آپ میرا یہ کام کر دیجیے میں عمر بھر احسان نہ بھولوں گا۔

استغفر اللہ یہ دیکھیے یہ بڑے کمرے کے قالین یہاں بچھا دیے اب تم لاؤ گے بڑے کمرے کا فرش؟ بس جدھر نظر نہیں کرتا ہوں اُدھر کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے۔

کیا پوچھتے ہیں آپ! حضرت سلامت بس جو کچھ کر رہا ہوں اکیلا کر رہا ہوں۔ دوست احباب تو گئے چولھے میں، یہاں کے دوستوں کی حالت آپ کو معلوم تو ہے، پھر ان کا ذکر ہی کیا؟ بھائی صاحب بس حد یہ ہے کہ یہ دس پانچ رئیس میری قدر کیوں کرتے ہیں اور میں سارے ہندستان کی آنکھ کا تارا کیوں بن گیا، انھی کی طرح غنڈہ کیوں نہ بنا رہا۔ خیر اس فضول بحث کو تو جانے دیجیے آپ تو ذرا جا کر وہ ہار والے کو یہ پچیس روپے دے آیئے اور کہنا کہ بھئی ہاں ہاں تقسیم کے وقت ماموں سیاں آپ ساتھ رہیے گا، چھوٹے میاں کو اس کا تجربہ نہیں۔

تو بھئی میں آخر کس کس کام میں رہوں گا وہ مٹھائی بھی میرے ذمہ ہے، اب ہار بھی میرے ذمہ لگاتے ہو۔

تو آخر اور کسے لاؤں؟

لاحول ولا پھر آپ نے دوستوں کا نام لیا۔

اے صاحب آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج تک کسی ایک نے بھی ان معاملات میں کوئی حصہ لیا۔ وہ تو اور برائیاں کرتے پھرتے ہیں۔ بس سبب یہی ہے کہ جہالت کے مارے ہوئے دماغ ہیں۔ گلستاں بوستاں سے آگے یہ بھی خبر نہیں کہ سکندر نامہ اور انوار سہیلی بھی کوئی کتاب ہے یا ریل گاڑی کا نام سکندر نامہ ہے؟ بمبئی شہر کو کبھی دیکھا نہیں کہ انسانی تمدن کے فرق اور ترقی کا کوئی اندازہ ہوتا، صحبت ہے دفتری لوگوں کی جن کے دماغ میں سوائے آفس، کاپی، مہتمم صاحب، سپرنٹنڈنٹ صاحب اور ہیڈ کلرک کے کسی بین الاقوامی انقلاب کی خبر نہیں اور یہی ناواقفیت اور تیرہ دماغی تو حسد کا باعث بنی ہوئی ہے۔ خیر لاحولہ ولا پھر آپ نے وقت ضائع کیا۔ اماں عورتیں تو جائیں بھاڑ میں ہمیں تو فکر ہے مردوں کی، تم ہو کہ عورتوں ہی کو لیے پھرتے ہو۔

کیا کہا؟ ہاں ذرا پھر کہنا۔ ٹھہر نا ٹھہر نا لاحول ولا دیکھیے ابھی ابھی کہنے کو تھا کہ بھول گیا۔ آخر کیا کیا جائے ایک دماغ ہے اور دس کام اچھا خیر تو اسے جانے دیجیے اب جب یاد آئے گی تو بتا دوں گا اور سنیے تو ماموں میاں۔ اچھا اچھا جایئے پر سن لیجیے گا۔ سچ ہے آپ کو ابھی ابھی دس چکر

لگانا ہے۔

ان بدحواسیوں میں دن تھا کہ گزر گیا اور وہ لیجیے وہ نکاح میں شرکت کے لیے لوگوں کا آنا شروع ہو گیا۔

تشریف لائیے۔

مزاج عالی

یہاں آیئے یہاں۔

کیوں صاحب وہ آپ اپنے ننھے جان کو کیوں نہ لائے؟

واللہ کارڈ تو ان کے نام کا بھی بھیجا تھا۔

ماں تو لیجیے کیوں بھئی مجھلے میاں یہ آپ کے ننھے میاں کے نام کا کارڈ بھیجا تھا نا؟

تو آخر ویسے بھی تو آپ ہی کا گھر تھا۔

اچھا تو تشریف رکھیے اور ذرا مجھے اندر جانے کی اجازت مرحمت فرما دیجیے۔ واضح ہو کہ عین نکاح کی تقریب سے کوئی دو گھنٹے پہلے ہمارے سارے دوستوں میں سے صرف ایک دوست تشریف لائے تھے جو اپنے خیال میں شاعر ہیں یعنی بڑے ذی ہوش، انھیں ہم نے چائے پلائی او بسکٹ کھلاء یا در بڑے انکسار سے کہا کہ آپ نکاح میں انتظامی معاملات کی نگرانی فرمایئے گا۔ چنانچہ موصوف چائے کے بعد اقرار فرما کر تشریف لے گئے اور عین نکاح کے وقت آئے اور اپنا حصہ لے کر ہمارے کان میں فرمایا کہ:

''مولانا مجھے ایک اور نکاح کا اذن ہے اگر آپ فرمائیں تو میں اس میں بھی شریک ہو جاؤں اور اگر کوئی کام ہو تو میں ٹھہر جاتا ہوں''۔

آگ سی لگ گئی ان کی اس بے حسی یا خود غرضی پر۔ فوراً ہی کہہ دیا کہ بہتر ہے آپ تشریف لے جایئے، مگر ممدوح ہماری اس طعن آمیز اجازت کو بھی نہ سمجھے اور سلام کر کے رخصت ہو گئے۔ پھر ہمارے ماحول کی یہ لعنت ملاحظہ ہو کہ یہی بزرگ آج بھی ہمارے دوست بنے ہوئے ہیں اور روزانہ خلوص کا دعویٰ دائر کرتے رہتے ہیں۔

اب کوئی دن کے پانچ بجے تو قبلۂ محترم والد صاحب مدظلہ نے ذرا تاؤ کے ساتھ فرمایا کہ

اماں اب بھی کپڑے بدلو گے یا نہیں؟ تب جا کر ہمیں ہوش آیا۔ اُدھر برادر عزیز لیفٹننٹ نعمت جلال ہماری سواری کے لیے ایک نہایت ہی شاندار رولز رائس موٹر کار لے کر آ گئے اور لگے غصہ فرمانے۔

لاحول ولا بڑے مجہول آدمی ہو۔

تمھیں کیا خبر وہاں مسجد میں تمام لوگ تمھارا انتظار کر رہے ہیں تو آخر دن بھر سے کیا سو رہے تھے؟

اب آپ ہی فرمایئے ان حالات میں ہم نے کیا خاک خوشی کے ساتھ نکاح کے لیے غسل کیا ہوگا اور کپڑے بدلے ہوں گے؟

مگر ہاں غسل کیا اس طرح کہ پانی ڈالتے تھے سر پر اور گرتا تھا پیچھے دیوار پر۔ غرض غسل ہو گیا اور وہ ''فاخرہ'' جوڑا پہنا جو آج تک یا ہم نے پہنا یا دنیا کے کسی سب سے بڑے بادشاہ ہی نے پہنا ہوگا اور یہ بھی اس لیے کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی سے یہ رسم ہے کہ دولھا جب تک سو دو سو روپیہ نقد کا جوڑا نہ پہنے وہ دولہا ہی نہیں اور صرف اس چند منٹ والی تقریب کے لیے یہ سو دو سو روپیہ یوں برباد ہو جاتے ہیں کہ دولہا میاں اگر تعلیم یافتہ اور آج کل کے پیداوار ہوئے تو وہ نکاح کے بعد مارے شرم کے اس جوڑے کی طرف عمر بھر دیکھتے بھی نہیں مگر عورتوں کا قانون یہ ہے کہ ہر حال میں رنگین اور قیمتی کپڑے پہنو۔ لہٰذا ملا رموزی صاحب نے بھی ایک خالص ریشم کا بنا ہوا مگر شرعاً حرام سیلا عرف پگڑی باندھی اور باوجود بائیکاٹ عرف ترک موالاتی ہونے کے ایک اعلیٰ درجہ کی ملک چین کے بنے ہوئے سلک کپڑے کی شیروانی پہنی۔ پاؤں میں بھی کوئی چار روپے کے ریشمی موزے اور دہلی کا موتیوں سے لدا ہوا جوتا اور بڑا سا ریشمی رومال لے کر پہنچے حضرت والدہ محترمہ مدظلہا اور بہنوں کو سلام اور اجازت کے لیے۔ بس اس وقت ماں بہنوں کے جذبات کا کوئی اندازہ بیان کرنا ایک طویل کتاب کا لکھنا ہے۔ مختصر یوں کہ اس وقت ماں بہنوں کے دماغ دو طرح کے جذبات سے لبریز تھے اور وہ ان سے بے اختیاری نظر آتی تھیں۔

ایک جذبہ تو یہ کہ خدا کا ہزار ہزار شکر کہ اس نے آج ملا رموزی کو نوشہ بنا ہوا دکھایا۔ دوسرا جذبہ یہ کہ آہ اس وقت ہمارے قبضہ میں قارون کے خزانے کیوں نہ ہوئے ورنہ وہ سب کے سب اس وقت اپنے بیٹے اور بھائی ملا رموزی پر سے نثار کر دیتے۔

بس ان جذبات کے ساتھ ہزاروں دعائیں دے کر ہار پہنائے اور ہم کچھ شرماتے ہوئے

گھر سے باہر آ کر موٹر میں سوار ہوئے۔ ہمارے جلوس کی اس موٹر میں ہمارے بھانجے صاحب، دونوں بھائی اور قبلہ محترم والد صاحب مدظلہ تھے۔ برادر عزیز لیفٹنٹ نعمت جلال مارے جوش کے قابو سے باہر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ آج موٹر کو اس شان سے چلایا جائے کہ کوہ قاف کی پریاں بھی اس کی رفتار پر نثار ہونے آ جائیں۔ لہٰذا بڑی آن بان سے یہ موٹر روانہ ہوا اور واقعی لیفٹنٹ صاحب نے کچھ اس شان سے چلایا کہ ہمیں اپنے نوشہ ہونے کا یقین آ گیا۔ بڑے کروفر اور بڑے دبدبہ سے مسجد کے زینہ پر چڑھے تو دروازہ ہی پر حضرت دبیر الانشاء مولوی قاضی ولی محمد صاحب بی۔ اے سکریٹری اسٹیٹ کونسل نے مصافحہ فرمایا اور ممدوح کے ہمراہ مسجد میں داخل ہوئے تو بے تکلف احباب نے ہلکے تبسم کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور ہم غریب اور مفلس مسلمانوں کو چھوڑ کر امیر اور عہدہ دار قسم کے دوستوں میں جا بیٹھے۔ غریب اور مفلس شرکاء ایک کے اوپر ایک ہو کر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بچوں کچوں نے مسجد میں مارے شور کے رام لیلا کے میلے کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ نامور شرکاء میں ذیل کے حضرات قابلِ تذکرہ ہیں:

عالیجناب عزیز الملک لیفٹنٹ کرنل سردار اقبال محمد خاں بہادر او۔ بی۔ ای۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر ریاست کوروائی کے اے۔ ڈی۔ سی مولوی عبدالاحد صاحب علیگ، ہائی کورٹ کے جج مولوی سید مرتضٰی علی صاحب بہادر بار ایٹ لا، میجر جنرل صولت جنگ، مولوی عبدالقیوم خاں صاحب بہادر، وزیر جنگ مولوی محمود علی خاں صاحب مولوی فاضل، مولوی محمودالحسن خاں صاحب بی۔ اے علیگ، ایڈیٹر علی گڑھ میگزین علی گڑھ، مولوی عبدالغفور خاں صاحب بی۔ اے پرائیویٹ سکریٹری۔

تھوڑی دیر میں ادب نواز و علم پرور نواب زادہ گرامی مرتبت کپتان محمد سعیدالظفر خان بہادر بالقابہ و نواب زادہ عالی منزلت کپتان محمد رشیدالظفر خان بہادر بالقابلہ کی اطلاع ہوئی اور تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر تعظیم کی رسم ادا کی۔ نواب زادگان گرامی کی تشریف آوری کے بعد حضرت صدر العلماء قاضی القضاۃ تشریف لائے اور ممدوح کے سامنے چھوٹے قاضی صاحب نے ہمارے نکاح کے کاغذات پیش کیے۔ ہماری 'اُن' کی جانب سے کپتان محمد عبدالقادر خاں صاحب، حضرت محمد میاں و حضرت شیر احمد خاں صاحب جاگیردار ریاست ٹونک نے بعد خطبۂ

نکاح ایجاب وقبول کی رسم ادا کی تھی کہ ہمارے سر پر سے کوئی ڈھائی سیر خرمے کسی نے پھینک مارے جسے "نچھاور" یا نثار کرنا کہتے ہیں۔ پاس ہی لونڈے بیٹھے تھے ٹوٹ ہی تو پڑے ان خرموں پر اور آن کی آن میں پھر فرش صاف کا صاف نظر آنے لگا۔ اس کے بعد دعا کی رسم ادا ہوئی۔ قسم لے لیجیے جو ایک شخص نے بھی اس دعا میں یہ کہا ہو کہ ملا رموزی صاحب کو یہ تقریب مبارک ہو۔ بس حضرت والد صاحب قبلہ نے ضرور ایسی دعا کی ہوگی۔ باقی کے سب لوگوں نے اپنی اپنی تنخواہوں میں اضافہ کی دعا کی ہوگی، لیکن رسماً ہاتھ اٹھائے رہے یہی تو وجہ ہے کہ نہ اب تک تنخواہ میں اضافہ، نہ عہدہ میں ترقی، نہ جاگیر و منصب، نہ نوکری کی حاضری معاف، نہ گھر بیٹھے کوئی وظیفۂ ادب۔ وہی دن بھر نوکری کی حاضری اور رات بھر مضمون نگاری میں آنکھیں اور دماغ جلانا۔ تو القصہ عین اسی حالت میں ہاروں، پانوں اور عطر کی جو تقسیم شروع ہوئی ہے تو معاذ اللہ پھر کون کسے انگریز سمجھتا تھا سب کے سب تھے ہندستانی اس لیے بس ہو گیا ہنگامہ:

اجی حضرت مجھے پان تو دیجیے، دیکھا نہیں میرے پاس سے گزر گئے۔

سبحان اللہ تو کیا میں آپ سے دوبارہ مانگ رہا ہوں۔

اماں میرے پاؤں پر پاؤں تو نہ دھرو۔

تو دیتا ہوں شیروانی تو چھوڑو۔

بھائی جان مجھے حصہ نہیں ملا۔ جی چاہے تو دے دیجیے ورنہ رہنے دیجیے۔ وہ تو ملا صاحب کی تقریب ہے گھر کا معاملہ ہے، ہمیں تو صرف ملا صاحب کے نکاح میں شریک ہونا تھا، سو ہو لیے۔

اچھا اچھا تو رہنے دیجیے، تکرار سے کیا فائدہ؟

اماں کیا اندھے ہو گئے ہو لاحول ولا۔ اِدھر تقسیم کرتے پھرتے ہو اُدھر تو دیکھو وہ دُلہن کی طرف کے تمام لوگ ویسے ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔

لاحول ولا تو میرے اوپر کیوں گرے جاتے ہو۔ ذرا صبر تو کرو دیتا ہوں آخر بھاگا تو نہیں جاتا۔ اچھا تو لو یہ تمھارے بچہ کا حصہ بھی لو، اب تو معاف کرو۔

لیجیے یہ نکاح کی تقریب ختم ہوگئی اور ہم اسی شان سے موٹر میں بیٹھ کر گھر واپس ہوئے۔ گھر جو پہنچے تو بغیر کسی مبارک باد کے گھیر لیا پھر عورت ذاتوں نے اس لیے کہ انھیں آج پھر جوڑا اور زیور

لے کر سسرال جانا تھا اس لیے پھر وہی:

تو موٹریں کتنی ہیں؟

اور وہ مٹھائی کے لیے خوان؟

اور بس تم ہی کہہ دو باجے والوں سے۔ وغیرہ۔

غرض انھی حالات کے ساتھ جو اوپر منگنی کی تقریب میں بیان ہو چکے آج بھی عورتیں گئیں اور دوسرے دن سسرال سے ہمیں جوڑا پہنانے جو عورتیں آئیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ دن بھر ہمارے گھر میں ان کی آمد آمد کا چرچا رہا اور فرش سے لے کر ایک ایک چیز سنواری گئی کہ وہ بھی آ گئیں شور ہوا کہ ''عورتیں آ گئیں'' کروفر اور ''لباس و بدبہ'' ان میں بھی کم نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم طلب کیے گئے اور دروازہ میں داخل ہوتے ہی ہم ''زیر سایہ خواتین'' یوں آ گئے کہ ہمشیرہ نے ہمرے سر پر اپنا دوپٹہ ڈال کر کہا دیکھو چل کر سب کو سلام کرنا اور ہنسنا نہیں۔ دل ہی جانتا ہے کس قدر تکلیف ہوئی جب ہمیں عورتوں کو سلام کرنے کی ہدایت ہوئی، مگر کرتے کیا رسم کے ہاتھوں مجبور تھے، اس لیے جاتے ہی ہم نے یوں سلام کیا گویا کیا ہی نہیں اور جو کیا بھی تو اپنے ہی آپ کو سلام کیا عورتوں کو نہیں۔ کوئی ڈھائی سو عورتوں میں سے صرف ایک جواب ملا ''جیتے رہو'' یہ ہوں گی کوئی عورتوں کی افسر اعلیٰ جنھوں نے مارے بزرگی کے یہ پیارسا جواب مرحمت فرمایا۔ دوسرا حکم ملا کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھو۔ اسے ہم نے اس لیے برا نہ سمجھا کہ اس حرکت میں مذہبی جذبہ نمایاں تھا۔ اس کے بعد ایک اُٹھیں اور ہمارے برابر کھڑے ہو کر ہمیں کپڑے یوں پہنائے کہ ہمارے اوپر عمامہ اور شیروانی پٹک دی۔ یہ حجاب کی وجہ سے ایسا کیا گیا۔ پھر ہمارے ہاتھ میں روپیہ دیے گئے۔ پھر خدا جانے کس چیز کے بنے ہوئے لڈو ہمیں یوں کھلائے کہ بارہا ہمارے منہ کے پاس لڈو لا کر ہاتھ کھینچ لیا گیا اور ہاں پھولوں کا بنا ہوا زیور بھی ہمیں پہنایا گیا۔ ہر معاملہ میں ہماری ہمشیرہ ہماری امداد فرماتی رہیں کہیں ہمیں خلاف ضابطہ پا کر ڈانٹ بھی دیا اور تقریب ختم ہو گئی۔ چلتے وقت ہمیں سلام کرنے کا پھر حکم ملا اور ہم نے بھی پھر ویسا ہی سلام کیا جیسا اوپر کر چکے تھے۔ ◆◆◆

رخصتی یا وِداع

جرمنی اور ترکی میں تو معلوم نہیں البتہ ہمارے ہاں یہ ضابطہ ہے کہ شادی کی تمام رسوم ایک ساتھ بھی کی جاتی ہیں، جسے عوام میں ''چٹ منگنی پٹ بیاہ'' بھی کہتے ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ایک تقریب ایک ایک سال کا فاصلہ چھوڑ کر ادا کی جاتی ہے۔ اس فاصلہ چھوڑنے کے بظاہر اسباب یہ ہیں:

(1) لڑکا کا نابالغ ہونا۔

اس صورت میں سوال یہ ہے کہ نابالغ ہونے کی صورت میں ایسا سلسلہ ہی کیوں قائم کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مذہب اسلام نے نابالغ لڑکی کا نکاح جائز قرار دیا ہے نیز اس لیے کہ بعض جگہ خاندانی تعلقات کی خوشگواری سے بھی لڑکی یا لڑکے کو کسی دوسری جگہ شادی سے باز رکھنے کے لیے بھی ایسی عجلت کی جاتی ہے اور منگنی یا نکاح کر کے وداع کی تقریب کو لڑکی کے بلوغ کا انتظار کیا جاتا ہے۔

(2) کہیں اس لیے ایسی تاخیر روا رکھی جاتی ہے کہ پسند کے موافق لڑکی یا لڑکا مل جانے کو غنیمت سمجھ کر کسی ابتدائی تقریب سے الجھا دیا جاتا ہے اور بقیہ تقاریب رفتہ رفتہ پوری کردی جاتی ہیں۔ اس میں بہت زیادہ اثر فریقین کے افلاس اور تنگ دستی کا ہوتا ہے اور ہندستان میں افلاس اور بے روزگاری عام اور کثیر ہے جس کی وجہ غیر قومی حکومت بتائی جاتی ہے، اس لیے یک لخت اسباب فراہم نہ ہونے کی وجہ سے تقاریب کے درمیان ایک فصل پیدا کیا جاتا ہے اور موافق اسباب جمع

ہو جانے پر تکمیل کی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں کہیں منگنی اور نکاح کے درمیان کا فصل بڑھایا جاتا ہے اور کہیں نکاح اور وداع کا فصل۔

پس ہم چونکہ ہر تقریب میں اپنے سرپرستوں اور بزرگوں کے احکام کے تابع تھے اور ہمیں معلوم تو ہے مگر بتاتے نہیں کہ ہمارے ہاں یہ فاصلہ کیوں پیدا کیا گیا؟ البتہ یہ علم ہے کہ اس فاصلہ کو فریقین چاہتے تھے اور صاف بات یہ ہے کہ عورتوں کی شریعت کے موافق مہینہ نہیں تھا، اس لیے ہمارے نکاح کے بعد وداع کی تقریب روک دی گئی جو آگے بیان کی جائے گی۔ یہاں اُن حالات کا تذکرہ دلچسپ ہوگا جو نکاح کے بعد ہمارے مخلصین، قدر دانوں اور اخبار نویسوں میں بپا ہوا اور اس ہنگامہ کی تفصیلات یہاں اس غرض سے نقل کی جاتی ہیں کہ اول تو مخلصین اور قدر دانوں کی واقعی محبت اس کتاب میں یادگار ہو کر محفوظ ہو جائے دوسرے اس لیے کہ حاسد اور مخالفین یہ اندازہ کر کے جل مریں کہ اُفوہ ملا رموزی کے ذاتی اور نجی معاملات پر بھی اردو زبان کے چوٹی کے اخبارات کس بے تکلفی اور کثرت سے لکھتے ہیں۔ تیسرے اس لیے کہ رشتہ دار سچے دوست اور برادری کے قدر دان مرد اور عورتیں دیکھ لیں کہ خدائے رحیم و رحمٰن نے اپنی مرحمت اور اپنے رسولؐ محترم کی غلامی کے صدقہ سے اپنے ملا رموزی کو کس قدر عزت اور شہرت دی ہے کہ ان کی ہر بات پر اخبارات میں پُر جوش حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ چوتھے اس لیے کہ ہمارا ناقدر دانیوں سے تھکا ہوا دل اور حوصلہ شکن مسلمانوں کے برتاؤ سے جلا ہوا دماغ ذرا مغرور اور متکبر ہو جائے اور ہم دل ہی دل میں کہتے رہیں کہ یہ ہے ہماری شان کہ آج اردو کے سب سے بلند، سب سے آخری اور سب سے مشہور اخبارات تک میں ہمارے تذکرے یوں آتے ہیں جیسے دنیا کے بادشاہوں اور بڑے بڑے ارباب کمال کے آیا کرتے ہیں اور آنکھیں کھول کر وہ لوگ ان تذکروں کو پڑھیں اور جلیں جو گھروں میں بیٹھے ملا رموزی پر تنقیدیں اڑایا کرتے ہیں اور پھر اس خدائی انعام کو وہ اپنی تمام مقدرت خرچ کر کے لے آئیں جو بصورتِ حسن قبول یا شہرتِ عام ہم ملا رموزی صاحب کے لیے یہ تذکرے اخبارت میں لکھے ہیں۔ اُن کا خلوص اور ولولۂ قدر دانی ملا رموزی کے لیے قابل احترام و عزت ہے یا ان بے دماغوں اور دولت مندوں کی اکڑفوں جو بکواس اور ہفوات سے زیادہ کوئی قیمت نہیں رکھتی اس لیے قصہ یوں کہ ہم نے چودہ برس کے اخباری اور تحریری تعلقات کی بنا پر

بعض مشاہیر، ارباب فضل، ادباء اور علمائے کرام کو اپنی اس تقریب کا علم تھا اور بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نکاح میں علم و ادب کے نامور خادم اور صاحب احساس و حوصلہ دوست حضرت گرامی مولوی محمود الحسن صاحب صدیقی بی۔ اے علیگ، ایڈیٹر رسالہ "علی گڑھ میگزین" بذات خاص شریک تھے، جنھوں نے ہمارے مقامی دوستوں کو احساسِ فرائض کی مثال پیش کرنے کے لیے فوراً ہی ایک مضمون روز نامہ "خلافت" بمبئی میں شائع کرادیا۔ روز نامہ خلافت بمبئی جنوبی ہند میں زبانِ اردو کا وہ اخبار ہے جس سے زیادہ بلند معیار، کثیر الاشاعت اور باوقار کوئی دوسرا اخبار نہیں۔ چنانچہ اس بلند و رفیع جریدہ میں ممدوح نے جو مضمون شائع کرایا، اس کی اشاعت مورخہ 21 جون 1929، جلد 8 نمبر 142 کے صفحہ 4 پر یوں درج ہے:

اخبارات کے پیغامات تہنیت

<u>ملا رموزی سلک ازدواج میں:</u>

"ملک کے تمام ادبی حلقوں میں یہ خبر حیرت اور مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ ملا رموزی صاحب جن کے تفریح خیز اخلاقی و معاشرتی مضامین نے اخبارات اور رسائل میں ایک دھوم مچا رکھی ہے بالآخر 7 جون 1929 کو سلک ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ملا رموزی صاحب اپنے مضامین میں اب تک لفظ "اُن" کے ساتھ بیوی کا ایک فرضی کیریکٹر نمایاں کررہے تھے اور "وہ" اور "ننھے میاں کی والدہ" کے بھی فرضی کردار ناظرین کی ضیافت طبع کا سامان فراہم کررہے تھے۔ بہت سے ناظرین کی ہمدردیاں بھی ان فرضی "ننھے میاں کی والدہ" کو حاصل ہو چکی ہوں گی۔ ننھے میاں کی والدہ کا کردار ایک جفاکش خاتون جو ہمہ تن خانگی انتظامات میں مشغول ہو، ملا رموزی صاحب کی حقیقی ہمدرد، باوفا اور ایثار پیشہ خاتون۔ جزرس اور شوہر کی بے اصولیوں اور فضول خرچیوں پر محاکمہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہا کرتی تھی۔ غرض ہندستانی گھریلو خاتون کا عجب معصومانہ لیکن باوقار کردار تھا جو آج اس خبر سے بالکل ایک پیکر خیالی ثابت ہوا۔

ملا رموزی صاحب کی شادی ان کے حسب منشا (یہ غلط ہے) ایک روشن خیال اور

معزز گھرانے میں (یہ صحیح ہے) ہوئی 7 جون کی شام کو موتی مسجد میں ملا صاحب کی تقریب نکاح عمل میں آئی اور گرامی قدر نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ جو ملا رموزی صاحب کے خاص قدر دان ہیں، خود اس تقریب میں شرکت فرماتے اور بھی بہت سے اخوان حکومت اور معززین شریک تھے۔ تھوڑی دیر میں ملا رموزی صاحب بھی تشریف لائے۔ ایک جوان عمر، جوان طبیعت، جوان صورت انسان نوشہ کے لباس میں اس فرسودہ تخیل سے کوسوں دور نظر آرہا تھا جو بعض سادہ لوح ناظرین ملا صاحب کے مضامین میں اور لفظ ''مُلا'' کی نسبت سے محسوس کرتے ہوں گے یعنی ایک ہفتاد رسالہ بزرگ بریش مقطع مع عمامہ وعبا۔

میرا خیال تھا کہ آج ملا صاحب ایک سنجیدہ اور متین (یعنی خشک) انداز میں رونق افروز ہوں گے مگر یہ منچلا نوجوان جس کی گھٹی میں ظرافت پڑی ہے، آج بھی اپنے مخصوص خنداں و شگفتہ انداز میں تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ملا صاحب اس وقت بھی کسی پُرلطف مضمون کا پلاٹ سوچ رہے ہیں۔

تقریب کا اہتمام نہایت قرینہ اور سلیقہ سے کیا گیا تھا۔ ملا صاحب اس تقریب پر تمام ادبی حلقوں کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ دعا ہے کہ اس ظریف ادیب نوشہ کی دُلہن بھی اس کی ہم خیال ہو اور ملا صاحب کو ازدواجی زندگی کی تمام مسرتیں نصیب ہوں۔

راقم

محمود حسن صدیقی، بی۔اے (علیگ)''

یہ وہ پہلا مرحلہ تھا جس نے سارے اخبارات اور ہندستان بلکہ ساری دنیا میں ہمارے اس معاملہ کی اطلاع بہم پہنچادی۔ کیونکہ یہ اخبار یورپ سے لے کر مکہ شریف تک جاتا ہے اس لیے ایک اور مقامی علیگ حضرت اشرف حسین صاحب بھی متاثر ہوئے اور آپ نے اخبار ''پارس'' لاہور کی اشاعت مورخہ 2 جولائی 1929 کے صفحہ 14 پر اس واقعہ کو یوں شائع کرایا کہ:

حضرت ملا رموزی کا نکاح:

''ملک کے تمام علمی و ادبی طبقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ جو ملا رموزی صاحب ایک بالکل فرضی اور خیالی ''ننھے میاں کی والدہ'' کے نام سے مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی اور اخلاقی زندگی پر نہایت بلند اور پُر از حقیقت اصلاح و نکتہ فرماتے رہتے تھے خود آج تک نا کتخدا تھے۔

بارے 7 جون 1929 کی شام کو موتی مسجد میں آپ کی رسم عقد نکاح عمل میں آئی۔ ملا رموزی صاحب جو کل تک ایک پختہ کار اور معمر ادیب کی حیثیت سے دنیائے صحافت میں اپنے بزرگانہ نصائح پیش فرماتے رہتے تھے آج ایک شاندار رولز رائس موٹر کار میں ایک نوجوان نوشہ کی حیثیت سے مسجد میں داخل ہوئے۔ معززین و رؤسائے شہر اور فوجی افسروں کی ایک خاصی جماعت شریک تھی جس میں قابلِ ذکر حضرات یہ ہیں:

عالیجناب نواب زادہ کپتان محمد سعید الظفر خان بہادر، عالیجناب نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خان بہادر، لیفٹننٹ کرنل، عزیز الملک، سردار اقبال محمد خاں صاحب بہادر، ایڈی کانگ میر دبیر مولوی قاضی ولی محمد صاحب بی۔ اے سکریٹری اسٹیٹ کونسل، صولت جنگ میجر جنرل عبدالقیوم خان بہادر، وزیر جنگ عالیجناب مولوی عبدالاحد صاحب علیگ، اے۔ ڈی۔ سی۔ حضور ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر کوروائی اسٹیٹ، مولوی محمود الحسن صاحب بی۔ اے علیگ، ایڈیٹر رسالہ ''علی گڑھ میگزین'' علی گڑھ، میر دبیر مولوی سید مرتضیٰ علی صاحب بہادر بیرسٹر اسٹیٹ لاء جج ہائی کورٹ، مولانا محمود علی خاں صاحب مولوی فاضل، مولانا یوسف علی خاں صاحب سٹی انسپکٹر پولیس و کوتوال شہر، کپتان سرو حسین خاں صاحب، کپتان عبدالعزیز خاں صاحب، ایڈ جوٹینٹ سید ابراہیم پاشا، لیفٹننٹ شاہ محمد خاں صاحب پشاوری، لیفٹننٹ نعمت جلال، حضرت صدر العلماء قاضی القضاۃ نے خطبۂ نکاح پڑھا۔

یہ تقریب حضرت حبیب احمد خاں صاحب پولیس افسر و جاگیردار ریاست ٹونک کی صاحبزادی سے ہوئی۔ کپتان عبدالقادر خاں صاحب وکیل نکاح محمد میاں صاحب و

حبیب شیر خاں صاحب جاگیرداران ریاست ٹونک گواہ تھے۔ دعا ہے کہ خدا ملا رموزی صاحب کے لیے اس تقریب کو خیر و برکت کا باعث فرمائے۔ آمین۔

سید اشرف حسین علیگ"۔

یہاں تک تو تھا معاملہ ایک حد تک متین، مگر اب یہ معاملہ جو پہنچا بے تکلف اخباری دوستوں میں تو خدا کے اس انعام کو حاسد کس طرح چھین لیں گے کہ ملا رموزی صاحب مسلمان بھائیوں ہی میں مقبول نہیں بلکہ اصولی اخبار نویسی کی وجہ سے وہ ہندو بھائیوں کے دلوں کی ٹھنڈک بھی بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ شمالی ہند کے ہندو بھائیوں کے باوقار اخبار "پارس" مورخہ 24 جون 1929 نے اپنے ایڈیٹوریل حصہ میں ہمارے اذن کے ظریف خط کو نقل کر کے جو کچھ لکھا وہ یہ ہے:

اپنے مُلّا رموزی کی شادی:

ہمارا خط:

"حضرت محترم لالہ کرم چند صاحب و لالہ باصر صاحب!

لیجیے یہ اپنے نکاح کا لال لال کارڈ حاضر ہے۔ آپ کے خطوط جو "پارس" کے سالگرہ نمبر کے متعلق سوان کا جواب دیتے کس طرح؟ جب کہ یہاں اپنے "ننھے میاں کی والدہ" کے خیر مقدم میں الجھے ہوئے ہیں کہ دل جانتا ہے۔ خدا کرے آپ سب کا روبار چھوڑ کر آ جائیں۔ سنیے یہ کارڈ پہلی تقریب کے ہیں۔ اس تقریب پر مخلص لوگ سہرا کہتے ہیں اور آپ دونوں ہیں شاعر، لہٰذا ایک ادیب شہیر کا سہرا کہیے تا کہ یاد رہے اور دوسری تقریب ہوگی 'رخصت' کی اس میں کھانا بھی کھلایا جاتا ہے جو ایک ماہ بعد ہوگی۔ اگر اِس وقت نہیں آ سکتے تو اُس وقت کے لیے اقرار لکھیے تا کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کے کام آئے۔

ملا رموزی"

اس پر اُس اخبار کے ایڈیٹروں نے جو کچھ لکھا وہ یہ ہے:

"ہم سالگرہ نمبر کی ترتیب کے ساتھ ہی اہلِ قلم حضرات کی ناز برداریوں سے عارضی

طور پر فارغ ہو چکے تھے اور آئندہ ہفتہ اخبار کے کولہو میں جُتنے کے لیے سُستا رہے
تھے کہ ڈاک پہنچی۔ ایک لفافہ پر نظر پڑی تو اُچھل پڑے کہ آہا مُلا رموزی صاحب کا
مضمون آ گیا، مگر بعد از وقت سالگرہ نمبر تو اس وقت خریداروں تک پہنچ بھی گیا ہوگا۔
اب مضمون کس کام کا؟ خیر لفافہ کے نیچے دبالیا اور باقی ڈاک اس طرح پڑھ یا دیکھ
گئے جس طرح لاہور کے افسر صحت عامہ شہر کی صاف ستھری گلیوں کا معائنہ کر جاتے
ہیں۔ خطوط پڑھ چکنے کے بعد اس لفافہ کی باری آئی جس کے متعلق ہمیں یقین تھا کہ
یہ ملا رموزی صاحب فاضل الٰہیات کا ہے اور اس میں سالگرہ نمبر کے لیے کوئی
پھڑ کتا ہوا مضمون ہے۔

لفافہ کھلا تو اس میں سے ایک سفید پُرزہ اور ایک سرخ خط کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ سرخ
کارڈ دیکھ کر پہلے تو ہم سمجھے کے بے چارے ملا صاحب بھی خدا انہیں نیک ہدایت
دے۔ بالشویک یعنی انقلاب پسند ہو گئے ہیں اور انھوں نے از راہِ دوستی ہمیں قتل کی
دھمکی دی ہے، مگر جب سرخ خط مطبوعہ علوی پریس کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ نامۂ
قتل نہیں بلکہ رقعۂ دعوت ہے۔ بس اتنا دیکھنا تھا کہ ٹائم ٹیبل اٹھایا اور ریل کا وقت
دیکھنے لگے۔ آنکھیں ٹائم ٹیبل پر تھیں، باز و کٹ پہن رہے تھے، منہ سے بستر لاؤ،
سوٹ کیس لاؤ، تانگہ لاؤ کی صدا بلند تھی کہ ہماری یہ بدحواسی دیکھ کر ایک دوست جو
قریب بیٹھے تھے اس سرخ کارڈ کے بغیر ہماری اجازت کے یوں دیکھنے لگے گویا ہم
اس قتل نامہ کے ڈر سے بھاگ رہے ہوں۔ فرمانے لگے جانتے ہو آج کون سی تاریخ
ہے؟ ہم نے کہا دس جون۔ تو فرمایا جایئے ملا صاحب کا نکاح 7 / جون کو ہو چکا، بس
سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ کوٹ کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے بولے ظالم نے یہاں بھی مذاق کو
ہاتھ سے نہیں جانے دیا؟

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ ناکامی اور مایوسی کی صورت میں دل کو فریب دینے کی
کوشش کی جاتی ہے۔ چونکہ بفضلہٖ ہم فرزند آدم اور اشرف المخلوقات ہیں اس لیے دل
ہی دل میں اس حادثہ پر یوں تنقید کرنے لگے۔

شادی وادی کچھ بھی نہیں، یہ سب دوستوں کے بنانے کا ڈھنگ ہے۔ حضرت جون میں اپریل فول منانے چلے ہیں۔ یہ سب انگریزی کی غلامی کا اثر ہے۔ شادی تو ہو چکی کب کی نہیں تو ہر مضمون اور ہر خط اور ہر شعر میں ''اُن کا'' اور ''ننھے میاں'' کا تذکرہ کیوں ہوتا اور پھر ''جملہ حقوق بحق راقم'' کیوں محفوظ ہوتے ہیں۔

تو خیر صاحب اگر مُلا صاحب کی شادی ہوگئی ہے یا ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے تو ہم انھیں مبارک باد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ جب ان کی ''وہ'' آئیں تو خدانخواستہ ملا صاحب ''گھر کے لوگ'' ہوکر نہ رہ جائیں۔ بلکہ ''پارس'' کے لیے خوب خوب لکھیں۔ اب رہا معاملہ سہرے کا تو چونکہ ہم شادی میں شریک نہ ہوئے اس لیے نہیں لکھا، لیکن چونکہ ملا صاحب اہل قلم ہیں اور ہمارے دوست ہیں اور ہم کو ان کی ہر مصیبت میں ہمدردی ہونی چاہیے یوں کہ وہ جو کہا ہے:

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

لہٰذا ہم ملا صاحب کا سہرا لکھیں گے اور ضرور لکھیں گے۔ اچھا تو ملا صاحب ''اُن'' کی تشریف مبارک ہو اور سہرے کا انتظار کیجیے''۔

اس کے بعد لاہور کے روزنامہ اخبار ''انقلاب'' نے اپنی اشاعت مورخہ 26 جون 1929 کے صفحہ 3 کالم 4،3 پر اس معاملہ کے متعلق لکھا۔ روزنامہ اخبار ''انقلاب'' صوبۂ پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کا وہ جلیل القدر ترجمان ہے جس کی ادبی اور علمی متانت و بلند پائیگی سارے ہندستان میں مسلّم ہے اور سارے اخبارات اردو میں یہ اخبار چوٹی کا اخبار مانا جاتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر مشہور ظریف ادیب حضرت ابو رشد عبدالمجید خاں سالک بی۔ اے، منشی فاضل ہیں۔ تحریر مذکورہ یہ ہے:

''ہمارے دوست ملا رموزی نے اپنے اکثر مضامین میں ''وہ'' اور ''اُن'' اور ''ننھے میاں کی والدہ'' کا ذکر جس والہانہ محبت اور دل بستگی سے کیا ہے، اس سے ناواقف اشخاص بھی نتیجہ نکالتے ہوں گے کہ ملا صاحب خدا کے فضل سے عیالدار آدمی ہیں اور

بیوی بچے باقاعدہ رکھتے ہیں حالانکہ آپ کی حالت یہ ہے کہ آپ اب تک ''نہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا''، ''جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا''، ''ننھے میاں کی والدہ'' موجود فی الخارج نہ تھیں، محض موجود فی الذہن بیوی تھیں اور اب تازہ خبر موصول ہوئی ہے کہ 7 جون 1929 کو اس موجود فی الذہن بیوی نے جسم، رنگ، شکل، سمت، مکان، زمان وغیرہم کے خواص اختیار کر لیے اور ملا صاحب بیک ایجاب وقبول مجرد سے مقید ہو کر رہ گئے۔

وہ ''ننھے میاں کی والدہ'' جو اکثر مضامین میں ملا صاحب کے لاابالی پن پر انھیں ڈانٹ دیا کرتی تھیں، لیکن اس کے باوجود بے حد باوفا، ایثار کیش، جفاکش اور مخلص تھیں، خیالی دنیا سے مثالی دنیا میں ہجرت کر آئی ہیں۔ ہم متعجب تھے کہ یہ ''ننھے میاں کی والدہ'' بھی عجیب ہیں کہ اس قدر ''زوردار'' عورت ہونے کے باوجود ملا صاحب کی ''طنزیہ کردار نگاری'' کو گوارا کر لیتی ہیں اور ''چھپ جانے'' سے ذرا نہیں گھبراتیں لیکن معلوم ہوا کہ وہ موجود ہی نہ تھیں۔ جو ہستی موجود ہی نہ ہو وہ کسی پر کیا بگڑے گی؟ اور کیا بازپرس کرے گی؟ مزا تو اب آئے گا اگر ملا صاحب ''وہ''، ''اُن'' اور ''ننھے میاں کی والدہ'' کے متعلق اسی بے تکلفی سے لکھتے رہے تو یقیناً ایک دن کھٹ پھٹ ہو جائے گی اور ملا صاحب کی انشاپردازی کا ایک نمایاں پہلو غائب ہو جائے گا۔

بہر حال ہم ملا صاحب کو ان کی ''شادی کتخدائی'' پر تہہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ خدا کرے زوجین میں موافقت رہے۔

مُلّا صاحب نے ازراہِ نوازش ہمیں بھی اس تقریب سعید میں شرکت کی دعوت دی تھی، لیکن انھیں یہ معلوم تھا کہ ہم شریک نہ ہو سکیں گے کیونکہ ایک بے حد مصروف اخبار نویس سے محض شادی کی تقریب میں شامل ہونے کی توقع ملا رموزی جیسے دانشمند آدمی کے دماغ بھی نہ آ سکتی تھی، اس کے علاوہ 7 جون کو ملا صاحب نکاح کی لڑی میں پرو دیے گئے اور 8 جون کو بھائی مہر کی دوسری شادی ہوئی۔ چونکہ 7 جون کو ملا صاحب کی شادی تھی اس لیے ہم مہر صاحب کی شادی میں شریک نہ ہو سکے اور

چونکہ 8 جون کو مہر صاحب کی شادی تھی، لہٰذا ہم ملا صاحب کی شادی میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں کی شادی میں شریک نہ ہوئے اور دونوں کی شکایت سے بچ گئے۔

شادی انسان کی زندگی میں ایک نہایت پُر لطف تجربہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ایک انشاپرداز کے لیے تو بے حد مضمون آفریں چیز ہے۔ جذبات نگار اس سے اپنے مطلب کے تاثرات فراہم کر سکتا ہے۔ اصلاح معاشرت پر مضامین لکھنے والے اپنے ڈھب کے مسائل سوچ سکتا ہے۔ تفریح و طنز کے لیے بھی اس مضحکہ خیز تقریب میں بے حد گنجائش ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ملا صاحب اس تجربہ کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ ان کی اپنی شادی پر ان کے تاثرات و خیالات معلوم کرنے کا شوق اکثر حضرات ہو گا۔ ہم نے ان حضرات کی ترجمانی کر دی ہے۔ کیا ملا صاحب ''ہنی مون'' کی دلنواز فراغتوں میں ایک ساعت اس مضمون کے لیے وقف فرمائیں گے''۔

اس کے بعد صوبہ جات متحدہ کا دیرینہ اور نہایت مشہور و بلند پایہ اخبار ''مدینہ'' بجنور مورخہ 28 جون 1929 کے صفحہ 3 کالم 2 پر لکھتا ہے:

''مذکورہ بالا مضمون قادیانوں کے متعلق لکھتے وقت جسم و جان میں غم و غصہ کی ایک آگ سی بھڑک رہی تھی، لیکن خدا بھلا کرے حضرت مُلّا رموزی اور ان کی جدید ترین بیگم صاحبہ کا جن کے نکاح کی خبر کے سیلاب مسرت سے اس کے شعلے کم ہو کر بجھ گئے۔ اور اب دل میں خوشی اور انبساط کا ایک چمن سا کھل گیا ہے۔ مُلّا صاحب کے مضامین پڑھنے کا جن لوگوں کو اتفاق ہوا ہے انھیں یاد ہو گا کہ وہ اکثر کسی ''ننھے میاں کی والدہ'' کا تذکرہ کیا کرتے تھے حالانکہ نہ کوئی والدہ تھیں نہ ''ننھا'' یہ حرکت محض طفل تسلی تھی (یا کردار نگاری) بہ الفاظ دیگر اب تک تصور ہی پر بسر تھی۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ 7 جون 1929 کو ملا صاحب کی شادی ہو ہی گئی۔ یہ ''ہو ہی گئی'' اس لیے کہا کہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ملا صاحب سعی ناکام کر چکے تھے۔ ''دیر آید درست آید'' مشہور ہے۔ ملا صاحب کا نکاح قاضی القضاۃ حضرت

صدرالعلماء نے پڑھا۔ بڑے بڑے افسروں اور رؤسا نے شرکت فرمائی اور خود ملا صاحب رولزرائس موٹر کار میں مسجد تک تشریف لے گئے۔ جی تو نہیں چاہتا تھا کہ ملا صاحب کی شادی کی خبر شائع کریں جب کہ انھوں نے نہ دعوتی رقعہ ارسال کیا نہ مٹھائی ارسال فرمائی۔ ایک روکھا پھیکا اطلاع نامہ ارسال کردیا کہ ہماری شادی ہوگئی۔ بہت اچھا صاحب، اطلاع پائی اللہ مبارک کرے اور اتنے بچے ہوں اتنے بچے ہوں کہ گھر بھر جائے۔ ہم ملانی صاحبہ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھیں ایک ظریف خاوند مل گیا۔ انشاءاللہ زندگی خوب گزرے گی"۔

اس کے بعد اخبار ''زمیندار'' لاہور نے اپنی اشاعت مورخہ 30 جون 1929 کے صفحہ 3 پر بہرۂ نکاہات میں جو کچھ لکھا وہ یہ ہے۔ روزانہ اخبار ''زمیندار'' لاہور اگر اردو زبان کا پائنیر اخبار کہا جائے تو غلط نہیں۔ اردو کے تمام اخباروں میں صرف ''زمیندار'' کو یہ وقعت حاصل ہے کہ وہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کا سب سے بلند مرتبہ، باوقار اور کثیرالاشاعت اخبار ہے اور حد سے گزرا ہوا بے باک اور راست گفتار اور یہی وہ اخبار ہے جس سے حکومت برطانیہ کبھی غافل نہیں رہتی۔ اس نے جو کچھ لکھا وہ یہ ہے:

''سنتے ہیں کہ ہمارے پرانے کرم فرما ملا رموزی صاحب کی شادی ہوگئی۔ ابھی پچھلے دنوں ملا صاحب کا دلچسپ مضمون رسالہ ''عالمگیر'' لاہور کے سالانہ نمبر میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کی تحریر تک آپ چنگے بھلے تھے اور اس کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ آپ ایسے آزاد منش آدمی یوں مناکحت کی طلائی زنجیروں میں گرفتار ہوجائیں گے۔

اب تک تو ملا صاحب ''خیالی بیوی'' کی ناز برداری کرتے تھے اب آپ کو ''حقیقی بیوی'' سے واسطہ پڑا ہے۔ آپ ہر مضمون میں ایک مرتبہ ''ننھے میاں کی والدہ'' یعنی ''خیالی بیوی'' کا ذکر کرتے تھے اور وہ بے چاری چیں بہ جبیں نہیں ہوتی تھیں، اب ملا صاحب ایک آدھ مرتبہ اپنے مضامین میں ''حقیقی بیوی'' کا ذکر کرکے بھی دیکھ لیں قدر عافیت معلوم ہوجائے گی۔ بہرحال ملا صاحب جہاں رہو اور جس حالت میں

رہو خوش رہو"۔

اس کے بعد صوبہ پنجاب کے مقتدر ادبی اور علمی رسالے "مخزن" لاہور بابت ماہ جون 1929 نے اپنے صفحہ 2 پر اظہار خیال کیا۔ رسالہ "مخزن" لاہور ادب اردو اور زبان اردو میں علم و ادب اور تاریخ و تنقید کا وہ مقتدر مجلّہ ماہی ہے جس کی خدمات سارے رسائل میں دیرینہ اور باا ثر سمجھی گئی ہیں اور جو پنجاب کے نامور ادیب سر عبدالقادر مدظلہ سے شروع ہو کر آج شمالی ہند کے شہرۂ آفاق سخن ور حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ادارت میں اردو کی گراں بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:

> "ہمارے پیارے دوست ملا رموزی صاحب کے متعلق جن کو لوگ از راہ عقیدت "قبلہ" بھی لکھ دیتے ہیں، یہ خیال کیا جاتا ہوگا کہ وہ جس طرح خیالات رائے اور تحریر میں پختہ ہیں اسی طرح عمر میں بھی پختہ ہوں گے اور ان کی عمر کم از کم ستر دو بہتر برس تو ضرور ہوگی۔ ان کی لمبی سی داڑھی ہوگی، جسے دیکھنے والے نورانی کہتے ہوں گے۔ ان کی بیگم صاحبہ جن کے لیے ملا صاحب اپنی تحریروں میں صرف "وہ" کے اشارے سے کام لینے کے عادی ہیں، ان سے دو تین سال ہی کمسن ہوں گی اور ان کے بڑے لڑکے دو دو تین تین ننھے میاؤں کے ابا جان کہلاتے ہوں گے وغیرہ۔
>
> ان خیالات کا سبب ظاہر ہے۔ حضرت ملا رموزی صاحب ہمیشہ اپنی تحریروں میں ایک "ننھے میاں" اور "وہ" کا تذکرہ بڑے اہتمام سے کرتے رہتے ہیں اور ایسا لکھتے ہوئے انھیں مدت گزر گئی ہے۔ بدیں وجہ لوگ اگر انھیں ایسا بوڑھا سمجھیں تو کچھ عجب نہیں جس کے بال سفید ہو چکے ہوں، جس کی کمر بار علم سے خمیدہ ہو گئی ہو، جو دانتوں سے محروم ہونے کی وجہ سے پان بھی "پن کٹی" میں کوٹ کر کھاتا ہو، نا س کی ڈبیا تعویذ کی طرح ساتھ رہتی ہو اور بھلے لوگ جس کی عزت کرتے ہوں، محلے کے لڑکے لڑکیاں جسے دیکھ کر اپنے کھلونے چھوڑ کر بھاگ جاتے ہوں گے۔
>
> مگر لاریب کہ ملا رموزی ایک مشاق ادیب ہیں۔ ایسے ادیب کہ شاید ایک خاص رنگ میں ان کا کوئی بھی حریف نہیں ہے۔ "فاضل الٰہیات" ہیں، زمانہ کے سرد و گرم

سے بھی واقف ہیں، اس لیے لوگ بے چارے اگر انھیں سن رسیدہ سمجھیں تو بے جانہیں، اس لیے ہم ایسے لوگوں کے خیالات وقیاسات کی تردید تو نہیں کرتے البتہ ان کی عمر کے صحیح اندازہ کے لیے ایک تازہ خبر ضرور درج کیے دیتے ہیں اور وہ خبر یہ ہے کہ ملا رموزی صاحب کی شادی کتخدائی عنقریب ہونے والی ہے اور یہ ملا صاحب کی پہلی شادی ہے اور اس میں شرکت کی دعوت ہمیں بھی دی گئی ہے، اس لیے اب ملا صاحب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات خود اندازہ لگالیں کہ ممدوح کی عمر کیا ہوگی؟ ہم ملا صاحب کو شادی کی مبارکباد پیشگی عرض کیے دیتے ہیں باقی 'اُن' کے آنے پر"۔

ادبا گرامی اور اخبارات کے ان خیالات کے بعد پُر لطف بات یہ تھی کہ ہمارے بعض اخباری بھائیوں کو اس بات کا علم نہ تھا کہ ہماری شادی کا معاملہ "نکاح" تک بڑھ کر رُک گیا ہے اور ابھی اس ادبی مہم کے سر کرنے کے ہمیں چند "عورتانہ لشکروں" کو اور شکست دینا ہے اور چونکہ اخبارات اور رسائل میں علاوہ ملازمت کے چودہ برس کا طویل زمانہ بھی گزر گیا ہے اس لیے اس محترم اور ذی علم طبقے میں ملا رموزی صاحب کے تعلقات "پرائیویٹ" تک پہنچ چکے ہیں، جن کا نمایاں ثبوت اوپر کی بے تحاشا تحریریں ہیں اور ایسے ہی برادرانہ تعلقات کے ثبوت کے لیے ہم نے تمام اخبارات کی عبارتیں لفظ لفظ نقل کر دیں۔ پس اس سلسلہ میں ہمارے نکاحی پرائیویٹ سکریٹری نے بھول کر محترم ایڈیٹر صاحب کو ہماری شادی کا اذن بھی نہیں بھیجا تھا، اس لیے ہمارے اُن کے درمیان جو "شادیانہ نوک جھونک" ہوئی، اس میں فاضل ایڈیٹر اخبار 'مدینہ' نے 9 جولائی 1929 کو ایک ایسا پُر کیف مگر بے حد معنی آفریں مضمون شائع کیا جسے اہم اس لیے نقل کرتے ہیں کہ شادی میں "رخصتی" یا "وداع" کی تقریب میں تاخیر کے وہ دلائل بھی واضح ہو جاتے ہیں جو عورتوں کی جہالت اور توہم کو ظاہر کرتے ہیں اور جن سے بچنا ہر ذی علم شادی کرنے والے کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ مضمون مذکورہ بالا یہ ہے:

"ملا رموزی صاحب کی شادی ہوگئی، لیکن وہ پھر بھی تنہا ہیں۔ یہ انجام ہر اس شخص کا ہونا چاہیے جو اپنی برادری کو اس قسم کے مواقع مسرت میں فراموش کر دیتا ہے۔ یہ تو

ظاہر ہے کہ ہم ملا صاحب کی تقریب میں اتنی دور شرکت کے لیے نہیں جاسکتے تھے اور وہ بھی ملا صاحب کی خشک رسم مناکحت میں۔ ہاں اپنی شادی ہوتی تو ہم راس کماری تک بھی بگٹٹ بھاگے چلے جاتے، لیکن اس ثواب بے لذت کے لیے "بی صحافت" سے کیسے جدا ہوتے؟ چونکہ ملا صاحب نے ہمیں یاد نہیں کیا اس لیے وہ بھی اب تک یکتا ہیں اور ان کے حریم آرزو کے سامنے دوئی کے پردے نہیں ڈالے جاسکتے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بقول ملا صاحب "ننھے میاں کی والدہ" ابھی انھی کے گھر ہیں رخصتی نہیں ہوئی۔ عورتیں کہتی ہیں کہ یہ محرم کا مہینہ ہے، اس لیے اس میں رخصتی نہیں ہوسکتی اور اگلا مہینہ صفر کا ہے۔ صفر خالی ہوتا ہے، اس لیے وہ بھی موزوں نہیں۔ اس سے اگلے مہینے کو کہہ دیں گے ربیع الاول ہے، اس میں حضور صلعم کی وفات ہوئی ہے اس لیے تقریب مسرت کے لیے وہ بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ پھر ربیع الثانی آجائے گا۔ اس کا تلفظ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ربیع رُبع سے ہے، ثانی کے معنی دوسرا، یہ دوچار اور چار دوخوفناک ہے، پھر جمادی الاول اور جمادی الثانی آئیں گے۔ ان ناموں میں "جمود" کے مشتقات پائے جاتے ہیں۔ "رخصتی سیالیت" کو چاہتی ہے اس لیے ان میں بھی یہ رسم نہیں ہونی چاہیے۔ رجب و شعبان میں کہہ دیں گے اوئی معراج شریف اور شب برأت کے مہینوں میں بھی کوئی اپنی بیٹی کو گھر سے نکالتا ہے۔ پھر رمضان شریف آجائے گا اس میں خود ملا صاحب رخصتی کو پسند نہیں فرمائیں گے۔ شوال کا مہینہ خدا کی قسم اس کے پڑھنے سے "بہتوں کا بھلا ہوگا" میں گزر جائے گا اور رمضان کی تلافی میں بسر ہوگا۔ ذوالقعدہ اور ذی الحجہ شہر حرام میں داخل ہیں، اس لیے رخصتی مناسب نہیں۔ لیجیے محرم آگیا جو ماتم کا مہینہ ہے۔ لاحول ولاقوۃ اس میں تو تقریب مسرت کا نام بھی نہیں لینا چاہیے۔ الغرض بقول ذوق:

القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یاں سے
دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

بات اصل میں یہ ہے کہ ملا صاحب ظریف ہیں، وہ سب کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اس لیے قدرت ان کے ساتھ بھی مذاق کرتی ہے۔ ''شیر آیا دوڑنا'' کا قصہ سنا ہوگا، ملا صاحب ''ننھے میاں کی والدہ'' کے تذکرے سے دنیا کو مغالطہ دیا کرتے تھے، اب خود مغالطہ میں مبتلا ہیں۔

باقی رہا رسم رخصتی میں دعوت شرکت کا قصہ تو بھائی حضرت حفیظ ایڈیٹر رسالہ ''مخزن'' لاہور اور دوسرے ایڈیٹر اسے پسند کریں تو کریں راقم الحروف سے تو یہ ممکن نہیں۔ شادی تو رسوم کی ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے؟ سال چھ مہینے میں بچے پیدا ہوں گے۔ پھر عقیقہ، ختنہ، منگنی، بیاہ رخصتی کی رسوم آئیں گی۔ بقول حیرت مرحوم:

ابھی تو رسم کا ذربہ کھلا ہے

کہیے ملا صاحب کیسی رہی؟ اب مزے کیجیے یہ نتیجہ ہے عورتوں کے توہمات کی پیروی کا''۔

اس کے بعد ہم نے ''عورت ذاتوں'' کی رسموں اور خلاف شرع عقائد پر پھر ایک خط ایڈیٹر صاحب ''مدینہ'' کو لکھا جو علاوہ متانت کے دوستانہ چھیڑ چھاڑ کے پُرلطف اشاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس پر اخبار ''مدینہ'' بجنور نے اپنی اشاعت مورخہ 21 جولائی 1929 کے صفحہ 3، کالم 2 پر جو کچھ لکھا اگرچہ وہ بھی دوستانہ بے تکلفی کا ایک دلنواز جواب ہے، لیکن اس جواب میں عورتوں کے سراسر خلاف شرع عقائد کی پختگی کا رنگ نمایاں ہے اور مسلمان عورتوں کے جن عقائد اور خلاف اسلام ذہنیت کا رنگ ایڈیٹر صاحب اخبار ''مدینہ'' کے اس جواب میں ثابت ہے۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ ہماری عورتوں میں باطل اور سراسر بے ہودہ عقائد اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ ان سے تعلیم یافتہ مرد بھی واقف اور متاثر ہے۔ چنانچہ مذکورہ اخبار میں یہ عبارت موجود ہے کہ کہ:

''ملا رموزی صاحب کا خط آیا ہے ''رخصتی'' کی دعوت لایا ہے، لیکن کوئی تاریخ اب بھی مقرر نہیں ہے، یعنی معاملہ ابھی زیرِ غور ہے اور شرکت کرنے والوں کو کچھ علم نہیں کہ رخصتی کب ہوگی اور ملا صاحب کی خانہ آبادی کب ہوگی؟

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ''عورت ذاتوں'' کے توہمات کا ہم نے قلع قمع کر دیا ہے یعنی

بجائے قمری مہینوں میں جنھیں علی گڑھ والے ہندستانی مہینے کہتے ہیں، شادی کرنے کے لیے ہم نے انگریزی مہینے کو اس تقریب کے لیے پسند کیا ہے۔ چنانچہ نکاح 7 جون 1929 کو ہوا ہے تو "رخصتی" بھی کسی انگریزی مہینے میں ہوگی۔

خیال تو بالکل صحیح ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ عورت ذاتوں کو اس کا یقین کون دلائے گا کہ یہ صفر کا مہینہ نہیں جولائی کا مہینہ ہے۔ وہ تو کہیں گی کہ موئے فرنگیوں کے مہینے جائیں بھاڑ میں ہم تو رخصتی اسلامی مہینوں میں کریں گے۔

بہرحال خدا کرے جلد رخصتی ہو جائے۔ ملا صاحب کی تنہائی کا تصور کرتے کرتے خود ہمیں وحشت ہونے لگی ہے۔ ہم نے لکھا تھا کہ ملا صاحب تو "اُن" کو لے کر گھر میں داخل ہو جائیں گے اور ہم کیا کریں گے، اس پر ملا صاحب نے لکھا ہے ہم بھی اپنی "اُن" کو اپنے ساتھ لے جائیں، تنہا کیوں جائیں۔ تجویز تو معقول ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل ہم بھی اپنی "اُن" سے کوسوں دور بیٹھے غزلیں پڑھ رہے ہیں، ان کو وہاں سے لانا اور ملا صاحب کے گھر لے جانا ملا صاحب کی رخصتی سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ بہرحال دعوت کا شکریہ۔ اب جو ہمیں دعوت دی ہے تو رخصتی بھی ہو جائے گی انشاء اللہ"۔

ان حالات کے بعد ہماری شادی کا معاملہ اخبارات میں اتنا بڑھا اتنا بڑھا کہ روکنا محال ہو گیا۔ دوستوں کو بدگمانی تھی کہ اب ملا صاحب فرضی "ننھے میاں کی والدہ" کے نام سے عام مسلمان عورتوں کے اخلاق یا کردار پر کچھ لکھنے گھبرائیں گے اور اس وقت ہم ملا صاحب پر طعن کریں گے کہ "بس ملا صاحب" مگر یہاں تو نہ کوئی "ننھے میاں کی والدہ" تھیں نہ "ننھے میاں"۔ ہمارے سامنے تو قوم و ملت کی بہنوں اور عام مسلمان بھائیوں کی اخلاقی ازدواجی اور معاشرتی اعلان ایسا مبارک اور ضروری تھا۔ اس لیے بعد تقریب نکاح ہم نے پھر اسی زنانے اور بیبا کی سے لکھنا جو شروع کر دیا تو ہماری اس بیبا کی اور جرأت پر سب سے پہلے آٹھ کروڑ اسلامیان ہند کے سب سے بلند اخبار "زمیندار" لاہور نے اپنی اشاعت مورخہ 14 جولائی 1929 کے صفحہ 3 کالم 4 پر یوں اظہار حیرت کیا:

"آج ملا صاحب پھر یاد آ گئے۔ ملا جی نوواردانِ بساطِ ہوائے دل میں سے ہیں۔
نئی نئی شادی ہوئی ہے مگر آپ نے غضب ہی کیا ہے کہ ابھی سے اپنی متاہل زندگی کے
تجربات بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اب اگر آپ کی یہ فاش گوئی "انھیں" پسند نہ آئی
اور "انھوں" نے ارادہ کرلیا کہ ملا جی سے لڑ جھگڑ کر گھر کی چار دیواری میں "سوراج"
حاصل کرنے کا تو پھر ملا صاحب کیا کریں گے"۔

جریدۂ مذکور اور اسی قسم کے بے شمار احباب کے خیالات کا جو آخری جواب ہم نے مجلّہ علیہ
"صوفی" گجرات میں شائع کیا، اُسے اس پرچہ کی اشاعت بابت ماہ اگست 1929 کے صفحہ 9 سے
یہاں نقل کرتے ہیں جو یہ ہے:

"اب اخبارات اور احباب میں یہ سوال پیش ہے کہ آیا ملا صاحب اب بھی اسی
انہماک اور صفائی سے مضامین لکھتے رہیں گے جس طرح وہ اب تک لکھتے رہے؟
سو اس کا جواب یہ ہے کہ اماں مضامین کے معاملہ میں ملا رموزی صاحب چھ کروڑ
انگریز بھائیوں سے جب نہ گھبرائے تو یہ تو ہیں ننھے میاں کی ایک ہی والدہ اور پھر وہ
بھی ہمارے ہی ننھے میاں کی والدہ پھر ہم انھیں کیا خاطر میں لا سکتے ہیں۔ آپ
مطمئن رہیے کیونکہ:

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشت من

◆◆◆

بارات

شادی بیاہ کے تمام حالات، رسوم اور ضوابط میں تقریب بارات یا رسمِ بارات دولہا دُلہن کے خاندان کے لیے نہایت اور ''بہت ہی نہایت'' نقصان رساں رسم ہے۔ اس میں مالی تباہی اور فضول خرچی کے جو المناک مناظر سامنے آتے ہیں، انھیں کوئی ذی ہوش اور صاحبِ عقل انسان برداشت نہیں کرسکتا۔ علاوہ اس تباہی کے وقت کی تباہی اور دماغی بدحواسی مزید ہے۔

جہالت، بے خبری، شرعی ناواقفیت کے سوا، خاندانی غرور، خود پسندی، خودنمائی اور شہرت کے برباد کن اثر کے تحت لڑکی والے اس موقع پر زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں اور لڑکی کو رخصت کرتے وقت وہ جس قدر دولت برباد کرتے ہیں، اس کا جواب اگر کفار و مشرکین ہی ہوتو ہو مگر مسلمان ایسی حکیم اور مصلح قوم میں تو کبھی جائز نہیں تھا لیکن آج یہ مصلح قوم ہی اپنی جہالت کے باعث دوسروں سے اصلاح کی طالب ہے۔ چنانچہ ملا رموزی کی شادی کے متعدد پیغامات کے سلسلے میں ایسے اجہل اور کوردماغ خاندان ہی ملے ہیں جنھوں نے لڑکی بیاہنے کی جاہلانہ شرطوں میں ایک شرط یہ بھی قرار دی تھی کہ بارات بے حد دھوم دھوم سے لائی جائے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر بارات دھوم دھام سے نہ لائی جائے تو لڑکی عمر بھر نہ بیاہی جائے گی اور اس طرح بے زبان لڑکی کی عمر تباہ ہوتی رہے گی۔ چنانچہ ملا رموزی اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر لکھتے ہیں کہ ایک جگہ سے تمام شرطیں پوری کردینے پر صرف بارات دھوم سے نہ لے جانے کی بنا پر شادی سے صاف انکار کردیا گیا اور کوئی پروانہ کی گئی کہ اس سے لڑکی کی زندگی پر کیا اثر پڑے گا؟ اگرچہ یہ بدنصیب مسلمان

آئے دن ایسے اعمال کا نتیجہ ''کوتوالیوں'' میں دیکھتے رہتے ہیں، مگر غلامی اور جہالت کے اثرات کو کم نہیں کرتے۔

پس ناظرین کی خوش قسمتی سے ہماری بارات کے لیے بھی ایسا ہی کچھ یا اس سے قریب قریب ہی اہتمام کیا گیا۔ بارات کے تکلفات میں اگر کہیں کا بادشاہ بھی ناچتا ہوا جائے تب بھی کم ہی سمجھا جاتا ہے اور نہ اسے توہین کی بات سمجھا جاتا یا سمجھی جاتی۔ بارات میں سب سے ضروری اور قابلِ توجہ رکن ''رنڈی'' ہے۔ کوئی دریافت کرے کہ ''رنڈی'' ہی اگر کوئی بڑی بھاری چیز ہے تو پھر سب سے بڑی بارات تو وہ ہوسکتی ہے جس میں بجائے معزز شرکاء کے بس رنڈیاں ہی رنڈیاں شرکت فرمائیں کیونکہ ہر چیز کی کثرت ہی جاذبِ نظر اور قابلِ ذکر ہوا کرتی ہے۔

غرض امیروں اور مالداروں کی بارات کے تکلفات ناقابلِ احاطہ ہیں۔ ان کے بارات میں پلٹنیں، رسالے، رجمنٹیں، توپ خانے اور ہوائی جہاز بھی ناچتے جائیں تو کم ہے۔ باجوں کی کثرت، آتش بازی، باغ بہاری، مٹھائی کے خوان، ہاتھی، گھوڑے، موٹر کاریں، بگھیاں اور اونٹ چھوڑ کر قسم کی سواریوں کی جتنی کثرت ہو، اتنی ہی بارات شاندار سمجھی جاتی ہے۔ روشنی میں اگر تمام دنیا کی بندرگاہوں کے روشنی والے مینار جمع کر دیے جائیں تب بھی کم۔ ایسی شاندار بارات لڑکے اور لڑکی کی پہلی شادی میں از بس کہ لازم ولابد ہے۔ بیوہ عورتوں کی شادی میں ضروری نہیں۔ گویا بیوہ ہو جانے کے بعد لڑکی عورت نہیں رہتی، مگر ملا رموزی کے خیال میں جس خاندان میں جہالت، بے خبری اور بے وقوفی زیادہ ہو اس کے ہاں کی بارات بھی اتنی ہی شاندار ہوگی۔

کہیں کہیں محض جماعتی مذاق اور رواج کے جاہلانہ اثر سے بھی بارات کو شاندار بنانا پڑتا ہے، مگر الحمدللہ کچھ دن سے علم و تعلیم کی قدرے ترقی نے ان غلط کاریوں کا انسداد و احساس بھی پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ 3 جنوری 1930 کے اخبار ''انقلاب'' لاہور میں ایک اعلان شائع ہوا ہے کہ امرتسر کے مشہور مسلمان رہنما حضرت شیخ صادق حسن صاحب بیرسٹر نے تہیہ کیا ہے کہ مسلمانوں کو شادی بیاہ کی فضول رسموں کے عذاب سے نجات دلانے کے لیے وہ انتہائی جدوجہد کا آغاز فرمانے والے ہیں اور اس کا سلسلہ خود انھوں نے اپنے ہاں کی شادی سے شروع کیا ہے۔

بارے ہماری بارات کے موقع پر ہمارے خاندان کے خیالات ان اثرات میں ڈوبے

ہوئے تھے اور اسی لیے وہ انجام سے بے خبر ہو کر رہ گئے۔ خیالات یہ تھے:

1۔ ملا رموزی سارے قبیلہ میں علم و فضل کے لحاظ سے ممتاز ہے۔

2۔ ملا رموزی سارے ہندستان کی آنکھ کا تارا ہے۔

3۔ ملا رموزی اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد ہے۔

4۔ ملا رموزی رئیسوں اور نوابوں کا وزیر اعظم ہے۔

5۔ ملا رموزی کے ساتھ خدا کا فضل اور رؤسا کی سرپرستی ہے۔

6۔ ملا رموزی کے سارے دوست پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔

7۔ ملا رموزی کے تمام ارمان اس کے ضعیف العمر والدین کو دیکھنا ہے۔

8۔ ملا رموزی کے حاسد، دشمن اور منافق دوست بھی کافی ہیں۔ اس لیے انھیں طعنہ زنی کا کوئی موقع نہ ملنے پائے اور وہ جل کر خاک بھی ہو جائیں۔

9۔ اور یہ کتنی بڑی دولت ہے کہ سارے شہر میں نام ہو جائے گا وغیرہ۔

اِن خیالات میں ہمارا ذاتی نقطۂ عمل وہی تھا جو ہمارے ذوق اور ہماری مصلحانہ اخبار نویسی سے نسبت رکھتا ہے۔ پھر یہ کہ قدر دانی کے متعلق بھی ہمیں پتہ تھا کہ ہماری قدر کیوں کر ہے، کتنی ہے اور کس جذبے کے تحت ہے؟ اس لیے بھی اور اس لیے بھی کہ جب ہم خود ساری دنیا کے مصلح بنے ہوئے ہیں تو پھر خود ہماری بارات میں فضولیوں اور فضول خرچیوں کا ہونا کہاں تک قابلِ حیرت و ملامت فعل نہیں؟ اس لیے ہم نے اصولِ شریعت سے لے کر منطق، فلسفے، علم البیان، علم التاریخ، علم المعاش، علم المعیشت، ریاضی، جغرافیے، سائنس، ڈاکٹری، بیرسٹری، تعزیراتِ ہند۔ پھر راہ نجات، تنبیہ الغافلین، پند نامہ فرید الدین عطار اور تو اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک ایک کتاب سے ثابت کیا کہ اگر ہماری بارات کو "شاندار" بتایا گیا تو جہنم واصل ہو جاؤ گے اور کتاب ہذا کے تالیفی منصف اور قومی خدمت کی دیانت کو باقی رکھنے کے لیے ہم آزادیٔ حلف مذہبی لکھتے ہیں کہ ہم نے اپنی بساط بھر اس قسم کی فضولیوں اور فضول خرچیوں کی روک تھام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن ہماری کوششوں کو جس ایک چیز نے شکست دیا وہ یہ کہ ہمارے خاندان کے افراد کی تربیت اور ذہنیت وہ کبھی نہیں ہو سکتی جو خود ہماری ہے، اس لیے ہماری اصلاحی گزارشوں کا

زیادہ حصہ تو خاندان کی اس فرسودہ ذہنیت نے ہضم کر لیا اور جو کچھ باقی رہا تھا اسے اپنی والدہ اور بیوہ بہن کی محبت اور ان کے ارمانوں پر نثار کر دیا۔ یعنی حضرت محترمہ والدہ اور عزیزہ ہمشیرہ چونکہ آخر وقت تک دھوم دھام کی بارات کی آرزو مند تھیں اور ہماری زیادہ مخالفت سے وہ اس لیے دل گرفتہ اور افسردہ ہوئی جاتی تھیں کہ وہ ہماری رضامندی بغیر خود کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ اس لیے ہم سے بر بنائے انسانیت ان کی دل شکنی برداشت نہ ہوئی اور ہم نے دھوم دھام پر رضامندی ظاہر کر دی، لیکن ہماری کسی فضول رسم کے لیے رضامندی حقیقت میں ہماری مصلحانہ مضمون نگاری کی دیانت کے خلاف ایک فعل ہے اس لیے اسے ہم خود ہی قومی خیانت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ہم قوم سے عذر خواہ اور شرمندہ بھی ہیں اور یہی فرض ہر اس شخص کا جو قومی لیڈر ہو یا مصلح، یہ نہیں کہ قوم کے سامنے تو وعظ کہا صبر و جفاکشی اختیار کرنے کا اور مریدوں سے ہزاروں روپیہ نذرانے کے وصول کر لیے اور مضمون میں لکھ دیا کہ بس ریاضت کی وجہ سے آٹھ پہر میں صرف چائے کی ایک پیالی پیتا ہوں اور دن بھر تہجد کی نماز پڑھا کرتا ہوں۔

اب ان مصارف کے لیے نہ پوچھیے کہ والد قبلہ مدظلہ اور خود ہماری روح دماغ اور عقل کو ہزار طرح سے جلا دینے والی تدابیر سے جمع کیا ہوا روپیہ کس طرح خرچ ہوا ہے؟ اور ہماری وہی دولت جو ہم نے اپنے دماغ اور روح کی برتر از کائنات اور لائق صد احترام کیفیات احساس اور اشرف و اعلیٰ قوموں کو برباد کر کے حاصل کی تھی آج شریعت مطہرۂ اسلامیہ سے بے خبری یا دل و دماغ اور نفس کی طاقت سے مرعوب ہو کر پانی کی طرح بہائی جانے لگی۔ جس کے لیے 27 ستمبر 1929 کی تاریخ مقرر ہوئی اور گھر میں ''مشیرانِ شادی'' کے اجلاس شروع ہوئے۔ ہر روز نئی نئی اصلاحیں اور تدابیر پیش ہونے لگیں۔ نئے نئے سلیقوں سے مکان کی آرائش شروع ہوئی اور عجیب عجیب قسم کے زیور تیار ہونے لگے۔ ہم نے کسی کی کوئی مخالفت کی تو میدانِ جنگ کا منظر بن گیا۔ خدا جانے کے من شکر، کے من خشک میوہ اور کئی لاکھ جوڑوں کا کپڑا آنا شروع ہوا۔ بقالوں اور دکانداروں نے جو موقع پایا تو چڑھ دوڑے وہ ہمارے مکان پر اشیاء خرید و فروخت کے انبار لے کر، پھر خدا جو کسی عورت کے سامنے کوئی خریدنے والی چیز بھیج دے تو وہ کب کسر اٹھا رکھتی ہے اس کے خریدنے میں؟ اس لیے شادی کی آخر تاریخ تک بس ہمارا مکان کیا تھا خاصی تجارتی منڈی

بنا ہوا تھا اور والدہ صاحبہ کے ذمہ بس اتنا کام تھا کہ جس نے جتنے نوٹ مانگے حوالے کر دیے اور جس نے جتنے روپے مانگے دے دیے۔ ہمارے ذمہ صرف اتنا کام تھا کہ جسے روپیہ خرچ کرتے دیکھا اسے دل میں بے وقوف کہا اور ادھر سے اُدھر چلے گئے۔

القصہ بارات کی تیاریاں شروع ہوئی گویا از سر نو ایک اور شادی ہونے والی ہے۔ ہر کام، ہر بات اور ہر خرچ میں وہی ابتدائی پن تھا جو منگنی اور نکاح میں دیکھا گیا تھا۔ کپڑوں سے لے کر فرش تک میں انقلاب اور تبدیلی اس لیے جائز اور ضروری قرار دی گئی تھی کہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ ملا رموزی صاحب کے پاس بس اس ایک چیز کے سوا دوسری چیز ہی نہیں اس لیے معلوم ایسا ہوتا تھا گویا ابھی نکاح تک نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ نکاح اس سے بھی زیادہ دھوم سے ہو چکا تھا۔ اب تو فقط رخصتی باقی تھی اور ہاں ولیمہ۔

سب سے پہلے جو مشاورتی اجلاس منعقد ہوا اور جس میں بڑی گرم بحث ہوئی وہ ''رنڈی'' سے متعلق تھی۔ اس ''رنڈی'' کے انتخاب کے متعلق بے حد اختلاف تھا اس لیے کہ منتخب کرنے والے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ احباب کے نمائندوں کا مطالبہ تھا کہ ''رنڈی'' لائی جائے لکھنؤ سے مگر ان میں بھی اختلاف تھا۔ ایک کا خیال تھا کہ مثل تو یوں مشہور ہے کہ ''رنڈیوں میں رنڈی اکبر آباد کی رنڈی'' یعنی اُس شہر آگرہ کی رنڈی جس میں سیماب شاعر پیدا ہوئے ہیں اور ان کی شاعری میں جو رنڈی پن پایا جاتا ہے وہ لاجواب ہے، اس لیے آگرہ ہی کی رنڈی زیادہ بہتر ہوگی۔ اعزہ کے نمائندوں کا مطالبہ تھا کہ رنڈی چاہے علی گڑھ سے لائی جائے مگر گانے میں یکتائے روزگار ہو۔ مقامی عوام کا مطالبہ تھا کہ ''حسین رنڈی ہو تو محفل میں بیٹھنے کو بھی چاہے خالی اچھا گانے میں کیا مزہ؟ اس ''رنڈیانہ کانفرنس'' میں دُلہن والوں کے نمائندوں کا مطالبہ تھا کہ ان کے شہر کی رنڈی مسماۃ چتا جان'' کا پس اس ہنگامہ خیز کانفرنس میں ہم نے بحیثیت صدر فیصلہ صادر کیا ایک ایسی مقامی رنڈی کے حق میں جس کی اجرت مبلغ 30 روپیہ تھی۔ مزاجی لحاظ سے اگر چہ اسے بیماری کی حالت میں نہیں چھوڑتی لیکن جلا ہوں کو خوش کرنے کے لیے وہ تندرست رہتی ہے اور نظری حساب سے ایسی بہت بری بھی نہیں ہے، لیکن واضح ہو کہ بظاہر معاملہ طے کیا جاتا ہے ایک رنڈی کے مصارف کا لیکن اصل میں میں تو اضع کی جاتی ہے ایک درجن رنڈیوں کی اور وہ اس طرح کہ

ہر رنڈی کے ساتھ ایک بوڑھی سی والدہ ہوتی ہیں جو اس رنڈی کے ناچ گانے میں اس کے پیچھے لحاف اوڑھے بیٹھی کھانستی رہتی ہیں۔ ایک عورت رنڈی کے بچے کو گود میں لیے رہتی ہے اور ہر نصف گھنٹے کے بعد اس بچہ کو دودھ پلانے کے بہانے سے گانے والی رنڈی کے حوالے کر دیتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح رنڈی گانے اور ناچنے کی مصیبت سے محفوظ رہے اور رات بچہ کے دودھ پلانے ہی میں کٹ جائے۔ اس کے بعد ایک عورت یا لڑکا رنڈی کے "پاندان" اور "خاصدان" کا محافظ ہوتا ہے۔ دو سارنگی بجانے والے اور ایک طبلہ بجانے والا جس کا نام ہمیں یاد نہیں۔ پھر ان سب پر ایک "استاد جی" مزید ہوا کرتے ہیں جو رنڈی کی ہر حرکت پر گردن ہلا کر داد عطا فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ استاد جی کی داد پر ساری محفل بھی داد عطا فرمائے۔ ایک عورت رنڈی کے جوتے اور کپڑے سنبھالنے والی ہوتی ہے۔ اِدھر رنڈی کا یہ قافلہ ہوتا ہے جس کے لیے سواری اور پان سگریٹ کا برابر برابر حساب رکھنا پڑتا ہے۔ اُدھر تواضع کرنے والوں کی ایک جماعت ہوتی ہے جو رنڈی کو اپنے ہاں کا ڈپٹی کلکٹر سمجھتی ہے اور رنڈی کو محفل میں اس شان اور اعزاز سے رکھتی ہے گویا رنڈی کیا ہے ساری محفل کی سردار ہے۔ ایسے لوگ بھی محفل میں تشریف لاتے ہیں جو رنڈی سے بھری محفل میں بات کر لینا خان بہادری کے خطاب کے برابر سمجھتے ہیں اور ایسے بھی جو محفل میں رنڈی کے دست اقدس سے پان کھا لینا عزت سمجھتے ہیں اپنے خاندان کی، ایسے لوگوں کے ذوق اور ذہنیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستانی مجلسی ذہنیت میں ابھی خاصا گنوار پن باقی ہے۔ اب نازک سا سوال باقی تھا ایک ایسی "جماعت عاملہ" کے انتخاب کا جو رنڈی کے گھر جا کر رنڈی کو ہماری بارات میں شرکت کا معاملہ پیش کرے۔ ان مواقع پر اکثر ایسے لوگ بھیجے جاتے ہیں جو نسلاً نہ سہی تو "مشقاً" رنڈی شناس، رنڈی دان اور "رنڈی گاہ" ہوں، لیکن ہم نے ایسی "مجلسِ عاملہ" کے لیے ایک حکیمانہ طریقہ یہ اختیار کیا کہ ایک ایسے بزرگ کو اس کام کے لیے منتخب کیا جو رنڈی کی صورت سے یوں بیزار کہ اگر کبھی راستہ میں کوئی رنڈی انھیں سلام کرے تو یہ جوتا ہی اتار کر ماردیں، مگر جواب کبھی نہ دیں۔ ان بزرگ کے انتخاب سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ یہ رنڈی کی خوشامد اور اس کے پُرفریب رنگ و رُخ کو خاطر میں نہ لائیں گے اور اس لیے قیمت جو دیں گے وہ نہایت کم کیونکہ ایسوں کو رنڈی کے ناز نخرہ سے کیا تعلق؟ مگر وہ جو کہا ہے کہ "چاہ کندرا

چاہ در پیش'' تو نقصان تو چاہا تھا رنڈی کا مگر ان بزرگ کو اس خدمت پر مقرر کر کے بقدر دس روپیہ الٹا نقصان اٹھا بیٹھے ہم خود۔

یہ رنڈی لانے والے بزرگ ہمارے محترم دوست حضرت عبدالہادی انصاری مدظلہ العالی تھے جو مزاج اور عقائد کے نہایت سخت قسم کے مولوی ہیں اور ان کا ذوق صرف نماز پڑھنے اور ڈنر پیلنے کے لیے خاص ہو چکا ہے۔ ملا رموزی کے دوست ہیں اس لیے بحث و مباحثہ میں منطق اور فلسفہ سے کبھی نیچے نہیں اترتے، اس لیے بڑی آن بان سے رنڈی سے معاملہ طے فرمانے لگے اور بحث و جرح کے لیے راستہ بھر دلائل اور نہایت عالمانہ غور و خوض میں ڈوبے ہوئے پہنچے رنڈی کے ''روبرو''۔ نتیجہ یہ کہ اس کی مقررہ فیس سے 10 روپیہ زیادہ اس لیے دے آئے کہ رنڈی بہر حال رنڈی ہوتی ہے اور ایک عالم فاضل آدمی پھر عالم فاضل، اس لیے آپ نے دلائل پیش کیے خالص عالمانہ اور اُدھر سے چالیں چلی گئیں خاصی رنڈیانہ۔ نتیجہ یہ کہ حضرت ہادی مدظلہ یوں ٹپٹائے کہ جواب نہ بن آیا اور دس روپیہ زیادہ دے کر بڑی آن بان سے آ کر فرمایا کہ لیجیے وہ گھر پر کھڑے ہو کر گانے پر راضی نہیں ہوتی تھی مگر جناب میں نے کھڑے ہو کر گانے پر بھی راضی کر لیا مگر بہ سوال جرح فرمایا کہ ہاں دس روپیہ زیادہ تو دے آیا۔

رنڈی کے بعد مرتبہ ہے باجے کا۔ حالانکہ مسلمان جانتے ہیں کہ باجے کو ان کے مذہب نے ایک ''فضولی'' قرار دیا ہے اور کسی تقریب میں مسلمانوں کو جائز نہیں کہ وہ کسی ایسے فعل کو پسند کریں جسے ان کے دین نے لغو اور فضول کہا ہو۔ پھر جو شخص کسی چیز کو محض اس لیے برا سمجھے کہ اس سے خدائے عرش و فرش کی رضامندی اور سرکارِ دو عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل ہو گی تو ایسا شخص شریعت اسلامی کے لحاظ سے ایک مبارک اور قابلِ احترام شخص مانا جاتا ہے، لیکن باوصف اس علم و واقفیت کے ہمارے لیے محال تھا کہ ہم باجے کو روک دیں، اس لیے بس اظہار بیزاری کر کے اس معاملے کو دوسروں کے سپرد کر دیا۔ اب مثل مشہور ہے کہ ''باجے باجے میں فرق ہوتا ہے'' مثلاً ایک باجا وہ ہوتا ہے جو ہمارے اور آپ کے ننھے میاں دن بھر منہ سے بجاتے پھرتے ہیں اور بزرگ انھیں ڈانٹ کر کہتے ہیں ''کیوں شور کرتے ہو جاؤ گھر میں جا کر بجاؤ'' جب وہ گھر میں جا کر بجاتے ہیں تو عورتیں کہتی ہیں ''کیوں کان پھوڑتے ہو، پھینکو اس باجے کو''۔ ایک

باجاوہ ہوتا ہے جو محض مسلمانوں کا دل دکھانے کے لیے مسجدوں کے سامنے بجایا جاتا ہے، اس باجے کی آواز پر مسلمان لاٹھیاں لے کر مسجد کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں۔ اُدھر سے ہندو باجا بجاتے ہوئے گزرے کہ اُدھر سے ان کی کھوپڑیوں پر لاٹھیاں برسیں۔ نتیجہ یہ کہ باجا تو رہ جاتا ہے گھر میں یا دکان پر لٹکا ہوا اور کئی سو ہندو مسلمان یا جان سے مارے جاتے ہیں یا جیل خانے چلے جاتے ہیں اور ان کے بے شمار بیوی بچے مارے پھرتے ہیں خاک چھانتے۔ ایک باجاوہ ہوتا ہے جو آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر کے جلوس میں بجایا جاتا ہے اور جسے دیکھ کر اور سن کر انگریز بھائیوں کو بہت تاؤ آتا ہے، مگر قومی جوش میں ڈوبے ہوئے باجے والے بھی آج کے دن صدر کے جلوس میں اس طرح بجاتے ہیں گویا اب اس کے بعد قیامت تک بجایا ہی نہیں جائے گا۔ ایک باجا وہ ہوتا ہے جو میدانِ جنگ میں فوجیوں کے اندر جوش پیدا کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے اور اس باجا کو ملا رموزی صاحب بھی پسند کرتے ہیں۔ ایک باجاوہ ہوتا ہے جو ہندستانیوں پر رعب ڈالنے کے لیے کسی بڑے افسر کی تشریف آوری کے وقت ریلوے اسٹیشنوں پر ''گارڈ آف آنر'' کے نام سے بجایا جاتا ہے۔ ایک باجاوہ ہوتا ہے جو اپنے خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کے ہاں قوالی کے نام سے بجایا جاتا ہے اور جب تک یہ بجایا جاتا ہے اُس وقت تک اس کے سننے والوں پر ایسی شدید غفلت طاری رہتی ہے کہ اگر اس وقت ان کے گھر میں آگ لگ جانے کی خبر بھی ملے تو وہ باجا چھوڑ کر اٹھ نہ سکیں اس غفلت کا نام رکھا ہے ''وجد و کیف''۔ ایک باجاوہ ہوتا ہے جو اسلامیہ ہائی اسکولوں کے بورڈنگ ہاؤس میں بجائے کتابیں پڑھنے کے خود طلبا بجاتے ہیں، جسے ہارمونیم کہتے ہیں۔ ایک باجاوہ ہوتا ہے جو بقالوں اور مہاجنوں کی شادی بیاہ کے موقع پر کئی دن پہلے سے ان کے مکانوں پر بجایا جاتا ہے اور محلے کے لونڈے جمع ہو کر اسے سنتے رہتے ہیں اور آپس میں لڑتے بھی رہتے ہیں۔ ایک باجاوہ ہوتا ہے جو رعایا پر بادشاہ کا خوف اور دبدبہ بڑھانے کے لیے صبح ہی صبح بجایا جاتا ہے اور اسے ''نقارہ'' بھی کہتے ہیں۔ اس لیے اتنے باجوں کی موجودگی میں ہمارے لیے اس کا فیصلہ کرنا محال تھا کہ کون سا باجا منگایا جائے؟ ادھر انتظام کرنے والوں کے سامنے اس وقت غور و فکر کے عوض صرف نام و نمود کا جوش تھا لہٰذا طے پایا گیا کہ فوج کا سرکاری بینڈ بھی منگایا جائے اور شہر کا سب سے بڑا بینڈ بھی۔

باجوں کے بعد مرتبہ تھا ''روشنی'' کا بس یہاں صرف ایک کمی یہ تھی کہ ملا رموزی صاحب گورنمنٹ آف انڈیا کے وزیراعظم نہیں تھے ورنہ سارے ہندستان کے بجلی گھر تک ہماری بارات میں طلب کر لیے جاتے۔ تب بھی انتظام کرنے والوں کو شکایت ہی رہتی کہ روشنی کم ہے اس لیے طے کر دیا گیا کہ اس وقت دنیا میں نہیں تو اپنے ہاں جس قدر بجلی کے ''ہنڈے'' ملیں انھیں منگا لیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بجلی کے ہنڈے والے نے بھرے بازار میں چلا کر کہا کہ میری دکان سے جتنے ہنڈے ملا صاحب کی بارات میں گئے آج تک کسی دوسری بارات میں نہیں منگائے گئے۔ بجلی والے کے اس قول کو ہمارے منتظمین نے بہ طریق فخر ہمیں کوئی ایک ہزار مرتبہ سنایا، اس کے بعد فرش کا معاملہ تھا اور آج کل صرف زمین دوز فرش کو فرش نہیں کہا جاتا بلکہ انگریزی قوم کی وضع قطع سے کرسیوں، میزوں اور قالینوں کو لگا دینے اور بچھا دینے کو فرش کہا جاتا ہے اس لیے ایک بہت بڑا شامیانہ لگایا گیا۔ اس کے اندر بہترین فرش برے بڑے گدے تکیے تو لگائے گئے غریبوں کے لیے اور امیروں کے لیے کرسیاں تھیں اور میزیں بھی۔ اب معاملہ تھا ملا رموزی صاحب کے لیے باراتی سواری کا تو سوچا گیا کہ چونکہ ملا رموزی صاحب ہی ں مشہور و معروف آدمی۔ حکومت سے لے کر پولیس والوں تک کی نظر میں نہایت بلند مرتبہ آدمی سمجھے جاتے ہیں اس لیے اگر ملا صاحب کی سواری کے لیے بھی عوام کی طرح گھوڑا یا ہاتھی لایا گیا تو بات ہی کیا؟ اس لیے طے کیا گیا کہ ملا صاحب کی سواری کا موٹر کار پھولوں اور ہاروں سے یوں آراستہ کیا جائے کہ بس نئے وائسرائے کے آنے کا گمان ہو اور پھر فوقیت جتانے کے لیے دو ہاتھی بھی منگائے جائیں جو ملا صاحب کے موٹر کار کے پیچھے خادم بنے چلے آئیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان ہاتھیوں پر ملا صاحب کے بھائیوں کو سوار کر دیا جائے۔ پس یہ تین چار سو روپیہ برباد کرنے والی تیاریاں جب مکمل ہو گئیں تو ایک دل شکن اور ناقابلِ برداشت رسم ادا کی گئی اور وہ رسم تھی............

ہر شخص قائل ہے کہ دنیا میں بہن ایک عزیز از جان وجود ہے جس کی محبت کا کوئی بدل ہی نہیں۔ حقیقی معنی کی مونس، شفیق، ہمدرد، غمگسار۔ اگر ماں کے بعد کوئی ہے تو فقط بہن، پھر ایسی بہن کا کیا کہنا جو اپنے بھائی کے مقابل ذی علم بھی اور ذی حس بھی۔ ان دونوں میں وحدتِ خیال بھی ہو اور وحدتِ ذوق بھی۔ پھر ایسی بہن جو کبھی وقت، مال و دولت اور عیش و عشرت کی طرف سے

مستغنی بھی رہی ہو اور اس نے دنیوی فراغت اور تمول کے گھرانے میں زندگی بسر کی ہو کہ یکا یک اس کا عیش و فراغت سے بھرا ہوا گھر یوں برباد کر دیا جائے کہ وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جائے تو ایسی بے کس اور بے نصیب بہن کو جو صدمہ ہو سکتا ہے اس کا اندازہ صرف اس کا وہی بھائی کر سکتا ہے جو اس کے عیش اور خیالات سے بھی خود واقف رہا ہو۔ پس جو ملا رموزی کی شادی سے قبل اپنے شوہر کی زندگی میں رسم مہندی کا وہ عظیم الشان نظام بنایا کرتی تھیں کہ شاید مقامی حیثیت سے کوئی دوسرا اس کا جواب نہیں لا سکتا تھا، لیکن آج ان پر بیوگی کا پہاڑ ٹوٹ چکا ہے اور وہ اپنے خیال اور جذبہ کے لحاظ سے دنیا میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ صرف بدنصیب ملا رموزی ہی ان کی خدمت گزاری کے لیے باقی رہ گیا ہے ورنہ ان کی دنیا تو ختم کر دی گئی اور بری طرح ختم کر دی گئی۔ پس ان تاثرات کے ہوتے ہوئے ہمشیرہ موصوفہ کا یہ اصرار کہ وہ ملا رموزی کے لیے مہندی لائیں، ملا رموزی کے لیے جس درجہ ناقابل برداشت صدمہ ہو سکتا تھا اس کا اندازہ دل اور دل میں درد رکھنے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

ملا رموزی اپنی تعلیم کے زمانے میں جب لکھنؤ میں رہتے تھے تو انھوں نے ماہ محرم میں شیعہ بھائیوں کی وہ مہندی دیکھی تھی جو آٹھ محرم کی شب کو لکھنؤ میں نکالی جاتی ہے۔ اس مہندی کے ساتھ شہر کے معززین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص کی ایک بڑی تعداد ہوتی ہے مگر اس مجمع کے تاثر اور سوز و گداز کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جب اس مہندی کے اٹھانے والے یہ مصرع پورے درد بھرے لہجہ میں بہ آواز بلند پڑھتے ہیں کہ:

میرے قاسم کی آتی ہے مہندی

لکھنؤ کی یہ مہندی چونکہ چالیس کروڑ مسلمانوں کے دینی و دنیوی سردار حضور گرامی منزلت سیدنا امام حسین علیہ السلام اور ممدوح فلک پایگاہ کے مظلوم و شہید جگر گوشوں کی یادگار کے طرق پر اٹھائی جاتی ہے۔ ادھر مسلمان حضور عالم پناہ کے تمام دلگداز و دل شکن واقعات سے پہلے ہی سے خبردار ہوتے ہیں اس لیے اس مہندی کے مجمع میں مذکورہ بالا مصرع کا جو اثر ہوتا ہے حق یہ ہے کہ صبر وضبط کی بلند سے بلند قوت اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ چونکہ لکھنؤ کے اس مجمع کے عینی تاثرات ملا رموزی کے دماغ میں پہلے ہی سے محفوظ تھے اس لیے بیان نہیں کر سکتے صدمہ کی اُس شدت کو

جو اپنی بیوہ بہن کی اس رسم مہندی سے ہمیں پہنچی، مگر خدا توفیق دے مسلمانوں کو وہ پوری شدت اور سختی سے اپنی عورتوں کے خلاف شرع رسوم اور عقائد سے پاک کر دیں کہ ایسی رسمیں ہر حال میں نقصان رساں ہی ہوتی ہیں۔

آج بارات ہے۔ ساری دنیا میں شہرہ ہے کہ آج ملا رموزی صاحب کی بارات ہے اور چھمنا جان رنڈی کا ناچ بھی۔ پھر ایک جہالت زدہ جماعت کے لیے ایسی اطلاع جس درجہ بے خود بنا دینے والی اطلاع ہو سکتی ہے، آپ خود ہی اندازہ فرمالیجیے۔ خدا جانے کئی دن پہلے ہی سے مہمانوں کا دنگل ہو رہا تھا، گھر میں نہ تل دھرنے کو جگہ تھی نہ جگہ دھرنے کو تل۔ کالے، گورے، بھورے، سانولے، پیلے، چھوٹے بڑے، منجھلے غرض ہر قسم کے بچے مہمانوں کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ اِدھر شادی کے گھر کا اگر پتہ محلے کے بچوں کو بتا دیا جائے تو پھر انھیں باقاعدہ اذن کی ضرورت نہ بلاوے کی وہ خود اپنے سے چھوٹے بچوں کو گود میں لادے مکان کے دروازہ کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں۔ کھیلتے ہیں، شور کرتے ہیں، لڑتے ہیں اور اگر موقع مل جائے تو کوئی چیز بھی چُرا لے جاتے ہیں۔

گھر میں عورتوں کا ہنگامہ ان سے سوا۔ تین تین چار چار کی ٹولیاں بنائے بیٹھی ہیں اور ایک دوسری پر طعن، ملامت اور آوازے کس رہی ہیں۔ زیور اور کپڑوں کی نمائش کر رہی ہیں اور ان کی گودوں میں ایک ایک دو دو لونڈے اور لونڈیاں پڑی ہوئی ہیں۔ بعض جو انتظام میں مصروف ہیں، اس وقت ان کا غرور، غصہ، شور اور تاؤ اپنی حد سے گزر رہا ہے۔ غرض گھر کیا تھا خاصی شنواریوں کی باغیانہ شورش تھی۔

وسیع شامیانے کے نیچے غریب قسم کے شرکا جمع ہو رہے ہیں۔ ہمارے دونوں بھائیوں صادق صبحی اور ساجد فتحی نے بھی خلعتِ فاخرہ پہن لیا ہے۔ بھانجے صاحب حضرت خلیق عصمت کو بھی شاندار لباس پہنا دیا گیا ہے جو اپنے ساتھیوں کو بڑے غرور سے دکھاتے پھرتے ہیں۔ احباب کے ساتھ احباب بے تکلف ہو رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی مذاق شروع ہو گیا ہے۔ مردانہ گھر میں ملا رموزی صاحب کا ایک حجرہ نما کمرہ نہایت شان سے آراستہ ہے، جس میں سب سے نیچے ایک نئی چٹائی بچھی ہے۔ اس پر بہترین چاندنی قالین اور اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور میزیں بھی لگی

ہوئی ہیں۔ یہ گویا ملا رموزی صاحب کا ''دیوانِ خاص'' ہے اور اس میں بارات کے صرف وہ شرکاء آ کر بیٹھ رہے ہیں جو موٹر کاروں پر سوار ہو کر آئے ہیں اور دنیا میں کسی بڑے عہدہ پر مامور ہیں۔ تو یاد رکھیے ملا رموزی صاحب کی اس جاہ پرستی کو کہ غریب شرکاء کو شامیانے کے نیچے زمین دوز قالین پر اور یہ عہدہ دار ''دیوانِ خاص'' میں۔ اماں بڑا مشکل ہے ایسے مواقع پر اسلامی مساوات اور رواداری کو قائم رکھنا اور یہ مسلمانوں میں مراتب کا فرق اصل میں نتیجہ ہے انگریزی اسکولوں کا اور انگریزی پڑھے ہوئے ہندستانی نسل کے غلام ماسٹروں اور پروفیسروں کے طریقِ تعلیم و تربیت کا کہ انھوں نے مسلمان بچوں کو لندن جانا اور پائنیرؔ اخبار پڑھنا سکھا دیا لیکن یہ نہ بتایا کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کا حقیقی بھائی ہوتا ہے اس لیے غریبوں سے امیروں کو علاحدہ نہ رہنا چاہیے۔

دروازہ کے سامنے ہمارے باراتی جلوس کا موٹر آراستہ پیراستہ کھڑا ہے۔ شاندار ہاتھی بھی کھڑے جھول رہے ہیں۔ باجوں پر باجے ہیں کہ بج رہے ہیں اور اسی ہجوم میں سے گزر کر دنیا کے بڑے بڑے جج، فوجی کمانڈر، اے۔ ڈی۔ سی، جاگیردار وکلاء وغیرہ ہیں کہ گزر کر ہمارے ''دیوانِ خاص'' میں آ کر بیٹھ رہے ہیں، جنھیں اعلیٰ درجہ کی سگریٹ اور سگار پلائے جا رہے ہیں اور ملا رموزی صاحب بھی ان سے بڑے تپاک سے مصافحہ اور معانقہ فرماتے جاتے ہیں اور شامیانے کے نیچے جو غرباء جمع ہیں وہ خود ہی اٹھ کر پانی پی لیتے ہیں اور خود ہی آپس میں باتیں کر رہے ہیں، مگر نہ ان سے ہم کچھ دریافت کرتے ہیں نہ ہمارے رشتہ داران کے پاس جاتے ہیں کیونکہ یہ لوگ تھے بے چارے غریب۔

اب احساس اور شعور کی قوت کا یہ فعل تو ملاحظہ ہو کہ باوصف اس کر و فر اور دھوم دھام کے اس وقت بھی ملا رموزی صاحب خلیفہ اسلام ہارون رشید کے علم پرور عہد اور دربار میں نہ ہوئے ورنہ اپنی اس تقریب میں صحیح معنی کی دھوم دھام کر کے دکھا دیتے اور یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے ملا رموزی کے مرتبہ سے بہت نیچا ہے، مگر یہ خیال ایک مرتبہ بھی نہ آیا کہ مسلمانوں میں ایسے بے شمار محتاج بھی موجود ہیں جنھیں شادی تو شادی ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اب آوازیں آنے لگیں:

تو کیا صبح چلو گے؟

یہ دیکھو ساڑھے گیارہ بج گئے۔

تو بس بدلو کپڑے۔

ساری دنیا کو خیال تھا کہ آج تو ملا رموزی صاحب جواہر، یاقوت اور نیلم ہی پہن کر جائیں گے مگر ہم نے ایک سرخ عمامہ باندھا، معمولی سی شیروانی اور دہلی کا چمکدار جوتا پہن کر دونوں جہان کی رات حضرت محترمہ والدہ صاحبہ مدظلہا اور بہنوں کے سلام کو حاضر ہوئے۔ آسمان سے اونچی دعاؤں کے ساتھ انھوں نے ہمیں ہار پہنا کر رخصت کیا اور ہم اپنے بھانجے خلیق عصمت کی انگلی پکڑے غریبوں کے شامیانے میں آئے تو سارے مجمع نے کھڑے ہو کر تعظیم ادا کی۔ ہم نے یوں خیال کیا کہ کسی ملک کو فتح کر کے اس وقت ہم جمہوری حکومت کی صدارت والی کرسی پر بیٹھ رہے ہیں اور ساری پارلیمنٹ ہماری تعظیم کو کھڑی ہے۔ ہمارے بیٹھتے ہی چھمّا جان رنڈی نے مجرا شروع کیا تو ہم نے سوچا کہ ہمیں جمہوریت کی صدارت پر دارالحکومت کی میونسپلٹی کا صدر سپاس نامہ سنا رہا ہے اور عوام ہیں کہ ہماری فاتحانہ اولوالعزمیوں پر صدائے تحسین وآفرین بلند کر رہے ہیں۔

کوئی سوا گیارہ بجے شب کو بارات روانہ ہوئی۔ سب سے آگے سرکاری بینڈ تھا، اس کے بعد شہر کے بڑے بڑے بینڈ، اس کے بعد محلّے کے رضا کاروں کا دستہ، اس کے بعد ہمارا شاندار موٹر، پھر فوجی افسروں کی جماعت، اس کے ہاتھی پر ہاتھی جن پر بھائی بھی سوار تھے اور ہمارے دوست مولانا عبدالہادی صاحب انصاری ان ہاتھیوں کے کمانڈر تھے۔ ایک شاعر دوست سنا ہے کہ اس لیے بارات سے واپس چلے گئے کہ انھیں عبدالہادی صاحب نے ہاتھی پر سوار نہ ہونے دیا۔ دونوں جانب شرکاء کی پاپیادہ قطاریں تھیں اور بجلی کے ہنڈے ہمارے موٹر کی دوسری نشست پر چنور جھلنے والے تھے اور ہمارے برابر ہمارے وہی چھوٹے سے بھانجے خلیق عصمت۔ بس خلاصہ اس دھوم دھام کا یہ تھا کہ سارا شہر بیدار ہو گیا تھا۔ اب جوں جوں بارات آگے بڑھتی جاتی تھی احباب پر احباب اور عوام پر عوام تھے کہ زیادہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ پھر چھمّا جان کو دیکھ لینے کے بعد کسے تاب تھی کہ وہ راستہ ہی سے واپس چلا جائے؟

شہر کی بڑی بڑی سڑکوں سے گزر کر جب سسرال کے قریب پہنچے ہیں تو یہاں سسرالی لڑکوں

نے دو بڑے بڑے بانس سڑک پر لگا کر بارات کا راستہ بند کر دیا تھا، جو باراتی جہالتوں کا ایک نمونہ یعنی رسم ہے، اس لیے قبلہ و کعبہ والد صاحب مدظلہ نے ان بانس والوں کو کچھ روپیہ دیے تب جا کر راستہ دیا گیا اور بڑی آن بان سے ہم ایک وسیع میدان میں پہنچائے گئے جو ہمارے اور چھمّا جان رنڈی کی شان کے لحاظ سے تجویز کیا گیا تھا تا کہ لاکھوں شرکاء بھی ہوں تو اس میدان میں جمع ہو سکیں۔

موٹر سے ابھی اترے نہ تھے کہ ہمارے ہی موٹر ڈرائیور صاحب نے آہستہ سے ہماری شیروانی کا دامن پکڑ لیا اور فرمایا کہ آج بغیر انعام لیے موٹر سے اترنے نہیں دوں گا۔ یہی انھوں نے کیا جو پہلے تو بڑی فرماں برداری سے بیٹھے ہمارے سر پر چنور جھل رہے تھے مگر اب وہ کہتے تھے کہ انعام لیے بغیر جنبش نہ کرنے دیں گے۔ وہ تو غنیمت ہی ہوا کہ محترمہ والدہ صاحبہ مدظلہا نے ہماری شیروانی کی اوپر والی جیب میں پہلے سے اشرفیاں بھر دی تھیں، اس لیے ان حضرات کو بغیر رسید لیے انعام دے کر جا بیٹھے بڑے دبدبہ سے اس بلند چوکی پر جو خاص ہمارے لیے تیار کی گئی تھی۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ خدا عمر دراز کرے چھمّا جان چمک کر کھڑی ہی تو ہو گئیں۔ سارا مجمع تھا کہ چھمّا جان کے ایک شعر میں ڈوب رہا تھا اور ہم تھے کہ چھمّا جان کی ہر غزل میں غلط تلفظ پر آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ اس موقع پر ضابطہ یوں ہے کہ رات بھر ہوتا ہے گانا اور دولہا میاں شرم و حجاب کی گڑیا بنے گھٹنوں میں سر ڈالے بیٹھے رہتے ہیں اور سسرال کی عورتیں اسے دولہا کی بڑی بھاری شرافت سمجھتی ہیں مگر چونکہ ہم ملا رموزی تھے اس لیے اس مکروہ طریقے کو توڑ تاڑ کر کوئی تہجد کی نماز کے وقت باراتیوں کو رنڈی کے حوالے کر خود اٹھ کر اپنے گھر چلے آئے اور یوں سوئے کہ دن کو کوئی تیرہ بجے بیدار ہوئے۔ اس وقت تک ہماری طلبی میں خدا جانے کتنے سسرال والے آ چکے تھے۔ آخر کار تنگ آ کر سسرال پہنچے۔ اس وقت تھی سسرال والوں کی طرف سے ضیافت۔ ہماری طرف کے لوگ بڑی آن بان سے کھانا کھا رہے تھے۔ ہم سے اصرار کیا گیا مگر ہم طبی اصول کو اوڑھنا بچھونا بنا چکے ہیں اس لیے ہم نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ نہ پلاؤ کھاتے نہ زردہ۔ سنا ہے کہ ہمارے اس انکار پر سسرال کے مردوں سے زیادہ سسرال کی عورتیں ناراض ہوئیں۔

آج شام کو وداع کی تقریب میں ہنگامہ کم ہوتا ہے۔ لہٰذا ہماری وداعی تقریب میں بھی نہ

اب وہ کل والی جھمتا جان تھیں نہ عوام کا ہجوم، نہ اتنے باجے تھے نہ اتنے شرکاء۔ کچھ سسرال والے تھے اور کچھ ہماری طرف کے۔ اس موقع پر سسرالی عورتوں کا برا حال ہوتا ہے۔ کہیں تو اس لیے کہ رخصت ہونے والی بیٹی سارے خاندان کو عزیز ہوتی ہے اور کہیں اس لیے کہ لڑکی کو رخصت کرتے وقت ماں باپ کو اپنی تنگ دستی یاد آتی ہے کہ اس وقت وہ دنیا جہان کو اپنی بیٹی کے جہیز میں دے دینا چاہتے ہیں مگر نہیں دے سکتے تو بس کھڑے ہوئے رویا کرتے ہیں۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جب دونوں طرف کی عورتوں میں رسمیں ادا کرتے ہوئے ایک ہلکی سی جنگ بھی واقع ہو جاتی ہے۔ اگر چہ ہم نے جاہلانہ رسوم سے کافی اظہار بیزاری کر دیا تھا اور سسرال میں ہمارا مزاج اور خیال پہچان کر رسموں کو کافی حد تک توڑ دیا تھا پھر بھی کوئی شب کے گیارہ بجے ہمیں عورتوں میں یوں بلایا گیا کہ دروازہ پر سے ہماری بہن صاحبہ نے ہمارے سر پر اپنا دوپٹہ ڈالا۔ بیوہ بہن نے اپنا دوپٹہ اس خیال سے نہ ڈالا کہ بیوہ کا کپڑا منحوس سمجھا جاتا ہے، اس لیے ہم نے بھی اندر جانے سے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ اگر ہماری بیوہ بہن دوپٹہ نہ ڈالیں گی تو ہم سرے سے شادی ہی نہیں کریں گے اندر جانا تو بہت معمولی بات ہے۔ مجبور ہو کر بیوہ بہن صاحبہ نے بھی دوپٹہ ڈالا اور ہم عجیب حالت سے عورتوں کے کمرے میں پہنچائے گئے۔ اگر چہ ان عورتوں میں پردہ بہت سخت ہوتا ہے مگر اس وقت ہم نے دیکھا کہ ہر عورت دولہا میاں کو دیکھنے کے لیے پردہ سے باہر ہوئی جارہی تھی۔ تیاری تو کئی گئی تھی کوئی ایک کم پچاس رسوں کی مگر عین موقع پر ہمشیرہ صاحبہ کی دھواں دھار تقریر نے سب کو روک دیا اور ایک فقرہ تو ہمشیرہ نے ہمارے ہی منہ کے سامنے یہ کہا کہ پھر کیا ہم لوگوں نے انھی باتوں کے لیے لکھا پڑھا ہے؟ اس فقرہ کو سن کر گو ہم خاموش تھے مگر معنی یہ سمجھے کہ ان تمام عورتوں کو بہن صاحبہ یہ سنا رہی ہیں کہ لکھے پڑھے تو یوں علی گڑھ میں ہزاروں پڑے ہوئے ہیں مگر ہم دونوں بہن بھائی نے جو کچھ لکھا پڑھا ہے وہ کچھ بہت ہی نرالے قسم کا ہے، جسے تم لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ دوسرے معنی یہ تھے کہ الحمد للہ ہم دونوں بہن بھائی تعلیم یافتہ ہیں سمجھا کیا ہے؟ تیسرے معنی یہ تھے کہ خدا کے فضل سے ہم احکام شریعت سے واقف ہیں اس لیے خلاف شریعت رسوم سے بیزار ہیں، مگر وہ تو کہا ہے کہ جہالت میں بھی خدا نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اس لیے ہم دونوں بہن بھائی کی ان کوششوں پر پانی ڈال دیا۔ ہماری بڑی بھاوج صاحبہ مدظلہا نے

اور فرمایا کہ سب کچھ روک دیا لو، فقط یہ تج کی رسم ادا کر دو۔ یہ کہا اور ہمارے سامنے ایک بڑا سا پتھر لا کر رکھ دیا۔ پھر اس پر ایک خاص قسم کا خوشبودار مصالحہ لا کر رکھا اور ہم سے کہا لو میاں اسے اس طرح پیس دو کہ پتھر کی آواز سنائی نہ دے۔ اس پر بہن صاحبہ نے تاؤ کے ساتھ ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دو چار مرتبہ پتھر پر چلایا اور خود سارے مصالحہ کو پیس کر رکھ دیا۔ سنا ہے کہ اس حرکت پر بھی سسرال کی عورتیں ناراض ہوئیں مگر الحمد للہ کہ ہم دونوں بہن بھائی نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی۔ اب کوئی بتائے کہ اس بے معنی سی حرکت سے وہ کون سا فائدہ تھا جو سسرال والوں کو پہنچا؟ اور ایک یہ کیا یہ ساری رسمیں اگر سسرال والوں کے سامنے رکھ کر ان سے ان کے فائدے دریافت کیے جائیں تو سارا سسرال نہ بتا سکے، بجز اس جاہلانہ جواب کے کہ بزرگوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ ایک رسم یہ بھی ہے کہ دولہا دلہن کو قریب بٹھا کر قرآن پاک دولہا کو دیتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ اس میں کوئی آیت پڑھ کر دلہن کے چہرہ پر پھونک دو گویا اس طرح دولہا کو پہلی مرتبہ دلہن کا چہرہ دکھایا جاتا ہے۔ اس حرکت کا بھی فائدہ دریافت کیجیے تو بجز اس کے کوئی فائدہ نہیں کہ قرآن محترم سے ایک مبارک فال لے لی جائے۔ ایک رسم یہ ہے کہ دولہا دلہن کو مقابل بٹھا کر دونوں کے ہاتھوں میں مہندی لگا کر ایک دوسرے کا ہاتھ ایک دوسرے سے اتنی دیر تک جوڑے رہتے ہیں کہ مہندی کا رنگ اتر آئے۔ اس کا فائدہ بھی معلوم کیجیے تو بجز خاموشی کے اور کوئی جواب نہیں۔

باہر آئے تو یہاں جہیز کے سامان کی فہرستوں پر ہم سے دستخط لیے گئے۔ یہاں ہمارے دوست میجر راؤ دوست محمد خاں صاحب بہادر او۔ بی۔ ای کمانڈر وکٹوریہ لانسرز نے ایک شاندار گھوڑا بھیجا تھا، جو محض طریق مسنون کے طور پر آج کے دن لایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے جہاد کے خیال یا اس خیال سے کہ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سواری فرمائی ہے، یقیناً احترام کی چیز ہے اس لیے ہم نے بھی اس سواری کو پسند کی اور رخصتی کی تقریب ختم شد۔

◆◆◆

ولیمہ کی دعوت

ساری تقریبوں میں یہ ایک تقریب ایسی ہے جس کی تعریف اس خیال سے کی جاسکتی ہے کہ اس سے مسلمانوں میں محبت، اتحاد اور یگانگت کے جذبات بیدار ہوتے ہیں، لیکن شاید ہی ایک مسلمان ایسا ہو جو محض اس خیال سے ولیمہ کی دعوت دیتا ہو ورنہ 99 فیصدی ولیمے اس لیے کیے جاتے ہیں کہ نام ہو اور شہرت ہو، اسی لیے اس موقع پر بساط اور مقدرت سے زیادہ روپیہ قرض لیا جاتا ہے اور اس پر بھی بس نہیں چلتا ورنہ خدا جانے کئی لاکھ روپیہ صرف ولیمہ ہی پر صرف کردیا جائے؟

رات ہی سے ملّا رموزی صاحب کے مکان میں دیگوں پر دیگیں تھیں کہ پک رہی تھیں۔ پھر یہ انتظام کہ علاوہ پکی ہوئی دیگوں کے اتنی ہی دیگوں کا کچا سامان تیار رکھا تھا کہ اگر کوئی کمی نظر آئے تو فوراً ہی دوسری دیگیں پکا ڈالی جائیں، دیر نہ ہو ورنہ نام ڈوب جائے گا۔

بجے ہوں گے صبح کے کوئی آٹھ کہ کھانے والوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ آنا شروع ہوگئے۔ متین، سنجیدہ، عہدیدار علی گڑھی قسم کے لوگوں کے بعد جو عوام کی فوجیں آئی ہیں تو اس وقت ہمارا گھر کیا تھا خاصا رام لیلا کا میلہ بن گیا تھا:

ذرا بریان لانا۔

اماں گرم تو لاؤ۔

آپ کو دیجیے آپ کو۔

اور کھایئے۔ تو آپ نے تو واللہ کچھ بھی نہ کھایا۔

اچھا تو پھر قورمہ اور لاؤں۔

اور یہ زردہ تو ویسا ہی رکھا ہوا ہے۔

اماں کیسے جوان آدمی ہو؟

لاحول ولا تمھاری عمر میں ہم تھے تو واللہ دس رکابیاں صاف کر تے تھے۔

پانی؟

اماں کیسا پانی؟ کھایا کچھ بھی نہیں اور پانی۔

اور کیوں صاحب وہ چھوٹے بھائی کو آپ کیوں نہ لائے؟

بھئی ملا صاحب حق تو یہ ہے کہ خوب ہی شادی کی۔

خدا کی قسم سب میں تعریف ہو رہی ہے۔ ہم نے بارات تو ایسی آج تک نہیں دیکھی۔ بس کوئی رئیس ہی کر سکتا ہے ایسی شادی۔

ہاں صاحب اللہ نے آپ کو دی ہے علم کی دولت مگر واہ صاحب سبحان اللہ بھئی خدا جوڑا مبارک کرے ماشاءاللہ خوب ہی کیا۔

اماں کیا باتوں میں لگ گئے دیکھو وہ جج صاحب کھڑے ہیں، انھیں تو کہیں بٹھاؤ۔

ملا صاحب! آپ جانتے ہیں کہ میں تو اب کسی کی تقریب میں جاتا نہیں، مگر میں نے سوچا کہ بھئی کچھ بھی ہو ملا صاحب کے ولیمہ میں تو شرکت ضرور کروں گا۔

واہ ملا صاحب یہ آپ کیا فرماتے ہیں واللہ آپ تو ہمارے شہر کی عزت ہیں۔ آپ سے تو ہمارے شہر کا نام روشن ہو گیا۔

تو کیوں صاحب کچھ افغانستان کی بھی خبر ہے۔

ماشاءاللہ بس آپ بھی اخبار کے کیڑے بن گئے ہیں، بھئی بلا کے اخبار آتے ہیں آپ کے پاس۔ تو کیوں ملا صاحب ہو جاتے ہوں گے ان اخباروں پر آپ کے کوئی سو سوا روپیہ ماہوار خرچ؟

اب کوئی ان سے دریافت کرتا کہ اس ولیمہ کے موقع پر یہ افغانستان اور اخباروں کا حساب

دریافت کرنا کہاں کی ضرورت تھی؟

السلام علیکم ملا صاحب! ماشاء اللہ بھئی خدا مبارک کرے۔ سبحان اللہ کیا کھانے پکائے ہیں۔ بس ایک وقت نواب صاحب کے ہاں کھایا تھا ایسا بریان یا آپ کے ہاں کھایا۔

مگر کیوں صاحب یہ آپ نے قاری صاحب کو کیوں نہ بلایا؟

بے شک بے شک سچ فرمایا ملا صاحب آپ نے۔ بڑا ہی فتنہ انگیز آدمی ہے۔ اسے دن بھر سوائے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے کوئی کام ہی نہیں۔ بے عقل ہے بے عقل اور اسی لیے تو اچھے لوگوں میں ذلیل ہے اور دیکھنا انشاء اللہ ذلیل ہی رہے گا۔ کیوں ملا صاحب یہ مگر آپ نے گھی کہاں سے خرید فرمایا تھا؟

بھئی کوئی میرے لائق کام ہو تو پھر میں ٹھہر جاؤں ورنہ اب دفتر کا ہو گیا ہے وقت اور آپ کو معلوم ہے کہ ہمیں کیا خبیث افسر ملا ہے۔

ورنہ روزہ رکھنے نہ نماز جانے پھر اسے خوف خدا ہو تو کس طرح وہ تو بس انگریزوں سے خوش رہتا ہے مسلمان کی صورت سے تو اسے وہ نفرت ہے کہ کیا کہا جائے۔ خیر ملا صاحب تھوڑی سی اور رہ گئی ہے دعا کیجیے خدا شرم و عزت کے ساتھ اسے بھی گزار دے۔

اسی قسم کے حالات کے ساتھ جب یہ "مردانہ ولیمہ" ختم ہوا تو "عورتانہ ولیمہ" شروع ہوا اور شام کو جا کر فراغت نصیب ہوئی۔ خلاصہ یہ رہا کہ سب لوگ ماشاء اللہ اور سبحان اللہ کہہ کر اپنے اپنے گھر تشریف لے گئے اور ملا رموزی صاحب آج تک مصارف کے کاغذات پڑھ رہے ہیں، اس لیے آپ ذرا سوچ لیجیے کہ شریعت اسلامیہ کے موافق زندگی بسر کرنے والے آرام سے ہیں یا علی گڑھ والے؟

◆◆◆

سہرے

عام دستور ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر احباب اور مخلصین سہرے کہتے ہیں۔ بظاہر سہرا دو حالتوں میں کہا جاتا ہے ایک کسی غرض مندی کے تحت، دوسرے خوشگوار اور برادرانہ محبت کے تحت، جو ایک طرح کی منظوم مبارکباد ہوتی ہے اور شادی کی یادگار، اسی لیے سہرے شاعر کے دیوان میں بھی (بعض لوگ) محفوظ رکھتے ہیں اور چوکٹوں میں بھی۔

ملا رموزی صاحب بھی بے اندازہ دوستوں کے دوست ہیں اور بے شمار شاعروں کے مخلص۔ ہندستان کے سہرا کہنے والے دوستوں کو تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ کر اگر آپ ملا رموزی صاحب کے دوستوں کو معلوم کرنا چاہیں تو سوائے ایک مولانا عبدالہادی انصاری کے باقی سب کے سب شاعر بھی ہیں اور شاعر گو بھی۔ یہ ہر مشاعرہ میں غزل پڑھتے ہیں اور ہر موقع پر شعر کہتے ہیں، مگر ہماری ذات سے متعلق ان مخلصین نے سہرے کے باب میں جو طریق عمل اختیار کیا اس کا اظہار خود ہمارے لیے اگر چہ مناسب نہیں لیکن دوسروں کی عبرت کے لیے کچھ بیان کر دینا ضروری ہے۔

ہمارے نکاح کے بعد ہی سے ہندستان کے نامور علمی وادبی لوگوں نے مبارکباد کے خطوط، مضامین اور سہرے لکھے۔ ان کی اطلاع پر ہمارے ایک دوست شاعر صاحب نے ہم سے خود ہی فرمایا کہ میں تمھارے لیے وہ سہرا کہوں گا کہ اس پر یہ مصرعہ کہا جا سکے گا کہ:

دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی کہہ دے سہرا؟

ان شاعر صاحب کا نمبر 1 ہے۔

آپ نکاح سے لے کر شادی یا رخصتی تک بھی ایک شعر نہ کہہ سکے لیکن ہر ملاقات میں سہرے کا شاندار تذکرہ ضروری فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہندستانی شعرا کے سہرے ہمیں پہنچے تو اس خیال سے کہ ہندستانی مخلصین ہمارے شاعر دوستوں کو غیر مدرک اور خلوص سے کورا نہ سمجھیں۔ ہم نے خود ہی سہرے کی یاددہانی کی اور یہ یاددہانی اس جذبے کے ساتھ بھی تھی کہ دنیا کہے گی کہ واقعی ملا صاحب جن لوگوں میں رہتے تھے ان میں لکھا پڑھا کوئی نہ تھا لہٰذا جب آپ سے یاددہانی کی گئی تو نہ پوچھیے آپ کی تعلّی، آپ کا غرور، آپ کا گھمنڈ اور شاعرانہ تکبر۔ فرماتے تھے کہ کیوں بدظن ہوتے ہو وہ سہرا کہوں گا کہ آسمان کو داد کے لیے زمین پر آنا پڑے گا اور دھرے رہ جائیں گے تمھارے یہ ساری پنجابی خرافات نگار دوست۔ اس پر ہم نے یہی سوچا کہ واقعی ہمارے صبح و شام کے ساتھ رہنے والے اور خلوص و محبت کے لحاظ سے بس یوں سمجھو کہ طالب و مطلوب پھر کیسے ہوگا کہ یہ اس موقع پر اظہار خلوص نہ فرمائیں، مگر ظاہر و باطن ایک نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک ایک شعر بھی نہ فرما سکے۔ نمبر 2 شاعر صاحب کو ہماری ذات کے ساتھ خلوص و یگانگت کے جتنے دعوے آپ کو ہیں، ایک کو نہیں۔ شاعری کی اس حد کو پہنچ گئے ہیں جہاں حاجت مند شاعر کسب زر اور کسب غرض کے لیے خوشامدانہ قصیدے کہا کرتا ہے۔

چنانچہ اس دنیائے ناپیدا کنار میں آپ کے کہے ہوئے ایسے خوشامدانہ قصیدے موجود ہیں جو آپ نے ارباب امارت و اقتدار کی شان میں کہے ہیں۔ ''مشق سخن'' کا یہ اعتماد ہے کہ غزلیں کی غزلیں اپنے شاگردوں کو تقسیم فرما دیتے ہیں اور ضبط کا اتنا یارا بھی نہیں کہ ایسی غزلیں شاگردوں کو عطا فرما کر ہم سے کہہ بھی دیتے ہیں کہ یہ غزل اصل میں میری کہی ہوئی ہے۔ پہلے ہی سے وعدہ تھا کہ ملا صاحب آپ کے لیے وہ سہرا کہا جائے گا کہ خیر منہ سے تعریف تو فضول ہے مگر ہاں آپ کے ہندستانی شاعروں سے ملا لینا، مگر اس مخلصانہ اعلان کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ہماری شادی پرانی بھی ہوگئی مگر جناب صدر الشعرا سے ایک شعر بھی نہ کہا گیا اس لیے نہیں کہ کہنے کی واقعی استعداد نہیں تھی بلکہ دوستی کا وہی ظاہر و باطن خراب تھا جو ملا صاحب ہی کے نہیں آج کل کے سارے دوستوں کا ہوا کرتا ہے، یہاں تک کہ ان کی فطری بے حسی اور بے عملی کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے خود ان

سے بھی شکایت کی اور بہت صاف طور پر کہا کہ ایسا نہ ہو کہ بیرونی شعرا کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ ملا رموزی صاحب کے دوستوں کا ظاہر و باطن ایک نہیں تو فرمایا کہ لاحول ولا قوۃ مگر لاحولا ولا قوۃ کچھ اتنا ہی طویل ہوا کہ آگے حد ادب ہی آ گئی تو ہم نے پھر یوں کہا کہ اچھا تو حضرت اب ہم اپنی کتاب ''شادی'' میں آپ کے فریب دہ برتاؤ کی دھجیاں اڑائیں گے، محض اس لیے کہ دوسرے مسلمان آج کل کے دوستوں کو پہچان لیں۔ اس پر فخر و مباہات کے بہت پُر زور دعوے کیے گئے جن کا مطلب یہ تھا کہ تم جانتے ہو ملا صاحب کہ ایک میں ہی تمہارا صحیح معنی کا مخلص ہوں پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں سہرا نہ کہوں جب کہ یہ تو میرا فرض ہے، مگر نتیجہ یہ ہوا کہ جب ممدوح کو علم ہوا کہ ملا صاحب نے اپنی کتاب ''شادی'' ختم فرمائی اور میری فریب دہ دوستی کا بھانڈا بھی پھوڑ دیا تب آئے اور فرمایا کہ کیوں صاحب میں نے تو آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں سہرا کہوں گا اور بس اتنا کہنے پر بھی جناب مکرم سہرا نہ کہہ سکے۔

آپ کے بعد دو تین شاعر دوست اور رہ جاتے ہیں جن میں سے ایک کے تخلص کا حرف اول (شین منقوطہ) ہے۔ آپ بھی صاحب دیوان ہیں اور صاحب مشاعرہ۔ ایک ماہوار رسالے کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں تا سب کو عاقل، بالغ، روشن خیال اور فرض شناس اور پھر ہمارے ساتھ صبح و شام کی خلوص بھری ملاقاتوں میں اظہار محبت کا کیا کہنا، لیکن سب کے نتائج خلوص یہ کہ الحمد للہ ایک نے بھی ایک شعر نہ کہا اور لطیفہ یہ کہ پھر اسی آج بھی ملا صاحب ساتھ ملتے ہیں اور ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ دوستوں کی اس سرتاسر پُر فریب اور کار دوستی کا ایک یہ فائدہ کیا کم ہے ک اول تو ملا صاحب ان احباب کے زیر بار کرم نہ ہوئے دوسرے بیرونی مخلصین کو ملا رموزی صاحب کے ان دوستوں کے احساس و تعلق کا اندازہ تو ہو گیا جو ملا صاحب کے خاص دوست کہلاتے ہیں مگر یہ الفاظ علامہ عرفی شیرازی ''دوستانِ منافق'' کے لیے ہی جو کچھ کہا گیا وہ بھی بکمال خلوص قلب ایک تنبیہہ ہے اور ایک عبرت آموزی جس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ زمانہ اپنے فرض کے احساس پر مستعد ہو جائے ورنہ یہ تو ملا رموزی کے علم و احساس کی توہین ہو گی اگر وہ دنیا سے اپنی شان میں سہرے اور قصیدے ہ کہنے پر دنیا سے گلہ گزار ہوں جب کے بفضل خدائے عرش و فرش آج نہ فقط ملا رموزی بلکہ خود ملا رموزی کے دوست ملا رموزی پر اس

کے خدا کے اس فضل کے قائل ہیں جو علامہ عرفی شیرازی نے بربنائے زعم کمال کبھی اپنے لیے ان الفاظ میں خاص کرلیا تھا کہ:

گر سر بہ صحبتِ گل و سوسن در آورم
دستِ چمن گرفتہ بہ مسکن در آورم
تا زاغ ظلمت افگنم از شاخسار طبع
خورشید و ماہ را بفلاخن در آورم
ہمت ثمر فشاں و شجر طوبیٰ و ہنوز
شرم آیدم کہ میوہ بہ دامن در آورم
اے طائرانِ ہمت سدرہ مدد کنید
کا عندلیب قدس بہ گلشن درآورم
اے مہر شاد باش کہ گوہر کمال یافت
اکنوں وسیلہ شو کہ بہ مخزن درآورم

پھر ایسی حالت میں ملا رموزی کیا خاک سہرے لکھوائے گا۔ اذن سے جن کی دنیائے علم وادب میں خود کوئی مستقل جگہ اور گنتی نہ ہو اور خود ان کی روشن خیالی مرہون کرم ہو ملا رموزی کے فیض صحبت کی مگر یہ تو ایک فطری تقاضا تھا جو ہر ذمہ دار دماغ میں اپنے ماحول کی غلط کاریوں سے پیدا ہوتا ہے اور اس سے وہ دروغ گو متکبرین تک خالی نہیں جو بظاہر خود کو مستغنی اور بے پروا کہتے ہیں۔ بارے شکر وسپاس اُس خدائے زمین وزمان کو جس نے خاص دوستوں کے احسان سے بچالیا اس لیے اب ان متعدد سہروں میں سے چند سہرے ملاحظہ کیجیے جو ہندستان کے مخلصین کرام نے ارسال فرمائے ہیں اور ان کو یہاں درج نہ کرنا حقیقت میں ان ہندستانی مخلصین کے جذبات کی توہین تھی جو ملا رموزی کو آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں اور خود ملا رموزی بھی ایسے ہی ہندستانی ارباب احساس کی قدر افزائی پر زندہ ہیں۔

حضرت استاذی مولوی محمد حسین محوی لکھنوی پروفیسر اورنگ آباد
عثمانیہ کالج وصدر دائرہ ادبیہ لکھنؤ)

حضرت محوی ادبیاتِ اردو میں جو شہرت پائے ہوئے ہیں اس سے صحافت اردو سے واقفیت رکھنے والے ناواقف نہیں۔ حضرت گرامی ملّا رموزی کے استادِ شعر بھی اور ایک شفیق بزرگ بھی۔ ممدوح گرامی کا ادبی پایہ یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو ایسی وقیع مجلس نے اردو کا جو آخری لغت تیار کیا ہے اس کے تالیفی ارکان میں ایک حضرت محوی بھی ہیں۔ پھر صاحب دیوان اور بے شمار قومی نظموں اور متعدد تصانیف کے مالک بھی۔ ملّا رموزی کے لیے اس موقع پر آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ یہ ہیں:

پھر حریفِ نظارۂ دیدۂ تمنا ہے
اک عروسِ مہ پارہ رونق نظارہ ہے

وہ ادب کی دیوی ہے، وہ عروسِ اردو ہے
بازوئے رموزی ہے اور اس کا گیسو ہے

جس کا جلوۂ رنگیں، رشکِ صد نمائش ہے
ہر زباں پر جس کا نغمۂ ستائش ہے

عشرتوں سے ہے معمور آج دل کا کاشانہ
واقعہ بنا ہے اب تھا جو ایک افسانہ

حضرتِ رموزی کی یعنی ہوگئی شادی
دل کے غمکدے میں ہے عشرتوں کی آبادی

کیوں کسی کا فریادی، دل ہو اب رموزی کا
جس کا کلک، اک دریا اور وہ بھی گوہرزا

ہو مبارک اے ملّا، عشرتوں کی یہ گھڑیاں
ختم ہوگئیں آخر رنج و فکر کی گھڑیاں

خدمتِ ادب کا ہے آج تیرے سر سہرا
اس سے بڑھ کے کیا ہوگا، رونق نظر سہرا

تیری زینتِ آغوش، وہ ادب کی دیوی ہے
ہر عروس سے بالا آن بان جس کی ہے

جس پہ فخر ہے تجھ کو، جس کو فخر ہے تجھ پر
کیونکہ تیری ہر تحریر، نقش روح پرور ہے

وہ عروسِ رعنا ہے، تیری خلوتِ دل میں
آرزوئے ہر دل ہے اب جو ساری محفل میں

زندگی میں جو تنے خدمتِ وطن کی ہے
یہ صلہ اُسی کا ہے، یہ جزا اسی کی ہے

ملک و قوم میں عزت پائی اور یوں پائی
ہر ادیب اور شاعر جس کا ہے تمنائی

کھپ گئی تیری تحریر دیدۂ تماشا میں　　آئی یوں نظر ہر سو جلوہ ہائے رعنا میں

پیکرِ ظرافت میں روح ڈال دی تو نے　　تیرے بر میں انگڑائی لی عروسِ اردو نے
حیرتی ہے اک عالم، ہے خروش دنیا میں　　ہے یہ قوتِ تسخیر کلک شوخ ملا میں
اک عروسِ فطرت ہے تیری دلکشا تحریر　　ہر مبصر ہے جس کا قائلِ تاثیر
خیرگی ہوئی پیدا، دیدۂ بصیرت میں　　جان ڈال دی تو نے پیکرِ بلاغت میں
چٹکیاں جگر میں لیں، وہ ہیں تیری تحریریں　　کھینچ دیں دلوں پر جو حالِ دل کی تصویریں
یہ ظرافتِ دل کش، نازشِ فصاحت ہے　　یہ نگارش رنگیں رد کشِ بلاغت ہے
شورشِ نوا تیری، جان ہے صداقت کی　　کوئی پوچھے محوی سے قدر اس لطافت کی
کشور ادب میں تو، طرزِ نو کا بانی ہے　　ہر تری نگارش اک، نقش غیر فانی ہے
تو ظریف مصلح ہے، تو ظریفِ ناصح ہے　　کشور ادب کا تو، نوجوان فاتح ہے
خدمت ادب کا آج تیرے سر ہی سہرا ہے　　تیری ہی ہم آغوشی، اس دلہن کو زیبا ہے

حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری

ایڈیٹر اخبار ''انصاف'' لاہور و رسالہ ''مخزن'' لاہور)

ادبیاتِ اردو کے اس شہرۂ آفاق رکن اور شمالی ہند کے اس جلیل القدر شاعر سے ہندستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ شعر اردو میں حضرتِ حفیظ کا جو پایہ ہے حقیقت میں وہ زبانِ اردو میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہے۔ حضرتِ حفیظ علاوہ شعر و سخن کے ملک کے مشہور مصلحین اور سیاسیین میں ہیں۔ آپ دس بارہ اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور اس وقت بھی شمالی ہند کے نہایت بلند مرتبہ روزانہ اخبار ''انصاف'' لاہور اور زبانِ اردو کے صحیفۂ اولین ''مخزن'' کے ایڈیٹر اور سرمحرر ہیں۔

ملا رموزی کے لیے آپ کی فرض شناسی کہ آپ نے اس تقریب کی اطلاع پا کر اپنے نامور مجلۂ علمیہ وادبیہ ''مخزن'' لاہور کی اشاعت بابت ماہ جولائی 1929 کے صفحہ 3 پر حسب ذیل عبارت کے ساتھ چند اشعار شائع فرمائے۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

''ضیاء الملک ملا رموزی کی شادی خانہ آبادی کی تقریب میں، میں شریک نہ ہوسکا

لیکن مجھے اس شادی سے جو مسرت ہوئی وہ مظاہرہ کے لیے بے تاب ہے۔
ملا صاحب نے تا حال باوجود صدہا منتوں کے اپنی دوسری تصویر نہیں بھیجی تا کہ
ناظرین ''مخزن'' سے جو وعدہ کر چکا ہوں اسے پورا کرتا اور وہ نظم جو ملا صاحب کی
خدمت میں میری کتاب عقیدت کا خلاصہ پیش کرتی ''مخزن'' کے صفحات پر آجاتی۔
خیر یار زندہ صحبت باقی۔ فی الحال یہ دو بند نذر ہیں''۔(حفیظ)

رموزی تیرے سر اسلام کی خدمت کا سہرا ہے
رسول اللہ کے پیغام کی عزت کا سہرا ہے
خدا کے فضل کا، احسان کا رحمت کا سہرا ہے
بڑی شوکت کا سہرا ہے، بڑی عظمت کا سہرا ہے
تیرے سر سے ہے کیا نسبت زر و گوہر کے سہروں کو
تیرا سہرا سبق دیتا ہے دنیا بھر کے سہروں کو

ادب میں تیرے سر ہے طرزِ نو ایجاد کا سہرا
تیری نکتہ نوازی کو ملا استاد کا سہرا
تیری سیرت نے باندھا فطرتِ آزاد کا سہرا
ہوا ان سب پہ طرّہ اس مبارکباد کا سہرا
میرے پیارے رموزی، اب تجھے شادی مبارک ہو
یہ ایزادی مبارک، خانہ آبادی مبارک ہو

حضرت ادیب فاضل مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی

پروفیسر ادب اردو علی گڑھ کالج وصدر انجمن خیابانِ اردو علی گڑھ

حضرت مولانا احسن مارہروی کا علمی و ادبی تبحر زبانِ اردو میں جس درجہ مسلم و ممتاز ہے وہ واقفانِ صحافت اردو سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت ممدوح شعرا اردو کے یکہ و تاز استاذ حضرت نواب مرزا خاں داغ دہلوی مغفور کے ان ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں جن کی خدمات سے زبانِ اردو اور شعرِ اردو نے جلا پائی ہے۔ فی الوقت بھی مولانا علی گڑھ کالج ایسی بلند پایہ درسگاہ میں ادبِ اردو

کے استاذ ہیں اور ممدوح گرامی کا یہی منصب آپ کے اُس غیر معمولی تبحر کا شاہد ہے جو آپ کو ادبیاتِ اردو میں حاصل ہے اور شعروسخن میں جس دیرینہ طرزِ نگارش کے آپ مالک ہیں وہ ذیل کے اشعار سے نمایاں ہے۔ آپ نے ہماری تقریب کی اطلاع پاتے ہی ایک طویل گرامی نامہ کے ساتھ ذیل کا سہرا عطا فرمایا:

جس ابتدائے مسرت کی ہے خبر سہرا — اسی خوشی کا ہے ملا تمھارے سر سہرا
بہارِ عقد کی رنگینیاں ہیں چھائی ہوئی — بنا ہوا ہے چمن زار سربسر سہرا
بڑے ریاض سے گوندھا ہے اس کو مالن نے — کہ باندھنے کو ہے آج ایک ذی ہنر سہرا
چمن کی سیر کرو، گھر میں انجمن والو — یہ دے رہا ہے تمھیں دعوتِ نظر سہرا
کلی کلی ہو نہ کیوں اس کی رازِ سربستہ — بنا ہے جب کہ رموزی کے نام سر پر سہرا
نہ بار اس کا جبیں پر نہ بوجھ ہے سر پر — دکھا رہا ہے لطافت کا یہ اثر سہرا
ہے رسمِ کہنۂ عقد، آبروِ معیشت کی — رہے گا اس سے ترو تازہ عمر بھر سہرا
وہ ہٹ کے چہرہ سے کیوں چشمِ بد کو پڑنے دے — کرے گا فرض سے اپنے نہ درگزر سہرا
نیا یہ مسئلہ حل پر تو انگلی کا ہوا — کہ شمس بازغہ چہرہ ہے تو قمر سہرا
ملے نہالِ تمنا کا پھل رموزی کو — دعا ہے دل سے کہ ہو جلد بادر سہرا
مرض جو پست نہ کرتا تو آج میں احسن — بلند کیا ہے، سناتا بلند تر سہرا

حضرت مولانا حاجی ابومحمد صاحب ثاقب کانپوری
ایڈیٹر مجلّہ ''نظارہ'' کانپور

حضرت مولانا ثاقب کانپوری بھی ادبیاتِ اردو کے ان مستعد اور معروف ترین ارکان میں سے ایک ہیں جن کی خدمات سے اردو کے ''ادبِ جدید'' نے ایک گونہ ترقی کی ہے۔ حضرت ثاقب کانپوری نے شعرِ اردو اور افسانہ نگاری میں اس درجہ تیزی سے ترقی کی ہے کہ بایدوشاید، شاید ہی کوئی علمی و ادبی رسالہ ایسا ہو جس میں ممدوح گرامی کے افکارِ عالی زینت بخش نہ ہوتے ہوں۔ خود بھی ایک مجلۂ ماہی کے ایڈیٹر اور محررِ خصوصی ہیں اور بے مثل شاعر۔ آپ نے بھی

ملّا رموزی کی اس تقریب پر سہرا عطا فرمایا ہے جو یہ ہے:

سر سے مُلّا کے اگر آئے اُتر کر سہرا | میری آنکھوں میں رہے پتلیاں بن کر سہرا
بلبلیں باغ سے آتی ہیں فدا ہونے کو | سُن لیا کیا؟ کہ رموزی کے ہے سر پر سہرا
جلوۂ طور کا عالم مجھے یاد آتا ہے | جب سرک جاتا ہے رُخ سے ترے دم بھر سہرا
گرمیِ حسن سے ٹپکے جو عرق کے قطرے | ہم یہ سمجھے کہ لٹاتا ہے جواہر سہرا
کیا تعجب ہے جو اظہارِ مسرت کے لیے | حوریں آئیں گُلِ فردوس کا لے کر سہرا
جس طرح آج ہے رُخ پر ترے سہرے کی بہار | آئے اک روز یونہی ننھے کا بن کر سہرا

ثاقب اپنا بھی یہ دعویٰ ہے بقولِ غالب
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

◆◆◆

ننھے میاں کی والدہ

شادی بیاہ کی تمام مذکورہ بالا تفصیلات اور ان کی جانی اور مالی اذیتوں کے بعد اب اس اصل کے لیے بھی کچھ سن لیجیے جو اس بحث کا ''عنوان دلفریب'' ہے۔ پس ملا رموزی کے لیے اگر یہ مان لیا گیا ہے کہ وہ اپنے وقت کا ایک مسلمہ اہلِ قلم، انشا پرداز اور صاحب تصنیف ہے تو اس کی ذہنیت بھی یقیناً یہ ہوگی کہ وہ ملا رموزی جس کے خیال و اندازے اور احساس و ادراک کی پرواز مخلوقات اور کائناتِ عالم کے ہر سربستہ راز کو محسوس و معلوم کر کے اس کی اصل و حقیقت اور خاصیت سے دنیا کو ایک دلفریب طرز سے روشناس کرنے والی ہوگی۔ اس کے دماغ اور خیال میں دنیا اور دنیا کی ہر شے کی وہ انتہائی نزاکت اور رعنائی بہ یک نظر سما سکتی ہے جو عوام و خواص کی نظروں سے باوصف کوشش اوجھل رہتی ہے۔ وہ انسانی حسن و قبح کی اُن نازک سے نازک اور پوشیدہ سے پوشیدہ گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہوگا، جن پر کوئی دوسرا دماغ احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس کا دل حسنِ قدرت اور جمالِ فطرت کی عالم آرا رنگینیوں کی ادنیٰ سے ادنیٰ کمزوری پر بھی اعتراض کرتا ہوگا اور انسانیت کی ہر ادنیٰ کمی اور بیشی اُس کے دماغ کو بے چین کر دیتی ہوگی کہ انشا پرداز اور مضمون نگار نام ہے ایک بلند مرتبہ اور غیر معمولی صاحب عقل و شعور کا۔ پس اس ذہنیت کی نسبت سے ملا رموزی کی بیوی ایسی ہونا چاہیے تھی جس کے نظر نواز و دلفریب حسن و جمال کی نزاکتوں سے ایک جہانِ کیف و بیخودی پیدا ہوتا، جس کی ہر حرکت سے علم و احساس، نقد و تحقیق، ندرت و رفعت، جدت و حکمت، ایجاد و اختراع، نفاست و خوش سلیقگی کے برتر از خیال و گمان سوتے جاری ہوتے گویا ایک دریائے

نور ہوتا جو اپنی پاکیزہ موجوں میں ملا رموزی کے خیال و دماغ کو ہر لحمہ بھاتا رہتا اور اسے آشوبِ عالم سے کسی وقت بھی متاثر نہ ہونے دیتا کہ اسی کا نام ہے ''رفیقۂ حیات'' و ''رفیقِ زندگی''۔

بخلاف اس کے بیوی کے انتخاب میں ہندستانی مسلمانوں میں جو اصول وضوابط ہیں اور لڑکا اپنی مرضی کے موافق لڑکی کے انتخاب سے جس طرح محروم رکھا جاتا ہے، اس کا جو خمیازہ ملا رموزی کو اپنی شادی میں برداشت کرنا پڑا ہے اس کے تصور سے اور اندازے سے اپنے دوسرے دینی بہن بھائیوں کو بچانے کے لیے ملا رموزی لکھے دیتے ہیں کہ کوئی شخص جب تک اپنی آنکھ سے لڑکی کو نہ دیکھ لے شادی پر راضی نہ ہو۔ لڑکی کے انتخاب میں لڑکا پوری آزادی اور اپنی پسند سے کام لے اور اس معاملہ میں وہ اپنے ماں باپ تک کی پسند پر قناعت نہ کرے اور بالکل اسی قسم کا حق لڑکی کو اپنے شوہر کے انتخاب کے متعلق دیا جائے اور جن عورتوں تک ملا رموزی کی یہ کتاب پہنچ جائے، انھیں چاہیے کہ وہ لڑکی کو اپنے شوہر کے انتخاب میں کوئی متین اور سنجیدہ طریقۂ انتخاب خود بہم پہنچائیں۔ ملک مصر میں شوہر کے بھیجے ہوئے پیغامات لڑکی کو پہنچا دیے جاتے ہیں اور وہ شوہر کے تفصیلی حالات پڑھ کر یا سن کر کسی ایک پیغام پر لفظ ''منظور'' لکھ دیتی ہے اور جن پر وہ کچھ بھی نہیں لکھتی انھیں ناپسند سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح لڑکے کو لڑکی کے انتخاب کے لیے بہتر سے بہتر اور سنجیدہ سے سنجیدہ موقع بہم پہنچایا جا سکتا ہے، اس لیے کہ ہندستانی مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی اور اخلاقی و اجتماعی زندگی کی موجودہ اور ناقابلِ بیان پستی اور بربادی کا بلند سے بلند اور نمایاں سے نمایاں سبب بھی ناپسندیدہ شادیاں ہیں اور شادیوں کے بعد ایک اور بلائے بے درماں ہے جو انسان کے حالات کے لیے زہر سے بڑا قاتل نظر آتی ہے اور یہ بلا ہے۔

◆◆◆

سسرال

عین اس وقت جب کہ یہ کتاب مسودہ کی صورت میں مکمل ہو چکی تھی ہم نے صوبہ سرحد کے جدید الشیوع اور بلند پایہ رسالہ ''ادیب پشاور'' کے فروری نمبر کے لیے ''سسرال'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، لیکن مضمون روانہ کرنے کے بعد کتاب ہٰذا کی نسبت سے اس کا یہاں نقل کر دینا بے حد ضروری سمجھا گیا ہے، اس لیے مذکورہ مضمون کے کٹے کٹائے مسودہ سے عام فائدے کے لیے یہاں اُن حالات کو نقل کیے دیتے ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔ چنانچہ وہ جو کہا ہے کہ ''کافر برحق ہے اور کرنے والا جادو'' سو بالکل اسی طرح یہ بھی برحق ہے کہ غلامی کی آب و ہوا میں پل کر جو لوگ جوان ہوتے ہیں خواہ وہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ''قومی ترانہ'' پڑھ لیں یا وہ ''مسدس حالی'' حفظ یاد کر لیں، رہتے ہیں ہر حال میں خستہ و خوار، نہ جہالت ان کا پیچھا چھوڑتی ہے نہ وہ جہالت کا، نہ افلاس سے وہ محفوظ رہتے نہ بیماریوں سے۔ ان میں سینما پر سینما ہوتے ہیں کہ وقت اور دولت تباہ کرنے کے لیے کھلتے جاتے ہیں اور تھیٹر پر تھیٹر ہوتے ہیں کہ قائم ہوتے جاتے ہیں۔ حالانکہ کہنے میں یوں آتا ہے کہ ہندستانیوں کی اصلاح و ترقی کے لیے اسلامیہ ہائی اسکول بھی ہیں اور محمڈن کالج بھی، انجمن حمایت الاسلام لاہور بھی ہے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی۔ مگر آپ غلامی اور آزادی کا فرق معلوم کرنا چاہو تو ایک بڑے سے میدان میں یورپ کی تمام قوموں کو جمع کروا اور انھیں کے برابر برابر افریقہ کے حبشیوں، ایشیا کے ہندستانیوں اور امریکہ کے میکسیکوئیوں کو کھڑا کر دو، پھر ذہنی اور خیالی مقابلہ کرو تو رذالت، پستی، خوف، وحشت، نفاق، منافقت اور

قناعت تو نظر آئے گی حبشیوں اور ہندستانیوں میں اور فتح وظفر مندی، اصلاح و ترقی، ایجاد و اختراع، ہمت واولوالعزمی نظر آئے گی یورپ کی قوموں میں۔

تو بس ایسا ہی کچھ نقشہ ہے اپنے ہندستان میں رہنے والوں کی صورت، سیرت، لباس، زبان، مذہب، تہذیب اور معاشرت یا اخلاق کی پستی کا اور ان میں سے ہر چیز ہلاک ہو رہی ہے جہالت اور رسومِ بد کے ہاتھوں، مگر وہ جو کہا ہے کہ "ساون کے اندھے کو ہمیشہ ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے" سو رسوم و عادات کے لحاظ سے وہ ایم۔اے پاس ہو کر بھی باوادادا کی تاریک اور خلافِ عقل رسوم و عادات کے یوں پابند ہیں گویا انھوں نے دماغی لحاظ سے آج تک ایک انچ بھی ترقی نہ کی۔ تعلیم تو پاچکے یورپ کے بہترین اور ترقی یافتہ دماغوں اور ارفع و اعلیٰ علوم کی مگر عادات و رسوم کے اعتبار سے وہ 308 قبل مسیح کے زمانے ہی میں دھرے ہوئے ہیں اور مرتے ہیں تو باوادادا کی رسوم پر اور دم بھرتے ہیں تو جاہلانہ رسوم و عقائد کا۔

پس ہندستانیوں کی ایسی ہی ذہنی پستی اور دماغی تاریکی کا ایک گھناؤنا نمونہ "سسرال" بھی ہے جسے اگر اکبر آباد کی سونٹھ کی منڈی کا پاگل خانہ کہا جائے تو غلط نہیں۔ آپ ہندستان کے طبقۂ اعلیٰ کے سسرال کا تذکرہ تو اس لیے جانے دیجیے کہ طبقۂ اعلیٰ کے افراد بہ لحاظ اصولِ زندگی ایک طرح کے "بے قید لوگ" ہوا کرتے ہیں کہ نہ ان کے ہاں اصول اصول نہ ضابطہ ضابطہ، نہ شرم شرم ہے نہ ندامت ندامت، نہ اخلاق پر کوئی احتساب نہ اعمال پر کوئی پابندی، بس جس وقت جو چاہا کھایا، جب چاہا تھیٹر میں جا بیٹھے جب چاہا سنیما میں، جب چاہا سو گئے، جب چاہا بیدار ہو گئے۔ بس یوں سمجھو کہ ان کے ہاں اللّے تللّے آتا ہے اور اناپ شناپ خرچ ہوتا ہے۔ اپنے سے کم مرتبہ انسان کو یہ لوگ "بے منہ کا جانور" سمجھتے ہیں اور اپنے سے کم دولت مند آدمی کو لنگور نہیں تو گدھا۔ البتہ برطانیہ کی گورنمنٹ کے کانسٹبل تک سے یوں کانپتے ہیں جیسے طالب علمی کے زمانہ میں ہم آپ اللہ بخشے "بڑے مولوی صاحب" سے ڈرتے رہتے تھے۔ اس لیے قابلِ ذکر و بحث طبقہ تو ہوا کرتا ہے طبقۂ ادنیٰ عرف غریب لوگ کہ انھی لوگوں میں مذہب، اخلاق، معاش و معاشرت اور تمدن و تہذیب کی جملہ پابندیاں نظر آتی ہیں۔

البتہ بعض حالات میں اس طبقۂ ادنیٰ کے اندر بعض رسوم و عادات اس درجہ سخت و شدید اور

اس درجہ غلط صورت میں پائی جاتی ہیں کہ ان کی اصلاح سے غفلت اصل میں ہندستانیوں کی اجتماعی موت کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ ایسی ہی مہلک اور تباہ کن چیزوں میں سے ایک ''سسرال'' بھی ہے۔ بظاہر تو سسرال کہتے ہیں شوہر والے لوگ بیوی کے خاندان کو اور بیوی والے لوگ شوہر کے خاندان کو، مگر اصل یہ ہے کہ جن خاندانوں کو سسرال کہا جاتا ہے وہ انسانی اوقات، دولت، اخلاق اور دماغ کی تباہی کے ایسے مرکز ہیں کہ افریقہ جاتے وقت خدا ہر ہندستانی کو ان سے محفوظ رکھے۔

ہندستانیوں میں ''سسرال'' ایک ایسا مقام مقدس اور مزار پاک سمجھا جاتا ہے جہاں انسان جائے تو قیمتی اور پاک کپڑے پہن کر، سلام کرے تو جھک کر، بولے تو بڑے تہذیب سے، بیٹھے تو بڑی لیاقت سے، دیکھے تو کنکھیوں سے اور جمائی لے تو منہ بند کر کے۔ پھر اگر اپنے خسر کو جھک کر سلام کرے تو ساس کو بھی جھک کر اور سالی کو بھی جھک کر اور جو سسرال کے جملہ رشتہ داروں کی ''سسرالی صرف ونحو'' کرڈالو تو ذیل کے افراد خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں، جن کی تعظیم بجالانا داماد کا بھی فرض ہے اور بہو کا بھی۔ مثلاً خسر یا ساس کے ساتھ صرف ایک لفظ کا اضافہ کردیجیے بزرگ لوگ پیدا ہو جائیں گے یعنی سسر سے نانا سسر، دادا سسر، ماموں سسر، چچا سسر، خالو سسر اور پھوپھا سسر۔ ساس کے ساتھ نانی ساس، دادی ساس، پھوپھی ساس، چچی ساس، ممانی ساس اور خالہ ساس۔ یہ اور ان سے دو چند سہ چند چہار چند بلکہ ''سو چند'' افراد اور ہوں گے جنھیں سسرال میں جا کر آداب بجالانا پڑے گا۔ پھر اگر آپ اتنے سلاموں سے تھک کر چاہیں کہ ذرا سانس قائم کرلیں تو یہ اور جگہ تو ہوسکتا ہے لیکن سسرال میں اس لیے نہیں ہوسکتا کہ یہاں کے ضابطہ اور قانون کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ مثلاً آپ کے سالے بھی ہوں گے اور سالیاں بھی۔ پس یہ سالے اور سالیاں آپ سے عمر، عقل، تمیز، تہذیب اور مرتبہ میں چاہے کتنے ہی کم بلکہ کمتر ہی کیوں نہ ہوں لیکن اگر یہ سب آپ کی بیوی سے فقط عمر میں بڑے ہیں تو آپ پر ان سب کو جھک کر سلام کرنا فرض ہوگا۔ اگر آپ کی بیوی انھیں بھائی جان کہہ کر پکارتی ہے تو آپ ان کے باوا کی عمر کے ہو کر بھی انھیں بھائی جان ہی کہیں گے۔ اگر آپ کی بیوی آپ کی سالی کو ''آپا جان'' کہتی ہے تو آپ بھی ''آپا جان'' ہی کہیں گے تب تو شریف داماد ورنہ جہنمی۔ یہی حال آپ کی بیوی کا ہوگا کہ وہ آپ کے خاندان کے جملہ ارکان کی چھوٹی لونڈی قرار دی جائے گی جس کا احترام نہ کرے گی نافرمان، بدتمیز، سرکش اور موقع ملے گا تو

حرآفت تک کہہ دی جائے گی اور حق سمجھا جائے گا جو کچھ اس کے لیے کہا جائے گا۔

واضح ہو کہ اس قسم کی فرماں برداری اور چھوٹا پن تو آپ کو بادشاہوں کے سسرال میں بھی ملے گا اور تاریک خیال مولویوں کے گھرانوں میں بھی، لیکن اگر آپ عقل اور مزاج کے حساب سے ذرا تاریک خیال سے، ذرا مفلس سے اور ذرا جاہل سے ہوں گے تو پھر آپ کی حیثیت سسرال میں وہی ہوگی جو یورپ کے ہوٹلوں میں افریقہ کے حبشی انسانوں کی ہوا کرتی ہے۔ یا شریف ہندستانیوں کی محفل میں رنڈیوں کی یا ہندستانی افسروں کی نظر میں اپنے ماتحت ہندستانیوں کی یا کوتوالوں کی نظر میں مشتبہ لوگوں کی یا مار کھائے ہوئے طالب علم کی نظر میں اپنے ماسٹر کی یا ہندستانی ٹکٹ کلکٹروں کی نظر میں ہندستانی مسافر عورتوں کی یا ریلوے پولیس مین کی نظر میں بے ٹکٹ سادھوؤں کی یا موٹے مہاجن کی نظر میں ایم۔اے پاس قرضدار کی یا مولانا ثناءاللہ امرتسری کی نظر میں قادیانیوں کی یا عربی گھوڑے کی نظر میں بریلوی فچر اور گدھے کی یا اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کی نظر میں مضمون نگاروں کی یا سرحدی پٹھانوں کی نظر میں لکھنؤ والوں کی یا آج کل کے مسلمانوں کی نظر میں ہندو کی اور ہندو کی نظر میں مسلمان کی یا گشت کرنے والے پولیس مین کی نظر میں بے روشنی کے راہ گیر کی۔

القصہ سسرال نام ہے ان کی کم یا زیادہ افراد کی فرماں برداری، غلامی، بچکوی، اطاعت اور عبودیت کا جو شوہر کے رشتہ دار ہوں یا بیوی کے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بیوی کے لیے شوہر کے خاندان میں شوہر کی والدہ اور شوہر کی بہن بہت زیادہ قابلِ احترام و اطاعت ہیں کہ یہی دونوں ہوتی ہیں جو بیوی کے حق میں ہلاکو خان اور پنجاب کا جنرل ڈائر ہوتی ہیں لیکن شوہر کے لیے سسرال کے ہر فرد کی ناز برداری، غمخواری، دلداری اور تابعداری جس کا خلاصہ انسانیت بھی ہے اور شرافت کی علامت بھی اور شوہر کے ذمہ سسرال کے یہ وہ فرائض ہیں جو علی گڑھ میں یونیورسٹی بنا کر نہ کم کیے جاسکے نہ لندن میں جا کر تعلیم یافتہ ہونے سے دور ہوئے بلکہ اب جو یورپ کی غیر قومی عادات ہندستانی مسلمانوں نے غلامی کے اثر سے اختیار کی ہیں ان کے حساب سے بیوی کو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کا رتبہ دیا جا رہا ہے یعنی عورت کو مرد کے برابر جو درجہ مل رہا ہے اس کے اعتبار سے تو اب شوہر کے لیے بیوی کا خاندان ایک طرح کا ''ہائی کورٹ'' ہو کر رہے گا جہاں بادشاہ اور چپراسی

سب برابر سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں تک تو تھا معاملہ "مراتب" کا اب مرتبہ آتا ہے "فرائض کا"
چنانچہ سسرالی فرائض کی یوں تقسیم کی گئی ہے کہ اگر بیوی کا کوئی رشتہ دار اس کے شوہر کے گھر جائے تو
اسے چاہیے کہ وہ لڑکی کے نام سے اپنے ساتھ مٹھائی، میوہ، زیور یا کمبل ہی سہی مگر تحفہ ضرور لے
جائے اور لڑکی کے سسرال میں سوائے پان کے اور کوئی چیز نہ کھائے نہ لڑکی کے سسرال میں جا کر
چارپائی پر لیٹ جائے وغیرہ بخلاف اس کے اگر شوہر اپنی سسرال یعنی بیوی کے رشتہ داروں میں
جائے تو ایک ایک فرد کو جھک کر سلام کرے اور خیریت دریافت کر کے اپنی بیوی کو آ کر سنائے۔ اگر
اسے معلوم ہو کہ اس کی سسرال کا کالے رنگ والا کتا کہیں بھاگ گیا ہے تو وہ اس کی تلاش میں پہلے
محلے کے ایک ایک مکان کو چھان ڈالے پھر کوتوالی میں جا کر کتے کا حلیہ لکھائے، پھر اخبار "پارس"
لاہور اور اخبار "پائنیر" الہ آباد میں گمشدہ کتے کی تلاش کا اشتہار چھپوائے اور جو معلوم ہو کہ یہ کتا
اکبر آباد کے محلہ نائی کی منڈی میں موجود ہے تو یہ وہاں جا کر اسے اپنے ساتھ لے آئے اور راستہ
میں اسے جوتا تو مارے مگر آہستہ سے۔

پھر اگر بیوی کے رشتہ داروں میں سے کوئی ایک بیمار ہو جائے تو داماد کو چاہیے کہ نوکری چھوڑ
کر بھاگے، ڈولی اور تانگہ ساتھ لے کر پہلے اپنے گھر جائے وہاں سے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر بیمار
کے گھر جائے اور بیمار کی چارپائی کے اوپر یا نیچے یا قریب یوں بیٹھ جائے گویا مارے غم کے اب وہ
خود مرنے والا ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں وہ بیمار کا تھوک بھی صاف کرے اور بستر بھی اور جو بیماری
سے بھی اچھا نہ ہو تو اسے حکیم محمد جمیل خاں کے پاس دہلی لے کر جائے اور جو حکیم محمد جمیل خاں
صاحب اس وقت ہوں رامپور میں تو یہ سیدھا رامپور پہنچے اور جو یہ بیمار راستہ ہی میں "جان بحق
تسلیم" ہو جائے تو پھر یہ داماد کفن دفن کے بعد بیوی کے ساتھ ہم آواز ہو کر اس زور سے روئے کہ
سارا محلہ جان لے کہ داماد بھی رو رہا ہے اور بیوی بھی۔ اسی طرح اگر داماد کے خسر صاحب کی
پنشن رک جائے تو پھر داماد انھیں عمر بھر روٹی بھی اپنے پاس سے کھلائے اور حقہ بھی پلائے۔ اگر
سالے آوارہ ہوں تو انھیں اپنے مصارف سے تعلیم دلائے، نوکر کرائے اور شادی بھی کرائے۔

یہ تو تھا نمونہ مختصر سے فرائض کا جو انسان کے وقت، دماغ اور دولت کی تباہی کا باعث ہیں۔
اب ان کے بعد مرتبہ ہے "معاملات" کا سو ان کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی داماد اپنی سسرال میں

زیادہ رہ جائے، سسرال والوں کو زیادہ مہمان رکھے یا سسرال والوں سے زیادہ ربط وعلاقہ رکھے تو اس کی ماں اور بہن اس سے ناراض ہو کر کہیں گی کہ:

تو سسرال کا کتا ہے۔

جورو کا مزدور ہے۔

پھر ہمارے ساتھ کیوں رہتا ہے؟

پھر سسرال ہی میں کیوں نہیں رہتا

تو ہمارے گھر آنے کی پھر کیا ضرورت ہے؟

اور سن کہ آج تیری بیوی نے گالی دی۔

اور سن کہ آج تیری ساس نے لٹھ مارا۔

اور سن کہ آج تیرے سسر نے جوتا مارا۔

یہی حال سسرال والوں کا ہوگا جب آپ جائیے گا تو خسر، ساس، سالے اور سالیاں آپ کو گھیر کر بیٹھ جائیں گی اور کہیں گی کہ:

آپ کی والدہ نے ہماری بہن کے ساتھ یہ کیا؟

آپ کی بہن نے ہماری بہن کو آج صبح سویرے آنکھ دکھائی تو آپ ہی بتائیے کہ پھر ہم اپنی لڑکی کو آپ کے گھر کس طرح رکھیں۔

تو آپ اپنے ماں باپ سے علاحدہ کیوں نہیں ہو جاتے؟ یہ ہمارا گھر موجود ہے۔آپ ہی مالک ہیں آج ہی سامان اٹھا لائیے۔

تو پھر ہماری لڑکی کو طلاق دے دیجیے اور مہر کا روپیہ لکھ دیجیے۔

یہ اور اسی قسم کے بے شمار حالات اور رسوم ہیں جو سسرال یا سسرالوں میں موجود ہیں اور تقریباً 95 فیصدی خاندان سسرال کی جاہلانہ گرفت میں جکڑ کر یوں تباہ ہو رہے ہیں کہ اگر سسرالوں کی اصلاح پر جلد توجہ نہ کی گئی تو مسلمانانِ ہند کی اجتماعی اور اخلاقی زندگی کا آخری آغاز اسی جگہ سے ہو کر رہے گا۔

مگر آپ یہ نہ سمجھ لیجیے کہ ملا رموزی صاحب کا سسرال بھی ایسا ہی تاریک خیال اور رسوم کا

پابند ہے اور اسی لیے مُلّا صاحب نے یہ مضمون لکھا ہے۔ الحمد للہ کہ ہمارا سسرال سب سے اچھا، سب سے بہتر اور سب سے بلند و برتر ہے۔ خدا ہمیں اور ہمارے ننھے میاں کی والدہ کو مبارک کرے۔ آمین!

◆◆◆

چند شکریے

آج کہ میں اپنی اس کتاب کے ایک حد تک تفصیلی واقعات کو ختم کر رہا ہوں میری قابلِ صد احترام قرآنی واقفیت اور لائق صد عظمت دینی تعلیم کا اثر مجھے ایک ایسے فرض کو یاد دلا رہا ہے جو آج مغربی تعلیم اور تربیت کے اثر سے بھلا دیا گیا ہے اور جس کا ادا کرنا خوشامد کہا جاتا ہے یا غرض مگر جن دماغوں کو علومِ اسلامی کی دولت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ کہ شکر احسان کس درجہ بلند و برتر شرف ہے اور کس قدر شریف و مستحسن عمل، اس لیے محال ہے کہ میں اس موقع پر اپنے ان عزیز و محترم محسنین کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے میری زندگی کے اس کبھی نہ بھولنے والے انقلاب میں اپنی مقدرت اور محبت سے دریغ نہ فرمایا۔

البتہ ان لائق احترام ہستیوں کے ناموں کا اظہار اس لیے غیر مناسب ہے کہ کتاب ہے ظریف اور محسن ہیں بلند مرتبہ اور باوقار۔ پس اس خوف سے کہ کہیں ممدوحین محترم کو اس کتاب میں ناموں کا اظہار گراں خاطر نہ بنا دیے، میں اخفا نام پر مجبور ہوں پھر بھی میں نے اس کمی کو اپنی دوسری متین اور سنجیدہ تحریروں میں کہیں ظاہر بھی کر دیا ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ ظاہر کرتا رہوں گا کہ تقاضائے کرم یہی ہے۔

ان محسنین میں ظاہر ہے کہ وہی گرامی مرتبت ہستیاں شریک ہیں جن پر اقتدار و مقدرت، دولت و حشمت اور اعزاز و سربلندی کی خدائی نعمتیں نازل ہیں پھر انھیں جو ملّا رموزی ایسے گدائے بےنوا سے محبت ہے اور میرے اس مسئلہ مذکور میں ان میں سے ہر ایک نے جس کرم سے کام لیا اس کے دو ہی سبب قرار دیے جاسکتے ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر لائق شکر ہیں۔

پہلا سبب محض خدائے برتر وتوانا کا فضل وانعام کہ اس نے ملا رموزی ایسے کم مایہ انسان کو ان مستغنی ہستیوں کے دلوں میں جگہ دی، دوسرا سبب ملا رموزی کی "صرف ادبی خدمات" کہ ان کے سوا نہ یہاں بیرسٹری ہے نہ کلکٹر قسم کے خاندان کی کوئی شہرت کہ آج کل یہی چیزیں ہیں انسانی سربلندی کا ذریعہ۔

ان بظاہر اسباب کے بعد چند ایسے اسباب بھی ان محترم ہستیوں کے التفات کا باعث ہیں جنھیں ملا رموزی کے مذہبی اعتقاد وایقان سے تعلق ہے اور وہ یہ ہیں:

(1) حاسدوں اور کم ظرف وکم مایہ مخالفوں کی دراندازیاں کہ تعلیمات اسلامیہ کے برتر از عقل و ہوش و نکات و غوامض میں یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ مخالفت بھی سبب بن جاتی ہے انسانی گناہوں کے عفو ودرگزر اور عروج وترقی کا۔

(2) دوسرا سبب ماں باپ کی وہ خلوص میں ڈوبی ہوئی دعائیں جن کی مقبولیت کی تاثیر سے نہ انگریز منکر ہیں نہ علی گڑھ والے۔

لیکن مُلا رموزی اپنے محسنین کے التفات یا اپنی اس سربلندی کا جو صحیح سبب محسوس کرتا ہے وہ فقط یہ ہے کہ یہ سب کچھ کرشمہ اس واحد و یکتا خدا کا جو زمین وآسمان کی ناقابل احاطہ وسعتوں کا مالک اور مخلوقات عالم کی جانوں کا آفرینندہ ہے اور جو ایک حقیر گداگر کو بحر و بر کا بادشاہ بناتا ہے۔ پس سارے شکریے اسی کی ذات کو زیبا ہیں یا اس کے اس عالی مقام رسول کو جس نے یثرب ایسی ناقابل اعتناز مین سے اٹھ کر کائنات عالم کو بتادیا کہ تمھاری نجات وسرفرازی صرف اس ذات کے اختیار میں ہے جسے خدائے وحدۂ لاشریک کہتے ہیں۔ پس درود وصلوٰۃ ہو اس معظم ومحترم رسول پر صلی اللہ تعالیٰ علیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

عالیجناب محمد عبدالکریم صاحب ولی قریشی مانگرولی

حق ناشناسی ہوگی اگر ہم ممتاز ونامور شعرا اور احباب کے سہروں کے ساتھ اپنے ایک شفیق، شاعر کے سہرہ کو اس کتاب میں جگہ نہ دیں جس کا ایک ایک مصرع جانِ لطافت اور روحِ صداقت ہے۔ صداقت ان معنی میں کہ حضرت ولی دنیائے شعر وادب میں اس سے پہلے کچھ بھی نہ ہونے پر

ہماری شادی کے موقع پر مارے خلوص ومحبت کے جس قدر جلد شاعر بنے ہیں اسے آنے والا سہرا خود ثابت کردے گا۔

حضرت ولی مانگرولی ہمارے محترم دوست محمد بشیر صاحب بارایٹ لا، آنریری مجسٹریٹ و میونسپل کمشنر کانپور کے ملازم ہیں اور صاحب موصوف کے ہمراہ جب لندن تک جا پہنچے تو پھر وہ کیا کچھ نہیں ہیں۔ آپ کی مادری زبان'' کاٹھیاواڑی اردو'' یا گجراتی ہے اسی لیے آپ ہمیشہ گجراتی زبان میں شعروسخن کے'' سمندر بہایا کرتے ہیں'' لیکن یہ محض ہمارے خدا کہ آپ نے ہمارے سہرا کو اردو زبان میں'' کہہ کر'' رکھ دیا۔ اگست 1929 میں برادرم محمد بشیر صاحب بارایٹ لاء نے ہمیں کانپور یاد فرمایا اور ہم کانپور پہنچے تو حضرت ولی مدظلہ ہماری نگرانی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ اب کیا تھا ادھر کمرہ میں ہم دن بھر مضمون نگاری فرماتے تھے اور اُدھر حضرت ولی رات بھر شاعری فرماتے تھے۔ ہوتے ہوتے ایک دن آپ کو سوجھی کہ حضرت ملا رموزی کی شادی چونکہ ابھی حال میں ہوئی ہے اس لیے حق تعارف یہ ہے کہ سہرا کہہ دیا جائے اس لیے جناب مکرم نے دوسرے ہی دن کوئی پندرہ منٹ میں عین ہماری آنکھوں کے سامنے جو سہرا کہہ کر ہمیں عطا فرمایا اس کی جادو بیانیاں آپ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

لیکن قبل اس کے کہ آپ اصل سہرہ ملاحظہ فرمائیں اس کی چند دلفریب خصوصیات بھی معلو فرمالیجیے مثلاً سہرا پیش کرنے کا عام دستور یہ ہے کہ کسی نفیس سے کاغذ پر نہایت درجہ خوشخط لکھوا کر کسی حسین چوکھٹے میں جڑوا کر پیش کیا جاتا ہے، اس کی پیشانی پر ممدوح کا خاصا القاب پیش کرنے کا سبب وغیرہ وغیرہ ہوتا ہے اس لیے حضرت ولی نے بھی اس سہرے کی پیشانی لکھی ہے جو یوں واقع ہوئی ہے:

بہ تقریب شادی بعالیجناب مولانا مُلاّ رموزی صاحب دام حشمتہٗ

''سہرا''

اب اس'' بہ تقریب شادی اور بہ عالی جناب اور دام حشمتہٗ'' والے سہرہ کی پہلی شاعری ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

میری بھی خوشی یہ تھی ہو آپ کے سر بھی سہرا
لو پھول چُنے تھے گوندھیں گے ابھی سہرا

لیجیے اب اگر اس مطلع الانوار مطلع کو ہم نے ''پہلی شاعری'' لکھا تو کیا غلطی کی کیونکہ مفہوم کو چھوڑ کر جس طرح چاہو مصرعہ ثانی کو مصرعہ اولی سے ہم وزن کر و لیکن کبھی نہ ہوگا پھر مفہوم میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ہماری شادی حضرت ولی کی خوشی سے ہوئی ورنہ ناممکن تھی یا آپ اس کارِ خیر میں ہمارے 'مشیرِ نکاحی' ضرور تھے اس لیے کسی نے آپ سے جب سوال کیا کہ ملا رموزی کی شادی ہو جانا آپ کے نزدیک کیسا ہے تو آپ نے مصرعہ میں کہہ دیا کہ 'میری بھی خوشی یہ تھی'۔

نا آشنا تھا مالی اس کو خبر یہ کیا تھی
کہہ تو دیا تھا ہم نے لو چنیں گے ابھی سہرا

یہ پورا شعر ہمارے لیے نہیں کہا گیا بلکہ اس میں مالی پر غصہ کیا گیا ہے اب یہ اور بات ہے کہ یہ پورا شعر ہمارے سہرے میں آ گیا، مگر کلام کی قدرت دیکھیے کہ اس شعر میں ردیف وقافیہ کے عوض لفظ ''بھی'' ہر حال میں موجود ہے۔

گھوڑے پہ چڑھے ہے کیوں کر کوئی آ کے بٹھا دیتا
دیکھیں گے ہم یہاں سے اس شان کا بھی سہرا

اس شعر کو واقعہ کے مقابل شاعر کے 'عالم خیال' سے زیادہ نسبت حاصل ہے یعنی شاعر نے مراقبہ کی حالت میں دیکھا کہ ہم خود بخود گھوڑے پر چڑھے جا رہے ہیں تو اس نے ہمیں ڈانٹا کہ 'خود کیوں سوار ہوتے ہو کوئی آ کر بٹھا دے گا نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ہماری برات میں فقط ہم اور ہمارا گھوڑا ہی شریک تھا اور کوئی اتنا بھی نہ تھا کہ ہمیں آ کر سوار کرا دیتا یا پھر یہ بات ہوگی کہ ہمارے تمام براتی لوگ کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے اور ہم تھے کہ خود بخود گھوڑے پر سوار ہو رہے تھے اس لیے شاعر نے دوسرے مصرع میں دوستانہ طعن کے ساتھ کہا کہ اچھا اگر تم اسی طرح سوار ہو کر رہو گے تو ہم بھی شریک نہ ہوں گے بلکہ یہاں سے اس شان کا بھی سہرا دیکھیں گے لفظ ''یہاں سے'' مراد شہر کانپور ہے کیونکہ برات کے وقت حضرت ولی کانپور ہی میں مقیم تھے:

کوئی پوچھے ہم سے کیوں کر کہ یہ قصد ہے کہاں کا

کیا ہاتھ میں لیے ہو، کیا گاؤ گے ابھی سہرا

یہ شعر بحر، وزن، قافیہ، ردیف اور مضمون کے لحاظ سے جس درجہ ''شفاف'' ہے وہ ظاہر ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ مضمون نگاری، تقریر یا شعر میں آدمی جتنا آگے بڑھتا ہے اتنی ہی طبیعت کھلتی جاتی ہے اور مضامین کی آمد زیادہ ہوتی جاتی ہے اس لیے حضرت ولی کا بھی یہی حال ہوا ہے۔ لہٰذا اب جو شعر کہا ہے وہ شاعری کی تمام قیود و شروط سے آزاد ہو چکا ہے جیسا کہ ارشاد عالی ہے کہ:

کیوں کر خوشی ہو نہ مجھے آپ کی شادی سے رموزی

ہم نے مدت سے یہ سوچا تھا کہ کبھی گائیں سہرا

اب تو ثابت ہو گیا کہ یہ جو شعرا عام شادیوں پر سہرے کہا کرتے ہیں محض اس لیے کہ انھیں اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ وہ شادی میں جا کر سہرا گاتے ہیں لیکن ہماری بدقسمتی سے حضرت ولی کو ہماری شادی میں شرکت کا چونکہ موقع نہ ملا اس لیے آپ نے ''گانے'' کے لیے ایک حور کو حکم دیا اور اس حور نے جس طرح اس سہرے کو گایا وہ ملاحظہ ہو:

تم رہو خوش، گھر ہو آباد یہ دعا ہے

کہہ دو حوروں سے وہ جلد آئیں اور ابھی گائیں سہرا

معاف کیجیے یہ ہمارے لکھنے کی خطا ہے کہ مصرعہ ثانی ذرا آگے بڑھ گیا ہے شاعر نے تو مصرعۂ اولیٰ کے برابر ہی کہا تھا۔ ہاں یہ واضح رہے کہ لفظ ''ابھی'' کا آنا پھر شروع ہو گیا ہے۔

اتنے حالات کے بعد ہماری شادی پھر سے شروع ہوتی ہے یعنی برات روانہ ہو رہی ہے اس لیے ارشاد ہے کہ:

پان لے آؤ ذرا جلد رموزی کے لیے

لو وہ بن آئے ہیں دولہا ان کو پہنائیں گے ابھی یہ سہرا

اس مصرعۂ ثانی کو بھی ہم نے کھینچ کر لمبا کر دیا ہے ورنہ ولی صاحب نے تو لفظ ''ابھی'' اس میں باندھ دیا ہے۔ مضمون صاف ہے۔ لطف اٹھائیے اور داد دیتے جائیے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ محلے کے لوگ شادی والے گھر میں پہلے سے آ کر بیٹھ جاتے ہیں پھر عین وقت پر اپنے گھر جا کر کپڑے بدل کر آتے ہیں اس لیے حضرت ولی پر بھی یہی حالت طاری ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا

ہے کہ:

تم اب کریم اٹھو بن ٹھن کے تم بھی جاؤ
واں دھوم مچ رہی ہے گائیں گے ابھی سہرا

کہنے کو اوپر کے سہروں میں عموماً اور بعض ان سہروں میں خصوصاً ہمارے حسن عالم آرا پر بہت کچھ لکھا گیا ہے جنھیں ہم نے طوالت کی وجہ سے درج نہیں کیا اور یہ پرانی شاعری کا حسن بھی سمجھا گیا ہے کہ دولہا کو سہرے میں حسن و جمال کی ''نیلم پری'' بنا دیا جاتا ہے لیکن حضرت ولی نے ہمارے حسن و جمال پر جس ''کچکچاہٹ'' کا اشارہ فرمایا ہے حقیقت میں اس نے ہمیں کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

کیا کہوں جس گھڑی دولھا وہ بنے بیٹھے تھے
ٹھیک اس وقت ولی نے بھی جو گایا سہرا

ابھی آپ کا ذوق اور خیال اس جان شاعری سہرے کے بے شمار اشعار کا منتظر ہوگا کہ یکا یک آپ سہرے میں یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ''تمام شد'' از قلم محمد عبدالکریم ولی قریشی کاٹھیا واڑی مقیم کانپور، اس لیے آپ بھی دعا کیجیے کہ خدا ایسے شاعروں کی کثرت سے اردو کے حسن کو تا دیر سلامت رکھے۔ آمین!

مرہونِ کرم
مُلّا رموزی

◆◆◆

خواتینِ انگورہ

مؤلفہ

مُلّا توحیدی

انتساب

ملک وملت کے لیے جس طرح ترکی قوم کی قربانیاں اور اس کے حیرت زاکارنامے ایشیا کے لیے سرمایۂ عبرت ہیں اسی طرح حامل خلافت ترکی قوم کے ہمدردوغمگسار اور ملک وملت کے سچے مونس عالیجناب ناصرالاسلام میاں محمد حاجی جان محمد چھوٹانی صدر مجلس مرکزیہ خلافت ہند کا فداکارانہ جذبۂ ایثار وعمل کتاب ہٰذا کے موضوع سے ایک قریبی اور امتیازی نسبت رکھتا ہے اس لیے میں بہ کمال عقیدت اپنی اس ناچیز کتاب کو ناصرالاسلام سیٹھ صاحب ممدوح کے نام نامی پر معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

گر قبول اُفتدز ہے عزوشرف۔

عقیدت کیش

''توحیدی''

فہرست مضامین

مقدمہ

اللہ اکبر

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

اسلامی دنیا کی گزشتہ تباہی اور مسلمانانِ عالم کی موجودہ ابتری کا اصل باعث اگر ان حروبِ صلیبیہ کو کہا جائے جو بعض متعصب مغربی افراد کی کج مج دماغی کا نتیجہ تھیں تو میں کہوں گا کہ یورپ کی تمام تر طاقت ہی اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی اور مغرب کی مجموعی قوت مسلمانوں کو دنیا سے ناپید کرنے میں آج بھی قاصر ونا کام ہے، لیکن مجھے اس امر کے اعتراف میں تامل نہیں کہ یورپ نے اسلامی دنیا پر جو سب سے نمایاں فتح حاصل کی وہ اسلامی اقوام کی اجتماعی روح فنا کردینا اور ان میں افتراق وانتشار پیدا کردینا ہے۔ مسلمانوں پر یورپ کا یہ وہ تباہ کن حملہ تھا جس نے بالآخر آج مسلمان ایسی تابناک روایات کی حامل قوم کو ذلت وخواری کے تاریک غار میں ڈھکیل دیا، لیکن بجائے اس کے کہ میں مسلمانوں کی واژگوں طالعی کے اسباب مغرب کے سر تھوپ دوں مجھے خود مسلمانوں میں اس قدر اہم اور شرمناک کوتاہیاں نظر آتی ہیں کہ ان کے سامنے یورپی اقوام کا بغض وعناد کوئی چیز نہیں ٹھہرتا۔ اگر یورپ نے مسلمانانِ عالم کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی تو خود مسلمانوں نے اس روح فرسا عمل کا کیا رد کیا؟ کچھ نہیں۔

میرے نزدیک بغداد وقرطبہ، ایران، مصر کے عظیم الشان اسلامی جوامع کی شکست وبرہمی

نے عالمِ اسلام کو اس قدر نقصان نہیں پہنچایا جس قدر ''جامعہ خلافت'' سے دوری نے مسلمانوں کو نیست ونابود کر دیا۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ہمیشہ ایک مرکز و جامعہ سے متعلق رہ کر دین ودنیا کی سعادتیں حاصل کریں اور یہ مرکز و جامعہ ''خلافت اسلامیہ'' تھی، لیکن قطع نظر خلافتِ راشدہ اور دیگر اسلامی خلافتوں کے جب یہ سعادت اندوز ورثہ آلِ عثمان میں منتقل ہوا تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسلمانانِ عالم کا نصیب ہی الٹ دیا گیا اور ان میں اس مسعود و مبارک جامعہ سے بُعد و جدائی کے اسباب پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

تاریخی اعتبار سے گو ابتداً خلافت عثمانیہ سے سلاطین اسلام کو گونہ ربط وعلاقہ رہا لیکن اس آخری صدی میں مسلمانانِ ہند نے خصوصیت سے مرکزِ خلافت کو جس قدر فراموش کیا اس کا اندازہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے اُن صفحات سے ہو سکتا ہے جو ان کی بدنصیبی سے سیاہ ہو رہے ہیں تم دور نہ جاؤ صرف 1909 کے زمانہ سے قبل پر نظر ڈالو اور غور کرو کہ کتنے ہندی مسلمان تھے جو خلافتِ عثمانیہ کی عظمت و برگزیدگی اور اس کے احکام و فرامین کو اپنی نجات و سربلندی کا باعث سمجھتے تھے اور اس دینی مرکز سے ربط و تعلق کے لیے بےقرار تھے۔ شاید کہا جائے کہ آج سے بیس برس قبل خود خلفائے عثمانیہ نے ہمیں بھلا دیا تھا اور انھوں نے ہمیں اس مرکز سے وابستگی کے لیے مخصوص دعوت نہیں دی، اس کے جواب میں تمام سیاسی اسباب سے قطع نظر میرے پاس 1901 سے لے کر 1912 تک کے وہ ''سفرنامے'' ہیں جو مسلمانانِ ہند کے ذمہ دار افراد نے مرکزِ خلافت میں حاضر ہو کر لکھے ہیں۔ ان سفرناموں سے مسلمانانِ ہند اور خلیفۂ عثمانی کے تعلقات پر جو روشنی پڑتی ہے اس سے یہ اندازہ ہو گا کہ عثمانی خلیفہ اسلامی ہند کی فلاح و بہبودی کا کہاں تک دلدادہ تھا اور مسلمانانِ ہند کو اپنے اس مرکز و جامعہ اور اس آسمانی امانت کی حامل قوم سے کہاں تک عشق و شیفتگی حاصل تھی؟

میں نے کتاب ہٰذا میں ترکی خواتین کے قدیم دورِ ترقی کے حالات معلوم کرنے کے لیے کوئی دو سو سفرنامے پڑھے ہیں اور کوشش کی کہ مجھے اردو زبان ہی میں ایسا سفرنامہ مل جائے جس میں ترکی خواتین کے حالات وضاحت سے جمع کیے گئے ہوں مگر آہ کہ میں اس مقصد میں ناکام رہا اور ان اردو سفرناموں کے مطالعہ سے مجھے جو دماغ سوز تکلیف پہنچی اس کی شرح یہ ہے۔

1۔ کسی ہندستانی سیاح نے ترکی ممالک اور ترکی قوم کے حالات کو اُس عقیدت وشیفتگی سے نہیں لکھا جیسا کہ ایک پکے موحد کو درسعادت کے حالات لکھنا چاہیے۔

2۔ ان مسلمان سیاحین نے ترکی کے حالات کو اس قدر سرسری اور سطحی انداز میں بیان کیا ہے گویا وہ ایک وحشی اور غیر متمدن ملک میں پہنچ کر اپنے روزنامہ کو اصولاً بھر رہے ہیں۔

3۔ بہ اعتبارِ جامعیت اگر چہ بعض سفرنامے اچھے لکھے گئے ہیں لیکن پھر بھی اصولی اور قومی نقطۂ نظر سے یہ ناکافی ہیں۔ ایسے سفرنامے جن کا مقصد درسعادت کے حالات کو بخوبی بیان کر کے خلافتِ عثمانیہ کی محبت اور اس کی حکمران حیثیت کو نمایاں کر کے عالمِ اسلام کو اس کی طرف مخاطب کرنا ہو بہت کم ہیں۔ البتہ بیگم صاحبہ جنجیرہ کا سفرنامہ ایسا دیکھا گیا جس کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ سیاح کو اس قوم اور اس کی تمدنی اور کاروباری زندگی کے تمام شعبوں سے ایک خاص شغف ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ قوم میرے سفرنامہ کے ذریعہ دنیا میں ایک ممتاز حیثیت کے ساتھ نمایاں ہو۔

4۔ اس کے خلاف ان مسلمان سیاحین نے یورپی ممالک اور یورپی نظامِ حکومت پر جس وضاحت سے قلم اٹھایا ہے اور جس ثنا و مدحت کے ساتھ یورپی حالات جمع کیے ہیں ان سے ان کی یورپ پسندی کا وہ اٹل اور کامل ثبوت ملتا ہے جو شاید ایک پکے عیسائی کو بھی حاصل نہ ہوگا۔

مذکورہ حالات اور جغرافیائی رکاوٹوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ذرائع معلومات کی ان خرابیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہم ایشیا کی اس بلند مرتبہ اور ترقی یافتہ قوم کی رہنمائی سے محروم ہو گئے۔

آج جو لوگ مصری خواتین کی تازہ بہ تازہ جدو جہد کے اہم پہلوؤں کو جانچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ترکان انگورہ کی تحریک نے سارے ایشیا کو بیدار کر دیا اسی طرح مصری خواتین کا مردوں کے دوش بدوش جدو جہد میں حصہ لینا محض ان ترکی خواتین کی تقلید ہے جنھوں نے اناطولیہ کے میدانوں میں ایثار و عمل کے وہ نادر نمونے پیش کیے ہیں جن پر ترکی تاریخ کے صفحات ابدالآباد تک جگمگاتے رہیں گے۔

میں کہتا ہوں اور بہ دلائل کہتا ہوں کہ ترکی خواتین کے موجودہ کارناموں اور خدمات نے

ہندی خواتین خصوصاً مسلمان عورتوں کے لیے ایک شاہراہ ترقی پیش کی ہے اور قطع نظر ان کی سیاسی جدوجہد کے اگر تم ان کی علمی و معاشی خدمات ہی کو معلوم کرو گے تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ ترکی خواتین نے نہ صرف ایک طریق عمل ہی پیش کیا ہے بلکہ انھوں نے اپنے اعمال و کارناموں سے اسلامی ہند کے اُس نہایت ہی قدیم اور نا قابلِ انفصال مسئلہ کا فیصلہ کردیا ہے، جس پر اسلامی ہند میں آج تک اختلاف و مذاکرہ قائم ہے اور وہ مسئلہ ''پردہ ہے'' جس کے رواج و عدم رواج پر اس وقت تک غلام ہندستان میں بحث و مکالمہ ہو رہا ہے، لیکن ترکوں نے جس مذہبی احترام و پابندی کے ساتھ اپنی عورتوں کو دنیا کے تمام شعبوں میں شریک و داخل کیا اس کے کامیاب نمونے تمھیں کتاب کے آنے والے صفحات میں ملیں گے۔ ترکی عورتوں نے موجودہ جدوجہد میں جس جوش و قابلیت سے حصہ لیا ہے اس کا ایک حوصلہ افزا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اسی ہزار کی تعداد میں میدانِ جنگ کی آتش فشانیوں میں اپنے مردوں کے ہمدوش ملک و مذہب کی حفاظت کا مقدس فرض ادا کیا۔ اور دوسرا ثبوت یہ ہے کہ جب فتح ایشیائے کوچک کے بعد ترکانِ انگورہ اندرونی اصلاحات میں مصروف ہوئے اور 17 فروری 1923 کو سمرنا میں زیرِ صدارت فاتح آرمینیا مارشل کاظم قرہ بکر پاشا ترکی اقتصادی کانفرنس ہوئی تو اس میں پانچ سو ترکی عورتیں بطریق ڈیلی گیٹ شریک ہوئی تھیں اسی طرح انگورہ گورنمنٹ کے دوسرے شعبوں میں جس قدر عورتیں کام کر رہی ہیں ان کی فہرست یہ ہے:

1۔ محکمۂ تعلیماتِ عامہ 735
2۔ محکمۂ ٹیلیگراف 301
3۔ شفاخانے 14793
4۔ باربرداری 959
5۔ متفرق دفاتر 5843

(المقطم مصر، بحوالہ ینی گون انگورہ)

گویا ترکی عورتوں نے جس طرح میدانِ جہاد میں عہدِ سعادت کی مجاہد خواتین کے ایثار و عمل کو زندہ رکھا اسی طرح وہ آج تمدنی و معاشی معاملات میں مردوں کے شانہ بہ شانہ شریکِ عمل

ہیں۔ لہٰذا ہندی خواتین خصوصاً مسلمان عورتوں کے لیے میں نے اس[1] کتاب میں جن ترکی عورتوں کے حالات فراہم کیے ہیں ان میں عروج و ترقی اور کسبِ علوم و معارف کے ایسے درخشاں نمونے ملیں گے جو ہندی عورتوں کی تقلید و عمل کے قابل ہیں اور یہی سبب ہے کتاب ہٰذا کی تالیف کا۔

ماخذ:

جن اربابِ علم کو غلام ہندستان کے علمی ذوق کی موجودہ حالت کا اندازہ ہے ان کے نزدیک اردو مصنفین کی مشکلات بھی مسلم ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی تالیف کے لیے بغیر کسی اقتباس و التقاط کے کام نہیں چلتا، خصوصاً ترکی کے تازہ انقلاب کے لیے سوائے اخبارات کے کوئی ایسی مستند کتاب نہیں جس سے کوئی مولف فائدہ اٹھا سکے لہٰذا میرے لیے بھی چارہ کار یہی تھا کہ کتاب زیرِ بحث کے لیے میں بھی اخبارات ہی سے استفادہ کروں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اگرچہ میرا عقیدہ ہے کہ اخبارات کی فراہم کردہ معلومات غلط نہیں ہوتیں لیکن میں طبعاً کامل تحقیق اور صحیح استناد کا عادی ہوں لہٰذا اسی لیے مجھے کتاب ہٰذا کی تالیف میں دماغ سوز تکالیف برداشت کرنی پڑیں اور میں نے جب خالدہ ادیب خانم اور آپ کی بہن نگار ادیب خانم اور رضیہ خان کے حالات مرتب کر لیے تو مجھے ان حالات میں بعض امور کے متعلق شک تھا، لیکن ہندستان میں رہ کر کسی ترکی خاتون کے متعلق صحیح اطلاع حاصل کرنا جس قدر ناممکن ہے وہ ظاہر ہے اس لیے مذکورہ خواتین کے متعلق میں نے اپنے بعض ایسے دوستوں کو تکلیف دی جن کا علم ترکی معاملات میں مسلّم و مستند ہے۔ میں نے اپنے محترم بھائی مولوی سید سلیمان ندوی ایڈیٹر "معارف" سے رضیہ خانم مقیم سوئٹزرلینڈ کے حالات طلب کیے کیونکہ مولوی صاحب ممدوح بذاتِ خود سوئٹزرلینڈ میں ترکی مبلغین سے مل کر آئے ہیں اور ممدوح نے براہِ عنایت شفقت میری دوسری کتاب "تاریخ انگورہ" کے لیے، جس قدر کثیر مواد عطا فرمایا ہے اس پر میں ممدوح کا شکر گزار ہوں۔ آپ کے ذریعہ رضیہ خانم کے متعلق میرا شک رفع ہو گیا۔ محترمہ خالدہ ادیب خانم اور آپ کی بہن نگار ادیب خانم کے لیے میں نے اپنے قدیم کرم فرما مولوی سید سجاد حیدر یلدرم بی۔ اے رجسٹرار اینگلو مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ کو لکھا کہ مولوی صاحب ممدوح کو ترکی لٹریچر خصوصاً خالدہ محترمہ کے ادبی کارناموں سے جس قدر واقفیت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں مذکور الصدر حضرات کے بعد میں نے اپنے ان علم پسند دوستوں کو بھی لکھا جن کے ساتھ مجھے اخباری لائن میں کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں ممنون ہوں کہ ان دوستوں نے بھی مجھے کافی امداد بہم پہنچائی خصوصاً شفیقی ہاشمی بی۔اے، چیف ایڈیٹر اخبار ''اخوۃ'' اور ''استقلال'' نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنی کتاب کے لیے ایڈیٹر صاحب ''مسلم اسٹنڈرڈ لندن'' کو لکھوں۔ چنانچہ میں نے نومبر 1922 میں ایڈیٹر صاحب ''مسلم اسٹنڈرڈ لندن'' سے ترکی خواتین کے حالات دریافت کیے۔ جب میں لندن خط روانہ کر چکا تو مجھے اپنے ایک اور فاضل دوست یاد آئے جو کسی وقت میرے ساتھ دہلی کے ایک اخبار میں کام کرتے تھے اور آج کل وہ جرمنی میں مقیم ہیں، میں نے انھیں بھی خط لکھا اور انھوں نے مجھے 19 جنوری 1923 کو مقام ہیمبرگ سے مفصل خط لکھا جو مجھے یکم فروری 1923 کو ملا۔ اسی طرح میں خوش ہوں کہ سوائے میرے ایک باضابطہ کاہل دوست مولوی محمد احمد خاں صاحب ایڈیٹر اخبار ''زمیندار'' کے باقی تمام احباب نے نہایت حوصلہ افزا جواب دیے خاص کر لندن و جرمنی سے جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں وہ اس قدر مفصل اور دلچسپ ہیں کہ میں نے خواتین انگورہ کا دوسرا حصہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اب میں محترم بھائی مولوی سید سلیمان ندوی اور مولوی سجاد حیدر یلدرم بی۔اے کے وہ خطوط درج کرتا ہوں جو ممدوحین نے کتاب زیر بحث کے متعلق مجھے لکھے ہیں۔ ان خطوط سے میری تحقیق اور فراہم کردہ حالات کے لیے میری محنت و کوشش کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خطوط یہ ہیں:

(از دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

''محترم السلام علیکم!

خواتین اتراک کا حال تو مجھے معلوم نہیں، فاطمہ رضیہ خانم سے میں واقف نہیں پیرس میں ڈاکٹر بہزاد آفندی کی ایک بھتیجی مجھے ملی تھیں وہ وہاں پڑھتی تھیں۔

والسلام

سید سلیمان ندوی۔ 21 فروری 1923''

(از مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

''مکرمی تسلیم عرض ہے۔

خالدہ خانم کے مفصل حالات بمبئی کرانیکل میں کوئی ایک ماہ سے زائد ہوا چھپے ہیں اس سے بہتر مضمون ان کے متعلق میری نظر سے نہیں گزرا، اس کے بعد وہ مضمون جو سالک صاحب نے ایک سال ہوا 'مخزن' میں چھپوایا تھا۔

میرے پاس خالدہ خانم کی دو تصنیفیں ہیں ''خراب معبدلر''، ''سویہ طالب''۔ ''خراب معبدلر'' (یعنی ویران صنم خانے) مختصر حکایات اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ ''سویہ طالب'' ایک ناول ہے جس میں اس زمانہ کا ذکر ہے جب کہ نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کو تخت سے اتارا تھا۔

میں جب 1911 میں قسطنطنیہ گیا تھا تب یہ دونوں کتابیں (منجملہ اور کتابوں کے) خریدی تھیں۔ ہاں علاوہ اُن حالات کے جو اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں یہ میں بتا سکتا ہوں کہ خالدہ خانم کے دوسرے شوہر ڈاکٹر عدنان بے ہیں جو حکومت انگورہ کی طرف سے قسطنطنیہ کے گورنر مقرر ہو کر حال ہی میں قسطنطنیہ پہنچے ہیں۔

نگار خانم کے متعلق مجھے کچھ حالات معلوم ہیں۔ ''ہمایوں'' میں جو مضامین خالدہ خانم کے میں نے شائع کرائے ہیں ان کا ماخذ خراب معبدلر ہے''۔

خاکسار

سید سجاد حیدر

6 فروری 1923''

مذکورہ خطوط ہندستان میں میری آخری تحقیق ہیں۔ ان کے بعد میرے بعض اور دوستوں نے اس کتاب کے متعلق جو امداد عطا فرمائی ان میں استاد حضرت مولوی محمد حسین محوی صدیقی، صدر دائرۂ ادبیہ لکھنؤ کا شکر گزار ہوں جن کی شفقت و حوصلہ افزائی کے ذریعہ آج یہ کتاب ناظرین کے ملاحظہ میں پہنچ رہی ہے۔ حقیقتاً مولوی صاحب کی ذات اردو زبان کے لیے کہاں تک مفید ہے اس کا جواب لکھنؤ کا دائرہ ادبیہ، کانپور کا حلقہ ادبیہ اور اس کا مجلّہ ماہی الادب کافی ہے جو مولوی صاحب

ممدوح ہی کے نتائج فکر ہیں۔ آپ کے بعد میرے بہنوئی ڈاکٹر ادریس فاروقی کے لیے دعائے مغفرت ہے کہ مرحوم نے اپنی وفات سے چند دن پہلے مجھ سے اس کتاب کے لیے ولایتی اخبارات کا کافی ذخیرہ عطا فرمایا تھا، آہ کہ آج ادریس نہیں جو اپنی محبوب کتاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔

ادریس کی موت نے میرے دماغ کو جو صدمہ پہنچایا اس کا اثر یہ ہے کہ میں کتاب ہٰذا کو ان کی فرمائش کے موافق مکمل نہ کر سکا:

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

آخر میں مجھے اپنی کتاب کے بعض اسقام کا اعتراف کرنا ہے جن کی تلافی بشرط زندگی آئندہ ایڈیشن میں ہوگی۔

خاکسار

توحیدی عرف ملّا رموزی (بھوپالی)

یکم اگست 1923

ترکی خواتین کا دورِ ترقی

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ترکی خواتین کی عہدِ حاضر میں حیرت افزا قربانیاں اُن کے کسی فوری اشتعال وولولہ کا نتیجہ نہیں ہیں ان کے اُس دور کا مختصر ساذ کر کرنا چاہتا ہوں جسے ترکی خواتین کے صحیح نشو وارتقاء اور تہذیب و ترقی کا اصل زمانہ کہا جاسکتا ہے اور حقیقت میں یہی وہ اگلا دور ہے جس میں ترکی قوم وحکومت نے اپنی عورتوں کو تہذیب وتمدن میں مساوی حصہ لینے کا موقع دیا۔ گویا موجودہ جدید ترکی جدوجہد میں جو گرانمایہ خدمات ترکی عورتوں نے انجام دیں وہ اس کے لیے آج سے کئی سال پہلے تیار کی گئی تھیں۔

مخالفین ترکی تو بجائے خود پوری ترکی قوم پر الزام دھرتے ہیں کہ "وہ یورپ میں متمدن اقوام کے دوش بدوش حکمرانی کے قابل نہیں" لیکن ذیل کے حالات بتلائیں گے۔ جس قوم نے اپنی عورتوں کے ارتقاء اور دماغی علوم تبت کے لیے بکمال فراخ حوصلگی وسائل فراہم کیے ہوں وہ دنیا میں متمدن اقوام کے ہم پلہ کن شاہنشاہی امور میں مساوی نہیں ہوسکتی؟

اگر آج سے پچیس برس پہلے ترکی اور اسلامی ہند کے ربط و تعلق کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ہند میں مشکل سے پچیس فیصدی ہی ایسے مسلمان ملیں گے جو ترکی حکومت اور ترکی قوم کو اس عظمت ومحبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس طرح وہ آج ترکی پر جان ومال سے فدا

ہیں، گویا اسلامی ہند اور ترکوں کے باہمی پُرخلوص تعارف کا زمانہ طویل نہیں بلکہ یوں کہیے کہ جب ترک ہلاکت و بربادی کی آخری حدود پر پہنچ گئے خصوصاً مقامِ خلافت کے سقوط و ہبوط نے مسلمانانِ ہند کو ترکوں سے روشناس کرایا۔ پس اس مناسبت سے مسلمانانِ ہند نے ترکوں کو سب سے پہلے اس وقت پہچانا جب ترکوں میں ''عہدِ دستوریت'' کا آغاز و افتتاح ہوا جسے آج تقریباً پندرہ برس کا عرصہ ہوتا ہے اور ٹھیک اسی طرح ترکوں کے عہدِ ترقی اور ان کے دماغی عروج و کمال کا زمانہ بھی اگرچہ مختلف تباہ کن دور اختیار کرتا رہا لیکن اصل میں ان کے قوی عروج و ارتقا اور نشو و اصلاح کا زمانہ بھی یہی ''عہدِ دستوریت'' ہے۔ گویا ترکوں نے بھی اپنی ذلت و مسکنت کو اسی زمانہ میں محسوس کیا۔ اگرچہ ترکوں کو ترقی کی طرف مائل کرنے والا سبب کوئی غیر معمولی حادثہ نہ تھا بلکہ وہی ''دائمی ارتقا'' تھا جو انسانی علو و بلندی کا رہبر ہوا کرتا ہے تاہم ان کے ان ترقی کن خیالات سے مسلمانانِ ہند اس وقت واقف ہوئے جب وہ انھی اصلاحی جذبات کی بنا پر جنگ بلقان و طرابلس میں الجھائے گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ جنگ بلقان سے پہلے بھی ترکوں میں طبعاً اپنی داخلی و خارجی اصلاح کے خیالات پیدا ہو گئے تھے اور ان کی ایک ''نوجوان جماعت'' تھی جو طریقِ حکومت کو جدید اصول پر بدل دینے کی موید و حامی تھی اور یہ اسی جماعت کا اثر تھا جس نے بالآخر ایک خونریز جدوجہد کے بعد ترکی حکومت کے شخصی تفوق کے تباہ کن اور مستبدانہ اثرات سے قوم کو بچالیا اور اب وقت آ گیا کہ ترک بھی اقوامِ عالم کے دوش بدوش اپنی اصلاح کریں، لیکن قطع نظر ان تمام رکاوٹوں سے جو ترکوں کے اس اندرونی اور قومی اصلاح و ترقی کے راستہ میں یورپ نے پیدا کیں۔ وہ حقیقتاً نہایت بلند حوصلگی سے اپنی داخلی اصلاح میں مصروف ہو گئے تھے اور یہ اسی جذبہ کا نتیجہ ہے کہ ترکی کے جس دور کو ''عہدِ جہالت'' کہا جاتا ہے وہ اس دور ہی میں اپنے قوائے عملی کو کارآمد بنانے میں محو و منہمک تھے۔

ترکوں کا یہ وہی عہد جاہلیت ہے جب کہ انھوں نے اپنی عورتوں کو عظیم الشان پیمانہ پر ترقی و تمدن اور علوم و معارف کے حصول کے لیے آزادی عطا کی۔ یہ وہی دور جاہلیت تھا جب ترکی عورتیں ترکی مردوں کے ہمدوش اپنی دماغی تربیت میں شریک و منہمک ہو گئی تھیں اور بربنائے دلائل و واقعات میں نہایت بلند آہنگی سے کہہ سکتا ہوں کہ جن ترکی عورتوں نے موجودہ جدوجہد

میں عدیم النظیر خدمات انجام دیں یہ تمام تر اثر اسی دورِ اصلاح کا ہے جب کہ ترک نسوانی مراعات میں بخیل کہے جاتے تھے۔ اب میں بعض ایسے حوالے نقل کرتا ہوں جن سے ترکی خواتین کی بیداری اور ان کی ترقی کے ابتدائی حالات کا اندازہ ہوگا اور صرف اسی حوالہ سے ترکی خواتین کے دورِ بیداری اور ترکوں کے اصلاحی خیالات کی تاریخ معلوم ہوگی۔ یہ مضمون ایک عیسائی عورت مس بلزنٹ کا لکھا ہے جسے پیرس کے نامور رسالہ ''ایشیا'' سے نقل کیا جاتا ہے۔ مس بلزنٹ وہ انصاف پسند عیسائی عورت ہے جو عرصہ تک قسطنطنیہ کے سرکاری کالج میں پروفیسر رہ چکی ہے اور ترکی تہذیب و ترقی اور معاشرت سے بخوبی واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ترکوں کے ان ترقی کن خیالات سے کامل طور پر واقف ہے جو ان کے دماغ میں نسوانی اصلاح و آزادی کے لیے برسوں پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ ذیل کے مضمون میں خاتون مذکور نے ترکی خواتین کی علمی سرگرمیوں پر ایک جامع نظر ڈالی ہے جس کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔

حصہ اول اس امر سے متعلق ہے کہ خود ترکی حکومت نے خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے کیا کچھ کیا؟

حصہ دوم میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ عوام ترکی نے اپنی عورتوں کو تہذیب جدید کے اصول پر تعلیم دلانے میں کس دلچسپی کا اظہار کیا؟ یہی وہ دو حصے ہیں جن پر خاتون مذکور نے بکمالِ جامعیت مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون سے ترکوں کی معارف پسند طبائع کا صحیح اندازہ ہوگا۔ مضمون یہ ہے:

> ''فرقۂ اناث کی تحریک دنیائے اسلام میں گزشتہ صدی کے تقریباً وسط میں پہلے مصر میں اور پھر کوہ قاف کے دامن میں شروع ہوئی۔ یہ تحریک چند مہذب شخصوں کی مخالفت اور ہجو کے پیرایہ میں اس اصول کے متعلق تھی کہ ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ عورتیں قعرِ مذلت اور جہالت میں پڑی ہوئی ہیں۔ یہی تحریک کچھ مدت بعد ترکی میں بھی شروع ہوئی اور وہاں سے اس نے بڑی ترقی کی ہے کیونکہ جب سے 1909 کی دستوری حکومت برسرِ پیکار ہے عورتیں اپنے حقوق کے لیے برابر جدوجہد کر رہی ہیں۔ مس بلزنٹ نے مندرجہ ذیل فقرات اخبار ''منزورلڈ'' کے حال کے ایک نمبر سے لیے ہیں اور جن سے اس جانبازانہ روح کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے جس نے ترکی عورتوں کو اپنی آزادی کے لیے آمادہ

سعی و جہد کر دیا۔ یہ اخبار "انجمن تحفظ" حقوق نسواں ترکی کا ترجمان ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

اگر حقیقی خوشی حاصل نہ کر سکیں تو اس میں قسمت کا کیا قصور ہے۔ قصور تو ہمارا ہے۔ مرد آج صاف طور پر دیکھ رہے ہیں اور ایسا پیشتر شاید ہی ہوا ہو کہ آئندہ سالوں میں ہماری قوم کی کامیابی اور فلاح و بہبود کا انحصار زیادہ تر ہم پر یعنی اپنی نسل کی ماؤں اور لڑکیوں پر ہے۔ آزادی تعلیم و ترقی، عملی اور اخلاقی پہلوؤں سے یہی ہماری دلی خواہش ہے اور یہی اپنا مقصد ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ کون ہم کو خوش کر سکتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ ہم کو کس طرح اپنے وطن اور اہل وطن کے لیے مفید ثابت ہونا چاہیے؟

1909 سے لے کر ترکی عورتوں نے اخبارات کی بنیاد ڈالی ہے اور جن کی ایڈیٹری اور نامہ نگاری بھی عورتیں ہی کر رہی ہیں تا کہ وہ اشتراکی اور اقتصادی معاملات پر بحث کریں اور یہ ایک ایسے ملک میں جہاں پہلے عورتوں کا محض نام لینا بھی حیات عامہ میں ممنوع تھا اور جہاں قانونی دستاویزوں میں بھی ان کا نام نہیں لیا جاتا تھا، اس حالت میں اتنی تبدیلی ہوئی ہے کہ آج یہ معمولی بات سمجھی جاتی ہے کہ استنبول کے اخباروں میں ایک شاہزادی کا نام کسی فیاضی کی ذیل میں یا کسی مشہور عورت کا نام پڑھا جائے تو برلن سے چلی ہے اور بروصہ آ پہنچی ہے۔ عورتوں نے کلب اور انجمنیں قائم کی ہیں جنھوں نے گزشتہ نو سال کی جنگوں میں بڑی پبلک خدمات سرانجام دی ہیں اور جن کے عوض انھوں نے اپنے فرقے کے لیے خاص مراعات حاصل کی ہیں۔ انھوں نے قدامت پسندوں کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود مستقل اور پائیدار ترقی کی ہے۔ ترکی عورتوں کے پلیٹ فارم سے چند سابق نورانی مراسم اور سابق اسلامی حقوق کا مطالبہ بآواز بلند کیا جا رہا ہے جن کے ماتحت عورتوں کو پہلے سے زیادہ آزادی اور امتیازی حیثیت حاصل تھی وہ تعلیم و اقتصادی آزادی کے لیے مردوں کے برابر موقع چاہتی ہیں۔ مثلاً شادی اور طلاق کے معاملہ میں منصفانہ سلوک وغیرہ۔

گزشتہ زمانہ میں عورتوں کو زیادہ تر جرم کے حقوق سکھائے جاتے تھے۔ مسجد کی ابتدائی درسگاہوں میں چند ایک کو قرآن مکرم کے کچھ سپارے تھوڑا سا جغرافیہ اور کچھ حساب وغیرہ سکھایا جاتا تھا۔

البتہ 1870 میں مشہور و معروف ترکی مورخ علامہ جاوید پاشا نے اس رائے کا اظہار کیا کہ
''عورتوں کو وہی تعلیم دی جائے جو مردوں کو دی جاتی ہے''۔

''علامہ جاوید پاشا کی دو صاحبزادیوں فاطمہ عالیہ خانم اور آمنہ خانم نے فارسی تہران کے ایک شیخ سے پڑھی۔ عربی ایک درویش سے اور ترکی، ترکی نارمل اسکول کے پہلے گریجویٹ سے اور موسیقی ایک فرانسیسی خاتون سے اور فرانسیسی فلاسفی اور فلسفۂ جذبات ایک دوسری خاتون سے۔ جبر و مقابلہ علم و مثلث اور ہیئت و جغرافیہ اپنے بھائی سے اور مذہب و تاریخ اپنے باپ سے۔ فاطمہ عالیہ خانم مشہور ناول نویس خاتون ہیں اور دارالخلافہ کی علمی زندگی میں کئی سال تک معتد بہ حصہ لیتی رہیں۔

1870 سے دیسی عورتوں کے لیے غیر مکمل درسگاہیں قسطنطنیہ میں قائم کی گئی ہیں، لیکن جب تک سلطان عبدالحمید خاں معزول نہیں ہوئے ترکی طالبات بے کھٹکے ان میں داخل نہیں ہو سکتی تھیں۔ نوجوان ترکوں نے خواہ دیگر معاملات میں وہ کتنے ہی قصوروار ہوں عورتوں کی تعلیم کے لیے صاف طور پر ترقی کی راہیں کھول دی ہیں۔ ان کے نظامِ عمل میں لڑکیوں کے لیے چھ سال کا نصاب شامل ہے۔ یعنی تین سال کنڈر گارٹن اور ابتدائی حصہ کے لیے اور تین سال تعلیم ثانوی کے لیے۔ گزشتہ نو سالوں میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ تقریباً پانچ لاکھ نے اس نصاب سے فائدہ اٹھایا ہے۔ قسطنطنیہ میں عورتوں کے لیے ایک ہائی اسکول، ایک نارمل اسکول اور ایک صنعتی اسکول ہے۔ سابق وزیرِ تعلیم نے طلعت پاشا کی وزارت میں بیان کیا کہ وہ عورتوں کے صنعتی اسکولوں کو ترکی کی سب سے بڑی تعلیمی ضرورت گردانتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اپنے اس خیال کو عمل میں لانے کے لیے ان کے پاس ذرائع نہیں ہیں۔ پانچ سال کا زمانہ ہوا کہ شاہی عثمانی یونیورسٹی نے عورتوں کے لیے حفظ صحت اور ادبیات کے متعلق لیکچروں کا علاحدہ انتظام کیا۔ پانچ سال ہوئے یونیورسٹی نے ایک ڈاکٹری کا نصاب جاری کیا جس میں کئی سو عورتیں داخل ہوئیں۔ اگرچہ گورنمنٹ کی آہستہ روی جو ڈاکٹری پیشہ کو بذریعے لائسنس دینے میں برتی جاتی تھی اس پیشہ کے لیے سدِ راہ ہے۔

ابھی حال ہی میں حکومت عثمانیہ نے یورپی علم و ادب کی پروفیسری کا سلسلہ قائم کیا ہے جس

کے لیے خالدہ ادیب خانم مقرر کی گئی ہیں۔ چند سالوں تک گورنمنٹ نے اقرار نامہ کے تحت قسطنطنیہ اور سوئٹزرلینڈ کے زنانہ امریکن کالج میں طالبات کو استاد بنانے کی شرط پر تعلیم دی۔ 1914 سے تقریباً ایک سو عورتیں جرمنی اور آسٹریا تعلیم کے لیے بھیجی گئیں۔"

اس طویل مضمون کا خلاصہ حسب ذیل نمبر ہیں:

1۔ ترکوں میں اپنی عورتوں کو مردوں کے برابر ترقی دینے کا خیال نہایت وسیع اور قدیم ہے۔

2۔ ترکی حکومت نے اپنی نسوانی رعایا کے لیے ترقی اور کمالات کے تمام دروازے کھول دیے تھے۔

3۔ ترکی حکومت نے اپنی عورتوں کو تہذیب جدید اور علوم و معارف کے حصول کے لیے خود اپنے صرفہ سے غیر ممالک میں بھیجا تھا۔

4۔ ترکی حکومت نے اپنی عورتوں کے جدید طرزِ تعلیم کے لیے خود اپنے ملک میں وسائل و ذرائع بہم پہنچائے تھے۔

5۔ ترکی عورتوں نے بجائے خود ان جدید اصول کے ساتھ کمال دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

6۔ بطریق حاصل، ترکی نے اس زمانہ میں بھی ایسی مستعد اور کامل عورتیں پیدا کی تھیں جس طرح وہ آج دنیا کے سامنے خالدہ وغیرہا کو بطریق تمثیل پیش کر رہی ہے۔

7۔ ترکی خواتین کی موجودہ جد وجہد اس گزشتہ دور ترقی و تعلیم کے عملی نتائج ہیں۔

یہ تو وہ امور تھے جن کی وجہ سے ترکی خواتین یورپین عورتوں کے ہمدوش و ہم پلّہ ہو جاتی ہیں لیکن یہ وصف ترکی خواتین ہی کے لیے خاص کیا گیا ہے کہ انھوں نے ہر وقت اور ہر عہد میں میدانِ جنگ کی عقل سوز تکالیف کو مردانہ وار برداشت کر کے اپنے ملک و مذہب کو دشمن سے بچالیا اور ترکی خواتین کا یہی وہ وصف ہے جس کے مقابل مغربی طبقۂ نسواں سرنگوں نظر آتا ہے اور ان کے اس مخصوص عملی ایثار کے ہمیں جنگ طرابلس و جنگ بلقان میں ایسے ممتاز نمونے ملتے ہیں جن پر ترکی تاریخ ہمیشہ ناز کرے گی۔ پس اس قدر حالات معلوم ہو جانے کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ ان تعلیم پذیرفتہ اور مستعد ترکی خواتین نے جنگ یورپ اور جنگ ترکی و یونان میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیے؟ لیکن قبل اس کے کہ میں "خواتین انگورہ" کے کارنامے بیان کروں کتاب کی جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آغازِ تحریک کے مختصر اسباب بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

1915 کا وہ زمانہ ہے جب کہ ترکی حکومت ایک اضطرابی حالت میں گھری ہوئی ہے۔ جنگ یورپ شروع ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر گیا ہے جرمنی حکومت برابر اس کوشش میں مصروف ہے کہ کسی طرح ترکی حکومت اس کے ساتھ اس کے دشمنوں سے نبرد آزما ہو۔ آخر کار سیاسی الجھنوں اور ضرر دریات نے ترکی حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ جرمنی کے ساتھ شریک جنگ ہو کر فرانس و برطانیہ، جاپان و اٹلی اور روس سے جرمنی کی معاونت میں جنگ آزما ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ترکی حکومت شریکِ جنگ فرنگ ہوگئی اور کامل تین سال تک جنگ آزما رہی۔ لیکن گزشتہ جنگ ہائے بلقان و طرابلس میں جہاں اسے تنِ تنہا مقابلہ کرنا پڑا تھا اس وقت اس کی جنگی طاقت اپنے مقابل دشمنوں کے مقابل نہ تھی تاہم وہ بکمالِ مردانگی روس ایسی قہار قوت سے نبرد آزمائی کرتی رہی۔ اس نے 1917 میں درّہ دانیال پر اتحادیوں کی تین لاکھ بحری فوج کو ایسی تباہ کن شکست دی کہ اتحادیوں کے حوصلے پست ہو گئے، لیکن بدقسمتی سے ترکی کے شریک و معاون جرمن پر خدا کا قہر وغضب نازل ہوا اور جرمنی رعایا نے اپنی فتح یاب فوجوں سے میدانِ جنگ چھوڑنے کا مطالبہ کیا، لیکن جب جرمنی کے جنگی اسٹاف نے اس سے انکار کر دیا تو مقہور و بزدل جرمن قوم نے اندرونِ ملک بغاوتیں شروع کر دیں اور اس طرح اس نے 1918 میں اپنے بہادر جنگجو بادشاہ قیصر ولیم کو مجبور کر دیا کہ وہ تخت و تاج چھوڑ کر تمام جرمنی فوجوں کو واپس بلالے۔ چنانچہ اس کمزوری کے بعد جب جرمنی فوجیں میدانِ جنگ چھوڑ چکیں تو ترکی حکومت بھی جنگ و پیکار ختم کر دینے پر قدرتاً مجبور ہوگئی اور اکتوبر 1918 میں ترکی حکومت اور اتحادیوں کے درمیان التوائے جنگ ہوگیا، لیکن اس التوا میں اتحادیوں نے قبل معاہدہ صلح ترکی حکومت کے تمام جنگی مقامات پر قبضہ کر لیا اور درّہ دانیال میں بحری بیڑہ داخل کر کے 1919 میں ترکی کے دارالسلطنت قسطنطنیہ کو بھی اپنی کامل نگرانی میں لے لیا۔ لہٰذا ایسی صورت میں اُن ترکی مدبرین کی حیات و زندگی خطرہ میں تھی جنھوں نے جنگ یورپ میں ترکی حکومت کو شریکِ جنگ ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ یا جو شریکِ جنگ رہ چکے تھے اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لیے تمام ترکی مدبرین اور جنگی اسٹاف مع وزیر اعظم وزیر جنگ طلعت و انور قسطنطنیہ سے فرار ہوگیا۔ یہ لوگ یورپ و ترکی کے مختلف مقامات میں پناہ گزیں ہوئے جن میں سے انور و طلعت تو جرمنی چلے گئے اور خلیل و جمال نے حلب میں پناہ لی اور ان لوگوں کے فرار ہو جانے کے بعد قسطنطنیہ میں اتحادی اثرات روز بروز قوی ہوتے گئے یہاں تک کہ 1919 میں اتحادیوں نے ترکی ممالک کی باقاعدہ تقسیم شروع کر دی اور 5 مئی 1919 کو ترکی کے زبردست

وزرخیز صوبے سمرنا وتھریس یونان کے سپرد کر دیے اور ان صوبوں میں فوجیں بھی داخل ہوگئیں۔ تمام مدبرین گرفتار و نظر بند ہونے لگے۔ قسطنطنیہ کے جنگی وسیاسی مقامات پر اتحادی فوجیں قابض ہوگئیں غرض ترکی حکومت کا کوئی حصہ ایسا نہ بچا جو اتحادیوں کے اثر میں نہ آ گیا۔ اِدھر ترکی علاقوں میں جہاں یونانی قابض ہوگئے انھوں نے ترکی آبادی پر وہ قیامت خیز مظالم شروع کر دیے جن کے تصور سے کلیجے کو منہ آتے ہیں۔ پس اس عام تباہی نے غیور وشجاع ترکوں کو ازسرِ نو آگ وخون سے کھیلنے کی جرأت آزما دعوت دی اور مقام حلب میں پہلی مرتبہ قائد محترم سرکار تہور آثار حضور گرامی عالی جاہ مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں اتحادیوں سے اپنے تمام ممالک مع دارالخلافہ آزاد کرانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے شجاعت نشان دستے غدار وغاصب یونانی فوجوں پر حملہ آور ہونے لگے۔ انھوں نے ازسرِ نو ترکی ممالک فتح کرنے کے لیے ایشیائے کوچک کے مقام انگورہ کو اپنا فوجی وسیاسی مرکز قرار دیا۔ انگورہ میں ان احرار نے اپریل 1920 میں ایک قومی مجلس کی بنیاد ڈالی جو اصل میں ترکوں کی ''جدید حکومت'' تھی۔ اس مجلس کے تحت احرارِ ترک ایشیائے کوچک میں جدوجہد کے لیے آمادہ کار ہوگئے اور وہ گرد ہا گرد یونانی فوجوں پر تاخت میں مصروف ہوگئے۔ بس یہ وہ تحریکِ آزادی تھی جس کے دیکھتے ہوئے ترکوں کی غیرت پسند اور شجیع عورتیں بھی اپنے مردوں کے دوش بدوش حفظِ وطن اور حصولِ استقلال کے لیے کھڑی ہوگئیں۔ اب ذیل میں ان عورتوں کے کارنامے درج کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے ملک و مذہب اور اپنی فطری آزادی کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے فقید النظیر خدمات انجام دیں۔

◆◆◆

ہزایکسلنسی خالدہ خانم
وزیر تعلیمات انگورہ

خالدہ خانم کا وطنی سلسلہ سرکیشا سے ملتا ہے۔ آپ کی عمر 35 سال ہے۔ آپ کے والد کا نام نامی عثمان ادیب پاشا ہے۔ ادیب پاشا نائب مناب نبی سرکار شریعت مدار خلافت پناہی حضرت اقدس واعلیٰ حضور سلطان عبدالحمید خاں انار اللہ برہانہ کے وزیر خزانہ تھے۔ آپ کی تین بیویاں تھیں جن سے تین ہی لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں خالدہ ادیب خانم، نگار ادیب خانم، بلقیس ادیب خانم۔ ادیب پاشا ایک نہایت بیدار مغز اور روشن خیال آدمی تھے اور خلافت پناہی حضور مرحوم دمغفور سلطان عبدالحمید خاں کے زبردست معتمد اور امین تھے۔ شاہی محل میں آپ کو ''امین'' کے قابلِ قدر لفظ سے پکارا جاتا تھا اور وزرائے خلافت میں آپ سے بڑھ کر کسی دوسرے شخص پر اعتماد نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ ادیب پاشا ہی کی بیدار مغزی اور روشن خیالی تھی کہ آپ نے اس وقت جب کہ ترکی قوم میں یورپین تعلیم سے نفرت کی جاتی تھی اپنی تینوں صاحبزادیوں کو ''جدید تعلیم'' دلانے کا فیصلہ کیا اور خالدہ و نگار خانم دونوں قسطنطنیہ کے مشہور رابرٹسن کالج میں داخل ہوئیں۔ ان نوجوان لڑکیوں نے خداداد ذہن پایا تھا چنانچہ دونوں بہنیں نہایت مکمل حیثیت سے

کالج سے فارغ ہو کر نکلیں۔

خالدہ خانم کی تعلیم کا آغاز 1889 میں ہوا اور اس ذہین عورت نے بکمال مستعدی 1901 میں امریکن کالج واقع باسفورس سے بی۔اے آنرز کا امتحان پاس کیا۔ جس وقت خالدہ کالج میں داخل ہوئیں اس وقت خالدہ کے استاد ایک ترکی پروفیسر احمد صالح بے تھے۔ احمد صالح بے ریاضیات کے ممتاز و مستند ماہر تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک زبردست اور کامیاب اخبار نویس بھی تھے، جن کے علمی و ادبی اور سیاسی مضامین کا ترکی میں شہرہ تھا۔ احمد صالح بے کو خالدہ کی حد سے بڑھی ہوئی ذکاوت اور خداداد ذہانت اپنا گرویدہ بنا چکی تھی، اسی لیے احمد صالح بے خالدہ کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے۔ جس وقت خالدہ نے بی۔اے کا امتحان پاس کر لیا تو انھوں نے احمد صالح بے کے ساتھ شادی کر لی۔ صالح بے سے دو تین بچے بھی پیدا ہوئے لیکن اس عرصہ میں صالح بے نے ایک اور شادی کر لی جو خالدہ ایسی آزاد خیال عورت کی مرضی کے خلاف تھی لہٰذا وہ مجبور ہوئیں کہ ایسے خاوند سے علاحدہ ہو جائیں۔ انھوں نے فوراً صالح بے سے خلع کر لیا۔ اس خلع کے بعد خالدہ کا دوسرا نکاح ڈاکٹر خالد بے کے ساتھ ہوا جو ترکی شاہی فوج میں ممتاز ڈاکٹر تھے[1]

خالدہ خانم علاوہ ایک کامیاب طالب علم کے ایک روشن خیال مضمون نگار بھی تھیں۔ انھوں نے زمانۂ طالب علمی ہی سے مضمون نگاری شروع کر دی تھی۔ چنانچہ 16 برس کی عمر میں انھوں نے ''ترکی پردہ'' پر ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی تھی جس کے ذریعہ وہ ترکی نسوانی حلقوں میں روشناس ہو گئی تھیں۔ خالدہ محترمہ نے ایک کافی زمانہ مغربی لٹریچر اور مشرقی کتب کے مطالعہ میں صرف کیا اور کافی مطالعہ کے بعد آپ نے افسانہ نگاری شروع کی جس کا اسلوب بیان اور طرز پرداز اچھوتا اور نہایت دل آویز تھا۔ خالدہ کے ان بہار آفریں افسانوں کی رنگینیاں اور سحر طرازیاں اپنے دامن میں علم و ادب کے وہ درخشاں جواہر رکھتی ہیں جن پر ترکی لٹریچر اور ترکی ادبی تاریخ ہمیشہ فخر و ناز کرے گی۔ یہ فسانے اپنے موضوع کے اعتبار سے مختلف ہیں مگر خالدہ کے قلم کی آتش ریزیاں سب میں یکساں ہیں۔ ان افسانوں میں سے خالدہ کا ایک افسانہ ''خراب معبدلر'' ہے جس کا دلاویز ترجمہ ''ویران صنم خانے'' ہے۔ دوسرا ناول ''سویہ طالب'' ہے جسے سلطان عبدالحمید خاں

1۔ ملاحظہ ہو عربی اخبار ''اللطائف المصورہ، مصر القاہرہ۔ مورخہ 13 نومبر 1922ء

مرحوم کے عہدِ انقلاب میں لکھا تھا۔

ان افسانوں کی نگر یزیاں اگر دیکھنا چاہتے ہو تو لاہور کے مشہور مجلۂ علیہ ادبیہ ''ہمایوں'' کے صفحات پڑھو جن میں ''ویران صنم خانے'' کا ترجمہ برادرم یلدرم بی۔اے نے شائع کرایا ہے۔ ان افسانوں میں بعض افسانے اصلاحِ معاشرت اور تہذیب جدید پر لکھے گئے ہیں۔ جس وقت خالدہ کے یہ افسانے یورپ میں پہنچے تو ان کی بلند پائیگی اور عدیم النظیر نوعیت نے قبولِ عام حاصل کیا اور روسی، جرمنی، فرنچ اور عربی میں بہ تعداد کثیر ان کے تراجم شائع ہوئے۔ ان رسائل نے خالدہ کو جس طرح یورپ میں روشناس کرایا اسی طرح اب وہ ترکی میں بھی نہایت عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جانے لگیں۔ انھوں نے شعروشاعری کی طرف بھی توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ ماہرِ فن کی حیثیت سے شعر کہنے لگیں۔ خالدہ محترمہ اگرچہ ان گراں پایہ علمی اشتغال میں اپنا وقت صرف کرتی ہیں مگر ان کا صحیح اور طبعی میلان سیاسیات کی طرف تھا۔ اب وہ عملاً چاہتی تھیں کہ ترکی کے نسوانی طبقہ میں جدید خیالات کو فروغ دیا جائے اور ترکی عورتیں ان جدید اصول پر گامزن نظر آئیں۔ اس مقصد کے لیے آپ کو بہت محنت سے کام لینا پڑا۔ وہ ترکی عورتوں کے علاوہ سب سے پہلے ترکی مردوں کو اپنے گھر کی اصلاح کے لیے آمادہ کرتی رہیں۔ وہ تحریر وتقریر کے ذریعہ ترکی کے ذمہ دار افراد کو عورتوں کی اصلاح وترقی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ انھوں نے ترکی میں چھوٹی چھوٹی نسوانی جماعتیں بھی بنائیں جن کا واحد مقصد ''نسوانی تمدن ومعاشرت'' کی اصلاح تھا۔ وہ ترکی عورتوں کو یورپ میں تعلیم دلانے کی سب سے پہلی محرک تھیں۔ انھوں نے اسی زمانہ میں ترکی وزارت تعلیمات پر زور ڈالا کہ وہ ترکی عورتوں میں جدید تعلیم کو فروغ دے اور ترکی عورتوں کو تمام تعلیمی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ خالدہ خانم کے یہ وہ ابتدائی مشاغل تھے جنھوں نے ترکی حلقوں میں ان کا کافی وقار پیدا کر دیا اور تمام ترکی خالدہ کو ایک محترم لیڈر و قائد تسلیم کرنے لگے۔

عہدِ دستوریت کا آغاز ہوا۔ سرکار شریعت مدار حضور پُرنور سلطان عبدالحمید خاں تخت سے اتار دیے گئے۔ ترکی حکومت اور ترکی قوم کی از سرِ نو تعمیر وترقی کے ذرائع اور وسائل بہم پہنچائے جانے لگے اور ترکی نوجوان فضلا وارباب علم وتدبر مصروفِ عمل ہوگئے تو خالدہ خانم نے بھی کھلم

کھلا سیاسیات میں حصہ لینا شروع کردیا۔ گویا خالدہ محترمہ کی سیاسی زندگی کا زمانہ عہد دستوریت سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ ترکی کا ہر فرد اپنی حالت کی اصلاح ودرستی میں کوشاں تھا اور سب سے زیادہ انہماک حکومت کے آئینی وسائل کی ترتیب وتہذیب کے لیے تھا۔ خالدہ کے دوررس دماغ نے اس وقت بھی ترکی خواتین کے لیے میدانِ ترقی میں آسانیاں بہم پہنچانے کے لیے جدوجہد کی اور دستور پسند جماعت کی مقتدر ارکان کو خالدہ نے محض اپنے قلم کے ذریعہ اپنا ہمنوا بنالیا۔ خالدہ خانم نے ترکی نسوانی حقوق کے تحفظ کے لیے اس وقت ایک پُرزور ایجی ٹیشن شروع کیا جس کے سلسلہ میں ترکی طبقۂ اعلیٰ کی خواتین خالدہ کی شریک عمل ہوگئیں۔ اس عرصہ میں خالدہ نے قسطنطنیہ میں متعدد انجمنیں قائم کرائیں اور حقوق طلب عورتوں کی سب سے پہلی تحریک اسی ایجی ٹیشن کا نتیجہ ہے۔ خالدہ کی اس تحریک اور زبردست جدوجہد نے آخرکار ترکی عمالِ حکومت کو مجبور کردیا کہ وہ نظام جہاں بانی اور آئین حکومت میں ترکی عورتوں کے لیے تمام دروازے کشادہ کردیں۔ ترکی نسوانی حقوق کے تحفظ میں خالدہ خانم نے جو خدمات انجام دیں انھوں نے خالدہ کے اقتدار واثر کو مزید قوت بہم پہنچائیں۔ اس جدوجہد میں خالدہ کے معرکۃ الآرا مضامین سے ترکی اخبارات بھرے رہتے تھے اور وہ اس وقت تک برابر سرگرم رہیں جب تک کہ حکومت نے ''کتاب آئین'' میں حقوقِ نسواں کے لیے قوانین درج ومنضبط نہ کرلیے۔ جب آپ کو ترکی عورتوں کے حقوق اور ان کی تمام دینی ودنیاوی ترقیوں کے متعلق اطمینان ہوگیا تو آپ نے اپنے دائرۂ عمل کو وسعت دی اور اب آپ نے یورپ کے اخبارات میں دستور پسند جماعت کی حمایت اور دفاع میں مضامین لکھنے شروع کردیے۔ ان مضامین کا مقصد نظام دستوریت کو استحکام اور ترکی مخالفین کو ساکت کرنا تھا۔ یہ وہ ہنگامہ آرا مضامین تھے جنھوں نے یورپین سیاست داں حلقوں میں ہلچل پیدا کردی اور بڑے بڑے یورپین مدبرین خالدہ کے حکمت افروز زورِ قلم اور پختگی پر عش عش کرنے لگے۔ مضمون نگاری کے اس دور میں امریکہ کے اخبارات نے خالدہ کے مضامین کو بہت شہرت بخشی۔ انھوں نے بڑی خوشی سے خالدہ کے مضامین کو شائع کیا۔ امریکن اخبارات میں جب خالدہ کوئی مضمون لکھتی تھیں تو ایڈیٹر بڑے فخر سے نوٹ میں لکھتا تھا کہ امریکن کالج کی ایک اولڈ بوائے آج ہمارے اخبار میں ایک ترکی مدبر کی شان سے جلوہ گر ہے۔ خالدہ کے ان مضامین نے

یورپ کے اُس تنگ دل طبقہ کی آنکھیں کھول دیں جو ترکی شاہنشاہی حقوق میں ہمیشہ سے ترکوں کا دشمن اور مخالف رہا کرتا تھا۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ خالدہ کسی سیاسی انجمن کی رکن یا صدر نہیں ہیں بلکہ وہ تمام خدمات محض ایک قومی خادم کی حیثیت سے انجام دے رہے ہیں۔ اور گو خالدہ کا قلم یورپ اور تمام علمی دنیا میں کسی مزید شرح و تعارف کا محتاج نہیں تھا تاہم وسیع العمل خالدہ اس عرصہ میں بھی بعض قیمتی سیاسی کتابیں لکھتی رہیں جن کے ذریعہ خالدہ محترمہ کی علمی و سیاسی پوزیشن روز بروز وقیع تر ہوتی گئی اور اس غیر معمولی جدوجہد نے ترکی مدبرین کے دلوں پر خالدہ کا پورا پورا سکّہ بٹھادیا۔

1913 کا زمانہ خالدہ خانم کی تہلکہ انداز سیاسی خدمات کا زمانہ ہے۔ ترکی کے مایۂ ناز مدبرین انور و طلعت کا عہدِ وزارت ہے جس میں ترکی قوم ایک خونچکاں قربانی کے بعد اپنی اندرونی تہذیب و اصلاح میں مصروف و منہمک ہے۔ ترکی وزارت کے لیے اس وقت سب سے زیادہ نازک مسئلہ بیرونی نظام اور خصوصاً مسئلہ بلقان کی پیچیدگیاں ہیں۔ ترکی مدبرین چاہتے ہیں کہ ان کے مقبوضہ ممالک میں ایک بالکل ہی جدید اسکیم کا نفاذ ہو اور تمام منتشر اجزا باہم متحد و مربوط ہو جائیں۔ نوجوان ترکوں پر اس وقت یورپ کا متعصب طبقہ جس بری طرح الزام عائد کر رہا تھا اور ان کے مجموعی ہیئت حکمرانی کو جس انتشار و پراگندگی کی طرف دھکیل رہا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ ترکی مدبرین ایک ایسی حکومت ترتیب دیں جس میں محکوم افراد کے لیے عدل و مساوات اور اخوت و حریت کے اصول مساوی ہوں۔ گویا ترکی سیاسیات کا یہ نازک ترین انقلاب تھا جس میں باکمال و متبحر مدبرین کی امداد و اعانت اشد ضروری تھی۔ پس اس اہم اور مشکل ترین دورِ سیاست میں انور و طلعت ایسے دانش گاہ وزرا نے خالدہ خانم کو امداد و اعانت کے لیے طلب کیا اور خالدہ بھی بڑی مستعدی سے نظم حکومت اور اندرونی اصلاحات کی ترتیب و تسوید میں شریک و مصروف ہوگئیں۔ خالدہ خانم نے اپنے خداداد تدبر سے ترکی وزارت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ خود ترکی مدبرین ان کے دانش پژوہ دماغ پر حیران و ششدر تھے۔ ترکی وزارت میں جہاں ایک طرف انور و طلعت خلیل و جمال ایسے فہیم و عظیم الشان مدبر کام کر رہے تھے وہاں دوسری طرف خالدہ خانم بکمال سکون بعض اہم ترین سیاسی ضوابط و آئین کی ترتیب میں مصروف تھیں۔ آخر کار جب ارکان

انجمن اتحاد و ترقی نے خالدہ کے فقید النظیر تدبر اور ان کی لاجواب فراست کا کافی اندازہ کر لیا۔ ادھر جب بعض اندرونی مسائل سے فرصت ملی تو شام کے گورنر جنرل ہزایکسلنسی حضور جمال پاشا نے ترکی وزارت سے اپنی معاونت کے لیے خالدہ خانم کو طلب کیا۔ ہزایکسلنسی جمال پاشا اس وقت ملک شام کے گورنر جنرل تھے اور آپ اپنے علاقہ میں جدید تعلیم و تہذیب کی اشاعت کے خواہش مند تھے۔ آپ اپنی رعایا میں علوم و معارف، صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت کو بڑے پیمانہ پر فروغ دینا چاہتے تھے خصوصاً مملکت شام میں جدید زراعتی اور صنعتی تعلیم سے عرب کے متفرق اور بکھرے ہوئے طبقوں میں جو عرصہ سے پرانی لکیر کے فقیر بنے چلے آتے تھے ایک منفعت بخش بیداری پیدا کرنی چاہتے تھے۔ ادھر عربوں کے وحشت اندوز اور تاریک دماغوں میں جدید تعلیم اور جدید اصول کی روشنی پہنچانا مقصود تھا، لیکن انجمن اتحاد و ترقی کے دور سے قبل مملکت شام کی حالت کچھ اس درجہ ابتر ہو چکی تھی جس کی اصلاح و ترتیب ایک زبردست اور نہایت وسیع جدوجہد کی محتاج تھی لہٰذا مملکت شام میں علمی و صنعتی وغیرہ اہم امور کی انجام دہی کے لیے پختہ کار و مدبر حضور جمال پاشا نے خالدہ خانم ایسی مدبرہ اور فاضلہ ہی کو منتخب کیا۔ جب خالدہ خانم شام میں پہنچیں تو حضور ہزایکسلنسی جمال پاشا نے آپ کو شام کا وزیر تعلیمات مقرر فرمایا اور خالدہ خانم اس اہم فرض کی انجام دہی میں بڑی محنت سے مصروف ہو گئیں۔

خالدہ خانم نے شامی وزارت تعلیمات کا چارج لیتے ہی تمام شامی علاقوں میں تعلیمی و صنعتی وسائل بہم پہنچانے کے لیے ایک لائحۂ عمل مرتب کیا جس میں شام کے ہر قصبہ میں ابتدائی مدارس اور صدر مقام میں ہائی اسکول کھولے جانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ آپ کا مستقر دمشق تھا اور ارباب علم و فضل کا ایک ممتاز طبقہ آپ کے عملۂ وزارت میں کام کرتا تھا۔ خالدہ خانم نے علاقہ شام میں تعلیم کو جو فروغ دیا وہ حیطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ شامی عربوں میں جو فطرتی جمود و بے حسی پائی جاتی ہے خصوصاً شام کا بدوی طبقہ حد درجہ جنگجو واقع ہوا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے شام میں کسی تعلیمی اسکیم کا مقبول ہونا اور عوام کا تعلیمات اور فنون و حرف سے دلچسپی لینا ایک مشکل اور بعید از قیاس امر تھا لیکن خالدہ محترمہ نے اس مشکل کو اپنے آتش بیاں وعظ اور تقریر سے اس درجہ آسان بنا دیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام شام میں ابتدائی تعلیم کے لیے مدراس قائم ہو گئے۔ خالدہ خانم جب

دورہ کرتی تھیں تو وہ عام جلسوں میں تقریر کے ذریعہ تعلیم اور تہذیب جدید کے فوائد عوام کے ذہن نشین کراتی تھیں۔ خالدہ خانم کو خدائے بزرگ و برتر نے وہ زورِ تقریر عطا فرمایا ہے کہ کوئی شخص ان کی تقریر سن لینے کے بعد ان کے خیالات کا مخالف نہیں ہوسکتا۔ غرض خالدہ محترمہ نے اپنی تقریروں کے ذریعہ تمام علاقہ شام میں تعلیمات عامہ کو جو فروغ دیا، اس کی تفصیل ایک دوسری کتاب کو چاہتی ہے۔ البتہ انھوں نے اس دور میں جو سب سے نمایاں اور قابلِ تعریف کام کیا وہ مذہبی تبلیغ ہے۔ آپ نے اس تبلیغ کو اپنے تعلیمی دوروں کے ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ ابتدائی مدارس کے بعد آپ نے شامی اور کُرد یتیم بچوں کے لیے حکومت کے صرفہ سے متعدد یتیم خانے کھولے اور ان میں ان کی پرورش اور تربیت کے ساتھ ہی ان کی تعلیم کا انتظام بھی کر دیا۔ آپ کی مذہبی تبلیغ میں وہ ہزار ہا ارمن و کُرد بچے تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے تعلیم و تربیت سے بے بہرہ رہے جاتے تھے۔ آپ نے اصولِ اسلام کی تلقین جس خوش اسلوبی سے کی اس کا یہ اثر ہوا کہ سیکڑوں ارمن دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ خالدہ خانم نے ان نومسلموں کی تعلیم و تربیت پر حکومت کی طرف سے بڑی فراخ حوصلگی سے کام لیا۔ آپ کی ان حسن خدمات کا سلسلہ جب ترقی پذیر ہوا تو یورپ کا متعصب طبقہ چیخ اٹھا کہ:

''شام میں خالدہ خانم ارمن بچوں کو جبراً داخلِ اسلام کر رہی ہیں''۔

لیکن یورپ کی اس چیخ و پکار نے خالدہ خانم ایسی پختہ کار خاتون پر کوئی اثر نہ کیا اور وہ برابر اپنے کام میں مصروف رہیں۔ انھوں نے کچھ دن بعد شامی بچوں اور نادار طلبا کے لیے تعلیم کو مفت اور لازمی کر دیا۔

خالدہ خانم مملکت شام میں تنہا وزارت تعلیمات کے فرائض انجام نہیں دیتی تھیں بلکہ وہ گورنر جنرل ہز ایکسلینسی جمال پاشا کی مشیر کار بھی تھیں۔ چنانچہ اکثر مواقع پر حضور جمال پاشا آپ سے انتظامی مسائل میں مشورہ لیتے تھے۔ ادھر شامی علاقوں میں خالدہ خانم نے جو اثر اور وقار پیدا کر لیا تھا اس کے نتیجہ میں ایک مرتبہ خالدہ خانم حلب سے ایک سیاسی مشن لے کر نکلی تھیں اور بعض بدوؤں کو آپ نے حکومتِ عثمانیہ کا مطیع و منقاد بنایا تھا جو محصول کی ادائیگی میں تساہلی سے کام لیتے تھے۔ آپ نے شام میں بھی اپنے ہم جنس طبقہ کی خدمات سے دریغ نہ کیا اور اکثر وہ فرصت کے

اوقات میں لڑکیوں کو خود پڑھایا لکھایا کرتی تھیں جیسا کہ وہ انگورہ میں بھی کرتی رہیں۔ غرض شام میں خالدہ خانم نے محکمۂ تعلیمات عامہ میں جو گراں قدر خدمات و اصلاحات کیں انھوں نے ارکانِ انجمن اتحاد و ترقی کے دلوں میں خالدہ کی وقعت کو دوبالا کر دیا۔

خالدہ خانم ابھی حلب ہی میں تھیں کہ جنگ یورپ کا آغاز ہوا اور اب ترکی حکومت کے لیے پیچیدگیوں کے دل بادل امنڈنے لگے۔ خالدہ خانم نے شام کو چھوڑ دیا اور وہ قسطنطنیہ آ گئیں۔ اس اقامت کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ بالآخر ترکی حکومت کو بھی جنگ فرنگ میں شریک ہونا پڑا۔ اس وقت حضور محترم فاتح مشرق مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی طرح خالدہ خانم بھی جنگ کی مخالف تھیں لیکن ارکانِ حکومت کی کثرت رائے کے سامنے آپ نے فوراً اپنی رائے کو جماعت کا تابع کر دیا، لیکن مدبرہ خالدہ کا دماغ ان مصائب سے ضرور متاثر تھا جو ترکی حکومت کو آئندہ چل کر برداشت کرنے پڑے۔ چنانچہ اس تشویش کی حالت میں آپ نے قسطنطنیہ میں ایک سوسائٹی قائم کی جس کا نام "ولس سوسائٹی" تھا، اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ حکومت امریکہ کو ترکی کا دوست اور ہمدرد بنایا جائے۔ آپ نے ارکانِ حکومت سے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ایک طاقتور مشن لے کر امریکہ جانا چاہتی ہیں، لیکن بوجوہ چند آپ کا یہ مقصد پورا نہ ہوا اور آپ نے قسطنطنیہ ہی میں رہ کر خدمات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپ نے ترکی طاقت فراہم کرنے میں بھی وزارت جنگ کی کافی امداد کی۔ آپ نے امریکن اخبارات میں پھر سلسلۂ مضامین شروع کر دیا اور ان مجبوریوں کو پوری قابلیت سے بیان کیا جن کی وجہ سے ترکی حکومت کو جنگ فرنگ میں شریک ہونا پڑا۔ وہ ان اخبارات میں ان الزامات کی تردید کرتی رہیں جو ترکی حکومت پر عائد کیے جاتے تھے۔ اس وقت ترکی حکومت کی مشکلات اور خالدہ خانم کی مصروفیت اپنی حد کو پہنچی ہوئی تھی، لیکن باوجود اس کے خالدہ خانم کا ہر مضمون سیاست و پختہ کاری استدلال و اصابت رائے کا ایک نظر فریب گلدستہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ آپ کا ایک طویل سیاسی مضمون شائع کرتے ہوئے امریکہ کے مشہور اخبار "نیویارک ٹائمنر" میں ایک لیڈر رنے یہ فقرے لکھے تھے:

"ہم اس سے قبل بھی اس ترکی خاتون کے مضامین شائع کر چکے ہیں اور آج بھی ان کا ایک معرکۃ الآرا مضمون شائع کرتے ہیں جو امریکن قوم کو اپنی ہمدردی کے لیے ایک

نہایت ہی منصفانہ اپیل کے ہم معنی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ یہ نہایت ہی مصروف ترکی خاتون اس قدر روزن دار اور مدلل مضامین کے لیے کس طرح وقت نکال لیتی ہے"۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ خالدہ خانم نے جنگ فرنگ کے زمانہ میں ترکی وزارت جنگ کو کافی امداد بہم پہنچائی چنانچہ یہ امداد بھی قلمی تھی اور آپ نے اسی زمانہ میں ایک مبسوط کتاب "پان توران رم" کے نام سے لکھی تھی۔ یہ کتاب خالدہ محترمہ کی تمام کتابوں میں زبردست ترین کتاب ہے۔ اس میں خالدہ نے کمال سیاست صرف کیا ہے۔ آپ نے اس میں ترکوں کے جذبات کو ابھارنے کی جو کوشش کی تھی وہ امید و قیاس سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ اس کتاب میں طلعت پاشا مرحوم کو ہیرو مقرر کیا تھا اور اس کے آتش فشاں طرز بیان کا یہ عالم تھا کہ کوئی ترک اس کے مطالعہ کے بعد اپنے جذبات، مردانگی اور شجاعت کو قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسی لیے ترکی وزارت جنگ نے اس کتاب کے لاکھوں نسخے فوج میں تقسیم کرائے تھے تاکہ نوجوان ترکوں کا میدان جنگ میں ولولۂ جہاد قائم و تازہ رہے۔ چنانچہ جس وقت برطانوی فوجوں نے مقام عازہ پر حملہ کیا تھا تو وہاں ترکی خندقوں میں اس کتاب کے کثیر نسخے پائے گئے تھے۔ غرض جنگ فرنگ کے زمانہ میں خالدہ خانم کی مصروفیت اپنی انتہائی حد کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ جس طرح مضمون نگاری اور تالیف و تصنیف منہمک رہتی تھیں۔ وہ اسی انہماک کے زمانہ میں ترکی یتیموں اور بیواؤں کی خدمت میں بھی مصروف تھیں۔ وہ اکثر اوقات ان ترکی یتیموں اور بیواؤں کے پاس پہنچتی تھیں جو جنگ کے مصائب سے درماندہ ہو کر قسطنطنیہ کی سراؤں اور مسجدوں میں پناہ گزیں تھیں۔ ایک عینی شاہد نے لکھا تھا کہ:

> "میں نے قسطنطنیہ میں خالدہ خانم کو ایک ایسے مقام پر دیکھا تھا جہاں چند بیوہ عورتیں آگ جلا کر اپنے کمسن بچوں کو لیے بیٹھی تھیں، انھوں نے پردہ کے لیے اپنے کپڑے تان لیے تھے اور ان میں میں نے خالدہ کو دیکھا کہ یہ بیٹھی ہوئی انھیں صبر و تحمل کی تلقین کر رہی تھیں۔ یہ جگہ اس قدر غلیظ اور غیر محفوظ تھی کہ کوئی مہذب آدمی یہاں ایک لحہ بھی ٹھہر نہیں سکتا تھا مگر خالدہ خانم نہایت بشاش یہاں بیٹھی ہوئی تقریر کر رہی تھیں اور وہ اپنی تقریر میں اس درجہ منہمک اور مستغرق تھیں کہ انھیں کسی دوسری طرف توجہ بھی

نہیں ہوئی تھی"۔

غرض خالدہ محترمہ اس وقت قسطنطنیہ میں ایک ممتاز لیڈر کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں۔
جب 1917ء میں خالدہ محترمہ کو قسطنطنیہ میں مستقل طور پر رہنا پڑا تو انھوں نے ڈاکٹر عدنان بے کے ساتھ شادی کر لی۔ ڈاکٹر عدنان بے کو عالم اسلام عموماً اور اسلامی ہند خصوصیت سے جانتا ہے۔ وہ اس وقت قسطنطنیہ میں ترکی یتیم خانوں کے آنریری سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ڈاکٹر ممدوح کا تدبر اور ان کی فراست اور سیاست دانی کا ترکی میں شہرہ ہے۔ وہ ایک غیور اور قوم پرست مدبر ہیں اور ارکان انجمن اتحاد و ترقی کے بلند مرتبہ رکن ہیں۔ وہ 1920 میں قسطنطنیہ سے وطنی مدافعت کے لیے جب انگورہ پہنچے تو آپ کی مسلمہ قابلیت کی بنا پر آپ دولت عظمیٰ انگورہ کے وائس پریذیڈنٹ بنائے گئے۔ وہ عرصہ تک بحیثیت لارڈ آف چیف جسٹس کام کرتے رہے۔ وہ انگورہ گورنمنٹ کے آئین جہاں بانی کی اصلاح میں تین سال تک سرگرم خدمت رہے اور جب 1922 میں ترکان انگورہ نے اپنی جنگی و سیاسی قوت کے ذریعہ قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تو آپ منجانب دولت عظمیٰ انگورہ قسطنطنیہ کے گورنر جنرل مقرر کر کے قسطنطنیہ بھیج دیے گئے۔ لہٰذا مذکورہ خصوصیات کے اعتبار سے ڈاکٹر عدنان بے کے ساتھ خالدہ ایسی فاضلہ کا نکاح کر لینا ایک قسم کا قران السعدین تھا، جس کے ذریعہ یہ دونوں فاضل روزگار ہستیاں ملک و مذہب کی مدافعت میں شریک و سرگرم ہو گئیں۔

خالدہ ممدوحہ کی علمی و سیاسی خدمات اور آپ کی خداداد قابلیت کے یہ وہ حالات تھے جو ابھی تک ہندستان میں اشاعت پذیر نہیں ہوئے تھے، لیکن اب وقت آ گیا کہ خالدہ خانم ایسی فاضل عصر خاتون کے کارناموں سے دنیائے اسلام روشناس ہو۔ ترکی حکومت کے زوال کا وہ الم انگیز زمانہ آ گیا جب کہ ترکی حکومت نے اپنی حلیف طاقت جرمنی کی اندرونی کمزوریوں اور میدان جنگ میں شکست کھانے کی وجہ سے ہتھیار رکھ دیے اور برطانیہ فرانس وغیرہ سے صلح کی درخواست کی۔ یہی وہ زمانہ تھا جسے صحیح معنی میں ترکی قوم کے ابتلا و آزمائش کا دماغ سوز زمانہ کہہ سکتے ہیں۔
آخر 1918 میں فرانس و برطانیہ اور اٹلی و جاپان اور امریکہ کے زبردست جنگی جہاز درہ دانیال میں داخل ہو گئے۔ قسطنطنیہ پر اتحادی قبضہ ہو گیا۔ تمام سرکاری و غیر سرکاری اہم مقامات خصوصاً فوجی

چھاؤنیوں، تارگھروں، عدالتوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر اتحادی فوجیں قابض ہو گئیں۔ بڑے بڑے مدبرین قید و نظر بند کر دیے گئے۔ درہ دانیال کی ناکہ بندی نے تھریس وایڈریانوپل اور خود قسطنطنیہ کو ایشیائے کوچک سے جدا کر دیا۔ بوڑھے سلطان وحیدالدین کے بوڑھے وزرا اتحادی اثر سے مغلوب تھے۔ داماد فرید پاشا جو ایک بزدل اور کافر دماغ وزیراعظم تھا، اتحادیوں کو قبضہ دے دیا تھا۔ ادھر اتحادیوں نے ترکی حکومت کو تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا اور تھریس وسمرنا ایسے زرخیز ترکی صوبے یونان کو دے ڈالے تھے، جن پر قابض ہوتے ہی یونان نے وہ مظالم شروع کر دیے جن کے تصور سے روح لرزاں ہے۔ غرض ان مظالم کے دفاع و رد کے لیے احرار ترکوں نے اناطولیہ میں جدوجہد شروع کر دی۔ انھوں نے کل ترکی حکومت کو اتحادیوں سے آزاد کرانے کی قسم کھائی اور اپریل 1920 سے یہ تحریک زیرسرکردگی حضور محترم تدبیر پناہ مارشل مصطفیٰ کمال پاشا رونما ہوئی اناطولیہ میں ترکان احرار کی اس تحریک نے قسطنطنیہ کے غیور وملت پسند ترکوں کے لیے ہلاکت و بربادی کا ایک نیا دروازہ کھول دیا اور اب اتحادیوں نے ان تمام ترکوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائیاں شروع کر دیں جو قسطنطنیہ میں رہ کر ترکان اناطولیہ کی تائید چاہتے تھے۔ پھر بھی ترکان قسطنطنیہ نے غلامی و ماتحتی کی زندگی اختیار کرنے سے انکار کر دیا اور وہ ہر طرح ترکان اناطولیہ کے ہم نوا بن گئے۔ اِدھر تھریس وسمرنا میں جو قیامت خیز مصائب ترکی آبادی پر ڈھائے گئے انھوں نے قسطنطنیہ کی آبادی کو اور بھی آتش زیرپا کر دیا اور اب ہر ترک نے تہیہ کیا کہ وہ اپنی جان دے کر ملک وملت کو آزادی کی نعمت دلائے گا۔ پس ان حالات کے ماتحت کیسے ہو سکتا تھا کہ ترکی قوم کی مایۂ ناز خاتون محترمہ خالدہ خانم کے فضیلت نشان اور قوم پسند دل میں کوئی تڑپ پیدا نہ ہوتی۔ آخرکار خالدہ خانم اٹھیں اور انھوں نے ٹھیک اس وقت جب کہ قسطنطنیہ کے احرار مجاہدین انگورہ کی تائید و تحریک کے جرم میں قید و نظر بند کیے جا رہے تھے۔ کھلم کھلا ترکان انگورہ کی اعانت کے لیے ملک و قوم کو بیدار و آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ اپنے شوہر ڈاکٹر عدنان کو انھوں نے قسطنطنیہ سے انگورہ پہنچ کر وطنی مدافعت پر آمادہ کیا۔ غرض خالدہ خانم قسطنطنیہ میں تمام ترکی قوم کی رہبری کے لیے ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے سرگرم عمل ہو گئیں۔ انھوں نے تقریروں اور جلسوں کے ذریعہ ترکان قسطنطنیہ میں حب وطن اور مدافعت وطن کے جذبات برانگیختہ کرنا شروع کر دیا تو وہ نہایت بیباکی سے

مصروف عمل ہوگئیں اور داماد فرید کی گورنمنٹ پر بھی انھوں نے ''ترکی شاہی حقوق'' کی حفاظت کے لیے زور دیا۔ اور روز بروز ان کے عمل کا پیانہ ترقی کرتا گیا۔ انھوں نے علاوہ ترکی قوم کی مدافعت کے بعض تورانی و تاتاری اقوام کے اتحاد و آزادی کے لیے بھی جدو جہد کی۔ انھوں نے جمہوریہ آذر بائیجان کی آزادی کے موقع پر قسطنطنیہ میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا تھا جس میں وہ خود صدر جلسہ تھیں۔ اس جلسہ میں انھوں نے کمزور اقوام خصوصاً اسلامی افراد کی عام آزادی پر اظہار خیالات کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے:

> ''ممکن ہے کہ میں ترکی حکومت کے اثرات و اقتدار کو بخارا و تاشقند تک پھیلا دیکھنے کے لیے زندہ رہوں، لیکن اگر میں اس سلطان ترکی کے دورِ حکومت میں ہوتی جنھوں نے وائنا دارالسلطنت آسٹریا کو محاصرہ کی دھمکی تھی تو شاید میرے دل کو قدرے تسکین ہوتی، لیکن مغرب کی کسی کامیابی اور فتح سے میرے دل کو یہ مسرت و خوشنودی حاصل نہ ہوئی جو حکومتِ اسلامیہ آذر بائیجان کی خودمختاری کی روح افزا خبر نے میرے دل میں پیدا کر دی ہے''۔ ('سیاست' 25 اپریل 1930)

خالدہ محترمہ کی ان تمام تر سیاسی مصروفیتوں میں جو بات سب سے زیادہ تعجب انگیز ہو سکتی ہے وہ یہ تھی کہ اتحادیوں نے انھیں گرفتار نہ کیا۔ اس کے جواب میں رپورٹر نے لکھا تھا کہ وہ پہلے پہل اس وجہ سے گرفتار نہیں کی گئیں کہ وہ عورت تھیں اور انھوں نے اس وقت تک اتحادیوں کے خلاف کوئی نفرت و حقارت نہیں پھیلائی تھی اور نہ انھوں نے کسی اہم سازش میں حصہ لیا تھا، لیکن جب 5 مئی 1919 میں بزدل یونانیوں نے سمرنا میں حشر انگیز مظالم شروع کر دیے۔ ترکی آبادی کو آگ و خون میں جھونکنا شروع کر دیا۔ لاکھوں ترک بچے بوڑھی عورتیں اور نوجوان تلوار کے گھاٹ اتارے جانے لگے تو خالدہ ممدوحہ کے جذبۂ حمیت میں ایک ولولہ انگیز تڑپ پیدا ہوئی اور وہ ان ہولناک مظالم پر بے چین ہوگئیں۔ انھوں نے ان مظالم کے انسداد کے لیے قسطنطنیہ میں زبردست ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ گویا اب تک وہ نہایت آئینی طریق پر کام کر رہی تھیں مگر اب انھوں نے انسداد مظالم کے لیے عظیم الشان جلسے منعقد کیے اور بڑے بڑے ترکی مدبرین کو ان جلسوں میں مدعو کیا۔ اس وقت خالدہ خانم کے ساتھ تمام قسطنطنیہ تھا، لاکھوں ترک اٹھ کھڑے

ہوئے اور انھوں نے خالدہ کی آواز کو لبیک کہا۔ خالدہ خانم کے خداداد فضل وکمال کا یہ اثر تھا کہ ہر بڑے سے بڑے جلسہ کی وہی صدر بنائی جاتی تھیں۔ خالدہ خانم کے ان جلسوں نے اتحادیوں کا ناطقہ بند کردیا تھا خصوصاً انگلستانی جرائد چیخ اٹھے تھے اور انھوں نے خالدہ خانم کے اثر کو محسوس کرتے ہوئے سمجھ لیا تھا کہ اگر آتش بیاں خالدہ کو قسطنطنیہ میں اسی طرح جلسوں میں تقریر کا موقع دیا گیا تو وہ ایک دن ضرور اتحادیوں کا سر پلپلا کرادیں گی۔

مذکورہ حالات بھی ایک حد تک نہایت آئینی تھے اور گو قسطنطنیہ میں خالدہ خانم نے پوری قابلیت سے اتحادیوں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا لیکن ان تمام کارروائیوں نے اتحادیوں کے طرزِ عمل کو نہ بدلا۔ اس کی ظاہر وجہ یہی تھی کہ قسطنطنیہ کی گورنمنٹ کا صدر کارکن داماد فرید اتحادیوں کا دوست تھا۔ پس جب خالدہ خانم نے اتحادیوں کے طرزِ عمل کو ناقابلِ اطمینان پایا تو بہادر و ذی حوصلہ خالدہ نے نہایت اہم ذرائع مدافعت اختیار کیے۔ انھوں نے قسطنطنیہ کی ترکی عورتوں کو ترکانِ انگورہ اور حفظ وطن کے لیے تیار و آمادہ کیا۔ انھوں نے پوری جرأت و بے باکی سے ترکی عورتوں کو اس خونچکاں جدوجہد کے لیے ابھارنا شروع کیا اور بکمالِ فراست ان جواں ہمت عورتوں کی اندرونِ قسطنطنیہ متعدد انجمنیں قائم کیں، جن کا واحد مقصد "حفظِ وطن" اور ترکانِ انگورہ کی اعانت تھا۔ میں نے ابتدائے کتاب میں ترکی خواتین کی بیداری کے جو اسباب بیان کیے ہیں انھی کا نتیجہ تھا کہ خالدہ کی اپیل ترکی خواتین میں بہت جلد مقبول و کامیاب ہوگئی اور بیدار مغز قوم پرست ترکی خواتین خالدہ کے ساتھ ہوگئیں۔ قسطنطنیہ کی تقریباً 25 فیصدی ترکی خواتین نے خالدہ کے ساتھ کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور وہ عملاً اس اہم خدمت کے لیے تیار ہوگئیں۔ جب خالدہ محترمہ نے ترکی خواتین کے ولولۂ عمل کو محسوس کرلیا تو انھوں نے بطریقِ عمل ان خواتین کی تین انجمنیں بنائیں۔

(1) ترکی خواتین مقیم قسطنطنیہ کی پہلی جماعت جو امراء و تعلیم یافتہ طبقہ سے متعلق تھی ترکی مظلومیت اور انتزاعِ حقوق کی مدافعت میں تحریر و تقریر کے ذریعہ دنیائے انصاف کو اپنی ہمدردی اور اعانت کے لیے متوجہ کرتی تھی۔

(2) ترکی خواتین کی دوسری جماعت اتحادیوں اور ترکی گورنمنٹ کی خفیہ سازشوں اور

معاہدوں وغیرہ کی اطلاع انگورہ گورنمنٹ کو دیتی تھی۔ چنانچہ 1921ء میں ہندستان کے مشہور دوزخی مصطفےٰ صغیر کو انگورہ میں جس ترکی خاتون نے گرفتار کرایا وہ اسی مجلس کی رکن اور خالدہ خانم کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والی غیور خاتون تھی جس کا نام جنان ہے۔

(3) ترکی خواتین کی تیسری جماعت میں نہایت جری اور بہادر خواتین کام کرتی تھیں۔ ان کا کام مجاہدین انگورہ کو خفیہ طریق پر قسطنطنیہ سے ہتھیار اور سامانِ حرب بہم پہنچانا تھا۔ ترکی خواتین کی یہ وہ بہادر و ذی حوصلہ جماعتیں تھیں جنھیں جواں ہمت خالدہ نے مرتب کیا تھا اور ان جماعتوں نے ترکان انگورہ اور حفظ وطن کے لیے جو گراں پایہ خدمات انجام دیں انھیں میں آگے چل کر تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔ لیکن مذکورہ تہلکہ انداز اور عظیم الشان انہاک عمل میں خالدہ محترمہ کی ایک ایسی کارروائی کا اظہار ضروری ہے جو مذہب پسند طبقہ کی دلچسپی اور مذہب ناشناس مسلمانوں کی عبرت کے لیے اپنے اندر سینکڑوں بصیرتیں رکھتی ہے۔

خالدہ محترمہ نے جب قسطنطنیہ میں آغازِ عمل کیا تو انھوں نے عام جلسوں میں تقریر کے لیے تمام مذہبی اعتبارات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تقدس پناہ حضور شیخ الاسلام سے حسب ذیل الفاظ میں درخواست کی تھی:

> ''میں مذہب و ملت اور ترکی کے جائز حقوق کی حفاظت کے لیے جس جد و جہد کا آغاز کرنا چاہتی ہوں اس میں مجھے عام جلسوں میں مردوں کے سامنے تقریر کرنا پڑے گی، لہٰذا میں تقدس پناہ سے ملتجی ہوں کہ مجھے دستور مذہبی کے تحت ان عام جلسوں میں تقریر کی اجازت دی جائے''۔ (ملاحظہ ہو ڈیلی میل، لندن۔ مورخہ 14 اگست 1921)

اس عبارت سے خالدہ خانم کی مذہب پرست طبیعت کا اندازہ ہوگا اور یہ سمجھا جاسکے گا کہ خالدہ محترمہ باوصف ایک جدید فیشن ایبل اور مغربی تعلیم یافتہ عورت کی حیثیت سے کس درجہ مذہبی احترام کی دلدادہ ہے۔ خالدہ محترمہ ہمیشہ برقعہ پوش رہتی ہیں۔ انھوں نے سوائے میدانِ جنگ کے کبھی اپنے چہرہ کو بے محابا نہیں کھولا۔ گویا وہ ایک پکی مسلمان اور مذہب کے جزوی سے جزوی حکم و شعار کی پابند عورت ہیں۔ کاش خالدہ محترمہ کے اس طرزِ عمل کو مولانا حسرت موہانی پڑھ لیں۔

الغرض خالدہ محترمہ نے جب قسطنطنیہ میں مذکورہ جماعتوں کی بنیادیں استوار کیں اور خود

بھی نہایت بے باکی سے میدانِ عمل میں سرگرم کار ہوگئیں تو اب اتحادیوں کے لیے مشکل ہوگیا کہ وہ خالدہ کو آزاد چھوڑ دیں لہٰذا اتحادی ممبروں نے خالدہ کی نگرانی شروع کردی اور اب وقت آ گیا کہ خالدہ قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوجائیں۔ بس اس حالت کے پیدا ہوتے ہی خالدہ محترمہ نے بجائے ترکِ عمل کے اناطولیہ فرار ہوجانے کا خطرناک ارادہ کرلیا اور عین اس رات کو جب کہ اتحادیوں نے خالدہ کی گرفتاری کے احکام صادر کردیے تھے خالدہ قسطنطنیہ سے روپوش ہوگئیں اور وہ اپنے محبوب مامن یعنی رابرٹسن کالج میں چھپ گئیں۔ خالدہ محترمہ کی اس روپوشی کے لیے مختلف اطلاعیں شائع ہوئیں۔ کسی میں بیان کیا گیا ہے کہ خالدہ رابرٹسن کالج میں کافی عرصہ تک پوشیدہ رہیں۔ کسی میں لکھا ہے کہ خالدہ نے ارکانِ کالج سے بھی اپنی پوشیدگی کے اسباب بیان نہیں کیے۔ بہرکیف یہ صحیح ہے کہ وہ رابرٹسن کالج میں پناہ گزیں ضرور ہوئیں اور جب اناطولیہ جانے کے اسباب مکمل ہوگئے تو وہ شب کی تاریکیوں میں ایک کشتی کے ذریعہ قسطنطنیہ کو خیرباد کہہ کر اناطولیہ روانہ ہوگئیں اور بحری سفر کے بعد وہ خچر پر سوار ہوکر دشوار گزار راستوں سے انگورہ پہنچ گئیں۔

خالدہ محترمہ کی اس فراری کے متعلق ایک انگریز نامہ نگار نے لکھا تھا کہ خالدہ خانم اور ان کے فاضل شوہر ڈاکٹر عدنان بے قسطنطنیہ سے گرفتار کرکے مالٹا بھیج دیے گئے تھے اور وہاں سے یہ دونوں میاں بیوی فرار ہوکر انگورہ پہنچ گئے، لیکن کثیر اطلاعیں اس خبر کی تردید میں ہیں اور خالدہ محترمہ کا انگورہ اسی طرح پہنچنا صحیح ہے جس طرح میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ خالدہ کے اس عزم اور سفر کی پریشانیاں کوئی غیور دماغ محسوس کرسکتا ہے؟ کیا یہ کوئی معمولی واقعہ ہے کہ خالدہ نے محض ملک وقوم اور وطنِ حنیف کی حفاظت وخدمت کے لیے خود کو ہلاکت بار سفر میں چھوڑ دیا۔ وہ جب باسفورس سے شب کو سیاہ لباس پہن کر بحری سفر کے لیے نکلیں تو اس وقت اتحادی جنگی جہاز بندرگاہوں پر اپنی آتش فشاں توپوں کے دہانے سیدھے کیے کھڑے تھے۔ شب کی ڈراؤنی تاریکیاں فضائے ارض کو اس طرح گھیر چکی تھیں کہ خالدہ کو اپنے مقرر کردہ بندرگاہ کا راستہ بھی نہ مل سکا اور وہ اسی بے راہ روی میں ایک ایسے بندرگاہ پر پہنچ گئیں جہاں قریب تھا کہ وہ یونانی نگہبانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوجائیں مگر ان کے ایک رفیق کی آواز نے انھیں عین وقت پر اس خطرہ سے

بچالیا۔ انھوں نے دریا میں بجائے کسی محفوظ جہاز کے ایک ہلکی کشتی پر سفر کیا جو بحری خطروں سے ہمیشہ گھری رہتی ہے۔ انھوں نے ساحل اناطولیہ پر پہنچ کر بڑی راستہ ایک خچر پر طے کیا جس کی تکالیف کا اس نسبت سے اندازہ کیجیے کہ خالدہ کوئی مشاق جفاکش سپاہی تو نہ تھیں جو راستہ کی تمام مشکلات اور سواری کی تکالیف کو آسانی سے قبول کر لیتیں۔ وہ تو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ناز پروردہ خاتون تھیں۔ وہ ترکی قوم کی لیڈر و سردار تھیں جو بڑے بڑے مدبرین کے دماغوں پر حکومت کرتی تھیں کیا خالدہ کو بھوک و پیاس کی عقل سوز تکالیف نے نہ گھیرا ہوگا؟ کیا وہ راستہ کی درازی اور تنہائی سے گھبرا نہ گئی ہوں گی؟ کیا انھیں تنہائی اور اس غربت نے نہ ستایا ہوگا جب کہ وہ بے یار و مددگار اناطولیہ کے وسیع جنگلوں اور ریگزاروں سے گزر رہی تھیں؟ کیا انھیں وطنِ عزیز کی راحتیں اور سکون بخش نیند یاد نہ آتی ہوگی؟ ہاں یہ سب کچھ تھا مگر ان تمام حوصلہ شکن اور صبر آزما تکالیف کو جس جوہر نے اطمینان و مسرت سے بدل دیا تھا افسوس کہ وہ ہم میں تو نہیں مگر ہاں خالدہ خانم میں بدرجۂ اتم موجود تھا اور وہ حبِ وطن، حبِ مذہب، جذبۂ آزادی، ایثار و فدویت، عمل و جہدِ عمل اور سب سے آخر یہ کہ خدائے قدیر و قادر پر پختہ اعتماد و ایمان تھا جس نے دل و دماغ کو امید و کامرانی کے حوصلہ افزا جذبات سے معمور کر دیا تھا۔ وہ ملک و مذہب کی خدمت کے لیے تیار ہوئی تھیں۔ وہ بے کسوں کو استقلال و آزادی کی نعمت سے شادکام بنانے نکلی تھیں۔ وہ ابنائے ملک و ملت کے تحفظ اور بقائے دینِ مبین کے لیے چلی تھیں اور یہی وہ آخری مگر مقدس جذبۂ عمل تھا جس کی وجہ سے خدائے رحیم و رحمٰن نے ان کے لیے زمین کو لپیٹ دیا اور سفر کی تمام دلگداز و دل شکن مصیبتیں ان کے لیے آسان ہو گئیں اور وہ بخیر و خوبی انگورہ پہنچ گئیں کہ یہی بدلہ ملتا ہے خدائے قدیر و قدوس کی طرف سے مخلصین کو۔

دارالسلام انگورہ میں خالدہ کا داخلہ اس وقت ہوا جب کہ دانایانِ انگورہ اناطولیہ میں ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھ رہے تھے جس کے اصول حکمرانی اسلام کے صحیح اور عدالت نواز معیار پر مبنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ترکانِ انگورہ کے سامنے اگرچہ حفظِ وطن اور دشمن کو ملک سے مار بھگانے کا نہایت اہم و اقدم مسئلہ پیش تھا، مگر جس قوم کے عروج و کمال کا زمانہ آتا ہے تو خدائے حکیم و

فیاض اس کے افراد کے تمام قوائے عملی کو ایک مافوق الفطرت قوت کے ساتھ بیدار کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس نازک وقت میں جب کہ احرار انگورہ کو میدانِ جنگ کی مصروفیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں ان کا انگورہ میں بیٹھ کر ایک بدیع المثال حکومت کی اندرونی اصلاح و تحکم کا تہیہ مبداو فیاض کی اُس بخشش و موہبت کی دلیل ہے جو محض کسی ترقی پانے والی جماعت ہی کا نصیب ہو سکتی ہے۔ غرض اس وقت ترکانِ انگورہ کو حکومت کی داخلی اصلاح و ترتیب کے لیے جن تبحر دماغوں کی ضرورت تھی اسے خالدہ کی آمد نے ایک حد تک پورا کر دیا اور اسی لیے خالدہ خانم کا انگورہ میں وہ شاندار استقبال کیا گیا کہ بیان سے باہر ہے۔ آپ کو فوراً انگورہ کی سیاسی جماعت میں شریک کر لیا گیا۔

انگورہ میں ابتداً خالدہ خانم بحیثیت رکن پارلیمنٹ کے شریک عمل ہوئیں اور ان قوانین کی ترتیب میں بیش از بیش اور نہایت قیمتی امداد دی جو جمہوریہ انگورہ کے لیے مرتب کیے جا رہے تھے۔ خالدہ محترمہ کے یہ سیاسی مشورے ایوانِ حکومت میں بلا کسی مخالفت کے منظور کیے جاتے تھے اور یہ اسی سیاسی انہاک اور خالدہ کے غیر معمولی تبحر کا نتیجہ تھا کہ جب 1920 کے آخری ایام میں انگورہ گورنمنٹ کا نیا کابینہ منتخب ہوا تو خالدہ خانم کو بالاتفاق انگورہ کیبنٹ میں دولت علیا انگورہ کا وزیر تعلیمات مقرر کیا گیا اور خالدہ اب بحیثیت وزیر کے ایک عظیم الشان حکومت کے ایوانِ سیاسی میں داخل ہو گئیں۔ جس وقت خالدہ خانم کو انگورہ گورنمنٹ نے وزیر تعلیمات مقرر کیا تو اس وقت نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ یورپ کے متعصب علمی و سیاسی طبقات میں ہلچل مچ گئی اور یورپین اخبارات و ارباب رائے نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس طرح دنیا میں ترکوں نے حکومت کے شعبۂ انتظامی میں خالدہ کو وزیر تعلیمات مقرر کر کے اپنی بیدار قومیت کا ثبوت دیا ہے اسی طرح خالدہ خانم سب سے پہلی وہ صاحب کمال عورت ہے جس نے کسی زبردست حکومت میں اس قدر اہم اور جلیل القدر عہدہ حاصل کیا ہے۔

الغرض جس وقت خالدہ خانم کو عہدۂ وزارت سپرد کیا گیا یہ وقت حکومتِ انگورہ اور اناطولیہ کے لیے نہایت کرب و اضطراب کا وقت تھا۔ کیونکہ قسطنطنیہ پر اتحادی جنگی جہازوں کی موجودگی اور ناکہ بندی نے اناطولیہ پر ہر قسم کی امداد و اعانت کا راستہ بند کر دیا تھا۔ یونانی فوجیں اندرونِ

اناطولیہ بڑھی چلی آ رہی تھیں اور ملک میں سکون واطمینان کا نشان بھی نہ تھا۔ یونانی افواج کی تباہ کن پیش قدمی کے باعث اناطولی باشندے گونا گوں اور برباد کن مصائب میں مبتلا تھے اور یہ اضطراب اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ خود دانایانِ انگورہ مدافعت کے اسباب ووسائل میں منہمک تھے۔ اس وقت ہر شخص کے نزدیک سب سے اہم خدمت دشمن کا ملک سے قطعی استیصال و مقابلہ تھا۔ کیونکہ اندرونِ اناطولیہ یونانی افواج کی غارت گر پیش قدمی اوراس کے شہر وغیرہ جنگی مقامات کے چھن جانے سے اناطولی باشندوں میں عام تشویش پھیل گئی تھی۔ پس مذکورہ خطرناک حالات میں ظاہر ہے کہ کوئی علمی وتعلیمی تجویز یا اسکیم کس طرح ملک میں نفاذ ہوسکتی ہے؟ اور قاعدہ بھی یہی ہے کہ جب کوئی حکومت خطراتِ جنگ میں گھر جاتی ہے تو وہ اپنی تمام تر اندرونی اصلاحات، تجارت اور درآمد و برآمد کے سلسلوں کو روک دینے پر مجبور ہوتی ہے اور جب تک ملک کو داخلی سکون و اطمینان حاصل نہیں ہو جاتا اس وقت تک حکومت کسی دوسرے شعبہ کی اصلاح نہیں کرتی بلکہ وہ سب سے پہلے اپنی تمام طاقتوں کوایک مرکز پر جمع کر کے دشمن کوملک سے باہر نکالتی ہے، پھر زمان امن وامان میں وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہوتی ہے، لیکن یہ خالدہ خانم کی انتہائی حوصلہ مندی تھی کہ آپ نے اناطولیہ کی ان خوں نابہ فشانیوں اور حالتِ جنگ ہی میں اناطولیہ اور ممالک محروسہ انگورہ کی تمام آبادی کے لیے ایک زبردست تعلیمی لائحۂ عمل تیار کیا جس کی وسعت واہمیت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ کی اسکیم میں اناطولیہ کے بڑے بڑے شہروں، قصبوں سے لے کر گاؤں گاؤں میں ابتدائی مدارس کا افتتاح تجویز کیا گیا تھا، لیکن قبل اس کے کہ خالدہ خانم کی یہ جامع اسکیم ملک میں نفاذ پذیر ہوتی آپ کو ایک زبردست مقابلہ انگورہ پارلیمنٹ سے کرنا باقی تھا اور یہ اہم مقابلہ اپنی وسیع تعلیمی اسکیم کے مصارف منظور کرانا تھا، لیکن یہ منظوری اس لیے دشوار تھی کہ اس وقت انگورہ پارلیمنٹ میں ایسے وزرا کام کر رہے تھے جو "ضروریاتِ جنگ" کو تمام لوازم پر مقدم رکھتے تھے۔ انگورہ کے ہاؤس آف لارڈس میں حضورذی جاہ تہور پناہ مارشل مصطفیٰ فوزی پاشا چیف آف دی اسٹاف کی ذات ہی تنہا ایسی تجاویز کی مخالف تھی اور ان کی تمام جنگی پارٹی اس وقت مقاصد جنگ کی موید وطرفدار تھی، لہٰذا ایسی صورت میں کہ جنگی پارٹی اور تمام دوسرے وزراء ضروریاتِ جنگ کے تکفل وسربراہی کے موید ہوں کسی تعلیمی لائحۂ عمل کے لیے وزارت مال سے

کوئی گراں قدر بجٹ منظور کرالینا آسان نہ تھا، لیکن یہ خالدہ خانم ہی کی خداساز اہلیت اور پوزیشن کا اثر تھا کہ آپ نے جس وقت انگورہ پارلیمنٹ میں یہ بجٹ پیش کیا تو وہ بہت قلیل مخالفت کے بعد منظور ہوگیا۔ صرف وزیر مال دانش پژوہ ہزایکسلینسی جمیل بے نے یہ ترمیم پیش کی تھی کہ شہرو قصبات کے بعد ''گاؤں'' میں ابتدائی مدارس کا افتتاح فی الحال جنگی ضروریات کی وجہ سے ملتوی کر دیا جائے لیکن جس وقت فاضل خالدہ خانم نے اس ترمیم کے خلاف تقریر کی اور بہ دلائل اس ضرورت کو واضح کیا اور صدر پارلیمنٹ ڈاکٹر عدنان بے نے آراء کا شمار کیا تو چونسٹھ میں سے تین آرا خالدہ کے خلاف تھیں باقی تمام ارکان نے خالدہ کی موافقت کی جس پر وزیر مال کی ترمیم رد کردی گئی اور خالدہ خانم کا مکمل بجٹ منظور کرالیا۔ وزیر مال کی ترمیم کو رد کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی اس میں انھوں نے علاوہ تعلیمی ضروریات وفوائد کو ثابت کرتے ہوئے یہ نہایت دانشمندانہ مقصد ظاہر کیا کہ:

> ''اس وقت جب کہ ہم لوگ آگ وخون کے دریا میں دھکیل دیے گئے ہیں اور ہم پر مصیبت کے بادل امنڈ رہے ہیں، دشمن چاہتا ہے کہ ہمیں کسی نہ کسی طرح دنیا میں ذلیل ثابت کرے۔ آرمن و یونانی پروپیگنڈہ کررہے ہیں۔ یورپ کہتا ہے کہ ہم بربریت اور جہل کے حامی ہیں لہٰذا ہمارا کامیاب احساس یہ ہوگا کہ ہم ان مصائب و آلام میں گھر کر بھی اپنی ماتحت رعایا کی دماغی وذہنی اصلاح کر کے دشمنوں کو دکھلا دیں کہ ترک کس طرح علوم ومعارف، تہذیب وترقی کے دلدادہ ہیں''۔

خالدہ محترمہ کا یہ بلند پایہ مقصد ومنشاء تھا جسے بیدار مغز ترکوں نے قبول کرلیا۔ گویا خالدہ نے اس اسکیم کے ذریعہ ترکوں کے اس پہلو کو روشن کردیا جسے متعصب یورپ کے پروپیگنڈے نے عرصہ سے تاریک بنا رکھا تھا۔ خالدہ خانم کی اس نازک وقت میں تعلیم کو فروغ دینے والی اسکیم نے جو تبلیغی اثر یورپ میں پیدا کیا اسے یورپین دماغوں نے کس نسبت سے محسوس کیا؟ اس کا جواب فرانس کی مشہور ترک دوست سیاست داں خاتون مس گالف نے تصریحات انقرہ میں اس طرح لکھا ہے:

> ''مجھے حدود اناطولیہ میں جس چیز نے سب سے زیادہ خوش کیا وہ یہاں گاؤں گاؤں

اور قصبہ قصبہ میں ابتدائی مدارس کا افتتاح ہے جو اس زبردست تعلیمی لائحۂ عمل کا نتیجہ
ہے جو خالدہ خانم وزیر تعلیمات نے مرتب کیا ہے اور جسے منظور کرانے میں انھیں اپنی
لاثانی قوتِ استدلال صرف کرنا پڑی تھی۔ اناطولیہ میں تنہا مدارس کی کثرت ان
یورپین متعصب مبلغین کا کافی اور دنداں شکن جواب ہے جو وہ ترکوں کی جہل دوستی
کے متعلق بیان کرتے رہتے ہیں"۔

غرض ان حالات کے تحت خالدہ خانم نے جب اسکیم منظور کرالی تو اسے عملی جامہ پہنانے
کے لیے انھوں نے تدابیر اختیار کیں، لیکن یہ وقت اور کام خالدہ کے لیے پارلیمنٹ کی مخالفت سے
بھی زیادہ سخت تھا کیونکہ اس وقت اناطولیہ اور انگورہ میں با مقصد وسیع پیمانہ والی تعلیمی اسکیم کے
اجراء و عمل کے لیے جو ضروری چیزیں درکار تھیں وہ خالدہ کو میسر نہ تھیں۔ مثلاً سب سے پہلے بہ تعدادِ
کثیر اساتذہ، پروفیسرز اور معلمات کی ضرورت تھی، لیکن اناطولیہ اس قدر تعداد بہم پہنچانے سے
قاصر تھا۔ دوسری ضرورت مدارس اور کالجوں کے لیے عمارتوں کی فراہمی تھی سو ضروریات جنگ نے
انھیں بھی کمیاب بنا دیا تھا۔ لہٰذا ایسی صورت میں خالدہ خانم کی یہ وسیع تعلیمی تجاویز بے کار تھیں، لیکن
یہ ذی حوصلہ عورت اس کمی سے مطلق نہ گھبرائی بلکہ آپ نے قسطنطنیہ کے اساتذہ اور معلمات کو اس
خدمت کی طرف توجہ دلائی اور انھیں قومیت کے جذبات سے متاثر کر کے انگورہ پہنچنے کی دعوت
دی۔ انھوں نے مدارس کی عمارت کے لیے اندرونِ اناطولیہ وہاں کے تجار و متمولین سے
درخواست کی جنھوں نے فوراً ہی اپنی عمارتیں تعلیمی ضروریات کے لیے خالدہ کے سپرد کر دیں اور
اس طرح یہ وسیع تعلیمی اسکیم نفاذ پذیر ہوگئی۔ خالدہ محترمہ نے ماہرین اور اساتذۂ قسطنطنیہ سے انگورہ
میں خدمات انجام دینے کے لیے جو اپیل کیے تھے وہ منجانب صدارتِ انگورہ حضور مصطفیٰ کمال پاشا
کے نام سے ہندستانی جرائد میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ یہ اپیل ہوائی جہازوں کے ذریعہ پہنچائے
گئے تھے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کی بیدار مغز اور آزاد آبادی سے اربابِ علم و کمال جوق در جوق انگورہ پہنچ
گئے اور اس طرح یہ وسیع تر تعلیمی اسکیم عملی صورت میں کامیاب ہوگئی۔ ملک میں متعدد اسکول و کالج
کھولے گئے اور خاص دارالسلام انگورہ میں شاہی جامع مسجد کے مقابل انگورہ یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد
رکھا گیا اور یہی وہ عظیم الشان یونیورسٹی ہے جو ایشیائے کوچک کا مرکزی دارالعلوم کہا جا سکتا ہے۔

ان ابتدائی تعلیمی امور کے بعد خالدہ محترمہ نے اپنی اسکیم اور وسعت دی اور انھوں نے ترکی یتیم بچوں اور لڑکیوں کے لیے تعلیم کو ''مفت و لازم'' کر دیا۔ اس کے بعد آپ علوم و معارف کے دوسرے شعبوں کی طرف متوجہ ہوئیں اور آپ نے ممالکِ محروسہ انگورہ کا ایک طویل دورہ کیا جس میں علاوہ تعلیمی امور کی جانچ کے ساتھ آپ نے خواتینِ اناطولیہ کو کسبِ علوم وفنون کی طرف متوجہ کیا اور انھیں علمی فوائد ذہن نشین کرائے۔ پھر انگورہ واپس ہو کر انھوں نے جدید اصول پر ایک ''زنانہ کالج'' کھول دیا جس میں اناطولیہ عورتوں کو سائنس، ڈاکٹری، قانون اور صنعت وحرفت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس زبردست زنانہ کالج کے متعلق مس گالف لکھتی ہیں کہ:

''اناطولیہ کا زنانہ کالج خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ اس میں ترکی عورتوں کو ڈاکٹری، سائنس اور انجینئری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے اسلحہ اور اوزار بھی فراہم کیے گئے ہیں''۔

خالدہ خانم کے نزدیک چونکہ عورتیں بھی مردوں کے مانند قوائے عمل رکھتی ہیں اس لیے آپ نے خصوصیت سے تعلیماتِ نسواں کے ہر شعبہ کی تکمیل کو ملحوظ رکھا۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم میں جہاں ڈاکٹری، سائنس، انجینئری، دینیات اور قانون ایسے فنونِ عالیہ کی تعلیم کو عام کیا۔ وہاں انھوں نے فنونِ لطیفہ سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے بھی درس گاہیں قائم کیں۔ چنانچہ اوائل 1921 میں انھوں نے عورتوں کے لیے موسیقی کا ایک اسکول کھول دیا جس میں اناطولیہ کی عورتیں تعلیم پاتی ہیں۔ اس اسکول نے تھوڑی ہی مدت میں خاصی ترقی حاصل کر لی اور اس کی کامیاب طالبات آج اس فن کے ذریعہ ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ ماہرینِ موسیقی کو ملک وقوم کی خدمت سے کیا تعلق ہے؟ اس کے جواب کے لیے احمد امین بے، ایڈیٹر اخبار ''وقت'' اور اخبار ''مارننگ پوسٹ'' لندن کے نامہ نگار نے اپنے سفر انگورہ کے حالات میں لکھا ہے کہ:

''انگورہ پارلیمنٹ کے ایوان کے سامنے ایک چھوٹا سا خوشنما تھیٹر ہے۔ اس میں انگورہ کی خوش الحان لڑکیاں اپنے قومی ترانوں سے ان ارکانِ پارلیمنٹ کے تھکے دماغوں کو مسرور بناتی ہیں جو دن بھر ایوانِ پارلیمنٹ میں مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ ان کے

ترانے اس قدر اثر انداز ہوتے ہیں کہ سامعین کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں''۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ خالدہ محترمہ نے بحیثیت وزیر تعلیمات عامہ اندرون اناطولیہ ایک طویل دورہ کیا تھا۔ اس کی واپسی پر آپ نے ایک مبسوط رپورٹ پارلیمنٹ کو پیش کی تھی جس میں نہایت مدلل طریق پر اناطولیہ کی آبادی کے اعداد وشمار اور ضروریات کا اظہار کیا تھا، اسی رپورٹ میں آپ نے بتلایا تھا کہ اناطولیہ میں پچاس ہزار دیہات ایسے ہیں جن میں تیس ہزار مدارس کھولنا چاہیے۔ یہ تجویز اگر چہ اس وقت جنگی ضروریات کے تحت ملتوی کر دی گئی تھی، لیکن 15 جنوری 1923 کے اخبار نجات بجنور نے اخبار ''شکاگو ٹربیون'' کے حوالہ سے اس تجویز کی منظوری کی اطلاع دی ہے گویا خالدہ خانم کا بنایا ہوا تعلیمی لائحہ عمل اس قدر اہم اور مفید تھا جو ضروریات جنگ کے معتدل صورت اختیار کرتے ہی منظور کر لیا گیا۔ خالدہ خانم کا یہ تعلیمی دور کوئی سال ڈیڑھ سال رہا اور اس عرصہ میں آپ نے جو گراں قدر علمی وعملی خدمات انجام دیں وہ ظاہر ہے کہ ان حد سے زیادہ مختصر اور غیر مسلسل حاصل شدہ خبروں کے ذریعہ پوری نہیں ہو سکتی ہیں۔ پھر بھی اس قدر حالات آپ کی فقید المثال علمی سرگرمیوں اور آپ کے غیر معمولی علمی تبحر کے اندازہ کے لیے بہت زیادہ کافی ہیں۔

اب میں خالدہ خانم محترمہ کے خالص وقار اور ان کی مقبول عام علمی خدمات کے متعلق بعض نہایت ممتاز اہل الرائے اصحاب کے خیالات درج کرتا ہوں جس سے خالدہ کی بلند پایہ حیثیت کا اندازہ ہوگا۔ مشہور اور معروف ترکی سیاح جناب مولانا محمد مارڈیوک پکھتال چیف ایڈیٹر بمبئی کرانیکل لکھتے ہیں کہ:

''خالدہ خانم ترکان احرار کے علمی وسیاسی ڈھانچے میں بمنزلہ روح کے کام کرتی ہیں''۔

مشہور فرانسیسی اخبار نویس وسیاست داں خاتون مس گالف جو خود عرصہ تک انگورہ میں مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی مہمان رہ چکی ہیں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے بذات خود خالدہ خانم کو انگورہ کے ایوان پارلیمنٹ میں دیکھا ہے۔ جس وقت مجھ سے اول مرتبہ ملیں وہ خالص ترکی لباس پہنے تھیں۔ وہ دوسری مرتبہ مجھ سے

اس وقت ملیں جب وہ ترکی یتیم خانوں کے معائنہ سے فارغ ہوکر اپنے سکونتی کالونی
میں چند عورتوں کو املا لکھا رہی تھیں۔ یہ ترکی عورت ایک قوی اعضا کی خاتون ہے اس
کا علمی تجربہ صرف ترکی بلکہ یورپ میں مسلّم ہے۔ یہ ایک ہمہ داں فاضلہ ہے جو معلّمہ،
ناول نگار، اخبار نویس اور مصنفہ ہے۔ خالدہ خانم وہی عورت ہے جو آسکر وائلڈ کی
کتابوں کا ترجمہ کر چکی ہے''۔

امریکہ کے پریس ڈیپوٹیشن مقیم اناطولیہ کے پریذیڈنٹ مسٹر وومیر لکھتے ہیں کہ:

''میں نے انگورہ میں مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کے بعد جس دلچسپ اور نہایت ممتاز
شخصیت سے ملاقات کی وہ خالدہ خانم وزیر تعلیمات انگورہ تھیں جن کا علمی تبحر اور
تعلیمی سرگرمیاں اس وقت ترکان احرار سے خراج تحسین حصول کر رہی ہیں''۔

انگورہ گورنمنٹ کے صدر اعظم جلالت مآب و دانش آگاہ حضور حسین رؤف پاشا نے
''نیویارک ہیرالڈ'' کے نمائندہ سے دوران ملاقات میں فرمایا کہ:

''مشرق نے کئی صدی کے بعد ایک مشہور عالم عورت پیدا کی ہے اور وہ خالدہ ادیب
خانم ہیں''۔

مذکورہ حصہ خالدہ محترمہ کی خالص علمی و تعلیمی خدمات سے متعلق تھا جس میں حاصل شدہ
اطلاعات کی اس مختصری فہرست سے قارئین کرام ممدوحہ کی بلند پایہ اور فضیلت مآب شخصیت سے
واقف ہوگئے ہوں گے۔ اب ممدوحہ کے اُن حالات کو بھی ملاحظہ کیجیے جنھوں نے خالدہ محترمہ کی
دوسری حیرت فزا قوت کا اظہار کیا ہے اور یہ قوت خالدہ محترمہ کے وہ جنگی کارنامے ہیں جو آپ نے
ترکانِ احرار کے احرار لشکروں کے ہمدوش انجام دیے۔ خالدہ مکرمہ کی تعلیمی و سیاسی خدمات کا
آخری زمانہ جولائی 1921 ہے۔ اس وقت تک آپ بحیثیت وزیر تعلیمات عامہ اناطولیہ میں
خدمات انجام دیتی رہی، لیکن اس ماہ کے آخر میں ترکی جنگی ہوائی جہازوں کے ذریعہ یہ اطلاع ملی
کہ یونانی لشکر انگورہ پر ایک کاری ضرب لگانے کے لیے بڑے پیمانے پر تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ
وہ تیاریاں تھیں جو ستمبر 1921 میں یونان کی ایک خونچکاں پیش قدمی کی صورت میں مقام ''سکاریہ''
پر مصدق ہوگئیں۔ اس وقت چونکہ ترکان احرار کی قوت چنداں قابلِ اعتماد نہ تھی اس لیے ایسی

خبروں سے اگر چہ انگورہ کا جنگی اسٹاف مطمئن تھا لیکن عام طور پر اس حملہ کی مدافعت کے لیے اضطراب پھیلا ہوا تھا اور جنگی اسٹاف بھی نہایت وسیع پیانہ پر مدافعت کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ ملک میں نوجوانوں کی بھرتی کے لیے بڑے بڑے انعام دیے جارہے تھے اور تمام جنگی لیڈر فوجی بھرتی میں مصروف تھے۔ نئی نئی فوجیں فراہم اور مرتب کی جارہی تھیں۔ غرض ملک کا گوشہ گوشہ جنگی تیاریوں میں منہمک تھا پس ایسی حالت میں خالدہ ایسی جواں ہمت وقوم پسند خاتون کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ ایوانِ تعلیم میں بیٹھ کر خاموشی سے اس جنگی مشکلات ومصائب کو دیکھتی رہے۔ آخر ان کا جذبہ ایثار وعمل پھر بھڑک اٹھا اور انھوں نے حفظ مذہب اور وطن کی مدافعت کے لیے بکمالِ جرأت تلوار اٹھائی اور ایک جنگجو اور تیغ آزما سپاہی کی طرح یہ تبحر عورت میدانِ عمل میں آ گئی۔

انھوں نے فوراً ایک جنگی لائحۂ عمل تیار کیا جس کی دفعات کا یہ مقصد تھا کہ:

1۔ مدافعت وطن کے لیے ترکی خواتین کا ایک جرار لشکر مرتب کیا جائے۔

2۔ بھرتی شدہ خواتین کی خدمات حسب ذیل طریق پر تقسیم کی جائیں:

(الف) جو جوان عورتیں چاہیں وہ میدانِ جنگ میں ترکی بٹالین کے پیچھے خدمات انجام دیں۔

(ب) جو نوجوان دبہادر عورتیں چاہیں وہ میدانِ جنگ میں ترکی مجروح کی اعانت کا فرض انجام دیں۔

(ج) تعلیم پذیرفتہ خواتین کو مردوں کی جگہ مقرر کرے۔ ان مردوں کو میدانِ جنگ کے لیے تیار کیا جائے۔

(د) رسد وباربرداری کی تمام خدمات عورتیں انجام دیں۔

(س) ڈاک خانوں، شفاخانوں، تجارتی وزراعتی شعبوں میں ترکی خواتین خدمات انجام دیں اور آسامیوں سے فارغ شدہ مرد خدمات جنگ ادا کریں۔

خالدہ محترمہ کا یہ وہ لائحۂ عمل تھا جسے انگورہ کے چیف آف دی اسٹاف کے صدر مارشل فوزی پاشا نے فوراً منظور کرلیا اور اس وقت سے خالدہ محترمہ کی جنگی خدمات کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس منظوری کے بعد خالدہ خانم فوراً ملک میں دورہ کے لیے روانہ ہوگئیں۔ آپ کی جگہ عارضی طور پر علامہ وہبی کام کرنے لگے جو آج کل گورنمنٹ انگورہ کے مستقل وزیر تعلیمات عامہ ہیں۔

خالدہ موصوفہ نے ابتدا میں ترکوں کے ممتاز جنرل علی احسان پاشا کے ہمراہ دورہ کیا جو اس وقت جنوبی اناطولیہ میں رنگروٹ بھرتی کر رہے تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد خالدہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور بجائے شہروں کے وہ دیہات میں گئیں جہاں انھوں نے ترکی مستورات کے سامنے حفظ وطن اور قومی خدمت کے موضوع پر ایسی دلدوز تقریریں کیں کہ ترکی مستورات کے دل ولولۂ عمل اور قربانی کے جذبات سے معمور ہو گئے اور انھوں نے بکمال مستعدی حفظ وطن اور قومی مدافعت کے لیے خالدہ کی آواز کو لبیک کہا۔ خالدہ موصوفہ نے ان خواتین کا انتخاب کیا اور جو عورتیں خدماتِ جنگ کے قابل نہ تھیں انھیں انگورہ میں دوسری خدمات کے لیے بھیج دیا۔ خالدہ محترمہ اپنی تقریروں میں عورتوں کو ان کے شوہروں اور نوجوان بیٹوں کو مذہب وملت پر فدا کرنے کے لیے آمادہ وتیار کرتی تھیں اور خود انھیں ملک وملت پر قربان ہونے کی ترغیب دیتی تھیں۔ ممدوحہ کی ان خدمات کے متعلق لندن کے ممتاز اخبار "ڈیلی میل" نے یہ الفاظ لکھے تھے۔

مشہور ترکی مصنف خاتون خالدہ ادیب جو سمرنا پر یونانی تصرف کے سبب سے اٹھارہ ماہ قبل اتحادی پہرہ داران قسطنطنیہ کی آنکھوں میں خاک ڈال کر مصطفیٰ کمال پاشا کے مجاہدین میں جا ملی تھیں اور وہاں وزیر تعلیمات مقرر ہوئی تھیں۔ اب وہ دورہ کر رہی ہیں اور ترکی خواتین کو اُکسا رہی ہیں کہ وہ ترک احرار کو مدد دیں اور مردوں کو مجاہدین میں شامل ہونے پر آمادہ کریں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے کئی زنانہ لشکر بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے جو ہر فوجی مستقر میں رہ کر کام کریں گے۔ خالدہ محترمہ کی ان تقریروں نے دیہات کی عورتوں میں جنگل کی آگ کی طرح اثر کیا اور وہ جوق در جوق خدماتِ جنگ کے لیے خالدہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ جب ترکی عورتوں کے ہجوم کے ہجوم فوج میں بھرتی ہونے لگے تو خالدہ محترمہ نے ان کی فوجی تنظیم کے لیے انگورہ کے جنگی اسٹاف سے امداد طلب کی تا کہ ایک فوجی جماعت اس بھرتی شدہ جماعت کو قواعد جنگ کی تعلیم دے۔ جنگی اسٹاف نے اس درخواست کو منظور کر لیا اور ایک تجربہ کار جنگی جماعت خالدہ کے ساتھ کر دی جو ان عورتوں کو قواعد جنگ سکھلاتی تھی۔ خالدہ خانم کو جب دیہات میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی تو وہ اندرونِ ملک تشریف لے آئیں اور شہروں میں بڑے بڑے جلسے منعقد کیے جن میں شہری عورتوں سے خدماتِ جنگ کے

لیے اپیل کیے۔ انھوں نے بھرتی شدہ عورتوں کی تربیت اور فوجی تعلیم کے لیے قواعد داں خواتین کا انتخاب کیا اور انھیں بھرتی شدہ عورتوں کو قواعد سکھلانے کا کام سپرد کیا۔ انھوں نے شہری اور تعلیم یافتہ خواتین کو بھرتی کا کام سپرد کر دیا۔ اسی طرح اناطولیہ میں بکثرت عورتیں تبلیغی خدمات بھی انجام دینے میں مصروف ہوگئیں اور اس تدبیر کے ساتھ انھوں نے ان فوجی افسروں کو دوسری خدمات کے لیے آزاد کر دیا جو عورتوں کو قواعد جنگ سکھانے پر مامور تھے۔ جب مستورات کی تعداد کافی ہوگئی تو ایک شش ماہی کے اندر جنگی اسٹاف کے تحت ان کے چھوٹے چھوٹے دستے بنائے گئے اور انھیں میدانِ جنگ کے ان حفاظتی مقامات پر بھیج دیا گیا جہاں سے ان کے ساتھ مل کر آگے بڑھا دیے گئے تھے۔ یہ نسوانی لشکر عموماً پلوں، تار گھر اور ریلوے اسٹیشنوں کی حفاظت کرتے تھے۔

خالدہ خانم نے ان عورتوں میں اپنی تقریروں کے ذریعہ اس قدر جوش اور دلولہ پیدا کر دیا تھا کہ ہر عورت خود کو میدانِ جنگ کے لیے پیش کرتی تھی۔ اُدھر ترکی جرنلوں نے آپ کی ترتیب میں زبردست جنگی اصول سے کام لیا تھا مثلاً کرنل یعقوب بے نے ترکی خواتین کا ایک دستہ رات کو دشمن پر چھاپے مارنے کے لیے تیار کیا تھا۔ یہ وہ جاں نثار نسوانی دستہ تھا جس نے اپنی شب خونوں سے علاقہ اسمر میں دشمن کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ نسوانی لشکر کا ایک حصہ سامانِ حرب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنی نگرانی میں منتقل کراتا تھا۔ خالدہ خانم نے اپنے لشکر کے خود ہی دو حصے کیے تھے جن میں سے ایک تو میدانِ جنگ کی خدمات انجام دیتا تھا اور دوسرا کاروباری معاملات خصوصاً جنگی اسٹاف سے متعلق خدمات کے لیے وقف تھا۔

غرض خالدہ محترمہ کی یہ جنگی سرگرمیاں انگورہ و اناطولیہ کے بجائے خود ترکی عورتوں اور خصوصاً نوجوانوں کے لیے پیغامِ عمل بن گئی تھیں اور بعد میں یہ حالت ہوئی کہ کثیر التعداد مجاہدین محض اس حمیت کے جذبہ سے متاثر ہو کر میدانِ عمل میں آگئے کہ ان کے سامنے نسوانی لشکر اور جنگی والنٹیئر خدماتِ جنگ میں مصروف تھے۔ ان خدمات نے اناطولیہ میں خالدہ محترمہ کی ذات کو ایک بااثر لیڈر کی حیثیت میں بدل دیا اور انگورہ کے جنگی اسٹاف نے ان کامیاب خدمات کے صلہ میں انھیں نسوانی لشکر کا لیڈر بنا دیا ہے۔ اس اعزاز کے ملتے ہی خالدہ کی خدمات اور سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اب وہ خود محاذِ جنگ پر جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔ انھوں نے چند منتخب نسوانی

دستوں کو اپنی رائے کے موافق ایسے موقع پر متعین کیا تھا جہاں سے دشمن پر کامیاب زد پڑتی تھی۔ خالدہ محترمہ کو میدانِ جنگ میں دست بدست جنگ کرنے کا شوق تھا چنانچہ جس وقت ستمبر 1921ء میں مشہور یونانی حملہ شروع ہوا تو خالدہ اس وقت مع اپنے نسوانی لشکر کے میدانِ جنگ میں موجود تھیں اور آپ ان مجاہدین کو جو میدانِ جنگ میں مجروح ہوتے تھے تحریصِ جنگ دلاتی تھیں۔ مقام ''اینی بولی'' کی مشہور تاریخی جنگ میں جہاں مجاہدینِ انگورہ سرکردہ احرار فیلڈ مارشل عصمت پاشا کی کمانڈ میں کمالِ مردانگی دکھا رہے تھے۔ خالدہ ان مجاہد فوجوں کے عقب میں اپنے نسوانی لشکر کے ساتھ موجود تھیں۔ ایک ترکی نامہ نگار نے لکھا تھا کہ اگر اس جنگ میں فیلڈ مارشل عصمت پاشا ان نسوانی لشکروں کو پیش قدمی سے روک نہ دیتے تو یقیناً خالدہ خانم اس جنگ میں تمام آ جاتیں کیونکہ ان کے فداکارانہ جذبات میدانِ جنگ کے چشم دید حالات سے بہت مشتعل ہو گئے تھے۔ اس خبر کی تصدیق میں امریکن پریس بیورو کے صدر مسٹر میر جو اس وقت عصمت پاشا کے ساتھ میدانِ جنگ میں موجود تھے لکھتے ہیں کہ:

> اس تاریخی معرکہ میں، میں نے خالدہ خانم اور ان کے نسوانی لشکر کو جس بہادری سے صفوفِ جنگ میں کام کرتے دیکھا اس سے قبل میرے ذہن میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ دنیا ایسی شجیع عورتیں پیدا کر سکتی ہے''۔

(الاخبار، مصر القاہرہ، 25 اکتوبر 1921)

معرکہ سکاریہ کے بعد خالدہ خانم فوجی مسائل میں حصہ لیتی رہیں اور ان کی جنگی دلچسپیاں اس درجہ بڑھ گئیں کہ انھوں نے حملہ کے بعد ہی یونانی فوجوں سے جوابی حملہ کے لیے ایک جنگی اسکیم مرتب کی جس میں مواقع جنگ کی اطمینان بخش حالت کا ذکر کرتے ہوئے حضور مارشل مصطفیٰ کمال پاشا پر تساہل و کاہلی کا آواز کسا تھا اور زور دیا تھا کہ وہ فوراً یونانیوں پر جوابی حملہ شروع کر دیں۔ اگر چہ اس وقت انگورہ کا جنگی اسٹاف جوابی حملہ کے لیے خود تدابیر اختیار کر رہا تھا مگر خالدہ محترمہ کا جذبۂ انتقام اس قدر مشتعل تھا کہ انھوں نے اس تاخیر پر جنگی اسٹاف کو ''کاہل'' اور وقت کو ٹالنے والا کہا تھا اور اس سستی پر سخت طعن کی تھی۔ بالآخر اگست 1922 کو ترکانِ احرار کا وہ عظیم الشان تاریخی حملہ شروع ہو گیا جس کے ذریعہ ترکانِ اناطولیہ نے پورے ایشیائے کوچک اور

قسطنطنیہ تک آزاد کرالیا۔ اس حملہ کی تاریخی اہمیت فوجی حلقوں میں ہمیشہ یادگار رہے گی جس میں ڈھائی لاکھ ترکی فوجوں نے فیلڈ مارشل مصطفیٰ فوزی پاشا، مارشل مصطفیٰ کمال پاشا، مارشل عصمت پاشا، مارشل نورالدین پاشا اور مارشل کاظم قرہ بکر پاشا ایسے جلیل القدر جنگی جرنلوں کی کمانڈ میں پیش قدمی کی تھی۔ اس کی خوں بار وخوں ریز پیش قدمی کا اس سے اندازہ کیجیے کہ اس حملہ کا محاذ مختلف حیثیتوں سے چار سو میل طویل وعریض تھا اور جس میں تقریباً تیس ہزار پختہ کار اور تیغ آزما ترکی جنرل کمانڈ کر رہے تھے اور کامل ڈھائی ہفتہ شبانہ روز یہ معرکہ برپا رہا۔ گویا ترکی قوم اور حاملانِ خلافت یا اسلام کا یہ آخری اور فیصلہ کن معرکہ تھا جس میں تمام ترکی فوجوں نے ختم وتمام ہوجانے کی قسم کھائی تھی۔ پس مذکورہ حالات کی بنا پر آپ خیال کر سکتے ہیں کہ اس قیامت خیز معرکہ میں خالدہ ایسی جلیل القدر مجاہد عورت شریک نہ ہوگی؟ ہاں وہ تھی اور بڑی جرأت سے اس معرکہ میں تیغ آزمائی کر رہی تھی۔ البتہ ہندستان میں رپورٹر نے خالدہ کی معرکہ آرائی کی کوئی واضح خبر نہ دی لیکن قسطنطنیہ کے ممتاز اسلامی آرگن ''توحید افکار'' کے نامہ نگار نے جو اس معرکہ کے دوسرے دن مارشل عصمت پاشا کے ہمراہ محاذِ جنگ کے معائنہ کے لیے گئے تھے اس جنگ جو اور مجاہد خاتون کے حالات سے پردہ اٹھایا اور یہ اطلاع عربی اخبارات کے ذریعہ ہندستان تک پہنچ گئی۔ چنانچہ نامہ نگار ممدوح تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''جب ہم الیون قرہ حصار میں پہنچے تو میں نے ایک بازار میں دیکھا کہ خالدہ خانم عورتوں کے درمیان تقریر کر رہی ہیں اور وہ عورتیں ان کے سامنے یونانی قبضہ کے مظالم سنا رہی ہیں۔ وہ اس وقت میدانِ جنگ سے واپس آکر غنیمت اور مظلومین کے انتظام میں مصروف تھیں''۔

(الاخبار، مصر ذریعہ نجات، سورخہ 28 فروری 1923)

الحاصل یہ معرکہ 8 ستمبر 1922 کو فتح سمرنا کی صورت میں ختم ہوگیا اور ترکی فوجیں سمرنا سے بڑھ کر جب قلعہ چناق پر حملہ آور ہوئیں تو اتحادیوں کی طرف سے ترکوں کے سامنے درخواست صلح اور التوائے جنگ پیش ہوئی اور برطانوی کمانڈر مقیم درہ دانیال جرنل ہیرنگٹن اور سر رمبولڈ نے ترکی کمانڈر مارشل عصمت پاشا سے پیش قدمی روک دینے اور مقام مدانیہ میں معاہدہ التوائے جنگ کے

لیے استدعا کی، جسے ترکی کمانڈر نے منظور کر لیا اور ترکانِ اناطولیہ کا اس طرح یہ کامیاب حملہ ختم ہو گیا جس کے بعد ہی 19 اکتوبر 1922 کو ترکی جرنل حضور رافت پاشا نے قسطنطنیہ پر ترکانِ احرار کے قبضہ کا اعلان کر دیا اور اسی طرح کامل تین سال کی خوں ریز قربانیوں کے بعد مارشل مصطفیٰ کمال پاشا قائداعظم کی زیر کمان بہادر ترکوں نے مقام خلافت کو آزاد کرا لیا۔ پس اس آزادی و کامرانی کے بعد جنوری 1923 میں ڈاکٹر عدنان بے نے حسب الحکم انگورہ گورنمنٹ عہدۂ صدارت سے استعفیٰ دے کر قسطنطنیہ کی گورنری کا رافت پاشا سے چارج لے لیا اور ماہ جنوری 1923 میں فاضل جلیل اور اسلام و اسلامیات کی یہ مایۂ صد نازش خاتون خالدہ خانم اپنے شوہر کے ساتھ مقام خلافت قسطنطنیہ میں بخیر و خوبی اور پوری کامیابی اور فتح مندی کے ساتھ داخل ہو گئیں۔

زندہ باد خالدہ خانم

اب ذیل میں مخدومہ کی ان تمام عظیم الشان اور حیرت فزا قربانیوں اور سرگرمیوں کا اندازہ کرنے کے لیے دو خبریں ایسی درج کرتا ہوں جن سے محترمہ مذکورہ کی گرامی قدر ذات کا خداساز مرتبہ پہچانا جا سکے گا اور ان ہی خبروں سے معلوم ہوگا کہ خالدہ محترمہ کا ترکوں میں کس قدر زبردست اقتدار قائم ہے؟

جب انگورہ گورنمنٹ کے صدر اعظم شوکت نشاں حضور قدر قدرت حسین رؤف پاشا بحیثیت فاتح سمرنا میں داخل ہوئے تو آپ نے باشندگانِ سمرنا کے ایڈریس کے جواب میں جو سرکاری تقریر فرمائی اس میں مخدومہ خالدہ اور آپ کے نسوانی لشکروں اور رضاکار عورتوں کے لیے ارشاد فرمایا کہ:

''مجھے وہ الفاظ نہیں ملتے جن کے ذریعہ میں آپ کا اور آپ کی مجاہد خواتین کا شکریہ ادا کروں''۔

وزیراعظم نے خالدہ محترمہ کے شکریہ میں جو الفاظ صرف کیے وہ سرکاری حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد خالدہ محترمہ کی بلند مرتبہ خدمات کے اعتراف میں سب سے آخری مگر حد سے سوا شرف اندوز و سعادت نصیب اطلاع یہ ہے کہ ممدوحہ کو انہی خدمات کی بدولت نائب مناب نبی سردار اتقیا سالار اصفیا سرکار دین پناہ خاقان ابن خاقان سلطان ابن شہنشاہ بحر و بر حضور

خلیفۃ المسلمین غازی عبدالحمید خاں خلد اللہ ملکہ وسلطنت نے بارگاہ خلافت میں باریاب فرما کر بہ نفسِ نفیس مخاطب فرمایا جو ترکی نسوانی تاریخ میں سب سے پہلا شرف ہے جس سے خالدہ محترمہ بہرہ اندوز ہوئیں۔

حلیہ وخصائص:

خالدہ خانم محترمہ کا بچپن اسکول وکالج میں گزرا ہے۔اس وقت خالدہ خانم امریکن وترکی طالبات میں ممتاز خوبیوں کی سرمایہ دار تھیں۔خالدہ محترمہ کے بچپن کا سنگھار انہی عام ترکی عورتوں کے مانند تھا جو ترکی حرم کی زینت سمجھی جاتی تھیں۔اُس وقت خالدہ ایک نہایت نرم ونازک اندام لڑکی تھیں۔آنکھیں باوجود یورپین ہونے کے قدرے سیاہ، پیشانی کشادہ اور ناک کسی قدر موٹی تھی۔پیشانی کے سنہری کاکل ان کے نقاب سے باہر نکلے رہتے تھے۔ان کی پلکوں پر ہلکا سرمہ لگا رہتا تھا۔وہ ہونٹوں پر بطریق فیشن سرخی ملتی تھیں۔غرض زمانِ طفولیت میں وہ ہر طرح ان نئی فیشن ایبل عورتوں کے خلاف وضع رکھتی تھیں، جن کی آگے چل کر وہ قائد ورہنما بننے والی تھیں لیکن اس زمانہ میں بھی وہ جب تقریر کرتی تھیں تو آپ کے ظاہری نقاب سے آپ کے بلند وروشن مستقبل کا نور چھن چھن کر نکلتا تھا۔وہ اس وقت بھی تقریر میں آتش بیان تھیں اور اُن کی قدرتی فصاحت و بلاغت اور جوش وسرگرمی کی وجہ سے تمام ہم جماعت لڑکیاں ان کی مداح ومعترف تھیں۔

خالدہ خانم نہایت درجہ نرم طبع، مستقل مزاج اور کافی دلفریبیوں کا مجموعہ ہیں۔آپ کی آواز میں دلکش شیرینی ہے، لیکن کسی معرکۃ الآرا تقریر کے دوران میں ہی نرم ونازک آواز گرجتے ہوئے بادلوں کی مانند تیز وتند ہو جاتی ہے جو شرکائے جلسہ کو مرغوب ومبہوت کر دیتی ہے۔پچھلے زمانہ میں تو خالدہ موصوفہ اس اپنی مغربی تعلیم وتربیت کی وجہ سے یورپین معاشرت کی طرف مائل تھیں لیکن کچھ دن بعد ہی وہ یورپ کی ہر چیز سے بیزار ہوگئیں۔خالدہ مخدومہ عموماً ترکی لباس زیب تن فرماتی ہیں لیکن وہ میدانِ جنگ میں کبھی سبز اور کبھی سیاہ عمامہ باندھ کر شریکِ جہاد ہوتی تھیں جو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے مخصوص لباسِ جہاد میں داخل ہے۔خالدہ ممدوحہ جب سیاہ عمامہ باندھ کر میدانِ جنگ میں پہنچتی تھیں تو فوجوں میں زلزلہ، جوش وخروش پیدا ہو جاتا تھا۔

خالدہ محترمہ بلند پایہ مدبرین کی طرح نہایت متین وخاموش رہتی ہیں، لیکن وہ جلسوں میں

آٹھ آٹھ گھنٹہ مسلسل تقریر کرتی رہتی ہیں پھر بھی اثنائے تقریر ان کے چہرہ پر تکان کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ خالدہ خانم کو غصہ بہت کم آتا ہے بلکہ وہ کبھی کبھی گفتگو کرتے ہوئے کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہیں، لیکن ان کی فطرتی متانت انھیں فوراً خاموش کر دیتی ہے۔ آپ طبعاً اس قدر جفاکش اور محنتی واقع ہوئی ہیں کہ موجودہ میدانِ جنگ و سیاست کی سرگرمیوں سے قبل بھی آپ کالج میں ''محنتی لڑکی'' کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ آپ کا عزم و ثبات ترکی عورتوں میں مشہور ہے۔

ان خوبیوں میں سب سے نمایاں خصوصیت آپ کی رقتِ قلب ہے اور یہی وہ قلبی نرمی ہے جس نے آپ کو بالآخر جنگ و قتال اور ملک و مذہب کی خطرناک مصیبتوں میں بلا تامل ڈال دیا۔

مذکورہ حالات سے خالدہ محترمہ کی اخلاقی و معاشرتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور اس قدر حالات کے بعد میں ممدوحہ کی سوانح ختم کرتا ہوں۔

پائندہ باد خالدہ خانم

نگار ادیب خانم

ترکانِ احرار کی جدید جدوجہد میں خالدہ خانم کے کارنامے نہ صرف ترکی تاریخ کے لیے مایۂ نازش ہیں بلکہ عالمِ اسلام خصوصاً اور مشرقی اقوام عموماً اپنی نسوانی جدوجہد اور عروج وتہذیب میں اس بلند حوصلہ اور فاضل خاتون کے حوصلہ افزا حالات کو اپنا طرزِ عنوان بنائیں گی۔ ممدوحہ کے حیرت زا کارناموں کی نسبت سے ہر شخص کو قدرتاً ممدوحہ کے خاندانی اور ابتدائی حالات کے معلوم کرنے کا شوق ہے، لہٰذا میں اس ذوق کی سیرابی کے لیے آپ کی چھوٹی بہن نگار ادیب خانم کے سوانح حیات پیش کرتا ہوں جن کے ذریعہ معلوم ہوگا کہ:

این خانہ ہمہ آفتاب ست

خالدہ ادیب خانم کی دو بہنیں ہیں نگار ادیب خانم اور بلقیس ادیب خانم۔ مجھے مشہور انشا پرداز مسٹر محمد مار ماڈیوک پکھتال چیف ایڈیٹر بمبئی کرانیکل سے معلوم ہوا اور اس کے بعد ہی میں نے دونوں بہنوں کے حالات کی جستجو شروع کردی۔ حاصل شدہ حالات میں افسوس کہ بلقیس ادیب خانم کے حالات معلوم نہ ہوسکے البتہ نگار ادیب خانم کے جو حالات مل سکے وہ یہ ہیں۔

نگار ادیب خانم اگرچہ اسلامی ہند میں روشناس نہیں لیکن وہ حدودِ ترکی میں کافی شہرت رکھتی ہیں۔ انھوں نے جس طرح اپنی بہن کے ساتھ تعلیم حاصل کی اسی طرح وہ عملی طور پر بھی ان

سے پیچھے نہیں رہیں۔ البتہ ان کی خدمات علم وادب سے متعلق ہیں۔

وہ ایک زبردست اور شیوہ بیان شاعرہ ہیں۔ وہ جب تعلیم سے فارغ ہوئیں تو انھوں نے روس وترکستان اور ولایت شام کی سیاحت کی۔ انھوں نے شاعری میں مشہور ترکی شاعر نامق کمال بے کا تتبع کیا ہے۔ انھوں نے فنِ شاعری کی تکمیل کے بعد مضمون نگاری شروع کی۔ وہ علمی مضامین زیادہ لکھتی رہیں، مگر زورِ قلم کا یہ حال تھا کہ اخبار ''طنین قسطنطنیہ'' کے علمی ضمیمہ سے نگار خانم کے مخصوص اور قیمتی مضامین کا ایک علاحدہ مجموعہ شائع ہوا ہے جو معاشیات سے متعلق ہے۔ وہ فنِ طب میں بھی کافی درک رکھتی ہیں۔ یہ ان کی انشا پردازی کا کمال ہے کہ ان کے مضامین کو ایک فرانسیسی خاتون نے جب قسطنطنیہ میں پڑھا تو اس نے نگار خانم کو اپنے یہاں دعوت دی۔ جب نگار خانم اس فرانسیسی خاتون سے ملیں تو اس نے کہا کہ اگر آپ فرانسیسی زبان پڑھ لیں تو آپ کے بلند پایہ مضامین کو فرانسیسی عورتیں بکمال قدر دانی پڑھیں گی۔ نگار ادیب خانم نے اس مشورہ کو قبول کیا اور انھوں نے خاتونِ مذکور سے فرانسیسی زبان سیکھنا شروع کر دیا اور فرانسیسی خاتون نگار ادیب خانم سے اسلامی اصول ازدواج اور مسائلِ فقہ کے متعلق معلومات حاصل کرتی رہیں۔ نگار ادیب ممدوحہ اس قدر غیر معمولی ذہین واقع ہوئی تھیں کہ ایک سال میں انھوں نے فرانسیسی زبان میں اس قدر استعداد پیدا کر لی کہ یہ فرانسیسی خاتون ان کی ذہانت پر حیران رہ گئی۔

جب نگار ادیب خانم کو فرانسیسی زبان میں کافی مہارت حاصل ہو گئی تو انھوں نے اپنی استانی کے مشورہ سے فرانسیسی ادبیات اور شعرا کے کلام کا مطالعہ شروع کیا اور تھوڑے عرصہ میں انھوں نے فرانسیسی شاعری کے انداز و پرواز اور ادبیات پر کافی عبور حاصل کر لیا۔ انھوں نے پہلی مرتبہ فرانسیسی رنگ میں ایک تضمین لکھی جو ایک فرانسیسی شاعر کی نظم پر تھی۔ یہ تضمین قسطنطنیہ کے ایک علمی رسالہ ''عقاب'' میں چھپی تھی جو ترکی و فرانسیسی زبان میں ایک ارمن مستشرق کی ایڈیٹری میں پندرہ روزہ چھپا تھا۔ اس تضمین نے نگار ادیب خانم کو اس درجہ نمایاں کیا کہ علاوہ ترکی علمی حلقوں کے فرانس میں لوگ نگار ادیب خانم کے شائق ہو گئے۔ خود ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ نگار ادیب خانم کی اس تضمین پر مجھے فرانسیسی تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے بکثرت خطوط ان [illegible] ف کے لیے وصول ہوئے تھے۔

اس قدر حالات کے بعد نگار ادیب خانم پر بھی عام ارباب علم وکمال کی طرح ایک المناک وقت آ گیا۔ انھوں نے ڈاکٹر اسعد بے سے شادی کرلی جو شاہی خاندان کے ڈاکٹر تھے اور اس وقت وہ اٹلی میں ترکی قالینوں کی تجارت کرتے تھے۔ نگار ادیب خانم کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ابھی اس بچی کی عمر ڈیڑھ سال ہی کی تھی کہ ڈاکٹر اسعد بے کا انتقال ہو گیا۔ تمام تجارتی کاروبار میں نقصان ہوا اور جو کچھ سرمایہ تھا اس سے نگار ادیب خانم محروم رہ گئیں۔ کیونکہ ڈاکٹر اسعد بے کے بڑے بھائی جودت بے نے اس تمام جائیداد پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت نگار ادیب خانم زچگی کے مرض میں مبتلا تھیں جس کا سلسلہ کامل دو برس رہا اور اسی عرصہ میں ان کی بچی کا بھی انتقال ہو گیا۔ غرض وہ ایک سخت آزمائش میں مبتلا ہو گئیں جس کا دماغ سوز سلسلہ کوئی چار برس قائم رہا۔ جب نگار ادیب خانم کو ان مصائب سے قدرے فراغت نصیب ہوئی تو انھوں نے پھر علمی خدمات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اب ان کے مضامین ترکی و فرانسیسی زبان میں شائع ہوتے رہے جن میں وہ بیشتر شاعری اور مذہب کے متعلق خیالات ظاہر کرتی تھیں اور اسی سلسلہ میں فرانسیسی پارلیمنٹ کے ایک ممبر موسیو پالرے کی بیوی نے جو خود بھی خوش ذوق شاعرہ تھی انھیں پیرس آنے کی دعوت دی، مگر اس وقت نگار ادیب خانم پیرس نہ جا سکیں البتہ اس دعوت کے جواب میں انھوں نے ایک نظم لکھی جو اسی میزبان فرانسیسی خاتون کے نام تھی۔ جس وقت یہ نظم خاتون مذکورہ کو ملی تو اس نے اس کے ڈیڑھ ہزار نسخے فرانسیسی زبان میں چھپوا کر فرانسیسی علمی جماعتوں بالخصوص نسوانی انجمنوں میں تقسیم کرائے۔

نگار ادیب خانم کے یہ وہ حالات ہیں جنھیں انھی کے ایک مجموعۂ مضمون موسومہ ''اشک سے'' اخذ کیا گیا ہے۔ ''اشک'' ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جس میں ان کے مختصر حالات زندگی مع مختلف نظموں کے شائع ہوئے ہیں۔ ان حالات کے لیے مجھے اپنے ایک عزیز دوست کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے مجھے یہ حالات عطا فرمائے اور جو اس وقت جرمنی کے مشہور مقام، ہیمبرگ میں بہ سلسلہ تعلیم وتجارت مقیم ہیں۔

اس کے بعد مجھے نگار ادیب خانم کا ایک دوسرا مجموعۂ نظم ونثر ہاتھ آیا۔ یہ ایک چھوٹی تقطیع کا نہایت خوشنما مجموعہ ہے جو 1316 میں سرکاری مطبع قسطنطنیہ میں چھپا ہے۔ اس کے سرورق پر

''نگار خانم'' کے قلمی دستخط ہیں اور یہ عبارت ان کے قلم سے لکھی ہوئی ہے:

''استانبول بر خاطرہ ناچیز اخصوصی نگار بنت عثمان ادیب''۔

اس مجموعہ کی ضخامت 324 صفحات ہیں جس کی ابتدا میں 110 صفحہ تک منظوم کلام ہے اور باقی میں نثر، ادبی، علمی اور اصلاحی مضامین ہیں۔ اس مجموعہ کی پُر کیف رنگینیوں کو دیکھ کر نگار ادیب خانم کے بہار آفریں قلم کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس کا ہر شعر وجد آفریں کیفیت کا ایک جام لبالب ہے جو اس کے دلکشا صفحات سے چھلکا پڑتا ہے۔ نظم کا پہلا عنوان ''طفل خیال'' ہے جس میں فاضل نگار ادیب خانم نے تخیل کے ایسے نازک نکات بیان کیے ہیں کہ روح وجد کرتی ہے اور دل میں کیف و گداز کی ایک ولولہ انگیز تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ صفحہ سوم سے امید، تصویر و نامہ، عطر یار اور ترانہ خزاں کے وہ دلفریب عناوین شروع ہوتی ہیں جو شاعری اور فنِ شعر کی اچھوتی مثالیں ہیں۔ 'امید' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں ایک جگہ نگار ادیب خانم انتظار دوست کے موقع پر لکھتی ہیں کہ:

''جب کرب واضطراب میں رات تمام ہوگئی اور میری آنکھوں سے خونِ جگر کی تراوش بھی بند ہوگئی تو میں تمھاری آمد سے مایوس ہوگئی کیونکہ خونِ جگر کا ہر آنسو جو میری آنکھوں سے ٹپکتا تھا وہ تمھاری آمد کا سچا قاصد ہوتا تھا''۔

''ترانہ خزاں'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں عام ترکی مذاق کے موافق ''وطن عزیز'' کا نوحہ کیا گیا ہے، لیکن غلام ہندستان کے مذاق کے خلاف اس میں بجائے دلگداز و دل شکن خیالات کے ولولہ انگیز اور جرأت آموز جذبات سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ عثمانی جھنڈے کو مخاطب کر کے لکھتی ہیں کہ:

''پیاپے مصائب سے اگرچہ تیری فاتحانہ جنبش و حرکت میں قدرے سکون پیدا ہوگیا ہے، لیکن اگر نوجوان تجھ پر فدا ہو چکے ہیں تو ابھی مایوس نہ ہو بلکہ ان ترکی ماؤں کی طرف دیکھ اور خوش ہو، جو اپنی لاڈلی گودوں میں چھوٹے چھوٹے ترکی بہادروں کو پرورش کر رہی ہیں لہٰذا جب یہ جوان ہو جائیں گے تو پھر ایک مرتبہ تیرے عروج اعتلا اور سربلندی کے لیے وہ اپنی گردنیں تجھ پر نثار کر دیں گے''۔

غرض نگار ادیب خانم کے کلام کا صحیح اندازہ ان کے کلام ہی سے ہوسکتا ہے۔ دوسرے حصہ میں دریا، مہتاب، اسلامی حمیت، عصبیت اور لوح مزار کے عناوین سے جونثری مضامین لکھے ہیں اوران میں کمال انشا پردازی کے جو جوہر دکھلائے ہیں وہ نگار ادیب خانم کی ادبی بلند پائیگی کے نہایت روشن نمونے ہیں۔ خصوصاً لوح مزار اور اسلامی حمیت میں نگار ادیب خانم نے انسانی فطرت کے جن نازک جذبات سے بحث کی ہے وہ دنیا کے بلند سے بلند ادبیات میں طراز عنواں بنانے کے قابل ہیں۔ الغرض بحالات مذکورہ نگار ادیب بھی خالدہ ادیب کی طرح ایک مصلح دماغ کی عورت کہی جاسکتی ہیں جنھوں نے اپنے علم و تبحر اور اپنے دماغ و قلم سے ملک و ملت اور دین حنیف کی یادگار خدمات انجام دیں۔ نگار ادیب خانم ترکستان میں نہایت سربلند اور شہرت یافتہ خاتون ہیں۔ چنانچہ اس قبول عام اور ان کی معروف ذات کا یہ حال ہے کہ بیگم صاحبہ؟؟؟ جب قسطنطنیہ بغرض سیاحت تشریف لے گئیں تو انھوں نے اپنے سفرنامہ میں ترکی کی مشہور و معروف عورتوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور اس مخصوص حصہ میں انھوں نے نگار خانم کے متعلق حسب ذیل عبارت لکھی ہے:

> ''ایک بی بی سے میں ملی جن کا نام نگار خانم ہے اور یہ ترکی کی بڑی نامی شاعرہ ہیں۔ یہ میرے پاس آئیں اور جب انھیں یقین آگیا کہ میں مسلمان ہندی خاتون ہوں تو وہ بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہوئیں اور مجھے اپنے یہاں دعوت دی''۔

(ملاحظہ ہو میر یورپ، صفحہ 26-268، مطبوعہ یونین اسٹیم پریس، لاہور)

اس عبارت سے یہ اندازہ ہوگا کہ نگار خانم ترکی میں ایک ممتاز شہرت رکھتی ہیں اور ان کے علمی و ادبی کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں۔

افسوس کہ خالدہ ادیب خانم کی تیسری بہن بلقیس ادیب خانم کے حالات میسر نہ آسکے ورنہ معلوم ہوتا کہ عثمان ادیب پاشا کی ہونہار د مایۂ نازش صاحبزادیوں نے ترکی خواتین میں کیسی یادگار اور لازوال شہرت و اہلیت پیدا کی۔

◆◆◆

خواتین قسطنطنیہ

میں نے خالدہ محترمہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ممدوحہ نے بکمال تدبر قسطنطنیہ میں جو سرگرم کوششیں انگورہ اور حفظ وطن کی خاطر انجام دیں ان میں خالدہ محترمہ نے قسطنطنیہ کی خواتین کو آمادۂ خدمت کر کے ان کی باقاعدہ جماعتیں متعین کردی تھیں جو بطریق تقسیم عمل اپنے اپنے مفوضہ کام کو انجام دینے میں مصروف رہتی تھیں۔ اب ان خواتین کے ان کارناموں کو ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے قسطنطنیہ میں رہ کر باوجود اتحادی نگرانی اور گوناگوں خطرات کے انجام دیں۔ ان خواتین کی تین کارکن جماعتیں جو اوپر لکھی گئی یہ ہیں:

1۔ احرار انگورہ کے لیے اسلحہ جنگ فراہم کرنے والی جماعت۔

2۔ تحریر و تقریر کے ذریعہ انگورہ کو مجاہدین روانہ کرنے والی جماعت۔

3۔ جاسوس جماعت۔

خواتین قسطنطنیہ کو جب ان کے ماحول اور وطن کی حد سے بڑھی ہوئی بے چارگی نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے فطرتی حقوق اور وطن کی حفاظت کریں تو وہ بکمال دلیری گھروں سے نکل کھڑی ہوگئیں۔ ان خواتین میں ملک کی تعلیم یافتہ عورتیں زیادہ تھیں۔ انھوں نے نہایت ہوشیاری اور جرأت سے اپنی خدمات کو تقسیم کر کے کام شروع کر دیا۔ یہ بہادر عورتیں نہایت خفتہ کارروائی کرتی

تھیں۔ وہ شب کے وقت اپنے گھروں میں جلسے کر کے ملک وقوم کو آمادۂ انتقام کرتی تھیں۔ انھوں نے سب سے پہلے مردوں کو انگورہ پہنچ کر احرار کے ساتھ مل کر کام کرنے پر آمادہ کیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں انھوں نے سینکڑوں رضا کار اور مجاہد اناطولیہ پہنچا دیے۔

ایک جماعت نہایت مستعدی کے ساتھ اسلحہ جنگ فراہم کرنے میں مصروف تھی اور عورتوں کی بھی وہ جماعت تھی جس کا کام نہایت خطرناک تھا، لیکن یہ بہادر و ہوشیار سپاہی عورتیں تمام کام شب کی تاریکی میں انجام دیتی تھیں۔ یہ عورتیں احرار انگورہ کے اس معتبر گروہ سے ملی ہوئی تھیں جو نہایت احتیاط سے قسطنطنیہ میں احرار کی طرف سے مقرر تھا۔ یہ عورتیں جس قدر اسلحہ اور سامانِ حرب فراہم کرتی تھیں وہ ان کے حوالہ کر دیا جاتا تھا اور پھر بڑی حفاظت کے ساتھ وہ انگورہ روانہ کر دیا جاتا تھا۔ یہ عورتیں نہایت آزادی سے قسطنطنیہ کے محلوں میں گشت لگاتی تھیں اور غریبوں سے لے کر امرا کے مکانوں میں بے تکان داخل ہو جاتی تھیں جہاں وہ اپنی بہنوں کو گھر سے نکل کر اس خطرناک مگر مبارک خدمت کی دعوت دیتی تھیں۔ ان عورتوں نے بجائے جلسوں اور مجالس کے اس طرح فرداً فرداً بہت کامیابی حاصل کر لی تھی۔ خواتین قسطنطنیہ کے اس طریق عمل کا یہ عمدہ نتیجہ نکلا کہ وہ اپنے اپنے کام میں نہایت چستی و مستعدی سے سرگرم رہیں لیکن اتحادیوں کو ان خطرناک اور مخالف امور کا پتہ بھی نہیں چلا اور بھی وہ خفیہ طریق کار تھا جس کی وجہ سے اتحادی پولیس قسطنطنیہ کی ان عورتوں پر دست اندازی نہ کر سکی۔ انھوں نے سینکڑوں مجاہد عورتیں جب تیار کر لیں تو انھیں مشورہ دیا کہ وہ فوراً انگورہ پہنچ کر امکانی خدمات میں احرار کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ انہی عورتوں کی تبلیغ و تحریص کا نتیجہ تھا کہ ڈیڑھ سو زنانہ ڈاکٹر اور دایہ عورتیں ایک ہی وقت میں قسطنطنیہ سے فرار ہو کر انگورہ پہنچ گئیں اور ان ڈیڑھ سو عورتوں کی فراری نے خواتین قسطنطنیہ کے طبقوں میں نہایت گہرا اثر مرتب کیا اور ان کا اس طرح خدماتِ وطن کے لیے فرار ہونا ترکی عورتوں کے واسطے تحریصِ عمل بن گیا۔ اس کے بعد ہی قسطنطنیہ میں ایک ہیجان و ولولہ عمل پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے بیشتر عورتیں انگورہ کے لیے تیار ہو گئیں۔ ان انگورہ جانے والی عورتوں میں تعلیم یافتہ خواتین کا زیادہ حصہ شامل تھا۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح جب خود کو اناطولیہ پہنچا دیا تو احرار انگورہ نے فوراً انھیں ان کی قابلیت کے موافق خدمات سپرد کر دیں۔ ان عورتوں میں زیادہ تر ایسی عورتیں تھیں جنھوں نے

انگورہ پہنچ کر تار گھروں، شفاخانوں وغیرہ میں خدمات انجام دیں۔ دوسرا طبقہ جو قسطنطنیہ اور حصارِ قسطنطنیہ سے فرار ہوا اس نے فوج میں مجروحین کی امداد و خدمت کا اہم اور قابلِ تعریف کام کیا۔ یہ انہی عورتوں کی تدابیر کا نتیجہ تھا کہ قسطنطنیہ کے مدرسہ طیارہ سازی سے سینکڑوں طلبا اور ماہرینِ فن انگورہ فرار ہو گئے۔ ان عورتوں میں سے بعض ایسی عورتیں بھی تھیں جو اناطولیہ میں سامانِ رسد اور بار برداری کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ غرض تھوڑے ہی عرصہ میں خدماتِ جنگ وغیرہ کے لیے عورتوں کی کافی تعداد فراہم ہو گئی۔ اس کے بعد قسطنطنیہ کی عام آبادی سے عموماً اور ترکی خواتین میں خصوصاً ان مبلغ عورتوں نے چندہ کی تحریک کی۔ یہ تحریک بھی دوسری تحریکات کی طرح نہایت خفیہ رکھی گئی لیکن تھوڑے عرصہ میں اظہار کر دیا گیا۔ چندہ کی تحریک میں یہ عورتیں حد سے زیادہ کامیاب ہوئیں۔ یہ خدام عورتیں ''شاہی خاندان'' اور امرائے قسطنطنیہ سے چندہ وصول کرنے میں کامیاب ہوئیں اور انھیں ملک و ملت کے مصائب سے متاثر کر کے ہزاروں روپیہ وصول کیا اور انگورہ پہنچا دیا۔ اس چندہ میں ترکی کی عام خواتین کے مقابل شاہی حرم اور بیگمات کے چندوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان عورتوں نے مجاہدین انگورہ کے لیے کپڑے اور ادویہ وغیرہ ضروریاتِ جنگ بھی فراہم کی تھیں۔ ان عورتوں کا اندازِ بیان اور تقریر اس قدر موثر اور دلدوز ہوا کرتی تھی کہ مخاطب عورتیں اپنے قیمتی زیورات کے دینے میں تامل نہیں کرتی تھیں اور اسی نسبت سے وہ متمول اور غریب عورتیں ستائش کی مستحق ہیں جنھوں نے حبِ وطن کے لیے اپنا سب کچھ خرچ کر ڈالا۔

ان خفیہ خدمات کے ساتھ ہی مظالم سمرنا کے متعلق انھوں نے بالاعلان ایک امدادی انجمن قائم کی جس کے ذریعہ سے انھوں نے احرارِ انگورہ کو بہت کچھ مدد دی۔ اس امدادی جماعت نے جو خدمات انجام دیں وہ حد سے زیادہ حیرت انگیز اور قابلِ تعریف ہیں۔ مثلاً اس جماعت کی ارکان عورتیں سامان جنگ وغیرہ ارسال کرتی تھیں اور طریقہ ترسیل اور بھی حیرت فزا تھا۔ یہ عورتیں چھوٹے چھوٹے طمنچے، ریوالور وغیرہ اپنے برقعوں میں چھپا کر لاتی تھیں اور بندرگاہ سے اناطولیہ جانے والے جہازوں کے روئی کے گٹھوں اور اشیاءِ خوردنی کے صندوقوں میں بکمالِ حفاظت انھیں رکھ دیتی تھیں جس پر کسی نگران کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح بہت سا بھک سے اُڑ جانے والا مادہ بھی انگورہ روانہ کیا گیا مگر کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ ان خطرناک خدمات میں جس

چیز نے ان خادم عورتوں کی کافی مدد کی وہ ان کا اسلامی لباس خصوصاً ''برقعہ'' تھا جب کہ قوانین اسلامی اور ترکی حکومت کے آئین شرعی کے تحت کسی کو حق نہیں تھا کہ وہ برقعہ پوش خواتین کی تلاشی لے سکے، لہٰذا خواتین قسطنطنیہ نے اس برقعہ سے سینکڑوں خطرناک کام لیے یہاں تک کہ اسی برقعہ کی آڑ میں کثیر التعداد مرد ادھر سے اُدھر نکل گئے مگر کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ انگورہ کے مخبر بھی زیادہ تر اسی برقعہ کے اندر سرگرم کار رہتے تھے۔ وہ اس برقعہ کے ذریعہ اتحادیوں کے مواقع اور ان کے پوشیدہ کاموں کو معلوم کر لیتے تھے۔ وہ اس برقعہ میں ان مقامات تک پہنچ جاتے تھے جہاں ذخائر حرب کے انباروں پر اتحادیوں کی نگرانی تھی۔ یہی وہ برقعہ پوش مخبر تھے جنھوں نے احرار انگورہ کو اتحادیوں کے طریقۂ کار اور طرز حفاظت نیز مواقع کی اطلاع بہم پہنچائی۔ یہ برقعہ پوش قسطنطنیہ کے سرکاری ایوانوں اور محلوں، ہوٹلوں، گزرگاہوں، تفریح گاہوں، تھیٹروں اور بازاروں میں بے خوف پہنچ جاتے تھے اور تمام موافق و مخالف حالات کو معلوم کر کے انگورہ اطلاع پہنچا دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ احرار انگورہ کو قسطنطنیہ سے بے شمار امداد حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں وہاں کی تمام تر کارروائیوں کا ہر وقت علم رہتا تھا۔ ان خفیہ مخبروں کے متعلق لندن کے مشہور اخبار ''ٹائمز'' کے نامہ نگاروں نے اسے قسطنطنیہ سے حسب ذیل مراسلہ روانہ کیا تھا:

> ''ایک اجنبی یہاں (قسطنطنیہ میں) آ کر اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب وہ باب عالی کے نہایت محتاط مدبرین سے چند باتیں کر لیتا ہے تو سخت دل برداشتہ ہو جاتا ہے، لیکن اگر یہ اجنبی قسطنطنیہ سے روانگی سے پہلے ایک انگریز پولیس مین سے دریافت کرے جو پہرا دے رہا ہے تو وہ بتا دے گا کہ آج کل قسطنطنیہ شرق کا ڈبلن (آئرلینڈ) بنا ہوا ہے جس کے سن فیز کمالی ترک ہیں۔ قسطنطنیہ کی حقیقت حال کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اس شہر کا باشندہ ہو اور ترکوں کا معتمد علیہ ترکی بازاروں میں جو استنبول کے وسط میں واقع ہیں۔ اب بھی آپ کو وہی مشرقی آبادی نظر آئے گی۔ قدیم دکانوں میں آپ ایک خوجہ کو دیکھیں گے جو بیٹھا ہوا ناریل پی رہا ہے۔ یہ خوجہ انگورہ سے آیا ہے اور بھیس بدلا ہوا فوجی کرنل ہے۔ اس دکان کے اندرون حصہ میں ایک چور دروازہ ہے جو زیر زمین کسی مقام کو جاتا ہے جو قوم پرستوں

کا مرکز ہے۔قوم پرستی کی تحریک کا دماغ تو شاید انگورہ میں ہے لیکن اس کا دل یقیناً قسطنطنیہ ہے۔قسطنطنیہ براہِ راست اتحادیوں کے قبضہ میں ہے، مگر یہیں سے نصف شب گئے جرنل اور فوجی افسر فرار ہوتے ہیں جنھوں نے انگورہ میں ایک بالکل جدید ترکی کی بنیاد رکھی ہے۔ باوجود قابض فوج کی ہوشیاری اور یونانی جنگی جہازوں کی چالاکی کے قسطنطنیہ سے سامانِ جنگ اناطولیہ جارہا ہے اور اس میں کوئی بہت بڑی دقت پیش نہیں آتی۔دولِ یورپ اور اتحادی قابض افواج کے مراکز میں جو کچھ واقع ہوتا ہے اس کی خبر روزانہ انگورہ کو کسی مخفی تار کے ذریعہ سے بھیجی جاتی ہے۔اس قسطنطنیہ سے جو مشرق کی کارواں سرائے ہے مکہ شریف اور عالم اسلام کی طرف سے مظلوم اسلام کی چیخیں جاتی ہیں۔مجاہد محترم غازی مصطفیٰ کمال پاشا کا زبردست ہاتھ یہاں ہر جگہ کام کررہا ہے۔جبری بھرتی کے طریقہ سے لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا جارہا ہے، لیکن اس جبری بھرتی کے آثار ایسے ہی زبردست ہیں جیسا کہ وہ ہاتھ جس نے یہ حکم جاری کیا۔قسطنطنیہ میں ترکی قوم پرست خفیہ طریق سے کاروبار کررہے ہیں۔وہ عظیم الشان ذخائر خرید کر اور ان میں نہایت ہوشیاری سے اسلحہ چھپا کر انگورہ روانہ ہوتے ہیں۔اگر آپ غلہ کے بندر پر جاکر دیکھیں تو وہاں آپ کو روئی کے کثیر التعداد گٹھے نظر آئیں گے جو انگورہ کو بھیجے جارہے ہیں۔یہ یونانی توپوں کے منہ کے سامنے کیا جارہا ہے جو سامانِ جنگ کی حفاظت کے لیے متعین ہے۔کوئی نہیں جانتا کہ اس روئی میں کس قدر زبردست بھک سے اُڑ جانے والے مادے پنہاں ہیں۔اسی طرح قوم پسندوں کو ہر طرح کی جنگی سہولتیں میسر ہیں۔اس سلسلہ میں مظلوم ترکی عورتوں نے برقعہ میں بڑا کام کیا اور اس قومی تحریک پیدا کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔جب انگورہ کو قسطنطنیہ کی حکومت انقلاب پسندوں کا مرکز خیال کرتی تھی اور جب غازی محترم مصطفیٰ کمال پاشا کا اعلانیہ نام لینا بھی حکومت کے خلاف ایک ناقابلِ معافی جرم خیال کیا جاتا تھا تو ان ترکی عورتوں نے خفیہ انجمنوں کے قیام میں بڑی مدد کی جواب بھی موجود ہیں۔ابتدا میں تو یہ عورتیں اپنے برقعہ کی وجہ سے بہت

مفید ثابت ہوئیں۔ کیونکہ انھیں کوئی روک نہیں سکتا اور انہی عورتوں نے ابتدا میں اپنی
عجیب وغریب رسومات کے پردہ میں انگورہ کو دستی بم بھیجے۔
مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کے دوستوں نے جو میگزین برطانیہ کے زیر اہتمام تھا اسے
ایک رات میں خالی کر دیا۔ یہ ایک زیرز میں راستہ کے ذریعہ کیا گیا جو ایک ماہ سے بھی
کم عرصہ میں کھودا گیا تھا۔ یہ کس نے کھودا کون شخص تھا، اس کے افشا کی آج تک کسی
نے جرأت نہیں کی ورنہ اس کی جان خطرہ میں تھی۔ ہر رات ریوالوروں کی آوازیں
اور سیٹیاں باسفورس کی سمت سنی جاتی ہیں۔ اکثر یونانی جہازوں میں جو سقوطری کے
سمندر میں لنگر انداز ہیں۔ افسر اور سپاہی مرے ہوئے پائے گئے ہیں لیکن کوئی نہیں
جانتا کہ کس نے انھیں قتل کیا؟''۔

(لندن ٹائمز، ذریعہ الامان مورخہ 15 مارچ 1922)

مذکورہ خلاصہ سے ترکوں کی خواتین مقیم قسطنطنیہ کے اہم ترین کارناموں کا اندازہ ہو گیا ہو گا یہ خواتین علاوہ ان خفیہ اور حرارت آزما خدمات کے بظاہر جو کام کرتی تھیں ان میں وہ خواتین بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں جو ترکی کے لاوارث اور بھوکے پیاسے بچوں کی حفاظت وخدمت میں مصروف رہتی تھیں۔ 1921 کا ابتدائی زمانہ قسطنطنیہ کی ترکی آبادی کے لیے قیامت سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس وقت اتحادی قبضہ اور جنگ فرنگ کی نا قابل برداشت شکست اور اندرون ترکی لاکھوں غیر اقوام کے مفلوک و فاقہ کش افراد کی کثرت خصوصاً جزل رینگل ڈینکن کی شکست پذیر افواج کے قیام قسطنطنیہ نے گورنمنٹ قسطنطنیہ کی مالی حالت تباہ کر دی تھی۔ قسطنطنیہ سے ایشیائے کوچک کا زرخیز علاقہ تو یونان واحرار کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ قفقاز وارمیدیا بھی ترکانِ احرار کے زیر اثر تھا اس لیے قسطنطنیہ کی گورنمنٹ بہ اعتبار مالی حالت کے اس قابل نہ تھی کہ وہ اپنی لاکھوں کی تعداد والی رعایا کا بندوبست کرتی۔ ملک میں اشیائے خوردنی کا کال تھا۔ بڑے بڑے تاجر سوداگر دیوالیہ ہو چکے تھے۔ عارضی التوائے جنگ یا ترکانِ احرار نے جو حالت پیدا کر دی تھی اس کی وجہ سے تمام ترکی تجارت بند پڑی تھی اور اس تجارت کے بند ہو جانے کے باعث قسطنطنیہ کے بڑے بڑے صاحب جائیداد اور متولین مجبور ہو گئے تھے کہ اپنی جائیدادیں اور مکانات فروخت کر کے اپنے گزارہ کا انتظام کریں۔

بس اسی تہ دست اور ابتر حالت کا یہ لازمہ تھا کہ اندرونِ ملک ڈاکہ زنی اور غارت گری کی وارداتوں میں ناقابلِ بیان اضافہ ہوگیا تھا۔ یونانی و رومن تو سرے سے غارت گری میں مصروف تھے اور ان کے ساتھ بالشویکیوں سے شکست خوردہ جرنل ڈینکن وریخنگل کے لاکھوں سپاہی بھی شریک تھے جو ترکی بازاروں اور محلوں میں دن دہاڑے لوٹ مچاتے رہتے تھے۔ پس ان وجوہ کی بنا پر اس وقت قسطنطنیہ کی آبادی بھوکوں مر رہی تھی اور اس عام تباہی کا سب سے زیادہ اثر ان بے کس ترکی عورتوں اور یتیم بچوں پر پڑ رہا تھا جن کے ورثا میدانِ جنگ میں کام آچکے تھے مگر داخلی حالت کی ابتری کی وجہ سے ابھی گورنمنٹ قسطنطنیہ ان کے گزارہ کا قابلِ اطمینان سرانجام نہیں کرسکتی تھی لہٰذا خیال ہی نہیں بلکہ یقینی طور پر لاکھوں ترکی عورتیں اور یتیم بچے اس وقت بھوک و پیاس کی تکالیف برداشت کر رہے تھے اور قریب تھا کہ وہ اسی حالت میں لقمۂ اجل ہوجاتے۔ قسطنطنیہ کی اس عام فاقہ کش زندگی کے متعلق ایک انگریز سوداگر نے حسبِ ذیل نقشہ کھینچا تھا:

''جب کوئی شخص قسطنطنیہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس شہر کی حالت اور کاروباری حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ٹریم گاڑیاں اور مزدوروں کی جماعتیں اِدھر سے اُدھر جاتی دکھائی دیتی ہیں، ریل گاڑیاں بھی اپنے وقت پر آتی جاتی ہیں لیکن اس شہر میں رہتے ہوئے ابھی عرصہ نہیں گزرا کہ تمام اصلی اور افسوس ناک حالات واضح ہوجاتے ہیں۔ ہزاروں آدمی بے کار بیٹھے ہیں۔ ترک بچے بھوکے پیاسے چیتھڑے لگائے ہوئے کھانے کی تلاش میں بازاروں میں اِدھر اُدھر مارے پھرتے ہیں۔

اس وقت قسطنطنیہ میں کوئی قابلِ ذکر تجارت بھی نہیں ہے اور جن لوگوں نے اپنے کاروبار سے کچھ روپیہ پس انداز کر رکھا ہے۔ وہ اس پر گزر کر رہے ہیں۔ غیر مضافی آبادی بلکہ تمام سرکاری عہدہ داروں کو تین ماہ سے تنخواہ کا ایک حبہ بھی نہیں دیا گیا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سرکاری خزانہ خالی پڑا ہے۔ ترکوں کے قدیم شریف و نجیب خاندان اپنی جائیدادیں چپ چاپ بیچتے چلے جارہے ہیں۔

مزدوروں کی اجرت میں پینتیس فیصدی سے پچاس فیصدی تک تخفیف کردی گئی ہے اور غربا کے طبقوں کو فاقہ کشی کا بھوت خوفزدہ بنا رہا ہے اور عوام کی اخلاقی حالت قطعاً

قعرِ ذلت میں گر چکی ہے کسی کو معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ فساد اور خوں ریزی کا
بازار گرم ہے۔ لوٹ غارت گری ہر طرف پھیل پڑی ہے۔ لاکھوں بچے بھوک اور
پیاس کے لقمہ بن رہے ہیں۔"

(ایوننگ ٹیلی گراف، لندن۔24 فروری1921)

مذکورہ اطلاع کی بنا پر قسطنطنیہ کی داخلی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اصل آبادی کن تباہ کن مصائب میں گھری ہوئی تھی اور ایسی صورت میں یہ امر ناممکن تھا کہ ترکی قوم کے ایسے لاتعداد بچے تباہ نہ ہو جاتے جو کل ترکوں کے ہونہار اور بہادر سردار سپاہی بننے والے تھے لیکن قابلِ صد تحسین وہ ترکی خواتین جنھوں نے قوم کے ان نونہالوں کو موت کے پنجے سے بچا لینے کا ایک ایسے وقت میں تہیہ کیا جب کہ وہ خود چاروں طرف سے مصائب میں گھری ہوئی تھیں اور ان بہادر عورتوں نے چھوٹی چھوٹی جماعتیں انجمن ہلال احمر کے تحت قائم کی تھیں جو ایسے ترکی بچوں اور عورتوں کی کفالت کا سرانجام کرتی تھیں جن کا ذریعہ زندگی بجز قومی مدد کے کچھ نہ تھا۔ یہ مجاہد عورتیں مساجد، مقابر یا سراؤں اور بازاروں کے اُن مقامات میں کپڑا اور روٹی تقسیم کرتی تھیں جہاں یہ مظلوم و بے کس ہستیاں زندگی کے تلخ لمحات گزار رہی تھیں۔ انجمن ہلال احمر کی یہ خدمت گزار بیبیاں اُس سلسلہ جدوجہد سے تعلق رکھتی ہیں جو "حفظ وطن" کے لیے ملک میں طبقۂ نسواں کی طرف سے جاری و ساری تھا، لیکن ان خواتین نے بجائے کسی دوسرے شعبہ میں کام کرنے کے یہ زیادہ پسند کیا کہ وہ ان بے کس بچوں کو موت کے منہ سے بچا لیں جو بشرطِ زندگی آئندہ ملک و قوم کے لیے قابلِ اعتماد طریق پر سرپرست و جاں نثار بننے والے تھے۔ ان خدمت گزار خواتین کی جماعتیں ملک سے جو کچھ چندہ فراہم کرتی تھیں اس کے ذریعہ ان بچوں اور بیکس عورتوں اور بوڑھوں کے اسبابِ زندگی بہم پہنچائے۔ ان خواتین نے نہ صرف اندرونِ ملک ان مظلوم افراد کے لائق تحسین خدمات انجام دیں بلکہ تعلیم یافتہ خواتین ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنے اثر انداز قلم سے ہزار گونہ خدمات انجام دیں۔ انھوں نے ان تباہ شدہ اور فاقہ کش بچوں کی امداد اور استعانت کے لیے دنیائے انسانیت سے عموماً اور عالمِ اسلام سے خصوصاً طویل سے طویل مراسلوں اور اپیلوں کے ذریعہ چندے اور کپڑے طلب کیے۔ مذکورہ گرامی قدر خواتین کو جب

انگلستان میں مسلمانانِ ہند کی کارکن جماعت کا علم ہوا تو انھوں نے مشہور خادم خلافت حضرت مشیر حسین صاحب قدوائی بی۔اے کو ایک طویل مراسلہ لکھا تھا جس کا مضمون یہ ہے:

''جناب شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی، جنرل سکریٹری مرکزی اسلامی سوسائٹی۔

از مقام قسطنطنیہ 4 فروری 1921

جناب من! 29 جنوری 1921 کو انجمن ہلال احمر کی خواتین کے صدر مقام میں قسطنطنیہ کی تمام نسوانی انجمنوں کا متفقہ جلسہ منعقد ہوا جس میں اتفاق رائے سے یہ تجویز منظور کی گئی کہ جناب کی وساطت سے مندرجہ ذیل واقعات تمام اہل عالم کے روبرو پیش کیے جائیں:

ہمارے مشہور اور نامور ماہرین کی تحقیقات سے یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا ہے کہ اس وقت صرف قسطنطنیہ میں بیرونی صوبوں کے علاوہ پانچ لاکھ عورتیں اور بچے ایسے موجود ہیں جن کو اگر بروقت مدد نہ پہنچی تو بھوک کے مارے وہ موت کا شکار ہو جائیں گے۔ ہزار ہا روسی پناہ گزیں اس وقت قسطنطنیہ میں آچکے ہیں جن علاقوں پر یونانیوں کا قبضہ ہے وہاں سے اجناسِ خوردنی کا قسطنطنیہ میں لانا قطعاً ممنوع ہے، مسلسل آتش زدگی سے شہر میں مکانوں کی سخت قلت ہے۔ ان تمام تکلیفوں نے مل ملا کر زندگی اجیرن کر رکھی ہے اور ترکی آبادی سخت مصیبت میں ہے۔ اتنے ترک جنگ کے دوران نہیں مرے جتنے آج کل بھوک و پیاس کی تکلیف سے مر رہے ہیں اور ان مصیبتوں کا اثر صرف غریبوں ہی پر نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے خوشحال اور معزز و متمول خاندان کے خاندان بھی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو گئے ہیں اور آخری صورت میں وہ اپنے باپ داداؤں کی جائیدادیں بیچ رہے ہیں اور روز بروز ان کی حالت اس قدر خراب ہوتی جاتی ہے کہ نہ رہنے کے لیے مکان ہیں نہ کھانے کے لیے ٹکڑا ہے اور یہ لوگ نہایت دردناک حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مردوں کو روٹی کھانے کے لیے کام نہیں ملتا ہے بھوکی پیاسی ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ نہیں رہا کہ اپنے چاند سے بچوں کو پلائیں اور ان کو موت سے بچالیں۔ بیماروں کی دیکھ بھال بھی اچھی

طرح نہیں ہوتی کیونکہ شفا خانوں میں ہر ضروری چیز کی کمی ہے۔ باہر کے پناہ گزیں
مسلمان جب تک اپنے گھروں میں تھے عیش و آرام سے بسر کرتے تھے لیکن اپنی
جانیں بچانے کے لیے سب کچھ وہیں چھوڑ کر بھاگ آئے اور آج وہ ناز و نعمت کے
پلے ہوئے بازاروں میں نیم برہنہ پھر رہے ہیں اور برف و بارش میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر
سکڑے جاتے ہیں۔ مسجدوں اور دوسری عمارتوں میں تازہ اور مصیبت زدہ بھرے
پڑے ہیں۔ اموات کی تعداد روز بروز خوفناک طور پر بڑھ رہی ہے۔ مقامی مسلمان
اور رفاہ عام کی انجمنیں سرتوڑ کوشش اور محنت سے ان مظلوموں کو مدد پہنچا رہے ہیں
لیکن جہاں لاکھوں مدد کے محتاج ہوں وہاں چند ہزار مسلمان اور چند انجمن کیا حیثیت
رکھتی ہیں؟ ان تمام حالات کو پیش کر کے ہم قسطنطنیہ کی خواتین کی طرف سے تمام
مہذب دنیا کے باشندوں سے اپیل کرتے ہیں کہ آج دار الخلافت اسلامیہ میں ان
آفات کا نزول جاری ہے اور اگر ان مصیبتوں کے اسباب دور کر دیے جائیں تو آج
ہی یہ تمام مظلوم خوشحال ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم شجاع و نجیب انسانوں کی خدمت میں
عرض کرتے ہیں کہ وہ بلا امتیاز مذہب و ملت اٹھ کھڑے ہوں اور ان لاکھوں
انسانوں کو تباہی اور موت کے پنجہ سے بچالیں۔"

("ہم ہیں آپ کی اسلامی بہنیں ارکان انجمن، ہلال احمر قسطنطنیہ")

اس مراسلہ سے ان خواتین کے جذبۂ حب وطن، ایثار و فدویت اور خلوص و خدمت کے
جن گراں پایہ جذبہ و خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ کسی مزید شرح کا محتاج نہیں اور یہی وہ مراسلہ ہے
جس کے الفاظ سے میرے اس قول کی کافی تصدیق ہوتی ہے جس میں میں نے کہا تھا کہ قسطنطنیہ
میں حفظِ وطن کے لیے خواتین متحد انجمنیں قائم کی گئی تھیں۔ غرض اس قدر حالات کے بعد خواتین
قسطنطنیہ کے کارناموں کو اس لیے ختم کرتا ہوں کہ مجھے ان مجاہد عورتوں کے متعلق اس سے زیادہ ذخیرہ
اور معلومات حاصل نہیں ہوئیں لہٰذا بر بنائے حالات کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ترکی قوم نے جنگ
فرنگ کی ذلت اندوز شکست کے بعد بے نظیر شجاعت و کمال مردانگی سے عدیم المثال فتح حاصل
کر کے یورپ میں دوبارہ اسلامی پرچم اُڑایا اسی طرح اس جدید ترکی تعمیر و تنظیم اور حصول آزادی میں

خواتینِ ترکی بالخصوص قسطنطنیہ کی عورتوں نے اپنے تمام عملی قوا کو صرف جدوجہد کر کے نہ فقط ترکی شہنشاہی اقتدال کو زوال و برہمی سے بچالیا بلکہ انھوں نے اسلام و اسلامیت کو دوبارہ زندہ کرنے میں جو قربانیاں کیں وہ الفاظ اور تاریخی صفحات کی تنگ دامانی میں بیان نہیں کی جاسکتیں اور یہی وہ قربانیاں ہیں جن کی بنا پر دین و دنیا کی تمام عظمتیں ان مجاہد اسلام خواتین کے لیے وقف ہیں۔

مقالہ زیر بحث ختم کردینے کے بعد اب میں بعض ان خواتین کے نام پیش کرتا ہوں جنھوں نے قسطنطنیہ میں مذکورہ قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ان ناموں سے ان عورتوں کی بلند مرتبہ پوزیشن اور عملی حالت کا اندازہ ہوگا اور یہ سمجھا جاسکے گا کہ اس وقت جب کہ قسطنطنیہ پر مصائب کے بادل امنڈ رہے تھے ترکی خواتین نے جو خدماتِ عامہ انجام دیں ان میں ترکی کے معمولی یا ادنیٰ درجہ کی عورتیں شریک نہ تھیں بلکہ اس قومی مصیبت میں جن عورتوں نے ان تھک خدمات انجام دیں وہ اصل میں ترکی قوم کے طبقۂ اعلیٰ سے تعلق رکھنے والی عورتیں تھیں اور اسی سے ترکی کے طبقہ اعلیٰ کا یہ بھی اندازہ ہوگا کہ اس نے اپنی عورتوں کو علم و خدمت کے لیے کس قدر تیار و مستعد کیا۔ ان محترم خواتین میں ذیل کی عورتیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

جنابہ سلمہ خانم رضا:

آپ ایک بلند مرتبہ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ آپ کے والد کا نام نامی علی رضا پاشا ہے جو حکومتِ قسطنطنیہ کے سفیر رہ چکے ہیں۔ آپ قسطنطنیہ کے محلّہ غورتیمی میں رہتی تھیں اور آپ نے انجمن تحفظ بیوگان میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

جنابہ عزیزہ فروح خانم:

آپ بھی ایک روشن خیال تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ آپ جناب نورالدین فروح بے کی اہلیہ ہیں جو سابق صدر اعظم محمد پاشا کے زمانہ وزارت میں مدارالمہام کے جلیل القدر عہدہ پر مامور رہ چکے ہیں۔ آپ قسطنطنیہ کے محلّہ ندیلی واقع باسفورس میں رہتی تھیں اور انجمن نسواں کی نائب صدر تھیں۔

جنابہ رفیقہ ادہم خانم:

آپ مشہور ترکی قائد ہز ایکسلینسی ادہم پاشا کی بیوی ہیں جو محمد پاشا کے زمانہ میں وزیر

جنگ وغیرہ رہ چکے ہیں۔ آپ بھی کندیلی باسفورس میں رہتی تھیں اور مجلس خواتین قسطنطنیہ کی رکن تھیں۔

جنابہ فیضی روم بے اوغلو مہر الدین:

آپ ایک ممتاز ارمن ترکی ہیں۔ آپ کے شوہر کا نام ہزایکسلینسی روم بے اوغلو مہر الدین ہے جو سابق مین وزیر ڈاکخانہ تھے۔ یہ جوشیلی خاتون قسطنطنیہ کے محلہ اشیشلی واقع قسطنطنیہ میں رہتی تھیں اور انجمن یتامیٰ کی صدر تھیں۔

جنابہ سعدی خلیل:

یہ فاضل خاتون قسطنطنیہ میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ آپ کے شوہر کا نام ہزایکسلینسی خلیل ادہم بے ہے جو قسطنطنیہ کے شاہی عجائب خانہ کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ موصوفہ خاتون سعدی کا ترکی خواتین میں خاصا اثر ہے اور آپ کے ذمہ امراء و بیگمات سے چندہ وصول کرنا تھا۔

جنابہ صفیہ حسین:

خاتون محترم کیپٹن حسین بے کی اہلیہ ہیں جو قسطنطنیہ کے جنگی بیڑہ میں کپتان کے عہدہ پر ممتاز و مامور تھے۔ آپ عورتوں کے لیے کپڑوں اور غذا کا اہتمام کرتی تھیں اور اپنی خدمات کے لیے ہر وقت وقف تھیں۔

جنابہ نارولی خانم:

آپ کی فضیلت اور علم دوستی قسطنطنیہ میں مشہور ہے۔ آپ فرنچ زبان میں کامل مہارت رکھتی ہیں۔ آپ جناب ولی شمسی بے کی اہلیہ ہیں جو پہلے پیرس میں ترکی حکومت کے قونصل جنرل کے ممتاز عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ آپ قسطنطنیہ کے محلہ محمودی جدی میں رہتی ہیں اور نہایت سرگرم خاتون ہیں۔

قسطنطنیہ کی وہ عالی خاندان اور تعلیم یافتہ خواتین ہیں جنھوں نے ملک وملت کے لیے اپنے عیش وآرام کو ترک کر کے اپنی تمام قوتوں سے قوم کی خدمت انجام دی اور یہی وہ خدمت ہے جس کی بنا پر ان محترم خواتین کے نام تاریخ کے روشن ترین صفحات میں ہمیشہ جلوہ گر رہیں گے۔

◆◆◆

چشم دید حالات

مجھے مسرت ہے کہ میں اپنی کتاب میں جہاں صحیح حالات فراہم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں وہاں میری تحقیق میں ایک قابلِ اطمینان حصہ ایسا ہے جس میں ترکی خواتین کے چشم دید حالات میں نے حاصل کیے ہیں۔

ان چشم دید حالات کے لیے میں ایک ترک مخلص کا ممنون کرم ہوں جنھوں نے مجھے یہ حالات بتائے ہیں۔ اس مخلص ترک کا نام عارف محمد طاہر آفندی ہے۔ موصوف کا وطن آرمینیا ہے۔آپ کی عمر 32 سال ہے اور آپ قط العمارہ کی مشہور مہم میں زیر کمان فیلڈ مارشل ہز ایکسلینسی خلیل پاشا کے شریک رہے ہیں۔آپ 1916 میں گرفتار ہوئے تھے اور 1921 میں سابرمتی جیل سے رہا ہوئے۔ مجھ سے اور موصوف سے برہان پور اسٹیشن پر ملاقات ہوئی جس کا سلسلہ کامل دو گھنٹہ رہا۔آپ عربی نہایت شستہ اور رواں بولتے تھے۔ میں نے اس ملاقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ممدوح سے ترکی خواتین کے حالات دریافت کیے اور آپ نے بڑی مسرت سے مجھے عراقی مہم کی بعض ان خواتین کے حالات بتائے جو عراقی محاذ پر ممتاز خدمات انجام دے چکی تھیں۔ان مجاہد خواتین کی تعداد جو قابض ترکی النسل تھیں ڈیڑھ سو تھی اور یہ سب کی سب میدانِ جنگ یا محاذِ جنگ پر نہایت قیمتی خدمات انجام دیتی تھیں۔ان میں سے بعض خواتین یہ ہیں:

زینب خانم:

وطن داغستان، عمر 17 سال، نا کتخدا۔ عارف محمد طاہر فرماتے تھے کہ یہ وہ ترکی مجاہدہ تھی جس کی حیرت فزا خدمات نے لشکر کو مبہوت بنا رکھا تھا۔ موصوفہ کے باپ ترکی رسالہ کے افسر اعلیٰ تھے اور یہ وہ رسالہ تھا جسے ترکی زبان میں "کولا غاسی فدا طاپور عثمانیہ" کہتے ہیں۔ اس رسالہ کا یہ فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے غنیم کے توپ خانہ پر گولہ باری کی حالت میں حملہ آور ہوتا ہے۔ زینب خانم اپنے باپ کے ساتھ جہاد کے شوق میں وطن سے ساتھ ہو گئی تھیں مگر نا کتخدا ہونے کے باعث آپ کو میدانِ جنگ میں خدمات انجام دینے کا موقع نہیں ملتا تھا، لیکن شوقِ فدویت اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ آپ ترکی مجروحین کی خدمت کے لیے جنگی شفا خانہ میں کام کرتی تھیں اور کسی وقت آرام سے نہیں گزارتی تھیں۔ غازی محترم فیلڈ مارشل ہز ایکسلینسی خلیل پاشا نے آپ کے شوقِ جہاد کو دیکھتے ہوئے آپ کو ابتداً جنگی شفاخانہ میں نگراں افسر کے عہدہ پر ممتاز فرمایا۔

حملہ موصل میں آپ کے والد بزرگوار شہید ہو گئے۔ جس وقت زینب خانم نے اپنے باپ کی شہادت کی خبر سنی تو بجائے کسی رنج والم کے آپ کے اندر جہاد و انتقام کے جذبات اور بھی مشتعل ہو گئے اور آپ نے فوراً اپنے باپ کی کمانڈ لینے کے لیے درخواست کی جسے ترکی کمانڈ افسر نے زینب خانم کی مستعدی اور قابلیت دیکھتے ہوئے منظور کر لیا۔

عالی جناب عارف طاہر بے فرماتے تھے کہ جس وقت زینب خانم کو رسالہ کی کمانڈ سپرد کی گئی اس وقت یہ جوان عمر دجواں ہمت عورت مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتی تھی اور اس کی زبان سے یہ الفاظ ہر وقت سنے جاتے تھے کہ:

> "اب راحت و آرام کی جگہ تلوار و خون سے پیہم مقابلہ رہے گا۔ مجھے آرام کے لیے کوئی گھڑی مرغوب نہیں۔ میں نے اپنے پدر بزرگوار کی نعش اپنی آنکھوں سے خون آلود دیکھی ہے لہٰذا میں ہر وقت غنیم کی نعشوں سے کھیلنا چاہتی ہوں تا کہ حق پدری اور فرضِ جہاد ادا ہو"۔

اس کے بعد یہ بہادر خاتون عراق و قط العمارہ میں گیارہ مہینے کامل و مسلسل جنگ آزما رہی اور اس کی حملہ آوری اس جانبازانہ انداز میں ہوتی تھی کہ خود ممدوحہ کے ماتحت لشکری آپ کی

شجاعت وشہامت پر حیران وششدر تھے۔ خاتون محترمہ اپنی ڈیوٹی کے موافق ہمیشہ رسالہ کے آگے رہا کرتی تھیں لیکن تعجب یہ ہے کہ وہ کبھی زخمی بھی نہ ہونے پائیں اور بکمال قابلیت خود کو محفوظ رکھتی تھیں۔ راونڈز سے قریب ایک میدان میں یہ شجیعہ دن بھر اپنے رسالہ کو غنیم سے اس قابلیت سے لڑاتی رہی گویا ایک نہایت ہی پختہ کار جنرل اپنی فوج کو لڑا رہا ہے۔ اس مجاہد خاتون میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف یہ بات تھی کہ وہ دن بھر میدانِ قتل وقتال کی خونبار وخوں ریز جدوجہد کے بعد رات کی بھیانک تاریکیوں میں خدائے جلیل وجمیل کی یاد میں بہ ہزاراں عجز وانکسار محو ومصروف ہو جاتی تھی جس سے اسلام کے عہدِ اولین کی ان تقدس پناہ مجاہد خواتین کی یاد تازہ ہوتی ہے جن کی خدا پرستانہ خدمات ومشاغل سے تاریخ اسلام کے پُرعظمت صفحات جگمگا رہے ہیں۔

غرض کامل گیارہ ماہ بعد خاتون ممدوحہ انتظاماً اناطولیہ بھیج دی گئیں۔

عائشہ بنت نامق آغا:

وطن کردستان، عمر 25 سال طاہر بے اس جلیل القدر خاتون کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور فرماتے تھے کہ میں اس مجاہد خاتون سے بہت زیادہ واقف ہوں کیونکہ ممدوحہ میرے وطن آرمینیا ہی سے میرے لشکر کے ساتھ تھیں اور جب مشہور وممتاز ترکی کمانڈر فیلڈ مارشل کاظم قرہ بکر پاشا آرمینیا پر یلغار کر رہے تھے یہ جواں ہمت خاتون محکمہ جنگ میں داخل ہو چکی تھی اور میدانِ آرمینیا ہی سے ان کی جنگی خدمات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ آرمینیا کی مہم میں آپ کے شوہر حامد جلال بے ایک ترکی دستہ کے کمانڈر افسر تھے اور ان کے باپ نامق آغا بھی فوجی افسر تھے۔ جب تک خاوند خدماتِ جنگ انجام دیتے رہے اس وقت تک خاتون موصوفہ گھر سے باہر نہیں نکلیں۔ آپ کی تین صاحبزادیاں بھی تھیں جن کی عمر بالترتیب چار، چھ اور دس برس کی تھی آرمینیا کے ایک موضع ''اہالی'' میں آپ کے شوہر شہید ہو گئے تو آپ نے باپ کی اجازت سے فوراً اپنا نام فوج میں لکھا دیا اور ترکی رنگروٹوں میں فنونِ جنگ سے واقفیت حاصل کرتی رہیں۔ پھر آپ نے درخواست کی کہ انھیں میدانِ جنگ پر بھیج دیا جائے۔ درخواست منظور ہو گئی اور آپ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میدانِ جنگ میں عینی مشاہدات نے آپ کے شوقِ جہاد کو اور بھی بھڑکا دیا۔ کوئی پونے تین ماہ بعد ترکی فوج کا وہ حصہ جس میں موصوفہ کے والد تھے جب اناطولیہ جانے لگا تو آپ

مع صاحبزادیوں کے اس لشکر کے ساتھ بحیثیت ایک فوجی سپاہی کے روانہ ہوگئیں۔ یہ دستۂ فوج کچھ دن بعد اناطولیہ سے محاذ موصل کی طرف بھیج دیا گیا جس میں آپ بھی اپنے والد کے ہمراہ محاذ موصل پر آ گئیں۔ اس وقت موصل پر ترکی فوجوں کے ساتھ عراقی سرحد اور کردستان کے بدو مجاہد بھی شریک تھے چونکہ موصوفہ کی جنگی قابلیت اور شعور سے ترکی افسر کما حقہ واقف تھے اس لیے ایک موقع پر آپ کو بدو مجاہدین کا کمانڈ افسر کر دیا گیا۔ طاہر بے فرماتے تھے کہ میں نے عائشہ خانم کو دوسری مرتبہ راونڈز میں بدوؤں کا کمانڈ افسر دیکھا۔ گویا اب وہ ایک ذمہ دار فوجی افسر تھیں۔ ابھی آپ کو اس عہدہ پر مامور ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ میدانِ موصل میں آپ کے پدر بزرگوار شہید ہو گئے۔ جب ناصق آغا شہید ہو گئے تو ترکی قوم کی عدیم النظیر استقامت و شجاعت کے موافق اس خاتون کے جذبات اور شعور و انتقام اور بھی بھڑک اٹھے اور اب بڑی تندہی سے میدانِ جنگ میں بدو مجاہدین کو لڑاتی رہیں۔ جب آپ حملہ یا میدانِ جنگ سے فارغ ہوتی تھیں تو اپنے ماتحت دستہ کو قواعد جنگ سکھانے میں مصروف رہتی تھیں اور اسی طرح آپ مجاہدین میں ولولۂ جہاد قائم رکھنے کے لیے تقریریں بھی کرتی تھیں۔ حملہ اور میدانِ جنگ سے واپسی کے وقت تکبیریں کہنا آپ کا شعار تھا۔

اس نوجوان ہمت خاتون کا سب سے نمایاں وصف یہ تھا کہ باوجودیکہ آرمینیا میں شوہر اور موصل میں باپ کو شہید ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن کبھی ان سرپرستوں کا تذکرہ اس صابر اور مستقل مزاج عورت کی زبان سے نہیں سنا گیا۔ میدانِ جنگ کے سوا یہ مجاہد خاتون اپنے مستقر پر بھی ایک ہی وقت کھانا کھاتی تھیں۔ نماز کے بعد وظیفہ پڑھنے کی بڑی پابند تھیں۔

آرگو یہ بنت حاج مُلا سلیمان گرجی قوقازی:

وطن باطوم، عمر 35 سال۔ ترکی مجاہد عورتوں میں یہ خاتون سب سے زیادہ قابلِ احترام ہیں۔ آپ باطوم کے ایک نہایت متمول خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ عراق کی ترکی آبادی اور مجاہد عورتوں میں آپ کا تمول مشہور تھا اور یہ تمول اس لیے اور بھی شہرت پذیر ہوا کہ تمام مصارف خود ہی برداشت کرتی تھیں اور باوجود ترکی فوج میں قابلِ قدر خدمات انجام دینے کے کبھی ایک پیسہ کی روادار نہ ہوئیں۔ جب باطوم سے ترکی مجاہدین کے لشکر اناطولیہ میں جنگ آزمائی کے لیے روانہ

ہوئے تو آپ نے محض شوقِ شہادت کی بنا پر اپنا نام بھی ترکی والنٹیرس میں لکھادیا اور اناطولیہ روانہ ہوگئیں، جہاں آپ کو با قاعدہ اصولِ جنگ سے واقفیت حاصل کرائی گئی اور بعض طلایہ دستوں میں آپ کی درخواست کے موافق غنیم کی سراغ رسانی کا کام آپ کے سپرد کیا گیا۔ خداداد ذہن اور قوتِ برداشت کی وجہ سے آپ نے طلایہ گردستوں میں اس خوش اسلوبی سے خدمات انجام دیں کہ ترکی محکمۂ جنگ کو آپ کے ولولہ عمل اور ترقی پذیر جذبہ کا کافی اندازہ ہوگیا تو ترکی محکمۂ جنگ نے سرحدی طلایہ گر جماعت کا افسر دوم مقرر کردیا۔ جب آپ کو یہ خدمت سپرد کی گئی تو آپ کی چستی اور تندہی میں تحیر خیز اضافہ ہوگیا اور آپ دشمن کی تلاش اور اس کی جستجو میں اس قدر سرگرم رہنے لگیں کہ بعض اوقات ان کے ہمراہی بھی ان کی پیہم جستجو اور میلوں دور سفر سے تنگ آجاتے تھے، مگر خاتون محترمہ جب تک دشمن کا پتہ نہ لگالیتی یا کافی مسافت تک آپ کو اطمینان نہ ہوجاتا آپ کو چین نہ آتا تھا خصوصاً شب کے وقت آپ بہت زیادہ سرگرم کار رہتی تھیں۔ آپ ایک وقت بخار میں مبتلا ہوگئیں اور بخار بھی اس قدر شدت کا تھا کہ آپ کو کبھی کبھی غفلت طاری ہوجاتی تھی لیکن اس شجیعہ خاتون نے اس حالت میں بھی اپنی ڈیوٹی سے رخصت لے کر علاحدہ ہونا پسند نہ کیا۔ طاہر بے کہتے تھے کہ ممدوحہ کی اس حالت کی اطلاع جب نجیب بے طلایہ کمانڈ افسر کو ہوئی تو انھوں نے موصوفہ کو آرام اور علاج کے لیے کہا۔ اس کے جواب میں ممدوحہ نے کہلا بھیجا کہ:

''میں ترکی سپاہی نہیں ہوں بلکہ اسلامی مجاہدہ ہوں جسے آرام سے کوئی سروکار نہیں''۔

موصوفہ کے بخار کی شدت بڑھتی گئی یہاں تک کہ آپ غافل ہوگئیں۔ اس غفلت کی حالت میں کمانڈ افسر نے آپ کو جنگی ہیڈ کوارٹر پر پہنچادیا۔ جب جنگی ہیڈ کوارٹر پہنچ کر آپ کو قدرے افاقہ ہوا تو آپ نے فوراً اپنی خدمت پر بھیج دینے کی درخواست کی لیکن چونکہ ابھی آپ کی صحت خدماتِ جنگ کے قابل نہ تھی اس لیے آپ کو اجازت نہ دی گئی۔ جب موصوفہ کو اجازت نہ ملی تو آپ نے روزے رکھنا شروع کردیے اور کامل ایک ماہ تک روزہ و نماز میں مصروف رہیں۔ جب صحت قابلِ اطمینان ہوگئی تو آپ نے پھر خدمت کے لیے درخواست پیش کی اور اپنی جگہ پر چلی گئیں۔ اب ممدوحہ کی خدمات اور قابلیت سے تمام جنگی اسٹاف واقف ہوچکا تھا اس لیے کچھ دن بعد جب عراقی محاذ پر ترکی کمک روانہ کی گئی تو اس میں ممدوحہ بھی شریک ہوئیں اور اب عراق میں آکر آپ توپ

خانہ میں لے لی گئیں۔ آپ نے بڑی سرگرمی سے توپ خانہ کے کام کو سیکھ لیا۔ چنانچہ جس وقت مقام کرکوک میں اتحادی فوجوں سے مقابلہ ہوا تو اس وقت موصوفہ ترکی توپ خانہ میں کام کرتی تھیں۔ توپ خانہ کے کام سے واقفیت حاصل کر کے آپ نے ہوائی جہاز گرانے والی مشین گن کا کام شروع کیا اور یہ کام بھی تھوڑے ہی وقفہ میں سیکھ لیا۔ ممدوحہ کی تمام تر جدو جہد میں یہی امر قابلِ حیرت و استعجاب ہے کہ آپ نے علاوہ جنگی خدمات کے تمام تر فنونِ جنگ، راستہ اور سفر ہی میں حاصل کیے اور اپنی شبانہ روز سرگرم جدو جہد کے باعث آپ ترکی فوج میں ایک ذی عزت اور فنونِ جنگ سے ماہر عورت تھیں۔ مذکورہ خدمات و حالات کے بعد خاتون موصوفہ اناطولیہ واپس بھیج دی گئیں جہاں انھوں نے کردخواتین کو فنونِ جنگ اور قواعد سکھانے کا ارادہ کیا تھا اور اناطولیہ پہنچ کر وہ اس خدمت پر مامور کردی گئیں۔

عراقی محاذ پر ترکی خواتین میں سے مذکورہ خواتین کے متعلق عارف طاہر بے کو چونکہ اس قدر تفصیل کے ساتھ حالات معلوم تھے اس وجہ سے میں نے انھیں لکھ لیا تھا، لیکن ان کے سوا موصوف فرماتے تھے کہ عراق میں خالص ترکی النسل خواتین کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار تھی اور یہ سب کی سب محاذ جنگ یا محکمہ جنگ سے متعلق خدمات میں مصروف رہتی تھیں۔ میں نے ممدوح سے جب عربی خواتین کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس موقع پر عربی و بدوی خواتین کی خدمات جنگ سے انکار کرنا بھی ایک اخلاقی خطا ہے جب کہ میدان عراق و فلسطین میں کوئی اٹھارہ ہزار بدوی و عربی خواتین برابر مصروف خدمات رہی ہیں اور انھوں نے اسلامی لشکروں کے ساتھ ہر طرح کی خدمت انجام دی ہے۔ ایک کردی خاتون مسمّٰی کلثوم خانم کے متعلق طاہر بے فرماتے تھے کہ موصوفہ میدانِ جنگ میں مجروحین کو پانی پلانے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔ یہ نہایت ضعیف العمر کردی خاتون تھیں۔ انھوں نے تین حج بھی کیے تھے لیکن اس ضعیف اور کبرسنی کے عالم میں بھی وہ میدانِ جنگ میں نہایت چست و مستعد خاتون تھیں۔ یہ راتوں کو میدانِ جنگ اور خندقوں میں سپاہیوں کے لیے پانی لے کر پہنچ جاتی تھیں۔ وہ دشمن کے حملہ یا اس کی فوجوں کو کبھی خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ انھیں سپاہی ''جن'' کہتے تھے۔ یہ اکثر مجروحین کو کرب و تکلیف میں دیکھ کر انھیں شوقِ جہاد اور جنت الفردوس کی ابدی نعمتوں کی طرف تحریص دلاتی تھیں اور کہتی تھیں کہ تم

نوجوان ہو، اسلام کے لاڈلے بچے ہو، دیکھو اگر آج میرے قویٰ اس قابل ہوتے کہ میں صفوف جنگ میں اعدا سے مقابلہ کرسکتی تو تم سے ہمیشہ آگے رہتی۔ غرض موصوف ایک نہایت جواں ہمت اور سچی فدائے اسلام خاتون تھیں۔ آپ کی یہی وہ خدمات تھیں جنھیں خدائے رحمان ورحیم نے قبول فرمالیا اور مقام کرکوک میں دشمن کے ہوائی جہاز کی گولہ باری سے شہید ہوگئیں۔

عارف طاہر بے فرماتے تھے کہ اس بڑھیا کا جنازہ اس قدر احتشام کے ساتھ اٹھایا گیا تھا کہ میں نے کسی دوسرے شہید کا جنازہ اس طرح اٹھتے نہیں دیکھا۔ تمام ترکی سپاہی اپنی اپنی خندقوں سے اس جنازے کی شرکت کے لیے نکل آئے تھے اور ہر سپاہی محبت کے آنسو بہاتا ہوا کہتا کہ:

> ''محترمہ ''نجمی'' تمھارے خون کا بدلہ پوری ترکی قوم لے گی کیونکہ تو تو ہماری شفیق ماں تھی''۔

◆◆◆

لطیفہ کمال خانم

محترمہ خالدہ خانم کے بعد ترکی سیاسی جدوجہد میں لطیفہ کمال خانم زوجہ غازی اعظم مصطفیٰ کمال پاشا کے وجود سے جو اہم انقلاب پیدا ہوا ہے اس کے زریں فوائد ترکی کے تابناک مستقبل کا پتہ دیتے ہیں۔

ممدوحہ محترمہ کا وطن شہر سمرنا، عمر 19 سال آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی محترم اُوشا کی بے ہے، جو سمرنا کے ایک کروڑ پتی تاجر اور نہایت بلند مرتبہ اور روشن خیال آدمی ہیں۔ محترم اوشا کی ممدوح گو خود ایک نہایت ممتاز تجارت پیشہ آدمی ہیں مگر انھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت میں کمالِ دانشمندی سے کام لے کر ممدوحہ لطیفہ خانم کو پوری تعلیم کے لیے تیار کیا۔ لطیفہ خانم کی ابتدائی تعلیم مکان پر ہوئی لیکن دو برس بعد آپ کو انگلستان بھیج دیا گیا۔ انگلستان میں آپ ''ٹیورڈ ہائی اسکول چنز یبرسٹ'' میں ایک سال تک تعلیم پاتی رہیں جہاں آپ کی تعلیم و تربیت پر بہت روپیہ خرچ ہوا۔ آپ کی نگرانی کے لیے دو قابل انگریز لیڈیاں ہیں جو تربیت کی خدمت انجام دیتی تھیں۔ ممدوحہ لطیفہ خان نے ان انگریز لیڈیوں کی تربیت میں رہ کر جو ترقی کی وہ نہایت اطمینان بخش تھی۔ جب آپ یہاں سے فارغ ہوئیں تو روشن خیال باپ نے آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس بھیج دیا۔ کچھ عرصے تک آپ ''بورڈو'' میں رہیں جہاں علاوہ فرانسیسی زبان کے علم ہیئت،

فلسفہ اور جغرافیہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد آپ نے ادب و تاریخ میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ دورانِ تعلیم میں ترکی معاملات کے لیے آپ کو فرانسیسی سوسائٹی سے قیمتی معلومات بہم پہنچیں کیونکہ اس وقت فرانسیسی ترکوں کو قدر و محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لطیفہ خانم کی تعلیم و تربیت کا یہ زمانہ نہایت بیدار کن تھا جب کہ اکثر مواقع پر آپ کو فرانسیسی خواتین کی مجالس اور بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا کرتا تھا۔ انھیں طبعی طور پر ایسے علمی جلسوں اور مذاکروں میں شرکت کا بہت شوق تھا اور یہ اسی قیمتی صحبت کا نتیجہ ہے کہ لطیفہ خانم میں بیداری اور بلند حوصلگی اور روشن خیالی کے گراں پایہ خدمات وخیالات پیدا ہوئے۔ آپ فرانسیسی خواتین کے قومی جذبات اور حب وطن اوران کی علمی وسیاسی سرگرمیوں سے بہت متاثر ہوئیں اور آخر کار:

''جمالِ ہم نشیں در وے اثر کرد''

کے مصداق وہ ایک پاکیزہ اخلاق اور تعلیم یافتہ خاتون کی حیثیت سے ترکی قومیات میں دلچسپی لینے لگیں۔ فرانسیسی خواتین کی طرح وہ بھی اپنے ملک و مذہب اور قوم کی صلاح وفلاح کے ذرائع سوچتی تھیں لیکن ابھی وہ اس قابل نہ تھیں کہ ملکی وقومی معاملات میں حصہ لیتیں کیونکہ ابھی ان کا دورِ تعلیم ختم ہوا تھا اور وہ رات دن علمی کتب کے مطالعہ میں مصروف رہتی تھیں اور اس تمام سیاست میں انھیں کسی قومی وملکی تحریک سے کوئی علاقہ نہ تھا بلکہ محض ایک تعلیم یافتہ سیاح کی طرح وہ اکثر ممالک کا دورہ کرتی رہتی تھیں۔ آغاز جنگ فرنگ یعنی 1914 میں وہ پیرس ہی میں تھیں۔ التوائے جنگ 1918 میں وہ ایک ماہ تک جرمنی میں رہیں اور دورانِ سیاحت انھیں نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں کی صحبت میسر آئی جس نے لطیفہ خانم ایسی فاضل خاتون پر سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

جب 5 مئی 1919 کو یونانی فوجوں نے آپ کے وطن عزیز سمرنا پر قبضہ کرلیا اور آپ کے والد قبلہ کو نظر بند کردیا گیا تو آپ اس حالت سے بہت زیادہ متاثر ہوئیں۔ اس وقت بھی آپ یورپ ہی میں مقیم تھیں۔ بقول امریکن پریس نمائندہ مسٹر وارڈ پرائس ابھی آپ کا ارادہ تھا کہ یورپی سیاحت سے فارغ ہوکر ترکی زبان میں بعض فراہم کردہ قیمتی کتب کا ترجمہ شروع کریں کہ آپ کے گھر پر ظالم یونانی فوجیں چڑھ دوڑیں۔ آخر کار مجبور ہوکر آپ 1921 میں سمرنا واپس آگئیں اور والد بزرگوار کی خدمت میں ایک علمی زندگی اختیار کرلی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ساری ترکی قوم ایک

قیامت خیز جدوجہد اور ہنگامہ آرا آزمائش میں مبتلا تھی۔ اناطولیہ میں مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی تحریک کا جوخوں چکاں آغاز ہو چکا تھا، اس نے ترکی کے بچہ بچہ کے دل میں ایثار و عمل، خدمت و فدویت اور استقلال و حریت کے حوصلہ افزا جذبات پیدا کر دیے تھے لہٰذا ناممکن تھا کہ لطیفہ خانم ایسی وسیع النظر اور اعلیٰ تربیت یافتہ نوجوان خاتون اس قومی جدوجہد سے متاثر نہ ہوتی؟ پس ان حالات کے تحت آپ نے اپنی پُرسکون و پُرعشرت زندگی کو خیرباد کہتے ہوئے ترکانِ انگورہ کے دوش بدوش قومی و ملکی خدمت گزاری کا فیصلہ کر لیا لیکن لطیفہ خانم ایسی بلند مرتبہ خاتون کے لیے یہ ناممکن تھا کہ آپ یکا یک میدانِ جنگ یا میدانِ عمل میں کود پڑتیں بلکہ آپ کو ضرورت تھی کہ پہلے کسی معتبر شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کریں اور پھر اس کی تائید سے آپ اصلاح و خدمت کا کام شروع کریں۔ چونکہ خدائے علیم و حکیم اپنے جس بندہ کو کسی اہم خدمت کے لیے چن لیتا ہے اسے اسی نہج کے ذرائع بھی فراہم کر دیتا ہے اور اس کے جذبات و خیالات کی سطح کو بھی عام جذبات و خیالات سے بلند بالا کر دیتا ہے۔ لہٰذا لطیفہ خانم نے سب سے پہلے یہی مناسب سمجھا کہ وہ براہِ راست ترکی کے جلیل القدر قائدِ اعظم مارشل مصطفیٰ کمال پاشا سے رابطۂ خیال پیدا کریں جب کہ ممدوحہ ایسی مدبرہ کے خیالات کو کوئی ایسا ہی بلند مرتبہ دانشور سمجھ سکتا تھا۔ الغرض آپ نے مشہور معرکہ ''سکاریہ'' کے بعد جب کمالی فوجیں اس کی شہر تک بڑھ آئی تھیں مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کو ایک طویل مگر خفیہ خط روانہ کیا جس میں آپ نے اپنے نام و نسب کے ساتھ اپنے قومی جذبات و خیالات کا بڑی قابلیت کے ساتھ اظہار فرمایا۔ اس وقت مارشل مصطفیٰ کمال پاشا یونانیوں پر ایک کاری ضرب لگانے کے ساتھ ساتھ اندرونی اصلاح تنظیم کے لیے بھی بہت منہمک تھے اور گو بقول ''ڈیلی میل لندن'' لطیفہ خانم اور مارشل مصطفیٰ کمال پاشا میں ایک قسم کا ربط خیال ضرور پیدا ہو گیا تھا لیکن ابھی ایک دوسرے کو کسی سکون بخش قربت کا موقع نہیں ملا تھا۔ پھر بھی محترمہ لطیفہ خانم کو مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی کامیابی پر پختہ اعتماد تھا اور وہ نہایت اطمینان سے اس وقت کا انتظار کر رہی تھیں جب کہ مجاہدینِ اسلام کا یہ سرتاج و سالار اپنی قہار افواج کے ساتھ سمرنا میں لطیفہ خانم سے آ کر ملے۔

---

9 ستمبر 1922 کی صبح نہ صرف لطیفہ خانم بلکہ کل عالم اسلام کے لیے مسرت وشادکامی نصرت وکامرانی کی وہ سعادت اندوز صبح تھی جب کہ اسلام واسلامیت کا یہ مظفر ومنصور سپاہی نپولین بونا پارٹ اور اسکندر اعظم کی عظمت و بلند آوازگی کو روندتا ہوا سمرنا میں داخل ہوا۔ نہ پوچھو کہ لطیفہ خانم کے امیدوں سے بھرے ہوئے دل میں اس وقت کن جذبات اور کن مسرت خیز ولولوں کا ہجوم تھا؟ ابھی ایک ہفتہ پہلے ظالم وکمینہ یونانی فوجوں نے لطیفہ خانم کے مکان پر سخت پہرہ بٹھلا دیا تھا اور ان پر جاسوسی کا الزام لگا کر تین ماہ قید رکھا تھا۔ ان کے والد بزرگوار کی تمام املاک و جائیداد قلم بند کر لی گئی تھی اور لطیفہ خانم ملک وقوم کی اصلاح وفلاح کے وسیع ترین جذبات وخیالات کو اپنے دل ودماغ میں لیے ہوئے ایک قیدی کی زندگی بسر کر رہی تھیں کہ یکا یک سمرنا میں شیردل کی کمالی فوجیں داخل ہوئیں اور بزدل کمینہ یونانی فوجیں آپ کے مکان بلکہ کل سمرنا کو چھوڑ کر فرار ہوگئیں۔

دن کے تین بج رہے تھے کہ اسلام وعالم اسلام کا سرتاج مصطفیٰ کمال پاشا سمرنا میں داخل ہوا، ہر طرف مبارک سلامت کے شادیانے بجنے لگے۔ دوسرے ہی دن محترم اوشا کی بے نے اس فاتح مشرق کو اپنے یہاں چائے کی دعوت دی۔ یہ چائے کی دعوت غازی اعظم اور لطیفہ خانم کی متحدہ زندگی کا پیشہ خیمہ تھی۔ غازی اعظم بھی لطیفہ خانم کے وسیع خیالات کے دلدادہ تھے۔ آپ اس دعوت میں تشریف فرما ہوئے جہاں لطیفہ خانم کو اس جلیل القدر مدبر سے گفتگو کا موقع ملا۔ خود لطیفہ کا بیان ہے کہ اس دعوت کے بعد ہی میرے والد قبلہ نے ایک دوسری دعوت کا انتظام کیا جس میں انھوں نے مفتی شہر کو بھی مدعو کیا گویا یہ دعوت سمرنا کے ایک تاجر اعظم کی دعوت تھی اور اس میں چالیس کروڑ مسلمانوں کا محبوب وجاں باز سپہ سالار اعظم دولہا بننے والا تھا مگر اسلامی سادگی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے پائی اور معزز مہمانوں کے جمع ہوتے ہی لطیفہ خانم اس مجمع میں طلب کی گئیں اور رسول محترم ﷺ کے مقدس ومحترم دستور کے موافق فوراً آپ کا نکاح پڑھا دیا گیا، سپہ سالار اسلام کے اس نکاح میں جس قدر سادگی اور عجلت سے کام لیا گیا وہ تمام مسلمانوں کے لیے کفایت شعاری اور اتباع شریعت کی ایک بابرکت نظیر ہے۔ شرعی احکام کے مطابق انگورہ گورنمنٹ کے چیف آف دی اسٹاف کے صدر فیلڈ مارشل مصطفیٰ فوزی پاشا لطیفہ خانم کے وکیل اور

فاتح آرمینیا مارشل کاظم قرہ بکر شاہ اور فاتح ملیشیا مارشل نورالدین پاشا لیفٹننٹ گورنر سمرنا گواہ تھے۔ اس قدر شرعی امور کی تکمیل کے بعد یہ دونوں عظیم المرتبت ہستیاں متحد ہو گئیں جن سے عالم اسلام کی سینکڑوں امیدیں وابستہ ہیں۔ اس مبارک و مسعود تقریب کے بعد حاضرین نے جو تعداد میں صرف پچاس تھے ان دونوں محترم دولہا دلہن پر مبارک سلامت اور عقیدت و شیفتگی کے پھول نثار کیے۔

مارشل مصطفیٰ کمال پاشا فاتح مشرق کی اس تقریب میں جس سادگی اور اتباع شریعت اسلامیہ کا پہلو مدنظر رکھا گیا۔ کاش مسلمانانِ ہند خصوصاً طبقہ اعلیٰ کی ماں بہنیں اس پر عمل پیرا ہوں اور اپنی اولاد کی شادی بیاہ میں ان گنت روپیہ اور فضولیات میں دولت برباد کرنے سے احتیاط کریں۔

ممدوحہ لطیفہ خانم کے نکاح ہو جانے کے بعد آپ غازی اعظم کے ساتھ انگورہ تشریف لے گئیں جہاں آپ غازی ممدوح کے محل واقع چانقیہ میں ٹھہرائی گئیں۔ غازی اعظم کی اس تقریب سے تمام ترکی قوم میں مسرت و شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ جس وقت لطیفہ خانم انگورہ پہنچیں تو تمام شہر نے عظیم الشان طریق پر آپ کا استقبال کیا۔ لطیفہ خانم ایسی زبردست تعلیم یافتہ خاتون کا غازی اعظم کے ساتھ شریک زندگی ہو جانا ترکی قوم کے لیے جس قدر مفید ہوسکتا ہے وہ ظاہر ہے اور اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ آپ انگورہ پہنچتے ہی مصروف عمل ہو گئیں۔ لطیفہ خانم ہی وہ پہلی ترکی خاتون ہیں جو انگورہ پارلیمنٹ میں زبردست اور کثیر آرا سے ممبر منتخب ہوئیں۔ آپ اکتوبر 1922 میں انگورہ پارلیمنٹ میں تشریف لے گئیں۔ تمام ارکانِ پارلیمنٹ نے نہایت پُرتپاک استقبال کیا۔ جس وقت آپ پارلیمنٹ کے کمرہ میں داخل ہوئیں۔ تمام ارکانِ پارلیمنٹ اور وزرائے حکومت کے استقبال پر بہ طریق شکریہ ایک معرکۃ الآرا تقریر کی۔ اس تقریر میں آپ نے جس روانی، فصاحت اور مدبرانہ خیالات کا اظہار فرمایا۔ اس پر تمام ارکانِ پارلیمنٹ نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور صدر پارلیمنٹ نے آپ کی خداداد قابلیت کے اعتراف میں تقریر کرتے ہوئے ترکی قوم کی طرف سے آپ کو مبارکباد دی۔ یہ آپ کی پہلی تقریر تھی جو آپ نے دنیا کے عظیم الشان مدبرین اور وزرائے حکومت کے سامنے کی اس کے بعد آپ غازی اعظم کے ساتھ ملکی و اصلاحی

کاروبار میں شرکت فرمانے لگیں۔نومبر 1922 میں غازی اعظم نے فوجوں کا معائنہ شروع کیا اور دسمبر 1922 میں آپ نے تمام مقبوضہ علاقوں کا دورہ شروع کیا۔اس دورہ میں محترمہ لطیفہ خانم نے جو خدمات انجام دیں اور نئی نئی اصلاحات تجویز کیں ان پر تمام ملک نے آپ کی دانش مندی اور قابلیت پر اعتماد و مسرت کا اظہار کیا۔لطیفہ خانم نے اس دورہ میں فوجوں اور جنگی رضا کاروں کے سامنے جو پُر جوش تقریریں کیں ان سے فوجوں میں اشتعال و ولولہ پیدا ہوگیا۔آپ نے ترکی عورتوں کے سامنے بہ کثرت تقریریں کیں اور انھیں مردوں کے دوش بدوش ملکی خدمات انجام دینے کے لیے ابھارا۔لطیفہ خانم ممدوحہ وہ خوش قسمت خاتون ہیں جنھیں حضور اقدس و اعلیٰ مقام العلیٰ شہنشاہ بحر و بر حضرت خلافت پناہی سلطان عبدالمجید خاں خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ نے عید مبارک کا تار بھیجا تھا جس کے جواب میں لطیفہ خانم نے بندگانِ حضور اقدس کے قدموں پر اپنی عقیدت کے جذبات نثار کیے تھے۔

اس قدر حالات کے بعد میں لطیفہ خانم کی ایک ملاقات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جس کے ذریعہ محترمہ لطیفہ خانم کے اخلاق و عادات اور تہذیب و شائستگی اور اپنے شوہر غازی اعظم کے ساتھ آپ کی سرگرمیوں کا اندازہ ہوگا۔لطیفہ خانم کی یہ وہ ملاقات ہے جو ایک دعوت کے موقع پر انگورہ میں غیر ملکی اخبار نویسوں کے ساتھ ہوئی تھی۔غیر ملکی اخبار نویسوں کو یہ دعوت خود محترمہ لطیفہ خانم نے دی تھی جس میں برطانوی اور بلغاری اخبار نویس اور بعض فوٹو گرافر شامل تھے۔دعوت ''قصر چانقیہ'' پر دی گئی جو غازی اعظم کی اقامت گاہ ہے۔اس جلسہ دعوت میں جو اخبار نویس شریک تھے ان کے سرکردہ مسٹر وارڈ پرائس امریکن پریس نمائندہ لکھتے ہیں کہ:

''ہم لوگ محل چانقیہ کے دروازے پر پہنچے جہاں ایک گارڈ ہمارے استقبال کے لیے تیار تھا۔پہلے ہم ایک کمرہ میں داخل ہوئے جس کے درمیان سنگ مرمر کا فوارہ لگا ہوا تھا۔وہاں سے ہم کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں حکومتِ انگورہ کے صدر اعظم حسین رؤف پاشا نے ہمارا غازی اعظم اور ان کی بیگم لطیفہ خانم سے تعارف کرایا۔غازی اعظم کی نشست گاہ بھی غازی موصوف کی شخصیت کا پرتو تھی اور وہ مشرق و مغرب کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے یعنی زمین پر تو ہماری مشرقی قالینوں کا فرش

تھا اور کھڑکیوں پر جدید قسم کے بیلدار پردے پڑے ہوئے تھے جن پر ایرانی نبل لگی ہوئی تھی جہاں ایک نقل نویس اپنے کام میں مشغول تھا۔ درمیانی برنجی منقوش میز پر کتابوں اور رسالوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دیواروں پر تلوار، خنجر اور تصاویر آویزاں تھیں جن میں سے ایک تصویر شہر بیروت کی جانب سے بطور تحفہ ملی تھی اور جس میں یہ دکھلایا گیا تھا کہ غازی اعظم عربوں اور ہندوستانیوں کی فوج مرتب کر رہے ہیں۔ میزوں اور آتش دانوں پر طلائی فتیلہ سوز اور مشرقی فانوس رکھے ہوئے تھے۔ دیوار کی جانب جھکی ہوئی یونانی طرز کی ایک سنگ مرمر کی تصویر رکھی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ترکان احرار نے فتح حاصل کر کے غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکا ہے اور ادب و نیاز کے بعد بیگم لطیفہ خانم نے خواتینِ ترکی کے فرائض کے متعلق سلسلہ گفتگو شروع کیا اور فرمایا کہ میرے بہت سے امریکن دوست ہیں اور میرا باپ نیویارک کاٹن ایکسچینج کا قدیم ممبر ہے، لیکن میں کبھی امریکہ نہیں گئی بلکہ میں نے انگلستان و فرانس میں تعلیم پائی ہے اور اس لیے میں برطانوی خواتین کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف ہوں۔ آپ نے قہقہہ لگایا جب کہ ایک نامہ نگار نے کہا کہ امریکہ کی عورتیں بلا ذمہ داری کے مردوں کی مراعات کو غصب کر جاتی ہیں اور امریکہ ایک ایسا ملک ہے جہاں شوہر کا قتل روا رکھا جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ ترکی خواتین کا یہ مقصد نہیں بلکہ میں اور میرا شوہر خواتین کے طرزِ عمل کے متعلق بالکل متفق الرائے ہیں جیسا کہ ہم دیگر سیاسی مسائل پر متفق ہیں۔ اس کے بعد آپ نے اس تمام گفتگو کا جو انگریزی زبان میں ہو رہی تھی غازی اعظم کو ترجمہ سنایا جس پر غازی ممدوح نے فرمایا کہ عورت کو مرد کا شریک اور ساتھی سمجھنا چاہیے۔ جب غازی اعظم سے سوال کیا گیا کہ کیا ترکی قوم اس بات کے لیے تیار ہے کہ خواتین کو آزادی دی جائے؟ تو غازی اعظم نے ایک طویل اور مبسوط تقریر فرمائی جس کا ترجمہ صدر اعظم رؤف پاشا اور بیگم لطیفہ خانم نے کیا۔ آپ نے فرمایا کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یورپ ترکی عورتوں سے پوری طرح واقف نہیں۔ حقیقتاً (80 فیصدی) خواتین مردوں کی طرح آزادی کا لطف اٹھاتی ہیں اور

کاشتکاروں کی عورتیں جو دن بھر مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی اور مویشی چراتی ہیں رات کو مردوں کی طرح کاروباری زندگی میں حصہ لیتی ہیں اور بقیہ 20 فیصدی خواتین جو قسطنطنیہ ایسے بڑے شہروں میں رہتی ہیں وہ البتہ ابھی آزادی سے محروم ہیں۔ مسٹر واڈ پرائس لکھتے ہیں کہ اس قدر مباحثہ کے بعد ہم اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں بیگم صاحبہ نے ہماری چائے نوشی کا نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ انتظام فرمایا تھا۔ اس کمرہ میں مشرقی اور مغربی سامانِ آرائش کی کوئی کمی نہ تھی اور ظروف کی ترتیب سے پتہ چلتا تھا کہ لطیفہ خانم باوصف اس علو مرتبت کے خانگی کاروبار میں کافی دلچسپی اور محنت سے کام لیتی ہیں۔ جس وقت ہم لوگوں کو اس کمرہ میں داخل ہونے کا حکم ملا اس وقت غازی اعظم اور صدر اعظم تو ملاقات کے کمرہ ہی میں رہے لیکن بیگم صاحبہ بڑی مہربانی سے ہمارے کمرہ میں میزبانی کے لیے تشریف لے آئیں اور چائے کی پیالیاں اپنے دست مبارک سے ہماری طرف بڑھائیں۔ جس وقت ہم لوگ چائے پینے میں مصروف ہوئے بیگم صاحبہ تقریر فرمارہی تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ صحافت کی 32 سالہ زندگی میں میں نے ایسی اثر انداز اور پُر مغز تقریر کبھی سنی ہو جیسی کہ بیگم صاحبہ کی تقریر تھی۔ بیگم صاحبہ علاوہ سیاسی سرگرمیوں کے جو وہ اپنے محترم شوہر کے ساتھ ظاہر فرمارہی ہیں ملک وملت کی ایک علاحدہ خدمت بھی انجام دے رہی ہیں اور وہ خدمت تعلیم نسواں کی اصلاح وترویج ہے۔ آپ نے اپنے محل کے پاس ایک چھوٹا سا اسکول کھولا ہے جس میں 32 یتیم لڑکیاں آپ سے تعلیم پارہی ہیں"۔

ممدوحہ لطیفہ خانم کے متعلق یہ وہ بیان ہے جو ایک غیر ملکی اور قومی شخص نے مغربی اخبارات میں شائع کرایا ہے جس سے ممدوحہ کی خداساز فضیلت کا کافی اندازہ ہوسکتا ہے۔

حلیہ اور خصائص:

لطیفہ خانم کا قد متوسط اور رنگ پاکیزہ اور کھلا ہوا ہے۔ لمبی سیاہ پلکوں میں سیاہ آنکھیں، رسیلے پن سے چمکتی ہیں۔ ہنسنے میں آپ کے دہانِ مبارک میں خوشنما دانتوں کی پوری قطار نظر آتی

ہے۔ آپ معمولی سیاہ ساٹن کا تر کی لباس زیب تن فرماتی ہیں اور برقعہ نہیں اوڑھتیں البتہ شرع اسلام کی پابندی کے لیے آپ ایک سیاہ رومال منہ سے باندھ لیتی ہیں جس کی وجہ سے آپ کی صرف آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ رومال کھول دیا جاتا ہے لیکن کسی مجمع میں تقریر کے وقت آپ اس رومال کو علاحدہ نہیں کرتیں۔

آپ طبعاً حلیم اور نہایت نرم دل واقع ہوئی ہیں۔ عزم واستقلال اور ضبط وصبر میں وہ ممتاز ملکہ رکھتی ہیں۔ بلا کی جفاکش واقع ہوئی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ دورہ کے زمانہ میں کبھی تھکتی نہیں ہیں۔ وہ سفر میں گھوڑے کی سواری کو زیادہ پسند فرماتی ہیں۔ مغربی تعلیم مکمل ہے مگر مشرقی ایشیا سے زیادہ محبت ہے۔ ہنسی بہت کم آتی ہے البتہ دوران گفتگو نازک لبوں پر تبسم کی ہلکی ہلکی موجیں رواں رہتی ہیں۔ تقریر اس قدر پُرزور اور دل نشیں ہوتی ہے کہ بڑے بڑے مدبر اور عالم آپ سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

دعا ہے کہ غازی اعظم اور لطیفہ خانم کے اس جوڑے کو خدا تا دیر سلامت رکھے۔ آمین!

◆◆◆

موہنا فرید خانم

میں اپنی دوسری کتاب تاریخ انگورہ میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں کہ عہد حاضر میں مغربی ممالک خصوصاً یورپی حکومتوں کا ایک یہ بھی نہایت زبردست اور کامیاب سیاسی طریق کار ہے کہ جب وہ اہم ترین سیاسی نقطۂ نظر اور لائحۂ عمل کو مقبول عام بنانا چاہتی ہیں اور اختیار کردہ پہلو پر دنیا بھر کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتی ہیں تو اس خاص امر کو اپنے مبلغین کے سپرد کر دیتی ہیں اور یہ مبلغین اپنی طاقت کے موافق اس خاص مقصد کو عوام تک پہنچا کر ان کی ہمدردی حاصل کرتے ہیں۔ان مبغلین کے قابلِ شمار چار حصے ہیں:

۱۔ انشاء پرداز

۲۔ مقررین

۳۔ مصنفین

۴۔ اخبارات

یہ وہ چار جماعتیں ہوتی ہیں جو اس خاص مسئلہ کو بہ کمال خوبی دنیا بھر میں مشتہر کرتی ہیں اور رائے عامہ کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔مثلاً انشاپرداز اپنے قلم سے،مقررین اپنی تقریروں سے،مصنفین اپنی کتابوں کے ذریعہ اور اخبارات اپنے کالموں میں اس موضوع کو عوام

تک پہنچاتے ہیں تا آنکہ ان کے مخاطبین اور ناظرین کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو زیر بحث مسئلہ کا موید ہوتا ہے۔ پس ان حالات کے اعتبار سے نوجوان ترک جب کہ اپنی صدہا سال کی عظمت و برتری اور ملک وحکومت کھو چکے تھے وہ انگورہ کے ویران میدانوں میں اپنی فطری آزادی کے تحفظ کے لیے تنہا مصروف ہوئے تو انھیں بھی ضرورت تھی کہ دنیا میں ان کی معصومیت و مظلومیت پر کوئی طاقت اٹھ کھڑی ہو اور کم از کم ان کی اعانت نہ سہی اخلاقی تائید ہی کے لیے تیار ہو جائے کہ بین الاقوامی اور اجتماعی معاملات وعلائق میں کوئی تنہا قوم وحکومت کبھی امن وسکون سے زندگی بسر نہیں کر سکتی لہٰذا ترکانِ انگورہ نے بھی اس سیاسی حربہ سے کام لیا اور اپنے ملک سے ایک طاقتور جماعت اس کام کے لیے منتخب کی جو ترکوں کی بے گناہی اور حق تلفی کا اظہار کر کے دنیا کی اخلاقی ہمدردی حاصل کرے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ترک کسی حکومت یا جماعت سے مادی و فوجی اعانت حاصل کرنا چاہتے تھے جب کہ جنگ ترکی و یونان میں ثابت ہو گیا کہ ترکوں نے بلا مشارکت غیرے یونانیوں کو کچل کر رکھ دیا اور انگورہ گورنمنٹ کے پریزیڈنٹ حضور والا قدر مصطفیٰ کمال پاشا نے سرکاری وغیر سرکاری طور پر ہمیشہ اس امر کا اعلان کیا کہ ترک کسی حکومت کی فوجی اعانت کے حاجت مند اور متمنی نہیں ہیں بلکہ وہ تو ہر اس بین الاقوامی مجلس میں اپنے لیے دنیا کی اخلاقی ہمدردی بہم پہنچانا چاہتے ہیں جو ترکی مسائل کا تصفیہ کرنا چاہتی ہو پس اس خاص غرض کے حصول کے لیے ترکوں کی جو جماعت آمادہ کار ہوئی اس کے جامع تر حالات تو آپ کو میری کتاب تاریخ انگورہ کے حصہ مبلغین میں ملیں گے۔ یہاں صرف ان ترکی خواتین کا تذکرہ کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنی خداداد قابلیت سے دنیا میں ترکوں سے ہمدردی اور اخلاقی اعانت کا اپیل کیا لہٰذا انھیں مبلغ خواتین میں ایک جنابہ محترمہ موہنا خانم بھی ہیں۔

موہنا خانم ایک ضعیف العمر اور صاحبِ اولاد خاتون ہیں۔ آپ انگورہ گورنمنٹ کے وکیل مختار مدبر پناہ حضرت احمد فرید پاشا مقیم پیرس کی اہلیہ ہیں۔ آپ کی ابتدائی تعلیم قسطنطنیہ میں ہوئی اس کے بعد خاندانی تمول کے باعث آپ نے یورپ کی کافی سیاحت فرمائی۔ آپ کو سیاسیات کے مقابل علم دین کا کامل ترین درجہ حاصل ہے تاہم آپ نے اپنے فاضل شوہر کی صحبت میں سیاسیات کا اس قدر عمیق مطالعہ کیا ہے کہ اچھے اچھے مدبرین بھی آپ سے آنکھ ملاتے جھجکتے ہیں۔

موہنا خانم کے متعلق اگرچہ اس سے پہلے ہندستان میں کوئی تفصیلی اطلاع نہیں پہنچی لیکن جب آپ دسمبر 1921ء میں اپنے شوہر احمد فرید پاشا کے ساتھ تشریف لائیں تو آپ نے انگورہ تحریک کی تبلیغ و اشاعت کے لیے خود کو وقف فرما دیا اور فرنچ زبان دانی اور یورپی سیاسیات میں کافی دست گاہ ہونے کی وجہ سے آپ معاملات سفارت میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہوگئیں۔ سفارت خانۂ پیرس میں حضرت احمد فرید پاشا کو اپنی فاضل اہلیہ کی وجہ سے معقول امداد حاصل تھی جب کہ عملۂ سفارت پر موہنا خانم ہی کی توجہ و نگرانی رہتی تھی اور فرید پاشا ممدوح کو اس طرح ترکی و فرانسیسی اہم سیاسی مسائل کے حل کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا اور موہنا خانم سفارت کے چھوٹے موٹے کاموں سے ہمیشہ اپنے شوہر کو آزاد رکھتی تھیں لیکن باوجود ان اہم اور ذمہ دارانہ خدمات کی انجام دہی کے موہنا خانم انگورہ تحریک کی تبلیغ و اشاعت سے غافل نہیں رہتی تھیں۔

آپ کی تبلیغ کا طریق و قاعدہ یہ تھا کہ آپ فرانسیسی مدبرین اور تعلیم یافتہ عورتوں سے بالخصوص ملتی تھیں اور ان کے ذریعہ اپنے خیالات کو فرانسیسی ذمہ دار افراد تک پہنچانے میں کامیاب ہوتی تھیں۔ بہت تھوڑے عرصہ میں آپ کی جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ فرانس کی بعض تعلیم یافتہ اور سیاست پسند خواتین موہنا خانم کی ہمدرد اور ان کی ملاقات کی شائق ہوگئیں۔ جب آپ نے فرانسیسی خواتین کو اپنی طرف کافی طور پر متوجہ کرلیا تو آپ نے ان خواتین سے تمنا ظاہر کی کہ میں اپنی فرانسیسی بہنوں کے جلسہ میں تقریر کرکے عام طور پر تبادلۂ خیالات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے اس خیال کی فرانس میں عام طور پر تائید کی گئی اور فرانسیسی تعلیم یافتہ خواتین نے فوراً موہنا خانم کو جلسوں میں تقریر کے لیے مدعو کیا۔ ان جلسوں میں موہنا خانم انگورہ اور بین الاقوامی معاملات وغیرہ مناسب موضوعات پر تقریریں فرماتی تھیں جو نہایت مقبول و کامیاب رہیں۔ ان میں ممدوحہ کی دو تقریریں خصوصیت سے نہایت ممتاز اور قابلِ ذکر ہیں اور انہی دونوں تقریروں سے ممدوحہ کی علمی فضیلت اور خداساز تبحر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک تقریر تو وہ ہے جو وسط 1921 میں مشہور ترکی ہمدرد فرانسی مدبر و انشا پرداز مسٹر پال پیرلوٹی کے ترکی سے واپس وطن آنے کی تقریب میں آپ نے ان کے مکان پر مدبرین فرانس کے جلسہ میں ارشاد فرمائی اور دوسری علمائے فرانس کی کانفرنس میں۔ بحیثیت صدر کے پیرلوٹی وہ ممتاز انشا پرداز ہے جس نے اپنی عمر کا کافی

حصہ اور اپنا زورِ قلم ترکوں کی ہمدردی میں صرف کیا ہے۔ یہ وہی ترکوں کا ہمدرد ہے جو 1921 میں اپنی کبرسنی کے باعث قسطنطنیہ سے فرانس واپس ہوا تو دانش پژوہ مصطفیٰ کمال پاشا نے انگورہ سے بہ طریق شکر وسپاس آپ کے لیے مختلف ہدایا و تحفے روانہ کیے تھے اور قسطنطنیہ کے ترکوں نے آپ کی یادگار قائم کی تھی۔ جب یہ ممتاز ترکی ہمدرد فرانس میں واپس آ گیا تو اس نے اپنے مکان پر فاضل ترین احباب کو دعوت دی جن میں فرانس کے مشاہیر اربابِ قلم و اصحابِ سیاسیات شریک تھے۔ چنانچہ فرانس کے اس جلسے میں پیرلوٹی نے ترکی سفیر متعینہ فرانس جناب احمد فرید پاشا کو بھی مدعو کیا تھا لیکن فرید پاشا ممدوح کو اس دن کوئی نہایت اہم سیاسی مرحلہ پیش تھا جس کی وجہ سے محتشم الیہ جلسہ میں شریک نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا آپ نے اپنی طرف سے اپنی فاضل اہلیہ کو اس جلسہ کی شرکت کے لیے بھیج دیا جب فاضل موہنا خانم اس جلسہ میں اپنے شوہر کی نیابت کے لیے پہنچیں تو پیرلوٹی جو اس بلند پایہ جلسہ کا بانی اور میزبان تھا آپ کو مکان کے دروازے تک لینے آیا اور نیابت تپاک اور اعزاز کے ساتھ آپ کا تعارف حاضرین جلسہ سے کرایا۔ اس کے بعد جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی اور پیرلوٹی نے اپنی اُن خدمات کو بیان کیا جو اس نے ایک حق پسند فرانسیسی انشا پرداز ہونے کی حیثیت سے ترکوں کی ہمدردی میں انجام دی تھیں۔ جب پیرلوٹی اور اس کے احباب اپنی تقریریں ختم کر چکے تو فاضل موہنا خانم کھڑی ہوئیں اور آپ نے ترکی اور پیرلوٹی کے موضوع پر ایسی معرکۃ الآرا تقریر ارشاد فرمائی کہ آپ کی فرنچ زبان دانی اور آپ کی فصاحت و بلاغت اور معلومات پر حاضرین عش عش کرنے لگے۔ آپ نے سب سے پہلے اپنے شوہر کی طرف سے عدم شرکت کی معافی چاہی اور اس کے بعد فرمایا کہ میرے شوہر نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ترکی خیر خواہ بزرگ پیرلوٹی کو ان کے وطن واپس ہونے پر پُر جوش مبارکباد پہنچاؤں اور پھر ان خدمات کا شکریہ ادا کروں جو انھوں نے ترکی قوم کے قیام و بقا اور اصلاح و فلاح کے لیے اپنے دماغ و قلم کے ذریعہ انجام دی ہیں:

''اے بزرگ محترم پیرلوٹی!

میرا پہلا فرض یہ ہے کہ میں اپنے عزیز شوہر کی طرف سے ان کی عدم حاضری پر آپ سے معافی چاہوں اس کے بعد ان کا وہ شکر وسپاس آپ تک جو آپ کی طرف سے ان

کے دل میں ایک پُر جوش آرزو کی طرح موجزن ہے۔

محترم خیر خواہ ترکی!

خدائے اقدس و برتر کا شکر ہے کہ آپ بخیر و خوبی اپنے وطن واپس تشریف لے آئے اور گو آپ کی ترکی سے واپسی ایک کامیاب واپسی ہے۔ تاہم آپ کی اس جدائی سے جو قلق ترکی قوم کو ہوا ہے اس کا صحیح اندازہ تو آپ نے باسفورس کو چھوڑتے وقت کیا ہوگا؟ لیکن اسی کے ساتھ آپ کی ان گراں پایہ خدمات کے اعتراف میں جو آپ نے اپنی گزشتہ زندگی کے دور میں ترکی افراد کی خیر سگالی کے لیے انجام دیں۔ انگورہ اور اناطولیہ سے گزرتے وقت ترکانِ احرار کا وہ منت پذیر خدا حافظ کہنا تھا جو آپ کو رخصت کرتے وقت انھوں نے پُر سوز انداز میں کہا۔ خصوصاً ہمارے سردار محترم والا جاہ مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کا آپ کی خدمت میں پیامِ شکر اس بات کی بدیہی دلیل ہے کہ ترکی قوم کے بچے سے لے کر ہمارا ذی اثر سے ذی اثر سردار بھی آپ کی خدمات اور احسانات کے جذبہ سے کامل طور پر متاثر ہے۔

اے ترکی کے سچے محسن!

اب کہ آپ اپنے وطنِ عزیز واپس آ گئے ہیں اور ان خدمات کا سلسلہ ایک حد تک ختم ہو گیا ہے جو قیامِ ترکی کے زمانہ میں بکمالِ قابلیت آپ نے جاری رکھا پھر بھی مجھے توقع ہے کہ آپ کی خدمات کا اثر دنیائے انصاف اور منت پذیر ترکوں کے دلوں سے قیامت تک محو نہیں ہو سکتا اور مجھے اب بھی توقع ہے کہ گو آپ نے اب بقیہ زندگی کو ایک خدا پرست انسان کی طرح یادِ الٰہی میں صرف کر دینے کا تہیہ کر لیا ہے لیکن ترکوں کی نظریں ابھی آپ سے مایوس نہیں ہوئی ہیں۔

میں آخر میں بڑے زور سے کہوں گی کہ آپ نے ترکی قوم کی جو خدمت دی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مشرق و مغرب کے درمیان ایک ایسا نکتہ ہیں جس پر آپ نے دنیا کو اتحاد و محبت، انصاف و مساوات کے لیے جمع ہو جانے کی مفید دعوت دی ہے اور آپ کا یہ قائم کیا ہوا نکتۂ اتحاد ایسا ہے جس پر اگر آج اقوامِ عالم جمع ہو جائیں تو میں

کہوں گی کہ دنیا از سرنو امن واطمینان کی روح پرور گھڑیوں سے معمور ہو جائے گی۔

میرے بزرگ پیرلوٹی!

آپ سن لیجیے کہ آپ کی خدمات کو ترکی قوم کبھی فراموش نہیں کرے گی بلکہ اس کے بچے بھی آپ کو محبت آمیز الفاظ سے یاد کریں گے اور محسن پیرلوٹی کا لفظ ان کی زبانوں پر آ کر آپ کی عظمت کو ہمیشہ تازہ کرتا رہے گا۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو راحت وآرام کی زندگی عطا فرمائے۔"

موہنا خانم کی تقریر کا یہ وہ خلاصہ ہے جس کے سننے سے نہ صرف حاضرینِ جلسہ مبہوت و ششدر تھے بلکہ جس وقت موہنا نے تقریر کے آخری الفاظ کو رقت انگیز انداز میں بیان کیا اس وقت پیرلوٹی کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے اور وہ انہی حالت میں موہنا خانم کو جواب دینے کے لیے اٹھے اور فرمایا:

"محترم حاضرین اور میری لائق بہن!

آپ کے خیالات کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ترکوں سے مجھے جو محبت ہے اس کی وجہ کسی اہم تشریح کی محتاج نہیں بلکہ میں نے ترکی قوم کی جو ناچیز خدمات انجام دی ہیں ان پر میرا علم ذہن اور میری انصاف پسند طبیعت نے خود ہی مجبور کر دیا ہے۔ ترکی قوم کے برسوں کے مطالعہ کے بعد مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کی یہ برگزیدہ قوم جن حیثیات کے ساتھ یورپ وایشیا میں حکومت کر رہی ہے وہ سیاست وتمدن اور تہذیب واصلاح کے ان بلند وبالا اصول پر مبنی ہے جو انسانی نجات وسعادت کے ضامن ہیں، ترکوں کا جس طرح یورپی اقوام سے اتحاد وخطرناک نہیں اسی طرح وہ ہماری امداد وموانست کے سب سے پہلے مستحق بھی ہیں۔ لہٰذا اگر مغرب نے مشرق کی اس نجیب وشریف قوم کی طرف الفت واتحاد کا ہاتھ بڑھایا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی"۔

آخر میں آپ نے حاضرین کو خاص طور پر جن میں فرانس کے ممتاز اربابِ قلم بھی تھے مخاطب کر کے کہا کہ:

''اب میرا زمانہ تو ختم ہو گیا اور میں اب دنیا میں چند ساعتوں کا مہمان ہوں۔ البتہ آپ حضرات کے عمل کا وقت ہے اور خدا نے آپ کو وہ سب کچھ دیا ہے جس کے ذریعہ آپ دنیا میں انصاف و مساوات اور اصول تہذیب کی حفاظت و امداد کر سکتے ہیں۔ پس جب آپ اس خدمت کے لیے مستعد ہو کر میدان عمل میں آئیں تو میری پیاری ترکی قوم کو فراموش نہ کیجیے گا''۔

موہنا خانم اور پیرلوٹی کے جلسہ کے یہ وہ حالات ہیں جن سے موہنا خانم کی معلومات، ان کی اہلیت و فضیلت اور ان کے زور تقریر کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس جرأت کی تعریف نہیں کی جا سکتی کہ آپ نے اخبار نویسوں اور انشا پردازوں کے اس قدر ممتاز جلسہ میں اپنے خیالات کو صاف صاف ظاہر فرما دیا کہ یہی معیار ہے ایک فاضل و کامل کی فضیلت کا۔

اب آپ کی ایک دوسری تقریر کا خلاصہ آپ کی خداساز قابلیت کا اظہار کرے گا۔

ستمبر 1922 میں فتح سمرنا کے موقع پر فرانس کے ممتاز علمائے دین کی کانفرنس ہوئی تھی جس میں تیونس و الجزائر وغیرہ کے اکابر علما بھی شرکت فرما تھے۔ ظاہر ہے کہ جو مجلس علمائے کرام کی کانفرنس ہو اس کی فضیلت و بلند پائیگی کا کیا عالم ہوگا اور اس مجلس میں کیسے کیسے معتبر اور جید عالم و ماہر شریک ہوئے ہوں گے، لیکن موہنا خانم کی ذی علم اور مسلم الثبوت قابلیت کا اندازہ کیجیے کہ اس مجلس نے ممدوحہ سے صدارت کی درخواست کی اور آپ نے اس درخواست کو قبول فرما لیا اور جلسہ کی صدارت فرمائی۔ افسوس کہ محترمہ کی وہ صدارتی تقریر حاصل نہ ہو سکی جو آپ نے علمائے فرانس کی کانفرنس میں ارشاد فرمائی تھی تاہم آپ کی تدبیر آپ کے علمی تبحر اور خصوصاً آپ کے علم دین میں ممتاز درج کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہی اطلاع کافی ہے کہ آپ نے علمائے فرانس کی مجلس میں صدارتی خدمات انجام دیں۔

غرض موہنا خانم نے فرانس میں ترکان انگورہ اور حفظ وطن کے لیے خواتین ترکی میں ممتاز ترین خدمات انجام دی ہیں جنھیں آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔

موہنا خانم کی ایک صاحبزادی بھی ہیں۔ آپ بھی اپنی قابلیت میں ماں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ آپ کا نام فرید خانم ہے اور آپ فرانس میں ترکانِ انگورہ کے مقاصد کی تبلیغ میں نہایت

سرگرم اور قابلِ ستائش طریق پر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ آپ بہترین مقرر ہیں اور فرنچ زبان میں کافی درک رکھتی ہیں۔ آپ کے متعلق جو اطلاعات ہندستان میں شائع ہوئیں ان سے آپ کے تبلیغی کارناموں پر کافی روشنی پڑتی ہے اور یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح ممدوحہ بھی فرانسیسی خواتین اور پبلک میں انگورہ تحریک کو فروغ دینے کے لیے سرگرم کار رہتی تھیں۔ ایک موقع پر آپ نے فرانسیسی خواتین کے عظیم الشان جلسہ میں ایک معرکتہ الآرا تقریر کے دوران اعداد وشمار کی رو سے یہ ثابت کیا تھا کہ انگورہ کی تحریکِ حریت میں خواتین ترکی نے قابلِ فخر طریق پر حصہ لیا ہے۔ اس تقریر اور خواتینِ ترکی کی خدمات اور ان کی مصروفیت اور میدانِ جہاد میں اپنے مردوں کے ساتھ شریکِ عمل رہنے والے حالات نے فرانسیسی خواتین کو بہت زیادہ متاثر کیا کیا تھا۔ فرید خانم کی اس زبردست تقریر کے متعلق رپوٹر نے اپنے ایک تار میں اشارہ کیا تھا۔ وہ تار یہ ہے:

> ''اخبار توحید افکار'' قسطنطنیہ کی ایک اطلاع سے پایا جاتا ہے کہ ترکی سفیر متعینہ پیرس کی صاحبزادی فرید خانم نے 7 جون 1922 کو ایک زنانہ جلسہ میں جس میں فرانس کی اکثر خواتین شریک تھیں ایک تقریر کے دوران میں یہ ثابت کیا کہ ترکی عورتیں قومی جہاد میں کس قدر حصہ لیتی رہی ہیں''۔

(خلافت، بمبئی، 20 جولائی 1922)

فی الجملہ فرانس میں موہنا خانم اور آپ کی صاحبزادی نے انگورہ تحریک اور حفظِ وطن کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ ایسی نہیں ہیں جنھیں ترکی تاریخ کے صفحات آسانی سے بھلا سکیں۔

◆◆◆

فاطمہ رضیہ خانم

مذکورہ مبلغ خواتین میں ایک نوجوان انشا پرداز خاتون فاطمہ رضیہ ہیں۔ یہ ہونہار اور وسیع الخیال خاتون ترکی مبلغین کے مرکز سوئٹزرلینڈ میں رہتی ہیں جو التوائے جنگ کے بعد سے بقول برادر گرامی سید سلیمان ندوی ترکی مدبرین و انشا پردازوں کا مرکز تھا۔ فاطمہ رضیہ خانم ایک روشن خیال تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ آپ کو بین الاقوامی مسائل و معاملات میں بے مثل عبور ہے۔ سیاسیات میں ان کی رائے مغز و پختگی رکھتی ہے۔ انھوں نے انگورہ تحریک کے سلسلہ میں تحریر و تقریر سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ 1920 میں جب ترکانِ انگورہ نے اپنی جدوجہد کو ایک منتظم لائحۂ عمل کے تحت شروع کر دیا تو سوئٹزرلینڈ کے ترکی انشا پردازوں نے بھی اپنے اپنے قلم کو جنبش دی۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ سوئٹزرلینڈ کے ترکی انشا پردازوں کے سرکردہ حضرت احمد رستم پاشا، سابق سفیر ترکی متعینہ واشنگٹن یورپی جرائد میں انگورہ تحریک پر ہنگامہ آرا مضامین لکھ رہے تھے۔ چنانچہ کیسے ہوسکتا تھا کہ فاطمہ رضیہ خانم ایسی ہمہ داں خاتون خاموش رہتیں جب کہ وہ بھی اپنے اندر ایک غیور پُر جوش دل رکھتی تھیں۔ فاطمہ رضیہ خانم پیرس و انگلستان کی سیاحت کر چکی تھیں اور وہ ان حکومتوں کی سیاسی زندگی سے کما حقہ واقف تھیں۔ وہ انگریزی زبان میں کامل دستگاہ رکھتی ہیں لہٰذا اوائل 1920 میں آپ انگلستان کے جرائد میں رونما ہوئیں اور ترکی بین الاقوامی مسائل پر آپ نے

ایسے معرکۃ الآرا مضامین لکھے کہ پڑھنے والے آپ کی اصابت رائے اور پختگی پر حیران رہ گئے۔ جن لوگوں نے لندن کے ممتاز اسلامی آرگن مسلم اسٹنڈرڈ کا مکمل فائل پڑھا ہے انھیں اس کے کالموں میں فاطمہ رضیہ خانم کے وہ مضامین ملیں گے جن میں ترکی اور یورپی تعلقات پر فقید المثال خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ممدوحہ کے قلم نے ترکی حمایت میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ نہایت طویل اور جامع ہیں البتہ آپ کی وسعت خیال اور سیاست دانی کے نمونہ کے لیے میں ذیل میں آپ کا وہ خط نقل کرتا ہوں جو آپ نے ترکی اور بین الاقوامی مسائل پر ایڈیٹر مسلم اسٹنڈرڈ لندن کو لکھا تھا جس کا مفاد یہ ہے:

''میرے عزیز اسلامی بھائی۔ السلام علیکم!

میں آپ کی ان خدمات کے لیے جو آپ نے اسلام کو بام رفعت پر پہنچانے کے لیے انجام دی ہیں آپ کی خدمت میں صمیم قلب سے ہدیۂ تہنیت پیش کرتی ہوں۔ میں اور میری دوسری بہنوں نے آپ کے ممتاز اخبار سے جو صحیح معنی میں مسلم اسٹنڈرڈ ہے بہت کچھ استفادہ کیا ہے اور کثرت سے معلومات حاصل کیے ہیں اگر آپ کے اخبار میں شائع شدہ حالات عالمگیر طریق پر شہرت پذیر ہو جائیں تو دنیا میں مسلمانوں کے دشمنوں کی تعداد کم ہو جائے مجھے یقین ہے کہ اس وقت کوئی مغربی طاقت خود مختار یورپین اقوام کی ظاہر داری کو بہتر طریق پر نہیں سمجھ سکی ہے تاہم وہ اس بات کو خوب سمجھ سکتی ہیں کہ امور واقعہ کو زبردست طاقت کے حسب منشا کیوں کر ظاہر کیا جا سکتا ہے جس صورت میں یورپ امریکہ اور جرمنی صداقت و انصاف اور انسانیت سے بیگانہ محض ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ کیوں مسلمان اور ہندستانی حکومتوں کے پاس اپنے وفود بھیج کر ان سے انسانیت، انصاف اور صداقت وغیرہ کے نام پر اپیل کرتے ہیں کیا انھیں ابھی تک تہذیب جدیدہ کا اصول معلوم نہیں ہوا؟ میں تبلیغ مقاصد کے خلاف نہیں ہوں اگر یہ وفود وغیرہ تبلیغ کی غرض سے بھیجے جاتے ہیں تو کچھ نقصان نہیں مگر یاد رکھیے کہ اس تہذیب جدیدہ کا حاصل خود غرضی ہے۔ ہر قومی یا انفرادی فعل اس قاعدے کے مطابق انجام دیا جاتا ہے۔ جب مراسم دوستانہ، عہد نامے، وعدے، اور

''معاہدے'' متذکرۂ صدر قاعدہ کے خلاف عمل پذیر ہوں تو وہ پرزۂ کاغذ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اس بات کو پیش نظر رکھیے اور جو جی چاہے کیجیے۔

آپ دھوکے میں نہیں آئیں گے میں چاہتی ہوں کہ آپ کامیاب ہوں اور میں آپ کو مرفہ حال دیکھنا چاہتی ہوں مگر آپ اپنی ہی تہذیب کو اپنا شعار بنائیے۔ اکثر یورپین ایک جدید تمدن اور ایک بالکل ہی نئی تہذیب کے متمنی اور منتظر ہیں۔ ان کی آنکھیں مشرق کی طرف لگی ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر ہندستان کی طرف بھی دیکھ رہے ہیں اور زیادہ تر بدھ مذہب کا خیال کر رہے ہیں لیکن میں فطرتاً اسلام کا خیال کر رہی ہوں اور مجھے ہندستان کے مسلمانوں سے بڑی امیدیں ہیں۔ میرے خیال میں اسلام کی ترقی اور عروج کے لیے یہ ایک نہایت مناسب ترین ملک ہے۔ یورپ اپنی طاقت کی تنظیم و ترتیب کے باعث اس قدر زبردست اور طاقتور بن گیا ہے پھر بھی میں کہوں گی کہ اسلام اور مسلمانوں کے برابر دنیا میں کوئی قوم انتظام و انصرام کی سرمایہ دار نہیں فی الحقیقت اسلام تنظیم و تنسیق کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

''اگر تم تین فرد ہو تو اپنا ایک سردار منتخب کرلو۔ خدا جماعت کی مدد کرتا ہے جو شخص جماعت سے الگ ہو جاتا ہے وہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف گامزن ہے اور مسلمانوں کی جماعت کوئی گمراہ کن کام نہیں کرسکتی۔ ایک سے دو۔ دو سے تین۔ تین سے چار بہترین اس لیے جماعت میں شریک ہونا تمھارا فرض ہے۔ اپنے کاموں میں مشورہ کرلیا کرو جو شخص جماعت سے علاحدہ مرے گا وہ جاہلیت کی موت مرے گا''۔

یہ محض چند حوالے دیے گئے۔ اس قسم کے بے شمار حوالے مل سکتے ہیں جن سے مسلمانوں کا آسمانی دستورالعمل (قرآن حکیم) بھرا پڑا ہے۔ یہ حوالے اس امر کے ضامن ہیں کیا اسلام تنظیم و انصرام کے بغیر ہرگز اسلام نہیں اگر مسلمان واقعی بیدار ہوگئے ہیں تو انھیں ان اصول کے مطابق تنظیم و انصرام قائم کرکے نشیب و فراز کی طرف قدم بڑھانا چاہیے اگر وہ اس تنظیم و تنسیق پر کاربند ہوگئے تو کوئی طاقت یا متحدہ

طاقتیں بھی کبھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ بے شک مسلمانوں کی تنظیم و تنسیق تعمیری ہوگی بہت سے یورپین ان کے ہوا خواہ بن جائیں گے جب دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی کہ اب مسلمان مہذب خیالات کی ایک متحدہ اور آزاد جماعت کے طور پر ارتقا و ترقی کی طرف گامزن ہیں اور محض یورپ ہی کی اندھی تقلید کو اپنا شعار نہیں بنا رہے ہیں تو بے شمار و کثیر التعداد لوگ اسلام کے حامی و موید پیدا ہو جائیں گے۔ یورپ خود اپنی ذات سے غیر مطمئن ہے اس کے ساتھ کسی قسم کا وعدہ کرلو اس سے کسی قسم کے امکان کا اظہار کرو پھر آپ اور میں معجزانہ واقعات کا نظارہ کریں گے۔

آپ کی بہن۔ رضیہ"

رضیہ خانم کا یہ وہ مراسلہ ہے جس میں زیادہ حصہ مسلمانانِ ہند کی اس جد و جہد سے متعلق ہے جو خلافت کی آزادی کے لیے انجام دے رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ یورپ میں مسلمان ہند کا وفد خلافت مسٹر محمد علی۔ بی۔ اے آکسن، ایڈیٹر "کامریڈ" دہلی کی سرکردگی میں دورہ کر رہا تھا اور اس کے ارکان سوئٹزرلینڈ بھی پہنچے تھے۔ لندن میں مسٹر مشیر حسین قدوائی بی۔ اے مرکزی اسلامی جماعت کے ساتھ خلافت کی آزادی کے لیے سرگرم عمل تھے۔ پس انھیں حالات و حوادث کے متعلق فاطمہ رضیہ خانم نے اسلامی ہند کی جد و جہد کے لیے جو اصول بتلائے ہیں ان کی وسعت و پختگی کے سوا رضیہ خانم نے انگورہ تحریک کے اس سلسلہ کو بھی ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جس کا ایک حصہ عالمگیر اتحاد اسلامی ہے۔

اس مراسلہ سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ترکی خواتین نے موجودہ انقلاب کو مسلمانوں کے لیے کس قدر مفید انقلاب سمجھا ہے اور یہ کہ وہ نہ صرف ترکی قوم بلکہ عالم اسلام کو ایک طاقتور اور منتظم جماعت دیکھنے کی متمنی ہیں وہ صاحب علم و کمال ہونے کے ساتھ اسلام کے سیدھے سادے اصول کی دلدادہ ہیں اور انھوں نے بھی عالم اسلام کے لیے فلاح و کامرانی اسی نکتہ میں مضمر پائی ہے کہ تہذیب مغرب کو قدیم تہذیب مشرق سے بدل دیا جائے۔ الغرض فاطمہ رضیہ خانم کی خدمات دیگر ترکی مبلغ خواتین سے کسی طرح کم نہیں۔

◆◆◆

متفرق

یہ تو ان مخصوص خواتین کے حالات تھے جو مجھے میسر آسکے لیکن ظاہر ہے کہ ترکی میں اس وقت بہ اعتبار قابلیت، بہ اعتبار علم و تجربہ سینکڑوں عورتیں پروفیسری، معلمی اور ڈاکٹری کے علاوہ موجد، انشاپرداز، لیکچرار، سیاسی مشیر، عہدہ دار اور جنگی سپاہی کی حیثیت سے موجود ہیں جن کے تفصیلی حالات یا تو کسی جدید ترکی مؤرخ سے یا پھر عرصہ دراز کے بعد ہندستان تک پہنچیں گے۔ البتہ مجھے بہ طریق مختلف اُن خواتین کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو بحیثیت مجموعی اس جنگ میں انگورہ گورنمنٹ اور قومی مدافعت کے لیے رضا کارانہ سرگرم عمل ہیں۔

چنانچہ ان خواتین میں سب سے زیادہ تحسین و ستائش کی مستحق ایشیائے کوچک کی خواتین ہیں جنھوں نے ترکانِ احرار کی تحریک شروع ہوتے ہی خود کو جنگی و غیر جنگی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے کامل تین سال تک حالتِ جنگ میں کمال صبر و تحمل سے اپنے فرائض کو ادا کیا اور اپنے شوہروں اور اپنے بیٹوں اور بھائیوں کو خدا کی راہ میں قربان ہونے کے لیے بصد مسرت پیش کر کے خود بھی صرف عمل ہوگئیں۔ انھوں نے انگورہ گورنمنٹ کے تمام شعبوں میں خدمات انجام دیں اور اپنے برابر مردوں کی تعداد کو وہ میدانِ جنگ میں بھیجتی رہیں۔ ان عورتوں نے تارگھر، ریلوے، ڈاکخانوں، خانقاہوں، میونسپل اور محکمۂ جنگ میں پُرجوش طریقہ پر وہ خدمات

انجام دی ہیں جن کے صحیح اظہار کے بعد دنیا ان اسلامی مجاہد خواتین کے کارناموں پر عش عش کرے گی۔ یہی وہ خواتین ہیں جنھوں نے دنیا کو دکھلا دیا کہ وہ بہ اعتبار ترقی کس مرتبہ پر پہنچ چکی ہیں اور انھوں نے قومی جنگ میں کس ہمت اور مردانگی اور قابلیت کا اظہار کیا ہے۔ ایشیائے کوچک کی تعلیم یافتہ خواتین کے بعد وہاں کی رضا کار خواتین نے ان سے بھی زیادہ قابلِ حیرت طریق پر خدمات انجام دی ہیں۔ ایسی رضا کار اور مجاہد خواتین کے جو اعداد پچھلے دنوں اللواء المصری نے شائع کیے ہیں وہ پچاس ہزار ہیں۔ یہ مجاہد عورتیں غیر علمی خدمات انجام دیتی تھیں۔ انگورہ گورنمنٹ کے محکمۂ رسد رسانی میں یہ عورتیں محکمۂ جنگ کے لیے جس طرح خدمات انجام دیتی تھیں ان میں سے ایک خدمت یہ بھی تھی کہ یہ جوان ہمت عورتیں فوج کے لیے سامانِ رسد وغیرہ ضروریات اپنے سروں اور کاندھوں پر لاد کر لاتی تھیں جیسا کہ انگورہ گورنمنٹ کے شعبۂ تبلیغ و اشاعت کے مقام و فاضل چیف ڈائرکٹر علامہ احمد اوغلو نے روس سے انگورہ واپس ہوتے ہوئے ان رضا کار خواتین کے متعلق ایک چشم دید واقعہ لکھا، فرماتے ہیں:

> ''جب میں مقام ''اینی بولی'' میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ریلوے اسٹیشن کے قریب فوج کے لیے ذخائرِ جنگ کے انبار لگے ہوئے ہیں جن میں خصوصیت سے ہیزم سوختنی کے بڑے بڑے گٹھر ہیں جو ترکی خواتین نے اندرونِ ملک سے ترکی سپاہ کی رہائش کے لیے فراہم کی تھیں پھر میں نے ترکی خواتین اور بوڑھوں کی ایک طویل قطار دیکھی جو اپنے کاندھوں اور سروں پر لکڑیوں کے گٹھر لیے آرہے تھے یہ لکڑیاں اس طرح جمع کی تھیں کہ ان کا کوئی معاوضہ انگورہ کے محکمۂ رسد کی طرف سے انھیں ادا نہیں کیا گیا تھا''۔

(اللواء المصر)

ایشیائے کوچک کی ترکی خواتین کے بعد یورپین ترکی خصوصاً قسطنطنیہ کی وہ خواتین ہیں جو کسی نہ کسی طرح قسطنطنیہ سے فرار ہو کر اناطولیہ میں قومی مدافعت کے لیے ترکانِ احرار سے مل گئیں۔ ان رضا کار خواتین کے دو حصے ہیں ایک تو وہ جو قسطنطنیہ سے بھاگ کر اناطولیہ آگئیں دوسرا وہ جو قسطنطنیہ میں رہ کر مصروفِ عمل رہیں۔ قسطنطنیہ میں رہنے والی خواتین کا تذکرہ تو اوپر

ہو چکا ہے اب اناطولیہ میں پہنچنے والی خواتین کے حالات میں وہ ڈیڑھ سو زنانہ ڈاکٹر قابلِ ذکر ہیں جو قسطنطنیہ سے اناطولیہ محض خدمتِ وطن کے لیے آئیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں عورتیں جو یورپین ترکی سے اناطولیہ پہنچیں انھوں نے خود کو انگورہ کے جنگی و غیر جنگی محاکم میں داخل کر دیا اور ہر ایک شعبہ میں انھوں نے مردوں کا کافی ہاتھ بٹایا۔ ان خواتین میں ایسی بے شمار تعلیم یافتہ خواتین ہیں جنھوں نے اناطولیہ محکمۂ تعلیمات میں اپنی خدمات پیش کیں۔ انھوں نے اپنی خداداد علم و ایثار سے اناطولی عورتوں کو تھوڑے عرصہ میں فنِ جراحی، ڈاکٹری اور دوسرے مفید علوم و فنون کی تعلیم دی۔ انھوں نے دورانِ ملازمت میں کمال اعتدال اور ضبط سے کام لے کر انگورہ گورنمنٹ سے کسی معقول و گراں قدر تنخواہ کا مطالبہ نہ کیا بلکہ ابتدا میں حسبِ اطلاع ''بنی لون'' انگورہ تین ماہ تک تنخواہ کا ایک پیسہ نہ لیا اور اپنے فرائض میں پوری تندہی سے مصروف رہیں۔ اس کے بعد انھوں نے انگورہ کی نسوانی فوج میں خود کو شریک کیا اور اس شجاعت و ہمت سے جنگی خدمات دیں کہ مخالفین حیران رہ گئے۔ یہ انہی خواتین کے ایثار کا نتیجہ تھا کہ ستمبر 1922 میں جنابہ خالدہ خانم کی زیر کمانڈ 80 ہزار ترکی خواتین میدانِ جنگ میں خدمات انجام دے رہی تھیں۔ اب میں ذیل میں ایک ایسی اطلاع درج کرتا ہوں جس کے ذریعہ ترکی خواتین کے مجموعی مگر بصیرت فزا کارنامے نمایاں ہوں گے وہ اطلاع یہ ہے:

> ''وقت آ گیا ہے کہ ان لوگوں کی خدمات کا اعتراف کیا جائے جنھوں نے دماغ ملی کی تحریک میں جوش و ہیجان پیدا کرنے اور آزادیٔ ملت کی امداد و حمایت میں سرگرمی سے کام لیا۔
>
> ترکی کے موجودہ نظام اجتماعی میں جو جنگ فرنگ کے بعد رونما ہوا ہے ترکی خواتین نے اپنی محنت اور بے نظیر ثابت قدمی سے ایسی اعلیٰ حیثیت حاصل کر لی ہے جس کا زمانۂ ماضی میں خواب و خیال بھی نہ تھا۔
>
> ان تمام ممالک کی طرح جو شریکِ جنگ تھے۔ ترکی میں بھی کارخانے اور دیہات مزدوروں اور کسانوں سے بالکل خالی ہو گئے تھے تاکہ میدانِ جنگ میں سپاہیوں کی قلت نہ رہے آخر ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ جنگ میں جانے والے نوجوانوں کی

جگہ بڈھے آدمی اور چھوٹے لڑکے کافی کام نہ دے سکتے تھے۔ ترکی میں سب سے پہلے محکمۂ ڈاکخانہ تھا جس نے اپنے دفاتر میں عورتوں کو ملازم رکھنے کی جرأت کی۔ پہلے پہل جب خواتین ترکی ڈاکخانے کی کھڑکیوں میں بیٹھ کر ٹکٹ بیچنے لگیں تو ملک میں ایک سنسنی سی پھیل گئی، لیکن ان عورتوں نے اپنے فرائض کو ایسی خوش اسلوبی سے ادا کیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بہت جلد بند ہو گئیں اور آئندہ کے لیے راستہ کھل گیا۔ بہت ہی جلد لوگ عورتوں کو بینکوں، بازاروں اور دکانوں میں دیکھنے کے عادی ہو گئے اور اس طرح آزادیٔ نسواں نے دیانت دار کارکنان ملکی کی وساطت سے عملی صورت اختیار کر لی۔

دیہات میں عورتوں نے اپنے مصروف کارزار بھائیوں اور شوہروں کی جگہ کام کرنے میں اور بھی عجلت اور سرعت سے کام لیا کیونکہ کاشتکاری کے کام میں تو زمانۂ سلف ہی سے عورتیں اپنے مردوں کے ہاتھ بٹاتی رہی ہیں یہی وجہ تھی کہ انھوں نے زراعت کا کام دوسرے کاموں کی نسبت جلد سنبھال لیا۔

پرانے تعصبات کی آگ فرو کرنے میں سب سے زیادہ اس امر نے کام دیا کہ عورتوں نے فوج کی امداد و اعانت کے بہت سے کام انجام دیے بالخصوص جنگی شفاخانوں میں خدمات انجام دینے لگیں۔ جنگ کے پہلے ہی مہینے سے ہلال احمر کے شفاخانوں میں ترکی خواتین کی محنت وسرگرمی کے مناظر نظر آنے لگے اور انھوں نے اس خدمت کو بہت خلوص وسرگرمی اور محبت سے انجام دیا۔ تجارت اور زراعت کے کام تو صرف طبقہ ادنیٰ اور طبقہ متوسط کی عورتوں نے اختیار کیے تھے، مگر زخمیوں کی دیکھ بھال اور شفاخانوں کے فرائض میں طبقۂ اعلیٰ کی معزز خواتین نے حصہ لیا۔ اس طرح نسوانی سرگرمی اور کارگزاری تمام طبقات اور تمام مدارج معاشرت میں جاری و ساری ہوگئی۔

بہت سی عورتوں نے فوج کے عقب میں کام کرنے کی خدمات اپنے ذمہ لیں۔ سرزمین اناطولیہ کے وسیع صحرائی علاقے جہاں حمل ونقل کے ذرائع مفقود ہیں اور

سال کے بڑے حصہ میں سڑکیں نا قابلِ گزر ہو جاتی ہیں ان جفا کش عورتوں نے جنگ کا ساز و سامان اپنی پیٹھوں اور کاندھوں پر اٹھا کر مجاہدین کو پہنچایا تا کہ جہاد کے تسلسل و تواتر میں فرق نہ پیدا ہو جائے۔ عالی جاہ دانش پناہ حضور گرامی سرکار حسین رؤف پاشا، صدر پارلیمنٹ انگورہ نے ایوانِ پارلیمنٹ میں قومی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے ان بہادر خواتین کی خدمت میں ہدیہ شکر و سپاس پیش فرمایا کہ میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں جن سے میں اپنی ان ماں بہنوں کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے برفانی علاقے میں ننگے پاؤں چل کر ہماری فوجوں کو اشیائے خوردنی اور سامانِ جنگ کے ذخائر بہم پہنچائے ہیں۔

(مسلم آؤٹ لک، بپرس زمیندار، 13 جنوری 1923)

◆◆◆

فاطمہ خانم

یہ نوجوان خاتون بھی احرار میں ممتاز و سربلند حیثیت کی سرمایہ دار خاتون ہیں۔ جب تاریخ انگورہ لکھی جائے گی تو اس کے روشن ترین صفحات اس مجاہد خاتون کے کارناموں سے جگمگا اٹھیں گے۔

فاطمہ خانم کسی بڑے ٹر کی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی ہیں بلکہ اسی شہر کے ایک فوجی افسر کی صاحبزادی ہیں۔ آپ نے اپنے شوہر سے فنونِ جنگ میں کامل مہارت حاصل کی تھی۔ آپ کے دل میں قومیت کے وہ ممتاز و ولولہ خیز جذبات موجزن تھے جو حفظِ وطن اور ناموس ایزدی کی صیانت کے لیے ہر غیور ترک کے دل و دماغ کو گرمائے رہتے ہیں۔ فاطمہ خانم کے اندر جہد و جہاد کے جذبات بھڑکانے والی خالدہ خانم ہیں جن کی آتش ریز تقریریں سن کر وہ ان جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکیں جو قومی مصائب اور اناطولیہ کی عام تباہی نے آپ کے اندر پیدا کر دیے تھے لہٰذا آپ فوراً میدانِ عمل میں آ گئیں۔

خالدہ خانم کی طرح آپ نے بھی اپنے شوہر سے میدانِ جنگ کی اجازت چاہی جسے شجاع و قوم پسند خاوند نے فوراً منظور کر لیا۔ فاطمہ خانم سب سے پہلے مقام ولیری عثمان میں نمودار ہوئیں جہاں آپ نے ترکی خواتین کا ایک جرار لشکر جمع کیا۔ فاطمہ نے ابتدا میں اپنے قبضہ کی عورتوں کو

میدان میں آنے کی ترغیب دی۔ متعدد تقریریں کیں اور جب وہ خدمات جنگ کے لیے تیار ہوگئیں تو موصوفہ نے انگورہ کے جنگی اسٹاف کو اس خدمت اور مصروفیت سے بھی بچالیا کہ وہ ان مجاہد خواتین کے قواعدِ جنگ وغیرہ کا انتظام کرے بلکہ ممدوحہ نے خالدہ خانم کو اطلاع دی کہ میں نے عورتوں کا جولشکر فراہم کیا ہے میں خود ہی اسے قواعد جنگ سکھاؤں گی۔ اس اطلاع کے بعد آپ ان کی جنگی تربیت میں مصروف ہوگئیں اور تھوڑے عرصہ میں آپ نے ایک نسوانی دستہ فوج کو ضروری فنونِ جنگ سے واقف کر کے اپنے قبضہ کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا۔ پھر آپ قریب کے دیہات میں گئیں اور وہاں کی عورتوں کو بڑی قابلیت سے آمادہ جنگ کر کے بھرتی شدہ عورتوں میں شامل کرلیا۔ اب کی مرتبہ آپ نے ان خواتین کا انتخاب کیا اور جو عورتیں خدمات جنگ انجام دینے کے قابل نہ تھیں انھیں آپ نے انگورہ کے جنگی ہیڈکوارٹر کو روانہ کر دیا اور جو اس قابل بھی نہ تھیں ان کو مقامی خدمات سپرد کر دیں۔ غرض آپ کی ایسی ہی دوسری خدمات کے دیکھتے ہوئے دین پناہ سرکار محترم حضور والا جاہ مارشل مصطفیٰ کمال پاشا نے آپ کو اس علاقہ کا مختار کمانڈر بنادیا اور حکم دیا کہ آپ ان مجاہد خواتین سے اپنے اختیار تمیزی کے موافق خدمات لے سکتی ہیں۔ اس حکم کے بعد فاطمہ خانم نے اپنے بڑھے ہوئے جذبات کی بنا پر فوراً اس نسوانی دستہ کے ساتھ غنیم پر حملہ شروع کر دیا لیکن جب آپ کے اس حملہ کی اطلاع جنگی ہیڈکوارٹر کو ہوئی تو اس نے فاطمہ خانم کو اس استعجال و سرعت سے جنگی مصالح کی بنا پر روک دیا۔ اگر چہ اس وقت فاطمہ خانم اور آپ کی ماتحت خواتین کے جذبات قابو سے باہر تھے تاہم انھوں نے عام اسلامی شعار کی مناسبت سے اس حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور بجائے اقدام کے آپ نے علاقہ اسمد کا دورہ شروع کر دیا۔ اس دورہ میں آپ نے پہلے سے بھی زیادہ محنت و قابلیت سے کام لیا۔ آپ نے اس دورہ میں علاوہ بھرتی کے اپنے نسوانی دستوں کے لیے سامانِ حرب بھی مہیا کیا اس سامان میں اکثر ہتھیار یونان ہی کے تھے جنھیں یونانی فوجیں کمالی دستوں کے مقابلہ میں چھوڑتی گئی تھیں اور کمالی جرنلوں نے انھیں دیہات کی آبادی میں تقسیم کر دیا تھا۔ آپ نے تمام آبادی سے اس طرح اسلحہ فراہم کیے کہ فی کس ایک بندوق چھوڑ کر باقی تمام ہتھیار نسوانی لشکر کے لیے طلب کر لیے۔ آپ کی اس ترکیب کو دیہات کی آبادی نے بھی بہت پسند کیا اور ہر شخص نے ضرورت سے زیادہ اسلحہ کو فاطمہ خانم کے

سپرد کر دیا۔

اسلحہ کی معتدل تعداد فراہم ہو جانے کے بعد یہ محترم خاتون اپنے دستوں کے لیے رسد وغیرہ ضروریات جمع کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ آپ کے اس مقصد کی کامیابی میں مقام ولیری عثان اور مضافات اسمر کی عورتوں نے بہت زیادہ اور معقول حصہ لیا۔ یہ بلند ہمت خواتین سامانِ رسد کے لیے گاؤں گاؤں پھرتی تھیں اور سامان کو کسی ایک جگہ جمع کرتی جاتی تھیں۔ پھر جمع شدہ سامان کے لیے انھوں نے انگورہ کے جنگی اسٹاف سے کوئی امداد طلب نہ کی بلکہ بعض اوقات گاڑیاں نہ ملنے کی صورت میں یہ خواتین اپنے کاندھوں پر سامانِ رسد لاد کر اپنے جنگی مستقر پر لے جاتی تھیں اور انگورہ کو جب تک ان خواتین کی اس محنت و جانفشانی کی اطلاع نہ ملی اس وقت تک خود فاطمہ خانم نے کوئی استدعا نہ کی لیکن جب دوسرے ذرائع سے انگورہ کے جنگی اسٹاف کو آپ کی ان سرفروشانہ مساعی کا علم ہوا تو وزیر بار برداری نے فاطمہ خانم کی امداد کے لیے چند موٹر لاریاں وغیرہ ضروریات رسد بھیج دیں۔ اب فاطمہ خانم نے بھرتی شدہ خواتین کے متعدد دستے بنائے جنھیں حسب منظوری خالدہ خانم آپ نے علاقہ اسمر پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا اور دشمن پر یکا یک حملے شروع کر دیے۔ جن سے یونانی افواج میں تہلکہ مچ گیا اور یونانی سپہ سالار کو جب اس امر کا علم ہوا کہ اس کی مور چہ بند افواج پر شب کے وقت ترکی عورتیں حملہ آور ہو کر سخت سے سخت نقصان پہنچاتی ہیں تو اس نے بھی ایک زبردست پلٹن ان عورتوں کے مقابلہ کے لیے روانہ کی۔ اس پلٹن سے ان عورتوں نے مقابلہ کیا اور آخر کار یونانی دستہ ان بہادر خواتین کو اپنی خدمات سے باز نہ رکھ سکا بلکہ شیر دل عورتیں پہلے سے بھی زیادہ جرأت سے لڑیں یہاں تک کہ فاطمہ خانم کو اس کا علم ہوا کہ یونانی دستے عورتوں کے مقابل زیادہ طاقتور بنا دیے گئے ہیں تو یہ بہادر خاتون خود میدان میں ان عورتوں کی کمانڈ کرنے لگیں۔ ایک معرکہ میں آپ نے اس قدر شدت سے مقابلہ کیا کہ یونان کا مقابل دستہ سراسیمہ ہو کر بھاگ گیا۔ یہ وہ زبردست مقابلہ تھا جس میں کئی مجاہد عورتیں بھی شہید ہوئیں لیکن فاطمہ خانم کی دلیرانہ مساعی کم نہ ہوئیں آخر کار آپ کی ان خونبار خون چکاں خدمات کا یہ فائدہ ہوا کہ یونان کے غارت گر دستے اب اندرونِ ملک غصب و غارت گری سے باز آ گئے اور ترکی علاقہ کی پریشان آبادی اب اطمینان و راحت کی نیند سونے لگی اور اسے یونانی اقدام و پیش قدمی کا

کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ فاطمہ خانم کی ان خدمات کا اثر معمولی نہ تھا بلکہ آپ کی ان مصروفیتوں اور جانبازیوں کی شہرت نے اطالوی مستورات میں زبردست عملی روح پیدا کردی اور وہ بربنائے غیرت وحمیت نسوانی لشکر میں داخل ہونے لگیں اور اس طرح نسوانی لشکروں میں ترکی عورتوں کی معقول تعداد شریک ودخل ہوگئی۔ آپ کے اس بڑھتے ہوئے اثر اور آپ کی مردانہ خدمات کا شہرہ اناطولی حدود سے نکل کر اب انگلستان تک پہنچ گیا۔ چنانچہ ذیل میں بعض انگلستانی جرائد کے وہ الفاظ نقل کرتا ہوں جو انھوں نے فاطمہ خانم کی ان قربانیوں اور حیرت فزا کارگزاریوں کے متعلق لکھے تھے۔ لندن کے ایک اخبار نے لکھا تھا کہ:

> ''انگورہ کے اخبارات مظہر ہیں کہ مضافات اناطولیہ میں بعض دیہات کی عورتوں نے محاذ اس کی شہر پر یونانیوں کے خلاف داد شجاعت دی اور خوب جان توڑ کر لڑیں۔ اس معرکہ میں تین مجاہد عورتیں شہید بھی ہوئی ہیں اور سات زخمی ہوئیں۔

(ملاحظہ ہو اخبار اسٹار لندن، مورخہ 22 اپریل 1921)

رپوٹر کے ایک اور تار کو ملاحظہ کیجیے جس میں اس نے فاطمہ خانم کی جنگی مصروفیت اور عملی انہاک کا نہایت وقیع الفاظ میں اعتراف کیا ہے تار یہ ہے۔

> علاقہ اسمر میں ایک ترکی خاتون فاطمہ خانم نے کئی خواتین کی ایک پلٹن بنائی ہے جو علاقہ مذکور میں یونانیوں سے برسر پیکار ہے اور یہ پلٹن کئی مرتبہ جنگ آزما چکی ہے۔ اس کے لیے ساز وسامان حرب اور رسد وغیرہ کا انتظام بھی فاطمہ خانم ہی کرتی ہیں۔

(ملاحظہ ہو سیاست لاہور، 26 اکتوبر 1921)

یہ وہ مختصر سی روداد ہے فاطمہ خانم کی جنگی خدمات کی جو آپ نے حفظِ وطن اور بقائے مذہب کے لیے انجام دیں اور ان نہایت مختصر حالات میں اگرچہ ان ترکی خواتین کا ذکر نہیں جنھوں نے فاطمہ ممدوحہ کے ساتھ اہم کارنامے دکھلائے تاہم یہ مجاہد عورتیں فاطمہ خانم کی زیر کمانڈ دشمن کو تباہ کرنے کے لیے جو خونچکاں خدمات انجام دیتی رہیں وہ آسانی سے بھلائے جانے کے قابل نہیں۔

◆◆◆

نزہت خانم

(صدر انجمن نسواں قسطنطنیہ)

نزہت خانم ان جلیل القدر ترکی خواتین میں ہیں، جنھوں نے قومی عزت و مذہب کے حفظ و بقا کے لیے ترکانِ انگورہ کی رفاقت میں سب سے پہلے اپنی قیمتی جذبات پیش کیے۔ ممدوحہ کے حالات گو مجھے ابتدا میں لکھنا چاہیے تھا مگر افسوس کہ آپ کے حالات مجھے اس وقت دستیاب ہوئے جب میں کتاب ختم کر کے دائرہ کو روانہ کر چکا تھا۔

نزہت خانم، ایک نہایت روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ آپ 1910 میں انگورہ گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیمات عالیہ میں سپرنٹنڈنٹ رہ چکی ہیں اور وطنی خدمات کے سلسلہ میں آپ نے خالدہ خانم کے دورِ وزارت میں نہایت ممتاز خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے ترکی خواتین کو مردوں کے دوش بدوش خدمات کے لیے ابھارا۔ اس موضوع پر آپ نے تحریر و تقریر سے بہت زیادہ کام لیا۔ انگورہ میں بھی آپ عورتوں کو ایک ایسے مرکز پر جمع کرنے کی کوشش فرماتی رہیں جہاں سے وہ وطنی خدمات اور اپنے مردوں کی امداد میں زیادہ سودمند ہوں۔ وزارت معارف انگورہ آپ کی طویل اور سودمند خدمات کی بہت زیادہ معترف ہے۔

دسمبر 1922 میں نزہت خانم قسطنطنیہ میں واپس تشریف لائیں اور آپ نے یہاں کی مستورات کو ملکی وسیاسی امور میں حصہ لینے کے لیے آمادہ کرنا شروع کیا۔ آپ نے خواتین قسطنطنیہ میں تبلیغ واشاعت کے لیے متعدد تقریریں کیں۔ چونکہ ممدوحہ نزہت خانم ایک نہایت ہی پُر جوش مقرر ہیں نیز وہ سرکاری طور پر احرار انگورہ کی نظروں میں نہایت احترام وعزت رکھنے والی خاتون ہیں اس لیے انھیں قسطنطنیہ میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ سہولتیں بہم پہنچیں۔

نزہت خانم نہ صرف ترکی خواتین کو ترکی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کی ترغیب دلاتی ہیں بلکہ ملکی اور سیاسی امور میں ترکی خواتین کے ذریعہ اہم خدمات اور حقوق حاصل کرنے کی خواہش مند ہیں۔ اس لیے انھوں نے قسطنطنیہ کی تعلیم یافتہ خواتین کی ایک انجمن بنائی ہے اور چونکہ نزہت خانم خود ایک نہایت فاضل وتبحر خاتون ہیں اس لیے خواتین قسطنطنیہ نے ان کو اپنی انجمن کا صدر منتخب کیا ہے۔ اس صدارت کے بعد سے نزہت خانم ترکی خواتین کی بیداری اور ان کے حقوق کے تحفظ میں حد درجہ کوشاں ہیں۔ چونکہ ترکی قوم کو معاہدہ صلح لوزان کے بعد سے جنگ و پیکار سے سکون نصیب ہو گیا ہے اور اب ترکی مرد اندرونی اصلاح اور ملکی ترقی میں مصروف ہو چکے ہیں اس لیے نزہت خانم بھی اپنی ہم جنس جماعت کو مردوں کے برابر حقوق دلانے میں پوری سرگرمی سے مصروف ہیں اور چونکہ ترکی مدبرین نزہت خانم کی بلند پایہ شخصیت اور ذی اثر حیثیت سے اچھی طرح واقف ہیں لہٰذا ترکی گورنمنٹ بھی نزہت خانم کی موجودہ سرگرمیوں کو دلچسپی کی نظر سے دیکھ رہی ہے۔

نزہت خانم ترکی عورتوں کو سیاسی امور میں کس درجہ تک ترقی دینا چاہتی ہیں اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ آپ نے اگست 1923 کے عام پارلیمنٹری انتخابات کے موقع پر وزیر داخلہ انگورہ علامہ علی فتحی بے کو منجانب انجمن نسواں قسطنطنیہ ایک نہایت مبسوط عرض داشت پیش کی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اب کہ جنگ و پیکار کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور ملکی انصرام واصلاح کا آغاز ہو رہا ہے۔ جدید انتخابات میں ترکی خواتین کو اجازت دی جائے کہ وہ مردوں کے برابر اپنی ایک نئی انجمن کی بنیاد ڈال کر ان اہم امور میں حصہ لیں۔ نزہت خانم کی یہ عرض داشت بظاہر نہایت صاف

معلوم ہوتی ہے لیکن مصر کے مشہور عربی اخبار ''الاخبار'' نے لکھا ہے کہ وزارت داخلہ نے اس عرضداشت کو رد کر دیا۔

فی الجملہ نزہت خانم کی خدمات اور آپ کے علمی تبحر کا ترکی میں بے حد احترام کیا جاتا ہے اور آپ کی فضیلت اور بلند شخصیت کا یہ عالم ہے کہ آپ سے ترکی کے بڑے بڑے اخبارات اظہار رائے کی استدعا کرتے ہیں۔ نزہت خانم انگورہ کی قومی پارلیمنٹ میں ممبر بھی رہ چکی ہیں۔ غرض آپ کی ان گوناگوں صفات و خدمات نے آپ کو ترکی میں نہایت مقبول و ممتاز بنادیا ہے۔ اب آپ کی اس عام مقبولیت کے ثبوت میں ''الاخبار مصر'' کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جو اخبار مذکور نے قسطنطنیہ کے ترکی اخبار ''وقت'' سے نقل کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''آستانہ میں ایک نسوانی انجمن کا انعقاد عمل میں آیا ہے جس میں پچاس تعلیم یافتہ عورتیں ممبر ہیں۔ ان کی ایک انتظامی کمیٹی ہے جس کی صدر نزہت خانم ہیں اور جو آج کل ترکی گورنمنٹ کے محکمہ تعلیمات میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ نزہت خانم نے حال ہی میں اخبار ''وقت'' کے نمائندہ سے موجودہ حالات اور ترکی عورتوں کی اصلاح و ترقی کے لیے بیان فرمایا کہ:

''اس وقت جب کہ قوم کے افراد میں بڑے سے بڑا شخص اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی ملکی اصلاح و ترقی کی کوششوں میں مصروف ہے، ترکی خواتین کا اس جانب متوجہ ہونا اور کام میں حصہ لینا نہایت اہم اور سودمند ہوگا، میرا خیال ہے کہ جس ملک میں عورتیں کام میں حصہ نہیں لیتیں وہ بے نتیجہ اور ناکام رہتا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے سلطان محمود کے زمانہ سے اصلاح و ترقی کی کوشش شروع کی لیکن ہر ایک کام میں ہم کو ناکامی ہوئی اور یہ صرف اس وجہ سے کہ مردوں کے ساتھ عورتیں شریک نہیں تھیں''۔

اس کے بعد نزہت خانم نے قومی تہذیب کے مسئلہ پر توجہ کی اور اخبار ''وقت'' کے نمائندہ سے بیان کیا کہ اصلاح کی کوشش کی بنیاد جب تک وطنی تعلیم اور قومی تہذیب

پر قائم نہ ہوگی وہ ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی کیونکہ اس قسم کی اصلاحی بنیاد کبھی مضبوط نہیں
ہوسکتی اور نہ وہ تہذیب حقیقی طور پر مکمل ہوسکتی ہے جس میں قوم بہ ہیئت مجموعی شریک
نہ ہو''۔

(نجات۔23 اگست 1923)

نزہت خانم جدید ترکی سیاسی اصلاحات میں جس سرگرمی سے حصہ لے رہی ہیں اس
کے مفصل حالات نہایت دلچسپ ہوں گے جو آئندہ ایڈیشن میں بالتفصیل لکھے جائیں گے۔
انشاءاللہ تعالیٰ۔

ترک اور ترکی عورتیں

مذکورہ حالات تو بعض ان ترکی مجاہد اور تعلیم یافتہ خواتین کے ہیں، جنھوں نے نہایت محدود حاصل شدہ اطلاعات کی بنا پر قومی عزت اور مذہبی عظمت کے تحفظ میں بیش بہا قربانیاں پیش کی ہیں۔ تاہم ان نہایت ہی مختصر حالات سے اس قدر پتہ ضرور ملتا ہے کہ ترکی قوم میں اپنی عورتوں کی اصلاح وترقی اور ان کی تہذیب وتعلیم کے لیے اس وقت جو توجہ پائی جاتی ہے اور خود ترکی عورتوں میں اپنی ترقی کے جو جذبات پرورش پا رہے ہیں ان کی رفتار حد درجہ تیز اور امید افزا ہے۔ ترکانِ احرار کے سردار اور مسلمانوں کے محترم سپہ سالار غازی اعظم مصطفیٰ کمال پاشا نے ستمبر 1923 میں ایک سرکاری تقریر میں ترکی خواتین کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ترکی قوم کے خیالات کا آئینہ ہے اور اس تقریر سے ترکی طبقۂ نسواں کے مستقبل کے لیے جو رائے قائم کی جاسکتی ہے وہ نہایت حوصلہ افزا ہے۔ حضور غازی اعظم نے فرمایا کہ:

> ''سال آئندہ میں اس وقت تک وہ سب (عورتیں) آزاد ہو جائیں گی اور رسم پردہ کو دور کر دیا جائے گا۔ گو اس میں شک نہیں کہ رسم پردہ بالکل ہی مٹا نہیں دی جائے گی تاہم اس میں اس قدر سختی بھی باقی نہ رہے گی جس کی وجہ سے عورتیں بے بس اور ناکارہ ہو رہی ہیں۔ عورتوں کا آزاد ہونا اور تعلیم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے،

عورتوں کو علاحدہ کر کے صرف نصف قوم جمہوری حکومت قائم نہیں کر سکتی اس کے سوا
مردوں کو تو دیگر مشغولیتوں سے فرصت نہ ہوگی وہ ملک کی اصلاح اور انتظام میں
مصروف ہوں گے اس لیے عورتوں کو مردوں کے ساتھ کام سے روکنا اس تحریک کے
لیے مفید نہیں بلکہ ان کی شرکت قیمتی فوائد سے مالا مال ہے''۔

(ڈیلی میل، لندن)

اس قدر حالات کے بعد میں اپنی کتاب کو ختم کرتا ہوں۔ گو مجھے اپنی کتاب کے متعلق یہ
دعویٰ نہیں کہ وہ بایں ہمہ وجوہ مکمل ہے پھر بھی ہندی خواتین کے لیے اس میں عبرت و سبق آموزی
کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔

اگر خدا کی توفیق شاملِ حال رہی تو ''خواتین انگورہ'' کا دوسرا ایڈیشن نہایت شاندار ہوگا
اور موجودہ ایڈیشن میں جو شبہات باقی ہیں وہ درست کر دیے جائیں گے۔

وباللہ التوفیق

خاکسار

توحیدی

◆◆◆

زندگی

مجموعۂ نگارشاتِ فکاہی

از

ملّا رموزی

انتساب

میں اس ناچیز مجموعہ کو

ہز ایکسی لینسی سر یمین السلطنۃ راجۂ راجگان مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد دام اقبالہٗ

پیش کار و صدر اعظم باب حکومتِ سرکاری عالی

کے نام نامی و اسم گرامی سے

معنون

کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں

گر قبول افتد زہے عز و شرف

فہرست مضامین

مقدمہ

بخرام و نظر کن کہ بجولانگہِ انشاء
حورِ قلم زادہ گلستانِ ارم را
جاوید ہمی بخشد و از مایہ نہ کاہید
رشحِ قلم ثروتِ اصنافِ اُمم را
(عرفی شیرازی)

اُس خدا کے نام سے اس مجموعہ کا تعارف لکھتا ہوں جس کی خدائی اور کبریائی کی لاجوابیاں اور بے مثالیاں اربابِ عقل وفراست سے اپنی صداقت و یکتائی کو آج تک منوا رہی ہیں، جو اکیلا ہے مگر کائناتِ عالم کی ناقابلِ اندازہ مخلوق کے نازک سے نازک وجود کا بھی رازق وحافظ بنا ہوا ہے، جس کے بنائے نظامِ عالم کے اسرار کو نہ حکمائے فرنگ سمجھے نہ عقلائے عالم میں اس کی ناپیدا کنار وسعتوں کا صحیح اندازہ ہوسکا۔

اُس خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جس نے عرب کے ایک معصوم انسان کو نبوت و رسالت کی بزرگی عطا فرما کر اس میں خطاب وکلام کی اور تبلیغ وخدا پرستی کی وہ عالمگیر قوت پیدا کردی جس کی الہامی عظمت اور پیغمبرانہ جلالت ومرتبت کے آج ساڑھے تیرہ سو برس بعد تک کچھ اوپر

چالیس کروڑ مسلمان تو اس طرح معتقد و معترف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوت و فضیلت انھیں برگشتہ خیال اور گمراہ ارادہ نہیں بناسکتی اور اربوں انسان ایک ہیں جو اس کے گرامی مراتب نام کو عزت اور احترام سے لیتے ہیں اور اسے مافوق الفطرت انسان مانتے ہیں اور جس کا محبوب و پُر عظمت نام احمد مصطفیٰ محمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اُسی خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جس نے اُس گرامی جاہ نبی کے اہلِ بیت اور اولاد میں وہ جلیل العظمت وجود پیدا کیے ہیں جن میں سے ہر ایک نے صداقت اور خدا پرستی کے اعلان و تبلیغ اور ظالموں سے مظلومین کی نجات و انصاف کے لیے جنگ و مقابلہ آرائی، انسانی نخوت و کبریائی اور غرور و سرافرازی کی تمام شیطانی قوتوں کو برباد و برہم کرنے کے لیے وہ کوششیں کیں جن کی مثال و نظیر سے انسانیت کی پر جلال تاریخ یکسر خالی ہے اور خالی رہے گی اور انھیں میں سے ایک ایسا عظیم القدر وجود پیدا کیا جس نے میدانِ کربلا میں خدائے یکتا کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط کی حفاظت و صیانت کو عربی اور فوجی قوتوں کے بل پر توڑ دینے والوں سے وہ خوں ریز اور صبر آزما مقابلہ کیا جس کی شجاعت و ہمت آزمائی کا جواب پیش کرنے سے بہادرانِ عالم کے کلیجے منہ کو آتے ہیں اور جس کا جلالت اندوز نام حسینؓ ابن علیؓ ہے (رضی اللہ عنہم)

اُسی خدا کے نام سے جس نے خلفائے اربعہؓ و صحابۂ رسول کو جہاد و مقابلے کے ساتھ ساتھ اصولِ جہانبانی و سیاست آگاہی معارف و حکمت اندوزی اور اخوت و برادری کی وہ دلنواز صلاحیتیں اور مقدرتیں عطا فرمائیں کہ آج بھی کوئی آئے اور ان کی پیروی کرکے آفتاب شہرت و سربلندی بن جائے اور نہ فقط یہ بلکہ دل چاہتا ہے اور بہ دلائل چاہتا ہے کہ دماغ و قلم کی جتنی مدحت گستر قوتیں حاصل ہوں انھی ناموں کی توصیف و تمجید میں صرف کرتا چلا جاؤں کہ یہی تو وہ ہیں جن کے نتائج عمل کے لایزال و لم یزل مدار پر دنیائے انسانیت گردش کرنے پر دیکھ لینا ابد تک مجبور رہے گی۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اب ان برتر از کائنات ناموں کا غلام ملا رموزی اپنی اس مقدرت پر کیوں نہ فخر کرے کہ اس کے قلم کو خدا نے ''نوحۂ زندگی'' اور کسی مولوی کے ''قیامت نامہ'' ہونے سے نہ فقط بچالیا بلکہ اس کے قلم کو خدائے عالم آفریں نے حسنِ قبول سے یوں مزین فرمایا کہ وہ انسانوں کے ستائے

ہوئے انسانوں کوغم وافسردگی یاس ونومیدی اور دردواذیت سے بچا کر سرور وشادمانی مسرت وزندہ دلی کے ولولہ سے معمور کر کے انھیں عرصۂ حیات وعمل میں پھر خوش خوش لے آئے۔

امابعد! اس قسم کے قلم ودماغ والے ملا رموزی نے جب مشق سخن کا سلسلہ شروع کیا تو یہ وہ وقت تھا جب زبانِ اردو میں لطیف تحریریں خواجہ غریب نواز کے عرس والے پلاؤ کی طرح ''تبرک'' سمجھی جاتی تھیں۔ یعنی اردو میں ہنسانے والے کم تھے اور رُلانے والے زیادہ۔ جو ہنسانے والے تھے بھی تو وہ ''قحط النظر فاء'' کے باعث خود کو کچھ اس درجہ بھی عالیشان اور عالی مقام بنائے ہوئے تھے کہ ان کی ایک ایک سطر عوام وخواص میں غفراں مکان حکیم اجمل خاں صاحب کے ''مجربات'' سمجھے جاتے تھے اور لوگ ان تحریروں کو اپنے خواجہ حسن نظامی کے تعویذ کی طرح گلے میں لٹکائے پھرتے تھے۔ اب جو ان کے سامنے یہ چھوٹا سا ملا رموزی پیدا ہوا تو آنکھیں کھولتے ہی اس کے سامنے وہ افسردہ اور رُلانے والا ماحول تھا جسے سیاسی اصطلاح میں ہنگامۂ دار وگیر کہتے ہیں یعنی جنگ فرنگ پس یہی وہ وقت تھا جب دنیا جرمنی کی 75 میل والی توپ سے خوفزدہ ہو کر کانپ رہی تھی تو ہندستان کی تحریری دنیا پریس ایکٹ نام کے قانون کے منہ میں تھی، اس لیے محال تھا کہ کام کے آدمی حد ادب سے زیادہ ہمت اور حوصلے سے کام لیتے، اس لیے تاؤ کھا کر ملا رموزی نے بھی ''گلابی اردو'' کے نام سے وہ طرزِ تحریر وخطاب اختیار کیا کہ اچھے اچھے مرگئے مگر نہ سمجھے کہ یہ کیا ہے۔ البتہ سی۔ آئی۔ ڈی والوں کو بتادیا تھا کہ بھیا گھبراؤ نہیں یہ ایک میرا سیاسی مشن ہے تاکہ مصائب زدہ اربابِ کار کو ہمت ہو اور انھیں رونے کا خیال نہ آسکے۔

اب وہ زمانہ بھی گزر گیا۔ جنگِ فرنگ کی بلا بھی یہہ کہہ کر ٹل گئی کہ ہر گیارہ نومبر کو دو منٹ تک گول رہا کرنا ورنہ پھر لوٹ آؤں گی، اس لیے اب وقت آیا تھا کہ کچھ کرتے کہ ناگاہ وہ ''بقاء خلافت'' ایسا مقدس ومحترم معرکہ شروع ہوگیا۔ لہٰذا اب ملا رموزی پھر گلابی اردو اور کچھ غیر گلابی اردو بنا رہا تھا کہ اربابِ عمل پڑھتے چلے جائیں اور رونے کا خیال وتصور بھی نہ کریں۔

اب یہ دور بھی گزر گیا اور اب ہندستانیوں کے لیے کوئی خاص کام نہ رہا تو وہ باہمی ہاتھا پائی پر اُتر آئے یعنی دہلی کے بنی محمد علی شوکت علی بولے کہ جتنا زور باقی ہے اسے جزیرۃ العرب کی حفاظت پر صرف کردو۔ بمبئی کے بنی جُجنہ اور بریلی کے بنی رضا خاں کہتے تھے کہ دماغ وقلم کی ہر

قوت قبوں اور قبروں کی حفاظت پر یوں صرف ہو کہ قبے رہ جائیں اور عرب کے بے شمار مسلمان فنا ہو جائیں۔ ہندوؤں کے بنی اسرائیل کہتے تھے کہ سب چھوڑ دو اور صرف انگریز بھائیوں کا مارے طمانچوں کے منہ لال کر کے کہو کہ ہندستان ہندستان کو دے دو، مگر قادیان اور پنجاب کے تمام قبائل اس امر پر متفق تھے کہ انگریزوں کو خراج دیے جاؤ اور فدوی بنے رہو۔

ابھی یہ ہو رہا تھا کہ لندن سے آئے ماسٹر ماٹیگو اور دہلی سے اُٹھے لارڈ چیمسفورڈ اور کہا کہ یہ بھی جانے دو اور ہمارے کہنے سے آپ 35 کروڑ ہندستانی دس برس تک اپنا نام ''اسمبلی'' اور ''لیجسلیٹیو کونسل'' رکھ کر دیکھو پھر کیا ہوتا ہے؟ مگر گاندھی صاحب کے بنی کھدر اور بنی چرخہ بولے کہ جو کونسل میں جائے اس کا پانی بند۔

اب جو ملا رموزی نے ہندستانیوں کی یہ باہم آویزی دیکھی تو اس غریب نے سب کچھ چھوڑ کر ہندوستانیوں کا ''ہوم ڈپارٹمنٹ'' سنبھال لیا اور طے کر لیا کہ ان غلامی کے مارے ہوؤں اور غلط تعلیم و تربیت کے ستائے ہوؤں کی اخلاقی اور داخلی اصلاح جب تک نہ ہو گی ان کے فرشتے بھی دنیا میں کامیاب نہ ہوں گے اس لیے اب اس نے خطاب و کلام کا وہ طرز اختیار کیا جسے سلیس اور مروجہ اردو کہتے ہیں۔ پس اس طرز کا پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ اب ملا رموزی کی بات کو وہ گورمیٹے بھی سمجھنے لگے جو انگریزی تعلیم کی وجہ سے گلابی اردو کی عربی فارسی مصطلحات کو اپنے اپنے والدین تک سے دریافت کرتے تھے مگر نہیں سمجھتے کیونکہ آج کل کے والد صاحب صرف انگریزیے ہوتے ہیں عربیے اور سنسکریتیے نہیں اور دہلی کے ایک جلسے میں تو یہ اعلان بھی ہو گیا ہے کہ اب والدائیں بھی انگریزی میں تیار ہوا کریں گی۔ پس اب جو اس طرز تحریر کو اختیار کیا تو ہندستانیوں کی اخلاقی اجتماعی اور داخلی زندگی کے جو عجب عجب تجربے اسے حاصل ہوئے ان میں سے اکثر تو مضامین رموزی کے نام سے شائع ہو چکے۔ البتہ ایک خاص تجربہ آج سن لیجیے۔

یعنی ہندستانی غلامی کے جس شدید اور طویل دباؤ میں ہیں اس نے نہ فقط ان کے لباس، زبان، رسوم، مذہب اور عام حالات کو کچھ سے کچھ بنا کر رکھ دیا، بلکہ ان کے دماغ و شعور کی قوتوں کو بھی روند ڈالا اور اب وہ ہر اوندھے کو سیدھا اور ہر سیدھے کو اوندھا سمجھنا ہی دلیل ہوشمندی قرار دینے لگے اور کسی ایک جگہ نہ شرمائے۔ چنانچہ ہر قوم اور جماعت کے آداب زندگی اور اصول حیات

میں دماغی اور عملی تفریح نہ زندہ دلی، خوش دلی وخوش باشی، مزاح وظرافت از بسکہ حصہ ٔ زندگی قرار دیا گیا ہے، لیکن ہندستانی عقلا وعلما جو اٹھے تو انھوں نے ان تمام باتوں کو حرام، چھچھوراپن، ہزل و بیہودگی، بے تمیزی اور لونڈاپن ثابت کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ اٹھا لو لکھنؤ کے منشی نولکشور صاحب کی چھاپی ہوئی کتابیں ہر جگہ یہی لکھا ہوگا کہ ہنسی مذاق اور ظرافت کی باتوں سے آدمی کا وقار ضائع و زائل ہوتا ہے۔ لہٰذا اب جو عالم و واعظ اٹھا اس نے خشک منہ بنا کر رونا شروع کر دیا، جاہلوں نے جو دیکھا کہ عالم صاحب کھڑے رو رہے ہیں تو ان کے ہاں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے کی کون سی کمی تھی، اس لیے آن کی آن میں لکھنؤ سے تا بہ دہلی سینکڑوں ماتم خانے تیار ہو گئے اور آخر کار تاؤ کھا کر مولانا حسرت موہانی بی۔ اے کو کہنا ہی پڑا کہ:

غزل کا نام ہزل رکھ دیا ہزل کا غزل
جو چاہے آپ کا علم وقار ساز کرے

چنانچہ صوبہ جات متحدہ اور دہلی کے ارباب قلم کے خشکی اور افسردگی، سوگواری اور آہ وگریہ انگیزی پر اردو میں جو ذخیرہ جمع کیا ہے شاید ہی کسی دوسرے صوبہ کو یہ ماتمی سعادت حاصل ہوئی ہو اور تو اور اردو کے خدائے سخن اور رجز نگاری کے استاذ الاساتذہ حضرت گرامی انیس مغفور کے تیغ آزما اور صف شکن مضامین کو یاروں نے گومتی میں ڈبا کر صرف اتنے حصہ کا نام مرثیہ رکھ لیا کہ:

ہائے مرے ہائے مرے

غرض اودھ سے لے کر دہلی تک جدھر دیکھیے مرثیے کے مرثیے ہیں کہ چھپ رہے ہیں اور بک رہے ہیں۔ یہی حال دہلی میں "نوحہ زندگی" اور "یتیموں کی آہ" کا ہوا کہ جس طرف جایئے ایک آدھ بیوہ یا ایک آدھ یتیم کتب فروش کے ہاں کتاب بنا ہوا بیٹھا نظر آئے گا۔

کچھ شک نہیں کہ یہ ذخیرہ تحریر اسلامی سلطنت کے ہندستان سے مٹ جانے کا وہ افسردہ کن ردعمل تھا جس نے اُس وقت کے عیش پسند دماغوں کو اپنے عیش وعروج کو یاد دلا کر متاثر بلکہ ماؤف بنا دیا۔ انگریز بھائیوں نے چھ سات ہزار میل دور سے آ کر جس دلیری اور حوصلے سے ہندستانیوں کے لٹھ رسید کیا تھا اُس کے جواب کے تصور تک سے بھائیوں کو کھانسی کی شکایت ہو جاتی تھی، اس لیے اب یہی رہ گیا تھا کہ عہد رفتہ کی یاد میں سوگواری اور غم و افسردگی کے مراد آبادی لوٹے

بن کر بیٹھ گئے جنھیں وضو کے لیے نمازی ہی اٹھا کر اِدھر سے اُدھر رکھ دیں باقی سب خیریت، مگر کسی کو ہوش نہ آیا کہ میدانِ مقابلہ میں شکست کھائی ہوئی قوم کو مرثیوں، نوحوں اور فریادوں سے دور رکھ کر اس کے اندر جوش وخروش، مسرت وخوش دلی اور تفریح وتفنن کے ولولوں کو پیدا کر دینا ہی اس کی رہی سہی زندگی کا سہارا ہو سکتا ہے، مگر ہوا یہ کہ یاروں نے اسی ماتمی خطاب وکلام کو ادب اردو کا حصہ قرار دے کر جو فروغ دینا شروع کیا تو خدا کی پناہ یہاں تک کہ چند بالکل ہی عجیب وغریب "خسکوں" نے اس حصۂ تحریر دکلام میں ایک نہایت ہی اچھوتی ترکیب ایسی ایجاد کی کہ زبان اعتراض وطعن ہی گنگ ہو کر رہ جائے یعنی یہ ایجاد ہے نظمِ اردو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر قوم کے لیے فریاد کرنا اور آنسو بہانا اور اس حصۂ شعر کا نام کسی نے "سلام" رکھا تو کسی نے مناجات۔ چنانچہ اس قسم کے ماتم گساروں سے آج علم وترقی کا یہ زمانہ بھی محفوظ نہیں جیسا کہ ذیل کے تازہ نمونوں سے ظاہر ہے۔ مثلاً یوپی کے ایک سیماب صاحب ایسے شاعر ہیں جو شعر گوئی، اصلاح شعری واصلاح شاعری، اُستادی، اخبار نویسی، غرض قیادت ورہنمائی کی ہر عزت وعظمت کو اپنے اسم شریف کے ساتھ لٹکتا ہوا پا کر بہت مسرور ہوتے ہیں، لیکن مسلمانوں میں موت نما افسردگی پھیلانے اور رسولِ گرامی جاہ ایسی صاحبِ علم ووقار ہستی کی جلیل القدر امت کو پستی اور خرابی میں پا کر اسے اٹھانے اور بڑھانے کا بندوبست نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر سے یوں کراتے ہیں:[1]

مبارک آپ کو یہ اوج و رفعت کی فراوانی
مبارک آپ کو خورشید عظمت کی درخشانی

مسلم بے یار اور بے چارہ ہے
عبرت افروز اُس کا نظارہ ہے
ہے دامنِ مرحمت کا سایہ درکار
کملی والے کی قوم آوارہ ہے

1۔ دیکھو اخبار تاج آگرہ، مورخہ 21 اکتوبر 1930، صفحہ 9، کالم نمبر 1

ایک آسمانوں سے اونچے عزت والے نبیؐ اور اس کی تمام امتوں سے بلند مرتبہ امت کی شان میں آخر کا مصرعہ غور سے ملاحظہ فرمایئے۔ اناللہ۔

آپ کے بعد یو پی کے ایک نہایت درجہ ممتاز اخبار کے رسول نمبر بابت 1930 سے ایک نمونہ اور ملاحظہ ہو جو اعجاز حسین صاحب علوی کاکوروی کے رشحات خیال وارادت ہیں:

اے ختم رسلؐ فخر بشر شاہ دوعالم
محبوب خدا زیب دہ عرش معظم
ہم سے کیا اقبال نے دولت نے کنارا
حکمت نے حکومت نے اور عظمت نے کنارا
عزت نے فتوحات نے جرأت نے کنارا
الطاف و کرم خلق و اخوت نے کنارا
مظلوم ہیں بیکس ہیں زمانے کے ستائے
دشمن نظر آتے ہیں ہمیں اپنے پرائے
جتنے کہ ستم ہم نے تہ چرخ اٹھائے
دشمن کو بھی اللہ نہ وہ رنج دکھائے

یہ وہ حقیر نمونہ ہے جو اس قسم کے ہزاروں اشعار سے لیا گیا ہے جو آئے دن ذی علم سے ذی علم اخبار نویس اپنے صفحات پر شائع فرماتے رہتے ہیں، مگر کبھی نہیں سوچتے کہ تم جس عالی مراتب نبی کی شان میں یہ کہہ رہے ہو وہ اس کی تعلیمات کی نہ فقط خلاف ورزی بلکہ توہین ہے ورنہ بتاؤ کہ کیا پہاڑوں سے اونچے غم والم کے عالم میں بھی رسولِ اقدس علیہ السلام نے چیخ کر رونا، بین کرنا اور ہر وقت آہ وزاری کرنے کو کسی جگہ ضروری، جائز اور مفید قرار دیا ہے؟

آہ! اُس باوقار وصاحب عظمت نبیؐ نے تو اپنے ہاں کے گنواروں تک کو یوں سنوارا تھا کہ باید وشاید۔ چنانچہ خدا مسرور اور کامیاب رکھے قبلہ استاد محترم مولانا انوارالحق صاحب بھوپالی کو جنھوں نے عین وقت پر مجھے قطعہ عطا فرمایا۔ سنو ایک عربی گنوار حضور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے انتقال کے موقع پر ان کے صاحبزادے کے پاس جا کر تعزیت کا فرض ان الفاظ میں ادا کرتا ہے کہ:

اصبر نکن بک صابرین فانّما
صبرالرعیّۃ بعد صبرالرّاسِ
خیرٌ من العبّاس اجرک بعدہٗ
واللّٰہ خیرٌ مِنکَ للعبّاسِ

(احیاءالعلوم از امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ)

ترجمہ سنیے وہ کہتا ہے کہ اے عباس رضی اللہ عنہ کے بیٹے آپ صبر کیجیے تا کہ آپ کے صبر سے ہم صبر کرنا سیکھیں۔ اس لیے کہ رعایا کا صبر اپنے سردار کے صبر سے پیدا ہوتا ہے، عباس کے بعد ان سے بہتر تمھارے صبر کا وہ اجر ہوگا جو خدا تمھیں دے گا۔ اور عباس کے حق میں اب تم سے بہتر اُن کا خدا ہوگا۔

دیکھی آپ نے رسولِ عرب و عجم صلعم کے غلاموں کی شاعری اور ہمت اور حیات افروز تلقین؟

اس قسم کے شعرا کے بعد اردو میں خشکی اور افسردگی پھیلانے والے چند اسباب اور بھی ہیں جن میں واعظوں کے قیامت ناموں کے ساتھ ساتھ چند پرانے اساتذہ بھی ہیں جن کے خیال میں تلامذہ کو استاد کے سامنے یا استاد کے ذریعہ بجز متانت، سنجیدگی عرف افسردگی اور خشکی کے کسی ایسی تحریک، تحریر اور گفتگو سے فائدہ اٹھانا ممنوع تھا جس سے مزاح و تفریح طبع کا کوئی اثر پیدا ہو۔ اسی لیے دیکھا ہوگا کہ پرانی درسگاہوں میں داخل ہوتے ہی ایک نوجوان طالب علم پر بھی عالمانہ قسم کی خشکی نمودار ہو جاتی ہے اور وہ خواہ مخواہ متانت کے عین قاف کو بڑے مولویانہ تکلف سے ادا کرتا نظر آتا ہے۔

خشکی اور افسردگی کو بڑھانے والا اسی قسم کا ایک طبقہ صحافتِ اردو میں موجود ہے یعنی حماقت سے یہ سمجھ لیا گیا کہ مزاحی تحریریں بھی عالمانہ وقار و سنجیدگی کے حق میں مضر ہیں اس لیے بعض رسالوں اور اخباروں نے ایسی تحریروں سے گریز اختیار کی اور طرف یہ کہ عوام و خواص میں خشک رسالے اور خشک اخبارات ہی صحافت کا بلند معیار قرار پا گئے۔

اس کے بعد اردو میں لطیف تحریروں کی قلت کا سبب لطافت نگاروں کا وہی قدرتی فقدان

ہے جس پر میرا یہ خیال صحیح ہو جاتا ہے کہ ہندستانی شاید فطرتاً ہی عبوس وخشک پیدا ہوتے ہیں ورنہ کیا قیامت ہے کہ اتنی طول طویل اردو میں اتنے چھوٹے سے چند ملا رموزی پیدا ہوئے کہ جب چاہو انگلیوں پر گن لو اور بس۔

اس کے بعد اردو سے امرا اور دولت مندوں کی نفرت اور دوری بھی اردو میں لطائف نگاروں کی قلت کا باعث ہے اور وہ اس طرح کہ ہندستان کے امرا اور دولت مند یورپ والوں سے جتنے مرعوب اور متاثر ہوئے ہیں اس کا جواب نہیں، اسی لیے ان کے ہاں یورپ والوں کے ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی نقل جس قدر جلد کی جاتی ہے کسی دوسرے طبقہ میں نہیں اور کیا یہ امر مرعوبیت کا زندہ ثبوت نہیں کہ یہ آج بے چارے غیروں کی چیز سے واقف ہیں اور اپنی چیزوں سے یکسر بے خبر اسی لیے یہ جو اخبار ''پائنیر'' اور ''ٹائمس'' کے خریدار ہوئے تو اپنی مادری زبان کے اخبار ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' کو کنجڑوں اور تانگے والوں نے خریدنا شروع کر دیا اور اسی حالت میں اردو کی ہر چیز قدر افزائی اور حوصلہ افزائی سے محروم ہو کر افسردہ ہوگئی اور کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اردو کے متعدد لطافت نگار کسب معاش کی دماغ سوز تکالیف اور پابندیوں میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے علاحدہ ہوگئے اور اردو ان کے جواہر دافکار سے کوئی حصہ حاصل نہ کر سکی۔ خود صحافت اردو امراء اور دولت مندوں کی اس بے خبری سے آج ہو رہی ہے۔ کیونکہ غیر کی حکومت ہونے پر اپنی ہر قومی اور ملکی چیز کی زندگی امراء وطن ہی کی سرپرستی کی محتاج تھی لیکن جب ان کے مطالعہ کے لیے پائنیر آنے لگا تو اب یہ اردو کے ایک ملا رموزی سے بھی واقف نہیں۔ نہ ایک اخبار کے یہ سرپرست اسی لیے خود صحافتِ اردو اپنے لطافت نگاروں کی امداد و حوصلہ افزائی سے قاصر رہی۔

امرائے وطن کی اپنی ملکی وقومی اور مادری زبان سے اس بے دیانتی اور غداری ہی نے اردو کی انجمنوں اور اصحابِ تصنیف و عمل کو مضمحل بنا دیا ورنہ اگر غیر ملکی حکومت اردو کی سرپرست نہ تھی تو امداد ملنے پر یہ اردو کے مولوی عبدالحق اور مولوی سید سلیمان ندوی ہی وہ تھے کہ اچھے اچھے انگریزوں سے اردو ہی میں نام لکھوا کر چھوڑتے، مگر داد دیجیے امرائے ہند کی اس روشن خیالی کی کہ وہ لندن ٹائمز سے اپنی چسپیدگی ہی کو ترقی سمجھے بیٹھے ہیں اور انھیں خبر نہیں کہ اردو میں ملا رموزی کسی لطافت نگار کا نام ہے یا اس نام کا کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

تو اب گویا اردو کی حیات و موت کا معاملہ صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جنھیں عوام یا غربا کہتے ہیں۔ لہٰذا علمی نقطۂ نظر سے ان بے چاروں میں وہ ابتدائی چیز ہی ''ندارد'' ہے جسے لیاقت یا صلاحیت کہتے ہیں۔ پھر اس پر طرفہ مصیبت فطری بدمذاقی، لہٰذا اب جو اردو میں بدتمیزیوں اور بے وقوفیوں کا سیلاب آیا تو بے چارے انگریز بند باندھتے باندھتے تھک ہی گئے مگر بدمذاقی ہے کہ اردو میں موج اندر موج بڑھتی چلی آتی ہے۔ چنانچہ دور نہ جایئے آج کل ہی کے اخبارات اور رسالے اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ ان میں کیسی کیسی لطافت نگاریاں شائع ہوتی چلی جارہی ہیں۔ پھر داد دیجیے کہ چھاپنے والے دوسرے چھاپنے والوں پر تو اعتراض فرماتے ہیں کہ تو اخبار والا نہایت بازاری ظرافت کو شائع کرتا ہے مگر خود نہیں دیکھتا کہ میں ''اخبار والا'' خود کتنی ذلیل ظرافت کو شائع کررہا ہوں۔

اب ان شائع کرنے والوں کے بعد ان کے خریداروں کی خوش مذاقی تو کچھ اتنی بھی اچھوتی دولت ہے کہ مل جائے تو ذی علم انسان مارے وحشت کے کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف بھاگتا نظر آئے لہٰذا ان خریداروں میں لطافت نگاروں کے لیے کوئی معیار ہے نہ امتیاز اس لیے انھیں ملا رموزی کی تحریر پڑھ کر سناؤ تو یہ مارے ہنسی کے بے خود ہوجائیں گے اور ایک انگریزی کی اَنمل بے جوڑ تحریر سناؤ تو یہ اُتنے ہی زور سے قہقہہ فرمائیں گے یا پھر یہ ہوگا کہ نہ ملا رموزی کی تحریر سے خوش نہ مولانا سالک کے افکار و حوادث سے مسرور اب فرمایئے کہ ایسوں کو میں مرثیہ میر انیس نہ کہوں تو خوش مذاق کس طرح کہہ دوں؟

ان کے بعد اردو میں لطیف تحریروں کی قلت کا باعث خود اردو کی اہلِ قلم برادری ہے یعنی اس برادری کا دیگر احوال ہی سب سے جدا ہے۔ مثلاً اس کے ہاں بھی ہندو مسلم فرقہ پسندی کی ایک شاخ موجود ہے یعنی جو جماعت ملا رموزی کی تحریر کو پسند کرتی ہے وہ قیامت تک مولانا سالک کی تحریر کو آگے نہ بڑھنے دے گی او جو سالک کی تحریر کی عاشق ہے وہ ملا رموزی کی تحریر کو ذلیل ثابت کرنے پر تلی رہے گی۔ چنانچہ اس امر کا ثبوت وہ مضامین ہیں جو ایک دوسرے کے مضامین کو حقیر و ذلیل ثابت کرنے کے لیے اخباروں اور رسالوں میں آئے دن تنقید اور ریویو کے نام سے شائع ہوکر لکھنے والوں کے دل جلاتے رہتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ معترضین کے ہاں

اصل تحریر سے بحث نہیں بلکہ جانب داری اور لکھنے والے آدمی سے بحث رہتی ہے پھر وہ بھی اس صلاحیت اور شائستگی کے ساتھ کہ اگر اُس طرف سے لکھا گیا کہ ابے تو کیا جانتا ہے تو وہ جواب تنقید ہی نہیں جس میں اس طرف سے یہ نہ کہا جائے کہ اب تیرا باوا کیا جانتا تھا جو تو مجھ سے سوال کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اب اردو میں لطیف تحریروں کے فقدان کا سب سے آخری سبب خود اصل لطافت نگار ہیں۔ یعنی ان کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ بے غیرت ہی ہیں جو ہنسا کر دل و دماغ کی مردہ قوتوں کو بیدار کرتے رہتے ہیں ورنہ خود ان کے حق میں ان کا ماحول اور ان کا خاندان ہی وہ مصیبت ہوا کرتا ہے کہ جس کے اندر سے سو ماتم خانے تو پیدا کیے جاسکتے ہیں مگر ہنسی کی ایک آواز پیدا نہیں ہوسکتی مگر پھر ہیں کہ لطیف تحریر لکھنے پر مرے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک لطافت نگار اور ہنسا کر بے خود بنا دینے والے کی فراغت اور دماغی مسرت کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب جمع ہو کر زندہ قوم کے زندہ دل چارلی چپلن کے پاس تو چلی گئی ہیں، مگر اردو کے کسی ظرافت نگار کے ہاں نہیں۔

اماں وہ اور تو سب کچھ جانے دیجیے میرے خیال میں اردو کے ایک ایک ظرافت نگار کی بیوی ہی کی خبر منگا لیجیے کہ وہ اپنے خوش دل و خوش دماغ شوہر کے حق میں سکون و مسرت کا باعث ہوتی ہے یا مصیبت و بد مذاقی کا پہاڑ؟ چنانچہ قسم لے لیجیے جو اردو کے ایک لطافت نگار کے خاندان میں پورا کا پورا خاندان اس کی لطافت و ظرافت کا یکساں قدر شناس ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ہر خاندان میں اسی کو خوش دل اور لطافت نگار مانا جاتا ہے جو کہیں کا افسر ہو اور ایک کوٹھی اور موٹر کا مالک ہو۔ ان خاندانوں میں آپ ظرافت و زندہ دلی کے آسمانی نکتے ہی کیوں نہ بیان فرما دیجیے کوئی کان بھی نہ دھرے گا۔ لیکن اگر آپ غلامی کے غلام عرف ملازمت پیشہ بن کر کسی دفتر کے افسر ہو کر موٹر میں بیٹھ کر گھر میں آ گئے تو سارا خاندان ہے کہ آپ کی لیاقت کا قائل بنا ہوا آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ یہی تو راز ہے کہ ملا رموزی میں اور ان کے ننھے میاں کی والدہ میں اسی وقت مسرت، خوش طبعی، زندہ دلی اور ظرافت نظر آتی ہے جب ملا رموزی اُنھیں یقین دلاتا ہے کہ وہ یکم دسمبر 1934ء سے فلاں محکمہ کا افسر ہو جائے گا اور علاوہ پانچ سو روپیہ تنخواہ کے موٹر بھی سواری میں ہوگا۔ پھر بتائیے کہ وہ

بدنصیب ظرافت نگار کیا لکھے گا جس کے گھر کا بچہ بچہ افسری خواہ اور موٹر پرست ہو۔ پس اس حساب سے اگر آپ اردو کے لطافت نگاروں پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اردو میں لطیف تحریروں کی قلت کا باعث کیا ہے۔

اب ان حالات کے بعد بھی اگر ان آنے والے مضامین کے اندر آپ مصروف ہو کر اپنے رنج وغم یاس وافسردگی کو بھول کر کچھ دیر لطف حاصل فرمالیں تو یا ہاتھ اٹھا کر ملا رموزی کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں یا بذریعۂ منی آرڈر کچھ نقد ورنہ زیور ہی سہی۔

ملا رموزی

یکم جنوری 1933

بھوپال

اپنے علی گڑھ کالج کا مشاعرہ

دنیا کے تمام علی گڑھوں میں اپنا کالج والا علی گڑھ بھی غنیمت ہے۔ کیونکہ اس کے نام سے مسلمانانِ ہند میں طب یونانی، انگریزی ڈاکٹری، بیرسٹری، ایڈیٹری، لیڈری اور ڈپٹی کلکٹری کے تمام علوم زندہ ہیں صرف ذرا دینیات کا معاملہ زیرِ غور رہتا ہے اور علوم و معارف پسندی کی یہ اُسی علی گڑھیانہ مستعدی کا حاصل ہے کہ یہاں ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ زبانِ اردو کی اصلاح و ترقی کی اغراض سے منعقد کیا جاتا ہے۔ البتہ ڈاکٹری اور طبی حلقوں میں یہ سوال ہے کہ یہ مشاعرہ آخر شدید جاڑے کے موسم میں کیوں منعقد ہوتا ہے؟ یا یہ کہ جب یہ مشاعرہ ہوتا ہے تو جاڑا شدید کیوں ہوجاتا ہے؟ کالج کے پرنسپل سے لے کر جملہ طلبا اس مشاعرہ کے محرک و موید ہوتے ہیں مگر تائید مزید کے طور پر خدا نے مولانا احسن صاحب مارہروی کو جب سے اس کالج میں بھیج دیا ہے اُس وقت سے آپ کی ''ذات مشاعرہ صفات'' سے اس میں اور بھی شرکت پیدا ہوگئی ہے۔

اس مشاعرہ میں ہندستان کے ہر شہر، ہر ضلع اور ہر قصبہ سے شعرا تشریف لاتے ہیں اور اس سال ادبا بھی تشریف لایا کریں گے۔ ارکانِ مشاعرہ کی طرف سے خواہش مند شعرا کو مصارف سفر بھی دیے جاتے ہیں اور تا یومِ قیام چائے اور طعام بیرونی شعرا کو بشرطیکہ وہ ''خوش گلو'' ہوں طلبا

بھی چائے کی دعوت دیتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر عزیز طلبا اور محترم پروفیسروں کی ایک جماعت استقبال کے لیے بھی موجود رہتی ہے پھر جب شاعر صاحب قیام گاہ پر پہنچ جاتے ہیں تو اس وقت سے واپسی تک ان کے آس پاس ایک جماعت ایسی بھی رہتی ہے جو ان کے ہر فقرہ پر سبحان اللہ ماشاءاللہ، جی بہت اچھا، حاضر ہوا، سگریٹ تو ملاحظہ فرمایئے، پان ملاحظہ فرمایئے، آرام سے بیٹھیے، ذرا سو جایئے، یہ لیجیے تکیہ، کیا غسل کیجیے گا، تو ذرا یونیورسٹی ہی ملاحظہ فرما لیجیے کی وہ خدمت انجام دیتی رہتی ہے جس کا تذکرہ میزبانی کے سلسلے میں کیا ہی نہیں جاتا حالانکہ یہی وہ سب سے بڑی قربانی ہے جو علی گڑھ کالج کی طرف سے مہمان شعرا کے لیے کی جاتی ہے اور حضرت محترم پرنسپل صاحب کے ایک خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی مہمان بیمار ہو جائے تو اس کے لیے گل بنفشہ، عناب، تخم خطمی، گاؤ زبان در آب تر کردہ مالیدہ، ہمراہ خمیرۂ عنبری بھی بہم پہنچایا جاتا ہے اور آخر میں ایک فوٹو بھی کھینچ دیتے ہیں اور ان کی غزلوں کو بہ اہتمام مولوی محمد مقتدیٰ علی خاں صاحب شیروانی ایک کتاب میں چھاپ دیتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی بے شمار مراعات علی گڑھ کالج کی طرف سے اس لیے اور محض اس لیے ہیں کہ ادب اردو یا زبان اردو میں حصۂ نظم ترقی پائے اور یہی وہ دیرینہ مراعات و خدمات ہیں علی گڑھ کالج کے ارکان اور طلبا کی جن کے سایہ میں پل کر ظفر علی خاں، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، اقبال احمد سہیل اور شوکت علی خاں فانی ایسے سخن سنج و سخنور جوان ہوئے ہیں۔

علی گڑھ کالج کی ان ادبی خدمات و تحریکات کے سلسلہ میں 1927 سے ایک لائق تعریف ہستی کا اضافہ ہوا ہے اور وہ شہریار اسلام تاجدار بھوپال نواب محمد حمید اللہ خاں بہادر بی۔ اے علیگ دام اقبالہ کے برادر زادہ عالیجناب نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ ہیں جو بہ سلسلۂ تعلیم علی گڑھ میں داخل ہوئے ہیں۔

ممدوح محترم نے اپنے عالی منزلت خاندان کی اُن علمی و ادبی روایات کو ایک ''حیات تازہ'' بخشی ہے جو علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور جن کے سرپرست نواب زادہ

ممدوح کے اسلاف ہیں۔ چنانچہ 1927 ہی سے آپ نے کالج کے اس مشاعرہ میں محض شعری تشویق وتحریص کے لیے ایک گراں قدر ''انعام'' مقرر فرمایا ہے۔ اس سال آپ کے برادر معظم نواب زادہ کپتان محمد سعید الظفر خاں بہادر (بھوپال) اور آپ کے محترم استاد حضرت محمد عبدالمجید صاحب قریشی ایم۔ اے کی طرف قریشی سعید الظفر خاں ترانی کے نام سے منسوب ہے اور یہ نواب زادہ گرامی ہی کی ادب نوازی ہے جو ملا رموزی صاحب کا علی گڑھ والوں سے اتحاد واقع ہوگیا۔

---

28 نومبر 1928 بکری، فصلی کو حضرت محترم مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی صدر مجلس شرقیہ، ادبیہ علی گڑھ کالج کا مطبوعہ گرامی نامہ آہی تو گیا۔ لکھا تھا سالانہ مشاعرہ ہے ضرور آیئے دیکھیے بھول نہ جایئے گا باقی سب خیریت ہے۔ خرد وکلاں کو درجہ بدرجہ المکلف احسن پریذیڈنٹ اورینٹل سوسائٹی انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اس عبارت کا پڑھنا تھا کہ فطری نقادی میں اُبال آہی تو گیا اور کہنی کے سہارے سر کو لگا کر پورے غصہ سے سوچا کہ دیکھیے اس ادبی مجلس کے ادبی اذن میں جب المکلف صاحب کا پتہ اس قدر دبیز انگریزی زبان میں ہے تو مشاعر پھر خالص پائنیر اخبار کی عبارت ہی میں ہوگا۔

مگر اسی عبارت سے حضرت مولانا احسن کی مصروفیت کا بھی اندازہ ہوگیا۔ کیونکہ ممدوح مشاعرہ کے سلسلہ میں اکثر شعرا کے پاس اصالتاً بھی چلے جایا کرتے ہیں اس لیے مسودہ یقیناً وہ ''لڑکوں'' کو دے گئے ہوں گے۔ انھوں نے مولانا کا پتہ انگریزی میں لکھ دیا اور تار کا پتہ ویسے بھی انگریزی میں ہوا کرتا ہے، خیال ہوا کہ جو بالغ نظر لوگ زبانوں میں غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کے اخذ ونقل اور داخلہ کے:

قطرہ قطرہ بہم شود دریا

والے راز کو جانتے ہیں وہ مولانا ہی پر اعتراض کریں گے۔ حالانکہ مولانا کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور ہزار بار یہ کام لڑکوں ہی کا ہوگا؟

اب وہ جو کہا ہے کہ:

اہل قلم را ہوئے بس است

بہم پہنچ گئے اور مشاعرہ سے ایک دن قبل پہنچ گئے کہیے کیا برے پہنچے حضرت گرامی نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ میزبان تھے، پھر کیا تھا ملا صاحب کو کچھ غرور ہی ہو گیا ہوگا کہ مشاعرہ کے چند گھنٹے پہلے ہی سے خواجہ ''میر درد'' کا اثر محسوس ہوا اور پھر خوب محسوس ہوا۔ پھر بخار آیا اور خوب آیا۔ پھر استفراغ ہوئے اور خوب ہوئے۔ پھر ضعف طاری ہو گیا اور خوب ہو گیا۔ اس حالت میں دو سوال سامنے تھے ایک یہ کہ مشاعرہ میں جاؤ مگر نہ جاؤ، دوسرا یہ کہ وطن واپس چلو مگر نہ چلو، لہٰذا اس چلو اور نہ چلو سے یہ منطقی نتیجہ نکلا کہ نہ چلو تو کہیں نہ چلو اور جو چلو تو دونوں جگہ چلو۔

حضرت گرامی محمد عبدالمجید صاحب قریشی ایم اے، پرنسپل کالج نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ آپ کو اور حضرت پروفیسر محمد فاروقی ایم۔ ایس۔ سی کو مشاعرہ میں ''تقریرنا'' ہوگا اور یہ خبر بعض لوگوں تک ''شدہ شدہ'' بھی ہو گئی تھی، اس لیے ایسے لوگوں کو مشاعرہ میں انتظار ہوگا کہ آخر ملا رموزی صاحب مشاعرہ میں ایسے وہ کہاں کے علمی و ادبی دریا بہاتے ہیں جو ہم نے آج تک نہیں دیکھے؟ مگر یہاں ضعف سے یہ حال کہ ایک ''باسی کمبل'' اوڑھ کر مشاعرہ میں یوں چلے گئے جیسے گورنری کے عہدہ سے کمشنری کا چارج لینے چار و ناچار جا رہے ہوں۔ مشاعرہ منعقد ہونے والے گھر کا نام آج تک ''یونین'' ہی ہے اور ایک اسی پر کیا موقوف ہے کالج اور یونیورسٹی کی بے شمار عمارتوں کے نام انگریزوں کے نام پر ہیں۔ خیر ذرا سوراج مل جانے دیجیے پھر اگر انھیں عمارتوں کا نام ''حویلی سید احمد خاں''، ''احاطہ محسن الملک'' اور ''باڑہ مزمل اللہ خاں'' نہ رکھ دیں تو ملا رموزی نہیں۔

غرض اس مکان میں نشستوں کا جغرافیہ نہایت درجہ مرتب و مہذب ہے اور ان کرسیوں کو دیکھ کر اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس سال کی کلکتہ کانگریس کے پنڈال کی طرح یہاں ...اماں میری

شیروانی تو چھوڑ دو اور ادھر تو ہٹو۔

ارے ارے میرے پاؤں پر جوتا تو نہ دھرو کا شور نہ ہوگا مگر ہوتا ہے۔ ان کرسیوں کے درمیان سے ایک ایسا ''بخط مستقیم والا معاملہ'' ہے کہ اگر اسٹیج کے زینہ پر منتظم پروفیسروں کا اتار چڑھاوا ہو تو شاعر سیدھا اسٹیج پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔ تہذیب محفل یہ ہے کہ اگر کوئی نامی گرامی شاعر یا مہمان داخل ہو تو تمام کھچا کھچ حاضرین تالیاں بجاتے ہیں جو پُر جوش خیر مقدم کا مغربی طریقہ ہے اور اب مشرقی بھی۔

ہم جو داخل ہوئے تو آدھے ہال تک کسی کو ضرورت بھی نہیں تھی کہ سب کچھ چھوڑ کر وہ ہمیں پہچان ہی لے اور خود ہم نے پسند نہ کیا کہ ہم دروازے ہی سے چلا کر کہیں کہ ہوشیار ہو جاؤ کہ فاروق صاحب آرہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے ہال تک یوں گردن جھکائے چلے گئے گویا ہم کوئی چیز ہی نہیں، مگر نصف ہال کے بعد چند طلبا نے پہچان لیا تو انھوں نے تالی بجادی۔ طلبا میں کالج کی طرف سے یوں تو تالی بجانے کے تمام قواعد وضوابط جاری ہیں، مگر عمل کے وقت ہال میں صرف ایک تالی بجانا کافی ہوتا ہے، پھر برقی رفتار سے جملہ تالیاں بج جاتی ہیں۔ یوں کہ خود تالی بجانے والوں کو تالی کا سبب معلوم نہیں ہوتا اور اسی لیے بعد ختم تالی گردنیں اٹھا کر اور کہنی مار کر ایک دوسرے سے سبب دریافت کرتے ہیں، مگر تالی بجاتے وقت یہ تحقیق نہیں فرماتے کہ آخر تالی کیوں بجی؟ اور جو بجی تو بجی مگر ہم کیوں بجائیں؟ اس لیے ہم نے بھی ان تالیوں کے دو معنی سمجھے ایک یہ کہ یا تو ہمارے آنے سے طلبا کو بے حد مسرت ہوئی یا پھر ہم سے داخلہ کے وقت ضرور کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے، اس لیے ان تالیوں کے صاف معنی یہ ہیں کہ ''واہ ملا رموزی صاحب!''

''اسٹیج'' کے قریب پہنچنے میں کوئی قدم دو قدم منٹ باقی تھے کہ کسی نے:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

کہا اور ہم اسٹیج سے پہلے ہی بٹھا لیے گئے۔ دیکھا تو برادر محترم حضرت جلیل احمد قدوائی بی۔ اے مشہور ادیب و افسانہ نگار اور حضرت محترم پروفیسر محمد فاروق ایم۔ ایس۔ سی تھے۔ گویا تھیٹر کے حساب سے اس وقت ہم پانچ روپے والے درجہ میں بیٹھ گئے مگر فوراً ہی اسٹیج پر کسی نے حضرت عالی

پرنسپل صاحب سے کہہ دیا کہ ـــ دیکھیے وہاں ہاں وہ، ارے صاحب یہ کیا فاروق صاحب کے برابر بیٹھے ہیں۔ پرنسپل صاحب نے دیکھتے ہی اشارہ فرمایا اور حضرت قبلہ احسن صاحب دوڑے ہوئے آئے اور ازراہِ غایت شفقت ہمارے مصافحہ کو بوسہ دیا اور اسٹیج پر لے گئے۔

اسٹیج کی پہلی سطر میں دیکھتے کیا ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں یعنی ادیب عالی پروفیسر خاوری ایم۔اے، ان کے بعد ذرا ایک دبیز قسم کے پروفیسر صاحب ایم۔اے تھے، دوسری جانب کی پہلی سطر میں حضرت رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی رونق افروز اور ان کے پاس (خدا جانے کیوں) پروفیسر فاروق ایم۔ایس۔سی پہنچ کر بیٹھ بھی چکے تھے۔ فاروق صاحب کے پاس حضرت محترم میاں محمد شریف صاحب ایم۔اے پرووائس چانسلر تشریف فرما تھے۔ ہم روشنی کی ندامت سے محفوظ رہنے کے لیے صدارت کی کرسی کے پیچھے بیٹھ گئے اور پروفیسر مولانا احسن صاحب کے صاحبزادے صاحب سے بڑے ذوق شوق سے باتیں شروع کر دیں۔ برادرم حضرت محمد فاروق چونکہ ایک پختہ کار اور کہنہ مشق اخبار نویس اور مضمون نگاری میں ایک دل کشا طرز خاص کے مالک بھی ہیں جنھیں اخبارات میں "حاجی بلغ العلےٰ" کے نام سے سب جانتے ہیں اور وہ اخبار ہمدرد ایسے وقیع اخبار کے روح رواں بھی رہے ہیں اس لیے ممدوح گرامی اور ہمارے تعلقات میں ایک "اخباری ساز باز" کا ہونا ازبس کہ لازم ولابد تھا لہٰذا ممدوح نے ہمیں اپنے پاس بلایا اس لیے بھی کہ حضرت پرووائس چانسلر سے تعارف کا احسان بھی دھر دیں گے اور اپنے پاس بٹھا کر تنقیدیں بھی اڑائیں گے یہی ہوا۔ گئے تو آپ نے بڑی لیاقت سے پرووائس چانسلر صاحب سے تعارف کرایا اور تھوڑی دیر میں اندازہ ہوا کہ حضرت پرووائس چانسلر ادب اردو اور شعرائے اردو کے ایک نکتہ رس فرد ہیں اور شاعرانہ مذاق نہایت بلند اور مخلص ہے، اس حساب سے اس وقت ایک نشست پر ہم تین ادبی اتحادیوں کا قبضہ تھا۔ پھر مجال تھی جو تنقید، نکتہ چینی، مصرعہ چینی اور پوری غزل چینی سے کوئی شاعر محروم رہ جاتا۔

یہاں سے ایک نظر ہال پر ڈالو تو ارکان مشاعرہ، اساتذۂ کرام اور عزیز طلبا کی مستعدی اور

مشاعرہ کے اہتمام میں ان کی مصروفیت دیکھ کر اس لیے جی خوش ہوا کہ یہ سب کچھ محفل "علم و ادب" کی خدمت کے لیے ہے۔ بجلی کے رنگ برنگ قمقموں سے مشاعرہ یا صحن محفل یا در و دیوار محفل جگمگا رہے تھے۔ عزیز طلبا باوجود جاڑا کالج کی اسلامی وردی پہنے تھے اور محترم پروفیسر لوگ انگریزی سوٹ محفل کی آرائش سے پتہ چل رہا تھا کہ یہاں بھی قبلہ احسن صاحب کو شعرا نوازی سے بہت کم فرصت ملی، اس لیے "لڑکوں" نے رنگا رنگ جھنڈیوں میں بجائے "ہلال" کے "جیک" کی شان پیدا کر دی اور یہ کسی قصد و ارادے سے نہیں بلکہ اس جوش کے ساتھ کہ ایک ہی جھنڈی میں مختلف رنگ کی پٹیاں لگائیں گے تو زیادہ بھلی معلوم ہوگی مگر یہ بھول گئے کہ جب ایک ہی جھنڈی میں تین چار پٹیاں برابر برابر لگائیں گے تو وہ برطانوی جھنڈی ہو جائے گی اور یہاں آج ضرورت تھی "قومی جھنڈی" کی اور تو کچھ نہیں ڈر فقط یہ تھا کہ کہیں مولانا حسرت موہانی کی نظر نہ پڑ جائے کیونکہ وہی ہیں جو ذرا سی باتوں سے ناراض ہو جایا کرتے ہیں اور اسی لیے حضرت قبلہ احسن دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ انشاء اللہ زندہ رہوں تو آئندہ سال ہال کو "ہلال ہی ہلال" سے بھر دوں گا۔

وقت سے پہلے پہنچے تھے اس لیے شعرا و ادبا کی آمد آمد تھی۔ اشراف شہر اور یونیورسٹی کے ارکان وغیرہ آ رہے تھے اس لیے اسٹیج کے منتظم حضرات فرما رہے تھے۔

وعلیکم السلام، مزاج شریف! یہاں تشریف لائیں، کرسی کر لیجیے، یہاں یہاں، ادھر ادھر۔ یہ لیجیے کرسی حاضر ہے، ذرا بھئی خاموش تو رہو، لاؤ وہ کرسی اِدھر اٹھاؤ آرام سے تشریف رکھیے، ذرا آپ اپنی کرسی سیدھی کر لیجیے۔ بس بس تھینک یو، دیکھو بھئی شور تو نہ ہونے دو۔ ان خدمات کے افسران ہمارے زندہ دل و زندہ دماغ دوست اور تاریخ کے لائق احترام عالم پروفیسر عبدالعزیز پوری ایم۔ اے، ایل ایل بی تھے اسی تشریف لانے کے سلسلے میں وہ ہمارے پاس بھی تشریف لائے اور بڑے تپاک سے سگریٹ پلایا۔ ان سے بے تکلف ہونے کے لیے بس یہی کافی تھا کہ ان کی نظر میں پہلے ہی سے ملا رموزی تھے اور وہ ہمارے خیال میں پوری صاحب۔

کرسیوں اور تشریف لائیے کے بعد پان، سگریٹ، چائے کے انصرام میں تو پوری صاحب کو جو کچھ دخل ہو، لیکن وہ طلبا کے ''وندے ماترمی نعروں'' کی روک تھام میں بہت کافی مستعد تھے اور اس انتظام و بندوبست کے لیے دوسرے پروفیسر صاحبان کا طلبا کے پاس کھڑا رہنا حقیقت میں کالج کی تہذیبی اور تنظیمی تربیت کو نمایاں کر رہا تھا اور اس سے نہ فقط منتظمی اور اصلاحی بیداری کا ثبوت مل رہا تھا بلکہ ان پروفیسروں کا جذبۂ ایثار قومی مجالس کی بزرگ داشت اور ادب اردو کی خدمت کا شائستہ تقلید و لائق سپاس ولولے ظاہر تھے جن سے ملا رموزی صاحب کا قلب کافی طور پر متاثر رہا۔ خدا ان پاک نفس اور ایثار پیشہ پروفیسروں کی صحت اور تنخواہوں میں اضافہ فرمائے۔ اب رہے قبلہ احسن صاحب سوان کا ذہنی اور عملی انہماک اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ شور کی تخفیف کے لیے کرسی پر سے کبھی کبھی ہاتھ تو بلند فرما سکتے تھے مگر وہ یہ نہیں کر سکتے تھے کہ ہال میں پہنچ کر ''لڑکوں'' سے کہتے کہ دیکھو بھئی اب تو شور کیا ہے، مگر اب نہ کرنا ورنہ تمھارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

مشاعروں کی طرح اردو تھی:

بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

طرح فارسی تھی:

دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

اس کے بعد نظم کے لیے ''عزت نفس'' اور ''جذبۂ قومی'' کے موضوعات تھے۔ ان موضوعات سے انتخاب کنندہ حضرات اور کالج کے عملہ تعلیم کے ذہنی تاثر اور بالغ نظر کا جو اندازہ ہو سکتا ہے اس کی بلند پائیگی، ضرورت، محل شناسی اور ان کی تربیت کی صلاحیت اور بیداری کی داد نہ دینا حقیقت آگاہی سے انکار ہے۔ ان عنوانات سے پرنسپل اور اساتذۂ کرام کے تعلیمی نصب العین کے لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان بچوں کی اصلاح و ترقی اور تعلیم و تربیت کے جن مفید و برتر مقاصد کے داعی حضرت سرسید علیہ الرحمہ تھے، ان مقاصد کے امانت دار اس کالج میں آج بھی موجود ہیں اور خدا انھیں تا دیر رکھے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جس قوم اور جماعت میں ''عزتِ نفس'' کا احساس زندہ باقی ہے وہ زندگی کے اعلیٰ مدارج اور علو و برتری کے ہر شعبے کو استوار و مستحکم رکھنے کے لیے ہمیشہ ساعی و کوشاں رہے گی خواہ وہ شعبہ خیال و قیاس ہو، خواہ رتبہ علم و عمل۔ پھر کسی درسگاہ میں ''عزتِ نفس'' کی روح کو بیدار رکھنا درسگاہ کے ارکان کی اس محبت اور خلوصِ نیت کو واضح کرتا ہے جو انھیں قوم کے نونہالوں کے ساتھ ہے ''جذبۂ قومی'' کا موضوع بھی بین الاقوامی امتیازات، خصوصیات کو محفوظ و مستحکم رکھنے کا ایک ایسا درس ہے جس کے منتخب و مقرر کرنے والوں کی وہ قومی عصبیت اور ''قومیت پسندی'' ثابت ہے جسے وہ اپنی قوم کے ہر فرد میں پیدا کر دینے کے لیے تیار اور مستعد ہیں۔ پھر جب ان اہم واقدم موضوعات کو ''محفلِ مشاعرہ'' ایسی عام مجلس میں اظہارِ خیال کی شرط لازم اور قابلِ انعام عمل ٹھہرا دیا جائے تو اس سے ارکان دارالعلوم کا شکر و احسان مسلمانوں کے لیے بھی عام طور پر لازم ہو جاتا ہے خواہ ان مسلمانوں میں ہندستانی ہوں یا افغانستان کے ''شوریٰ''۔

حضرت گرامی صدر مشاعرہ کی میز کے سیدھے ہاتھ کی طرف مع کرسی حضرت قبلہ احسن صاحب تھے مگر صدر صاحب سے قریب ضرور تھے، آپ سے متصل ''کرسی شاعر'' تھی، میز کی بائیں سمت ناظم مذاکرۂ علمیہ کی کرسی تھی۔ حضرت قبلہ احسن مدظلہ ''بڑھیا لباس میں'' رونق افروز تھے اور شعرا کے اسماء اور ترتیب کی فہرستیں اس آن بان سے لیے ہوئے تھے گویا ''جمعیۃ الاقوام'' کے اجلاس میں آخری دستخطوں کے لیے معاہدہ ''لوکارنو'' اور معاہدۂ ''کیلاگ'' ہی پیش کرنے والے ہیں اور اسی لیے آپ کے بائیں ہاتھ پر آپ کے ایک چھوڑ دو ''لٹریری اتاچی'' بھی موجود تھے۔ جب ہال کے تمام حصے کچھا کھچ پورے ہوگئے تو عالی منزلت صدر مشاعرہ محمد عبدالمجید صاحب قریشی ایم۔اے، پرنسپل کالج صدارت کی کرسی پر یوں جلوہ افروز ف ہوئے کہ ہم سے اخلاقاً بھی یہ نہ کہا کہ ''لیجیے ملا صاحب آج آپ ہی صدارت کیجیے'' بارے ممدوح گرامی نے افتتاح کار کے طریق پر اور اسلامی قومیت کے دستور و قاعدہ کے موافق ایما فرمایا اور ایک خوش آواز طالب علم نے قرآن کریم سے چند آیات تلاوت کیں او سارا مجمع دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ یہ وہ مؤثر نظارہ تھا جو ہماری بدنصیب آنکھوں کو سال سوا سال ہی میں میسر آتا ہے۔ اس نظارے سے اسلامی قومیت اور

خدائے جلال و جمال کی عظمت و شہنشاہی کی وہ روح بیداری ہو رہی تھی جسے مسلمانوں میں دن رات میں پانچ مرتبہ زندہ ہونا چاہیے تھا، مگر ویران مساجد بتاتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہی وہ نظارہ تھا جہاں محبوب طلبا اور کالج کے معزز محترم ارکان کو دست بستہ اور سر خمیدہ دیکھ کر کہنا پڑتا تھا کہ علی گڑھ والوں میں اب ''نیچری لوگ'' نہیں رہے۔ چونکہ ملا رموزی صاحب حافظ قرآن بھی ہیں اس لیے وہ تاڑ گئے کہ قاری صاحب نے جلسہ کا اثر قبول کرلیا اور اسی لیے وہ ایک جگہ ''غلط پڑھ گئے''، جس کے گواہ قبلہ احسن ہیں۔

تلاوت کے بعد کارروائی کا آغاز یوں ہوا کہ بائیں کرسی والے صاحب نے میز پر رکھ کر کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اندازہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کالج کی مجلس مذاکرۂ علمیہ و ادبیہ کی روداد تھی مگر ان پر بھی ''جلسہ کا رعب طاری تھا'' اس لیے ایسی آواز میں پڑھ رہے تھے گویا وہ کاغذات کو نہیں بلکہ کاغذات انھیں پڑھ رہے ہیں۔ اس کے بعد حضرت گرامی صدر مجلس نے تقریر فرمائی۔

واضح ہو کہ پچھلے سال ہم نے صدارت سے متعلق اپنی دو حیرتوں کا اظہار کیا تھا ایک یہ کہ اس خالص ''مجلس شعر'' کا صدر بھی کوئی سلطان الشعرا ہی ہونا چاہیے تھا۔ حضرت گرامی پرنسپل صاحب صدر کیوں ہوئے؟ دوسرے یہ کہ اس زبانِ اردو کے مشاعرہ کی افتتاحی تقریر انگریزی زبان میں کیوں؟ اس لیے صاحب صدر نے ابتدائی تقریر ہی میں کسی بیرونی سلطان الشعرا کو صدر نہ بنائے جانے کے وہ مقامی وجوہ بیان فرمائے جن کا تعلق کالج اور یونیورسٹی کی انتظامی روایات سے ہے اور ہمیں اس امر کے اعتراف میں تامل نہیں کہ واقعی یہ صدارت ایک ایسی ہی ذات کو چاہتی ہے جو علاوہ ادبی ذوق کے مقامی نسبتوں کے اقتدار کی بھی مالک ہو، لیکن اس موقع پر حضرت احسن نے اپنی کرسی صدارت کی کرسی سے بالکل ملا کر لگانے کی کوئی وجہ بیان نہ فرمائی۔

زبانِ انگریزی میں تقریر والے معاملہ کا جواب صاحب فضل و کمال صدر نے جس عمل سے دیا وہ یہ کہ آپ نے ساری تقریر اردو ہی میں کی اور ممدوح مکرم کا یہی وہ طرز عمل تھا۔ ہمارے اعتراض کے جواب میں جو سبق تھا ان کے لیے جو ''اعتراض و نکتہ چینی'' کی جائز تلخی کو برداشت

نہیں کر سکتے، مگر ملا رموزی کا دماغ صاحب صدر کی اس "فراخ حوصلگی، شرافتِ نفس اور اصول نوازی" کے لیے ممنون وثنا گستر ہے۔ عالی مرتبت صدر نے پھر "غایتِ شعر ومشاعرہ" پر جو اہم علمی تبصرہ فرمایا اس سے یہ حیرت انگیز اندازہ ہوا کہ ممدوح محترم تو خود خاصے "سلطان الشعرا" ہیں پھر محققانہ بلند نظری کے متعلق ممدوح کا یہ حصہ تقریر کس درجہ اہم ہے، جو آپ نے طلبا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ... "ایسے اجتماعات اقوام وملل کی سیرت اور ان کے ذہنی خواص کے مظہر ہوا کرتے ہیں"۔

اب مشاعرہ شروع ہو گیا، لیکن مشاعرہ کے "غزنی حالات" سے قبل آپ ذیل کی تشریح ملاحظہ فرمایئے تاکہ مشاعرہ دلچسپ صورت میں آپ کے سامنے آجائے۔ پس جان لیجیے کہ مشاعروں میں حسب ذیل جذبات وخیالات کے لوگ شریک وشامل ہوا کرتے ہیں۔

(1) محض ہنگامہ پسندی کی عادت۔

(2) کسی مشہور گانے والے شاعر کا کلام سن کر خوش ہونے کے لیے۔

(3) محض اس لیے کہ صبح تعطیل ہے چلو مشاعرہ میں دیکھو کیا ہوتا ہے۔

(4) کسی مخبوط ذہن "نوجوان شاعر" کی زبانی اور جسمانی حرکات کی لغزشیں دیکھ کر اس پر قہقہہ لگانے کے لیے۔

(5) کسی ظریف شاعر کا کلام سنیں گے اور اس پر خوب ہنسیں گے۔

(6) عمدہ عمدہ غزلیں مشاعرہ سے لکھ لائیں گے اور پھر اسی شاعر کے انداز میں پڑھتے پھریں گے۔

(7) غزل بھی سنیں گے اور چائے بسکٹ بھی سنیں گے۔

(8) شاعروں کے لیے پھبتی، آوازے، تالیاں اور شور بہم پہنچائیں گے۔ "ایسوں" سے مجلسی وقار اور اصول کو صدمہ پہنچتا ہے۔

(9) اپنے دوست شاعر کی غزل پر داد کے لیے خوب چیخ وپکار سے کام لیں گے اور دوسروں کے لیے چپ رہیں گے۔ اس قسم کے شرکاء میں بعض خود شاعر کے لائے ہوئے بھی ہوتے ہیں اور بعد مشاعرہ شاعر اپنی تعریف میں خود کوئی مضمون جوڑ کر کسی "اخباری چیتھڑے" میں ان

کے نام سے چھپوا دیتا ہے، جس کا خلاصہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ مگر ہمارے شاعر صاحب کا کلام کیا تھا، خالص الہام تھا، آرٹ تھا، القا تھا، معجزہ تھا، کرامت تھی، بشارت تھی، صنعت و حرفت تھی اور ایک طرح کی زراعت بھی تھی۔ ایسوں سے شعرا میں رقابت، جانبداری اور کبھی کبھی مشاعرہ ہی میں ''لٹھ بازی'' کا میدان بھی گرم ہو جاتا ہے۔

(10) محض شعر اور ذوقِ شعر کے ساتھ آتے ہیں۔ متانت و سنجیدگی اور ضبط و سکون سے پورے مشاعرے میں شریک رہتے ہیں اور چائے سگریٹ کا شکوہ کیے بغیر اُسی وقار و خموشی سے چلے جاتے ہیں۔ ایسوں سے مجلسی وقار، اصول، باہمی خوشگواری، ایثار اور حسن خیال کی قوتیں فروغ پاتی ہیں۔

محترم شعرا میں مشاعرہ کے اندر جس ذوق و ذہن کے حضرات تشریف لاتے ہیں وہ یہ ہیں:

(1) اوندھی سیدھی داد ملے گی مگر ملے گی تو۔

(2) مشاعرہ میں غزل پڑھنے سے مزاجی جھجک دور ہوگی۔

(3) اساتذہ کا ''طرزِ پڑھ'' اور طریق گا'' دیکھیں گے پھر خود اسی طرح پڑھا کریں گے۔ اس خیال کا شاعر مشاعرہ میں ''بہت بے محل کود پڑتا ہے، چیخ پڑتا ہے، اس کے تال سُر میں کہیں ٹھمری اور کہیں ''قوالی'' کا انداز پیدا ہوتا رہتا ہے۔ لوگ اس کی حماقت پر مذاق اُڑاتے ہیں تو وہ دانستہ طور پر یہ سمجھتا ہے کہ مجھے داد مل رہی ہے۔

(4) بعض ''شاعرزادے'' بھی ہوتے ہیں جنھیں بعض کہنہ مشق شاعر غزل دے کر مشاعرہ میں لاتے ہیں اور اس غزل کی داد سے خود علاحدہ بیٹھے مزے لیتے ہیں۔ بچوں کو ان کی اہلیت سے بلند غزل پڑھوانے کی جہالت میں بعض متین اور سمجھدار لوگ بھی مبتلا ہیں اور زبانِ اردو کے مشاعروں میں یہی وہ ذلیل رسم ہے جس کی کھلی ہوئی بے وقوفی سے یہ لوگ نہیں شرماتے صرف ''اپنے مولانا احسن قبلہ'' ایسے ''لڑکوں'' پر دل ہی دل میں جلتے رہتے ہیں۔ مذکورہ اقسام کے شعرا جہاں حاضرین کے وقت و خیال کی تباہی کا باعث ہیں وہاں ان کے

شعری افکار سے ادب میں نہایت پست اور ذلیل تاثرات کا بے کار ذخیرہ داخل ہوتا ہے جو کسی متمدن اور شاندار زبان کے لیے نہایت مہلک حصۂ ادب ہے۔

(5) بعض ایک ماہ یا ایک ہفتہ پہلے سے مشاعرہ کے لیے محنت کے ساتھ غزل کہتے ہیں۔ اصلاح لیتے ہیں، اسے خوش خط لکھتے ہیں، کپڑے بدلتے ہیں، سواری خرچ ادا کرتے ہیں۔ چار چھ گھنٹہ تک انتظار کرتے ہیں لیکن غزل پڑھتے وقت یوں انکار کرتے ہیں گویا انھیں مشاعرہ تک کی خبر نہ ہوئی، مگر مسلسل اصرار کے بعد وہ پڑھتے ہیں اور غیر طرح تک پڑھ گزرتے ہیں۔ اس قسم کے شعرا کی حرکات کا اخلاقی اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب میں ''لایعنی تکلفات'' مضحک عادات، سست کاری اور مہملات پسندی کی ذہنیت رواج پاتی ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ سنجیدہ شرکا بھی ان کے مصنوعی انکار کی جہالت کو جان بوجھ کر اپنے پیہم اصرار سے ترقی دیتے ہیں۔ ترقی یافتہ قومیں ایسی کھلی ہوئی بیہودگی کو قومی ذلت تصور کرتی ہیں۔

(6) اس قسم کا شاعر آج کل کے نوجوانوں سے پیدا ہوتا ہے مگر علم، عمر، تجربے، دماغ کی ساخت اور فطرت کے لحاظ سے یہ نہایت مرغوب ہونے والی ذہنیت رکھتا ہے۔ یہ تحقیق، جدت، پرواز اور واقعیت کے مقابل ہر طاقتور اور شاندار تحریک اور کیفیت سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اس کی شاعری کا قوام گرد و پیش کے ان تاثرات سے تیار ہوتا ہے جن کی صحیح نوعیت و حقیقت کی تہ تک اس کے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی البتہ وہ ماحول کے سطحی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً اس کے عہد کے افراد کسی عظیم الشان انسان کی مصلحانہ آواز کو اگر ''پیغام'' کہتے ہیں تو وہ فوراً اپنی نظم کو بھی ''پیغام'' کہہ دیتا ہے۔ حالانکہ پیغام کی ذمہ داری حکمت آموزی اور اس کی اثری حیثیت کے ادنیٰ اصول سے بھی اس کا ذہن عاری ہوتا ہے۔ وہ لفظ ''آرٹ'' کی ترکیبی، اصولی اور معنوی خاصیت سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے مگر وہ اپنی نظم کو ''آرٹ'' بھی کہہ دیتا ہے۔ کسی بعید الفہم ادراک و تحریک کو جس کے اثرات بہت عمیق و بلند ہوں اگر لوگ ''الہام'' کہہ دیں تو یہ بھی اپنی نظم کو ''الہام'' کہنے میں تامل نہیں کرتا۔ اگر یہ سن لے کہ پریزیڈنٹ ولسن آنجہانی کے اصول چہاردہ گانہ کو سیاسیات میں ''شاہکار'' یا ''ماسٹر پیس'' کہتے ہیں تو وہ بھی اپنے ہر شعر کو ''شاہکار'' یا ''ماسٹر پیس'' کہنے میں تاخیر نہیں

کرتا۔

اس قسم کے شعرا کی فکری کوششوں کا تمام زور ''پُر شوکت الفاظ'' مہمل اور ناقابلِ فہم خرافات اور پیچیدگیوں کو نظم کرنے میں صرف ہوتا ہے اور ایسوں کے کلام سے حاضرین، سامعین اور ناظرین کو وحشت، ہنسی یا پھر ان خرافات میں خواہ مخواہ کے قیاسات دوڑانے کی قوت پیدا ہو کر ضائع جاتی ہے۔ اس قسم کی نظم کو منشائے شعر اور اصولِ شعر سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا اور اسی لیے ایسے شعرا اپنی خطابی کامیابی کے لیے ''خوش آوازی'' اور سطوت انگیز الفاظ کی ہیبت طاری کرتے ہیں اور اس طریق کار سے مخاطب میں معانی و مقاصد کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت پست ہو جاتی ہے اور قوم میں ''شاندار لفاظی'' کی قوت ترقی پاتی ہے۔

(7) اس قسم کا شاعر فنِ شعر اور منشائے شعر کے لیے ایک ''درمیانی درجہ'' ہوتا ہے جس کا صحیح نام رکھنا محال ہے۔ اسے اگر مشاعرہ کا باقاعدہ اذن نہ دیجیے تو یہ میر مشاعرہ یا منصرم سے کہہ دیتا ہے کہ میں ہر حال میں آؤں گا کیونکہ میں ''قومی شاعر'' ہوں اس حساب سے ایسے شعرا شاعری کے ''سائنس کیمشن'' ہوئے اور ان کے سامعین ''گوبیک''۔ مشاعرہ کو یہ لوگ ادب یا ذہنی خدمت کا کوئی خاص ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کا پہلا مقصد ''ابھرنا'' اور ''شہرت طلبی'' ہوتا ہے اور اسی لیے وہ شعر و خیال کی تزئین سے زیادہ اپنی زیبائش سے ناظرین کو متاثر کرتے ہیں باوجودیکہ یہ خود کو ''قومی شاعر'' کہتے ہیں مگر قومی خصائص و قومی شعائر میں سے ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً ان کی معاشرتی حالت صحیح نہیں ہوتی، وہ ملکی اور قومی لباس کا تاثر پیدا کرنے کے عوض انگریزوں کا کوٹ اور پاجامہ پہن کر اس ذہنی اور خیالی درسگاہ میں یوں نظر آتے ہیں گویا کسی قحط زدہ کاشت کار کی نعش کو مصری آثارِ قدیمہ کی مومیائی سے لیپ دیا ہو۔ یہ اپنے کلام کو مؤثر بنانے کے لیے آنکھ، کان، چہرے، کمر اور ہاتھوں سے ایسی مضحک صورتیں بناتے ہیں جن پر حاضرین و ناظرین میں جوش، مسرت، ولولہ اور فہم و ادراک کی قوتوں کی جگہ شرم، انفعال، ملامت اور نفرت کے ذلیل جذبات بھی بھڑکتے ہیں۔

(8) اس نوع کے شعرا کے پاس علوم و معارف، وسعتِ خیال و تجربہ وقار و تحمل، سکون و دبدبہ،

متانت و سنجیدگی اور خلق و سادگی کے خزانے ہوتے ہیں اور اسی لیے وہ اپنی خطابی اور تاثیری حیثیت میں کوئی صنعت و جدت پیدا کرنے سے بے پروا رہتے ہیں، مگر ان کا ہر مصرع خیال و قیاس تکمیل و تحقیق اور سنجیدگی کے تمام شعری لوازم کا حامل ہوتا ہے۔ وہ اپنے کمال کی پختگی کے اثر سے خود اپنی حیثیت اور قیمت سے بے خبر رہتے ہیں جیسے اپنے مولانا حسرت موہانی اس مشاعرے میں ہرے رنگ کی بیاض پر عینک دھرے یوں بیٹھے ہوئے تھے گویا وہ اپنے ہی دولت خانہ میں آرام فرما رہے ہیں اور یہی وہ اصل شاعر ہیں، جو اپنے مخاطب میں شعر کے مقاصد و اثرات کو تازہ کرتے ہیں۔ ایسے شاعر کی تاثیر کامیابی کی علامت یہ ہے کہ سامع و شاعر اور شعر کی عظمت سے سکوتِ حیرت اور خموشی کی ایک ہلکی سی تھکن طاری ہو جاتی ہے، اس شاعری سے ادب میں لفظی و معنوی وزن و وقار اور مقاصد کا قابلِ تعریف ذخیرہ جمع ہوتا ہے۔

مذکورہ ذوقیات کے لوگوں کے مجمع کو ملحوظ رکھ کر اب اصل کارروائی ملاحظہ ہو۔ حضرت قبلہ احسن صاحب نے بڑے شاعرانہ دبدبہ سے شعرا کی فہرست صدر صاحب کے سامنے پیش کی اور شعرا نے غزل پڑھنا شروع کیا۔ ابتدا میں کالج کے طلبا نے غزلیں پڑھیں۔ خیال تھا کہ ابھی طلبا ہی کا سلسلہ جاری رہے گا کہ یکایک ایک بیرونی شاعر صاحب نے غزل پڑھی۔ بلند و بالا قامت آواز میں وہ "فوجداری بھری ہوئی" کہ طلبا سہم تو گئے ہوں گے۔ چار پانچ اشعار کے بعد آپ نے پانی طلب کیا۔ دیا گیا تو پیا گیا اور پھر رعد و برق کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عمر ہو گی کوئی ایک پچاس برس کی۔ ہر شعر کی تان پہلے شعر کی تان سے مختلف ہوتی تھی۔ آپ جب فارغ ہو کر کرسی پر بیٹھے تو دیر تک مسرور آنکھوں سے پاس والوں کو اس لیے دیکھتے رہے کہ "کیوں کیسی لاجواب غزل پڑھی" جو شخص ان کی طرف دیکھتا یہ جھک کر آداب بجالاتے ہیں۔ اس حرکت سے اندازہ ہوا کہ یہ مسرت انھیں وطن تک خوش رکھے گی اور ریل کے سفر میں بھی یہ مسافروں سے کہیں گے کہ "تمھیں کیا خبر علی گڑھ میں ایسی غزل پڑھ کر آرہا ہوں کہ آپ بھی سن لیجیے"۔

آپ کے بعد پھر کالج کے طلبا نے غزلیں پڑھیں۔ شاعر کے لیے چونکہ ایک کرسی رکھ دی

گئی تھی مگر اس پر بیٹھ کر پڑھنا شاعر کی ذہنی حالت پر موقوف تھا۔ چنانچہ اکثر یہی ہوا کہ بیدار مغز طلبا کرسی چھوڑ کر ''لیکچر'' کے انداز سے غزلیں پڑھنے لگے۔ یہاں سے پھر وہ مقابلہ شروع ہو گیا جو آج کل شعرا میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ خرابی ہے تو اس مقابلہ میں بوڑھے شاعروں کی یعنی گا کر پڑھنا اور اس پر ہاتھ ہلانے کا اضافہ طرفہ مصیبت ہے۔ چنانچہ متعدد طلبا نے گایا۔ اس اثنا میں ایک طالب علم ایسے بھی آئے جنھوں نے گانے کی مشق کیے بغیر گانا شروع کیا تو حاضرین نے بھی زبانی داد کا وہ اضافہ فرمایا کہ غزل سننا محال ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرے طالب علم نے ان سے غزل لے کر پڑھی۔

اِدھر تو غزلوں کا سلسلہ مشاعرہ کا رنگ رفتہ رفتہ جما رہا تھا، اُدھر قبلہ احسن صاحب کے انتظامی ارکان تھے جو ''پان پر پان''، ''سگریٹ پر سگریٹ'' اور ''پانی پر پانی'' پلائے جا رہے تھے اور پھر یہی نہیں بلکہ ہر شخص کے عین منہ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ اصرار کہ الا بچی تو لیجیے۔ تمباکو تو لیجیے۔ چھالیا بھی لی یا نہیں۔ کیا فرمایا سگریٹ۔ بہت اچھا۔ ذرا آپ کو سگریٹ دیجیے۔ ہاں ہاں آپ کو بھی ماچس تو دو یہاں حضرت مکرم پروفیسر عبدالعزیز پوری سگریٹ پلانے میں اس درجہ مستعد تھے کہ پہلی سگریٹ کا تار نہیں ٹوٹنے دیتے تھے اور احسان مزید یہ کہ منہ کے سامنے کھڑے ہو کر ماچس بھی خود جلاتے تھے جہاں سے سگریٹ ختم ہو جاتی وہاں سے آواز دیتے۔

سگریٹ لاتا مگر خود علاحدہ نہ ہوتے۔ اس تواضع کی ترتیب یوں تھی کہ شاعر پوری غزل پڑھ کر بیٹھ بھی جاتا تھا۔ مگر ''متواضعین'' کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس معاملہ سے شاعروں کے دل میں آگ لگ جاتی تھی مگر یہ تواضع پیشہ حضرات بھی تھے تجربہ کار اس لیے جہاں شاعر غزل پڑھ کر بیٹھتا یہ حضرات پان سگریٹ کے خوان لے کر اُسے پان پیش کرتے اور بے سنے سمجھے یہ بھی کہتے پان ملاحظہ فرمایئے۔ ماشاء اللہ کیا غزل پڑھی۔ بے چارہ شاعر پان بھی کھاتا اور شکوہ کی بجائے شکریہ پیش کرتا۔

یہ وہ تواضع تھی جس سے حاضرین اور شعرا ناخوش ہوں گے اور دل میں کہتے ہوں گے یہ

''عطرپان'' غزل کے کسی ایسے خاتمہ پر کیوں نہیں پیش ہوتے۔ جب سب طرف سکون ہو یا اس کے لیے اعلان کر دیا جائے کہ ''معزز شائقین بعد غزل کے ایک سگریٹ بھی پلایا جائے گا'' مگر یہ مسئلہ ہے ارکانِ مشاعرہ کے خلوص کا اس لیے امید نہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو۔ پھر اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ حضرت پروفیسر پوری کبھی کبھی صدر صاحب کے برابر بھی کھڑے ہوجاتے ہیں اور ہال کی طرف فخر سے دیکھ سکتے ہیں، اس حالت میں کوئی ان سے نہیں کہہ سکتا کہ ''ذرا عمامہ اتار لیجیے شاعر کا منہ نظر نہیں آتا'' اسی طرح یہ شاعر کے لیے بھی یوں مفید ہیں کہ شاعر کی مذبوحی حرکات حاضرین کو نظر نہیں آتیں تو شور کم ہوتا ہے۔ بہرحال یہ سارا معاملہ حضرت احسن قبلہ کے ذوق پر موقوف ہے مگر وہ اس وقت حاضرین کی سطروں میں کب تشریف رکھتے ہیں جو انھیں علم ہو۔

چونکہ مشاعرہ ابھی ابھی شروع ہوا تھا، بیرونی شعرا میں سے بہت کم آئے تھے۔ البتہ ہمارے سیدھے ہاتھ والی سطر میں ایک صاحب یوں بیٹھے تھے کہ سر کو کرسی پر لگا کر پاؤں کو اس طرح دراز فرما لیا تھا گویا وہ سورۂ یٰسین سننے کے لیے آخری مرتبہ سخت ہو چکے ہیں۔ مزاجی خشکی کا یہ عالم کہ کسی شاعر کی غزل پسند ہی نہ آتی تھی۔ آنکھیں بند فرما چکے تھے۔ پان، سگریٹ والے ان کے اکڑے ہوئے پاؤں پر سے خود ہی کود کر چلے جاتے تھے، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ گویا ان کے لیے یہ مشاعرہ بھی آگرہ کا ریلوے ویٹنگ روم تھا، جہاں مسافر کرسی پر نصف بیٹھ کر اور نصف لیٹ کر سو جاتا ہے، ان کے منہ سے جو کسی شاعر کے لیے داد یا تحسین کے الفاظ نہ نکلے سو اس لیے کہ ''خود کوئی بہت ہی بڑے ہوں گے''۔

ان حالات کے بعد ہمارے اوپر پھر خواجہ میر درد کی توجہ ہوئی اور ہم مشاعرہ سے اٹھ کر صرف ذرا وطن تک چلے آئے۔ چونکہ وطن تک پہنچنے میں ریل گاڑی کے دو دن صرف ہوتے ہیں اس لیے گویا ہم مشاعرہ ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرق صرف نظر اور خیال کا تھا اس لیے مشاعرہ کے دوسرے دور میں جو کچھ ہوا خیال و قیاس کی امداد سے وہ بھی قلم بند کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ

دوسری شب میں یہ ہوا ہوگا کہ ہمارے دیرینہ دوست حضرت مولانا سید کلب احمد مانی جائسی آگئے ہوں گے۔ حضرت مولانا شوکت علی فانی بی۔اے، ایل ایل بی (علیگ)، حضرت جگر مرادآبادی، حضرت پنڈت جگ موہن لال اناوی رواں ایم اے، ایل ایل بی، حضرت نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بھوپالی، حضرت مولانا اظہر علی آزاد شریک ہوئے ہوں گے۔

جلسہ پھر تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوا ہوگا۔ حضرت محترم صدر نے بڑے تپاک سے حضرت قبلہ احسن مارہروی سے غزل کے لیے اصرار فرمایا ہوگا مگر قبلہ ممدوح نے کھانسی کا عذر فرما کر غزل سے صاف انکار کر دیا ہوگا اور مشہور یہ ہوا ہوگا کہ چونکہ حضرت مولانا بعض شعرا کے پاس ''اصالۃً'' بھی گئے تھے اس لیے عدیم الفرصتی کی وجہ سے غزل نہ کہہ سکے۔ آپ کے بعد حضرت گرامی میاں حامد علی خاں صاحب (بھوپالی) نے غزل پڑھی ہوگی اور بہت دلنشیں انداز میں پڑھی ہوگی۔ اس پر برادر محترم حضرت جلیل احمد قدوائی بی۔اے نے ہاتھ جوڑ کر صدر صاحب سے کہا ہوگا کہ اس غزل کو دوبارہ پڑھوایا جائے تو بھوپال کے حضرت مولانا حامد سعید خاں صاحب نے اس غزل کو پڑھا ہوگا۔ پھر صاحب صدر نے بڑے تپاک سے، حضرت جگر مرادآبادی سے غزل کے لیے اصرار کیا ہوگا تو طبیعت اچھی نہ ہونے کے باعث انھوں نے دو غزلیں پڑھ کر صاف کہہ دیا ہوگا کہ اب معافی چاہتا ہوں۔ پھر حضرت رواں نے نہیں تو حضرت مانی جائسی نے غالب کی مشہور غزل پر اپنی بہترین تضمین پڑھی ہوگی، جس میں یہ بھی آتا ہے کہ ''ایک قطرۂ خون وہ بھی'' انھیں اور حضرت رواں کو بے حد داد ملی ہوگی۔ اس کے بعد صدر صاحب نے حضرت گرامی پروفیسر عبدالعزیز صاحب پوری سے فرمایا ہوگا کہ موقع غنیمت ہے غزل پڑھ لیجیے تو ممدوح نے نہایت جاں فشانی سے ترنم کے ساتھ غزل پڑھی ہوگی تو لوگ باگ چیخ اٹھے ہوں گے کہ سبحان اللہ اور وہ جو مثل مشہور ہے کہ ''پروفیسر کو دیکھ کر پروفیسر رنگ بدلتا ہے'' سو آپ کو دیکھ کر ایک پروفیسر صاحب نے فارسی غزل شروع فرمائی ہوگی، مگر مارے ترنم کے دو چار اشعار کے بعد ہی کھانسی نے پکڑ لیا ہوگا، ان کے پڑھنے میں وقار، دبدبہ، شوکت، آن بان کے تمام لوازم مکمل ہو گئے تو طلبا مسکرائے ہوں گے مگر پروفیسر ہونے کے ڈر سے وہ مرتب تالیاں نہ بجائی ہوں گی جو وہ کبھی بے اختیار بجا اٹھتے ہیں۔

آپ کے بعد ایک صاحب سے اور کچھ نہ بن آیا ہوگا تو انھوں نے صاف صاف غزل پڑھنا شروع کر دیا ہوگا جسے سن کر حضرت مولانا احسن آپے سے باہر ہو گئے ہوں گے اور آپ نے شاعر سے کہہ دیا ہوگا بس بس بس۔ بعد میں معلوم ہوا ہوگا کہ ان شاعر صاحب کو حضرت ملا رموزی نے مشاعرہ سے رخصت ہوتے وقت ریلوے اسٹیشن پر مشاعرہ میں جانے کی تاکید فرمادی تھی اور ان کا تخلص اور کچھ نہیں تو بوم ہے پھر حضرت فانی مدظلہٗ نے غزل پڑھی ہوگی تو مشاعرہ ان کی عظمت، خوش سلیقگی، حسن اخلاق اور حسن کلام سے بے انتہا متاثر ہوا ہوگا۔ان کے بعد لوگوں کا دل کسی دوسرے شاعر کا کلام سننے کو نہ چاہتا ہوگا، مگر ایک صاحب نے یہ ضرور کہا ہوگا کہ میں یہاں بھی سناؤں گا اور آپ طلبا کے ''کمروں پر آکر'' بھی سناؤں گا۔ سنجیدہ حاضرین نے اس بے چارہ کی پست ذہنیت پر دل میں نفریں کہہ کر بظاہر تبسم فرمایا ہوگا اور بس۔

اب مقام ہردوئی کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک ماسٹر صاحب کے کلام کی باری تھی مگر افسوس کہ وہ خود حاضر نہ ہو سکے، اس لیے ممدوح نے اپنا کلام حضرت قبلہ احسن کے نام روانہ کر دیا جو ''ڈاک خانہ سے ساز باز'' کی وجہ سے بجائے حضرت احسن کے ہمیں مل گیا۔اس لیے ہم اسے ''لکھ کر پڑھتے ہیں''۔

اس کلام میں عروض، علم الکلام، بلاغت، سیاست، پند و نصیحت، فلسفہ، انشاء وغیرہ وغیرہ کے بے شمار و بے اندازہ اصول شامل ہیں، اس لیے ان کی تفصیل ایک علاحدہ تبصرہ کی محتاج ہے، جس کا یہ موقع نہیں۔ البتہ ماسٹر صاحب نے مشاعرہ کی طرح میں جو غزل کہی ہے، پھر اسی غزل میں ''عزتِ نفس'' اور ''جذبۂ قومی'' کے دونوں عنوانوں سے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان سے پہلے آپ کو یہ بھی ظاہر کر دینا تھا کہ ''میں اس وقت کن حالات میں مصروف ہوں، اس لیے آپ نے ان تاثرات کو بھی ایک ''منظوم خط'' کی صورت میں حضرت احسن قبلہ کو روانہ فرمادیا، مگر یہ ''منظوم خط'' اور ''غزل عزتِ نفس'' اور ''جذبۂ قومی'' کی دو نظمیں کاغذ پر جس طرح لکھی گئی ہیں ان کے لحاظ سے بہ یک نظر یہ منظوم خط ''غزل'' اور طرحی غزل معلوم ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ ماسٹر صاحب کا نام ان کا نام بھی ہے اور اسی کا ایک حصہ ان کے تخلص کا مزا دے جاتا ہے۔ ان کا نام ہے مول چند اور تخلص کا ''انچارج'' ہے ''شرما''۔

اب آپ نے یوں تو ہزاروں ''چند'' دیکھے ہوں گے مگر ذرا اپنے ان ''مول چند'' کو بھی دیکھ ہی لیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ شاعری میں ''ایسے چند کو'' کیا کہنا چاہیے۔ چنانچہ ممدوح مکرم کے ''مکتوبِ منظوم'' یا ''غزل'' کا مطلع ملاحظہ ہو مگر مشاعرہ کی طرح کو پہلے ذہن نشین فرما لیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے اور وہ بھی حضرت احسن ایسے ادیب و استادِ فن سے ارشاد ہوتا ہے کہ:

مکرم قدرداں ، مارہری احسن
ہیں وارے شاعری پر جو کہ تن من

مشاعرہ کی مقررہ طرح کے بعد اس مطلع سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت احسن مدظلہ نے ضرور کوئی ''خفیہ طرح'' بھی دی تھی جس پر حضرت شرما نے ''احسن اور تن من'' کے قوافی سے کام لیا۔

پچھلے سال کی ''روداد'' اور سفر نامہ میں ہم نے بعض احباب کی وطنی نسبتوں کو بربنائے تفنن ان کے ناموں سے پہلے لکھ دیا تھا۔ مثلاً ''جالندھری حفیظ'' اور ''مارہروی احسن'' ان ترکیبوں کی لطافت سے مرعوب ہو کر ایک تہی مغز و تہی مایہ ''اخبار چی'' نے اپنے ایک انشاپردازانہ ملفوبہ میں ان بزرگوں کے ناموں کو اسی طرح نقل کر کے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ لوگ ان ترکیبوں کو ''اخبار چی'' کی ذاتی ایجاد سمجھ کر بس تڑپ ہی تو جائیں گے، لیکن حضرت شرما نے تو متانت و احترام سے حضرت احسن مارہروی ''مارہری احسن'' نظم فرما دیا پھر طرفہ تماشہ یہ کہ ''وزن'' کے اعتبار سے مولانا کا نام نامی مع وطنی نسبت کے ''رہ روی احسن'' رہ جاتا ہے، یقین نہ ہو تو شرما صاحب کا مطلع پھر گنگنالو۔

اس مطلع میں اگر ہمیں قبلہ احسن صاحب معاف فرما کر اجازت دیں تو ہم بے شمار رازہائے

سربستہ کا انکشاف کیے دیتے ہیں۔ مثلاً پہلے مصرع میں شرما صاحب نے ''مکرم'' کے بعد ہی ''قدرداں'' لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ حضرت احسن اور حضرت شرما کے نہ فقط تعلقات ہی ''خوشگوار'' اور ''دیرینہ'' ہیں بلکہ احسن صاحب اس قسم کے شعرا کے قدرداں بھی ہیں۔ اب رہا مصرع ثانی میں یہ لکھنا کہ حضرت احسن قبلہ:

ہیں وارے شاعری پر جو کہ تن من

سو اس سے انکار نہیں کہ یہ ایک ''واقعہ بالکل'' ہے۔ (یہ اضافت قصہ اول کی حالت میں جائز ہے)

آج کل کے انگریزی یافتہ لوگ شعر میں ''گل و بلبل'' کی جگہ ''حقائق تاثرات'' کے بہت شائق ہیں، پھر شعر کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ شعر شاعر کے مافی الضمیر کا آئینہ ہو۔ اس ضابطہ سے مطلع کے بعد شرما صاحب کے حقیقی اور واقعی تاثرات ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں:

پریشاں سر ہے آمد انس پکٹر

ہیں آئے ساتھ دویم ڈاے رکٹر

عدیم الفرصتی، کارگراں ہے

د میلہ رام لیلا کامراں ہے

یہ ہیں وہ اشعار ہیں جن سے ادبیاتِ اردو میں ''وضع الفاظ'' مصطلحات اور اختراع وجدت کے ضوابط ترتیب پاتے ہیں۔ مثلاً انسپکٹر کو ''انس پکٹر'' کہنا جس قدر آسان ہے اتنا ہی ''پریشان سر'' کی بندش کس قدر محال ہے جسے شرما قسم کے شعرا ہی باندھ سکتے ہیں۔

بھاری یا بے شمار کاموں سے عدیم الفرصت رہنے کو دوسرے شعر میں یوں نظم کر دینا کہ:

''عدیم الفرصتی کار گراں ہے''

شرما صاحب کا کام نہیں تو کیا استاد غالب کا کام ہے کیونکہ استاد غالب اگر اسے لکھتے تو بس اس طرح کہ:

''کارہائے گراں سے عدیم الفرصت ہوں''

اور بس، مگر شرما صاحب کی ''عدیم الفرصتی'' کا سبب صرف ''کارہائے گراں'' تو ہیں نہیں بلکہ ان کے سامنے اس سے بھی زیادہ اہم معروفیت کا باعث تو ''وسیلہ رام لیلا کامراں'' بھی ہے (واؤ عاطفہ) کو یوں تو ہم بھی اکثر و بیشتر غلط مواقع پر لکھا کرتے ہیں، مگر ہم آج تک اس غلطی میں وہ حسن پیدا نہ کر سکے جو شرما صاحب نے ''وسیلہ'' کہہ کر پیدا کر دی ہے۔ اب رہا ''کامراں ہے'' تو یہاں صفت موصوف، مبتدا و خبر اور ''فکِ اضافت'' کے جو بلیغ قوانین صرف کیے گئے ہیں انھیں ہم ابجد خواں ملا رموزی کیا خاک سمجھ سکتے ہیں؟ اب کمالِ قادر الکلامی ملاحظہ ہو۔ اس قدر انہاک پر کہ ''انس پکٹر'' اور ''دویم ڈاے رکٹر'' کی آمد کے ساتھ ہی ''وسیلہ'' کامراں ہے کا واقع ہونا، لیکن شرما صاحب ایسے ہزار داستان کے لیے ایک غزل کہہ دینا بات ہی کیا تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

کہی ہے چند منٹوں میں غزل یہ
محض خوشنودیٔ خاطر طبع یہ

قواعد کے لحاظ سے ''یہ'' حرفِ اشارہ ہے اور وہ بھی قریب کے واسطے، اس لیے ثابت ہوا کہ یہ غزل حضرت مولانا احسن قبلہ کی شان میں تو نہیں کہی گئی بلکہ شرما صاحب نے اسے ''محض اپنی خوشنودی خاطر طبع'' کے لیے کہی ہے اور وہ بھی ''چند منٹوں'' میں کہی ہے۔ اب آگے چل کر ارکانِ مشاعرہ کی اس ''زبردست جدوجہد'' کا راز فاش ہوتا ہے جو انھوں نے حضرت شرما کو مشاعرے میں ''اصالۃً'' بلانے کے لیے کی مگر حضرت شرما نے ارکانِ مشاعرہ کی مسلسل التجاؤں اور تقاضوں سے تنگ آ کر صاف انکار کر دیا ہے اور وہ بھی ''غزل کے ذریعہ'' انکار کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

نہیں ہے دو بدو ہونے کا منشا
نہیں ہے فرصتِ شرکت ''پڑھے آ''

عروضیوں کے نزدیک ''تعقید'' ایک نہایت بھونڈا پن ہے اور گو اساتذۂ متقدمین و حال اس سے بچ نہیں سکے پھر بھی ''تعقید'' کو شاعر کی ''لفظی و خیالی بے بسی'' پر محمول کیا جاتا ہے، لیکن حضرت شرما نے ''پڑھے آ'' کہہ کر ثابت کر دیا ہے کہ ایجاز و اختصار کو اس سے زیادہ حسین و جامع بنا دینے کا کوئی

دوسرا ذریعہ ہی نہیں جسے اختیار کیا جائے۔ اب رہا ''دوبدو ہونے کا منشا'' سو خدا ہی نے محفوظ رکھا۔

اب تک تو شرما صاحب نے علی گڑھ کے طلبا کی عمر، ان کی ابتدائی تعلیم اور معمولی قسم کی معلومات کے تصور سے نہایت سادہ اور آسان مفہوم اور الفاظ سے کام لیا، لیکن آخر کمال علمی اور تبحر کو کہاں تک ضبط فرماتے اس لیے ایک عالمانہ شعر فرمایا ہے جس میں فارسی، مرکب اضافی، شوکت لفظی اور تخیلی نزاکت کے دریا بہائے ہیں اور ملا رموزی تو ملا رموزی ان ایسے اگر ہزار آ جائیں تو آنے والے شعر کی شرح سے عاجز رہیں۔ فرماتے ہیں:

توقع تسپہ ہو پس اند خاطر
جمع ہوں گے شعرا ہند شاطر

پسند خاطر کی جگہ ''پس اند خاطر'' شعری پس ماندوں کا مخفف بھی ہے اور ضرورتِ شعری بھی اب رہی ''شعرا ہند شاطر'' کی ترکیب سو اس پورے مصرعے کو اس سال بی۔ اے فرسٹ کے امتحان اردو میں دے دیا جائے پھر نہ حضرت حفیظ جالندھری کے بلانے کی ضرورت رہے گی نہ حضرت اصغر گونڈوی کی، مگر ''توقع تسپہ ہے'' کو ایسا نہ کیا جائے گا۔

شعرا میں یہ نقص بہت عام ہو گیا ہے کہ وہ غزل میں نہ خیریت و عافیت لکھتے نہ ختمِ غزل پر خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام، پس اس نقص کو شرما صاحب نے دور فرما دیا ہے اور وسط خط یا وسط غزل میں دور فرما دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

دعا فتح سمیع تسلیم سرہندی کو
ہے حسب حیثیت آداب سب کو

مصرعہ اولی میں ''سرہندی'' سے مراد حضرت احسن قبلہ ہیں، رہی ''دعا فتح سمیع'' کی عربی سو آپ اسے دارالعلوم دیوبند، تھانہ بھون اور ندوۃ العلما لکھنؤ میں بھیج کر اس کے معنی دریافت فرمالیجیے، سوائے جامعہ از ہر مصر کے اگر کوئی سمجھا دے تو ہمارا ذمہ اور اسی لیے ہمارے مشورہ ہے کہ اب مولانا ابرار حسین صاحب فاروقی کو تو یونیورسٹی کے ٹرسٹیوں میں لے لیا جائے اور عربی کے تمام

اسباق حضرت علامہ شرما مولوی فاضل ازہری کے سپرد کر دیے جائیں۔

اب شرما صاحب غزل یا خط ختم فرماتے ہیں اور غزل کی تاریخ اور سنہ کو غزل ہی میں نظم فرما کر شعرائے بے تاریخ کو ایک سبق دیتے ہیں، پھر ڈاک خانہ والوں کی مشہور عام چوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں:

دسمبر پندرھویں سنہ بست و ہشتم
لفافہ میں روانہ کر، نہ ہو ، گم

مصرعۂ اولیٰ میں حرب ربط کی کمی کو فارسی سے پورا کرنا کمال نہیں تو کیا جہالت ہے؟ پھر شعرا اب تک غزل ہی پر ٹکٹ لگا کر مشاعروں میں روانہ کر دیتے تھے اس لیے آپ نے بتادیا کہ ''لفافہ میں روانہ کر نہ ہو گم''۔

غالب مرحوم شاعری کے ہزار ابوالآبا تھے مگر ان کا عجز کچھ کم قابلِ افسوس نہیں کہ وہ بے شمار مواقع پر مقطع میں اپنا تخلص نظم نہ فرما سکے اور غالب کی جگہ ''اسد'' یا ''اسداللہ خاں غالب'' لانا پڑا اور اس مثال سے تو ساری شاعری عاری ہے کہ کسی شاعر نے اپنا نام تخلص اور عہدۂ ملازمت تک نظم کر دیا ہو اور وہ بھی صرف ایک مصرع میں مگر حضرت شرما کی شعر گوئی اور قادر الکلامی کی قوت ملاحظہ ہو کہ ممدوح نے کس درجہ جامع مقطع فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

مصنف ، مولچند، شرما ہیں ٹیچر
چمکتے دہر میں ہیں مثلِ اختر

بے وقوف ہی ہیں وہ یورپ والے جو حضرت شرما کے ہوتے ہوئے بھی دہر میں ''مریخ'' کی تحقیق میں سرگرداں ہیں۔

اس کے بعد والے اشعار پر چونکہ خود حضرت شرما نے یہ نوٹ لکھ دیا ہے کہ:

''سامعین صاحبان، اس نظم میں عزتِ نفس اور جذبۂ قوی دونوں ہیں''۔

اس لیے اوپر کے تمام اشعار کو آپ کی غزل سمجھنا جائز ہو گیا لہٰذا آپ اوپر کے اشعار میں خدا کے لیے ایک جگہ بتا دیجیے کہ "معشوق عاشق"، حسن وعشق، وصل وہجر، درد، گداز، آہ و نالہ، گل و بلبل، صحرا، ویرانہ، لیلیٰ، مجنوں غرض تغزل کا ایک جملہ بھی لایا گیا ہو، مگر اس "بے تغزلی" پر غزل ہو جانا شرما صاحب کی وہ غزلی فضیلت ہے جس کی وجہ سے آپ:

چمکتے دہر میں ہیں مثلِ اختر

غزل کے بعد آپ کی وہ نظم ہے جس میں "عزتِ نفس" اور "جذبۂ قومی" کے حکیمانہ نکات دغوامض کو حل کیا گیا ہے اور چونکہ ملا رموزی بہت معمولی قسم کے لکھے پڑھے آدمی ہیں اس لیے ان اشعار کی شرح سے عاجز آ کر اس نظم کو نقل کیے دیتے ہیں۔ اب اگر کالج کے ارکان میں ذرّہ برابر بھی قابلیت ہے تو وہ اس نظم کو نصاب میں داخل کر لیں گے۔ وھو ہٰذا:

ہندو مسلم کوئی بھی ہند میں آزاد نہیں　　لطف گلشن میں گل بلبل و شمشاد نہیں
راست گو شیخ کے پیر و بنو اطفال سبھی　　جانتے آپ کیا ہیں قصہ بغداد نہیں
کام نیکی و سخاوت کے جہاں میں کیجیے　　اشرف الخلق یہاں آپ ہیں ہمزاد نہیں
اپنے من مانے سبھی کام جہاں میں کرتے　　مانتے بات کوئی بھی جد و اجداد نہیں
گرسنہ غربا ہیں سردی و جاڑا تن پر　　روئیں طفلاں مگر سنتا کوئی فریاد نہیں
قول کر آئے یہاں آپ کو کیا یاد نہیں　　بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں
فلسفہ رزم خدا یاد کی باتیں پڑھ کر　　سیکھیں جا کر کہاں ملتا کوئی استاد نہیں
عیش و عشرت کا یہ کرتے ہیں یاں ساماں عبث　　ٹھہرا جنت میں لحہ ایک تک شداد نہیں
فکر کہ و مہ کو لگی رہتی ہے نت روزے کی　　کرتے محنت ہیں شب و روز مگر شاد نہیں
اپنے اعمالوں کا اب پھل ملا ہم کو آ کر　　ساری تکلیف سہو پر کرو فریاد نہیں

کام وہ شرما کرو عقبیٰ میں راحت دیویں
کیونکہ چلتی کسی کی واں پہ ہے فریاد نہیں

اب فرمایئے اس نظم کے اندر ایک حرف بھی ہے جس میں آپ کوئی سقم پیدا کر سکیں؟ حق تو

یہ ہے کہ حضرتِ شرما نے ''تغزل''، ''جذبۂ قومی'' اور ''عزتِ نفس'' ایسی حکمت آموز کیفیات کو جس ''عالمانہ شان'' سے نظمایا ہے، اس پر زبان ستائش ہی گنگ ہے۔ پھر یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ مشاعرہ کے ''انعام'' سے حضرت شرما محروم رکھے جاتے ہیں کیوں؟ محض بے انصافی اور ناقدردانی سے۔ کاش انعام دینے والوں میں ایک جج ملا رموزی بھی ہوتے تو واللہ یہ انعام آنکھیں بند کر کے حضرت شرما پر سے نثار کر دیتے، مگر آہ شرما صاحب زمانہ ہی قدردان نہیں اور اس معاملہ میں جو حال آپ کا ہے وہی تو ہمارا بھی ہے۔ کیونکہ جس طرح آپ کو مشاعرے کا یہ ''انعام'' نہ دیا، ہمیں بھی تو اس انعام کا ''جج'' نہ بنایا۔ واللہ ہم تو خوفِ خدا سے کانپ جاتے ہیں کہ آخرکار یہ ارکانِ مشاعرہ اس کھلی ہوئی ناقدردانی پر خدا کو منہ کس طرح دکھائیں گے۔

یہاں پہنچ کر ''مشاعرہ بخیر و خوبی'' ختم ہوا اور حضرت گرامی قدر پرنسپل صاحب نے ارکانِ مشاعرہ کے مصارف اور ان کی شب و روز کی تکالیف اور حضرت قبلہ احسن کی تہجد کی نماز تک کھانا نہ کھانے کے ایثار و مستعدی کا احسان جتائے بغیر الٹا مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، مقابلہ کی نظموں میں کالج کے کامیاب طالب علم جناب عارف صاحب کو ججوں نے ''کپ'' دیا پھر تمام مہمان شعرا کا ایک گروپ کھنچوا کر ان کے ساتھ کر دیا۔ اس گروپ میں ایک صاحب ایسے ضرور ہوں گے جنھیں اپنی تصویر کی خوشی عید کی خوشی سے زیادہ ہوئی ہوگی اور وہ کوشش کریں گے کہ کسی رسالہ میں یہ گروپ چھپ جائے تا کہ علی گڑھ کے ان ''بڑے بڑے لوگوں'' کے ساتھ دنیا انھیں بھی دیکھ لے۔

چونکہ اس سال مشاعرہ میں نہ حضرت بدر جلالی بی۔ اے، ایڈیٹر اخبار ''خلافت'' تھے نہ آخر وقت تک ملا رموزی رہے جو مہمانوں کی طرف سے طلبا اور ارکانِ مشاعرہ، کالج اور یونیورسٹی کے شریک کار حضرات کا ''دو بدو شکریہ'' ادا کرتے اس لیے ہم اس فرض کو یوں ادا کرتے ہیں کہ خدا ان طلبا اور ارکانِ مشاعرہ کو شاد و آباد رکھے جنھوں نے ہم مہمانوں پر اپنا سب کچھ قربان کیا۔ یہاں تک کہ خدا ان طلبا کو بھی کامیاب زندگی دے جنھوں نے اپنے داد کے شور سے ہم مہمانوں کو بعض غزلیں پڑھنا دشوار کر دیا اور اسے اپنی خصوصیت بنا کر اس سے خوش بھی رہے۔ حضرت قبلہ مولانا

احسن اور حضرت گرامی پرنسپل صاحب کالج کے لیے دل ہی وقف ہے۔ شکریہ کیا، پھر یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ آپ حضرات کی بھی وہ نوازشیں ہیں جن سے بدنصیب اور بے وسیلہ مسلمانوں کے علوم وفنون ان کی قومی خصوصیات اور ادبی روایات محفوظ رہ سکتی ہیں۔ حضرت احسن، حضرت پروفیسر پوری اور دسرے پروفیسر صاحبان منتظم طلبا نے مہمانوں کے ساتھ ہی مشاعرے کے نظم اور وقار کو جس بلند پایہ خوش اسلوبی سے باقی رکھنے کی کوشش فرمائی اس کے لیے ہم جس طرح ان اپنے دینی بھائیوں کے شکر گزار ہیں وہاں ہم حضرت گرامی پرنسپل صاحب کو بھی مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ اُن کے خلوص نیت سے ان کے کالج کا یہ ''آل انڈیا مشاعرہ'' اپنی تمام روایات کے ساتھ کامیاب رہا۔ خدا کرے یہ مشاعرہ انھی مسرتوں کے ساتھ اس مرتبہ بجائے شدید جاڑے کے کسی معتدل اور خوشوار موسم میں ہو۔ آمین۔

یہ تو تھی ''روداد مشاعرہ'' اب چند باتیں ایسی بھی سن لیجیے جنھیں ظرافت وخوش طبعی کے مقابل عقل وضرورت سے تعلق ہے اور وہ یہ ہیں۔

علی گڑھ یعنی کالج اور یونیورسٹی کی علمی وادبی روایات اور ذمہ داریوں کے یہ معنی نہیں کہ وہاں ہر سال کوئی ایسا ہی مشاعرہ ہوا کرے جیسا کہ ہندستان کے ہر شہر میں ہوتا رہتا ہے بلکہ جس طرح علی گڑھ اسلامی ہند کی ذہنی اور عقلی اصلاح وترقی کا ایک عظیم الشان مرکز مشن یا مصلح ہے اس کی نسبت سے یہاں کی ہر تحریک میں کوئی ایسی شان ضرور ہو جو مسلمانوں کے عام ذہنی اور فکری اداروں سے اسے ممتاز ومفید ثابت کر سکے، اس لیے آئندہ مشاعرہ کے لیے ذیل کی تجویز وتحریک پیش ہے:

(1) آئندہ مشاعرہ میں جس قدر غزلیں اور نظمیں پڑھی جائیں گی وہ اس طرح روداد میں شائع نہ ہوں گی بلکہ ہر غزل اور ہر نظم پر ایک عروضی اور فنی تنقید ہوگی۔ اس تنقید سے جہاں شاعر کو اپنے نقائص کا علم ہوگا وہاں ناظرین کو علمی اور فنی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ اگر کلام قابل ستائش ہوگا تو اس پر نہایت متانت سے بہتر داد دی جائے گی کیونکہ اس تنقید سے کسی کی دل شکنی مقصود نہیں بلکہ اصلاح وخدمت مقصود ہے۔

(2) جو کہ کم علم، کم عمر اور کم سمجھ لڑکے یا شعرا اپنی واقعی اور علمی قابلیت سے بلند اور نمایاں غزل یا نظم دوسروں سے لکھوا کر پڑھتے ہیں، ان کا سختی سے بھانڈا پھوڑا جائے گا کیونکہ شعر کی خوبی کا معیار، علم و عقل ہونا چاہیے دانستہ چشم پوشی نہیں ورنہ بچوں سے بہترین غزلیں پڑھوانے کا مقصد یہ ہوا کہ مشاعرہ کے صاحب علم و فضل اور ارباب ہوش و خرد شرکا دانستہ طور پر ''بیوقوف'' بن کر یہ کہتے رہیں کہ ''صاحبزادے خوب غزل کہی''۔ ایسی دانستہ داد کے یہ معنی ہیں کہ ہماری علمی مجالس کا ذوق ''علم پسندی'' نہیں بلکہ ''حماقت پسندی'' ہے اس لیے ضرورت ہے کہ ہر طالب علم اور ہر ''شاعر زادہ'' آئندہ کلام غیر کو اپنا کہہ کر نہ پڑھے ورنہ اس پر ہم جو کچھ لکھیں گے اس کی شدت کے ہم ذمہ دار نہیں۔

(3) ایسے شعرا کے نہایت مضحک خاکے اڑائیں گے جو غزل پڑھنے سے پہلے اور غزل پڑھتے وقت مضحکہ انگیز تکلفات اور لائق استہزا حرکات و اطوار کو اختیار کر کے مجلسی ذوق میں غور و تاثر کی جگہ مذاق اور ہائے وہو کی بے ہودگی کو رواج دے رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے ہوگا کہ اس زمانہ کو علم و عقل اور تہذیب و روشن خیالی کا زمانہ کہتے ہیں پھر کس قدر شرمناک بات ہے کہ اس درجہ بیداری میں ہمارا مجلسی رنگ انھیں لایعنی خرافات میں آلودہ رہے جو جہل و بے خبری کے عہد کا نہایت گھناؤنا اور گندہ ورثہ ہے۔

اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ آئندہ مشاعرے میں غزل اور شاعر دونوں کو سنبھل کر آنا چاہیے اور ہماری قلمی دیانت و ذمہ داری کی یہی وہ ''شرط بلاغ'' ہے جسے ہم پورے ادب سے پہلے ہی آپ تک پہنچا رہے ہیں کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ ہم خوشامد کے بعد اگر حق کہنے اور حق لکھنے پر آجائیں تو پھر یہ اپنا علی گڑھ کالج والج تو ایک طرف وہ ''آف انڈیا والی گورنمنٹ'' تک سے تو ڈرتے نہیں اور یہی تو راز ہے جو علی گڑھ کالج اور علی گڑھ یونیورسٹی والے بھی ہم سے دور ہی دور رہا کرتے ہیں۔

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

◆◆◆

علی گڑھ کالج کا مشاعرہ

تمام دنیا کے علوم وفنون سے 1929 کے آخر میں جب یہ ثابت ہو چکا کہ کچھ بھی ہو لیکن کالج میں مشاعرہ ہو کر رہے گا اور عین جاڑے ہی کے موسم میں ہو کر رہے گا تو ہم بھی اپنی زندگی کو خدائے جاں آفریں کے سپرد کر کے ٹھیک آٹھ بجے شب کو حضرت گرامی ادب نواز کپتان محمد رشیدالظفر خاں بہادر بالقابہ (بھوپالی) کے ایک شاندار موٹر پر سوار ہو کر علی گڑھ کالج کی مشہور "مشاعراتی عمارت" عرف یونین کے دروازہ پر اس نستعلیق انداز میں جا کر کھڑے ہو گئے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی، مگر وہ جو صاحبزادہ حامد کمال اور صاحبزادہ علی منصور حضرت ملا رموزی سے پہلے موٹر سے برآمد ہوئے تو تمام دنیا کے پروفیسروں کو یقین ہو گیا کہ ملا صاحب تشریف لے آئے۔

پروفیسر محمد حاذق ایم۔اے، ایل ایل بی، پروفیسر مولانا سید محمد علی احسن احسن مارہروی صدر انجمن خیابانِ اردو، پروفیسر عبدالعزیز پوری ایم۔اے، ایل ایل بی فوراً ہی تشریف لائے اور السلام علیکم کے بعد یہ بھی تو دریافت نہ فرمایا کہ مزاج شریف، خیریت تو ہے، سفر میں آپ کے اسٹیشن پر کوئی بم تو نہیں پھینکا گیا۔ گھر میں تو سب طرح خیریت سے ہے اور بچے تو اچھے ہیں، بس وہ تو آئے اور اسلامی جذبۂ اخوت میں ڈوب کر فرمایا۔ آیئے آیئے تشریف لائے۔ تشریف لایئے۔ آپ ہی فرمایئے کہ ایک چھوڑ تین بزرگوں کے اس دل نواز اصرار پر کیسے ممکن تھا کہ ہم بجائے

یونین میں تشریف لے جانے کے لئے اپنے وطن تشریف لے جاتے۔

غرور و نخوت، تکبر، انانیت کی تمام عزازیلی قوتیں بیدار ہوگئی تھیں جب ہمارے داخلہ پر طلبا نے تالیوں سے ''سر کو آسمان پر اٹھالیا'' صدارت والے چبوترے پر سے حضرت گرامی محمد عبدالمجید صاحب قریشی ایم۔اے، پرنسپل کالج نے کھڑے ہوکر استقبال فرمایا۔ چونکہ حضرت پرنسپل صاحب سے اب معاملات دوستی کی حد تک جا پہنچے ہیں اس لیے بیٹھتے ہی ''پرائیویٹ'' کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کچھ ممدوح ہنسے اور کچھ کچھ ہم، پاس ہی بیٹھے تھے حضرت عالی پروفیسر عبدالشکور ایم۔اے، کسی قدر راد نچے ہوئے اور مصافحہ کے ہاتھ میں سے ایک اور ہاتھ کو ہمارے ہاتھ سے جوڑ کر فرمایا۔ آپ ہیں حضرت نواب مشتاق احمد خاں صاحب بی۔اے (آکسن) خلف اکبر حضرت نواب وقارالملک بہادر غفراں مکاں اور ملا رموزی سے ملنے کے شائق۔ تصدیق یوں ہوئی کہ حضرت نواب صاحب ممدوح بھی بے حد تپاک سے پیش آئے اور وہ تو کہیے کہ ''مشاعرہ کا وقت طلوع ہونے والا تھا'' ورنہ نواب صاحب بہادر ضرور ارشاد فرماتے کہ ملا صاحب کل صبح میری ہی کوٹھی پر ''تناول ماحضر فرمایئے گا'' افغانی سفیر کے لہجے میں عالی منزلت پروفیسر خاوری بھی بیٹھے نظر آئے، چبوترہ کی پہلی سطر میں عالیجناب محمد عمر خاں صاحب شیروانی رئیس بھیکم پور جامہ وار کی شیروانی پہنے بیٹھے تھے۔

انگریزوں نے سائنس کے زور سے ایک ایسا ''عمل'' تیار کردیا ہے کہ جس شخص کو صحیح وقت معلوم کرنا ہو وہ اپنے اُلٹے ہاتھ کی کلائی کو آستین ہٹا کر ایک مرتبہ دیکھے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ 8 بج کر 7 سات منٹ آگئے ہیں، اس لیے حضرت پرنسپل صاحب نے اسی عمل سے کام لے کر فرمایا کہ ...لو بھئی ملا صاحب وقت ہوگیا مگر میرا چشمہ ٹوٹ گیا ہے۔ خیر بغیر چشمہ ہی کے سہی، ادھر مشاعروں کی صدارت کے انتخاب کے لیے کوئی اذاں تو دی نہیں جاتی ہے، صرف قبلہ جناب احسن نے اُس شور و غل میں جو کالج کے طلبا کی صفوں میں گونج رہا تھا کچھ ہونٹ ہلائے تھے کہ پرنسپل صاحب صدر ہوگئے اور تالیاں بج گئیں۔

علوم اسلامی سے واقف مسلمانوں کے نزدیک انسانی جذبات واعتقاد کے لیے وہ گھڑی سب سے زیادہ قابلِ عظمت اور احترام ہوا کرتی ہے جب خدائے عرش وفرش کی عظمت و کبریائی کا کوئی مظاہرہ کیا جائے۔ چنانچہ محترم صدر نے اشارہ کیا اور ایک صاحب نے اٹھ کر قرآنِ محترم کے ایک رکوع سے اس مجلس کا جب افتتاح کیا تو ساری محفل پر ایک پُر جلال سناٹا طاری تھا۔ ہر چھوٹا اور بڑا ''علی گڑھیا'' ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت علی گڑھ والوں کے دینی احساس کا کس درجہ دلنواز درد ح پرور اندازہ ہو رہا تھا۔

اس کے بعد صدر محترم نے زبانِ اردو میں اپنا وہ خطبۂ صدارت پڑھا جو اس مضمون کے ساتھ ہی کہیں نظر آئے گا اور چونکہ یہ خطبۂ صدارت متعلق تھا مشاعرے سے اس لیے اس کی اصولی داد بھی شعرا ہی کے ذمہ ہے اور ظاہر ہے کہ ہم پورے شاعر نہیں مختصر سے شاعر ہیں، اس لیے اس خطبہ کے متعلق اتنا کہہ سکتے ہیں کہ پرنسپل صاحب نے ہزاروں انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں کے سامنے یہ بات ثابت کردی کہ اگر ہندستانی بھائی اپنی مجلسی زندگی میں خطاب و بیان کے لیے اپنی ملکی، قومی اور مذہبی زبان اردو کو اختیار کریں تو اسے سب سمجھ بھی سکتے ہیں اور اس سے انگریزوں کی نظر میں ہندستانیوں کی عزت بھی بڑھ سکتی ہے۔

حضرت مولانا احسن مارہروی قبلہ اور ممدوح کے ''ادبی باڈی گارڈ'' کی کرسیاں پہلے کب صدر کی کرسی سے دور ہوا کرتی تھیں جو اس مرتبہ بھی دور ہوتیں، اس لیے پاس ہی کی کرسی سے انجمن خیابانِ اردو کے معتمد صاحب نے کھڑے ہو کر سال بھر کے کارناموں کو سنایا اور لوگوں نے اسے مجلس کی سالانہ روداد سمجھ کر خوب سنا۔ معتمد صاحب کی آواز صرف انھی کے کام آرہی تھی مجلس کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اب مشاعرے کے معاملات چھڑ چکے تھے کہ طلبا میں ہلچل سی پیدا ہوئی اور یکایک تالیوں کے شور سے مکان گونج اٹھا، دیکھا تو حضرت عالی نواب مسعود جنگ بہادر، وائس چانسلر یونیورسٹی تھے۔ بس اسلامیانِ ہند کی اس عزیز و مقبول ہستی کا اثر تھا کہ چبوترے پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے آپ کی تعظیم کے لیے تو بھی اٹھ میں بھی اٹھ، یہ بھی اٹھ اور وہ بھی اُٹھ یہاں تک کہ صدرِ جلسہ تک ''اُٹھ ہو گئے'' اب جو ممدوح رونق افروز ہوئے تو پھر... مطلع عرض ہونے

لگا۔ اُس وقت خیال آیا کہ اگر آج کو نواب مسعود جنگ بہادر بالقابہ کی جگہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر قیصر جرمنی ہوتے تو وہ قیامت تک بھی مشاعرے میں رات کے گیارہ بجے تک شریک نہ رہتے، مگر نواب صاحب ممدوح کی شرکت سے ثابت ہوا کہ آپ اصول کی عزت کرتے ہیں اور چونکہ مشاعرہ تھا کالج کا اس لیے نواب صاحب ممدوح کا اس کی حوصلہ افزائی کے لیے تشریف لانا اصل میں اصول کی پابندی تھی اور اخلاقاً تو مولانا احسن مارہروی نے ممدوح کی شرکت سے یہی فیصلہ کیا ہوگا کہ ''آئندہ سال کا مشاعرہ اس سے بھی شاندار منعقد کروں گا''۔

پچھلے سال کی چند ''ملّا رموزیانہ سفارشات'' جو اِس مشاعرے کی جماعتِ انتظامیہ میں منظور ہو چکی تھیں تو اس مرتبہ ملّا رموزی ہی نے اِن سے بڑی تکلیف اٹھائی۔ یعنی وہ جو ہم نے لکھ دیا تھا کہ غزل کے درمیان ''حقہ پانی بند'' رہنا چاہیے تو اس مرتبہ مشاعرہ کی اس اسمبلی کے ''واچ اینڈ وارڈ'' حضرت پروفیسر پوری اور اس شعری مجلس مقننہ کے ''مارشل'' پروفیسر محمد حاذق صاحب نے پانی، پان، چائے اور سگریٹ کی تقسیم کی سخت ممانعت فرمادی تھی۔ کوئی تین گھنٹہ تک ایک پکّے مسلمان روزہ دار کی طرح خاموش بیٹھے رہے مگر خدا جانے کیا منظور تھا، حاذق صاحب کو کہ جوں ہی کہ اکبرآباد کے ایک صاحب نے غزل شروع فرمائی حاذق صاحب کے بھاگوں سگریٹ کا چھینکا ہی ٹوٹ پڑا اور ممدوح نے آن کی آن میں سارے چبوترے والوں کو سگریٹ پلادیے۔ ایسی صورت میں پوری صاحب کو کون سا ''خوفِ خدا'' مانع تھا جو آپ خاموش بیٹھے رہتے اس لیے آپ سے اور کچھ نہ بن آیا تو آپ نے ایک شاعر صاحب کا ''گلا دھونے کے لیے'' ایک گلاس پانی لاکر صدر صاحب کی میز پر رکھ دیا، شاعر صاحب نے بھی ''پانی پی کر'' خوب خوب غزل سنائی۔

نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ ''شہرت''، ''تبلیغ''، ''ماحول'' اور ''پروپیگنڈے'' کے اثر سے ہر قسم کا انسان متاثر ہو کر رہتا ہے اور وہ اس اثر کا تابع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ اثر اس کی فطری وضع سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو مثلاً ایک وقت جب تھا ''علی گڑھ کے کھلنڈرے'' دنیا کی حیرت انگیز چیز سمجھے جاتے تھے یا ''شرارت'' اور ریلوے اسٹیشن ماسٹروں کو دق کرنا علی گڑھ کے طلبا کا خاصۂ فطرت تسلیم

کرلیا گیا تھا اور اسے قابلِ تعریف ''زندہ دل'' کہا جاتا تھا۔ اگر چہ یہ روایات اب روایاتِ پارینہ سے کچھ زیادہ نہیں رہیں پھر بھی ان کی شہرت کا یہ اثر ہے کہ علی گڑھ میں داخل ہو کر خشک فطرت طالب علم بھی چاہتا ہے کہ وہ کوئی شرارت فرمائے تا کہ علی گڑھ کا طالب علم مان لیا جائے یا جیسے ہندستان میں افغانیوں کو 'بہادر' مشہور کر دینے سے ملا رموزی ایسے ''فدویانہ جسم کے بزرگ'' بھی ریلوے ٹکٹ کلکٹروں کو ہر آن مرعوب رکھنے پر تلے رہتے ہیں۔ غرض اسی قسم کے جذبات کے تحت ایک ''الہامی شاعر صاحب'' نے جب غزل شروع کی تو اگر چہ یہ سوٹ پہنے ہوئے تھے، پھر بھی طلبا کی صفوف سے ایک آواز آئی کہ ''بس مقطع سنا دیجیے اور تشریف لے جائیے''۔

چونکہ کالج کی روایات میں علم وادب کی تحقیق و ترقی بھی شامل ہے۔ اس لیے مشاعرہ کے بعد یعنی دوسری رات کو 'تمثیل' کے ذریعے حضرت داغ دہلوی اور امیر مینائی کے عہد کی شاعری دکھانا بھی منظور ہو چکا تھا اور اسی مقصد کے لیے حضرت مولانا احسن مارہروی قبلہ نے عالی منزلت نواب کلب علی خاں بہادر مغفور تاجدار رامپور کے مشاعروں کے صحیح حالات کی تحقیق ونقل کے لیے رامپور تک دوڑ بھی فرمائی تھی اور رامپور کے نہایت معتبر ''سلطانی گواہوں'' کے بیانات سے اس تمثیل کو ''مطابق اصل'' بنایا تھا۔ چند طلبا کو حضرت داغ دہلوی، امیر مینائی وغیرہم کا لباس پہنا کر ایک درباری شاعر مرتب فرمایا تھا۔

بظاہر تو یہی تھا کہ کالج کے چند طلبا لمبی لمبی داڑھیاں لگا کر اور عبائیں پہن کر عبدالرحمٰن چغتائی کا بگڑا ہوا دیوانِ غالب بن کر بیٹھ گئے تھے مگر علمی اور فنی نقطۂ نظر سے 1929 میں یہ ایک ایسی ''بے مثل چیز تھی'' جس کے لیے حضرت مولانا احسن مارہروی اور پرنسپل صاحب کالج کے کمالِ تربیت اور حسنِ صلاحیت کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔

دوسری شب کو جب پردہ اٹھا تو واللہ حیرت سی طاری تھی۔ ہر شخص پر یہ دیکھ کر علی گڑھ میں رامپور کا شاعرانہ دربار اپنی ایک ایک ترکیب کے لحاظ سے مکمل و مرتب طریقے پر منعقد ہے۔ جس طالب علم نے جس شاعر کی نقل کی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس یہ تو بیٹھے ہیں امیر مینائی اور وہ دیکھیے وہ بیٹھے مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں حضرت نواب مرزا خاں داغ۔

اس تمثیل کے بے شمار ادبی نکات وفوائد ہم تو آج بسط وشرح سے لکھ کر پھینک دیں علی گڑھ کی طرف مگر سوال تو ہے حضرت گرامی قدر مولوی باہتمام محمد مقتدیٰ خاں صاحب کے تاؤ کا کہ وہ ایسی طویل روداد کے بس چار صفحات چھاپ کر باقی پھینک دیں گے ملا رموزی کی طرف تو؟

اس لیے خلاصہ یوں ہے اس تمثیل کا کہ اس کے دیکھنے سے ثابت ہو گیا کہ کہنے کو تو یہ دور ہے ''عہد علم وترقی'' لیکن ''ادبیاتِ اردو'' خصوصاً اردو کے مشاعروں نے نصف صدی میں بس اس قدر ترقی کی ہے کہ شرکا کو آج کل چائے پلا دیتے ہیں۔ باقی کے تمام حالات وہی ہیں جو آج سے نصف صدی پہلے مشاعروں میں پائے جاتے تھے۔ یقین نہ ہو تو مجلّہ ادبیہ ''نگار'' لکھنؤ بابت ماہ فروری 1930 کی اشاعت میں اردو کے مصدر شہر لکھنؤ کے ایک تازہ مشاعرہ کے حالات دیکھ لو اور پھر اس نصف صدی پہلے کے مشاعروں کی تمثیل کو دیکھ لو وہی شور ملے گا اور وہی ہائے ہائے باقی سب خیریت ہے اور حقیقتاً یہی ایک گراں قدر و گراں مرتبت فائدہ تھا جو اس تمثیل سے علی گڑھ نے سارے ہندستان کے مشاعروں کی اصلاح اور تبدیلی کے لیے اس تمثیل سے پہنچایا اور زندہ ہیں وہ طلبا جنھوں نے اس نقل کو اصل سے ملایا۔

تمثیل کے بعد ملک کے ممتاز و معروف شعرا حضرت عالی مانی جائسی، حضرت عالی فرخ بنارسی، حضرت عالی جگر مرادآبادی اور حضرت عالی اصغر گونڈوی نے بکمال خوش اسلوبی ایک ایک غزل سنائی اور ان حضرات کی صحیح معنی کی شعری قابلیت اور مسلمہ شہرت نے سامعین کو بے قرار بنائے رکھا۔ وہ تو کہیے کہ بس نہ چلا ورنہ طلبا ان تمام حضرات کے اسٹیچو اسی چبوترے پر بنا دیتے مگر اٹھنے نہ دیتے کہ یکا یک اس شاعرانہ پارلیمنٹ کے لارڈ اسپیکر حضرت پروفیسر حاذق نے 75 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک تقریر مہمانوں کے شکریہ کے لیے فرمادی۔ پھر کسے تاب کہ ملا رموزی صاحب کی ''جوابی تقریر'' تک وہ مشاعرے میں ''باقی رہتا'' بس ابھی کہ اس تقریر سے جلسہ پر ''خاموشی چھائی تھی'' کہ گھنٹی کی آواز آئی اور سب کے سب اپنے اپنے کمبل دبا کر... فقط۔

آخر میں ہم حضرت گرامی پرنسپل صاحب کے حسنِ انتظام حضرت گرامی مولانا احسن

مارہروی کے بندوبست اور گرامی منزلت نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ کو مبارک باد دیتے ہیں جنھوں نے اس ممتاز دارالعلوم کی ادبی روایات کی بقا و ترقی کے لیے اپنی بہترین توجہات کو مبذول فرمایا۔

بِرَحْمَتِكَ يَاأَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ!

سسرال

وہ جو کہا ہے کہ ''کافر برحق ہے اور کرنے والا جادو ہے'' سو بالکل اسی طرح یہ بھی برحق ہے کہ غلامی کی آب و ہوا میں پل کر جوان ہونے والے خواہ وہ ڈاکٹر اقبال صاحب کا ''قومی ترانہ'' پڑھ لیں یا مسدس حالی از بر کرلیں، رہتے ہیں ہر حال خستہ وخوار۔ نہ جہالت ان کا پیچھا چھوڑتی ہے نہ وہ جہالت کا افلاس ان میں رہتا ہے اور امراض ان میں، نفاق ان میں تو وقت اور دولت تباہ کرنے کے لیے سنیما اور تھیٹر کے تماشے ان میں، منافقت اور غرور ان میں تو کاہلی اور بے عملی ان میں۔ تعلّی اور تکبر ان میں تو قمار بازی اور چانڈو نوشی ان میں غرض اخلاقی زوال کو جتنا کثرت سے چاہو غلام اقوام میں جا کر دیکھ لو اور یوں کہنے کو ہائی اسکول بھی ان میں ہوتے ہیں اور محمڈن کالج بھی، انجمن حمایت الاسلام بھی ان میں تو انجمن اصلاح المسلمین بھی ان میں۔ برخلاف ایسی قوموں کے آپ یورپ کی ان قوموں میں جا کر دیکھیں جو آزاد ہیں اور جن کی قومی حکومتیں موجود ہیں تو ان میں علم و ہنر، جوشِ عمل، زندہ دلی و خوش فکری اور حصول فتح وظفر کے تمام وہ جذبات بیدار ملیں گے جن سے نجات ہے انسان کی اور جن پر بقا و ترقی موقوف ہے عام انسانوں کی اور ملا رموزی صاحب کی۔ اب اگر یہاں یہ کہہ دیں کہ ہندستانی قومی بہ لحاظ رذائل اور غلط کاریوں کے سارے یورپ میں نمونہ ہیں تو ثبوت میں صرف ہندستانیوں کے سسرال کو پیش کر دینا کافی بھی ہوگا اور روانی بھی۔

غلامی انسان کے جس حصۂ حیات وزندگی کو سب سے پہلے تباہ کرتی ہے وہ اخلاق ہے اور سسرال کا رشتہ یا تعلق بھی انسان کے اخلاق ہی سے ثابت ہے۔ گاندھی جی کے ایک رسالہ ''سوراج'' سے نہیں۔ سسرال اصل میں ہندستانی قوموں کی غلط کاریوں اعتقاد اور رسم کی فضولیوں اور ملعون ومردود آداب وضوابط کا وہ مہلک اور مضحکہ خیز نمونہ ہے جس کی اصلاح پر ساری دنیا کے علی گڑھ کالجوں کو توجہ کرنا از بسکہ لازم وضروری ہے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ''ساون کے اندھے کو ہمیشہ ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے'' سو ہندستانیوں کے عقائد بھی کچھ اسی نوعیت کے واقع ہوئے ہیں۔ آپ چاہے ہندستانیوں کو مقدمہ سازش لاہور میں پھانسی کی سزا دیں لیکن وہ ہر وقت اور ہر حال میں پابند رہیں گے ان ہی رسوم وضوابط کے جو عہدِ جہالت سے ان کے بزرگ انھیں ورثے میں دے گئے ہیں اور یہ کہنا بھول گئے تھے کہ اگر کبھی عہد علم وترقی پاؤ تو ان جاہلانہ اصول ورسوم کو ترک کر دینا۔ پس کہنے کو ساری دنیا کی قوموں کا ایک سسرال ہوا کرتا ہے لیکن ہندستانیوں کے سسرال کو اگر اکبرآبادی سونٹھ کی منڈی کا پاگل خانہ کہا جائے تو غلط نہیں۔ اس سسرال کا جو مفہوم ومنشا طبقۂ اعلیٰ میں سمجھا گیا ہے اسے تو اس لیے جانے دیجیے کہ جو طبقہ اعلیٰ کے افراد کو ''غیر انسان'' یا ''چاروں والا'' کہنا اس لیے موزوں اور صحیح ہے کہ اس طبقہ میں نہ صحیح معنی کی زندگی ہے نہ اصولِ زندگی، نہ ضابطہ کوئی چیز ہے نہ افعال پر کوئی احتساب، نہ جذبات پر قابو، بس یوں سمجھ لیجیے کہ اللّے تللّے آتا ہے اور اناپ شناپ خرچ ہوتا ہے۔ ان میں کا جو فرد جب چاہتا ہے کھانا کھاتا ہے اور جب چاہتا ہے تھیٹر چلا جاتا ہے۔ یہ اپنے سے کم رتبہ انسان کو اپنا غلام تو سمجھ لیتا ہے مگر خدا کا بندہ نہیں سمجھتا، صرف برطانیہ کی حکومت یا برطانوی حکومت کے کانسٹبل سے اس کی روح تک لرزتی ہے اور گورمنٹی احکام کو خاکم بدہن مکہ شریف سمجھتا ہے اس لیے ان اندھوں کے سامنے روئیے اور اپنی آنکھیں بھی کھوئیے۔ البتہ قابلِ ذکر طبقہ ہے، طبقۂ ادنیٰ کہ اسی کے افراد میں مذہب بھی ہے اور اعتقاد بھی، زندگی بھی ہے اور اصولِ زندگی بھی، عمل بھی ہے اور ولولۂ عمل بھی۔ ایثار بھی ہے اور خدمت وقربانی بھی اور یہی وہ طبقہ ہے جس میں انسانی اخلاق و اجتماعیات کے جملہ اصول وضوابط موجود ومروج ہیں۔ اب دکھانا یہ ہے کہ اس طبقہ میں بعض اعمال واعتقادات پر اس قیامت کی شدت اور سختی روا رکھی گئی ہے کہ اگر وہ کل پرسوں تک دور نہ کر دی گئی تو

پھران ہندستانیوں کی اخلاقی اور اجتماعی زندگی کے فاتحہ کا پلاؤ بھی کھا لیجیے۔ اماں غضب خدا کا یہ جاہل یا غریب ہندستان اس وقت کے قاعدوں پر آج تک عمل کر رہے ہیں۔ جب ہم آپ بھی جاہل تھے اور انگریز بھائی بھی۔ چنانچہ عہدِ جاہلیت میں کسی نے یہ بھی کہہ دیا ہوگا کہ ''سسرال'' بھی ان ''مقاماتِ مقدسہ'' میں سے ایک ہے جن پر اپنا سب کچھ قربان نہ کر دینا جہنمی ہونے کی نشانی ہے۔ چنانچہ بظاہر تو ''سسرال'' کہتے ہیں شوہر کے لیے اس کی بیوی کے خاندان کو اور بیوی کے لیے اس کے شوہر کے خاندان کو مگر اصل یہ ہے کہ جن خاندانوں کو ''سسرال'' کہا جاتا ہے وہ انسانی اوقات، دماغ، دولت اور اخلاق کی بربادی اور ہلاکت کے ایسے قرنطینے ہیں جن سے افریقہ جاتے وقت خدا ہر ہندستانی کو بچائے۔ ہندستانیوں میں ''سسرال'' بڑے احترام وادب کی جگہ مانا جاتا ہے یا مانی جاتی ہے جہاں انسان جائے تو ''پاک صاف ہو کر'' بھاری بھاری جوڑا پہن کر، پھر سلام کرے تو جھک کر، بولے تو بڑی تہذیب اور لیاقت سے، بیٹھے تو بڑے قاعدے اور قرینے سے، جواب دے تو بڑی فصاحت و بلاغت سے، پھر اگر ایک مرتبہ سسرال جائے تو پھر عمر بھر جاتا ہی رہے۔ بیٹھے تو روزانہ بیٹھتا ہی رہے اور سوئے تو پھر تین چار ہفتہ تک سوتا رہے۔ اسی طرح اگر سلام کرنے کا قاعدہ یہ ہو کہ بہت زیادہ جھک کر سلام کرے تو پھر ساس اور سسر ہی کو جھک کر سلام نہ کرے بلکہ ساس کی چھوٹی لڑکی کو بھی جھک کر اور بڑے لڑکے کو بھی جھک کر۔ مزاج پرسی کو اگر جائے تو پھر خسر کے مزاج سے لے کر ساس، سالے اور سالیوں کا مزاج بھی دریافت کرے اور ایک قاعدہ ایسا بھی ہے جو ''سسرالی'' صرف ونحو میں سب کو محترم اور مقدس بنا دیتا ہے مثلاً سسر پر فقط ایک لفظ کا اضافہ کر دیجیے تمام محترم افراد خود بخود بنتے چلے جائیں گے۔ مثلاً نانا سسر، دادا سسر، چچا سسر، خالو سسر، ماموں سسر، پھوپھا سسر۔ اب یہ تمام اقسام کے سسر خواہ وہ بیوی کی طرف کے ہوں یا میاں کی طرف کے ہوتے ہیں سب احترام کے قابل اور ان میں سے ایک سے بھی سرتابی، کنارہ کشی، بے رخی، بے اعتنائی اور بے خبری کمینہ پن کی نشانی ہے، عام اس سے کہ ان میں کے تمام قسم کے سسر جاہل ہوں، کندہ ناتراش ہوں، احمق ہوں یا گدھے ہوں۔ غرض کچھ بھی ہو لیکن فقط سسر ہوں پس پھر داماد کے لیے ان کی اطاعت، خدمت، غلامی اور خوشامد فرض ہے۔ یہی حال ''ساس'' کا ہے۔ اس سے بھی نانی ساس، دادی ساس، چچی ساس، خالہ ساس، پھوپھی ساس اور

ممانی ساس پیدا ہوتی ہے پھر یہ جتنی قسم کی ساسیں ہیں داماد پر ان سب کو جھک کر سلام اور ان کی غلامی فرض ہے۔ پھر اگر آپ اتنے سلاموں سے تنگ آ جائیں، تھک جائیں اور اکتا جائیں تو اور جگہ تو ایسے سلام معاف بھی ہو سکتے ہیں لیکن معاف نہیں ہو سکتے تو فقط سسرال میں کہ یہ جگہ ہر حال میں مقدس بھی ہے اور محترم بھی۔ اور یہاں کا ہر فرد آپ کا بڑا بھی ہوتا ہے اور بزرگ بھی۔ مثلاً آپ کی ایک چھوڑ اگر بارہ سالیاں ہیں اور یہ سب کی سب بیوی سے عمر میں بڑی ہیں تو عام اس سے کہ یہ سب کی سب جاہل ہوں، لونڈیاں ہوں، بڑ دنگیاں ہوں، یہاں تک کہ آپ سے بھی عمر میں ایک ہزار سال چھوٹی ہوں مگر وہ اب آپ کے لیے عمر بھر کو بڑی ہو کر رہیں گی۔ پھر لطف یہ کہ ساری دنیا کے عقلمند اور تعلیم یافتہ لوگ بھی ان سب کو آپ کا بزرگ ہی تسلیم کریں گے۔ یہی حال آپ کے سالوں کا ہوگا۔ عام اس سے کہ یہ سالے بھی علم و عقل کے لحاظ سے نرے ہوں، کورے ہوں لونڈے ہوں، بازاری ہوں، مگر آپ کی بیوی سے صرف عمر میں بڑے ہوں تو وہ عمر بھر آپ کے بھی بڑے اور بزرگ ہی بنے رہیں گے اور ایک علی گڑھ والا ایسا نہیں جو انہیں آپ کا چھوٹا قرار دیدے اور اسی لیے ہر حال میں ان سب کی تعظیم اور بزرگی آپ پر مسلّم اور فرض ہے اور اسی وجہ سے اس قسم کا ''چھوٹا پن'' آپ کو بادشاہوں کے خاندانوں میں بھی اختیار کرنا پڑے گا اور مولویوں کے گھرانوں میں بھی اور جو کہیں آپ حواس اور عقل کے لحاظ سے ہیں ذرا بے وقوف سے ذرا گدھے سے، ذرا مفلس سے، ذرا تاریک خیال سے اور بیوی پر ذرا فریفتہ سے، پھر تو آپ کی حیثیت سسرال میں وہی ہوگی جو یورپ والوں کے نزدیک افریقہ کے حبشیوں کی یا شریف ہندستانیوں کی محفل میں رنڈیوں کی یا ہندستانی افسروں کی نظر میں اپنے ماتحت ملازمین کی، یا کوتوال کی نظر میں مشتبہ اشخاص کی، یا مار کھائے ہوئے طلبا کی نظر میں ماسٹر کی، یا ننھے میاں کی والدہ کی نظر میں ملّا رموزی کی یا ملّا رموزی صاحب کی نظر میں ننھے میاں کی والدہ کی۔ یا ہندستانی ٹکٹ کلکٹروں کی نظر میں ہندستانی مسافر عورتوں کی یا بے ٹکٹ سفر کرنے والے سادھوؤں کی نظر میں ریلوے پولیس کانسٹبل کی، یا مہاجن کی نظر میں مقروض لیفٹننٹ گورنر کی یا ثناء اللہ امرتسری کی نظر میں قادیانیوں کی، یا ''چھپّن فیصدی'' والوں کی نظر میں کانگریس والوں کی یا بڑی بیوی کی نظر میں چھوٹی بیوی کی، یا یوپی کے شاعر کی نظر میں اکبر آبادی گدھے کی، یا اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں کی نظر

میں بچہ سقہ کی، یا اخبارات اردو کے ایڈیٹروں کی نظر میں اپنے مضمون نگاروں کی یا سرحدی پٹھانوں کی نظر میں لکھنؤ والوں کی، یا آج کل کے مسلمانوں کی نظر میں ہندو کی یا ہندو کی نظر میں مسلمانوں کی یا رات کو گشت کرنے والے پولیس مین کی نظر میں بے روشنی والے راہگیر کی یا ملا رموزی کی نظر میں بے نمازی مسلمانوں اور منافق دوستوں کی۔

القصہ سسرال نام ہے چند یا زیادہ افراد کی غلامی، طاعت، فرماں برداری اور خدمت کا۔ اب اس سسرال میں ایک فرق یہ ہے کہ بیوی کے لیے اس کا سسرال نہایت مختصر ہوتا ہے یعنی بیوی اپنے سسرال میں شوہر کے صرف والد صاحب، والدہ صاحبہ اور بہن صاحبہ کو جھک کر سلام کرنے اور انھیں ہر حال میں راضی رکھنے پر پابند ہے۔ ان میں سے فقط شوہر کی والدہ اور شوہر کی بہن بیوی کے لیے آفت بھی ہے، مصیبت بھی، کالی بلا بھی ہے اور چڑیل بھی۔ جن بھی ہے اور بھوت بھی، لیکن شوہر کے لیے بیوی کے خاندان کا ہر فرد بادشاہ بھی ہے اور کوتوال بھی اس لیے شوہر پر اپنے سسرال کے ہر فرد کی ناز برداری، غمخواری، ہمدردی، خدمت، تواضع اور تابعداری از بسکہ لازم بھی ہے اور فرض بھی اور یہ فرض ہے جو نہ آج تک علی گڑھ یونیورسٹی بن جانے سے ٹوٹا نہ بنارس میں ہندو یونیورسٹی کے قیام سے ٹوٹا۔ بلکہ انگریزی تعلیم کے لحاظ سے عورت ذات کو جو رتبہ دیا جا رہا ہے اس کے لحاظ سے تو سسرال عنقریب ایک طرح کی کوتوالی ہونے والا ہے، جہاں ہر حال میں چوری کے جرم کا اقبال کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا اس لیے شوہر کے لیے اس کے سسرال کا ہر فرد گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل بھی ہوتا ہے اور کمانڈر ان چیف بھی۔

سسرالی فرائض اور ذمہ داریوں کی تقسیم یوں رکھی گئی ہے کہ جو داماد جتنا بے وقوف ہو، اتنی ہی اس کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ بیوی کے خاندان میں شوہر کے خاندان سے اگر کوئی شخص ملاقات کو جائے تو اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے ساتھ مٹھائی بھی لے جائے اور میوہ بھی، پھل بھی لے جائے اور ترکاری بھی، موزے بھی لے جائے اور پمپ جوتا بھی، جاڑے کا موسم ہو تو لحاف بھی لے جائے اور پشاور کی پوستین بھی، ورنہ سبز چائے۔ بہر حال بیوی کا سسرال خالی ہاتھ جانا عیب بھی ہے اور جہالت بھی۔ عام اس سے کہ بیوی کے سسرال جاتے وقت آپ تین دن کے بھوکے ہوں یا پیاسے، بہ خلاف اس کے بیوی کے خاندان میں جاتے وقت شوہر اس قسم کی ''چنگی'' ادا کرنے یا

ممانی ساس پیدا ہوتی ہے پھر یہ جتنی قسم کی ساسیں ہیں داماد پر ان سب کو جھک کر سلام اور ان کی غلامی فرض ہے۔ پھر اگر آپ اتنے سلاموں سے تنگ آ جائیں، تھک جائیں اور اکتا جائیں تو اور جگہ تو ایسے سلام معاف بھی ہو سکتے ہیں لیکن معاف نہیں ہو سکتے تو فقط سسرال میں کہ یہ جگہ ہر حال میں مقدس بھی ہے اور محترم بھی۔ اور یہاں کا ہر فرد آپ کا بڑا بھی ہوتا ہے اور بزرگ بھی۔ مثلاً آپ کی ایک چھوڑ اگر بارہ سالیاں ہیں اور یہ سب کی سب بیوی سے عمر میں بڑی ہیں تو عام اس سے کہ یہ سب کی سب جاہل ہوں، لونڈیاں ہوں، بڑ دنگیاں ہوں، یہاں تک کہ آپ سے بھی عمر میں ایک ہزار سال چھوٹی ہوں مگر وہ اب آپ کے لیے عمر بھر کو بڑی ہو کر رہیں گی۔ پھر لطف یہ کہ ساری دنیا کے عقلمند اور تعلیم یافتہ لوگ بھی ان سب کو آپ کا بزرگ ہی تسلیم کریں گے۔ یہی حال آپ کے سالوں کا ہوگا۔ عام اس سے کہ یہ سالے بھی علم و عقل کے لحاظ سے نرے ہوں، کورے ہوں لونڈے ہوں، بازاری ہوں، مگر آپ کی بیوی سے صرف عمر میں بڑے ہوں تو وہ عمر بھر آپ کے بھی بڑے اور بزرگ ہی بنے رہیں گے اور ایک علی گڑھ والا ایسا نہیں جو انھیں آپ کا چھوٹا قرار دیدے اور اسی لیے ہر حال میں ان سب کی تعظیم اور بزرگی آپ پر مسلّم اور فرض ہے اور اسی وجہ سے اس قسم کا ''چھوٹا پن'' آپ کو بادشاہوں کے خاندانوں میں بھی اختیار کرنا پڑے گا اور مولویوں کے گھرانوں میں بھی اور جو کہیں آپ حواس اور عقل کے لحاظ سے ہیں ذرا بے وقوف سے ذرا گدھے سے، ذرا مفلس سے، ذرا تاریک خیال سے اور بیوی پر ذرا فریفتہ سے، پھر تو آپ کی حیثیت سسرال میں وہی ہوگی جو یورپ والوں کے نزدیک افریقہ کے حبشیوں کی یا شریف ہندستانیوں کی محفل میں رنڈیوں کی یا ہندستانی افسروں کی نظر میں اپنے ماتحت ملازمین کی، یا کوتوال کی نظر میں مشتبہ اشخاص کی، یا مار کھائے ہوئے طلبا کی نظر میں ماسٹر کی، یا ننھے میاں کی والدہ کی نظر میں ملا رموزی کی یا ملا رموزی صاحب کی نظر میں ننھے میاں کی والدہ کی۔ یا ہندستانی ٹکٹ کلکٹروں کی نظر میں ہندستانی مسافر عورتوں کی یا بے ٹکٹ سفر کرنے والے سادھوؤں کی نظر میں ریلوے پولیس کانسٹبل کی، یا مہاجن کی نظر میں مقروض لیفٹنٹ گورنر کی یا ثناء اللہ امرتسری کی نظر میں قادیانیوں کی، یا ''چھپن فیصدی'' والوں کی نظر میں کانگریس والوں کی یا بڑی بیوی کی نظر میں چھوٹی بیوی کی، یا یوپی کے شاعر کی نظر میں اکبرآبادی گدھے کی، یا اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں کی نظر

میں بچہ سقہ کی، یا اخبارات اردو کے ایڈیٹروں کی نظر میں اپنے مضمون نگاروں کی یا سرحدی
پٹھانوں کی نظر میں لکھنؤ والوں کی، یا آج کل کے مسلمانوں کی نظر میں ہندو کی یا ہندو کی نظر میں
مسلمانوں کی یا رات کو گشت کرنے والے پولیس مین کی نظر میں بے روشنی والے راہگیر کی یا
ملّا رموزی کی نظر میں بے نمازی مسلمانوں اور منافق دوستوں کی۔

القصہ سسرال نام ہے چند یا زیادہ افراد کی غلامی، طاعت، فرماں برداری اور خدمت کا۔
اب اس سسرال میں ایک فرق یہ ہے کہ بیوی کے لیے اس کا سسرال نہایت مختصر ہوتا ہے یعنی بیوی
اپنے سسرال میں شوہر کے صرف والد صاحب، والدہ صاحبہ اور بہن صاحبہ کو جھک کر سلام کرنے
اور انھیں ہر حال میں راضی رکھنے پر پابند ہے۔ ان میں سے فقط شوہر کی والدہ اور شوہر کی بہن بیوی
کے لیے آفت بھی ہے، مصیبت بھی، کالی بلا بھی ہے اور چڑیل بھی۔ جن بھی ہے اور بھوت بھی،
لیکن شوہر کے لیے بیوی کے خاندان کا ہر فرد بادشاہ بھی ہے اور کوتوال بھی اس لیے شوہر پر اپنے
سسرال کے ہر فرد کی ناز برداری، غمخواری، ہمدردی، خدمت، تواضع اور تابعداری از بسکہ لازم بھی
ہے اور فرض بھی اور یہ فرض ہے جو نہ آج تک علی گڑھ یونیورسٹی بن جانے سے ٹوٹا نہ بنارس میں
ہندو یونیورسٹی کے قیام سے ٹوٹا۔ بلکہ انگریزی تعلیم کے لحاظ سے عورت ذات کو جو رتبہ دیا جارہا ہے
اس کے لحاظ سے تو سسرال عنقریب ایک طرح کی کوتوالی ہونے والا ہے، جہاں ہر حال میں چوری
کے جرم کا اقبال کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا اس لیے شوہر کے لیے اس کے سسرال کا ہر فرد گورنر جنرل بہ
اجلاس کونسل بھی ہوتا ہے اور کمانڈر ان چیف بھی۔

سسرالی فرائض اور ذمہ داریوں کی تقسیم یوں رکھی گئی ہے کہ جو داماد جتنا بے وقوف ہو، اتنی
ہی اس کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ بیوی کے خاندان میں شوہر کے خاندان سے اگر کوئی شخص
ملاقات کو جائے تو اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے ساتھ مٹھائی بھی لے جائے اور میوہ بھی، پھل بھی لے
جائے اور ترکاری بھی، موزے بھی لے جائے اور پمپ جوتا بھی، جاڑے کا موسم ہو تو لحاف بھی
لے جائے اور پشاور کی پوستین بھی، ورنہ سبز چائے۔ بہر حال بیوی کا سسرال خالی ہاتھ جانا عیب بھی
ہے اور جہالت بھی۔ عام اس سے کہ بیوی کے سسرال جاتے وقت آپ تین دن کے بھوکے ہوں یا
پیاسے، بہ خلاف اس کے بیوی کے خاندان میں جاتے وقت شوہر اس قسم کی ''چنگی'' ادا کرنے یا

لگان دینے سے بری ہے لیکن اگر اپنی بیوقوفی سے کچھ لے جائے تو یہ اس کی ''سعادت'' بھی ہے اور ''شرافت'' بھی۔ پھر بظاہر تو شوہر کو اپنے سسرال کے ہر فرد کو جھک کر سلام کرنا پڑتا ہے، لیکن اصلیت میں وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ اگر ہفتہ وار ماہوار یا پھر روزانہ ہی بیوی کے خاندان کی خیریت دریافت کرنے حاضر نہیں ہوتا پھر اگر بیوی کے بھائی جاہل ہیں، غنڈے ہیں، آوارہ ہیں تو شوہر کا سسرالی فرض ہے کہ وہ ان سب کو اپنے روپیہ سے تعلیم دلائے، نوکر رکھائے اور ہو سکے تو شادی بھی اپنے ہی روپیہ سے کرائے۔ یہی ضابطہ سالی اور سالیوں کا ہے یعنی اگر سالی کی شادی ہو تو اسے زیور بھی دے اور کپڑے بھی اور جو سالی بیوہ ہو تو اس کا عقدِ ثانی کرائے یا پھر اپنے گھر میں رکھے۔ اگر خسر صاحب پنشن پا جائیں تو ان کی عاقبت بخیر تک ان کی امداد بھی کرے اور خدمت بھی، پھر اگر سسرال سے کوئی بھاگ جائے تو یہ داماد اس کی تلاش کے لیے اخباروں میں اشتہار بھی دے، کوتوالی میں رپٹ بھی لکھوائے اور حلیہ بھی اور جو پتہ چل جائے کہ بیوی کا وہ بھاگا ہوا عزیز رسالہ ''ادیب'' پشاور کے دفتر میں جا ٹھہرا ہے تو یہ داماد بھی بستر لے کر ''ادیب'' کے دفتر میں پہنچ جائے، عام اس سے کہ ایڈیٹر صاحب ''ادیب'' دونوں کو نکال باہر کریں یا ایک کو۔

پھر اگر بیوی کے خاندان میں کوئی بیمار ہو جائے تو داماد کا پہلا یہ فرض ہے کہ وہ خبر سنتے ہی موٹر میں یا تانگے میں، ڈولی میں یا سائیکل پر اپنی بیوی کو لے کر حاضر ہو جائے پھر مریض کے پلنگ پر خود بھی بیٹھا رہے اور بیوی بھی۔ پھر مریض کا تھوک بھی صاف کرے اور بستر بھی۔ پھر اگر یہ مریض حکیم محمد اجمل خاں صاحب کے علاج کے لیے دہلی جانا چاہے تو داماد اس کے ساتھ دہلی بھی جائے اور حکیم صاحب ممدوح ہوں اس وقت ریاست رامپور میں تو یہ داماد دہلی سے رامپور بھی جائے اور مریض کو ساتھ لے جائے اور جو یہ مریض دہلی سے واپس ہوتے ہوئے راستے ہی میں ''جاں بحق تسلیم'' ہو جائے تو گھر آ کر بہنوں کے ساتھ چلا چلا کر خود بھی روئے اور اپنی ذاتی ماں بہنوں کو بھی سسرال پہنچ کر رونے پر مجبور کرے۔

یہاں تک تو تھا معاملہ فرائض کا اب مرتبہ ہے اتفاق واتحاد کا۔ پس اگر آپ ذی ہوش بھی ہیں اور تعلیم یافتہ بھی، روشن خیال بھی اور انسانوں کے ہمدرد بھی، اس لیے اگر آپ چاہیں کہ میاں بیوی کے خاندانوں میں باہمی اتفاق بھی رہے اور خوشگواری بھی، محبت بھی رہے اور ایک دوسرے

سے خلوص بھی لہٰذا اس جذبے سے اگر آپ اپنے سسرال جاتے ہیں تو آپ کی ماں بہنیں آپ کی دشمن ہو جاتی ہیں۔ اس خیال سے کہ مبادا ہمارا بیٹا یا بھائی اپنے سسرال والوں کا ہو کر نہ رہ جائے، اس لیے جب آپ سسرال سے واپس آئیں گے تو آپ کی والدہ اور آپ کی بہن آپ پر طعن، ملامت، طنز اور ڈانٹ سے بھی دریغ نہ کریں گی۔ اس موقع پر یا تو یہ ہوتا ہے کہ داماد اپنی ماں بہنوں سے کہتا ہے بس بس معاف کیجیے اگر اب سسرال جاؤں تو اتنا کا اتنا بڑا ہی زمین میں سما جاؤں۔ یا پھر یا ہوتا ہے کہ داماد اپنے اپنے سسرال کے جانے اور وہاں میل جول رکھنے کو اپنے خاندان والوں سے ہمیشہ ''خفیہ پولیس'' رکھتا ہے اور جوان حالات میں داماد ہوتا ہے بے وقوف تو وہ یا اپنی ماں بہنوں کے ساتھ مل کر اپنے سسرال والوں سے لڑتا ہے یا خود اپنے خاندان والوں سے۔ نتیجۃً اگر یہ نکلے کہ داماد کو مارے جھگڑوں کے علاحدہ مکان میں رہنے پر عافیت نظر آئے تو پھر محلے والے کہتے ہیں کہ ''لڑکا شادی ہوتے ہی نالائق ہو گیا''۔

تو آپ یوں خلاصہ کر لیجیے ان حالات کا کہ ہندستانی غربا اور جاہلوں کے لیے سسرال ایک ایسی بلا ہے جس سے نہ قربت اچھی نہ جدائی اچھی اور یہ سب کچھ اثرات ہیں تعلیمات اسلامی سے بُعد و بے خبری اور جاہل بزرگوں کی رسوم و عادات کی پیروی کے، اس لیے دعا کیجیے کہ خدا ان حالات سے ہمیں اور ہمارے ننھے میاں کی تازہ والدہ کو محفوظ رکھے۔

پھر کیا ہو کہ کوئی ایک مسلمان اٹھے اور ہندستانی سسرالوں کے لیے ایک باقاعدہ قانون اسمبلی سے یوں منظور کرادے جیسے ہندوؤں کے لیے ''شاردا بل'' منظور ہو چکا کہ اصل میں سسرالوں کی اصلاح مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشی اصلاح ہے اور اسی پر مدار ہے حیات وزندگی کی خوشگواری کا۔

مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ ملا رموزی صاحب کے سسرال کے حالات نہایت عمدہ اور خوشگوار ہیں ورنہ کہیں آپ خیال فرمائیں کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ...

◆◆◆

ساڑھے پانچ دن کا علی گڑھ

شہر علی گڑھ میں تانگے والے، دھوبی، جلاہے، قلی، مزدور، افیونی، تمباکو فروش، زنانِ بازاری اور اکبر آباد زدہ شاعری کے پتلے بھی رہتے ہیں، مگر یہاں کالج اور یونیورسٹی بن جانے سے عوام ہند اور خواص ہند جہاں علی گڑھ کا نام آیا اور لوگوں کے خیالات معاً کالج اور یونیورسٹی کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ پس اس یونیورسٹی سے جہاں ہر خوبی کی توقع قائم کرلی جاتی ہے وہاں اس شہر کی ہر خطا اور ہر کمزوری بھی یونیورسٹی ہی کے سر تھوپی جاتی ہے اور علمی و ادبی لوگوں میں تو علی گڑھ کے معنی ہی یونیورسٹی ہے یا کالج، اس لیے قدرتاً اس شہر میں آنے والا سب سے پہلے یہاں کی تعلیم، تہذیب، تمدن، معاشرت، اجتماعیات اور اخلاقیات ہی پر نظر ڈلتا ہے لہٰذا ہم بھی نہ یہاں کے "مدار دروازے کے حالات" بیان کریں گے نہ گھنٹہ گھر کا تذکرہ، پس اگر مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ ملا رموزی صاحب یہاں کی اصطلاح میں بیسویں دسمبر 1929 کی دوپہر کو داخل ہوئے تو اس وقت سے لے کر وہ واپسی کے آخری منٹ تک یہاں متین سے متین اور بے تکلف سے بے تکلف رنگ میں رہے، مگر نگاہِ تحقیق و تنقید زندگی کے ان حصوں کی دیکھ بھال سے کبھی غافل نہ رہی جو اوپر بیان ہو چکے اور اصلاح و نکتہ چینی کی یہ نظر ہر جگہ اور ہر حال میں یوں پیوست ہوگئی گویا کسی اکبر آبادی ماہر دنداں ساز نے بنی اسرائیل اسٹریٹ کے کسی پوپلے شاعر کے اُبال کھائے ہوئے منہ

میں پوری کی پوری بتیسی فٹ کر دی ہو۔

کالج کے آل انڈیا مشاعرہ کے دوسرے ہی دن حضرت محترم پروفیسر عبدالعزیز پوری ایم۔ اے، ایل ایل بی نے ہمیں دعوت دی۔ چونکہ ایک صاحب اور شریک تھے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اصل دعوت ان کے اعزاز میں تھی اور ہم ''برائے بیت'' تھے یا اصل دعوت ہمیں تھی اور وہ بقدر ذائقہ تھے۔

حضرت پوری مدظلہ تاریخ کے ایک متبحر عالم اور ادب نواز بزرگ ہیں اور ہمارے مخلص ترین قدرداں اس لیے مرغ مسلم سے تواضع فرمائی، جو ہندستانیوں میں سب سے بڑھیا قسم کی غذا مانی جاتی ہے۔ کھانا کھانے کا طریقہ انگریزوں کی عادت کے موافق اختیار کیا گیا تھا یعنی میز کرسی پر بیٹھ کر کھا رہے تھے اس لیے باتیں بھی خاص ہوتی رہیں اور ہاں خوب یاد آیا کہ اور بھی انواع و اقسام کے کھانے موجود تھے ورنہ آپ یہی سمجھ لیں کہ بس ایک مرغا، اگر پکا لیا تو کہاں کا تیر مارا۔

دوسرے دن پروفیسر احسن مارہروی صدر انجمن خیابانِ اردو کا دعوت نامہ آیا جس میں بعد سلام مسنون آنکہ لکھا تھا کہ آج میرے ہی ساتھ ''نانِ خشک تناول فرمایئے'' ممدوح کے ہاں سر سے پاؤں تک مشرقی عرف اسلامی اصول و قواعد کے کھانے تھے۔ اس لیے نشست بھی ''زمین دوز تھی'' اور دسترخوان بھی رنگین اور پھول بیل بنا ہوا۔ کئی قسم کا گوشت اور ایک قسم کی دال اور وہ بھی ماش کی دال تھی جو علی گڑھ کالج کے بورڈنگ سے لے کر ہندستانی رئیسوں کے دسترخوانوں تک کی زینت سمجھی جاتی ہے۔ آخر میں مٹھائی بھی لائی گئی تھی۔ قبلہ احسن مارہروی اب ذرا بوڑھے سے ہو چلے ہیں اس لیے کھانے پر ہاتھ صاف کرتے وقت ہی آپ کے لیے گرما گرم روٹی پکائی جاتی ہے اور عام روٹیوں کے مقابل آپ کے حصہ کی روٹی ذرا گداز اور ایک طرح کا ڈنلپ ٹائر ہوتی ہے، مزاج میں پرانے زمانے کی تعلیم و تربیت یا اسلامی اصول و آداب کا رنگ غالب ہے۔ اس لیے میزبان کی تواضع پر مرتے ہیں۔ لہٰذا گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر بیٹھ گئے اور دس بارہ لقموں کے بعد یہ ضرور فرماتے تھے کہ ''ذرا اس ترکاری کو تو چکھیے'' اس دسترخوان پر ممدوح کے ارشد تلامذہ میں سے حضرت مولانا ابر گنوری اور حضرت مولانا آرزو احسنی بھی شریک تھے۔ کھانے کے بعد وہی اکبر بادشاہ کے زمانے کا حقہ آیا اور وہ پلنگ بھی بچھا دیے گئے تا کہ شاہی زمانے کے رنگ کا قیلولہ

بھی فرمایا جائے۔

جن لوگوں کے قلمی ناموں سے علی گڑھ یونیورسٹی کا نام روشن ہوسکتا ہے ان میں حضرت جلیل احمد قدوائی بی۔ اے علیگ کا مرتبہ خاص اور نمایاں ہے۔ مگر قدر روانی یہ ہے کہ رجسٹرار آفس میں نوکر ہیں اور دس بجے سے شام کے پانچ بجے تک دفتر کی کرسی کو بغیر رخصت اتفاقی چھوڑ نہیں سکتے۔ یہی وہ ذی علم جلیل احمد قدوائی ہیں جن کے زور قلم نے ادب اردو میں روسی ادب وانشا کو پوری کامیابی سے روشناس کرایا اور زبانِ اردو کا بلند سے بلند معیار رسالہ نہیں جو آپ کے اچھوتے فسانوں کو شکر گزاری کے ساتھ قبول نہ کرتا ہو مگر لعنت ہی ہو ایسی قوم پر جس کے جلیل ورشید اور رموزی ایسے شگفتہ نگار ملازت کی حاضریاں دیتے پھریں اور نظام حیدرآباد کو یار لوگ اطلاع بھی نہ دیں۔

غرض یہ علی گڑھ کے صاحب باغ میں رہتے تو کیا ہیں رہنے والوں کی نقل کرتے ہیں یعنی ایک تنگ وتاریک مکان میں چند کرسیاں ہیں اور دیوار پر چند تصاویر اور یہی کچھ نمونہ ہے اردو کے برنارڈ شا حضرت ملا رموزی کے ایوان کا۔ صبح سویرے حضرت احسن مارہروی کے تانگے پر سوار ہو کر جلیل صاحب کے مکان پر پہنچ رہے تھے کہ راستہ میں دوٹین کے سائبان والا ''سنیما'' نظر آیا، جو اسکول کالج اور یونیورسٹی کے پردیسی طلبا کی جیبوں سے روزانہ دولت خالی کرالیتا ہے اسی سے ملا ہوا ایک انگریزی سامان کا بازار ہے اور انگریزی وضع کا ہوٹل، ان کے ہونے سے دولت مند طلبا بجائے چار آنے کے ایک سے لے کر دس روپیہ تک کا کھانا روزانہ بھی کھاتے ہیں اور ہفتہ وار سے تو چوکتے نہیں، دولت کو تباہ کرنے کے ان کے ذرائع پر جو کسی کی نظر نہیں پڑتی تو اس لیے کہ سبھی شوقین واقع ہوئے ہیں۔

دروازے پر آواز دی تو جلیل صاحب یوں آچھوے گویا ہم ان کے کوئی ''گم شدہ عزیز'' تھے جو مع بستر کے آج ان کو مل گئے۔ کوئی دو گھنٹے تک بیٹھے مگر قسم لے لو جو اپنی بیوی کے سوا ہم میں سے کسی ایک نے دنیا کا کوئی اور تذکرہ کیا ہو، بس فرق یہ تھا کہ ہم اپنی جاہل اور بھونڈی ننھے میاں کی تازہ والدہ کی برائیاں بیان کرنے میں مصروف تھے اور جلیل صاحب اپنی بیوی کے محاسن ومحامد گنا رہے تھے مگر اس عزیز از جان داستان کو جس چیز نے مختصر کرادیا وہ عقل وخرد کو جلا کر خاک

کر دینے والا ''دفتر کا وقت'' تھا جس کی پابندی سے انشاء اللہ انتقال کے دن ہی فرصت نصیب ہوگی۔

حضرت خواجہ مسعودعلی ذوقی بی۔اے بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ان ہونہار انشاپردازوں میں ہیں جن کے مدرسے آفریں فسانے رسائل اردو میں بے حد وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ وہ ایک شیوا بیان شاعر بھی ہیں اور اگر خدا انھیں مقدرت دے دے تو اسی یونیورسٹی میں ایم۔اے پاس کریں اور اسی میں ایل ایل بی پھر اسی میں وکالت کریں اور اسی میں ڈپٹی کلکٹری مگر نہ جائیں تو یونیورسٹی کے باہر۔یعنی وہ اسی یونیورسٹی کے بی۔اے ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ایم۔اے کا امتحان دے کر پھر اسی یونیورسٹی میں داخل ہو چکے ہیں ۔آپ کے ''زرخرید کمرے میں'' حضرت اصغر گونڈوی اور حضرت جگر مرادآبادی سے تعارف ہوا اور فوراً ہی ہم سب چائے پر بٹھا دیے گئے ۔اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ پہلے ہی ایک دسرے سے ''رشتہ داری'' تھی اس لیے چائے کی پوری ایک پیالی بھی نہ پی ہوگی کہ سب بے تکلف ہو گئے ۔حضرت اصغر گونڈوی اور حضرت جگر مرادآبادی وہ اچھوتے اور وجد آفریں طرز شعر کے موجد ہیں اور ممدوحین گرامی کا رنگِ تغزل کچھ اس درجہ بھی ممتاز و مختص ہے کہ وہ سارے ہندستان میں اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی مشہور ہو چکے ہیں ۔ حالانکہ وہ بچپن ہی سے اصغر گونڈوی بھی تھے اور جگر مرادآبادی بڑھاپے سے قریب ہونے والی عمر کے ایک رند مشرب اور پابند شریعت بزرگ اس لیے ہیں کہ خود ہماری اقتدا میں انھوں نے مغرب کی نماز پڑھی تھی ۔ یہی عالم حضرت اصغر گونڈوی کے اتباع شریعت کا ہے ۔اور ممدوح محترم کو شریعت اسلامی کے ہر حکم کی پابندی سے جو شغف حاصل ہے اسی نے ملّا رموزی کو ممدوح کی نگاہ میں ''عزیز'' بنادیا اور ممدوح نے ہمارے مضامین کی جس روح کی داد عطا فرمائی اس پر نہ علی گڑھ والوں کی نظر پہنچی نہ دیوبند والوں نے سمجھا۔یعنی آپ نے فرمایا اور بڑے پیار سے فرمایا کہ ''مجھے آپ کے مضامین میں آپ کی مذہبیت کا رنگ سب سے زیادہ عزیز ہے'' جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضرت اصغر کو دنیا میں صرف مذہب عزیز ہے اس لیے مذہب کی ہر چیز کے وہ قدرداں ہیں اور اسی لیے ممدوح سے اب وہ دوستی ہوئی ہے جو نشاء اللہ اب نہ ٹوٹے گی اور خط و کتابت بھی جاری رہے گی۔

قبلہ پروفیسر احسن مارہروی کے شاگرد حضرت عزیز آرزو احسنی نے بڑے خلوص سے فرمائش کی کہ ہم ان کے "مسلم یونیورسٹی بک ڈپو" کا معائنہ بھی کریں اس لیے حضرت ابر گنوری احسنی کی معیت میں اس بک ڈپو میں گئے، دیکھا کہ نہایت صاف اور ستھری الماریوں میں کتابوں پر کتابیں یوں رکھی ہیں کہ نظر فریب کہیں انھیں اور جگہ جگہ میز کرسیاں یوں رکھی ہیں کہ "دلکش کہیں جنھیں"، انگریزی دفتر کی تہذیب کے جملہ لوازم مہیا تھے، کتابوں کی ترتیب یوں ہے کہ ہر کتاب بڑی آسانی سے مل سکتی ہے ہر قسم اور ہر زبان کی کتابوں کا ذخیرہ کافی سے زیادہ ہے۔ البتہ اکبرآبادی خرافیات کا ذخیرہ نہیں ہے اور یہ دریافت کرنا بھی بھول گئے کہ احادیث اور قرآن محترم کی جلدوں کی تعداد کتنی ہے؟ بہرکیف حضرت آرزو احسنی کا خلوص سب سے بڑی کتاب تھی جو اس بکڈپو میں نظر آئی۔

خبر ملی کہ حضرت نیاز فتح پوری ایڈیٹر "نگار" لکھنؤ بھی تشریف لے آئے ہیں اور حضرت پروفیسر حاذق ایم۔اے کے ہاں مقیم ہیں۔ ہم حضرت حاذق کے ہاں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ حضرت حاذق حضرت رشید احمد صدیقی کے دولت خانہ پر ہیں۔ یہاں پہنچے تو پروفیسروں کا ایک مجمع موجود تھا، مگر نیاز صاحب نہیں تھے۔ حضرت رشید احمد صاحب صدیقی موجود تھے اور حضرت قاضی جلال مدظلہ، صدر جلسہ بنے بیٹھے تھے۔ ہم نے جاتے ہی قاضی جلال صاحب سے مصافحہ کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ حضرت رشید صدیقی نے ہمیں اس وقت نہ پہچانا۔ اس لیے گو ہم نے ممدوح سے خیریت بھی دریافت کی مگر کسی اخاہ ملا رموزی صاحب کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ ایک پروفیسر صاحب نے اللہ کے نام پر پان کھلا دیا اور ہم اٹھ کر چلے آئے بس آنا تھا کہ محفل میں کسی نے رشید صاحب سے کہا کہ اماں یہ کیا غضب کیا آپ ملا رموزی سے مخاطب بھی نہ ہوئے تو رشید صاحب نے کہا ہوگا کہ لاحول ولا۔ واللہ میں تو نہ پہچانا اور آپ نے مجھ سے کہا بھی نہیں کہ آگئے ہوں گے جگر مرادآبادی اس لیے رشید صاحب نے جگر صاحب سے کہا ہوگا۔

بھئی جگر سنو تو مجھ سے ایک بڑی فروگزاشت ہوگئی۔ وہ ملا رموزی بے چارے کل مجھ سے ملنے آئے اور بھئی قرآن مجید کی قسم مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ میں نے انھیں مطلق نہ پہچانا، اور پتہ یہ قاضی جلال صاحب نے بھی بتایا تو کب جب وہ بے چارے چلے گئے۔ استغفراللہ بعض اوقات

عجیب قسم کی غلطی ہو جاتی ہے۔اس لیے حضرت جگر مرادآبادی ذوقی صاحب کے کمرے میں آئے اور ہم سے سارا واقعہ نقل کیا اور ہم اسی وقت جگر صاحب اور اصغر صاحب کے ہمراہ رشید صاحب کے پاس گئے۔نہ پوچھو اس وقت رشید صاحب کی ملاقات اور معذرت کا لطف، بڑے تپاک سے فرمایا کہ بڑی فروگزاشت ہوگئی۔جی میں تو آیا تھا کہ کہہ دیں کہ کیوں صاحب اگر کوئی مسلمان آپ کے گھر میں آپ سے ملنے آجائے تو بغیر تعارف آپ اس سے ایسے ہی ملیں گے جیسے بغیر پہچانے ملا رموزی سے ملے؟ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ آپ اپنے گھر پر آنے والے ہر مسلمان سے دریافت فرمائیں کہ کہیے کہاں سے تشریف لائے اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو میں حاضر ہوں کہ یہی آدابِ اسلامی ہیں ایک مسلمان سے مسلمان بھائی کی ملاقات کے۔بارے ملاقات یا بے تکلفی تو پہلے ہی سے تھی اس لیے جلد نئے پرانے ہو گئے۔ممدوح نے فوراً ہی دعوت دی کہ شام کو یہاں تناول ماحضر فرمایئے اور ساتھ ہی رسالہ ''مخزن'' لاہور میں ہمارے لکھے ہوئے شذرات کی پختگی کی بے حد داد عطا فرمائی اور اس میں زبانِ اردو پر تبصرے کی وسعت تحقیق اور رنگینی پر اظہار حیرت و پسندیدگی فرمایا۔اب کیا تھا ملا رموزی بھی مارے خوشی کے پھول گئے اور دن میں دس مرتبہ حاضر ہونے کی ٹھان لی۔یہاں سے چلے تو پروفیسروں کی معاشرت کا اندازہ کرنے کے لیے خواہ مخواہ ہر پروفیسر کے مکان پر جا پہنچے۔پھر نہ پوچھیے ان حضرات کے مکانوں کی انگریزی آرائش، بس فرنیچری حساب سے ہر پروفیسر کا مکان نئی دہلی تھا جس کی تعمیر پر 14 کروڑ روپیہ صرف ہوئے ہیں، جن قیمتی قالینوں پر کبھی اپنے بزرگ تکیہ لگا کر بیٹھا کرتے تھے یہاں ان قالینوں پر اب کرسیاں اور انگریزی جوتے بیٹھا کرتے ہیں۔دروازوں پر انگریزی پردے، میزیں، آئینے، تصاویر، پائیں باغ وغیرہ کے مصارف اگر جمع کیے جائیں تو یقین آجاتا ہے کہ اگر ان پروفیسروں کی تنخواہ میں دوگونا اضافہ نہ کیا گیا تو وہ طلبا سے رشوت لینا شروع کر دیں گے۔دیر تک سوچتے رہے کہ جب اساتذہ کی اس معاشرت کو کم سمجھ طلبا روزانہ دیکھتے رہیں گے تو پھر وہ تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے مکانوں کو بھی بکھنگم پیلیس بنانے کے خواہش مند نہ ہوں گے تو کیا احباب سے اپنے مکان کے باہر والے چبوترے پر چٹائی بچھا کر ملا کریں گے؟

ان مکانوں کے انگریزی فرنیچر پر خدا جانے کئی ہزار روپیہ انگریز تاجروں کو ان پروفیسروں

سے ملتا ہوگا؟ مگر وہ تو کہا ہے نا کہ:

خدا نے پانچ پروفیسروں کو یکساں نہ کیا، سوان پروفیسروں کی انگریزی معاشرت کا توڑ یوں ہوگیا ہے کہ اللہ میاں نے انھیں میں سے ایک صاحب کو پروفیسر فاروق ایم۔ایس۔سی بنا ڈالا ہے۔ چنانچہ ممدوح کے مکان کو دیکھ کر پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ آپ نے تمام انگریزی معاشرت والے پروفیسروں سے ''مقاطعہ مکانی'' کیا ہے اور اسی لیے آپ ایک ایسی چارپائی پر لیٹے رہتے ہیں جو نہ آسانی سے کروٹ لینے دیتی نہ کبھی مسہری کا ذائقہ دیتی۔ ممدوح محترم کے ایک شاگرد پیچھے پڑ گئے کہ چلیے اور حضرت فاروق سے ملاقات کیجیے کہ ممدوح آپ سے ملنے کے بے حد شائق ہیں۔

علی گڑھ کی تمام عمارتوں کی بدقسمتی سے آپ کا کوٹھی نما حجرہ سڑک سے بالکل ہی متصل واقع ہوکر رہ گیا ہے، دنیا جہاں کے تمام مکانوں میں داخل ہوتے وقت پہلے کرسی، قالین یا تخت نظر آتا ہے لیکن ممدوح کی اس مہمان سرائے میں سب سے پہلے آپ کی چارپائی نظر آتی ہے اور اس چارپائی پر فاروق صاحب یوں لیٹے رہتے ہیں کہ جب چاہو جناب فاروق کو چارپائی سمجھ لو اور جب چاہو چارپائی کو جناب فاروق کہہ لو۔ اب چارپائی اور اس پر لیٹنے والے کے فرق کو ظاہر کرنے کے لیے ایک کمبل ہے جو آدھا چارپائی پر رہتا ہے اور آدھا نیچے لٹک جاتا ہے جس کے اٹھانے کی فرصت نہ فاروق صاحب کو ملتی نہ خود کمبل کو یہ توفیق کہ وہ اُٹھ کر خود ہی اوپر آجائے مگر فاروق صاحب کی اس وجد آفریں طرز معاشرت سے ہماری نگاہیں ان کے اصل کمال تک جو جا پہنچی تھیں تو ان کا تماشہ بھی یوں دیکھ لیا کہ ہمارے حاضر ہوتے ہی اسلامی اخلاق و تواضع کا یہ مجسمہ یوں تڑپ کر کھڑا ہوگیا گویا اس کا کوئی حقیقی بھائی یورپ کے لام پر سے زندہ وسلامت آکر اس سے مل گیا ہے۔ بے ساختہ فرمایا اور بھئی ہم تو تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے اور بھئی تم تو بہت خوب لکھتے ہو، تم نے ہمارے لیے بھی جو کچھ لکھا تھا وہ ہمیں بہت پسند آیا، ''اچھا تو اب کھانا میرے ہی ساتھ کھانا''۔ آہ جناب فاروق کی اس سادہ زندگی اور پُر خلوص گفتگو سے ہمیں وہ پاک طینت مسلمان یاد آرہے تھے جو اپنے بھائیوں سے ملنے میں کبھی صحابہ کرام کا سا خلوص و جذبہ صرف کرنے کو خدائے عرش و فرش اور رسول اکرم علیہ السلام کی خوشنودی کا باعث سمجھا کرتے تھے مگر اب تو مسلمان گورنمنٹی خوشنودی کے لیے ترکوں اور عربوں کے خلاف، رنگروٹ بھرتی کراتے ہیں اور

مسلمانوں کے درمیان بغیر انٹرویو اور انٹروڈکشن کے بات چیت ہونا بدتہذیبی کہا جاتا ہے اور پھر ملاقات بھی ایک سگریٹ اور شیک ہینڈ پر ختم ہو کر رہ جاتی ہے کہ یہ سب اثرات ہیں غلامی کی زندگی کے اس لیے برے بھی نہیں۔

مُلا رموزی صاحب کے لیے سب سے زیادہ پُر لطف چیز اگر کوئی ہوسکتی تھی تو وہ حضرت رشید احمد صدیقی، ایم۔اے ایڈیٹر رسالہ 'سہیل' علی گڑھ ہی ہوسکتے تھے جب کہ بہ لحاظ لکھ پڑھ ان کا ہمارا رشتہ بہت زیادہ مضبوط ہے کیونکہ وہ بھی ظریف لکھاڑ واقع ہوئے ہیں اور ہم بھی بڑے لطیف لکھاڑ، پھر تحریر کے بعد ذوق میں بھی وہ وحدت کہ کبھی وہ ملا رموزی بن جاتے اور کبھی ہم رشید احمد صدیقی۔ وہ ہم سے صورت میں مشابہ اور ہم ان کے لباس سے مشابہ، بس اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ وہ اپنا وطن ترک فرما چکے ہیں اور ہم پردیس کو ترک کر چکے ہیں۔ آج کی دعوت میں نہ فقط ہم بلکہ حضرت جگر مرادآبادی، حضرت اصغر گونڈوی، ایسے ہم خیال شریک تھے۔ میزبانوں میں رشید صاحب کے ساتھ حضرت پروفیسر محمد صادق صاحب ایم۔اے ایسے سلیم المذاق دوست کی شرکت ایک طرح کا مزید برآں والا معاملہ ہوگئی تھی، جناب محمد فاروق ایم ایس سی بھی اس دعوت میں کمبل اوڑھ کر شریک ہو چکے تھے۔ واضح ہو کہ اس ضیافت کا سلسلہ مغرب سے قبل ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ حضرت حاذق چائے لائے، حلوہ لائے، کیک لائے اور ایک عبا پوش بزرگ کو بھی لائے جو حضرت جگر مرادآبادی کے کلام کو صرف ان ہی کی زبان سے سن کر ذرا مسکرا دیتے ہیں۔ البتہ جو کبھی بہت زیادہ مست ہو جاتے تھے تو کلمہ کی انگلی ہلا کر ذرا گردن بھی مٹکا دیتے تھے مگر منہ سے تعریف کے الفاظ ادا نہیں ہوتے تھے۔

رات ہو جانے پر کھانے والے مسلمان بھائی جمع ہوئے اور ماشاءاللہ جمع ہوتے ہی چلے گئے۔ ملا رموزی دیکھنا چاہتے تھے کہ آخر حضرت رشید احمد صدیقی ایم۔اے میں وہ کونسی فراغتیں جمع ہیں جو وہ اس قدر لطافت نگار واقع ہوئے ہیں سو اس حساب سے الحمدللہ کہ انھیں ہم نے ایم۔اے پاس پایا، پروفیسر پایا، ایک بہترین اور قیمتی فرنیچر والے مکان کا مالک پایا۔ ایک نوکر کا آقا بھی پایا مگر ممدوح کی دو چیزوں نے دل توڑ دیا۔ ایک یہ کہ وہ اس زرق برق فرنیچر والے مکان میں بھی روئی کی ڈلائی اوڑھے لیٹے رہتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ایک ایسے موذی مرض میں مبتلا کر دیے

گئے ہیں کہ الاماں۔ گویا ان کا دماغ وروح آلام اور صدموں سے فارغ نہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں انھوں نے لکھنؤ میں اپنے گردے میں چیرا بھی دلوایا تھا، جسے انگریز لوگ ''آپریشن'' کہتے ہیں۔ اس آپریشن کے روح فرسا صدمات کو ممدوح نے ''شیطان کی آنت'' کے عنوان سے رسالہ ''نگار'' لکھنؤ میں لکھا بھی ہے اور خوش فکر اور شگفتہ مزاج لوگوں کی بیماری کو ممدوح نے تاؤ کھا کر فطرت کی بدمذاقی لکھ مارا ہے۔ بظاہر رشید صاحب نہایت خاموش مسلمان ہیں، لیکن حضرت حفیظ جالندھری ایڈیٹر رسالہ ''مخزن'' لاہور نے 1928 میں ہم سے ان کی اس عادت کو کان میں کہہ دیا تھا، اس لیے ہم بے پروا تھے۔ چنانچہ وقت آیا یعنی کھانا آیا اور حضرت رشید کی بہار آفریں بے تکلفی شروع ہوگئی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ممدوح کھانا دیکھ کر ہی بے تکلف ہوتے ہیں بلکہ ممدوح تو اس وقت بھی دُلائی اوڑھے لیٹے رہے اور کھانے کا حق ادا کر گزرے۔ حضرت حاذق ایم۔اے۔ مقصود یہ ہے کہ حضرت رشید بے تکلفی کے موقع پر بے تکلف اور متانت کے موقع پر متین رہنے والے بزرگ ہیں۔ اب جو اس پر لوگ باگ انھیں خاموش اور عبوسا... کہے جائیں تو پھر ہم صاف کہے دیتے ہیں کہ یہ اثر ہے ممدوح پر اس محبت کا جس میں زندہ دلی اور خوش طبعی کے کفارے کے طور پر ایک ایسے عباپوش بزرگ کو داخل کر لیا گیا ہے جو اس مقدس عبا کو دن میں نیا آستین سمجھ کر پہنے رہتے ہیں، پھر یہ اثر ہوگا کبُولت پناہ حضرت قاضی جلال مدظلہ العالی کے اس چشمہ کا جو بتا رہتا ہے کہ اب قاضی صاحب قبلہ دنیا سے بیزار ہو رہے ہیں۔ کھانے والوں میں یوں تو حضرت اصغر، حضرت جگر، حضرت جلیل، حضرت ذوقی، جناب فاروقی اور حضرت ملا رموزی شریک تھے مگر برادر گرامی حضرت حاذق کا ''طرزِ کھا'' بتا رہا تھا کہ جب کوئی مسلمان بھائی کھانے پر اتر آتا ہے تو یوں کھاتا ہے۔ کھانوں میں انتہائی مشرقیت صرف کی گئی تھی اور ان کھانوں سے زیادہ لذیذ وہ باتیں تھیں جو ہو رہی تھیں۔ اسی حال میں حضرت گرامی فاضل از ہر مولانا ابرار حسین فاروقی، مولوی فاضل تشریف لائے اور ہمارے اوپر تاؤ کھا کر بیٹھ گئے کہ کیوں نہیں ممدوح کے ہاں کھانا کھانے گئے۔ کھانے کے بعد وہی جناب فاروقی ایم ایس سی جن کا مفصل تذکرہ ہم نے اوپر لکھا ہے اور حضرت رشید احمد صدیقی نے بھی دسمبر کے نگار لکھنؤ میں ان کی تعریف لکھی ہے، چائے کے خواستگار ہوئے اور بالآخر حضرت حاذق کو چائے لانا ہی پڑی۔ دوست کو موقع ہاتھ آیا اور فوراً ہی مشاعرہ تو کیا ایک

چھوٹی سی ''مشاعری'' منعقد کر ڈالی۔ بس وہی حضرت جگر اور حضرت اصغر تھے جو اپنا کلام پڑھ رہے تھے اور ہم لوگ تھے کہ واہ واہ اور آہ آہ کر رہے تھے۔ حضرت رشید احمد صدیقی اس معاملہ میں بے حد خاموش واقع ہوئے ہیں۔ یعنی کسی کے شعر پر وہ چلا کر داد نہیں دیتے۔ گویا وہ شعر سمجھنے میں ایک طرح کے ''فی بطن الشاعر'' واقع ہوئے ہیں۔ یعنی سمجھتے سب ہیں مگر منہ سے ظاہر نہیں فرماتے۔ ایسے لوگوں کو شعر سناتے وقت شاعر کو بہت تاؤ آتا ہے چاہے وہ اس کا اظہار نہ کرے۔ یہی عالم ایک فرنچ قسم کے حکیم صاحب کا تھا جنھوں نے دیوار کے سہارے خاموش بیٹھے رہنا ہی شاعری کی طبی داد سمجھ لی تھی۔ بس ہم، جلیل، حضرت حاذق اور پروفیسر عظمت الٰہی زبیری ایم۔اے تھے کہ ہر شعر پر چیخ رہے تھے گویا مذکورہ اصحاب کے نزدیک ہم تمام چیخ کر داد دینے والے بے وقوف ہی ہوں گے؟ غرض کوئی بارہ تیرہ بجے رات کو یہ مشاعری اور جناب فاروق کی چائے ختم ہوئی۔ اس اثنا میں حضرت جگر مرادآبادی کے وجد آور نغموں کے بیچ میں ایک مرتبہ جناب فاروق نے بھی گایا تھا جس کی تکلیف کو ہم آج تک کم نہیں کر سکے۔ اس لیے دعا ہے کہ خدائے رحمان و رحیم آئندہ سال ہمیں ان تمام بھائیوں سے پھر ملائے مگر جناب فاروق کے گانے سے عمر بھر نہ ملائے۔

اِن ملاقاتوں کا سلسلہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک دن ہم اس اصل معائنہ کے لیے روانہ ہوئے جو متعلق تھا یہاں کی تعلیمی دنیا سے اور ایسے ہم ہمیشہ خود کو نہایت غیر معروف اور خفیہ پولیس بنا لیتے ہیں کہ اصل مضمون نگاری اسی کا نام ہے یہ نہیں کہ گھر میں بیٹھے نقشے کھینچ دیں لندن اور پیرس کے صبح کا وقت تھا اس لیے گرم کوٹ اور گرم گلوبند فرما کر یوں پا پیادہ روانہ ہو گئے۔ گویا ہم کوئی چیز ہی نہیں۔ چل پہ چل ٹھیک بارہ بجے دن کے اس صحرائے علی گڑھ کو عبور کیا جو یونیورسٹی کو نیوسرکل یا میرس ہوسٹل سے جدا کرتا ہے۔ اس وقت مارے گرمی کے جو حال تھا اسے ہم جانتے ہیں وہ نہیں جان سکتے جو برقی پنکھوں کے نیچے بیٹھ کر ایڈیٹری فرماتے ہیں کہ ایسی ہی تکالیف اٹھاتے ہیں اربابِ خدمت و اصحابِ قلم۔ اجنبی اور ناواقف کی حیثیت سے جس کے کمرہ پر جاتے وہ بڑی تیز نگاہوں سے دیکھتا، سوالات کرتا، خشک جواب دیتا، معقولیت بھی صرف کرتا، جھجک بھی جاتا اور نام و نشان بھی دریافت کرتا اور ہم تھے کہ ان کی معاشرت اور عام اخلاق کی ایک ایک رگ کو بھانپ رہے تھے۔ دیکھا یہ کہ ہر ایک کے پاس ایک سے لے کر پانچ اور دس جوڑے انگریزی جوتے کے،

ہاکی کے کٹ، فٹ بال اور ٹینس کا قیمتی لباس، سگریٹ، داڑھی صاف کرنے کے انگریزی اوزار۔ بعض کاپیوں میں عشق ریز و عشق انگیز اشعار، کوٹوں پر کوٹ، پتلونوں پر پتلونیں، ہیٹوں پر ہیٹیں عرف انگریزی ٹوپیاں، موزوں پر موزے۔ مزاجی کیفیت یہ کہ کھانا کھائیں تو نوکر کی امداد سے، پانی پئیں تو نوکر کی امداد سے، پان کھائیں تو نوکر کی امداد سے اور موزہ پہنیں تو نوکر کی امداد سے۔ یہاں تک کہ بعض کے بوٹ کے تاگے بھی نوکر ہی باندھتا ہے۔ پھر ایسے حالات سے نکل کر جب مسلمان ڈپٹی کلکٹر ہوتے ہیں تو وہ اپنے ہم قوم کے ماتحتوں کو قلی، مزدور اور اپنا غلام سمجھتے ہیں تو کیا برا کرتے ہیں۔ ان چیزوں کا جو مالی اثر پیدا ہوتا ہے اصل میں افلاس کی بنیاد یہی ہے۔ طلبا کی اس بلند اور رئیسانہ معاشرت کی شرم سے وہ طلبا موت کے منہ میں جا پڑے ہیں جو حصول علم کے شائق ہیں، مگر بلند اور انگریزی معاشرت اختیار نہ کرنے کے باعث شہر کی تنگ و تاریک کوٹھریوں پر پڑے مصروف تعلیم ہیں مگر وہ کبھی یہاں کے کھیلوں اور پارٹیوں اور جلسوں میں شریک ہونے سے جو شرماتے ہیں تو کسے پروا مگر ان بچوں کی خطا ہی کیا جب ان کے اساتذہ کی انگریزی رنگینیاں کوئی دیکھے۔ ان کے ڈھائی ڈھائی سو روپیہ نقد کے سوٹ دیکھے، ان کا کلین شیو دیکھے، ان کے ولایتی جوتے اور ولایتی موزے دیکھے تب اسے پتہ چلے کہ بچوں کا انگریزی پن تو ان کے اساتذہ کے سامنے کچھ بھی نہیں کیونکہ یہ بچے تو دس سے چار بجے تک اسلامی وضع کی وردی بھی پہن لیتے ہیں، مگر پروفیسر بھائی تو چوبیس گھنٹے لارڈ برکن کر ہیڈ بنے رہتے ہیں۔

اسی حال میں جا پہنچے حضرت گرامی پروفیسر عبدالعزیز پوری ایم۔اے، ایل ایل بی کے کمرہ پر۔ ممدوح اسی وقت کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹے تھے۔ اِدھر ہم گشت سے کوفتہ بجنتہ ہو گئے تھے، اس لیے صفا کہہ دیا کہ پوری صاحب کچھ دیر ہم قیلولہ فرمائیں گے جو فقط پچیس منٹ میں ختم ہو جائے گا۔ پوری صاحب نے فوراً پلنگ چھوڑ دیا اور پاس کے کمرہ میں جا بیٹھے اور ہم سو گئے۔ اٹھ کر کیا دیکھتے ہیں کہ تمام دروازے بند سے ہیں اور پوری صاحب طلبا کے کمرہ کے ایک ایسے برآمدہ میں بستروں کے انبار پر بیٹھے ہیں جو دھوپ سے خاصا گرم ہو رہا تھا۔ اس کمرہ کی صفائی کے لیے طلبا نے اپنا تمام سامان اس برآمدہ میں ڈال دیا تھا اور پوری صاحب نہایت بے تکلفی سے بستروں کے اس انبار پر طلبا کے پاس بیٹھے طلبا سے باتوں میں مصروف تھے۔ حیرت سی ہو گئی۔ پوری صاحب کی اس

سادگی اور طلبا سے اس بزرگانہ ربط پر۔ جاتے ہی ہم نے کہا کہ یہ آپ اپنا کمرہ چھوڑ کر اس دھوپ میں کیوں آ بیٹھے تو فرمایا کہ جو شخص تھوڑی دیر کو آرام چاہے اسے بڑے اہتمام سے آرام دینا ہمارا فرض ہے۔ آپ تھکے ہوئے تھے اس لیے آپ کو زیادہ سکون کی ضرورت تھی۔ ہم نے کہا کہ آپ جو اپنے شاگردوں میں اس بے تکلفی سے بیٹھے ہیں سو اصل شان یہی ہے استاد اور پروفیسر کی اور ایسے ہی اساتذہ ہوا کرتے ہیں جو طلبا کے دُکھ درد اور ان کے ہر حال میں شریک رہ کر ان کے مصلح اور نگراں بن سکتے ہیں اور اسلامی تعلیمات و آداب میں ایسے ہی اساتذہ کو مکرم و معظم کہا گیا ہے۔ ابھی کہ ہم ممدوح محترم کے ان برتر از ستائش جذبات کی تعریف میں مصروف تھے کہ انھی طلبا میں سے بعض نے ہماری چائے کا بندوبست کر کے حضرت محترم پوری صاحب سے سفارش بہم پہنچائی کہ ہم ان کی چائے کو یا پی لیں یا کھا لیں۔ ممکن تھا کہ ہم بھی انگریزی قسم کا نخرہ اور اکڑ اختیار کر کے ''نو تھینک یو'' کہہ دیتے مگر مسجدوں کے حجروں میں بیٹھ کر تعلیم پائے ہوئے ملا رموزی میں ان عزیز از جان بھائیوں کی تواضع کے رد کی تاب کہاں۔ جا بیٹھے چائے پر۔ اس عرصہ میں چند طلبا حضرت گرامی پوری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم نے غور سے دیکھا کہ وہ حضرت پوری کے احترامی اور تعظیمی اثر سے کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے اور یہ پوری صاحب کی اُسی شفقت کا اثر تھا جو وہ اپنے شاگردوں سے ایک مہربان بھائی کی طرح روا رکھتے ہیں ورنہ جناب یہاں کے طلبا کو اگر کوئی استاد ایک آدھ چپی مار دے تو اسی دن تمام علی گڑھ میں ہڑتال ہو کر رہ جائے کہ یہی سلیقہ سکھایا ہے آج کل کے طریق تعلیم نے طلبا کو اساتذہ کی تعظیم و بزرگداشت کا۔ چائے کے بعد بعض حیدرآبادی طلبا نے ہمارا فوٹو لینے کی خواہش ظاہر کی۔ اس وقت خیال آیا کہ صوبۂ پنجاب کی طرح حیدرآباد میں علم و ادب دوستی کے جو جذبات بیدار ہو رہے ہیں یہ انھی کا قدرتی اثر ہے جو حیدرآباد کے طلبا ملا رموزی کا فوٹو اپنے پاس اس لیے رکھنا چاہتے ہیں کہ ملا رموزی ایک مشہور سا مضمون نگار ہے ورنہ یوں تو ہمارے جہالت زدہ شہر کے طلبا بھی یہاں موجود تھے جو اگر ہمیں ہماری ادبی خدمات کی بنا پر ایڈریس بھی دیتے تو کم تھا مگر ان میں سے بعض نے ہمیں ذرا جھک کر سلام ہی کر لیا یہی غنیمت تھا۔ آخر کار فوٹو لیا گیا۔ ایک فوٹو تنہا تھا اور ایک پوری صاحب کے ساتھ۔ یہاں سے چل پہ چل پھر اسی میدان سے گزرے جہاں مارے دھوپ اور گرمی سے ہم

کوٹ برداشتہ ہو گئے تھے۔ اب یہاں ایک ایسی چیز نظر آئی، جس نے تمام تھکن کو دور کر دیا اور یونیورسٹی والوں کے لیے بے ساختہ دعا نکلی۔ یعنی یہاں طلبا کی پریڈ ہو رہی تھی۔ طلبا باقاعدہ فوجی وردی پہنے قواعد سیکھ رہے تھے اور ان کے ساتھ فوجی باجا بج رہا تھا۔ وہ اُس روح کو بیدار کر رہا تھا جو انگریزی لونڈر، موزوں اور چست پاجاموں کی نزاکتوں میں دب کر مردہ سی ہو گئی ہے۔ بس ایک یہ شغل تھا جو مسلمانوں کے بچوں میں شجاعت و جفاکشی کی زندگی کو ابھار سکتا ہے۔ افسوس کہ حضرت جلیل احمد قدوائی اور حضرت ذوقی کے لکھنوی پن نے ان طلبا کے قریب لے جانے کے عوض میں حضرت رشید احمد صدیقی کے قریب لے جا کر بٹھا دیا ورنہ ہم ان طلبا کی تعریف بھی اتنی ہی لکھتے جتنی دوسرے طلبا کی برائی لکھی ہے۔

یونیورسٹی میں ایک مسجد اس خیال سے بنائی گئی ہے کہ اس میں طلبا نماز پڑھا کریں گے اور جب طلبا نماز پڑھیں گے تو ان کے اساتذہ بھی نماز پڑھیں گے اور جب اساتذہ نماز پڑھیں گے تو کالج اور یونیورسٹی کے دوسرے ملازمین بھی نماز پڑھیں گے اور جب اتنے لوگ نماز پڑھیں گے تو مسجد کو خواہ مخواہ وسیع بنانا چاہیے لہٰذا یہ مسجد نہایت وسیع اور شاندار ہے، مگر نمازیوں کا یہ حال ہے کہ درمیانی گھنٹوں میں چند طلبا مسجد میں آتے ہیں، بیٹھتے ہیں، ٹہلتے ہیں، پھرتے ہیں، چلے جاتے ہیں اور اسی لیے مسجد کے دروازہ پر کسی نے یہ نہیں لکھا کہ بغیر نماز کے مسجد میں آنے کی سخت ممانعت ہے۔ اب خدا جانے قیامت کے دن یونیورسٹی والے بخشے جائیں گے یا یہ ویران مسجد بخشی جائے گی۔

وہ جو خود صاحبِ علم و بصیرت ہیں اور اس لیے ملا رموزی کے قلمی کارناموں کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ ملا رموزی کی ملاقات کے لیے بے چین تھے، اس لیے حضرت جلیل احمد قدوائی بی۔ اے علیگ نے اپنے دولت خانہ پر اس ملاقات کا انتظام فرما دیا تھا۔ مغرب کی نماز کے وقت یہاں حضرت خواجہ غلام السیدین ایم۔ اے، حضرت پروفیسر ہاشمی ایم۔ اے اور حضرت محترم زیدی صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر صاحب تشریف لائے۔ بس پھر کیا تھا خلوص و محبت کا ایک دریا تھا جو امنڈ آیا تھا۔ دیر تک سلسلہ کلام جاری رہا۔ بڑے پیارے بھائی ہیں جو ملا رموزی ایسے ستم آزمودہ انسان سے محبت کرتے ہیں۔ ایران و عراق گھومے ہوئے ہیں اس لیے خواجہ صاحب نے

ایک مرتبہ ہم سے یہ بھی دریافت فرمایا کہ آپ نے فارسی کہاں تک پڑھی ہے۔اس کے دو ہی معنی تھے یا تو یہ کہ تم فارسی بھی نہیں جانتے اور بنے پھرتے ہو ملا رموزی یا یہ کہ تمھاری فارسی کی استعداد کچھ کچھ اچھی ہے جو تمھارے مضامین میں کہیں کہیں نظر آتی ہے ورنہ ان دونوں باتوں کے سوا آپ ہی بتایئے کہ یہ فارسی استعداد دریافت کرنے کا کون سا موقع تھا؟

سب سے زیادہ قابلِ احترام ذوق ان ملاقاتوں کا تھا جو یہاں کی بعض بلند خاندان اور تعلیم یافتہ خواتین کی طرف سے ظاہر کیا گیا۔خدا ان بہنوں کو خوش رکھے بس ان کی ملاقات کے بھروسہ پر انشاءاللہ آئندہ سال ہم بھی اپنے ننھے میاں کی والدہ کو علی گڑھ لے جائیں گے،کیسی خوش ہوں گی اس فقرہ کو پڑھ کر ہمارے ننھے میاں کی اجہل والدہ صاحبہ مدظلہا۔خدا اس علی گڑھ کو تا دیر سلامت رکھے کہ اس میں ابھی بے شمار نمونے اسلامی خلوص وحمیت کے موجود ہیں۔اور بھائی ہمیں بھی خدا زندہ رکھے مگر سکون وفراغت کے ساتھ آمین۔پروفیسر مولانا ابرار فاروقی،مولوی فاضل اور حضرت نواب مشتاق احمد خاں صاحب بہادر خلف اکبر حضرت نواب وقار الملک بہادر مغفور سے انشاءاللہ آئندہ سال ملاقات ہوگی۔

◆◆◆

علی گڑھ سے گھر تک

بے سروسامانی اور ننھے میاں کی والدہ سے جھگڑ کر سفر کرنا ہی کہاں کا راحت رساں سفر ہوا کرتا ہے جو ایسے مسافر کی سفر سے واپسی پُر لطف کہی جائے؟ بادشاہوں سے لے کر لیڈر اور وائسرائے قسم کے تھانیداروں تک کی واپسی پر غور کیجیے کہ جب یہ لوگ اپنے اپنے شاندار دورں اور سرکاری مہمانیوں سے واپس ہوتے ہیں تو نہ فقط ان کی صورتوں کے تمام خوبصورت بخیے یوں اُدھڑ جاتے ہیں گویا وہ اس سے پہلے مرادآباد کا لوٹا تھے، جس کی ساری قلعی اُڑ چکی ہے۔ چہرہ پر شاندار مہمانی کی حسرت بھری یادیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر برستی ہے جیسے تین چار سال سے صوبہ جات متحدہ میں بارش ہو رہی ہے۔ اب جو اگر سفر سے واپسی کے وقت آپ کو یہ خیال آجائے کہ گھر میں ننھے میاں کی والدہ پہلے سے ہی تاؤ کھائے بیٹھی ہیں اور اپنے ننھے میاں کے لیے انھوں نے جو کھلونے، کپڑے اور خود کے لیے دہلی کی جو بالیاں منگائی تھیں، ان کے دام آپ سفر ہی میں خرچ فرما چکے ہیں، اس طرح کہیں آپ نے اپنی شان بڑھانے کے لیے قلی مزدور کو دو آنے کی جگہ چار آنے دے دیے، کہیں تانگے والے پر رعب بٹھانے کے لیے انعام عطا فرمادیا، کہیں بجائے سات نمبر بیڑی پینے کے آپ نے قینچی چھاپ سگریٹ نوش فرمائے تو اب آپ کے لیے سفر سے گھر تک کی واپسی ایسی ہوگی جیسے عدالتوں سے ہندستانی قیدی، جیل حوالات سے واپس ہوا کرتے

ہیں۔ یا کوئی ہندستانی تھانیدار صاحب پنشن کے وقت تھانیداری کا آخری حساب کتاب سمجھا کر ہمیشہ کے لیے اپنے گھر جا رہے ہوں یا کسی دن بھر چلے ہوئے تانگے کا گھوڑا اپنے اصطبل کو واپس ہو رہا ہو یا دفاتر کے ہندستانی منشی لوگ شام کے وقت گھر جا رہے ہوں، یا جس طرح حضرت رشید احمد صدیقی ایم۔ اے علی گڑھ سے لکھنؤ آپریشن کے لیے تشریف لے جا رہے ہوں یا جیسے حضرت سیماب وساغر علی گڑھ کے مشاعرہ سے رات کی تاریکی میں پا پیادہ بغلوں میں ہاتھ دبائے گھر واپس ہو رہے ہیں یا دیہات میں بیگار گاڑیاں سرکاری سامان لادے جا رہی ہوں، یا جس طرح کچے آموختے والے بچے اسکول جا رہے ہوں یا کوئی ہندستانی وفد لندن سے واپس آ رہا ہو، یا کوئی نامور پہلوان کشتی لڑ کر دنگل سے واپس آ رہا ہو یا کوئی ہندستانی گدا ریل سے بے ٹکٹ اتر کر مسافر خانہ ڈھونڈ رہا ہو یا کوئی ایکٹر تھیٹر کے اسٹیج سے اپنے ایکٹ میں فیل ہو کر واپس ہو رہا ہو یا کوئی قادیانی مولوی مولوی ثناء اللہ امرتسری کے مناظرہ سے پلٹ کر اپنے گھر جا رہا ہو۔ بس اسی طرح یا اس سے ذرا کچھ اچھی حالت میں ہماری واپسی ہوا کرتی ہے۔ اس مرتبہ کی واپسی پر یہ دلنواز خبر، پہلے ہی سے مل چکی تھی کہ خوشدامن صاحبہ کی حالت نازک ہے اور ہماری ''وہ'' ان کی عیادت کے سلسلے میں میکہ تشریف لے جا چکی ہیں اور خیر سے یہ سسرال بھی واقع ہوا ہے پردیس میں گویا اس وقت نہ ہم اپنے شہر میں تھے اور نہ ہماری ''وہ'' اپنے مستقر پر۔

ادھر علی گڑھ ایسے علمی وادبی شہر میں ہم جس آن بان اور قلمی لیڈر کی حیثیت سے مہمان بنے ہوئے تھے، اس نے احساس کی متکبرانہ قوت کو اعتدال سے زیادہ مشتعل کر دیا تھا اور چوبیس گھنٹے تو کیا ہاں کوئی پانچ اوپر دس مرتبہ خود کو علی گڑھ کا گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سمجھتے رہتے تھے۔ آپ ہی انصاف کیجیے کہ جس علی گڑھ یونیورسٹی کے بڑے بڑے افسر، پروفیسر، پرنسپل اور رئیس طلبا ملّا رموزی صاحب کے میزبان ہوں، دعوتوں پر دعوتیں، ضیافتوں پر ضیافتیں اور ملاقاتوں پر ملاقاتیں ہو رہی ہوں، ہمارے فوٹو لیے جا رہے ہوں، قلمی تحریریں بطور یادگار لی جا رہی ہوں، وہی ملّا رموزی صاحب جب واپس ہوتو یوں کہ یکا یک ملازم سے کہیں کہ بس چائے پلا دے اور بستر باندھ دے پھر اس پر ملازم کہے کہ حضور خیر تو ہے۔ آپ تو پرسوں لاہور جا رہے تھے کانگریس میں اور ہم کہیں اب تجھے کیا؟ بس تو باندھ بستر ہمارا اور رہنے دے تیری کانگریس وانگریس۔ یہ

نہیں دیکھتا خط کہ وہاں تو حالت خراب ہو چکی ہے خوشدامن کی اور تو خواب دیکھ رہا ہے لاہور کے
بے وقوف کہیں کا۔ جا اور کوئی عمدہ اور تیز سا تانگہ لے کر آ کیونکہ نواب صاحب کا موٹر تو گیا ہوا ہے
شہر ظاہر ہے کہ تانگے سے ہماری مراد یہی ہو سکتی تھی کہ وہی شریف صورت اور شریف رفتار تانگہ
آئے گا جس میں دو سواریاں پیچھے اور ایک سواری آگے تانگے والے کے برابر بیٹھا کرتی ہے اور جو
عوام میں ''ربڑ ٹینٹ تانگہ'' کہلاتا ہے۔ ادھر موسم تھا جاڑے کا اور وہ بھی علی گڑھ کے جاڑے کا اس
لیے اپنے ساتھ ایک لحاف کے ساتھ اپنی ''اُن'' کا لحاف بھی اس لیے لے آئے تھے کہ وہ تو تھیں
میکے میں اس لیے پڑا رہتا نا یہ لحاف ہمارے گھر میں بے کار اور مسلمانوں میں بس یہی ایک عیب
ہے کہ وہ کفایت شعار نہیں۔ پھر یہ دو لحاف، ایک توشک، ایک تکیہ اور ایک چادر مل کر مجموعی حیثیت
سے جس درجہ موٹے ہو سکتے تھے آپ اندازہ فرمالیجیے۔ اس پر لوہے کا ایک کالے رنگ کا بڑا سا
صندوق اگر طرفہ تماشا نہیں تو طرفہ وزن تو تھا۔ اور ہاں ایک کمبل بھی، مگر ہمارے خیال میں
جاڑے کے موسم میں اس قسم کا شاندار بستر اگر خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تو بدنما کہنے والا بھی
بیوقوف ہی مشہور ہوگا۔ بس ابھی کہ چائے کی پیالی منہ سے الگ ہوئی تھی یا منہ چائے کی پیالی سے
الگ ہوا تھا کہ لے آیا ملازم علی گڑھ کا وہ ''مسجد نما اِکا'' جس کی ہلاکت بار اذیتوں کا رونا پچھلے سال
رسالہ ''رسالہ علی گڑھ میگزین'' میں اس امید پر رو چکے تھے کہ شاید یوپی کے باشندوں کو اس اکّے پر
تاؤ آئے گا اور وہ اپنی اپنی میونسپلٹیوں سے ان اِکّوں کو ہمیشہ کے لیے ''نعبور دریائے شور''
کرا دیں گے۔ دیکھتے ہی دماغ کھول گیا، مگر کرتے کیا کہ ریل کے جانے میں باقی رہ گئے تھے
''منٹ چندہ'' نخرہ کرتے تو ریل گاڑی کوئی ہماری ملازمہ تو تھی نہیں جو کھڑی رہتی۔ مگر ادھر
''پوزیشن'' کا خیال کہ اگر شیخ سدو کے اس علی گڑھی قبّے میں جا بیٹھے تو اور تو کچھ نہیں، صرف بازار
والے دیکھ کر کہیں گے ملاحظہ ہو آپ تشریف لے جا رہے ہیں، مگر معاً خیال آیا کہ جب بستر کا انبار
خود ایک گنبد بنا ہوا ہے تو کیوں نہ بیٹھ جاتے اس کے بیچ میں۔ تانگے کے بھاگتے بھاگتے اگر کسی کی
نظر پڑی بھی تو وہ یہی سمجھے گا کہ کسی مسافر کا فقط بستر ہے اور جو کسی چنگی کے سپاہی نے تانگا روک کر
بستر دیکھا اور اس کے بیچ میں ہم بیٹھے نظر آ گئے تو وہ کب سمجھے گا کہ یہی وہ ملا رموزی صاحب ہیں؟
اس لیے عربی زبان میں کچھ پڑھا اور بیٹھ گئے۔ اسی طرح اسٹیشن پر پہنچے تو تانگے والے نے ریل

چلی جانے کی بدحواسی کو پہلے بھانپ لیا تھا اس لیے اس نے موقع سے یہ فائدہ اٹھایا کہ ڈبل کرایہ طلب فرمایا، مگر اسے یہ کہاں پتہ تھا کہ جو شخص مولوی طفیل احمد صاحب سودی، ایڈیٹر رسالہ ''سودمند'' علی گڑھ کے شہر سے جارہا ہو وہ کفایت شعاری کے معاملہ میں پھانسی کے تختہ پر بھی ''غازی علم و؟؟ شہید'' ہی رہتا ہے اور اس پر کوئی بدحواسی طاری نہیں ہوتی، اس لیے بس دے دیے چار گنڈے، چلا تا ہی رہ گیا۔ میاں یہ کیا مگر ہم نے پلیٹ فارم کے اندر جا کر اس وقت اپنے مغربی جانب دیکھا، جب قلی نے بہ آواز بلند کہا حضور بس یہیں آئے گا سیکنڈ کلاس، ابھی کہ ٹکٹ کے لیے کھڑے روپیہ گن رہے تھے کہ سامنے خواجہ خضر کی صورت بنائے آ گئے حضرت ہادی انصاری۔ ہماری اخاہ علیکم السلام کے بعد ہی کہا۔ ''آپ تو جائیں گے سیکنڈ میں، پھر ہمارا اور آپ کا کیا ساتھ؟'' استغفراللہ بس اوس سی پڑ گئی ہمارے تمام سیکنڈ کلاسانہ ارمانوں پر اور سمجھ گئے کہ اب تو گھر تک ہادی صاحب کے ساتھ تھرڈ ہی میں جانا پڑے گا کیونکہ یہ ہیں ہمارے بچپن کے دوست پھر ''مکتب بھائی'' پھر ''پیر بھائی'' اور پھر سب سے آخر ''وطن بھائی'' اس لیے اگر نہ گئے ان کے ساتھ تھرڈ کلاس میں تو جاتے ہی سارے شہر میں کہتے پھریں گے:

دیکھا آپ نے ملا رموزی صاحب کو؟

اماں دماغ بگڑ گیا ہے دماغ۔

ذرا رئیسوں اور نوابوں نے منہ لگالیا ہے تو ہو شخص سیدھی بات تک نہیں کرتا۔

ہوا کیا؟

اماں میں علی گڑھ سے آرہا تھا، حضرت سے خاصا یارانہ ہے اس لیے میں تو گیا پاس اس خیال سے کہ چلو سفر میں ساتھ ہو جائے گا، مگر جناب اس نے تو بات تک نہ کی اور بیٹھ گئے میاں ''سیکنڈ کلاس'' میں بن کر لاٹ صاحب۔ خدا کی شان تو دیکھیے آج جو میاں کو چار پیسے سوا ملنے لگے ہیں تو سیدھی طرح زمین پر پاؤں نہیں رکھتے اب نہ وہ شہروار کو پہچانتے ہیں نہ بے شہر دار کو اور دیکھو نا یار! نام بھی عجیب قسم کا رکھ لیا ہے مُلا رموزی۔ آپ نے بھی آج تک ایسا نام کہیں سنا؟

اس پر ان کے مخاطب فرماتے:

سچ کہتے ہو بھائی ہادی بالکل سچ۔ پڑھ لی ہے ناذرا سی انگریزی ملا صاحب نے۔ اماں کل

کی بات ہے کہ یہی ملا رموزی خدا بخشے خالو میاں صاحب کے پاس گھنٹوں بیٹھے خوشامد کیا کرتے تھے اور یہ انھی کی مہربانی ہے کہ آج ملا صاحب ملا صاحب پکارے جاتے ہیں، مگر آہ ہادی صاحب آج نہ ہوئے خالو میاں مرحوم ورنہ وہ آپ کو بتاتے کہ یہ میاں ملا رموزی صاحب ہیں کون۔ بڑے باوضع بزرگ تھے، آپ بھی ملتے تو بہت خوش ہوتے۔ خدا کی قسم ہادی بھائی رستہ چلتے کے کام آتے تھے اور بھئی مجھے تو واللہ آخر دم تک اپنے بیٹے کی طرح سمجھا۔

اس پر تیسرے مخاطب بات کاٹ کر فرماتے:

تو پھر جانے بھی دیجیے ایسے ملا صاحب کو، ملا صاحب ہیں تو اپنے گھر کے تمھارا کیا بنالیں گے۔ بس اچھا کیا تو م نے جو پوچھ لیا کہ تھرڈ میں چلیے گا۔ تم اپنے فرض سے پاک ہوگئے اب ان کی شرافت ہے کہ وہ تمھارے ساتھ نہ بیٹھے۔ اماں بہت مشکل ہے ذرا امیری کو برداشت کر لینا اب تو جناب وہ ہمیں بھی بھول گئے ہیں واللہ راستہ میں کبھی مل جاتے ہیں تو منہ پھیر کر نکل جاتے ہیں اور اب انھیں دو انگلی کا سلام بھی ناگوار ہے۔ چلو ہٹاؤ بھی، لو یہ بیڑی پیو۔

بس اس قسم کی آوازوں سے محفوظ رہنے کی ایک یہی تدبیر تھی کہ بیٹھ جاتے سیدھی طرح ہادی صاحب کے تھرڈ کلاس میں کیونکہ اسی قسم کی ذہنیت اور فطرت ہوا کرتی ہے آج کل کے دوستوں کی اور آج کل کے دوستوں ہی پر کیا موقوف ہے وہ حضرات فردوسی، حافظ شیرازی ایسے ارباب کمال کے ساتھ آخر ان کے شہر والوں نے کیا کیا؟ اور دور کیوں جاتے ہو یہ آج کل ہی کے حضرات جوش ملیح آبادی حیدرآباد میں، ابوالکلام آزاد کلکتہ میں علامہ عمادی حیدرآباد میں، مولانا محمد علی دہلی میں اور مولانا شوکت علی بمبئی میں کیوں مقیم ہیں؟ اگر ان سب کے شہر والے ان کی قدر پہچانتے تو کیا یہ شہر سے باہر جاتے۔ ہاں اپنے ہندستانی بھائیوں میں یہ کمال ضرور ہے کہ وہ اپنے ہر کمال و شہرت والے بھائی کی قدر اس کی وفات سے دو تین سو برس بعد پہچانتے ہیں جیسے آج حضرات غالب، مومن اور حالی و آزاد کی پرستش کی جارہی ہے، جب یہ لوگ چہلم کی حد سے بھی گزر چکے۔

علی گڑھ سے آگرہ تک کا ٹکٹ تھرڈ کلاس ہی کا خرید لیا۔ اب گاڑی آنے میں بھی چند منٹ باقی رہ گئے تھے اور مغرب کی نماز قضا ہونے میں بھی چند منٹ ہی باقی تھے۔ اس لیے ذرا سی

گھبراہٹ کے ساتھ ہم نے ہادی صاحب سے نماز کے لیے جگہ دریافت کی تو فرمایا ''پڑھ لیجیے یہیں کہیں'' جس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ جس طرح پلیٹ فارم پر ایک ہزار مسافر چل پھر رہے ہیں، اسی طرح آپ بھی چلتے پھرتے نماز پڑھ لیجیے۔

تو ملاحظہ فرمایا آپ نے مسلمانوں کی نماز سے دلچسپی کو؟ اور بتایئے کالج اور یونیورسٹی جات۔ مجبور ہوئے تو سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں گئے۔ یہاں مسلم یونیورسٹی کے چند مسلمان طلبا بیٹھے ہوئے تھے، ان سے قبلہ کا رُخ دریافت کیا اور کوٹ بچھا کر اِدھر ہم نے نماز شروع کی اور اُدھر ان طلبا نے گفتگو کے شور کو جو کم نہ کیا تو دل ہی جانتا ہے، کس درجہ صدمہ ہوا یہ سوچ کر کہ مسجد کا احترام تو یہ کہ بے نمازی بھی ہندوؤں کو باجا نہ بجانے دیں اور نماز کا احترام یہ کہ گفتگو کے شور کو چند منٹ بھی کم نہ کیا جائے تو وجہ یہ ہے کہ یونیورسٹی میں احادیث کا مکمل سبق تو دیا جاتا نہیں، اس لیے خطا ہی کیا ہے طلبا کی بس یہی شرف کیا کم ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا تو کہلاتے ہیں۔

اب جو ریل آئی تو تھرڈ کلاس میں سوار ہونے کی تمام تکالیف اور ہنگامہ آرائیاں یاد آ گئیں مگر فوراً ہی یاد آ گئے زعیم الہند حضرت رئیس الاحرار حسرت موہانی جو گزشتہ سال اسی پلیٹ فارم سے ہمارے سامنے تھرڈ کلاس میں سوار ہو کر کانپور جاتے ہوئے ہم سے مصافحہ فرما رہے تھے۔ بس تھرڈ کلاس میں خالی جگہ کی تلاش یوں شروع ہوئی کہ دھکے، گھونسے، لاٹھیوں، بستروں اور مسافروں کو اپنے اوپر سے ہٹاتے ہوئے ایک ڈبّے میں داخل ہو رہے تھے کہ یکا یک دروازہ ہی میں مجنود سے ہو کر رہ گئے۔ اس طرح کہ اندر سے ایک مسافر نے باہر لانے کے لیے ایک بڑا سا صندوق بڑھایا اور باہر سے ایک مسافر نے کوٹ پکڑ کر کہا 'زنانہ ہے زنانہ' اس زنانہ سے بچ کر گئے ایک دوسرے مردانے میں یہاں جگہ ملی اور خاصی ملی تو اب حضرت وہ ہادی صاحب غائب، جن کے لیے یہ تھرڈ کلاسانہ قربانی کی تھی۔ پھر باہر آئے اور انھیں تلاش کیا۔ بیٹھے ہوئے تھے ایک ڈبے میں بند صندوق بنے، بڑے زور سے کہا کہ چلیے کافی جگہ مل گئی ہے فرمایا اب بیٹھ جایئے یہیں گاڑی جانے والی ہے تو ہم نے زیادہ غصہ سے کہا اماں چلو بھی وہاں خاصی جگہ ہے کہہ رہے ہیں۔ آخر تماشا ہی تھا اُس وقت کا ہمارا چہرہ جب ہم ہادی صاحب کو اس غرور سے لے کر اپنے ڈبّے میں آئے اور دیکھا کہ ہماری اسی بالکل خالی نشست پر ایک چھوڑ تین مسافر یوں آ بیٹھے تھے گویا وہ کئی

سال سے اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ نہ پوچھیے اُس وقت ہمارے اور ہادی صاحب کے درمیان کیا گفتگو ہوئی۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ سیٹی ہوئی، گھنٹی بجی اور ریل چلی۔ خود کو لکھا پڑھا آدمی سمجھ کر ہم نے کہیں پلیٹ فارم سے دو چار اخبار بھی خرید لیے تھے۔ اب جو دو چار اسٹیشن گزرنے پر انھیں اٹھا کر پڑھنا چاہا تو تھرڈ کلاس کی روشنی نے یہ جواب دیا کہ ہندستانی جاہل محض ہیں، بس فقط سیکنڈ اور فرسٹ کلاس میں لکھے پڑھے آدمی ہوتے ہیں، اس لیے تیز روشنی تھرڈ کلاس میں نہیں ہوتی اور چونکہ ہندستانی اور ان کے سبھی اسمبلی کے ممبر کبھی ریلوں کے تھرڈ کلاسوں میں تیز روشنی اور بجلی کے پنکھوں کا مطالبہ بھی نہیں کرتے اس لیے ریلوں کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے اندر لگا کر سارے ہندستان میں چلتی رہیں؟

ٹونڈلے کے اسٹیشن پر پھر گاڑی بدلنا تھا اور اسی اسٹیشن پر ڈنر بھی تھا عرف رات کا کھانا۔ ہادی صاحب کو تو بتایا ''منصرم گاڑی بدل'' اور خود کھانا لانے چلے گئے۔ اب ایک ایک ڈبہ تلاش کیا کہ ہادی صاحب مل جائیں مگر یوں تو نہ ملے ہاں یوں ملے کہ ایک تاریک ڈبے سے سر نکال کر چیخے اماں اِدھر آؤ اُدھر۔ دروازہ ہی پر سے ہم نے کہا ارے بھئی روشنی؟ تو جواب ملا کہ اس ڈبے کی روشنی کا تار بگڑ گیا ہے، میں نے گارڈ صاحب سے بھی کہا تھا انھوں نے کچھ جواب ہی نہ دیا۔ خیر آجاؤ ڈبہ ہے خالی، تھوڑی دور تو جانا ہی ہے۔ آپ ہی فرمائیے کہ گارڈ صاحب کے انگریزی غرور پر تاؤ کھاتے یا ہادی صاحب کی اس قناعت پسندی پر کہ آ بھی جاؤ ڈبہ ہے خالی، بس یہ کہا اور اندر داخل ہو گئے کہ آئندہ سے جب تھرڈ کلاس میں سفر کریں گے تو ایک لیمپ بھی ساتھ لایا کریں گے کیونکہ ان بے حس اور مست لیڈروں سے تو کچھ کہہ نہیں سکتے جو ہندستانیوں کی گاڑھی کمائی کو چندہ بنا کر بیٹھے پھرتے ہیں فرسٹ کلاسوں میں، مگر نہیں کرتے وہ یہ کہ سول نافرمانی کی طرح وہ کوئی سول ریلوانی کر گزریں تاکہ کچھ تو آرام پائیں۔ یہ سارے ہندستان کے کروڑوں ''تھرڈ کلاسی'' اب اس تاریک ڈبے... میں کھانا جو شروع کیا تو لقموں کا قاعدہ یہ تھا کہ کبھی ہمارے ہاتھ کو ہادی صاحب ترکاری سمجھ لیتے تھے اور کبھی ہم ان کے ہاتھ کو سالن سمجھ لیتے تھے اس لیے کہ سارے لقمے ایک دوسرے کے ہاتھ پر پڑ رہے تھے، مگر دماغوں کے اس زمینی اور آسمانی فرق کو ملاحظہ فرمائیے کہ اس حرکت پر ہم تو دے رہے تھے گالیاں ریل کے مالکوں اور ان کے غلام ہندستانیوں سے اس

گنوار قسم کے برتاؤ کو اور ہادی صاحب ہنس رہے تھے ان ہاتھوں پر جوتر کاری کے دھوکے میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ گویا آپ کے دماغ میں ریل کا یہ اندھیرا تو کوئی اذیت رساں بات نہ تھی صرف مذاق کی بات یہ تھی کہ دونوں کے ہاتھ ٹکرا رہے تھے، اس لیے اگر ہادی صاحب ہنس رہے تھے تو کیا خطا کی؟ بس نتیجہ یہ ہوا کہ بغیر پانی پیے پان ٹھونس کر ہم یوں چپ بیٹھے کہ آگرہ تک باتیں تو کیا کہیں، بس جو کچھ کہا سراسر خلاف قانون کہا اور کہیں کہیں خلاف تہذیب بھی، مگر کمال یہ کر دکھایا کہ جو کچھ کہا دل ہی دل میں کہا کیونکہ بھی تو کہتے ہیں کہ منہ سے بات نکلی اور جرم بن گئی۔ لیجیے وہ جس طرح ہوا آگرہ آ گیا۔ ٹکٹ تھا آگرہ فورٹ کا اور جا کر اترے آگرہ چھاؤنی پر، پلیٹ فارم ہی پر ٹکٹ کلکٹر صاحب نے فرمایا کہ مبلغ دو آنے پیسے اور عنایت فرمائیے جب کہ آپ آگرہ چھاؤنی کو آگرہ فورٹ سمجھ کر اتر رہے ہیں۔ جی میں آیا کہہ دیں کہ بس تو یہ دو آنے ہمارے تاریک ڈبے میں روشنی بند ہو جانے کے حساب سے منہا کر کے ہمیں جانے دو، مفت، مگر اللہ رے انگریز کا ڈر کہ کچھ بھی نہ کہہ سکے اور کوٹ کے سارے بٹن کھول کر اندر والی جیب سے دو آنے نکال کر پیش کر دیے اور الٹا یہ بھی دریافت کرنا پڑا کہ کیوں صاحب وہ پہلے ہی سے کھچا کھچ بھری ہوئی ریل کب آئے گی اور کون سے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوگی؟

دل ٹوٹ گیا آگرہ کے اسٹیشن پر اس جاڑے میں۔ رات کے ایک بجے قلیوں کو مزدوری میں یوں مصروف پا کر کہ ان کے بدن پر نہ کوٹ تھا نہ زیادہ روئی کی نیما آستین، بس پھٹے پرانے چیتھڑے لگائے تھے، سردی سے کانپ رہے تھے اور بھاگے پھر رہے تھے مسافروں کی گالیاں کھاتے۔ بس اس تصور سے آنسو نکل آئے کہ یہی قلی ان کی اولاد ہیں جو کبھی اسی آگرے اور اسی ہندستان کے مالک تھے۔

واضح ہو کہ ہم نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ فقط آگرہ تک لے لیا تھا۔ چونکہ یہاں سے شب کے ایک بجے بعد دہلی ایکسپریس سے جانا تھا اس لیے ہادی صاحب سے عرض کیا کہ اب اگر حکم ہو تو سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیں، کیونکہ شب کی وجہ سے باتیں تو کر نہیں سکتے ہاں اگر نیند کی حالت میں بھی آپ باتیں کر سکیں تو پھر ہم حاضر ہیں آپ کے تھرڈ کلاس میں بڑے جوش سے۔ فرمایا ہاں ہاں ملا صاحب ضرور سیکنڈ میں جائیے۔ آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی اور واقعی اب فقط سونا ہی

ہے مگر سنیے تو اور وہ صبح؟ یہاں اور وہ صبح کا مطلب یہ تھا کہ ٹکٹ تو خرید لیجیے سیکنڈ کا وطن تک اور صبح ہوتے ہی آ جایئے اسی ٹکٹ سے پھر میرے پاس تھرڈ کلاس میں۔ ہم نے بھی کچھ سوچ ہی لیا ہوگا۔ اس لیے ان سے کہہ دیا کہ ہاں ہاں صبح پھر ساتھ تو بڑی خوشی سے فرمایا کہ اچھا تو پھر جایئے جایئے ٹکٹ لے آیئے، گھنٹی ہو چکی ہے بس گاڑی آیا ہی چاہتی ہے مگر دیکھیے صبح بھول نہ جایئے گا۔

بڑا گھمنڈ تھا اب تو سیکنڈ کلاس میں جوانی کی نیند سوئیں گے مگر کسے خبر تھی کہ آنے والی ریل بھی انھیں انگریز بھائیوں کی ہے جس کی رعایا پروری سے پہلے والے تھرڈ کلاس نے مارے آرام و راحت کے کمر کی ہڈی توڑ دی تھی۔ یہی ہوا، ریل آئی تو بڑے کروفر سے سیکنڈ میں گئے اور الحمدللہ کہ ایک خالی نشست مل گئی، دونوں لحاف اوڑھ کر بیٹھے اور کوئی شب کے تین بجے تک علی گڑھ پر ایک مضمون لکھتے رہے کہ دن کو دفتر کی حاضر باشی نے مضمون نگاری کے قابل نہیں رکھا اور پورے چودہ سال سے شب کے تین بجے تک یہ لمبے لمبے مضامین لکھا کرتے ہیں۔ حالانکہ اب ہو چکے ہیں بیوی بچوں والے، تین بجے کے بعد بے ہوش سے ہو گئے جسے جاہل لوگ نیند کہا کرتے ہیں اور امیر لوگ آرام۔ اماں کوئی بجے ہوں گے پانچ کہ ایک بڑا جنکشن آ گیا کوئی پورے تین آدمی ہماری نشست پر یوں برابر برابر آ کر بیٹھ گئے کہ ایک صاحب ہمارے پاؤں ہی پر بیٹھ گئے جس سے ہماری نیند اُڑ تو گئی مگر ہمیں بھی آخر صدیاں ہی گزر گئی ہیں ریلوں میں سفر کرتے اس لیے ہر قسم کی ''ریلی ترکیب'' ہمیں بھی یاد ہے لہٰذا ہم نے بھی یہ کیا کہ باوجود بیداری کے کروٹ بھی نہ لی اور پڑے رہے آنکھیں بند کیے، مگر اُف ری ہندستانیوں کی برادر آزادی کہ سورج نکلتے ہی ایک صاحب نے ہمیں زور سے جھنجھوڑا اور فرمایا کہ اٹھیے حضرت اب صبح ہو چکی۔ یعنی ظاہر کیا کہ ہم بھی سیکنڈ کلاس کے مسافر ہیں اس لیے اتنا قانون جانتے ہیں کہ ایک نشست پر چار آدمی بیٹھا کرتے ہیں سوتے نہیں۔ اب فرمایئے کس طرح سوتے، اٹھے اور پشتو زبان میں ان سب کو خاصی گالیاں دیں۔ یہ سمجھے کہ کوئی افغانی آدمی ہے اپنی زبان میں پڑھ رہا ہوگا کلمہ وغیرہ اسی لیے ایک صاحب نے یہ بھی فرمایا خاں صاحب کہاں جایئے گا ہم نے کہا ''کوفہ'' جائیں گے تو فرمایا خان صاحب ''کوفہ'' کہاں ہے۔ ہم نے کہا آپ دین پناہ حضور امام حسین علیہ السلام کو جانتے ہیں کہا جی ہاں کیوں نہ جانیں کیا مسلمان نہیں ہیں۔ افسوس کے ساتھ ہم نے کہا تو پھر آپ ''کوفہ'' کو نہیں

جانتے۔تو معقولیت سے کہا کہ مگر آپ کا وہاں جانا یقینی نہیں تھا اس لیے ہمارا خیال اُدھر نہیں گیا ہم نے کہا بہ لحاظ ناقدر شناسی ہم اپنے دوستوں کے شہروں کو''کوفہ''ہی سمجھتے ہیں۔

غرض پان، بیڑی، سگریٹ، گوشت روٹی، چائے ہندو پانی مسلمانی والے ایک اسٹیشن پر گاڑی پھر جو کھڑی ہوئی تو یہاں سے پورے پانچ آدمی یہ کہہ کر ہمارے اوپر آبیٹھے کہ صرف ایک اسٹیشن جانا ہے، معاف فرمائیے گا۔ ہمارے ڈبے میں سندیلے کے ایک بوڑھے سے رئیس بھی بیٹھے ہوئے تھے مگر تھے وہ صوبہ''واللہ چنانچہ''کے رہنے والے اس لیے مزاج میں تہذیب اور لیاقت وہ کوٹ کوٹ کر بھری تھی کہ بس جو دوزانو ہو کر بیٹھے تھے تو پہلو نہیں بدلتے تھے۔اب جو یہ پانچ مسافر صرف ایک اسٹیشن کا کہہ کر سوار ہوئے تو موصوف کا یہ سندیلوی دوزانو پن بھی تباہ ہو گیا۔ لکھے پڑھے تھے یہ پانچوں کسی اسکول کے، اس لیے ان کے پاس مشرقی یا اسلامی تہذیب و متانت کا پتہ بھی نہیں تھا اس زور سے باتیں کر رہے تھے کہ رئیس سندیلوی ہی کیا ہم تک دعا کر رہے تھے کہ یا تو وہ ان کا''صرف ایک اسٹیشن''جلد آجائے یا خدا ہم لوگوں کو ایمان سے اٹھالے۔تھوڑی دیر میں ان پانچوں میں ایک نے ایک چھوٹے سے چمڑے کے صندوق سے اپنا پان کا ڈبہ نکالا، خود کھایا اور ساتھیوں کو کھلا کر رکھ دیا گھبراہٹ میں ہمارے رانوں پر۔اس پر ہم نے اس ڈبہ کو اٹھا کر کہا اور ملاحظہ فرمائیے بڑے''ضرب خفیف''ہوئے اور فرمایا کھائیے کھائیے ہم نے کہا آج کل کے ''تعلیم یافتہ پن''کی تہذیب یہ ہے کہ''تھینک یو''۔ان کی باتوں کے شور سے زیادہ دماغ سوز تکلیف ان کی باتوں کے عنوان سے پہنچ رہی تھی۔یعنی وہی''دفتریات''ان کے دماغ دفتری معلومات سے اس درجہ ماؤف ہو چکے تھے کہ بس یہ پانچوں اچھے خاصے، مقدمہ سازش لاہور کی ''عدالت العالیہ''بنے ہوئے تھے۔تھوڑی دیر میں ان میں سے ایک نے تھک کر رسالہ''جن'' لکھنؤ نکالا جو حضرت نیاز فتح پوری ایڈیٹر رسالہ''نگار''نے ایک خاص مقصد کے تحت ابھی ابھی جاری کیا ہے۔بس اس رسالہ کو ان کے پاس دیکھ کر ان کی ذہنیت اور کور ذوقی کا پورا اندازہ ہو گیا اور سمجھ لیا کہ جو شخص اس عہدِ عقل میں بھی جن اور بھوت کے حالات مزے لے کر پڑھے اس سے دفتری معلومات اور دفتری گفتگو کے سوا کانگریس کی ممبری، سارو ابل کی مخالفت، غازی نادر خاں کے عہد تاجداری اور مشرق جدید کی بین الاقوامی سیاست پر اظہار رائے کی کیا امید کی جائے۔پھر

بھی رسالہ جن کو ان کے پاس دیکھ کر اتنا یقین آیا کہ یہ بعض دوسرے رسالے بھی کبھی پڑھ لیتے ہوں گے، اس لیے ان سے آہستہ سے کہا کہ جنوری کا رسالہ ''نگار'' ضرور پڑھ لیجیے گا کیونکہ اس میں آپ حضرات کے اس سفر کے حالات پر ملا رموزی صاحب نے کچھ لکھا ہے۔ اب تو گھبرائے اور کا کہا تو کیا جناب ہی ہیں ملا رموزی۔ ہم نے کہا جی نہیں پہلے اسٹیشن پر ہمیں ایک صاحب نے بتایا تھا کہ اسی ریل میں وہ بیٹھے ہیں ملا رموزی یعنی آگے کے ڈبے میں بیٹھے ہیں۔ اب پریشان بھی ہوئے اور مشکوک بھی۔ نتیجہ یہی کہ اب ان کی باتوں میں ایک حد تک سلیقہ اور کمی آ گئی اور بار بار یہی دریافت فرماتے کہ بتایئے تو جناب کہ ملا رموزی صاحب آپ ہی ہیں۔ باقی کے چاروں نے ملا رموزی صاحب سے ملنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا اور ان کے مضامین کی بے حد تعریف شروع کر دی۔ اب اس موقع پر ہم نے سندیلوی رئیس صاحب سے جو کہا جناب عالی ادھر تشریف لے آئیں۔ بڑی تکلیف سے بیٹھے ہیں آپ تب ان دفتر زدہ لوگوں نے بھی کہا جی ہاں تشریف لے آیئے واقعی ہم لوگوں کے آنے سے آپ حضرات کو بڑی زحمت ہوئی۔ واضح ہو کہ یہ سب ہوں گے کوئی درجہ سوم کے ہندستانی مگر لباس اور گفتگو میں یہ لوگ آدھے سے زیادہ انگریز ثابت ہو رہے تھے۔ ہر دو سیکنڈ کے بعد تین چار انگریزی فقرے اردو میں داخل کر لیے جاتے تھے کہ یہی قابلیت پیدا کر دی ہے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے ہندستانی استادوں نے اپنے رشید شاگردوں میں یا ''شاگرد رشیدوں میں۔

اپنے شہر کے اسٹیشن پر پہنچے تھے کہ کوئی سو سوا سو قلی اور تانگے والے ہمارے اوپر ٹوٹ پڑے اور لگے ہمارے بچپن، جوانی، ملازمت کے آڑے ترچھے نام پکار کر ہمیں بلانے۔ شہر کی واقفیت، ملاقات اور پہچان پر یوں تو ان سب کو حق تھا کہ ہمیں چاہیں جس نام سے یاد کریں مگر ان میں سے جب کوئی ہمیں بر بنائے احترام منشی جی صاحب کہہ کر پکارتا تھا تو بس دل جانتا ہے کس قدر توہین ہوتی تھی ہماری بیدار مغزی ہماری روشن خیالی اور ہماری چوٹی کی انشاپردازی کی مگر وہ تو غنیمت ہوا کہ عہدِ حاضر کے دو چار روشن خیال تانگے والوں نے ہمیں جو ملا صاحب کہہ کر آواز دی تو کہیں منشی جی کی تکلیف کم ہوئی۔ اب جو شہر میں داخل ہوئے تو نہ کوئی استقبال تھا نہ ''زندہ باد رموزی'' کے نعرے تھے۔ نہ پُر جوش معانقے تھے نہ جلوس کے موٹر، بس سڑکوں پر سے گزرنے والے محض

شہری واقفیت کی بنا پر کہیں کہیں ذرا مسکرا کر سلام کو ہاتھ اٹھا دیتے تھے۔ اس وقت سلام کے ساتھ لوگوں کے ذرا مسکرا دینے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کہیے ملا صاحب کہاں گئے تھے، بہت دن سے نظر نہ آتے تھے کہ یکا یک سائیکل پر بیٹھے ہوئے ہمارے چھوٹے بھائی صادق صحی سلمہ تانگے کے پاس آئے۔ بعد سلام مسنون آنکہ بغیر کسی تمہید کے فرمایا کہ ''گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے سب سہور گئے ہیں، کل بارہ بجے انتقال ہوگیا میں بھی رات کی گاڑی سے محض آپ کو لینے آیا ہوں''۔

مجھے آپ یعنی ہماری خوشدامن صاحبہ کی وفات کی یہ اطلاع تھی جو اس طویل سفر سے واپسی پر بہ طریق ''تحفۂ ادب وانشا'' ہمیں راستہ ہی میں پیش کی گئی۔ اب اور بلایئے گا ملا رموزی صاحب کو شاندار جلسوں میں پُر جوش تقریروں اور تنقیدوں کے لیے۔

خدائے رحیم و کرم گستر کی بے پایاں رحمت سے کامل توقع ہے کہ وہ ہمیں راحت بخش اور عزت افزا سفر بھی اتنے عطا فرمایئے گا کہ ہم ہم تھک کر ڈاکٹر اقبال اور ٹیگور کی طرح تار کے ذریعہ کہہ دیا کریں گے کہ:

ابھی فرصت نہیں موسم بہار میں حاضر ہو سکوں گا۔ فقط

◆◆◆

ہندستانی اولاد

اس امر سے بحث نہیں کہ ملا رموزی ابھی صرف ایک ہی ننھے میاں کے والد صاحب ہوئے ہیں زیادہ کے نہیں۔ اور نہ اس جھگڑے میں پڑے کہ ملا رموزی کو اولاد سے کب تک محبت ہوگی؟ یہ دیکھیے کہ اب حسب ضابطہ ملا رموزی ''آل انڈیا والد اینڈ کمپنی لمیٹڈ آف انڈیا'' میں شرکت کے قابل ہو گئے ہیں یا نہیں؟ سو ظاہر ہے کہ ہو سکتے ہیں جب اللہ پاک نے ان کے گھر میں بھی ایک چاند سا بیٹا دیا ہے۔

پس کچھ شک نہیں کہ اس مضمون سے ملا رموزی تمام ہندستان میں یا بالکل ہی بے وقوف مان لیے جائیں گے یا ''حکیم الحکما'' لہٰذا واضح ہو کہ دنیا جہان کے ہر حصے میں ''اولاد سے محبت کرنا'' ایک ایسی یقینی بات ہے جس کا منکر دنیا میں کافر، مشرک، ملحد، مرتد اور جو کچھ بھی نہیں تو گدھا، اُلو، خبطی، پاگل اور کم سے کم سی۔ آئی۔ ڈی ضرور مانا جائے گا۔ اس لیے ملا رموزی بھی ''بہ اقرار صالح'' کہتا ہے کہ اولاد سے محبت کرنا مسلم اور صحیح مگر کیا یہ محبت کرنے والے کسی ایک کتاب سے بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ اولاد سے اس درجہ محبت کرنا ضروری ہے کہ دنیا آپ کو مالیخولیا، مراق، خبط اور دق کا مریض تصور کر لے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ اولاد سے محبت ''بقدر حماقت'' اور بس۔ لہٰذا چند امور کا تصفیہ بھی ضروری ہے مثلاً بتایئے کہ:

(1) والد صاحب کی محبت اولاد کے لیے ضروری ہے یا والدہ صاحبہ کی؟

(2) کس حد تک محبت ضروری ہے؟

(3) ہندستانیوں میں محبت کا کو موجودہ معیار صحیح ہے یا غلط؟

افسوس کہ اول تو ہندستان میں یہ باتیں غور طلب نہیں مانی گئیں اور جو مانی بھی گئی ہیں تو اس طرح کہ عمل میں کچھ بھی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہندستانی قوم ہی نہیں بلکہ قومیت تک برباد ہو رہی ہے اور کہنے میں صرف اتنا آتا ہے کہ اولاد سے محبت کرتے ہیں تو کیا گناہ کرتے ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ اولاد سے محبت کرنا انسان کا ایک طبعی اور فطری جذبہ ہے، مگر ہندستان میں جس طرح محبت کی جا رہی ہے وہ خدا کا کھلا ہوا عذاب ہے۔ چنانچہ ملا رموزی کے خیال میں اولاد سے محبت کا مقصد اس کی حفاظت، پرورش اور اعلیٰ تربیت کے بعد اس سے پنشن اور کھانسی کے زمانے میں امداد حاصل کرنا ہے یا پھر طبعی خشا یہ کہ انسانی آبادی میں اضافہ ہو اور یورپ میں اولاد سے مقصد یہ ہے کہ جنگی رضا کاروں میں اضافہ ہوتا کہ ایشیا کی قوموں پر حکومت باقی رہے اور اسی لیے یورپ میں مہر، نکاح اور طلاق کا سودا بہت سستا اور ارزاں ہے۔ پس جب اولاد سے مقصد انسانی آبادی کی بحالی اور افزائش ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہونا چاہیے کہ جو لوگ دنیا میں انسانوں کی کثرت سے گھبراتے ہیں انھیں اپنی اپنی اولاد کو فوراً ہلاک کر دینا چاہیے لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ اولاد کی کثرت کے مخالفین بھی صبح کے وقت اپنے ننھے میاں کو گود میں لیے ٹہل رہے ہیں، اس لیے اب پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ یہ کیوں؟ تو جواب یہ ہے کہ اولاد سے محبت کرنا جہاں ایک طبعی اور فطری ملکہ ہے وہاں اس میں ''پروپیگنڈہ'' یا ایک خیال کی حد سے سوا تبلیغ و شہرت کو بہت زیادہ دخل ہے۔ مثلاً اُس وقت سے جب کہ آپ خود کسی کی اولاد کہے جاتے ہیں آپ کے کان، ناک، آنکھ اور جسم کی ایک ایک رگ کو یہ سنایا جاتا ہے کہ دین و دنیا میں اولاد سے زیادہ پیاری، عزیز، محبوب، لطیف، اقدس اور کارآمد چیز اب تک پیدا ہی نہیں ہوئی اور اس کی محبت انسانوں سے لے کر گدھوں، گھوڑوں، کتوں اور مرادآباد کے لوٹوں تک میں مسلّم ہے۔ پھر یہ آواز اس قدر مسلسل اور متواتر سنی جاتی ہے کہ آپ کے تمام حواس و خواص اسے بغیر کسی علمی تحقیق اور غور و فکر کے اسی طرح قبول کر لیتے ہیں، جس طرح آپ اپنے مذہب کو بغیر کسی ذاتی تحقیق کے تمام دنیا کے مذاہب

سے بہتر مانے ہوئے ہیں۔ اس شدت کے ساتھ کہ دنیا کے بہتر سے بہتر دماغ بھی اگر آپ کے مذہب کو جھوٹا ثابت کر دیں تو آپ کے مان لینے کے بعد بھی اسے جھوٹا کہیں، لیکن اگر آپ اس خیال سے انکار کریں کہ اولاد سے محبت کرنا کسی پروپیگنڈا اور تبلیغ کا اثر نہیں ہے تو پھر بتایئے کہ مسلمانوں میں صحابہ کرام نے جب جہاد کے میدان میں اپنی اولاد کی شہادت کی خبر سنی تو اس پر اظہارِ مسرت کیوں کیا؟ یورپین عورتیں جب قومی جنگ میں اپنے بیٹے کے مارے جانے کی اطلاع پاتی ہیں تو اس پر کیوں اظہارِ فخر و مسرت کرتی ہیں اور یہ آپ کے آج کل سیاسی جنگ کے سب سے بڑے رہنما موتی لال صاحب نہرو کی صاحبزادی کو عدالت سے جرمانے کی سزا پر جب کسی گمنام آدمی نے ان کی رہائی کے لیے جرمانہ داخل کر دیا تو نہرو صاحب نے اخباروں میں یہ اعلان کیوں کیا کہ میری بیٹی کی رہائی کے لیے جرمانہ داخل کرنے والا میرا اور ملک کا دشمن ہے؟ پس ان حالات سے ثابت ہوا کہ اصل میں جہاد اور قومی و ملکی جنگ میں ختم ہونے کو اس درجہ لائقِ تعریف کام مشہور کیا ہے کہ اس میں اولاد تک کو قربان کر دینا دل و دماغ کو گراں نہیں گزرتا ورنہ کون ہے جو اپنے نوجوان بیٹے کی موت پر اظہارِ مسرت کو پسند کرے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جب یورپ کی ماں کا بیٹا میدانِ جنگ کو روانہ ہوتا ہے تو اس کی ماں اس کی پیشانی کو فخر سے بوسہ دے کر نصیحت کرتی ہے کہ یا کامیاب آنا یا خود کو قربان کر دینا، لیکن ہندستان کی والدہ صاحبہ لام پر جانے کی خبر سے خود بھی بے ہوش ہو جاتی ہیں اور بیٹے بھی اپنی علالت کے بہانے کے لیے ڈاکٹروں سے سرٹیفکیٹ لکھاتے پھرتے ہیں۔ کیونکہ ہندستان میں اولاد سے محبت کرنے کے خیال کو ہندستان کے شعرا نے بہت زیادہ عام کیا ہے اور شعرائے ہند نے ''ماں کی ممتا'' کے موضوع پر جتنا زور صرف کیا ہے اسے شائع کرنے والوں نے بھی عقل و خرد اور ادبِ لطیف کا ایک بڑا ہی ضروری اور قیمتی باب تصور کرایا ہے۔ چنانچہ شاید ہی کوئی رسالہ ہو جس میں ''ماں کی محبت'' یا ''ماں کی ممتا'' پر ایک آدھ مضمون یا ایک آدھ نظم شائع نہ ہوئی ہو اور اب تو تصاویر کے ذریعہ اولاد کو ماں کے گلے میں لٹکا ہوا دکھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس شہرت کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں یہ ہوا کہ قوم کا مشترکہ اخلاق برباد ہو گیا اور آج دنیا کی متمدن اقوام میں ہندستانی قوم سے زیادہ بداخلاق و بدعمل دوسری قوم ہی نہیں اور یہ ظاہر ہے بداخلاق و بدعمل قوم صرف تباہی کے لیے باقی رہتی ہے اور بس۔

اخلاق کے بعد اولاد سے حد سے سوا محبت نے قوم کی مالی زندگی اور معاشی حیثیت کو برباد کیا اور آج جو افلاس ہندستانی قوم میں پایا جاتا ہے وہ دنیا کی غلام سے غلام قوم میں بھی نہیں۔ اس لیے اس حصہ مضمون میں اولاد سے محبت کے وہ تباہ کن اثرات بتاتے ہیں جو غیر محسوس طریقے پر اخلاق و مالیات سے متعلق ہیں اور یہی اثرات قوم کی سیاسی اور بین الاقوامی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔

ہندستان میں اولاد سے محبت کا سب سے بڑا ٹھیکیدار والدہ صاحبہ کو قرار دیا گیا ہے اور اس معاملہ میں یہ اس درجہ مسلم الثبوت کر دی گئی ہیں گویا دنیا میں والدہ صرف اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ وہ دن رات اپنی اولاد کو گلے میں لٹکائے رہیں اور اس کے لیے آنسو بہاتی رہیں۔ چنانچہ اس خیال کا نتیجہ یہ ہے کہ اس تعلیم و ترقی کے زمانے میں بھی آج کل کی ایک ایسی نوجواں، زیرک، جوشیلی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی جس کی بے شمار قوتوں سے بے شمار کام لیے جا سکتے ہیں۔ جماعت اور خاندان کے اس مسلمہ پروپیگنڈا اور عقیدہ کے اثر سے پہلا بچہ پیدا ہوتے ہی اس کی یوں عاشق زار بن جاتی ہے کہ اگر اس کے سامنے فرہاد و مجنوں آئیں تو شرمائیں۔ حالانکہ ضابطۂ خردمندی تو یہ تھا کہ جس درجہ بلند اور تعلیم یافتہ خاندان ہو اس کے افراد و ارکان کے عقلی و علمی اعمال و اثرات بھی دوسروں سے بلند اور لائق تقلید ہوں، مگر تعلیم کے غلط اصول کے تحت ہندستان کے بلند خاندان بھی آج اولاد کے معاملہ میں جس درجہ غلط کار اور سیہ کار واقع ہوئے ہیں شاید ہی غریب خاندان میں ان کی مثال مل سکے۔

چنانچہ ہندستان کی ایک صاحب عقل و فراست لڑکی ایام حمل ہی سے ہونے والے بچہ کے حق میں ضبط کر دی جاتی ہے۔ بس اب یہ لڑکی ہے اور خاندان بھر کی جانب سے اس کی نازبرداری کا وہ اہتمام ہے کہ الامان یہ لڑکی ایام ولادت سے جتنی قریب ہوتی جاتی ہے اتنا ہی وہ خود کو نازک، ضعیف اور دق کا مریض تصور کرتی جاتی ہے۔ اس کی نزاکت کے اس خیالی بھوت کو اس کی ماں اور ساس خصوصیت سے زندہ ثابت کرتی رہتی ہے۔ لڑکی اگر اپنی طبعی قوت کے بل پر گھر کے کسی سخت کام کے لیے مستعد ہوتی ہے تو اس کی ماں اور ساس اسے فرضی ڈاکٹری کے لاکھوں قاعدوں سے ڈرتی ہے کہ دیکھو اس حرکت سے کہیں تمھیں کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ اس حماقت آفریں

طریق ناز برداری کے عام ہو جانے سے ملا رموزی قسم کے لوگوں نے بھی موقع کو غنیمت سمجھ کر ایام حمل کے لیے ایسے بے شمار اصول تصنیف کر ڈالے ہیں جن کی رو سے عورت کو ہر قسم کی نقل و حرکت ہی حرام قرار دے دی گئی اور اب اونچے خاندانوں کی ایک عورت بھی مزدوروں کاشتکاروں اور غریبوں کی حاملہ عورتوں کی زندگی اور کام کاج پر نظر نہیں ڈالتی کہ ان میں کی کوئی ایک عورت بھی حمل کے زمانے میں تجربہ نہ کرنے کے باعث ہلاک ہوگئی؟ پس مزاجی اور عملی طور پر جس طرح اس نخرہ کا آغاز ہوتا ہے اسی طرح ایامِ حمل ہی سے مالی بربادی کا کام بھی شروع ہو جاتا ہے جس کا معیار حماقت اور دولت پر موقوف ہے یعنی جس خاندان میں جتنی زیادہ حماقت اور دولت ہوگی اتنی ہی مالی بربادی بھی جائز اور مبارک سمجھی جائے گی۔ پس یہ دیکھ کر حکیموں اور ڈاکٹروں کو کیا ہو گیا تھا جو وہ اس حالت سے فائدہ نہ اٹھاتے لہٰذا انھوں نے بھی ایسی عورت کے لیے وہ قیمتی اور جواہرات کی تول کے نسخے گھڑ دیے کہ بس خریدے جایئے اور دیوالیہ ہوتے جایئے حالانکہ طبعاً ایسے نسخوں کی اس درجہ گرانی کے ساتھ ہرگز ضرورت نہیں جب کہ ولادت ایک طبعی فعل ہے اور اصولِ فطرت کے لحاظ سے اس میں ہرگز کوئی خطرہ نہیں۔ مگر رسم و رواج کی شدت و کثرت نے ہر زچہ کے لیے پورا شفاخانہ یونانی خرید لینا ایسا ہی ضروری قرار دے دیا ہے گویا ہر بچے کے ساتھ ایک شفاخانے کا پیدا ہونا بھی حد سے سوا ضروری اور ضابطۂ فطرت ہے۔

اس زمانے میں سب سے زیادہ تباہی پھیلانے والی ذات بیوی کی والدہ اور شوہر کی والدہ صاحبہ ہوا کرتی ہیں اور جس خاندان میں دونوں بقیدِ حیات ہیں اس خاندان کی تباہی کا عالم ہی نہ پوچھیے۔ چنانچہ بیوی کی والدہ اس جوش میں کہ میری لاڈلی بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے اور شوہر کی والدہ اس بے خودی میں کہ میرے لاڈلے بیٹے کے گھر لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ بچے والی عورت کو ناز و نخرہ کا جیسا تھیٹر بنا دیتی ہیں کہ وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ابھی پیدائش میں تین چار ماہ باقی ہیں اور کہیں ابتدا ہی سے زچہ اور بچے کے لیے جو ذخیرہ جمع کیا جاتا ہے، اسے اگر جرمنی فوجوں کا ذخیرۂ جنگ یا ذخیرۂ رسد کہیں تو غلط نہیں۔ چنانچہ اس موقع پر زچہ کے کھانے کے لیے جو مقوی اور قیمتی ادویہ و اغذیہ جمع کی جاتی ہیں اس پر شوہر صاحب کی اگر تین تنخواہیں خرچ ہو جائیں تو مبارک اور اگر ایک پورا مکان نیلام ہو جائے تو مسعود۔ اس کے بعد بچے کے لیے جو کپڑے تیار

ہوتے ہیں ان کی حماقت خیز قیمت کو اگر سرکاری وزیر مال کتابی صورت میں جمع کردے تو اتنی طویل ہو کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے تین شبانہ روز اجلاس بھی اس کی سماعت سے معذور رہیں۔ کپڑوں کے بعد گوشت کے اس بے حس وحرکت ٹکڑے پر کھلونوں کا دروازہ کھلتا ہے اور ماں باپ سے لے کر پورے خاندان اور سسرال تک کے ایک ایک رکن پر کھلونوں اور تحفوں کا لانا اتنا فرض کہ اگر پیدائش سے لے کر پانچ چھ برس کی عمر تک کے ''آل انڈیا بچوں'' کے کھلونوں کی تعداد، اقسام اور قیمت کے لیے ایک مستقل وزیر اطفال مقرر کردیا جائے تو اسے اپنے کام کے لیے وزیر ہند کے دفتر اور عملے کے برابر اپنا دفتر اور عملہ تیار کرنا پڑے۔

اس کے بعد پھر وہ عجیب وغریب تقریبات اور رسوم ہیں جن کا دیکھنا ایک عقلمند انسان پر وہی اثر کرتا ہے جو کم سمجھ بچوں پر بھوت کا دیکھنا اثر کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی مختصر خاکہ ہے مالی بربادیوں اور عقلی فضولیوں کا۔ اس کے بعد سب سے زیادہ مضحکہ خیز حالت ہندستان کے نئے اور تازہ ماں باپ کی ہوا کرتی ہے جو جماعت اور خاندان کے ارکان کے حماقت آفریں اقوال واعمال کی ایک عجیب سی نقل ہوا کرتی ہے اور وہ اس طرح کہ عموماً ہندستان میں شادی شروع جوانی ہی میں کردی جاتی ہے مثلاً بیوی صاحبہ ہوتی ہیں 12 برس کی اور شوہر صاحب ایک کم بیس کے لہٰذا عقلاً طبعاً اور ڈاکٹریاً ثابت ہے کہ اتنی عمر میں نہ لڑکی صورتاً سنجیدہ ہوتی نہ لڑکا متین و باوقار۔ مگر رسم و عقیدہ کا یہ خیالی اثر ملاحظہ ہو کہ جہاں اس عمر کے نوجوان کے ہاں پیدائش کا زمانہ قریب آیا کہ اب دلہن صاحبہ بھی مارے متانت کے ساٹھ برس کی بوڑھی بنی ہوئی ہیں اور دولہا میاں بھی 76 برس کے بوڑھے۔ دلہن صاحبہ ہیں کہ پہلے ہی بچہ کی محبت، سنبھال، نگہداشت، حفاظت اور اعلیٰ تعلیم وتربیت کی اس درجہ ذمہ دار بنی ہوئی ہیں کہ سوپختہ کار عورتیں ایک طرف اور دولہا میاں ہیں کہ پہلے ہی صاحبزادے پر یوں نثار وقربان نظر آتے ہیں کہ محلہ بھر تماشے دیکھے مگر وہ نہ شرمائیں۔ اگر اس ڈھائی دن کے بچے نے شروع رات میں کوئی غلط سی کروٹ لے لی تو نئی والدہ صاحبہ ہیں کہ مارے محبت کے رات بھر بیٹھی رو رہی ہیں اور نئے دولہا میاں ہیں کہ مارے محبت کے اس پلّے کے لیے جرمنی کے بنے ہوئے ڈاکٹر تلاش کرتے پھرتے ہیں، مگر پورے خاندان میں ایک ایسا نہیں ہوگا جو ان نئے نئے ماں باپ کو شرمائے اور کہے کہ ابھی سے آپ کا اولاد پر یوں نثار ہونا موزوں نہیں،

جب کہ آپ دونوں خود جماعت اور خاندان کی نظر میں ابھی بچے دھرے ہوئے ہیں۔ اب جو گھر میں یہ نئی والدہ صاحبہ چلیں گی تو خاص انداز سے اور گفتگو کریں گی تو خاص انداز سے۔ بچہ کو اٹھائیں گی تو لاکھوں دعائیں پڑھ کر اور بٹھائیں گی تو کروڑوں تعویذ باندھ کر۔ والد صاحب بھی بچے کو لیں گے تو بارہ پیار کر کے اور واپس کریں گے تو سترہ بار خدا حافظ کہہ کر۔ مگر گھر بھر میں ایک ذی عقل بھی ایسا نہ ہوگا جو ان دونوں بیاہے ہوئے بچوں کو ابھی سے اس مادرانہ اور پدرانہ بڑھاپے سے باز رکھے۔

اب جو چند دن کے بعد صاحبزادے نے ''اوں'' اور ''آں'' کی آوازیں پیدا کیں تو اب نہ پوچھیے ان نئے ماں باپ کی مراقی اور جنونی حالت کا عالم۔ رات اور دن کا جو لمحۂ فرصت بھی ہے وہ ان صاحبزادے سے کھیل میں یوں صرف کیا جارہا ہے گویا خود بھی بہت ہی کم عمر بچے ہیں۔ زبانیں لڑکھڑائی جارہی ہیں، منہ بھی بنایا جارہا ہے اور ہاتھ پاؤں بھی ہلائے جارہے ہیں اور اس درجہ اہتمام کے ساتھ کہ نہ اب اپنے پرانے ماں باپ سے شرم نہ احباب اور محلے والوں سے حجاب اور ملا رموزی نے تو ایسے ایسے احمق بھی دیکھے ہیں جو گوشت کے اس سیر بھر کے ٹکڑے کو گود میں لیے ہوئے ہر آنے والے دوست کو فخر و دیوانگی سے دکھاتے اور مارے پدرانہ دیوانگی کے اس بچے سے زیادہ خود بچے بنے رہتے ہیں۔ نئے نئے کھلونوں پر کھلونے ہیں کہ آرہے ہیں اور کپڑوں پر کپڑے ہیں کہ تیار ہورہے ہیں جن کی نہ قیمت کا حساب ہے نہ صحیح مصرف کا اندازہ۔

اس کے بعد اگر خدا نے اس بچے کو اس قابل کردیا کہ وہ معمولی سی گفتگو کرے تب تو نئے ماں باپ کی بے ہوشی کا عالم ہی نرالا ہے۔ بس اب اس کی عجیب و غریب تعلیم و تربیت کے قاعدے ہیں کہ تصنیف ہورہے ہیں۔ دور از کار اور دور از متانت حرکات ہیں کہ سکھائی جارہی ہیں۔ ایسے موقع پر خاندان کی بوڑھی عورتیں بچے کو فحش گالیاں سکھانا بہت بڑا پیار تصور کرتی ہیں اور نئے ماں باپ دو چار کتابوں کے ''تعلیم یافتہ ہوئے'' تو اب اس بچے کی خیر نہیں۔ جہاں گھر پر کوئی دوست آیا یا کوئی سہیلی کہ اب اس خورد سال رنگروٹ کی پریڈ اسے دکھائی جانے لگی اس طرح کہ:

ہاں بیٹے ذرا جھک کر آداب تو عرض کرو۔

اور ذرا بیٹے مصافحہ تو کرو۔

بھئی ماشاءاللہ ماشاءاللہ۔
شرماؤ نہیں بیٹا ایک مرتبہ اور۔
اور بیٹے ذرا وہ سنانا جو تمھاری والدہ نے رات کو بتایا تھا۔
اچھا اچھا دیکھو یہ چچا میاں کیا فرما رہے ہیں؟
اور بیٹے ذرا پڑھنا وہ اپنا سبق۔
ذرا اس کا جواب اور دے دو۔
اچھا گھبراؤ نہیں، لو ہمارے پاس بیٹھ کر صرف ایک مرتبہ اور سنا دو۔
اور ہاں بیٹے وہ تمھاری چچی جان منہ کس طرح بناتی ہیں؟
اور وہ نانی جان رات کو کس طرح کھانستی ہیں؟
اور بھئی لو یہ پیسے بس ذرا ایک مرتبہ چچا میاں کو جھک کر اور سلام کر لو۔
اور بیٹے مزاج بھی دریافت کر لو۔
اور وہ خالہ بی روٹی کس طرح کھاتی ہیں؟
اور ہاں ذرا کہنا کہ آداب عرض ہے۔
اور کہنا کہ مزاج کیسا ہے؟
اور بیٹا کہنا ذرا کہ پان ملاحظہ فرمایئے۔
اور کہنا بیٹا پھر کہ کہاں سے تشریف لائے۔
اور میاں وہ مُنّی جان رنڈی کس طرح ناچتی ہیں؟
اور وہ ننھو خاں کس طرح باتیں کرتے ہیں؟
اور وہ بیٹے وہ ریل کس طرح بولتی ہے؟
اور وہ موٹر کس طرح چلتی ہے؟
اور بیٹا وہ تمھارے ماموں جان دفتر کس طرح جاتے ہیں؟

غرض ایک ہزار کرتب ہیں کہ دکھائے جا رہے ہیں اور سنائے جا رہے ہیں۔ اب آپ چاہے کتنے ہی ضروری کام سے ان والد صاحب کے پاس آئے ہوں اور چاہے اس لونڈے کی

حرکت اور صورت سے آپ کو کتنی ہی شدید نفرت ہو مگر والد صاحب ہیں کہ آپ سے جبراً داد دلوا رہے ہیں اور اس کی خوبیوں کو منوا رہے ہیں اور آپ بھی مارے ہندستانی مروّت کے سبحان اللہ اور ماشاء اللہ فرما رہے ہیں۔ ایسے ہی حمقاء ہوتے ہیں جو اتنی عمر ہی میں بچے کے دماغ کو اپنے حماقت بھرے اسباق سے ایک ایک چھوٹی موٹی سی انسائیکلو پیڈیا بنا دیتے ہیں۔

اس سے بھی کچھ بلند حالت نئی والدہ صاحبہ کی ہوتی ہے۔ چونکہ اس خیال کی بہت زیادہ شہرت ہو چکی ہے کہ دنیا میں اولاد سے جو محبت ماں کی ہوتی ہے اس کا جواب نہیں۔ والدہ صاحبہ ہیں کہ ہر قدم بسم اللہ اور خدا کرے بنی پھرتی ہیں۔ اب اگر ایسی والدہ صاحبہ کو کسی محفل میں جانے کی سعادت حاصل ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ اب یہ محفل سے اس وقت رخصت ہوں گی جب ایک ایک عورت سے اپنے بچے کی تعریف کرا لیں گی انھیں اس امر سے کوئی بحث نہ ہوگی کہ ان کا بچہ صورت کے حساب سے کتنا بھونڈا، کتنا گندا اور کتنا الّو کی طرح واقع ہوا ہے یہ تو جب کسی محفل میں جائیں گی تو اس لونڈے کو حسین وجمیل بنانے میں یوں مصروف ہو جائیں گی گویا یورپ کے حسن کی نمائش میں انھی کا بیٹا اول نمبر کا انعام پا کر رہے گا۔ سُرمہ پر سُرمہ ہے کہ لگایا جا رہا ہے۔ کپڑوں پر کپڑوں پر کپڑے ہیں کہ پہنائے جا رہے ہیں اور جو اتفاق سے ایسی والدہ صاحبہ کی خدمت میں ایک آدھ ملازمہ اور خادمہ بھی ہے تب تو شاہانہ نخرہ کا عالم ہی نہ پوچھیے۔ اب یہ بھری محفل میں اس نخرہ سے داخل ہوں گی کہ ہر قدم پر ملازمہ کو ڈانٹا جائے گا۔ اس طرح کہ دوسری عورتیں بھی سن لیں اور دیکھ لیں کہ ہاں یہ بیٹے والی بھی ہیں اور ''امیر آدمی'' بھی۔

دیکھ دیکھ اندھی تیرے ہاتھ کے نیچے میاں کا ہاتھ دبا ہوا ہے۔

تو بے غیرت کبھی سنبھالا بھی ہے بچوں کو۔

لے جا ذرا باہر جا کر کھلا انھیں۔

اور دیکھ اگر رُلایا ہے تو تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

لے یہ کھلونے تو ان کے۔

بس بس لے جا جلد میں ذرا بہن سے باتیں کرتی ہوں۔

اتنے فقرے ملازمہ سے محض محفل کو سنانے اور دکھانے کے لیے کہے جائیں گے اور دل

میں یہ جوش بھرا ہو گا کہ بجائے ملازمہ کو دینے کے بیٹے کو خود ہی گلے کا ہار بنائے رہوں۔ چنانچہ بچے کے روتے ہی بڑے نخرہ سے ملازمہ سے لیا جائے گا اور محفل کے ایسے رُخ بیٹھ کر اسے دودھ پلایا جائے گا جہاں سے محفل کی تمام عورتیں آپ کو اولاد دیکھ لیں۔

اب جو دودھ پلا کر فارغ ہوئیں، تو تمام محفل کی شامت آ گئی۔ جو عورت آپ سے مخاطب بھی نہیں ہے اسے اپنی بے حیائی سے خود ہی مخاطب کیا جائے گا اور اپنے لاڈلے کے کرتب دکھائے جائیں گے اور اپنے سے زیادہ شوہر صاحب کے عشق کا اظہار کیا جائے گا۔

سلام کرو بیٹے یہ تمھاری نانی اماں ہیں۔

اور انھیں بھول گئے انھیں۔ ارے بے وقوف یہ تیری دادی جان ہوتی ہیں اور انھیں یہ اپنی خالہ بی ہیں بے ہودہ، ارے یہی تو تیرے لیے جوڑا لائی تھیں۔

اچھا میاں ذرا خالہ بی کو ڈانٹ تو دو۔

اور ذرا میاں آداب تو عرض کرلو جھک کر۔

اس قسم کی مضحکہ خیز پریڈ کے بعد اب یہ نئی والدہ صاحبہ اس لاڈلے کے حالات وخواص کی تفصیلات اور اپنی اور اپنے شوہر صاحب کی اس سے محبت کی داستان شروع فرمائیں گی اور انھیں یہ خیال ہرگز نہ ہوگا کہ سننے والی عورت ان حالات کو پسند بھی کرتی ہے یا دل میں میرا مذاق اڑائیں گی، مگر یہ ہیں کہ بچے کی تعریف میں رواں دواں ہیں۔

بہن کیا کہوں تم سے کہ میں نے اس بچے کے لیے کیسی کیسی تکالیف اٹھائی ہیں؟ خدا عمر دراز کرے اس کی آپ دیکھیے کہ جب یہ تین مہینے کا پیٹ میں تھا تو مجھ اندھی کو ہوش تو رہا نہیں میں ''اُن'' کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر ٹھنڈی سڑک پر چلی گئی۔ وقت تھا سخت جاڑے کا، بس مجھے کھانسی ہو گئی۔ اسی وقت بس خدا جانے کیا اثر ہوا کہ پیدا ہوتے ہی اسے بھی جو کھانسی ہوئی ہے، جانے کا نام نہیں لیتی، مگر خدا انھیں بھی سلامت رکھے کہ انھوں نے اس کے علاج کے لیے زمین آسمان تو ایک کر دیے ہیں۔ کون سا حکیم ہے، کون سا ڈاکٹر جس کی دوا انھوں نے اسے نہ دی ہو۔ بس اب میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اسے یورپ لے جاؤں گی اور جو کچھ بھی خرچ ہو وہاں اس کا علاج کراؤں گی کیونکہ دولت کی تو مجھے پرواہ نہیں۔ بس خدا اسے اچھا کر دے۔ کیونکہ بہن حق تو یہ ہے

کہ مجھ سے سوا تو انھیں اس سے محبت ہے۔اب جو میں یہاں آ گئی ہوں تو بس دیکھ لینا کہ ''وہ'' اس کے لیے بے چین ہور ہے ہوں گے۔کیا مجال جو گھر میں اسے تنہا چھوڑ کر میں ایک منٹ تو علاحدہ ہو جاؤں۔بس گھر کو سر پر اٹھا لیتے ہیں کہ دیکھو تم ہو بد احتیاط تمھارے ہو جانے سے خدانخواستہ میرے بچہ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو؟

اور بہن کیا کہوں میں تم سے اس شریر کی حرکتوں کا حال۔ماشاء اللہ جہاں صبح کی چڑیاں بولیں اور اس نے کھیلنا شروع کیا۔

بہن میں تو ہوتی ہوں اس وقت غافل۔بس خدا انھیں میرے سر پر ہزار برس رکھے وہی اٹھتے ہیں اور لیمپ کے سامنے لے کر لیٹ جاتے ہیں۔کبھی گود میں لے کر ٹہلتے رہتے ہیں۔

کہنے کو ابھی یہ پانچ مہینے کا ہے مگر ماشاء اللہ اتنا ذہین ہے کہ کتنا ہی چیخ رہا ہو، جہاں میری آواز سنی کہ بس فوراً ہی خاموش ہو جائے گا۔

یہی حال اس کی دادی اماں کا ہے۔

بہن حق تو ہے کہ وہ بھی اس پر جاں نثار کرتی ہیں۔گو اُن کی ضعیفی کا زمانہ ہے مگر رات بھر ہیں کہ اپنی گود سے علاحدہ نہیں کرتی ہیں۔غرض گھر بھر ان میاں پر قربان ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہے ایک حد سے سوا مختصر نمونہ ''ہندستانی اولاد'' کا جو تقریباً ہر گھر میں موجود ملتا ہے۔پس اس قسم کی اولاد کے اندر جو خواص و اثرات پیدا ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

1۔ مردانہ اور مجاہدانہ جذبات کی جگہ نسوانی اور بزدلی کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔جیسی یہ آج کل اسکولوں اور کالجوں کی نسل نظر آرہی ہے۔

2۔ ایجاد و اختراع کی جگہ نقل و تقلید کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

3۔ ترقی اور برتری کے عوض قناعت اور غلامی کے خیالات مضبوط ہوتے ہیں۔

4۔ ہنرمندی اور مشقت کے عوض سہارے اور معاون پر بھروسہ کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

5۔ ترکِ وطن اور کسبِ عزت کے لیے سفر کرنے سے خوف پیدا ہوتا ہے۔اور اسی لیے میدانِ جنگ جاتے وقت یورپ کی ماں خوش ہوتی ہے اور ہندستانی والدہ کے ساتھ لام پر جاتے وقت بیٹا بھی لپٹ کر روتا ہے۔

6۔ بداخلاقی وبداعمالی کا ولولہ ہر وقت پُر جوش رہتا ہے۔

7۔ وفا اور استقلال کی قوت فنا ہو جاتی ہے کیونکہ یہ قوتیں تکالیف کی برداشت سے پیدا ہوتی ہیں اور یہاں پرورش کی جاتی ہے ناز ونخرہ سے۔

اس کے بعد مرتبہ آتا ہے اولاد کے لیے منت، مراد، تعویذ، گنڈے، پیر صاحب، عرس اور خیرات وصدقات کی عجیب عجیب تفصیلات کا جس کے لیے آپ ملا رموزی صاحب کی کتاب ''بیٹا بیٹی'' ذیل کے پتے سے طلب کیجیے۔

غُصّہ

غصہ بظاہر تو ساری دنیا کے نزدیک مکروہ اور قابلِ نفرت چیز ہے، مگر فنی اور علمی نظر سے اس کے اندر جو حسن و خوبی پوشیدہ ہے اس سے انکار کرنا بھی نہایت شدید جہالت ہے۔ مثلاً ایک صاحب علم و بصیرت انسان کے لیے غصے والی کی بگڑی ہوئی صورت اور اس کا یکا یک جامۂ انسانیت سے باہر ہو جانا جس درجہ لطیف تماشہ ہے اتنا تھیٹر کا تماشہ بھی نہیں۔ غصہ کا یہ حسن کیا کم ہے کہ غصہ کرنے والا تو غصے کی آگ میں جلے اور دیکھنے والا مارے قہقہوں کے بے تاب ہو جائے۔

غصے کی پیدائش کا سبب انسان کے مزاج کا اتار چڑھاؤ ہے۔ بعض حضرات میں یہ دولت فطرت ہی سے ودیعت ہوتی ہے مگر بے سبب اسے فطرت بھی قبول نہیں کرتی مثلاً اور کچھ نہیں تو آپ فطرتاً سوکھے جلے ہوئے اور شکنجے میں کسے ہوئے بدن ہی کے واقع ہوں گے تو یہ دولت آپ کی رگ رگ سے ٹپکتی رہے گی یعنی جو شخص جتنا زیادہ دُبلا پتلا اور لاغر یا خشک مزاج ہوگا اتنا ہی زیادہ غصہ اس کی ناک کے سرے پر موجود ملے گا۔ غصہ کا سب سے قوی محرک انسان کی قوت حاسہ ہے پس جو شخص جتنا زیادہ ذی علم، ذی حسن اور عقلمند ہوگا اتنا ہی زیادہ غضبناک اور مشتعل مزاج ہوگا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پھر دنیا کے تمام مدبرین، وزرا، بادشاہ اور علمائے کرام ہی کو ہر وقت

آپے سے باہر رہنا چاہیے کہ یہی لوگ سب سے زیادہ ذی ہوش اور صاحب عقل ہوتے ہیں۔ بے شبہ انھی لوگوں کو سب سے زیادہ مشتعل مزاج رہنا چاہیے تھا مگر ایسا جو نہیں ہوتا سو اس لیے کہ ایسے لوگوں میں عقل وتمیز کے باعث غصے کے نتائج سمجھ لینے کی قوت بھی سب سے زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ان لوگوں کے غصہ کو ان کی مآل اندیش قوت ہر وقت شکست دیتی رہتی ہے۔ مثلاً جہاں کسی تعلیم یافتہ کو غصہ آیا اور معاً اس کے سامنے سی۔ آئی۔ ڈی، کوتوالی، حوالات، سپاہیوں کے گھونسے، چالان، عدالت کی پیشی پر پیشی، جرح، قید بامشقت، حبس دوام بہ عبور دریائے شور جلاوطنی اور پھانسی جب تک کہ دم نہ نکل جائے والے خطرات آجاتے ہیں اور اس کی قوت قہر وغضب ان سے مرعوب ہو کر رہ جاتی ہے بخلاف کسی تعلیم یافتہ اور ذی ہوش انسان کے کسی غنڈے کے غصے سے اللہ پاک ''عالمگیر'' کے ہر خریدار کو محفوظ رکھے اس لیے کہ غصہ کے عالم میں غنڈے کے سامنے بس گالی، گھونسہ، جوتا، لٹھ اور تلوار تو ہوتی ہے مگر کوتوال صاحب نہیں ہوتے پھر ڈر کا ہے کا؟

غصہ اصل میں ایک نہایت شریف قوت ہے جس کا دوسرا نام قوت مدافعت ہو سکتا ہے اور اس کا بقدر اعتدال ہر انسان میں ہونا انسانیت کی تکمیل ہے، مثلاً اسی قوت سے انسان جرمنی کی فوجوں کو اپنے شہر میں داخل ہونے سے روک سکتا ہے۔ اس سے وہ اپنے خاندان اور اپنی عزت کی حفاظت کر سکتا ہے وہ اس سے اپنے مذہب کو بچا سکتا ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کی حفاظت انسان کا شریف ترین وظیفۂ حیات ہے، لیکن جن لوگوں سے غصہ کی قوت کم ہو جائے سمجھو وہ بے حیائی، بے شرمی اور ذلت وخواری کی ہر حالت کو قبول کر سکتا اور جب ذلت کو قبول کر سکتا ہے تو اس کی موت بھی یقینی ہے، جیسے زنانِ بازاری یا آج کل کے اسکولوں کے فیشن ایبل لونڈے جن کے لباس کی آرائش اور نسوانی فیشن نے ان کے مزاجوں میں غصہ کے عوض نزاکت اور لکھنؤ کا ''واللہ چنانچہ پن'' پیدا کر دیا ہے اور اسی لیے وہ ہر جگہ ذلیل ہیں۔

یہ قوت سرحدی پٹھانوں ہی کے لیے خاص نہیں بلکہ یہ عربستان کے اونٹ اور ہندستان کے گدھوں میں بھی موجود ہوتی ہیں مگر اللہ تانگے کے گھوڑے کو غصہ کی حالت میں نہ لائے خصوصاً اس وقت جب وہ بیچ چوک میں غصہ فرما رہا ہو وہ جو ہم نے اوپر کہا کہ غصہ اصل میں مدافعت قوت کا نام ہے سو تانگے کا گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں سے اسی وقت غصہ کرتا ہے جب تانگے والے نے بجائے

تین کے چھ سوار یاں بٹھالی ہوں اور گھوڑے پر ہنٹر کا مینہ برسا تا جاتا ہو۔

اظہار غضب کے لیے ہمیشہ جسمی اعضا سے کام لیا جاتا ہے اور انسانی آلات غضب میں سب سے زیادہ تیز آنکھ اور ناک کے نتھنے ہیں جنھیں غصے کی حالت میں ''تیور'' کہتے ہیں، لیکن اگر کسی انسان کے کان بھی غصہ کا اظہار کر سکیں تو سمجھو کہ وہ جانور بھی ہے کیونکہ جانوروں کے اظہار غضب کے لیے کان سب سے زیادہ نمایاں آلہ ہیں۔ پھر پیشانی اور ہونٹ کام کرتے ہیں لیکن غصہ کے اظہار کے لیے جب انسان کی زبان اور ہاتھ کام کرنے لگیں تو بس اس وقت خدا ہر شریف آدمی کو اس سے محفوظ رکھے۔

غصے کے نتائج یہ ہیں:

پسینہ کا زیادہ آنا۔ ہاتھ پاؤں اور سانس کا 75 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کام کرنا، تمام کپڑوں کا نہیں تو دامن یا گریبان کا پارہ پارہ ہو جانا، پھر جس شخص پر غصہ کیا جائے اس کی پہچان یہ ہے، آنکھوں سے آنسوؤں کا جاری ہونا۔

کپڑوں کا جگہ جگہ سے پھٹ جانا۔

ناک کے نشانات سے کپڑوں پر نقش و نگار کا ابھر آنا۔

کوتوالی کی طرف جاتے ہوئے نظر آنا۔

سر سے خصوصاً اور دسرے اعضا سے عموماً خون کا جاری ہونا۔

پس ان حالات کے ساتھ جو شخص نظر آئے سمجھو کہ اس پر کیا گیا ہے۔ یہ تو تھیں غصے کی تعریفات اور علامتیں اب یہ معلوم کیجیے کہ غصہ کب اور کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ سو سب سے پہلے یہ پیدا ہوتا ہے آپ کی ذاتی کمزوری، خطا اور غلط کاری سے۔ مثلاً کوئی شخص بھرے مجمع میں آپ کی کسی خطا کا اظہار کر دے یا آپ کی کمزوری کو آپ کے منہ پر کہہ دے۔

مثلاً کوئی شخص کسی کوتوال سے کہہ دے کہ آپ جو مجرم کو رات بھر مارتے ہیں سو اس لیے نہیں کہ وہ جرم کا اقبال کر لے بلکہ اس لیے کہ آپ کو رشوت دے دے تو مان لیجیے کہ کوتوال صاحب کو آپ پر غصہ آ جائے گا۔ آپ کسی تحصیلدار سے کہہ دیں کہ آپ تحصیل وصول کرنے کے لیے کسانوں کی گاڑیوں میں کیوں سفر کرتے ہیں اور اپنے باوا کی جائیداد سے گاڑی کیوں نہیں

خریدتے تو تحصیلدار کو غصہ آجائے گا۔

آپ کسی ماسٹر یا پروفیسر سے کہہ دیں کہ آپ نے اسکول میں کوٹ پتلون پہن کر ہندستان کے قومی لباس کو فنا کرنے میں بہت زیادہ حصہ لیا ہے تو اسے غصہ آجائے گا۔

آپ کسی اسلامیہ کالج کے بی۔اے یا ایم۔اے پاس لونڈے سے کہہ دیں کہ جب تو کہیں کا افسر ہو جاتا ہے تو اپنے ماتحت ملازمین کو اپنے گھر کے گدھے سمجھتا تو اسے غصہ آجائے گا۔

آپ کسی شاعر سے بھرے مشاعرہ میں کہہ دیں کہ آپ جو غزل پڑھ رہے ہیں وہ آپ کی نہیں بلکہ ملا رموزی صاحب کی کہی ہوئی ہے تو اسے غصہ آجائے گا۔

آپ کسی سیماب اکبرآبادی اور کسی ساغر علی گڑھی سے کہیں کہ آپ کو نہ صحیح اردو لکھنا آتا نہ صحیح شعر کہنا تو ان دنوں کو غصہ آجائے گا۔

آپ کسی پروفیسر سے کہہ دیں کہ نوجوان طلبا میں نسوانی لباس اور نسوانی نزاکتیں پیدا کرنے میں آپ لوگوں نے بہت زیادہ حصہ لیا ہے تو ان سب کو غصہ آجائے گا۔

آپ کسی حاکم عدالت سے کہہ دیں کہ جو وکیل آپ کے بنگلہ پر زیادہ آتا جاتا ہے، آپ اسی کے ذریعہ رشوت وصول کرتے ہیں اور خدا کے بے گناہ بندوں کے مقدمات برباد کرتے ہیں تو اسے غصہ آجائے گا۔

آپ جس کے ملازم ہوں اس سے کہہ دیں کہ میں تجھ سے ہر طرح سے زیادہ قابل ہوں مگر ملازمت کی وجہ سے تجھے جھک کر سلام کرتا ہوں تو اسے غصہ آجائے گا۔

ان غصوں کے بعد دنیا کے بعض خطرناک غصے یہ ہیں جنھیں اجتماعی غصے کہہ سکتے ہیں۔

چنانچہ سب سے زیادہ خطرناک غصہ قومی اور ملکی غصہ کہلاتا ہے۔ یہ غصہ کبھی کسی خودغرض بادشاہ یا خودغرض حاکم سے شروع ہوتا ہے اور وزراء میں سے کسی ایک وزیر سے پھر اسے علماء، مقررین، مصنفین، اخبارات اور اشتہاروں کے ذریعہ ساری رعایا میں پھیلایا جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ قومی غصہ جرمنی کی لڑائی مشہور ہو جاتا ہے۔ یا فرض کیجیے کہ مسٹر گاندھی، موتی لال نہرو، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی اور ملا رموزی کو انگریز بھائیوں پر غصہ آجائے تو اس کا نام ''سوراج'' رکھ دیں گے۔ اس قسم کے غصوں کا نتیجہ دو قوموں کی بربادی ہوا کرتا ہے۔ پس اس قسم

کے غصوں کو یورپ سے دور رکھنے کے لیے شہر جینوا میں ایک انجمن بنائی گئی ہے جسے ہندستانی ''جمعیۃ الاقوام'' کہتے ہیں، یہ انجمن یورپ کے اجتماعی غصوں کو روک کر کام کرتی ہے، اس مجلس کے مقابل انفرادی غصوں کو روکنے کے لیے ہندستانی لوگ ذیل کے الفاظ سے کام لیتے ہیں:

بس بس جانے بھی دیجیے۔

چلیے چلیے آپ تو گھر جائیے۔

بے شبہ یہی نالائق ہے۔

چلیے دو باتیں آپ ہی سن لیجیے۔

بھئی تمھیں امام شہید کی قسم جواب بولو۔

لاحول ولا کہہ تو رہے ہیں کہ وہ آپ سے معافی مانگ لے گا۔ اماں ہو کیسے یہ تمام لوگ تماشہ دیکھ رہے ہیں اور جو تم نے اسے جوتا پھینک کر مار دیا تھا تو؟ چلیے بس برابر ہوئے۔

اماں سنو تو اچھا اِدھر تو آؤ۔

استغفر اللہ اگر آپ ہی چپ ہو جائیں گے تو کیا قیامت آجائے گی؟

انفرادی غصوں میں سب سے زیادہ مہلک، تباہ کن اور ملعون دولت مند یا حاکم کا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے غصہ کے لیے کوئی ضابطہ اور قانون نہیں، جب چاہا اور جس کے کہنے سے چاہا غصہ شروع کر دیا۔ پھر جب تک چاہا کسی سے خوش رہے اور جب چاہا غصہ فرما بیٹھے۔ ان لوگوں کے غصہ میں گالی، تو تڑاک، مار پیٹ اور ابے جا تجھ سے ڈرتا کون ہے وغیرہ الفاظ صرف نہیں کہے جاتے بلکہ جس پر ان لوگوں کو غصہ آجاتا ہے اسے نہایت خاموشی سے موقوف، برطرف، علاحدہ یا قید کر دیتے ہیں۔ اس قسم کا غصہ اس عہد علم و بیداری میں بھی کیا جاتا ہے مثلاً ایک افسر اپنے ایک ماتحت سے گیارہ برس کی ملازمت کے بعد اگر غصہ ہو جائے یا اس پر غصہ کرے تو اس کے لیے لکھ دے گا کہ یہ ملازم کاہل، غیر حاضر، گستاخ اور چور ہے، اس لیے موقوف کیا جاتا ہے مگر کوئی نہ پوچھے گا کہ اور یہ اوپر کے گیارہ برس میں اس کے اندر یہ خرابیاں کیوں نہیں تھیں؟ جب کہ ماتحت کے خواص اور اعمال کے اندازہ کے لیے چھ مہینے کی مدت کافی ہے اور اسی قسم کی موقوفی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ انتظام انصاف نہیں بلکہ افسر کا غصہ ہے۔

سب سے آخری یا خطرناک غصہ بیوی کا ہوتا ہے، خواہ یہ بیوی کسی رئیس کی ہو یا فقیر کی۔ اس کا غصہ نہایت میٹھا، نازک، خفیہ بلکہ انواع واقسام کا ہوتا ہے جسے عقلمند خاوند کے سوا کوتوال صاحب بھی نہیں سمجھ سکتے۔ بیوی کے غصہ کے اسباب نہایت غیر قانونی وعقل وخرد سے کوسوں دور اور اکثر نہایت غیر منصفانہ اور غیر شریفانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی دن آپ بیوی کی اجازت کے بغیر خواجہ حسن نظامی مدظلہٗ کے ہاں قوالی میں چلے جائیں اور وہاں سے بارہ تیرہ بجے رات کو گھر واپس آئیں تو وہ یہ غصہ فرما بیٹھے گی۔ پھر اشارتاً کنایتاً یا الفاظ کے ذریعے اپنی بیوی کے کان تک اتنی بات پہنچا دیں کہ مجھے تیرا کالا رنگ پسند نہیں، تیری آنکھ ذرا ترچھی ہے، تو گندی اور کاہل ہے، تیرے ہاتھ کا سالن لذیذ نہیں ہوتا۔ تیرے اندر تہذیب وسلیقہ ہے تو مگر کم کم، تو صبح بہت دیر میں سو کر کیوں اٹھتی ہے، تو کلب اور ٹھنڈی سڑک پر جانا ترک کردے، تو اپنے ماں باپ کے ہاں مہینوں کیوں رہا کرتی ہے وغیرہ۔ غرض اس بیوی کے غصہ کا نہ کوئی وقت ہے نہ کوئی ضابطہ نہ کوئی مقصد ہے نہ قرینہ وہ جب چاہے گی غصہ کرے گی اور جس طرح چاہے گی غصہ کرے گی بس اس پر جہالت کا غالب آنا شرط ہے پھر اس کے غصہ میں دیر نہیں۔ پھر جب بیوی کو غصہ آجائے تو اسے نہ شہر کا کوئی موٹے سے موٹا کوتوال ڈراسکتا ہے نہ سفید سفید سے داڑھی والا قاضی۔ پھر ستم پر ستم یہ کہ بیوی کا غصہ کبھی سیدھا نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ ترچھا یا الٹا ہوا کرتا ہے مثلاً اسے غصہ تو آئے گا شوہر پر مگر اس کا اظہار کرے گی گھر کے برتنوں پر یا وہ گالی تو دے گی شوہر کو مخاطب کرے گی اپنے گود کے بچہ کو۔ وہ اگر آپ کی وفات کے لیے دعا کرے گی تو یوں کہے گی "اللہ مجھے موت کیوں نہیں دیتا" اسی طرح وہ اپنے بچہ کو تنہائی میں تو پیار کرے گی، مگر شوہر کے سامنے اسے مار کر کہے گی "تو مر کیوں نہیں جاتا" وغیرہ۔

غرض دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں آپ کو اپنی اپنی بیویوں کے غصے سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔

◆◆◆

نمائش

اس نمائش سے وہ نمائش مقصود نہیں جس میں نہایت حسین اور خوبصورت بازاروں کے لیے شہر اور قصبات کے دکانداروں کی ''سرکاری شامت'' آجاتی ہے اور نمائش کے منتظم لوگ کسی دکاندار سے یوں مخاطب نظر آتے ہیں کہ:

ابے تیرے باوا کو دکان لے جانا پڑے گا نمائش میں۔
اور یہ جو حاکم آیا ہے کلکٹری سے تو اس کی تعمیل تو کرے گا یا ہم۔
تو کہہ تو رہے ہیں گنوار تجھ سے کہ ہاں صرفہ بھی ملے گا صرفہ۔
اچھا تو بس سمجھ گئے ہم کہ تو بغیر جوتے کے نہ جائے گا۔
اور بھئی مرا کیوں جاتا ہے بس ایک ہفتہ کی بات ہے۔
اور دیکھ وہ ملا رموزی صاحب تک کی دکان موجود ہے وہاں، پھر کیا انھیں صرفہ نہ ملا ہوگا۔
ابے الو وہاں صاحب ملاحظہ فرمائیں گے تیری دکان کو اور انعام دیں گے۔
پھر وہی بک رہا ہے۔
لاحول ولا۔
اماں ہیڈ صاحب ایک طمانچہ تو مارو اس مردود کو منہ پر۔

اب یہ کہہ رہے ہیں کہ اب وہ ملا رموزی صاحب کا زمانہ گیا اب ہمارا انتظام ہے وہاں۔

بس تو ٹھیک دو بجے دفتر سے گاڑیاں آجائیں گی۔

بھیا سامان لا دو دینا، دام دلانے کا ذمہ ہمارا۔

اور نہ اس نمائش سے وہ علی گڑھ کی نمائش مقصود ہے جس میں شرکت کے لیے تو بھی چل میں بھی چل۔ یہ بھی چل وہ بھی چل۔ طلبا بھی حسینوں کا لباس پہن کر چل، چپراسی بھی چل اور تو اور وہ پروفیسر لوگ بھی ٹینس کا بلا ہاتھ میں لیے کھیل سے سیدھے اس نمائش میں چل ہو جاتے ہیں۔ پھر خریداری کا یہ عالم کہ یہ بھی خرید وہ بھی خرید، اسے بھی خریدا سے بھی خرید اور بس چلے تو ایک چھوڑ دس ملا رموزیوں تک کو خرید لیں۔

اور نہ وہ نمائش مقصود ہے جس میں زائرین و شائقین اور مسافروں کو جلد پہنچانے کے لیے تانگے والے اور لاری والے مارے گھوڑ دوڑ رفتار مقابلے کے سڑک پر گزرنا محال کر دیتے ہیں اور بعض ملا رموزی کے تانگے والے اس گھوڑ دوڑ میں ایک ہاتھ سے گھوڑے کو رستی گھما کر مارتے بھی جاتے ہیں اور چلا چلا کر یوں گاتے بھی جاتے ہیں: ''اے مولا بلا لے مدینے مجھے'' بلکہ اس نمائش سے مقصد ہے اس نمائش کے چند نمونے پیش کرنا جو انسان کی دانستہ حرکات سے پیدا ہوتی ہے، جسے ''بناوٹ دکھاوا'' اور صنعت بھی کہتے ہیں۔

لہٰذا واضح ہو کہ نمائش کا دوسرا نام ''نام و نمود'' اور مولویوں کی ٹولی میں اس کا نام ''ریاکاری'' بھی ہے، جس کے اختیار کر لینے سے مسلمان قیامت کے دن قبر سے اندھا بھی اٹھے گا اور پل صراط پر سے گر کر دوزخ میں جل کر خاک ہو جائے گا۔ اب یہ معلوم کیجیے کہ گو انسان میں یہ جذبہ قدرتی اور طبعی ہوتا ہے مگر اس کا اظہار اکثر مواقع پر اپنے آس پاس کے حالات اور مؤثرات کے تابع ہے مثلاً آپ اپنے بنگلے سے نہایت ''فدوی'' نہایت کمترین، نہایت خاکسار، نہایت ہیچمدان، نہایت دعا گو، نہایت فرماں بردار، نہایت تابعدار، نہایت نمک خوار، نہایت خادم، نہایت احقر، نہایت نیاز مند، نہایت نیاز کیش، نہایت نیاز آگیں اور نہایت بندۂ بے دام ہو کر نکلے اور جہاں آپ سے کسی نہ کہا کہ کہیے پروفیسر صاحب کہاں؟ کہ بس آپ نے ٹوپی اتار کر سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور جھک کر دیکھا کہ جوتے پر زیادہ گرد تو نہیں چڑھ گئی تو سمجھ لیجیے کہ یہ ''پروفیسرانہ نمائش'' شروع

ہوگئی۔ اب آپ کالج اور یونیورسٹی سے جتنا قریب ہوتے جائیں گے، آپ کی یہ سمجھ موٹی ہوتی جائے گی کہ میں پروفیسر ہوں۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ اب دن بھر کرسی پر بیٹھ کر پڑھانے کے عوض گھوم گھام کر پڑھاتے رہیں گے اور چہرہ کو جتنا ہو سکے گا کھسیانہ بنانے کی کوشش کریں گے اور اگر مونچھیں بچ گئی ہیں تو انھیں بل دیجیے گا اور ترچھی نظر سے طلبا کو دیکھتے جایئے گا وہ دیکھ بھی رہے ہیں یا نہیں۔ یا پھر آپ ملا رموزی کے ساتھ چلا چلا کر مذاق فرماتے ہوئے جا رہے ہیں اور ہاتھ میں ہاتھ دیے جھومتے ہوئے جا رہے ہیں کہ جہاں سامنے سے طلبا نظر آتے ہوئے نظر آئے کہ آپ نے ملا رموزی سے کہا کہ:

ذرا بھئی خاموش رہنا کالج کے لونڈے آ رہے ہیں۔ پھر جب یہ طلبا برابر سے گزرے اور سلام کیا تو آپ نے نہایت موٹا چہرہ بنا کر ہاتھ کے اشارے سے جواب دے دیا تو یہ بھی نمائش سر را ہے گاہے کہی جائے گی اور اصولِ تعلیم میں یہ تمام نمائشیں حرام ہیں کیونکہ عقلمند لڑکے ان حرکتوں سے بجائے رعب قبول کرنے کے تاؤ کھاتے ہیں یا پھر مذاق اڑاتے ہیں۔

اگر آپ ہاکی کھیل رہے ہیں اور تماشائیوں کا مجمع بھی خاصا ہے، اس لیے اب اگر سر کے بالوں کو اس طرح حرکت دیں گے کہ وہ آپ کی آنکھوں پر آ جائیں اور پھر آپ انھیں نہایت نفاست سے سر ہلا کر گھڑی بندھے ہوئے ہاتھ سے پھر سیدھا کریں یا پسینہ صاف کرنے کے عذر سے ایک رنگین ریشمی رومال نصف پاجامے کی جیب میں اس طرح رکھیں کہ اس کا ایک حصہ تماشائیوں کو نظر آتا رہے یا اپنے ریشمی بنیائن کو آپ بار بار کھینچ کر اپنے نصف پاجامے کے اوپر لائیں یا بالوں کے بکھر جانے کے حیلے سے آپ اپنی سفید پیشانی پر ایک شوخ رنگ کا ریشمی رومال باندھ لیں، یا بغیر سورج کے سامنے آئے آپ ہاکی میں انگریزی سائبان والی ٹوپی اوڑھ کر ہاکی کھیلیں تو آپ کی یہ تمام حرکات ''ہاکیانہ نمائش'' مانی جائیں گی اور یہ سب اس لیے ناجائز ہیں کہ انھیں دیکھ کر تماشائی آپ کا ''لونڈا پن'' اور ''بے حیائی'' قرار دیتے ہیں اور یہ تو نہایت بھونڈی نمائش ہے کہ آپ ہر جلسے میں سب کے بعد تشریف لائیں تا کہ جلسہ کے زیادہ حاضرین آپ کی تعظیم کے لیے بھی کھڑے ہوں اور تالیاں بھی بجائیں اور یہ تو حد سے سوا بھونڈی نمائش ہے کہ آپ غزل پڑھنے وطن سے چل کر مشاعرہ میں آئیں اور عین وقت پر کہیں کہ آج تمام دن میرے

سر میں درد رہا اس لیے پڑھنے سے مجبور ہوں یا یہ کہ غزل نہایت محنت اور غور سے کہہ کر لائے ہوں اور مشاعرہ والوں سے کہیں کہ غزل ابھی ناتمام ہے اور اصلاح طلب، یا تمام مشاعرہ والوں کو چھوڑ کر ایک سے کہیں کہ حضرت ملا صاحب یہ شعر ملاحظہ ہو یا کہ کھانس کھانس کر مجمع کو چور نظروں سے دیکھتے جائیں یا درمیان روزہ رکھے پینے کے لیے پانی طلب فرمائیں یا اپنے شاگردوں کی طرف اس مقصد سے غور کے ساتھ دیکھیں کہ داد کے لیے تم زیادہ چلاؤ تو دوسرے بھی داد دیں۔ اور یہ تو ذلیل ترین نمائش ہے کہ مرد ہو کر اسکول جائیں تو اس نزاکت سے گویا منی جان الٰہ آبادی ملا رموزی کی شادی میں گانے اور ناچنے جارہی ہیں یعنی پاجامہ پر ریشم کی قمیص اس طرح پہن کر کہ اوپر کا بٹن کھلا ہوا ہو ماسٹر صاحب اور دوسرے لڑکے دیکھیں کہ قمیص کے اندر کتنا قیمتی ہے کہ جواب نہیں۔ یا یہ سوچیں کہ آپ کا گلا کتنا سفید اور نازک ہے کہ کہ اُفوہ۔ یا آپ گرمی کے عذر سے اپنے ماسٹر صاحب کے سامنے ٹوپی اتار کر بار بار سر کے بال سنبھالتے جائیں اور دوسرے لڑکوں کی طرف دیکھتے جائیں۔

اور یہ نمائش کہاں کی قابلِ تعریف نمائش ہے کہ آپ روزانہ گلابی رنگ کی ساری پہن کر چشمہ لگا کر اور موٹر پر سوار ہو کر ٹھنڈی سڑک کے اسی حصے سے گزریں جدھر مرد زیادہ ہوں۔ البتہ اسے نمائش نہ کہیں گے کہ آپ اسی انداز کے ساتھ چاوڑی بازار دہلی کے کسی مقام پر بیٹھی ہوئی ملا رموزی صاحب کے اشعار گنگنا رہی ہوں۔ ہاں یہ نمائش ضرور ہے کہ آپ نہایت نفیس کپڑے پہنے کمپنی باغ میں ٹہل رہی ہوں اور بار بار مردوں کی طرف دیکھتی جاتی ہوں۔ یہ بھی نمائش ہے کہ آپ غلام ہندستانی ہو کر جب اپنے بنگلے پر آرام کرسی سے سر لگائے پائیز اخبار پڑھ رہے ہوں اور آپ کا کوئی ماتحت آپ کی خوشامد کے لیے حاضر ہو تو آپ اپنے قحط زدہ چہرہ کو زیادہ رعب والا بنائیں یا پیشانی پر بل ڈالیں اور اس بدنصیب قومی ماتحت سے نہایت خشک گفتگو فرما کر یہ کہیں کہ اچھا معاف فرمایئے اب میں تو ذرا غسل کے لیے اندر جاتا ہوں، پھر آیئے گا مجھے آپ کا خیال ہے یہ بھی نمائش ہے کہ آپ چندے پر گزارہ کرنے والے لیڈر ہو کر ملا رموزی کے خط کا جواب خود نہ لکھیں بلکہ کسی دوسرے دوست سے لکھوا کر آخر میں اپنے دستخط کر دیں تا کہ ملا رموزی سمجھے کہ اُفوہ کتنے مصروف لیڈر صاحب ہیں کہ خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ یہ بھی نمائش ہے اور نہایت بھونڈی

نمائش ہے کہ شام کے وقت آپ اپنے باغ میں یا صحن میں دس بارہ کرسیوں کے بیچ میں ایک آرام کرسی پر لیٹ کر بڑے نخرے سے حقہ پیتے جائیں اور جو ملنے والے آئیں انھیں کھڑی کرسی پر جگہ دیں اور پھر بھی خود کو لکھا پڑھا مشرقی آدمی سمجھیں۔

نیچری قسم کی نمائش یہ ہے کہ آپ ہندستانی کارخانے کے بنے ہوئے ہو کر بھی انگریز بھائیوں کا سوٹ پہن کر ریلوے اسٹیشن پر جائیں اور ٹکٹ صرف انٹر کلاس ہی کا ہو مگر پلیٹ فارم پر دیسی مسافروں سے ایک طرف سیٹی بجا بجا کر یوں سگریٹ پیتے ہوئے ٹہلتے رہیں گویا آپ کی ولدیت لارڈ کرزن ہے۔ پھر یہ بھی نمائش ہے کہ انٹر کلاس میں آپ سوٹ پہنے ہوئے لیٹ کر ''اخبار ٹائمس'' خواہ مخواہ پڑھتے جائیں مگر پاس بیٹھے ہوئے ہندستانی ملا رموزیوں سے یہ دریافت نہ کریں کہ:

السلام علیکم ملا صاحب۔

کہیے مزاج تو اچھا ہے۔

آج کہاں تشریف لے جارہے ہیں آپ؟

اگر ضرورت ہو تو میں اپنا بستر پیش کروں؟

لیجیے یہ ناشتہ حاضر ہے۔

اچھا تو یہ سگریٹ تو ملاحظہ فرمایئے۔

جناب کا وطن۔

تو پھر علی گڑھ سے کب واپس ہوں گے آپ؟

یہ بھی نمائش ہے کہ آپ اپنے وطن میں تو ہوں فقط رام پرشاد اور ریل میں بیٹھے ہوئے مسافر کے دریافت کرنے پر آپ کہیں کہ میں دہلی جارہا ہوں، لکھنؤ میں میرے چچا جان بہت بڑے رئیس اور تعلقہ دار ہیں، دہلی میں بھی ہماری کوٹھیاں ہیں۔

جی ہاں! ملا رموزی صاحب میرے خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں۔ میں 1923 میں لندن میں تھا تو یہ ہوا تھا اور 1924 میں جب میں امریکہ گیا تو وہ ہوا۔

جی الحمدللہ! میں ملازم تو کسی کا نہیں، کچھ تجارتی کاروبار کا سلسلہ ہے اور یورپ میں بھی

میری ایجنسیاں ہیں۔ والد صاحب قبلہ آج کل بھی ولایت گئے ہوئے ہیں۔ مجھے ذرا طاعون کی شکایت ہوگئی ہے، اس لیے بغرضِ علاج دہلی جارہا ہوں۔

بس سیسل ہوٹل میں ٹھہروں گا کیونکہ میری کوٹھی نئی دہلی سے یہی ذرا آگے ہے۔ بس آپ سیسل ہوٹل کمرہ نمبر 6 میں آر۔ پی۔ ڈبلیو کہہ کر دریافت فرمایئے گا، میں وہیں مل جاؤں گا۔ یہ بھی نیچری نمائش ہے کہ آپ ہندستانی ہوکر بھی اپنے بڑے مولوی صاحب قسم کے لوگوں سے مصافحہ کرتے وقت ان کے ہاتھ کو اس زور سے جھٹکا دیں کہ مولوی صاحب دور تک آپ کو بڑبڑاتے ہوئے دیکھتے رہیں اور آخر میں آپ یہ بھی کہتے جائیں کہ ––– ''تھینک یو ویری مچ''

یہ بھی نمائش ہے کہ آپ ملا رموزی کے متعدد خطوط کے جواب میں ایک نفیس سے لفافہ کے اندر نہایت باریک قلم سے ڈیڑھ سطر میں لکھ دیں کہ جی ہاں یہ ہوا اور وہ ہوا اور ملا صاحب معاف کیجیے گا میں آج کل بے حد مصروف ہوں۔

یہ اتنی نمائشیں حاضر ہیں جن میں سے بعض اس درجہ نازک اور مہین ہیں کہ انھیں خواصِ انسانی کے ماہر، نفسیات سے واقف حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن اب ان سے بھی سوا نازک اور ناقابلِ فہم نمائش ملاحظہ ہو جو ایک ہی وقت میں ہزاروں نمائشوں کا مجموعہ بن جاتی ہے اور یہ نمائش ہے ہندستان کی عورت ذات، مگر اس سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ وہ کتاب ''عورت ذات'' ہے جو ملا رموزی صاحب نے بہ قیمت تین روپیہ فی جلد حال ہی میں لکھی ہے اور ملا رموزی صاحب بھوپال کے پتے سے مل سکتی ہے۔ تو یہ ہندستان کی عورت ذات گویا فطری طور پر علی گڑھ کی نمائش سے اونچی نمائش ہے مگر اس کی نمائشوں کا فوراً سمجھ لینا یا اس کے ذی ہوش شوہر کا کام ہے یا پھر ملا رموزی صاحب کا کام۔ مثلاً اس سے زیادہ عورت کی مہین نمائش کیا ہوگی کہ یہ خود کو جتنا بیگانہ نمائش بنائے سمجھ لیجیے کہ اُتنی ہی زنانے کی نمائش میں مصروف ہے۔ پھر جب یہ عورت کے بعد بیوی ہوجائے تو اس کی نمائش کے مواقع نہایت خاص ہوتے ہیں۔ پہلا موقع یہ کہ اس کے ہاں آپ کی بیوی صاحبہ مہمان ہوجائیں، دوسرا موقع یہ کہ ملا رموزی صاحب کی تقریب شادی میں جائے۔ بس جہاں اس کے گھر میں کوئی عورت مہمان ہوکر آئی اور اب اس کی رگ رگ سے نمائش کا اظہار شروع ہوا۔ چنانچہ اب وہ جو حرکت کرے گی نمائش لیے ہوئے۔ پھر اگر یہ ذرا صاحب

اولاد اور ذرا دولت مند بھی ہے تب تو اس کی نمائشوں کا عالم ہی نرالا ہوگا۔ جہاں آپ اس کے ہاں گئیں اور اس نے اپنے گھر خاص کر اپنے یا اپنے شوہر کے کمرہ کی آرائش عین اس وقت شروع کی جب آپ اس سے مخاطب ہو کر بات کرنا چاہتی ہیں (مرد ناظرین اس وقت معاف فرمادیں) بس یہ آپ سے بات کرتے کرتے یکا یک بیچ میں سے یہ کہہ کر اٹھ جائے گی کہ:

بہن ذرا ٹھہرنا میں ابھی آتی ہوں ذرا اُن کے لیے گرم پانی کر دوں کیونکہ وہ دفتر سے آتے ہی گرم پانی سے غسل کرتے ہیں۔

بہن ذرا ٹھہرنا میں آتی ہوں ذرا ان کے لیے چائے تیار کر دوں کیونکہ وہ دفتر سے آتے ہی چائے مانگتے ہیں۔

بہن ذرا ٹھہرنا میں اُن کے لیے ٹینس کے کپڑے نکال رکھوں کیونکہ وہ ٹھیک چار بجے ٹینس کھیلنے جاتے ہیں۔

بہن ذرا ٹھہرنا میں آتی ہوں ذرا دیکھ لوں کہ نوکر نے ان کے جوتوں پر پالش کیا کہ نہیں کیونکہ وہ صبح مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ میں دفتر سے آؤں تو میرے کالے پمپ پر پالش ہو جائے۔

بہن ذرا ٹھہرنا میں آتی ہوں اُن کے شکار کے کپڑے نکال دوں کیونکہ آج شام کو وہ شکار کو جا رہے ہیں۔

شوہر سے متعلق اتنی نمائشوں کے بعد وہ اب اولاد کو شوہر کے ساتھ ملا کر یوں نمائش کرے گی کہ بہن کیا کہوں میں تم سے کہ وہ اس تمھاری جمیلہ سے کتنی محبت کرتے ہیں؟ بس جہاں اس کے رونے کی آواز سنی انھوں نے اور وہ میرے اوپر غصہ ہوئے اور ان کا ہر وقت یہی کہنا ہے کہ دیکھو جی تم یوں تو جو تمھارا جی چاہے وہ کرو مگر کبھی میری جمیلہ بیٹی کو کوئی تکلیف نہ ہو اور یہ تو دیکھیے انھوں نے اس شریر کے لیے کتنے کھلونے جمع کیے ہیں۔ اونہہ یہ گاڑی وہ دلّی سے لائے تھے اس کے لیے اور یہ دیکھنا بہن یہ کتنی خوبصورت گڑیاں اس کے لیے لائے ہیں وہ مگر یہ ہے کہ اس کو ہاتھ تک نہیں لگاتی۔ بس یہ گاڑی لیے پھرتی ہے دن بھر اِدھر سے اُدھر۔ یہی حال اس کی دادی امّاں کا ہے کہ وہ کسی وقت بھی اسے اپنی گود سے علاحدہ نہیں کرتی ہیں بس بہن گھر بھر کا کھلونا ہیں یہ آپ کی جمیلہ بیگم۔

ہاں بہن میری بھی یہی دعا ہے کہ بس خدا انھیں نیک کرے کیونکہ اپنے باپ کی بڑی ہی لاڈلی بیٹی ہیں۔ یہ اولاد کی اس نمائش کے بعد پھر یہ اپنی نمائش میں شوہر کو یوں ملا لیتی ہیں کہ:

اور یہ دیکھیے یہ میرے لیے بھی وہ دہلی کا جوتا لائے تھے حالانکہ میرے پاس ایک چھوڑ تین جوتے نئے موجود ہیں، جنھیں میں نے ایک وقت بھی نہیں پہنا ہے مگر ان کا یہ کہنا ہے کہ بہن کے چاہے تم کسی چیز کو استعمال کرو یا نہ کرو مگر مجھے جو چیز بازار میں پسند آئے گی اسے میں تمھارے لیے ضرور لاؤں گا اور میں کہتی ہوں کہ جب مجھے ایک چیز کا شروع ہی سے شوق نہیں تو پھر کیوں آپ پیسہ برباد کرتے ہیں مگر انھیں مجھ سے اب کیا کہوں، بہن تم سے کس قدر محبت ہے۔ بس اُن کا تو یہ کہنا ہے کہ تمھارے پاس ہر چیز موجود رہے او کسی وقت تمھیں کسی چیز کی تکلیف نہ ہو۔ یہی حال ان کا کھانے کے معاملہ میں ہے تو یہ کیا مجال بہن جو بغیر میرے وہ لقمہ تو اٹھالیں۔ جب تک میں ان کے ساتھ دسترخوان پر نہ بیٹھوں گی وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے اور بیوی خدا بچائے ایک یہ ہمارے پڑوس میں ملا رموزی صاحب اور ان کی بیوی بھی ہیں کہ میں کیا کہوں، بہن تم سے ان کا حال؟ بس اللہ پاک کی قسم کہ ایک سرے سے ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہے۔ اے بہن کہنے کی بات نہیں بس قصہ اصل یہ ہے کہ ملا صاحب ہیں اس بے چاری سے ناراض۔

کیوں کیسے؟

بس ناراض اس پر ہیں کہ وہ غریب بے لکھی پڑھی ہے اور صورت کی بھی ذرا بھدی ہے تو اب بیوی خدا کے بنائے ہوئے سبھی ہیں ایسا بھی نخرہ نہ کرنا چاہیے مردوں کو، کیونکہ صورت میں دیکھو تو ایسی میں کہاں کی پری ہوں مگر خدا کا شکر ہے تمھارے بھائی تو اب میں کیا کہوں تم کچھ دن رہ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ مجھ پر کس طرح فدا ہیں اور کہنے کو ملا صاحب ملا صاحب مشہور ہیں مگر بیوی توبہ۔ ایسے بھی کیا ملا صاحب کہ اللہ کی بے گناہ بندی کی زندگی برباد کر رہے ہیں اور کہیے گا نہیں کسی سے میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ ان دونوں میں بات چیت بھی بند ہے۔ بس نام کو ملا صاحب گھر میں آتے ہیں۔ وہ ان کی ملازمہ ہی انھیں کھانا دے دیتی ہے۔ بس کھانا کھایا اور جو ملا صاحب گھر سے نکلے تو پھر ٹھیک دو بجے رات کو آتے ہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملا رموزی صاحب نے حسین بیوی کی تلاش میں سنا ہے کہ اشتہاروں میں بھی چھاپ دیا تھا، مگر کوئی حسین بیٹی

دیتا تو میاں کو کس بات پر۔ تنخواہ دیکھو تو میاں کی کچھ بھی نہیں اور اوپر سے خرچ اخراجات وہ کہ الاماں۔ وہ دیکھو نا بہن کہ خالومیاں نے اپنی بچی کو جو آج تک بٹھا رکھا ہے تو ان کا بھی یہی خیال ہے کہ دوں گا تو کسی ایسے ہی کو جو کھاتا پیتا ہو اور گھر سے خوشحال ہو۔ اگرچہ لڑکی کی عمر اب کوئی پچیس سال کے لگ بھگ ہے مگر خالومیاں کی یہی ضد ہے کہ جیسا میں چاہتا ہوں ویسا لڑکا جب تک نہ ملے گا میں کبھی لڑکی کو نہ دوں گا۔ حالانکہ وہ گھر ہی میں چچا کا لڑکا بی۔اے پاس بیٹھا ہے مگر کیا کہ بس تنخواہ کمبخت کی پچاس ہے۔

ارے بہن تو اب یہ کون کہے خالومیاں سے کہ لڑکی کی عمر تباہ ہو رہی ہے کیونکہ اب تو ہر خاندان میں لڑکیوں کا یہی حال ہے کہ بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں مگر نہیں دی جاتی ہیں۔ بس بہن خدا شرم رکھے ہمارے تو والد نے ان کے ہاں کا پہلا پرچہ دیکھ کر ہماری والدہ سے کہہ دیا تھا کہ بس بسم اللہ کرو اب لڑکی کا نصیب۔

اس قسم کی ''بالمشافہ نمائش'' کے بعد عورت ذات کی دوسری نمائش کا موقعہ ملا رموزی صاحب کی شادی کی تقریب ہے۔ بس جہاں یہ شادی کے گھر میں داخل ہوئی کہ اب وہ اولاد سے لے کر اپنی ایک ایک چیز کی نمائش کی فکر میں مبتلا ہو جائے گی۔ وہ جس طرف عورتوں کا مجمع زیادہ پائے گی اُدھر جائے گی، پھر اپنے لباس اور زیور کو پہلے خود دیکھے گی اور پھر قسم قسم کی ترکیبوں سے محفل کی عورتوں کو اپنی چیزوں کے دکھانے کے لیے متوجہ کرے گی۔ چلے گی تو باجے والے زیور کو زور سے بجا کر اور بیٹھے گی تو اسی ترکیب سے اور جو اس پر بھی کسی نے توجہ نہ کی تو خواہ مخواہ بے حیا بن کر نئی عورتوں سے گفتگو شروع کرے گی اور تھوڑی دیر بعد انھیں باتوں باتوں میں اپنے زیور، اس کی جھوٹی قیمت اور اس کے قسم اول ہونے کی تعریف خود ہی شروع کر دے گی اور یہ بھی نہیں تو عورتوں کے سامنے بیٹھ کر کسی زیور کو خود ہی الجھائے گی اور خود سلجھانے بیٹھ جائے گی اور اسی بہانے سے کسی عورت کو بلا کر کہے گی کہ بہن ذرا میری یہ بالیاں سلجھا دینا میں تو تنگ آ گئی ان بالیوں سے۔ کہتی تھی کہ دیکھو اتنی قیمتی بالیاں نہ لانا میں انھیں نہ پہنوں گی مگر وہ کہاں مانتے ہیں میرا کہنا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی تین ایسی ہی بالیاں توڑ چکی ہوں۔ خیر اب گھر تو جاؤں ان کم بختوں کو بھی نہ آگ لگا دوں تو میرا نام...غرض مطلب ان تمام باتوں سے یہ ہوتا ہے کہ یہ بالیاں سلجھانے والی

اجنبی عورت ان بیوی کے زیور کی قیمت اور ان کے شوہر کی ناز برداری اور محبت کی قائل ہو جائے۔

یہ ہیں چند نمونے انسانی نمائش کے۔اب آپ فیصلہ فرمالیجیے کہ ان میں سے کتنی نمائشیں ترک کرنے کے قابل ہیں تاکہ دنیا میں عقلمند لوگ آپ کا مذاق نہ اڑا سکیں۔فقط۔

◆◆◆

خوشامد

یہ ایک ملکہ ہوتا ہے جو انسانی قویٰ کے اضمحلال اور شدید ترین ضرورت سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کسی انسان کی قوتِ ادراک، ہمت اور خودداری جب مضمحل یا مردہ ہو جاتی ہے تو وہ خوشامد اختیار کرتا ہے۔ اربابِ علم واصحابِ مجد وشرف نے اس ملکہ کو ملعون کہا ہے اور یہ ایک شرمناک اور ارذل فعل ہے اور اس کا اختیار کرنے والا بھی ذلیل ہے۔ اس قوت کا پہلا اثر انسان کے اندر بے غیرتی، بے شرمی، مکر وفریب، جھوٹ اور حرص پیدا کرتا ہے۔ اس کی عملی صورتیں یہ ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کی اعتدال سے زیادہ تعریف کرے۔ اس کی کمزوریوں پر جان بوجھ کر بھی کبھی کچھ نہ کہے بلکہ ان کمزوریوں کی بھی تعریف کرے۔ اس کی حیثیت کو ہمیشہ اصلیت سے زیادہ خوبصورت رنگ میں دکھائے اور خود کو اس کے مقابل ہمیشہ کمترین، مسکین، حقیر، فقیر، نیازمند، دعا گو، بے نوا، ناتواں اور فدوی ثابت کرے۔ اور اگر ہو تو خود کو چھوٹے چھوٹے سینگ والا گدھا بھی باور کرادے۔ اس طریقے کو اختیار کرنے والے وزراء بھی ہوتے ہیں اور علما بھی، ایڈیٹر بھی، لیڈر بھی، حکماء بھی، فلاسفہ بھی، خدام اور چپراسی بھی۔ محلِ وقوع یا محلِ عمل صرف موقع اور ضرورت کا تابع ہے یعنی جہاں جس کو ضرورت لاحق ہو۔

البتہ خوشامد اور تحسین واعتراف حقیقت میں بہت نازک سا فرق ہے جو لفظاً تو خوشامد سے

مشابہ ہوتا ہے مگر اصولاً نہایت جائز اور ضروری عمل ہے۔ مثلاً کسی شاعر کے ایسے شعر پر بے حد و بے اندازہ تعریف کرنا جو قابلِ احترام جذبات کا محرک ہو خوشامد نہیں بلکہ تحسین اور اعتراف کمال ہے۔ اسی طرح کسی بے مثل کام کی تعریف کرنا خوشامد نہیں بلکہ حوصلہ افزائی اور قدر دانی ہے لیکن اس کے لیے بھی ذہنی صلاحیت اور قابلیت درکار ہے۔ چنانچہ ہوتا ہے کہ کسی محفل میں ایک شخص کے اظہارِ کمال پر وہی شخص غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے جو اس محفل میں سب سے زیادہ صاحب درک وبصیرت ہوتا ہے اور وہی اس کمال کی تعریف سب سے سوا کرتا ہے یہاں تک کہ بے خرد اور بے حس ارکانِ محفل اس کی حد سے بڑھی ہوئی تعریف کو مبالغہ یا خوشامد کہتے ہیں حالانکہ ایسی تعریف خوشامد نہیں ہوتی بلکہ اعتراف کمال بقدرِ صلاحیت ہے جو ہر شخص کو حاصل ہے۔

ہندستان میں جہالت، بے ہنری اور غلامی کی وجہ سے مزاجوں میں خوشامد کی قوت غیر معمولی اور زیادہ ہے۔ اس ذلیل جذبے میں ایک اثر عشرت پسند سلاطینِ ہند کے درباروں کا بھی ہے جہاں کبھی عرفی، فیضی اور دوسرے شعرائے فارسی نے قصائد کے ذریعہ واقعی خوشامد کی بنیادوں کو استوار کیا تھا۔

عہدِ حاضر میں مغربی اثر و تربیت نے اس جذبہ کو ایک دوسری صورت سے باقی رکھا اور وہ حکمراں طبقہ کی اقتدار پسندی، جبر اور قوت کا مظاہرہ ہے۔ ان اثرات نے ہندستانی ذہنیتوں میں حکمراں طبقہ کا خوف پیدا کیا اور اس سے خوشامد، جھوٹ، مکر و فریب وغیرہ کی ارذل قوتوں نے پرورش پائی ورنہ یہ خوشامد نہیں تو کیا ہے اور یہ خوشامد پسندی نہیں تو کیا ہے کہ دفتر کا ایک ایسا ملازم جو دن بھر دفتری کام میں اپنے دماغ کے خونی قطرات ضائع کرتا ہے مگر ترقی نہیں پاتا اس دفتری ملازم کے مقابل جو افسر کے گھر پر صبح وشام حاضری دیتا ہے اور ذرا ترچھا ہو کر افسر کو روزانہ سلام کرتا رہتا ہے۔

خوشامد کی چند عملی صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ انسان دن بھر دفتر میں مستعدی سے کام کرے اور شام کو گھر جانے سے پہلے افسر کے بنگلہ پر جا کر بیٹھ جائے یا کھڑا ہو جائے یا ٹہلتا رہے یا کرسی پر بیٹھ کر افسر کے انتظار میں اونگھتا رہے یا جمائیاں لیتا رہے یا انگڑائیاں لیتا رہے یا کھانستا رہے یا گنگناتا رہے یا ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ایک ٹانگ کو ہلاتا رہے یا افسر کے بنگلہ کی

تصویریں دیکھتا رہے یا اس کے باغ کے درختوں پر نظر ڈالتا رہے اور اس کا افسر جب کلب سے واپس نہ آئے تو اس کے خادم سے یہ کہہ کر واپس چلا جائے کہ چراغ دین سلام کو حاضر ہوا تھا، انشاء اللہ کل پھر واپس ہوگا۔ یا پھر افسر کے خانساماں سے باتیں کرتا رہے، اسے پان کھلاتا رہے، اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہے۔ یا افسر کے بچوں کو مصنوعی محبت کے ساتھ گود میں لیے پھرے، انھیں پیار کرے اور باغ میں ٹہلاتا رہے تاکہ افسر دیکھ کر یقین کرلے کہ اسے میری اولاد سے اپنی اولاد سے زیادہ محبت ہے۔ یا افسر کے پاس بیٹھ جائے اور بغیر افسر کی توجہ کے یہ خود بخود اس کے ہر فقرے کی تائید کرے اور کہے کہ بیشک حضور ایسا ہی ہے یا پھر افسر کے سامنے نہایت مؤدب صورت بنا کر بیٹھ جائے کہ خوشامد کی یہ بھی ایک صورت ہے کیونکہ اس سے افسر کے علی گڑھی غرور میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایک خوشامد افیونی کی طرف سے ہوتی ہے جو وہ کسی ایسے چائے فروش کی کرتا ہے جو اسے کبھی کبھی مفت اور اکثر قرض پلاتا رہتا ہے۔ افیونی صبح سے ہوٹل پر پہنچ جاتا ہے اور ہوٹل کے مالک کو دیکھتے ہی عرض کرتا ہے:

میاں آج تو آپ بہت دیر میں اٹھے سو کر۔

ہاں صاحب تو وہ دن رات تو آپ یہاں سے جنبش نہیں کرتے۔ بڑا مشکل کام ہے صاحب دکانداری۔

وہ تو آپ ہی کی ہمت ہے جو گیارہ سال سے آپ اس ہوٹل کو یوں چلا رہے ہیں کہ دوسری دکان اس کے سامنے جمنے ہی نہیں پاتی اور میاں ہے بھی یہ کہ جو چائے آپ کے یہاں ملتی ہے میں نے تو ایک ہوٹل میں نہ پائی دیسی۔

ہاں ہاں تو یہ کون کہتا ہے کہ اللہ میاں کا فضل نہیں ہے مگر وہ ترکیب بھی تو چاہیے ہر کام کے اندر۔

اچھا تو ننھے میاں اسکول گئے ہیں۔

بہت اچھا کیا صاحب آپ نے انھیں پڑھانے بٹھا دیا۔ یہ دیکھیے نا کہ آخر ہم رہ گئے نا جاہل اور جو آج کو کچھ کر لیتے حاصل تو ان حالتوں کے ساتھ کیوں مارے پھرتے اِدھر اُدھر۔

اے صاحب کیا کہیں وہ تو قسمت ہی میں نہ تھا ورنہ آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے والد صاحب نے اللہ انھیں جنت دے، ہماری پڑھائی کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔

چنانچہ ایک دفعہ کا قصہ..طویل قصے کے بعد۔

ماشاءاللہ یہ نقشے تو آپ نے بڑے ہی موزوں لگائے ہیں۔

کیا فرمایا؟

یہ بیچ والا نقشہ؟

اچھا مکہ شریف کا ہے۔

سبحان اللہ کیا جگہ ہے۔

خدا ہر مسلمان کو اس کی زیارت نصیب کرے۔

مگر صاحب بنانے والے کی بھی تعریف ہے کہ اس نے بھی کیا کاریگری دکھائی ہے کہ عین مین وہی نقشہ کھینچ دیا ہے اور صاحب حق یہ ہے کہ آپ نے بھی خوب ہی جڑوایا ہے۔

بھلا کیا دام دیے ہوں گے اس کے۔

ماشاءاللہ تو پھر وہ کہا ہے نا کہ جتنا گڑ ڈالیے اُتنا ہی میٹھا ہوتا ہے۔

اور صاحب یہ جگہ ہی ایسی ہے کہ اگر اس پر جان تک نثار کر دی جائے تو کم ہے۔

اور پھر آپ کا اسے ایسی جگہ لٹکانا کہ جو آتا ہے پہلے اسی پر نظر پڑتی ہے اس کی صلِ علی۔

اگر چائے دم ہو چکی ہو تو ایک پیالی عنایت فرما دیجیے کیونکہ اب مجھے ذرا جانا ہے، بھائی سعداللہ خاں کے پاس۔ جی ہاں ڈھائی آنے ہیں کل کے میرے ذمہ۔

دوں گا انشاءاللہ جلدی۔

واہ کیا بنی ہے کہ سبحان اللہ۔

بس یہی بات ہے آپ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چائے میں۔

ایک خوشامد اخباری ہوتی ہے مگر یہ اس قدر بھونڈی خوشامد ہوتی ہے کہ جو آسانی سے پہچان لی جاتی ہے البتہ کبھی کبھی یہ خوشامد بہت بلیغ اور پیچیدہ ہوتی مگر اربابِ علم وفضل اسے بھی بڑی آسانی سے پہچان لیتے ہیں اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی شخص کے محاسن اور اس کی خدمات کو

واقعہ کے طور پر لکھ کر یوں چھوڑ دیا کہ خود اپنی طرف سے کچھ اضافہ نہ کیا تاکہ عوام سمجھیں کہ محض اظہارِ واقعہ ہے خوشامد نہیں حالانکہ یہ خوشامد ہی ہوتی ہے مثلاً کبھی کبھی ریاست حیدر آباد کی تعریف یوں کی گویا ہندو لوگ اس اسلامی حکومت کے خلاف جو کچھ لکھ رہے ہیں یہ اصل میں اس کی تردید ہے حالانکہ خوشامد اسی وقت مکمل ہو گئی جب حیدر آباد کی تعریف محض کی اور اس کی کمزوریوں پر کبھی ایک حرف بھی نہ لکھا۔ ہز ایکسلنسی وائسرائے کو حضور وائسرائے بہادر لکھنا خوف ہے خوشامد نہیں۔ حضرت ابوالکلام آزاد کو ''امام الہند'' لکھنا خوشامد ملا ہوا واقعہ ہے۔ دیسی والیانِ ریاست کی کسی قسم کی تعریف بھی خوشامد ہی خوشامد ہے واقعہ نہیں۔ مالک اخبار کے ایڈیٹر کا یہ لکھنا کہ جب آپ نے ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی تو جلسہ میں سناٹا چھا گیا، ملازمانی خوشامد ہے۔ رئیسوں کی غزل پر یہ عنوان لکھنا کہ کلام الملوک ملک الکلام خوشامد ہے اور بہت بھونڈی خوشامد ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اخبار کے دفتر میں ایڈیٹر کے پاس بڑے تپاک سے جا کر بیٹھ جائے اور کہے کہ پرسوں کے دن آپ کا جو مضمون شائع ہوا اس کا تو جواب ہی نہیں تو سمجھو کہ تازہ پرچہ مفت پڑھنے کے لیے خوشامد کر رہا ہے۔ اگر ملا رموزی صاحب اپنے مضمون میں کسی شخص کی تعریف کریں تو سمجھو کہ خوشامد ہے مضمون نگاری نہیں الا ماشاء اللہ۔ اگر کوئی اہلِ قلم اپنی کسی کتاب کا انتساب کسی بڑے آدمی کے نام ساتھ کرے تو جان لو کہ تصنیفی خوشامد ہے انتساب نہیں۔ اگر اکبر آباد کا ایک شاعر یا دونوں شاعر کسی کے لیے قصیدہ لکھیں تو مان لو کہ شاعری نہیں خوشامد ہے۔ اگر کوئی شخص کسی خان بہادر کو ٹی۔ پارٹی دے تو کہیں گے کہ خوشامد ہو رہی ہے چائے نوشی نہیں۔ اگر کوئی ملازم اپنے افسر کو اسٹیشن پر رخصت کرنے جائے یا اس کی آمد پر اسے ہار پہنائے تو مان لیجیے کہ خوشامد کر رہا ہے اظہارِ خلوص نہیں۔ اگر کوئی ماتحت اپنے افسر کو ڈالی بھیجے تو سمجھو کہ خوشامد بھی ہے اور رشوت بھی۔ اگر کوئی وکیل اپنے مؤکل کو اپنے برابر کی کرسی پر جگہ دے دے، اپنے لکھنؤ کے خمیرے والا حقہ بھی پلائے، پان کھلائے اور یہ کہے کہ آ جائے گا محنتانہ ایسی کون سی جلدی ہے تو سمجھو کہ خوشامد ہے وکالت نہیں۔ اگر کوئی وکیل عدالت کے حاکم کے گھر جا کر اس سے کہے کہ پرسوں حضور نے جو فیصلہ لکھا ہے حقیقت میں وہ حضور کی قانونی واقفیت کا لاجواب ثبوت ہے تو سمجھو کہ خوشامد ہے وکالت نہیں۔ کسی کے ولیمہ کا پلاؤ چاہے پسند ہو یا نہ ہو مگر دولہا کے باپ سے یہ کہنا کہ ماشاء اللہ کیا کھانا پکایا ہے

خوشامد ہے داد نہیں۔ کسی دولہا کا اپنے خسر کے گھر جانا، اپنی ساس کا علاج کرانا اور اپنے سالوں کی تعلیمی نگرانی کرنا بیویانہ خوشامد ہے، خلوص ومحبت اور حقوق شناسی نہیں۔ کسی دکاندار کا اپنے گاہک کے لیے فوراً کرسی پیش کرنا، پان کھلانا، شربت پلانا، بجلی کا پنکھا چلانا اور ہنس ہنس کر مال دکھانا خوشامد ہے تجارت نہیں۔ کسی گداگر کا روٹی پاکر صاحب خانہ کے حق میں دعائے خیر کرنا خوشامد ہے شکریہ نہیں۔ مالدار ماں باپ کے سامنے ادب سے خاموش بیٹھ جانا خوشامد ہے سعادت مندی اور فرماں برداری نہیں۔

ایک خوشامد صوفیانہ ہوتی ہے جو پیر صاحب کی طرف سے کی جاتی ہے اور یہ ایسے پیر صاحب ہوتے ہیں جو رنگین لباس کے سوا علم دین اور علم تصوف سے کچھ بھی خبردار نہیں ہوتے محض مریدوں پر رعب قائم رکھنے کے لیے خوشامد کرتے ہیں مگر بڑی نازک خوشامد کرتے ہیں۔ مثلاً پیر صاحب کا مالدار اور افسر قسم کے مریدوں کے گھر خود بخود جانا خوشامد ہے، پیری نہیں۔ عین قوالی کی حالت میں کسی مالدار مرید کو اپنے برابر بٹھانا خوشامد ہے نوازش نہیں۔ مالدار مریدوں کے بچوں کے لیے بڑی مستعدی سے تعویذ لکھنا اور یہ کہنا کہ مجھے تمھارے بچوں سے بڑی محبت ہے، خوشامد ہے محبت نہیں۔ عرس کے موقع پر غریب مریدوں سے سیدھی طرح بات نہ کرنا اور مالدار مریدوں کو اذن کے لفافے بھیجنا خوشامد ہے دعوت نہیں۔ قوال کا پیر صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دینا خوشامد ہے عقیدت نہیں۔

سب سے آخری یا ضروری خوشامد شوہر اور بیوی کی خوشامد ہے جس میں ملا رموزی صاحب سے لے کر شاہ امان اللہ خاں تک مبتلا ہیں یہ خوشامد نہایت بلیغ اور غیر محسوس بھی ہوتی ہے اور بھونڈی بھی پھر یہ کہ کہیں شوہر زیادہ خوشامد کرتا ہے اور کہیں بیوی اور اس لیے اس خوشامد میں کوئی اصولی تسلسل نہیں ہوتا البتہ یہ ضرور ہے کہ شوہر کی طرف سے خوشامد زیادہ کی جاتی ہے اور بیوی کی طرف سے کم۔ کیونکہ بیوی کی طرف سے نان کوآپریشن، بائیکاٹ، ترک موالات، عدم تعاون، مقاومت مجہول، نان وائلنس، واک آؤٹ، قطع تعلق کے جس قدر مظاہرے کیے جاتے ہیں شوہر کی طرف سے ناممکن ہیں اور دشوار بھی اور یہ محض مہر کی رقم ادا کرنے کے ڈر سے، اس لیے اگر شوہر ولیمہ کے دن ہی اپنے روپیہ سے بیوی کے لیے تیار زیور خرید لائے تو سمجھو کہ خوشامد شروع ہو چکی

ہے یا شروع ہو رہی ہے یا شروع ہوگئی یا شروع ہوئی تو ہوئی ہوئی یا ہوگی تو پھر ہوتی ہی رہے گی اور جب ہوتی ہی رہے گی تو ہوتی ہی چلی جائے گی یا پھر شوہر صاحب بغیر طلب کے اگر بازار سے بیوی کے لیے پمپ جوتا، لونڈر، موزے اور صابن خرید لائیں تو سمجھو کہ خوشامد ہے اور محبت بھی اور جب شوہر صاحب ہنس ہنس کر باتیں کریں اور ہنسی کا موقع نہ ہو تو سمجھو کہ خوشامد ہے یا شوہر صاحب کہیں کہ اچھا تو لاؤ ننھے میاں کو مجھے دے دو اور تم تھوڑی دیر آرام کرلو تو سمجھو کہ وہی ہو رہی ہے یا شوہر صاحب کہیں کہ مجھے سوائے تمھارے ہاتھ کے کسی دوسرے کی پکائی ہوئی ترکاری میں مزہ ہی نہیں آتا تو سمجھو کہ ہو رہی ہے، یا شوہر صاحب کہیں کہ میں خود پان لگالوں گا تم نہ اٹھو تو سمجھ لو کہ ہو رہی ہے یا شوہر صاحب کہیں کہ تم مجھ سے ذرا ذرا سی بات پر نہ بگڑا کرو میں تو تم سے مذاق کرتا ہوں تو سمجھو کہ ہو رہی ہے۔ یا شوہر صاحب کہیں کہ تم اپنی والدہ کے ہاں جاتی تو ہو مگر جب تک واپس نہیں آتی ہو تو یہ گھر مجھے ویرانہ نظر آتا ہے تو سمجھو کہ ہو رہی ہے اور بہت بھونڈی ہو رہی ہے یا شوہر صاحب کہیں کہ اچھا ہے دو چار دن کے لیے اماں بی کے ہاں چلی جاؤ وہ تمھیں یاد کرتی ہیں تو سمجھو کہ ہو رہی ہے مگر مجبوراً ہو رہی ہے۔ یا شوہر صاحب کہیں کہ خدا کے لیے تم میرے سامنے تو کسی کام میں مصروف نہ ہوا کرو آخر یہ ملازمہ کس دن کے لیے رکھی ہے تو سمجھو کہ ہو رہی ہے۔ یا شوہر صاحب کہیں کہ جب تک تم میرے ساتھ کھانا نہیں کھاتی ہو تو مجھے کھانے کا مزہ ہی نہیں آتا تو سمجھو کہ ہو رہی ہے۔ یا شوہر صاحب کہیں کہ اُفوہ آج میرے سر میں کس شدت کا درد ہے مگر تم نہ دباؤ تمھارے ہاتھوں میں درد نہ ہو جائے تو سمجھو کہ ہو رہی ہے۔ یا شوہر صاحب اپنے خسر، سالے، سالی اور ساس کی تعریف اپنی بیوی کے سامنے کریں تو مان لو کہ اب تو بالکل وہی ہو رہی ہے۔ یا شوہر صاحب روزانہ سسرال کی خیریت دریافت کر کے بیوی کو اطلاع دیتے رہیں تو سمجھو کہ وہی ہو رہی ہے مگر بڑی بیوقوفی کے ساتھ ہو رہی ہے اور جب شوہر صاحب اس حد تک پہنچ جائیں تو سمجھو کہ ان کی ہر حرکت بس وہی ہے یعنی خوشامد۔

شوہر کے بعد بیوی کی خوشامد نہایت منطقی اور عالمانہ ہوتی ہے جو آسان نہیں۔ مثلاً بیوی کا لباس کے اعتبار سے ہر وقت نیلم پری بنا رہنا، سمجھو کہ خوشامد کا نہایت فاضلانہ آغاز ہے اور جب بیوی کہے کہ آج تو ننھا تمھیں یاد کرتے کرتے سو گیا تو سمجھو کہ وہی ہو رہی ہے اور ننھے کے ذریعہ

ہو رہی ہے اور جب وہ شوہر کے کپڑے، جوتا، چشمہ، پان کا ڈبہ اور سگریٹ کیس اپنے ہاتھوں سے صاف کر کے رکھ دیں تو سمجھو کہ وہی ہو رہی ہے اور اگر بیوی کہے کہ جب تک آپ نہ آئیں گے میں کھانا نہیں کھاؤں گی تو سمجھ لو کہ ہو رہی ہے اور جو بیوی کہے کہ مجھے نہ زیور کی پرواہ ہے نہ کپڑے کی بس خدا آپ کو میرے سر پر سلامت رکھے تو سمجھو کہ بڑے زور کی ہو رہی ہے اور جو بیوی کہے کہ تم سے زیادہ عزیز مجھے دنیا کی کوئی چیز نہیں تو سمجھو کہ ہو رہی ہے اور اب تو خاتمہ کی ہو رہی ہے۔

یہ ہیں وہ چند نمونے خوشامد کے جن سے محفوظ رہنا ہی عین خودداری اور اصل غیرت و حمیت ہے۔ ہماری رائے میں ان تمام خوشامدوں میں بیوی کی خوشامد نہایت تلخ اور بے فائدہ ہے، ممکن ہے ہماری اس رائے سے تمام دنیا کی ننھے میاں کی والدائیں ناراض ہو جائیں اور خود ہمارے ذاتی ننھے میاں کی تازہ والدہ تو اس پر یقیناً ناراض ہوں گی مگر ہم اظہار رائے میں کبھی ان کی مروّت کو دخل نہ دیں گے کیونکہ بیوی کی خوشامد ہی انسان کی تباہی کا باعث ہے۔ دوسری تمام خوشامدوں سے فائدہ ہی فائدہ ہے صرف ذرا انسان دنیا جہاں میں ذلیل ہو جاتا ہے، لیکن آج کل کی تعلیم و تربیت نے اسے جائز کر دیا ہے اس لیے وہی آج بے وقوف مانے جاتے ہیں جو خوشامد نہیں کرتے اور اسی لیے وہ تمام لوگ آج ملازمانی خوشامد میں مصروف ہیں جو کل تک ترک موالات کے ذریعہ گورنمنٹ تک سے اپنی خوشامد کرانا چاہتے تھے۔

ماسٹروں کی خوشامد یہ ہے کہ وہ ٹیوشن والے لڑکے کے باپ سے کہیں کہ ماشاءاللہ بچہ بڑا ذہین ہے اور گورنمنٹ کی خوشامد یہ ہے کہ وہ خطاب بھی دے اور جاگیر بھی اور ملا رموزی صاحب سے مصافحہ بھی کرے۔ فقط۔

سقّے کے بچّے

امت اسلامیہ کے لیے انقلاب کابل جو افسردگی، حزن وملال اور درد وکرب کا سامان نظر آتا ہے، بہت کم انقلابات اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً جو روایتی ''ہینگ فروش'' افغانی ساری دنیا میں کل تک صرف اس قابل سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہندستان کے کسی رام پرشاد کو سوطرح سے آمادہ کر کے اسے اپنا کپڑا قرض دے دے اس طرح کہ وہ جب چاہے اس کپڑے کی قیمت ادا کر دے، مگر جیسے ہی مہینے کی پہلی تاریخ ہوئی یہ افغانی صاحب مع ایک عدد بانس کے لٹھ کے اس رام پرشاد کے چبوترے پر یوں بیٹھے نظر آرہے ہیں کہ جب تک رام پرشاد ان کا ایک ایک پیسہ ادا نہ کر دے وہ جانے کا نام نہیں لیتے مگر یہی افغانی تھا کہ غازی امان اللہ ایسے بیدار مغز اور ذی حوصلہ بادشاہ اور شاہ نادر شاہ بہادر ایسے ذی ہوش سردار سپہ کے حوصلہ آزما جہاد حریت کے زیر اثر دولت خدا داد افغانستان کی آزادی کا وہ جھنڈا بن گیا جو کابل سے لے کر روس تک اور ہندستان سے لے کر انگلستان تک یوں لہرانے لگا کہ بالآخر اسے نظر ہوگئی یعنی حضرت گرامی غازی امان اللہ خاں سابق تاجدار افغانستان کو یورپ کا دورہ کرنا ضروری سا ہوگیا۔ بس ان کا یورپ تشریف لے جانا تھا کہ افغانستان کے چند بڑے ہی عقلمند، بڑے ہی ذی ہوش، بڑے ہی قابل، بڑے ہی اللہ والے، بڑے ہی نمازی، بڑے ہی پرہیزگار، بڑے ہی قوی ہمدرد اور بڑے ہی منتظم مسلمان بھائیوں نے

طے فرمایا کہ اب غازی امان اللہ کو تو اس قابل بنادو کہ وہ عمر بھر ملک اٹلی میں حرکت بھی نہ کرسکیں اور خود افغانستان کے بادشاہ سلام بن جاؤ کہ اس طرح جہاں تخت افغانستان پر قبضہ آسانی سے ہو جائے گا وہاں ستر اسی ہزار افغانی مسلمانوں کے خاک وخوں میں مل جانے سے ساری دنیا میں افغانی قوم کی جہالت مسلّم ومشہور تو ہو جائے گی۔ اس خیال کی تکمیل کے لیے ان افغانی یاروں نے ایک ایسے شخص کو سرداری کے لیے آگے دھر لیا جو تاریخ افغانستان میں عمر بھر کے لیے، مسمّٰی ''بچۂ سقا'' ہو کر رہ گیا۔ یہ غریب اس وقت افغانستان کے خدا جانے کس غار میں بیٹھے مسواک فرما رہے تھے کہ یاروں نے انھیں اُکسایا اور وہ بڑھ کر اتنے لمبے ہو گئے کہ کچھ دن کے لیے ''شاہ افغان'' بن گئے۔ وہ تو خیر ہوئی یا حضرت خلیفۂ قادیان کی بددعا کہیے ورنہ انھوں نے اپنے آپ کو ''خلیفۃ المسلمین'' بنانے میں کوئی کسر ہی نہ اٹھا رکھی تھی اور جب یہ ہو جاتا تو بس پھر آج کو ساری اسلامی دنیا کی جبینِ عقیدت ہوتی اور ''حضرت سقۃ المسلمین'' کے گنواروں کی طرح قدم ہوتے۔ بارے اب کہ حضرت ''سقے کے بچے'' پھانسی پاکر ہمیشہ کے لیے ''راجعون ہو چکے ہیں'' جائز نہیں کہ ان کے مصائب پر کچھ زیادہ کہا جائے۔

البتہ یہ صحیح ہے کہ انقلاب کابل کے سلسلے میں بچہ سقہ کے نام اور کام نے ہندستانی مسلمانوں کے دماغوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے ادب کو بھی بہت زیادہ متاثر کیا اور ممدوح غفران مکان کی زندگی ہی میں لفظ ''بچہ سقا'' زبانِ اردو میں عجیب عجیب معنی میں استعمال ہونے لگا تھا اور غلط نہیں کہ اس نام سے اکثر ذلت، رسوائی اور تضحیک کا مفہوم پیدا کیا جاتا تھے۔ پس ظاہر ہے کہ اس مفہوم کے لیے لفظ بچہ سقا سے مراد وہ آدمی نہ تھا جو افغانی بغاوت کا سرغنہ تھا اور جو مسہری پر سونے سے ڈرتا تھا اور جس نے کارتوسوں کی پیٹیاں کمر سے باندھ کر فوٹو کھنچوایا تھا تاکہ ہندستان کے ''للّھتو ے'' تصویر ہی دیکھ کر کانپ جائیں بلکہ ''بچہ سقا'' سے مراد ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو مرحوم ''بچہ سقا'' کے خواص واعمال کا آئینہ دار ہو۔ پھر ضروری نہیں کہ ان اعمال واخلاق کا نمونہ صرف حدودِ افغانستان ہی میں رہے اور ہندستان میں نظر نہ آئے۔ پس جس شخص کے اندر بہ استثنائے ریش مبارک ذیل کی چیزیں یا علامتیں نظر آئیں سمجھ لیجیے کہ آپ ہی ہیں ''بچہ سقا''۔ مثلاً:

1۔ وہ طبعاً حریص ہو۔

2۔ خدائے عرش وفرش کے احکام کو اس لیے توڑ سکتا ہو کہ کابل کا تخت مل جائے گا۔

3۔ یا اس لیے کہ روپیہ، نوٹ، گنی، اشرفی اور اکنی ہاتھ آئے گی۔

4۔ رولز رائس موٹر کار پر چڑھے پھریں گے۔

5۔ رہنے کو بہترین اور شاندار ''غریب خانہ'' ہاتھ آئے گا۔

6۔ قدسی فریب عورتوں سے جبراً نکاح کریں گے۔

7۔ بے شمار یا چند آدمی جھک کر سلام کریں گے۔

8۔ ٹکٹ اسٹامپ، روپیہ نوٹ اور دفتر کے کاغذات پر تصویر ہوگی۔ عام اس سے کہ تصویر کتنی ہی قحط زدہ بھی ہو۔

9۔ قوم کا شیرازہ کل کا بکھرتا آج بکھر جائے مگر ہم ہر حال میں بڑے آدمی ہو کر رہیں گے۔

10۔ بلا سے شاہ نادر شاہ غازی کے ہاتھوں گت بنے مگر چند دن تو بادشاہ سلامت کہلائیں گے اور اخبار ''زمیندار'' میں نام چھپے گا۔

11۔ اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کو جاگیریں دیں گے جس سے وہ جاگیردار اور زمین دار کہلائیں گے۔ خواہ یہ جاگیریں ان کے قبضہ میں رہیں یا نہ رہیں۔

یہ وہ اعتبارات اور خصائص ہیں جو کابل کے ''مرحوم ومغفور'' یا اس کے ساتھیوں میں پائے گئے تھے۔ پس اس حساب سے اگر آپ دنیا میں ذرا غور سے دیکھیں تو ایسے بے شمار ''سقے بچے'' نظر آئیں گے جو خواہشات کے لحاظ سے زندہ قسم کے سقے کے بچے ہیں، اب یہ ہم کیوں کہیں کہ ہندستان میں ایسے لوگ ہیں یا نہیں۔ البتہ اگر آپ دیکھیں کہ ایک نوجوان سا ٹکٹ کلکٹر جب انگریزوں کے پاجامے کو اپنی ہندستانی ٹانگوں میں الجھا کر پلیٹ فارم پر کھڑا ہوتا ہے تو اس حرکت کو تو اس کی ''نوکری'' کہہ سکتے ہیں۔ پھر اگر وہ گداگروں محتاج اور بے دست وپا مسافروں کو بے ٹکٹ ریل میں جانے نہیں دیتا تو یہاں تک بھی اس کی ''نوکری'' کہلائے گی۔ لیکن جب یہ ٹکٹ کلکٹر زنانے ڈبے کے پاس بار بار دیکھا جائے، یہ عورتوں کو ٹکٹ دیکھنے کے بہانے مارے یا دھمکائے یا وہ غریب اور محتاج مسافروں کے سر یا کمر پر اپنے انگریزی جوتے سے ''دو چار ڈیم فول'' بھی مارتا نظر آئے تو اب اسے ریلوے کا ''بچۂ سقا'' کہنا عین قانون وانصاف ہے۔

فرض کیجیے کے ایک دس بارہ گز قد کا مسلمان ہے۔ رنگ کے لحاظ سے وہ بالکل ہی خضاب لاجواب ہے، مگر اس کے چہرے پر کوئی ڈھائی فٹ کی دودھ سے زیادہ سفید داڑھی ہے، وہ لال رنگ کی وردی بھی پہنے ہے، اس کے ہاتھ میں موٹے موٹے دانوں کی ایک تسبیح بھی ہے جس کی حرکت کے ساتھ اس کی داڑھی کے ایک حصہ کو بھی حرکت ہوتی ہے، اس کے پاس ہی ایک بانس کا پورا نصف حصہ لٹھ بنا ہوا رکھا ہے اور وہ ایک ایسے دروازہ کے پاس اسٹول پر بیٹھا ہوا ہے جس پر چلمن پڑی ہوئی ہے۔ اب اگر آپ اس دروازے کے اندر ہاتھ میں اسٹامپ یا درخواست لے کر داخل ہوئے چلے جارہے ہیں تو یہ ''خضری صورت کا'' علیہ السلام اگر آپ کے بالکل منہ پر ہاتھ رکھ کر اس طرح روک دے جیسے آپ کسی کے طمانچے سے ٹکرا گئے ہوں یا کسی کا طمانچہ آپ کے منہ پر پڑا ہو، یا ناچ رہا ہے یا گانے والا ہے یا اس وقت نہیں مل سکتا بلکہ دسمبر کے مہینے میں ملے گا بس جایئے جایئے زور سے بات نہ کیجیے پھر یکا یک یہ کہے کہ لیجیے یہ اسٹول اس پر تشریف رکھیے تو خیر میں کس لائق ہوں، آپ کی مہربانی ہے۔ اچھا تو ٹھہریے میں اطلاع کرتا ہوں اور ابھی ابھی آپ کو صاحب سے ملائے دیتا ہوں تو سمجھ لیجیے کہ اب یہ چپراسی نہیں رہا بلکہ ''دفتری بچہ سقا'' ہو گیا۔ یوں کہنے کو یہ رشوت خور مشہور نہ ہو۔

فرض کیجیے کہ آپ کے بزرگ افغانستان میں مذہب اسلام کے ہمالہ سے اونچے علمبردار تھے لیکن اتفاق سے وہ ہندستان آگئے کہ یہاں آتے ہی انھیں فوج میں عہدہ مل گیا۔ پھر ان کے اولاد پیدا ہوئی اور اسی اولاد میں سے ایک صاحب نے پہلے اپنی مذہبی، قومی، ملی اور آبائی خصوصیات کو ترک کیا، پھر یورپ والوں کا پاجامہ پہنا، پھر پائنیر اخبار خریدنا شروع کیا تو یہاں تک تو ہوئی نوکری کی ضرورت لیکن پھر اس نے نماز ترک کی، پھر روزہ پھر داڑھی کے ساتھ ہی مونچھیں اکھاڑ کر پھینک دیں، پھر زمین پر بیٹھ کر روٹی کھانا چھوڑ دیا تو یہ سب کچھ تو ہوا تمدن کا اثر، لیکن جب اس نے ٹھیک گیارہ بجے رات کو پیانو باجا بجا کر ایک گلاس شراب کا نوش کیا تو آپ بتایئے کہ وہ اب بھی بچہ سقا ہوا یا نہیں؟

فرض کیجیے کہ ایک شخص اپنے خاندانی شرف ووقار میں اپنے آپ کو قندھار و کابل سے زیادہ اونچا اور بڑا تصور کرتا ہو، اس کی اولاد اسکول میں تعلیم پا چکی ہو، اتنی کہ فیشن کی ہر بات سے واقف

ہو، اتنی کہ شام کے وقت ٹینس اور کرکٹ کا ناغہ نہ کرتی ہو، اتنی کہ پاؤڈر سے چہرے کو ہر وقت چمکاتی رہتی ہو، اتنی کہ ریشم واطلس کے سوا کسی دوسرے کپڑے کی قمیض پہننا حرام سمجھتی ہو، اتنی کہ ہارمونیم بانسری، فونوگراف اور پیانو کی قسم کے تمام باجے بجا سکتی ہو، اتنی کہ سر کے مشرقی بالوں کو کاٹ کر پیچھے رکھا چکی ہو، اتنی کہ شلوار اور غرارے کی قسم کی ''پاجامی'' کے عوض ساری سے کام لیتی ہو (یہاں پاجامی عورت کے پاجامے کو کہنا صحیح ہے) اتنی کہ لیڈیز کلب کی ممبر ہو چکی ہو، اتنی کہ والد صاحب کی اجازت سے گھر کے نوجوان ملازم کے ساتھ رات میں سنیما کا تماشا دیکھنے جاتی ہو یا جا سکتی ہو اور والد صاحب اس اطمینان میں مبتلا ہوں کہ یہ نوجوان ملازم میرا وفادار ملازم اور پروردہ ہے تو ان حالات کے حساب سے اس قسم کا والد تو ہوا بچہ سقا اور اس کی اولاد ہوئی ''بچی سقی'' (بچی سقی مرکب اضافی نہیں بلکہ ملا رموزی کے غصہ کی بگڑی ہوئی تانیث ہے)

فرض کیجیے کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں، اتنے بڑے کہ آپ کو آنریبل بھی کہہ سکتے ہیں اور حضور بھی۔ پھر فرض کیجیے کہ آپ کے دو چار سفید سفید رنگ کے لڑکے بھی ہیں اتنے سفید کہ افغانی کہیں انہیں اور اتنے سرخ کہ قندھاری کہیں جنہیں۔ وہ اب کسی اسلامیہ کالج میں پڑھتے ہیں، وہ شلوار اتار کر لکھنوی چست پاجامہ بھی پہن چکے ہیں، وہ ریشم کی نظر سوز قمیض اس طرح پہنتے ہیں کہ اندر سے ریشم کی رنگین بنیائن بھی نظر آتی ہے، وہ سر کے بالوں کو یوں سنوارتے ہیں کہ ایک ہزار دلہنوں کا سنگار اسے شرماتا ہے۔ گویا وہ نوجوان مرد نہیں بلکہ ایک ایسی دلہن ہوتے ہیں جو اسکول کی پہلی گھنٹی سن کر شرماتی ہوئی اسکول جا رہی ہو، فرق صرف یہ ہو کہ دلہن کی آنکھوں کو اس کے دوپٹے کا گھونگھٹ چھپائے رہتا ہو اور ان سفید لڑکوں کی آنکھوں کو وہ نازک سا چشمہ ہو جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں دن میں ایک لاکھ جادو جگاتی ہوں، پس ان اداؤں اور زنانہ دلفریبیوں کے ساتھ جب کوئی سفید رنگ کا لڑکا اسکول جاتا نظر آئے اور اس کا باوا اس زنانہ پن پر اس سے کچھ بھی نہ کہے اور اسکول کا ماسٹر بھی اسے دیکھ کر خوش ہو تو بتائیے کہ اس قسم کا باپ اور بیٹا کون ہوا اور اس کا ماسٹر کون؟ قاعدے کے حساب سے اس قسم کا بچہ تو ہوا ''بچہ سقا'' اور باپ اور ماسٹر ہوئے اس کے سید حسین کہ اعانت مجرمانہ میں ان دونوں نے اس لڑکے کا ساتھ دیا۔

فرض کیجیے کہ آپ ہیں ''سپاہی ذات'' اور آپ ریل کے کسی ایسے ڈبہ میں بیٹھے ہیں جس

میں آپ کے سوا کوئی دوسرا مسافر نہیں کہ یکایک کسی چھوٹے اسٹیشن سے آپ کے ڈبے میں ایک گھبرایا ہوا مسافر سوار ہونا چاہے اور آپ اسے دھکا دے کر پلیٹ فارم پر اس طرح سے گرا دیں کہ ادھر مسافر مع بستر پلیٹ فارم پر گرے اور اُدھر ریل روانہ ہو جائے تو ایسی صورت میں آپ ہوئے ''کابلی بچہ سقا کے ہندستانی رنگروٹ''۔ پھر فرض کیجیے کہ آپ نے بی۔اے پاس کیا، گھر میں کھانا ترک کر کے ہوٹل میں تناول شروع کیا، پھر آپ نے ایک اخبار جاری کیا، پھر تقریر شروع کی، پھر کھدّر کا لباس پہنا، پھر جلوس نکلوایا، پھر چندہ جمع کیا، پھر ان تمام باتوں کے بعد آپ نے انسانوں کے مختلف طبقات میں شدید نفرت وفساد کی آگ بھڑکا دی تو اس حساب سے آپ ہوئے بچہ سقا اور آپ کی حرکات ہوئیں بچہ سچا کا توپ خانہ۔

پھر فرض کیجیے کہ آپ نے نہ لکھا نہ پڑھا مگر نام رکھ لیا 'محمد فاضل' پھر آپ نے ایک ڈھیلا سا کرتا پہنا، پھر ٹخنوں تک دو گز اونچا پاجامہ، پھر موٹا سا عمامہ پھر گلے میں تسبیح پھر قطب صاحب کی لاٹ کے برابر داڑھی پھر اس جہل و بے خبری پر آپ نے بغیر کسی لائسنس اور سرٹیفکیٹ کے اپنے کو پیر صاحب ظاہر کیا، پھر ایک قبر کے قریب گھر بنایا اور اس کا نام رکھا 'خانقاہ'۔ پھر ان حالات کے ساتھ جب شریعت وطریقت سے یکسر بے خبر لوگوں نے آپ کا مرید ہونا شروع کیا تو آپ نے عورتوں کو بھی بیعت کی دعوت دی اور جب عورتیں آپ کے پیرانہ اثر میں آگئیں تو آپ ایک دن رات کے تین بجے اس مقام سے فرار ہو گئے اس طرح کہ ایک مرید آپ کی اور اپنی نئی بیوی یا جوان بیٹی کی تلاش میں ہر کوتوالی میں حلیہ لکھاتا پھرا مگر نہ آپ ملے نہ اس کی بیوی تو اس حساب سے آپ تو ہوئے ''بچہ سقا'' اور آپ کی یہ تمام ظاہری اسلامیت اصول اور مذہب اسلام کے حق میں ہو گئی ''بغاوت'' پھر آپ نے فرار کے بعد جس گاؤں یا شہر میں قیام فرمایا وہ ہو گیا آپ کا کابل اور آپ ہوئے وہاں کے سقوی ''شاہ''۔

فرض کیجیے کہ آپ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو مذہب اسلام کی جملہ روایات کا حامل تھا۔ آپ ہوش سنبھالتے ہی علوم دین اور مشرقی تعلیمات کے حصول کے پابند کر دیے گئے۔ آپ کا ماحول وطن و آزادی کا احترام کرنے والا رہا۔ آپ احکام اسلام کی بجا آوری پر اس درجہ مستعد بنا دیے گئے کہ آپ کا دماغ وطن اور مذہب کی محبت سے مالا مال ہو گیا۔ آپ نے

بزرگوں کے احکام و اقوال کی عزت کی، وطن و ابنائے وطن کی آزادی اور فراغت کے لیے ہر خدمت کو فرضِ زندگی اور وظیفۂ حیات سمجھا اور اپنے برگزیدہ فرائض کی بجا آوری سے کبھی غافل نہ رہے کہ اسی حالت میں آپ کو یورپ جانا پڑا۔ پھر آپ یورپ گئے مگر اس طرح کہ وہاں نہ آپ نے باپ دادا کا پاجامہ پہننا نہ کرتا، نہ ڈانس میں شریک ہوئے نہ کسی میخانہ میں نہ ڈربی میں گھوڑے کا ٹکٹ خریدا نہ فرانسیسی عورت سے شادی کی۔ لندن میں بھی نماز پڑھی اور پیرس میں بھی۔ نہ ''ہلال احمر'' کے نام سے چندہ جمع کیا نہ ووکنگ میں مسجد کی تعمیر کے لیے، نہ ترکوں کے خلاف خفیہ کارروائیاں کیں نہ داڑھی منڈوائی پھر ان حالات کے ساتھ جب آپ وطن واپس آئے تو اسلام کو اسلام سمجھا اور بزرگوں کو بزرگ۔ قرآن محترم کو قرآن محترم سمجھا اور علماء کو علمائے وطن اور ابنائے وطن وطن کی امن و آزادی کے لیے اتنی کوشش کی کہ جان کو خطرے میں ڈال دیا۔ اب اگر ان خطرناک حالات سے آپ موت کے منہ سے بچ گئے تو ساری دنیا کی عزتیں آپ پر نثار ہوئیں اور اس حساب سے آپ ہوئے نادر شاہ خاں تاجدار افغانستان۔

پھر فرض کیجیے کہ آپ نے اس قسم کا ایک مضمون لکھا تو آپ ہوئے ملا رموزی اور جس رسالے نے اس کو شائع کیا وہ ہوا رسالہ ''ادیب'' پشاور کہا ہے۔

◆◆◆

دفتری ملازم

کہتے ہیں کہ اگر گھوڑے کی قسمت پھوٹ جائے وہ تانگے میں لگایا جاتا ہے اور انسان کی قسمت پھوٹے تو وہ دفتر میں ملازم ہوتا ہے۔ ہندستان میں تقریباً 75 فیصدی لکھے پڑھے لوگ دفتروں میں ملازم یوں بھرے نظر آتے ہیں جیسے ریلوے کے تھرڈ کلاس ڈبوں میں ایک کے اوپر ایک مسافر بیٹھا کرتے ہیں۔

ان میں ہر قسم کی قابلیت کے بشر ہوتے ہیں مگر اسے خدا کا قہر ہی سمجھیے کہ ذوق اور احساس کے لحاظ سے سب یک رنگ، ان کے ذوقیات میں یوں تو وائسرے سے لے کر "پیسہ" اخبار لاہور اور مسلم لیگ سے لے کر جمعیۃ الاقوام جینوا تک کی مشرقی حکمت عملی کے رموز و نکات سے دلچسپی لینا داخل ہوتا ہے لیکن اس دلچسپی کے لوگ ان میں اتنے ہی ہوتے ہیں جتنا آٹے میں نمک یا نمک میں آٹا۔ البتہ دفتری طبقات میں عام مذاق کا جو رنگ غالب ہے اسے ہم "دفتریت" یا دفتری پن کہہ سکتے ہیں۔ یہ دفتری پن 99 فیصدی ہندستانیوں کی حیاتِ عامہ، حیاتِ اجتماعی اور اخلاق کو جس درجہ برباد و برہم کر رہا ہے اگر اس کے اثرات پر گاندھی بھی کبھی ایک نظر ڈال لیں تو امید کہ وہ باردولی کی ستیہ گرہ اور لاہور کی کانگریس کے اجلاس کو اس وقت تک ملتوی کر دینے کی تحریک فرمانے پر مجبور ہو جائیں گے جب تک کہ ان دفتری بھائیوں سے ان کی دفتری تاریکی کو دور کرنے کا مچلکہ

نہ لکھوالیں۔

دفتری بھائیوں کو اگر ہندستانی قرار دے دیا جائے، ان کے حقوق کو میونسپلٹی سے لے کر کانگریس کی صدارت تک سے تسلیم کرالیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے دنیا کے کسی ایک ہندستان میں بھی ان کی کوئی انجمن ہے؟ یہ وہ بدقسمت طبقہ ہے جو تعداد کے لحاظ سے تو دنیا کے تمام انگریزوں سے زیادہ ہے لیکن بے حسی اور بے خبری کے لحاظ سے وہ قابلِ ذکر بھی نہیں اور جو آج تک ان دفتری لوگوں کی ترقی اور تنخواہ کے اضافوں کے لیے کوئی آل انڈیا کانگریس نہیں سوا اس کا سبب ان کی وہ تاریک ذہنیت ہے جس کی تفصیل پر آج کا مضمون ہم ضائع کر رہے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ بحیثیت انسان کسی ایک آدمی کے ذمہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ صبح کا کھانا کھائے، ڈکار لے، جمائی لے اور انگڑائی لیتا ہوا شام کو پھر کھانا کھانے بیٹھ جائے اور بیچ کا تمام وقت ایک دفتر میں گزار دے بلکہ عقل و ہوش اور علم و تمیز کا لازمہ یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں انسان گاندھی بھی بنے اور اسی وقت چندہ بھی جمع کرے، اسی وقت وہ ذاتی مصارف کے لیے کپڑے کے بڑے بڑے کارخانے قائم کرے اور قومی چندہ ہضم کر جانے سے بھی باز نہ رہے وہ اسی وقت قوم کی خدمت کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کرے، اس میں اپنے دورے اور تقریر اور تقریروں کی تعریفیں خود بھی لکھے اور اپنے ملازموں سے بھی لکھوائے مگر نہ شرمائے اور چند روز کے بعد اس اخبار کو بند کر کے وصول کیا ہوا چندہ اپنے بیوی بچوں کو کھلا دے۔ وہ لیڈر بھی بنے اور کوئی دواخانہ بھی قائم کرے خواہ یہ انگریزی ہو یا یونانی۔ وہ خود تو کھدر کا لباس پہنے لیکن اس کے بقیہ رشتہ دار انگریزی سوٹ بوٹ پہنیں مگر نہ لیڈر ان رشتہ داروں کو ڈانٹے اور نہ یہ رشتہ دار اس کھدری لیڈر کو برا کہیں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنا کھائے اور اپنا پہنے مگر گاندھی کو ہر حال میں جھک کر سلام کرے اور ایک وقت بھی گاندھی سے یہ نہ کہے کہ آپ کا بدن اور چہرہ رعب دار نہیں اور نہ لیڈر ہونے کا اس سے اثر پڑتا، اس پر فرض ہے کہ وہ مسلمان لیڈر بھی کہلائے اور ایک نماز بھی نہ پڑھے۔ اسے افریقہ بھی جانا چاہیے اور حیدرآباد بھی کیونکہ ان دونوں مقامات کی آبادی کو جس قدر اصلاح کی ضرورت ہے ہندستان کے ایک شہر کو نہیں اسے ہندو مسلم فساد میں چانٹے بھی کھانا چاہیے اور پھر ان چانٹے مارنے والوں کو "برادرانِ وطن" بھی کہنا چاہیے۔ اسے لیڈر ہو کر

تھرڈ کلاس میں ریل کا سفر کرنا چاہیے کہ جب لوگ اس کے استقبال کو اسٹیشن پر پہنچیں تو وہ فرسٹ کلاس میں صاف بیٹھا ہوا نظر آئے، اسے ملا رموزی کے مضامین پڑھے بغیر چین بھی نہ آنا چاہیے اور ملا رموزی کے لیے کوئی زر نقد کی تھیلی بھی نہ بھیجنا چاہیے۔

غرض ایک انسان ہو کر دس انسانوں کے کام کرنا ہر ذی ہوش انسان کے لیے اُس قانون کی رو سے جائز ہے جس کی رو سے ملک ہندستان میں بغیر فوج کے انگریزوں کی حکومت قائم ہے، مگر اللہ میاں کے یہ کروڑوں دفتری بندے ان تمام ذمہ داریوں سے کچھ اس خوش اسلوبی کے ساتھ بری ہو کر رہ گئے ہیں کہ جواب نہیں۔ ان کی بلا سے فلسطین میں یہودیوں کی امداد کے نام سے مریکہ کے دوسرے یہودی بھی آکر آباد ہو جائیں یا عربوں کے چانٹے رسید کیے جائیں، مگر یہ دفتری بھائی کبھی غور نہ کریں گے کہ ترکوں کو حکومت کے زمانہ میں گورنمنٹی لارڈ بالفور نے یہودیوں کے لیے فلسطین میں وطن بنانے کی تجویز پیش کیوں نہ کی؟ کیا برطانیہ کے قبضہ سے پہلے دنیا کے سارے ہندو یہودی تھے یا قادیانی؟ فیلڈ مارشل مصطفیٰ کمال پاشا نے یونانیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر یورپ سے اسلام کے خارج کیے ہوئے جھنڈے کو پھر قسطنطنیہ پر لہرایا اور ترکی قوم کو زندگی اور ترقی کے عرش پر لا بٹھایا، مگر ہندستان میں اس کے لیے جب خبر آتی ہے تو یہ کہ وہ دہریہ ہو گیا اور ملحد ہونے میں تو دیر نہیں سوا ایسی خبریں کیوں بھیجی جاتی ہیں؟ ان دفتری بھائیوں کو اس کی بھی تلاش نہیں کہ عین اس وقت جب کہ انگریزوں کا بچہ بچہ بالشویک حکومت کا دشمن تھا تو یہ اپنے پنڈت موتی لال نہرو کو ماسکو جانے کی اجازت کیوں دی گئی اور وہ جب ماسکو اور مصطفیٰ کمال پاشا سے مل کر واپس آئے تو انھیں نظر بندی اور جامہ تلاشی سے کیوں بری کر دیا گیا؟ یا گورنمنٹ کی اس قدر رعایتوں پر انھیں ہندستان کا آزاد خیال اور آزاد عملی لیڈر کیسے مانا جائے۔ انھیں خبر نہیں کہ مسلمانوں کے امیر گھرانوں میں لڑکی کی شادی سوائے بی۔ اے پاس آدمی کے غریب آدمی کے ساتھ کیوں نہیں کی جاتی؟ یہ لوگ اخبار نہیں پڑھتے اور اسے بےکار سی چیز سمجھتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ صبح جس وقت تک چاہیں سوتے رہیں لیکن دفتر کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے انھیں بیدار ہونا پڑتا ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوئے تو دفتر کی تیاری کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ فوراً ہی بیوی سے کہا:

''کیا آج غیر حاضری نہیں ہوگی جواب تک کھانے کا پتہ ہی نہیں اور یہ دیکھو یہ میرے پاس نہ الا یچی ہے نہ لونگ۔''

''اے نیک بخت وہ آج مہتمم صاحب ایک گھنٹہ پہلے دفتر میں پہنچ جائیں تب ہی تو میں جلدی کررہا ہوں ورنہ کیا مجھے کتے نے کاٹا ہے جو میں تمھیں تنگ کروں۔ پرسوں ہی کا قصہ ہے کہ جو میں دفتر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اکیلے بیٹھے خود ہی کام کررہے ہیں وہ تو کہو کہ مرادآباد کے رہنے والے ہیں بڑے شریف آدمی اور ماتحت نواز افسر ہیں کچھ بھی نہ کہا ورنہ دوسرا افسر ہوتا تو وہ فوراً ہی غیر حاضری لکھ دیتا۔''

''لاحول ولا وہ چھتری کہاں ہے؟ ارے تمھارے سامنے اسی تخت پر تو رکھی تھی، تو آخر یہاں سے کوئی شیطان لے گیا؟ اور وہ جو ایک سرخ رنگ کا کاغذ تمھیں دیا تھا، خدا کے لیے اسے نہ کھودینا وہ سرکاری کاغذ ہے۔''

غرض صبح سے جب تک گھر میں رہے دفتر ہی دفتر کے حالات، ضروریات اور واقعات پر گفتگو فرماتے رہے اور جو زیادہ روشن خیالی سے کام لیا تو اس طرح کہ:

''کیا کہوں کل میرے پاس روپے نہیں تھے ورنہ ساڑھے نو سیر چاول بک رہے تھے، پیش کار صاحب بھی ساتھ تھے، انھوں نے خرید لیے۔ انھوں نے کہا بھی کہ اماں کچھ تو تم بھی خرید لو مگر میں خرید کر لاتا تو کس طرح؟ اس لیے میں نے بہانہ کردیا کہ میں پچھلے مہینے خرید چکا ہوں۔''

جس وقت دفتر کی روانگی عمل میں آتی ہے تو اس شان اور آن بان کے ساتھ گویا اب سیدھے جاکر تخت طاؤس ہی پر جلوہ افروز ہوکر رہیں گے۔ تمام راستہ دفتری دوستوں سے جو گفتگو ہوتی رہتی ہے وہ بھی اس طرح کہ:

کیا فرمایا؟

وہ اشرف علی صاحب

ہاں ہاں کہیے پہچان گیا، ارے صاحب وہ پہلے سیکریٹریٹ میں ریکارڈ کیپر تھے۔ جب بجی قائم ہوئی تو وہ ہمارے سامنے یہاں پیش کار مقرر ہوکر آئے، پھر وہ تحصیلدار میں بدل گئے۔ جب وہ خان بہادر محمد صدیق صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے اور یہ منشی اشرف علی صاحب ان کے دفتر میں کام

کرتے تھے۔ میری تو اُس وقت سے ان سے ملاقات ہے۔

اماں مولوی سراج الحق صاحب کے ہم زلف ہیں اور یہ غلام احمد صاحب کے مکان کے برابر والے مکان میں رہتے ہیں، ہاں تو یوں کیوں نہ فرمایا۔

ہاں ہاں 1926 میں وہ تھانیداری کے امتحان میں بھی شریک ہوئے تھے مگر اس زمانہ میں افسر امتحان تھے سید الطاف علی ۔ یہ تھے شیعہ اور بڑے متعصب انھوں نے بے چاروں کو فیل کر دیا تو یہ کوئی چار پانچ ماہ تک بے کار رہے تھے اور اُدھر خدا کی شان کہ سید الطاف علی بھی رشوت ستانی کے مقدمہ میں برطرف کر دیے گئے ۔ جی ہاں تو اب اشرف علی صاحب ہی کے نوٹ پر مسلسل پیش ہوا کرے گی۔ کیا فرمایا نہیں ۔

جناب وہ بڑے کنڑ سنّی ہیں اور بڑے خلیق ۔ خدا بخشے میرے نانا جان غفران مکان سے اور ان کے چچا سے بڑی دوستی تھی۔ ہمارے گھر میں بھی ان کے ہاں آنا جانا تھا مگر وہ تو جب یہ 1927 میں بریلی بدل گئے تو اس وقت سے پھر کوئی سلسلہ نہ رہا، آدمی بڑے شریف ہیں۔ آج خدا کی شان کے وہ یکا یک یہ ہو کر آ گئے ۔ خیر بھائی ہمیں اس سے کیا ہمیں تو جب تک ملازمت کرنا ہے تو اگر کوئی بھنگی بھی افسر ہو کر آئے گا تو تابعداری کو حاضر ہیں اور ویسے بھی میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے کام میں مستعدی دکھانا چاہیے۔

دوسرے بولے۔

ذرا تیز چلیے 9 منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ مگر ہاں وہ خوب یاد آئی۔ آج تو وہ (افسر) کمیٹی میں جائے گا اور ویسے بھی وہ مراقی آدمی ہے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ دفتر ہی چلا آئے یا کمیٹی میں جائے۔ وہ تو خاصا کرستان ہے۔ اس میں انسانیت کہاں۔ واللہ بہت دق کرتا ہے۔ ہاں تو وہ وجہ بھی تو معقول ہے۔ اے صاحب وہ ڈپٹی کلکٹر کا سفارشی ہے اس کے خلاف کون سنتا ہے۔ واللہ گدھا ہے گدھا اسے کام وام تو آتا نہیں ہے وہ تو کہیے کہ سررشتہ دار مل گیا ہے کار کردہ بس وہ سب کچھ کر کے رکھ دیتا ہے بھائی صاحب کے سامنے اور بھائی صاحب دستخط فرما دیتے ہیں۔

بالکل سچ کہا آپ نے بھائی صاحب یہ زمانہ ہی ایمانداری کا نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں میں نے بیس برس کمشنری میں کام کیا۔ نو سال ججی میں ہوئے کسی ملعون نے آج تک یہ بھی نہ پوچھا کہ تم

نے اپنی نمک حلالی کا کیا صلہ پایا۔ یعنی جب میں نے منشی نصیر احمد سے چارج لیا ہے اس وقت دیکھتے آپ کام کی گندگی۔ واللہ ایک کاغذ اپنی جگہ درست نہ تھا۔ دفتر سے ایک کاغذات کی گٹھری باندھ کر لے جاتا تھا اور تمام رات انھیں درست کرتا تھا مگر آج اس اندھے کو یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کے کس ماتحت نے کیسا کام کیا۔ اب تو بس سفارش ہو پھر اس کے تین خون معاف ہیں۔

وہ دیکھیے نا آخر کو مولوی وحیدالدین صاحب منصرم نے اس ناقدری سے تنگ آکر پنشن ہی لے لی، مگر اس کی چالیس کی ملازمت میں بس پندرہ ایک مرتبہ اور دس ایک مرتبہ اضافہ ہوئے حالانکہ وہ اس وقت سیکریٹریٹ میں ایک ہی اہلکار تھے۔ دیکھیے ہٹ آیئے وہ موٹر آرہا ہے کون کون؟۔

اس موٹر میں کیا جج صاحب تھے۔ اماں نہیں وہی جارہا ہے بابو نانک چند۔ جی وہی جوڈیشل میں جو ہیڈ کلرک ہے اور جینک والے صاحب کے ساتھ مرادآباد سے آیا ہے اُفوہ کس بلا کا آدمی ہے بس آتش کا پرکالا کہیے پورا جوڈیشل آج اس کے ہاتھ میں ہے۔

اس قسم کے مباحث سے راستہ طے کیا اور دفتر پہنچ کر جو مسلیں لکھنے کے لیے سر جھکایا تو کوئی دو بجے جاکر بقدر پان سگریٹ اور بیڑی جمائی لے کر کام سے علاحدہ ہوئے اور پھر پل پڑے کاغذات پر تو شام ہی کو فارغ التحصیل ہوئے اور دفتر سے فارغ ہوکر گھر تک راستہ میں ترکاری اور سودے سلف کے تذکروں اور مذاکروں میں کاٹ کر آپڑے۔ پھر گھر میں یوں کہ شب کے آٹھ بجے ہی کھاپی کر خراٹے لینا شروع کردیا۔

ہیڈ کلرک صاحب کا دماغ اور رتبہ ان عام دفتری لوگوں سے قدرے بلند ہوا کرتا ہے۔ انھیں صاحب کی قربت اور شفقت پر بڑا ناز ہوتا ہے اور اسی بل پر وہ اپنے ماتحت ملازموں کو ڈانٹ تک پلانے پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان کا اجلاس بھی ذرا خاص ہوا کرتا ہے۔ دفتری ''لکھ پڑھ'' میں یہ خود کو علامہ رازی سمجھتے ہیں، اور اسی لیے انھیں گھمنڈ ہوتا ہے کہ دنیا میں ہیڈ کلرک کے کام کے مقابل کوئی قابلیت کا کام ہی نہیں۔ ان کے لہجے اور گفتگو میں ہیڈ کلرک پن کا نخرہ ضرور شامل ہوتا ہے۔ افسر کی خوشامد سب سے آگے اور دفتری واقعات تو خون بن کر بدن میں ہر وقت دوڑتے رہتے ہیں۔ بات بات پر مسل کا حوالہ دینے کو بڑی مورخانہ سعادت سمجھتے ہیں۔ ماتحت ملازموں کو

غیر حاضری، جرمانے اور چغلی سے کبھی چھوڑتے نہیں۔ ہر غلط کار اہل کار کی اصلاح کرتے وقت اپنے قدیم افسران کے عہد میں اپنی پابندی اور مستعدی کے حالات کو بڑی عبرت انگیز داستان بنا کر سناتے ہیں تا کہ دوسرے ماتحت بھی غلامی اور خوشامد کے عادی ہو جائیں۔ دفتری کاغذات کے ایک ایک پرزہ سے واقفیت حاصل کرنے کو اپنی قابلیت کا سرٹیفکیٹ سمجھتے ہیں اور مسلیں لکھنے میں اس قدر دلچسپی لیتے ہیں کہ دو بکس کاغذات گھر پر بھی لا کر لکھتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی روز دفتر میں تعطیل ہو تو یہ اکیلے ہی دفتر میں پہنچ کر لکھتے رہتے ہیں اور اسے اپنی مستعدی کا آخری ثبوت سمجھتے ہیں۔

دنیا کے دوسرے حالات میں صرف اس قدر شریک ہوتے ہیں کہ کبھی کبھی محلے میں میلاد شریف کی مجلس میں چلے جاتے ہیں ورنہ ہر لحہ دفتر یاد آتا ہے۔

دفتریات میں سپرنٹنڈنٹ، منصرم یا سرشتہ دار کا عہدہ بھی خاص چیز ہوا کرتا ہے۔ اس عہدہ کے ہندستان زادے ماتحت ملازموں سے ہنس کر بات کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں ان کے غرور اور گھمنڈ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے گھر میں بھی ہر وقت سپرنٹنڈنٹی قائم رہتی ہے۔ ان کا اجلاس عام ملازموں سے ذرا علاحدہ اور اوٹ میں ہوتا ہے۔ ان کا پیشہ افسر اعلیٰ کی تعریف، خوشامد اور بڑھیا قسم کی رشوت ستانی ہوتا ہے۔ یہ لوگوں سے بہت کم میل جول رکھتے ہیں۔ اپنے افسر کی مہربانیوں کا ذکر بڑی اہمیت سے فرماتے ہیں۔ یہ بھی دفتری واقعات کی انسائیکلو پیڈیا ہوتے ہیں۔ افسر کے بنگلے پر روزانہ جانے کو دارین کی سعادت سمجھتے ہیں۔ ان کے مکانوں پر ارباب حاجت واصحاب ضرورت کا روزانہ دربار ہوتا ہے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کسی عمدہ سی آرام کرسی پر بڑے فخر سے پڑے ہوئے معروضات سنا کرتے ہیں اور غرض والوں اور محتاجوں کو ہمیشہ اس قسم کے جوابات عطا فرماتے ہیں کہ:

''یہ معاملہ اب میرے اختیار سے باہر ہے۔ تصفیہ تو صرف صاحب ہی کر سکتے ہیں، ہاں میں جو کچھ ہو سکے گا صاحب سے آپ کے لیے عرض کر دوں گا۔''

اس رتبہ کے دفتری لوگ محض خلافت ایجی ٹیشن، بھوک ہڑتال اور مہاتما گاندھی کی جے سے صرف اس قدر بیدار ہوئے ہیں کہ کبھی کبھی اخبار زمیندار پڑھ لیتے ہیں یا صاحب کا اخبار

''پائنیر'' ان کے مکانوں پر دفتر کے چپراسی سودا سلف بھی لاتے ہیں اور حقہ بھی بھرتے ہیں۔

ان سے جو ذرا بلند ہو جائیے تو پھر دالحفیظ۔ ان کے بعد آخری افسر آتے ہیں۔ ان کے دفتری اقتدار اور پندار کا عالم بھی نرالا ہوتا ہے۔ جتنا مرحوم و مغفور لوگوں کا فرشتوں سے، ان کا دماغ افسری کے نشہ سے ہمیشہ سرشار رہتا ہے اور ماتحت انسان تو ان کی نظر میں کوئی چیز ہی نہیں ہوتا۔ جب چاہا ڈانٹا اور جب چاہا برطرف فرمایا۔ جب چاہا خوش ہو گئے اور جب چاہا ناراض۔ ان کے تعلقات محلے والوں سے بھی نہیں ہوتے اور شہر والوں سے بھی نہیں۔ بس یا صاحب بہادروں یا خان بہادروں سے۔ ان میں سے بعض اپنا لہجہ انگریزوں کا سا بنا لیتے ہیں اور گفتگو تو سراسر انگریزی میں۔ ان لوگوں میں ''پائنیر اخبار'' پڑھا جاتا ہے اور اپنی مادری زبان کے اخبار ''زمیندار'' سے نفرت کی جاتی ہے۔ عام مسلمانوں اور ہندوؤں کی بساط نہیں جو ان کے مکان پر آسانی سے ملاقات یا عرضِ حال کر سکیں ہاں وہ ایک ضروری بات تو ٹال ہی گئے اور وہ یہ کہ ان تمام اقسام کے دفتری لوگوں میں یہ جہالت، حماقت، غلط فہمی اور گھمنڈ مشترک ہوتا ہے کہ دفتر کی کارروائیوں کو اس درجہ قابلیت کا کام سمجھتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس کام کو ایک مضمون نگار ایسا فاضل انسان بھی نہیں کر سکتا حالانکہ ایک مضمون نگار ہی ہوتا ہے جو دفتر تو دفتر ایک پوری حکومت کا نظام مرتب کر کے رکھ دیتا ہے مگر ان لوگوں میں مضمون نگاری اور چیز ہے اور دفتری گھسیٹ یا دفتری نستعلیق اور۔

الغرض ان میں کا ہر ایک کسی نہ کسی وقت خود کو سقراط و بقراط ہی سمجھتا ہے مگر قابلیت یہ کہ نہ انشا درست نہ املا، بس چھپے ہوئے رجسٹروں کے خانے بھر دینا اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں معاملہ کو طے کر دینا ہی اپنا انتہائی ''منشی جی پن'' سمجھتے رہتے ہیں۔ پھر مصیبت یہ کہ اس جہل و کم سوادی پر یہ نہ گاندھی کو خاطر میں لاتے ہیں نہ ابوالکلام آزاد کو۔

بے خبری کا یہ عالم کہ دفتر کے باہر نہ کانگریس کی اہمیت سے خبردار نہ مسلم لیگ کے مقصد سے واقف نہ شہنشاہی حکومت کا مطلب سمجھیں نہ جمہوری حکومت کے فوائد۔ نہ وضع قوانین کے اصول و ضرورت کا علم نہ انصرامِ حکومت کا سلیقہ۔ کام کرنے کا سلیقہ یہ کہ 99 فیصدی دفتری لوگ تاریک سے کمروں میں بیٹھ کر لکھتے ہیں تو انھیں صحت کی بھی شکایت نہیں ہوتی اور مقررہ اوقات سے سوا لکھتے رہیں تو انھیں دماغی ضعف کا غم لاحق نہیں ہوتا بس ایک مشین ہوتے ہیں جو چکر کھاتی

رہتی ہے اور بس۔

غرض یہ وہ بے حس اور بے خبر طبقہ ہے جو اگر بیداری سے متمتع ہو جائے تو ہندستان میں روشن خیالی کی 75 فیصدی کمی پوری ہو جائے۔ پھر کیا ممکن ہے کہ کوئی پنجابی بھائی اٹھے اور اس بے کس طبقے کی اصلاح و ہدایت اور ترقی اور بیداری کے لیے ایک اخبار "دفتر" کے نام سے جاری کر دے۔ مان لیجیے کہ اس قسم کا اخبار بے شمار دفاتر میں بے حد مقبول ہوگا بشرطیکہ اس کا ایڈیٹر بھی کوئی پنشن زدہ اور دقیانوسی قسم کا ہیڈ کلرک ہو اور اخبار میں بجائے اجتماعی اور بین الاقوامی مسائل کے عرصۂ دراز تک مراسلہ آفس کا پی۔ ڈی۔ او، ورقۂ حکم، مسل حکام بالا کی خوشامد، دفتر کی حاضری کے طریقے، تعطیل کے دن کام کرنے کے اصول، تنخواہ میں اضافہ کرانے کے گُر، سفارش حاصل کرانے کے اصول اور بال بچوں کے ساتھ رہنے کے ضابطے لکھتا رہے کہ یہی چند چیزیں ہیں جن کے اندر دفتری بھائیوں کی:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

رہا افسروں کے غرور اور گھمنڈ کا علاج سو اس کا جواب تو مخفی رکھتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ ایک فاتح قوم جب مفتوح قوم کے افراد سے ذرا نخوت اور غرور سے فطرتاً پیش آتی ہے تو مفتوح افراد میں اقتدار پسندی یقینی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر ہندستانی افسروں کو ڈانٹنے اور چانٹا مارنے کے لیے انگریز ہاتھ نہیں آتے تو وہ اس جذبہ کو اپنے ہی ملکی اور قومی ماتحت ملازموں پر حکومت فرما کر پورا کر لیتے ہیں۔

اسی لیے تو ہمارے ننھے میاں کی والدہ کو دفتر کی روزانہ حاضری پسند نہیں۔ غنیمت ہی ہے ان کا اتنا ہی احساس، خدا ہم دونوں کو بعافیت و فراغت سلامت رکھے۔ آمین۔

◆◆◆

طلبا کا سفر

ارتقائے طبعی کے تحت جہالت آباد ہند کے باشندوں کی ذہنیت بدل رہی ہے۔ سیاست، تجارت، زراعت، تمدن، تعلیم، مذہب، معاشرت، ادب اور بین الاقوامی حالات واوضاع میں ایک ہلکی سی تبدیلی ہے جو بتدریج بڑھ رہی ہے اور ارتقا اور ترقی کی یہی وہ روح ہے جو ان کی حیات وزندگی کے ہر شعبہ میں بیدار ہو رہی ہے اور یہی وہ روح ہو سکتی ہے جو سعی پیہم یا کسی حادثہ کے اثر سے ایک دن ہندستانیوں کو متمدن اور عروج یافتہ اقوام کے ہم پایہ بنا دے گی۔

ارتقا و انقلاب کے جذبات سے کون ہے جو خالی نظر آتا ہے؟ سینوں میں اگر جوش ہے تو انقلاب وارتقاء کا، دماغ میں خیالات ہیں تو علو و برتری کے، ارادہ ہے تو اصلاح وترقی کا یہاں تک کہ اختلاف وفساد ہے تو وہ بھی اپنی حیات وزندگی کے تحفظ وتجدد کا۔ غرض ہندستان کا وہ میلا اور گندہ مزدور جسے اگر فرصت ملتی تھی تو ''بہ مقدار چلم نوشی'' اگر اس کی جدوجہد کا میدان تھا تو ''از غریب خانہ تا بہ کارخانہ''، مگر آج یہی مزدور ہے جو ہر اجتماعی تحریک میں سب کے ساتھ شرکت کو تیار نظر آتا ہے۔ وہ استقلال وحریت، تہذیب وتربیت کی ہر تقریر سے مانوس ہے اور حیات مستقل کی ہر آواز کو سنتا ہے اور بہت غور سے سنتا ہے۔ پھر اسی ماحول اور ارتقائی جذبہ کا اثر ہے کہ مسلمان بھی کروٹ بدلنے کی آنکھ کھول رہے ہیں۔ وہ اپنی خبیث اور ملعون عادت کو ترک کرنے چلے تو ہیں مگر

کافی ذلت اور خواری کے بعد۔ موٹر، گھوڑ دوڑ، سنیما، تھیٹر، تیتر بازی، مرغ بازی اور شراب خواری سے بے زار تو ہو رہے ہیں مگر پوری بربادی اور برہمی کے بعد اور ارتقائے طبعی کا یہی وہ تاثر ہے کہ اب مسلمانوں میں خبائث وسیئات اور مکروہات وممنوعات کے ترک کے ساتھ ہی ایک نہایت خفیف مگر واقعی حرکت ہے جو دیرینہ کسل وغفلت کے پہلو میں انگڑائی لیتی نظر آ رہی ہے۔ ان میں بھی سیاست واستقلال، تمدن وتہذیب، اصلاح ومعاشرت کی ہر آ وزش جاری ہے مگر اس قدر ثقیل وقلت کے ساتھ گویا کہ ابھی کچھ بھی نہیں۔

ان کے ذہنی اور فکری اعمال کی ترقی تاریک وتنگ درسگاہوں سے نکل کر اسکول، کالج اور یونیورسٹیز کی بلند اور شاندار عمارتوں تک پہنچ گئی ہے مگر اس طرح گویا وہ کوئی ایسا جمیل ورنگین خواب دیکھ رہے ہیں جس کی تعبیر ان کے لیے مہلک تر ہے۔ بس انھی کیفیات کے ساتھ آپ مسلمان طلبا کے ایک ایسے سفر کے حالات سن لیجیے جو حصولِ علم وتحقیقِ حقائق کی خاطر کیا گیا تھا اور اس طرح کہ اپنے ملا رموزی صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔

عرصہ سے سن رہے تھے کہ آج کل کے اسکولوں اور کالجوں سے طلبا کو ہندستان کے تاریخی، جغرافی اور علمی مقامات کے معائنہ کو اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ وہ ''عملی تعلیم'' کے فوائد سے بہرہ ور ہوں اور یہ اس طرح کہ ان کے ساتھ ان کے اساتذہ بھی ہوتے ہیں جو ہر علمی اور تحقیقی موقع پر طلبا کو واقعی درس دیتے جاتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ آپ اس سفر کے حالات معلوم کریں یہ جان لیجیے کہ آج کل کے اسکولوں اور کالجوں میں یہ اپنے محلہ کے شیخ بدھو اور حافظ کلا کے لڑکے تعلیم نہیں پاسکتے بلکہ وہ تعلیم پاتے ہیں جن کے والد ماجد اور نہیں تو کہیں کے ڈپٹی کلکٹر ضرور ہوں۔ پھر ایک کلکٹر زادہ کے لیے یہ بات آسان نہیں کہ وہ تحقیقِ علم کی خاطر افغانی جفاکشوں کی طرح بغیر کسی امداد کے مساجد کی خیراتی روٹیوں اور زکوٰۃ کے موٹے موٹے کپڑوں کو پہن کر بھی ڈٹا رہے، مگر حصولِ علم سے منہ نہ موڑے۔ اب تو جب تک اسکول کے لیے سائیکل، موزے، ٹائی، کالر، ریشمی شیروانی، چست زنانہ پاجامہ اور ڈاسن کا پمپ نہ ہو تو اسکول جانا کیسا؟ پھر اسکول پہنچ کر ہاکی اور فٹبال کا بوٹ، نیکر، سلک کی بنیائن، بالوں کی آرائش کے لیے پیرس اور لندن کا تیل اور کھیل کے بعد سوڈا واٹر برف اور لیم جوس کی بوتلیں نہ ہوں تو پھر اسکول میں دلچسپی ہی کیا؟ اس حالت کے

ساتھ طے پایا کہ فلاں دن فلاں وقت فلاں فلاں کے ساتھ فلاں ریل سے فلاں شہر جائیں گے تا کہ وہاں کے آثارِ علمیہ کا معائنہ کیا جائے۔

اسکول سے سفر کے خرچ کا انتظام ہوگیا، مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے؟ ہر طالب علم اپنی اپنی ماں اور اپنے اپنے باپ سے چار چار سوٹ، چار چار بوٹ، چار چار بکس، چار چار سگریٹ کیس اور چار چار داڑھی صاف کرنے کے اُسترے معہ تولیہ، صابن اور پاؤڈر کے طلب کیے اس پر بھی ایک بولے:

بھئی ہم کیا خاک جائیں؟

کیوں؟ اماں موزے تو فقط پانچ جوڑے ہی ہیں۔

اور میرے پاس بھی تو یہ چار ہی پاجامے ہیں، مردود دھوبی نے اب تک دھوئے ہی نہیں۔

تو تمھاری طرح میں تو ہوں نہیں کہ چاہے کچھ ہو یا نہ ہو مگر سفر ضرور کریں۔

اچھا تو آگرہ بھی تو راستہ میں پڑے گا وہاں سے خرید لینا میں بھی تو آگرہ ہی سے چست پاجامے خریدوں گا کیونکہ آگرہ میں جو ''شاعرانہ پاجامے'' ملتے ہیں وہ تم نے خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔

لاحول ولا تو کیا یہاں سے میں ننگا ہی چلوں؟

اماں ننگا کیوں چلو۔ آخر اتنا تو ہے کہ وہاں تک چلے چلو۔

جی نہیں مجھے تو معاف کیجیے ذرا والد صاحب دفتر سے آجائیں ان سے ایک مرتبہ اور کہوں اگر دے دیے تو خیر ورنہ بھئی میں تو اس حالت سے نہیں جاؤں گا۔

اماں کیوں نخرہ کرتے ہو چلے بھی چلو واللہ بڑا لطف رہے گا۔

گویا سفر کا مقصد علمی تحقیق و کاوش نہیں بلکہ ''لطف'' قرار پایا۔ غرض اس قسم کی تکرار ہی کے بعد ''مقررہ فلاں تاریخ'' اور فلاں وقت پر فلاں ریل پر پہنچ گئے۔ دیکھا تو طلبا کی تعداد سے کہیں زیادہ تعداد صندوقوں کی تھی جن کے اندر قیمتی جوڑے کپڑے کے، پائنیر اخبار، انگریزی ناولیں، سیفٹی ریزر، صابن، تولیے، بوٹ اور چشمے یوں بھرے ہوئے تھے گویا کسی گرلز اسکول کی صاحبزادی کا فیشن ایبل جہیز ہے جو ریل پر بار کیا جانے والا ہے اور اس میں نسوانی اور زنانہ بناؤ

سنگھار کی ایک چیز بھی کم نہیں، لیکن واضح رہے کہ کسی جغرافی یا تاریخی کتاب کا اس پورے سامان میں پتہ بھی نہیں تھا اور جانماز کا تو ذکر ہی بے موقع ہے۔

ہمارے ''ننھے میاں کی والدہ'' گو تنخواہ مل جانے کی وجہ سے ہم سے کسی قدر خوش بھی تھیں، مگر اس سفر کے لیے انھوں نے اس حال میں بھی ناشتہ کی روٹیوں کے اوپر فقط پانچ روپے عطا فرمائے تھے۔ بستر کی چادر دھوبی کے ہاں سے آئی نہ تھی اس لیے فقط ایک ''کارآزمودہ کمبل'' تھا جو ہمارے بستری وقار کے لیے کافی سمجھا گیا اور چونکہ سفر تھا صرف چار دن کا اس لیے صرف ایک جوڑا کپڑے کا کافی سمجھ لیا گیا اور اسے اخبار زمیندار لاہور کے بیچ کے دو ورقوں میں یوں باندھ دیا گیا گویا آگرہ شو فیکٹری سے سات نمبر بوٹ خرید کر لا رہے ہیں۔ قمیص کی جیب میں کاغذ کے ٹکڑے اور انگریزی سیاہی، بھرا ہوا قلم رکھ دیا گیا تا کہ معاوضہ کی مضمون نگاری کا ناغہ نہ ہو۔ ریل کے کرایہ کا خود طلبا نے انتظام کرلیا تھا اور وہ بھی سیکنڈ کلاس کا اس لیے ہم نے سوچ لیا کہ یورپ میں بھی مضمون نگار اسی طرح سفر کرتے ہوں گے پھر ہم کیا برے ہیں۔

لڑکے تھے اسکول کے اور وہ بھی انگریزی زبان کے اسکول کے اس لیے انگریزوں نے یہ قاعدہ بنا دیا ہے کہ جب کسی اسکول کے لڑکے کسی انگریزی قسم کے علم کی تحقیق یا کسی انگریزی قسم کے کھیل تماشے کے لیے سفر کریں تو ریل والے ان سے آدھا کرایہ لیں شاید اس سے مقصد یہ ہے کہ یورپی آداب واثرات کی اشاعت ہو ورنہ جناب یہ اپنے دیوبند کے طلبا کیا طلبا نہیں ہیں جو بے چارے تھرڈ کلاس میں بھی بے ٹکٹ نہیں جا سکتے۔ اس لیے ہماری جماعت کی طرف سے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسٹیشن ماسٹر صاحب کو انگریزی زبان میں پہلے ہی لکھ دیا تھا:

> ''ہمارے طلبا چوں کہ فلاں مقصد کے لیے فلاں شہر تک فلاں ریل سے فلاں ماسٹر کی نگرانی میں فلاں دن فلاں تاریخ اور فلاں بج کر فلاں منٹ پر سفر کریں گے اس لیے ان کے واسطے فلاں قسم کے ڈبہ میں فلاں فلاں قسم کی سیٹیں عرف نشستیں وقف وخاص کر دیجیے تا کہ کسی دوسرے یا تیسرے مسافر کو اس ڈبے میں ''تاب گھس پڑ'' نہ رہے۔ امید کہ آپ فلاں قاعدے کے موافق فلاں مقدار کے ٹکٹ تیار فرما دیں گے''۔

واضح ہو کہ ہندستانی ریلوں کے محکموں میں جو ہندستانی ملازم ہیں ان کی ذہنی، مذہبی،

اخلاقی اور علمی قابلیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ یورپ کے مسافر کو خود جھک کر سلام کرتے ہیں اور اپنے قومی وملکی اور دینی بھائیوں کو ادنیٰ سے ادنیٰ، ذلت اور تکلیف پہنچانے میں کبھی کمی نہیں کرتے اور یہ فقط اس لیے کہ ریلوں کے ہندستانی ملازمین میں ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلما لکھنؤ اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں دینی اخلاق اور علوم کی کامل تعلیم پائی ہو اور مشرقی خلق وکرم اور ہندستانی خلوص و ہمدردی اخبار بمبئی ٹائمس اور پانیئر اخبار پڑھنے والوں میں نہ پیدا ہوئی ہے نہ ہو۔ یا پھر ریلوں کے محکموں میں وہ انگریز ملازم ہیں جو قانون کے پابند ہیں اور قانون میں صاف لکھا ہے کہ ''گاڑی صرف تین منٹ ٹھہرے گی'' اس لیے باوجودیکہ ہم میں کا ہر طالب علم لباس اور چہرہ کی صفائی کے لحاظ سے لائڈ جارج سے کم نہ تھا، بعض کے ہاتھ میں تازہ اخبار پانیئر بھی تھا مگر گاڑی آتے ہی سب کو دھکے بھی کھانا پڑے اور مسافروں کی گالیاں بھی۔ کسی کا چشمہ ٹوٹ گیا اور کسی کے بکس کا پالش اُڑ گیا۔ غرض سوار ہوتے وقت طلبا میں نہ کوئی ''نسوانی نزاکت'' باقی تھی نہ مزاجوں میں انگریزی دانی کی اکڑ اور تو اور قلی مزدوروں تک پر رعب باقی نہ رہا اور انھوں نے صندوق پر صندوق یوں دے مارا گویا وہ کسی پردیسی تاجر کے پارسل ہیں جو بریک سے پلیٹ فارم پر پوری بے دردی سے پھینکے جاتے ہیں اتارے نہیں جاتے۔ نشستوں میں گنجائش کا یہ حال تھا کہ ہر مسافر اپنے پاس والے مسافر کی کسی نہ کسی چیز پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے رہنما دو ماسٹر تھے جو ہندستانی کچھومر ہونے پر بھی آج ہیٹ سوٹ میں یوں پھولے ہوئے تھے گویا کل سارے ہندستان کے گورنر جنرل باجلاس کونسل وہی ہوں گے۔ آئے اور سیٹی بجاتے ہوئے سیکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ صرف لڑکوں سے اتنا کہہ گئے کہ دیکھو بھئی ہشیاری سے بیٹھنا۔

ریل روانہ ہوئی وقت تھا رات کا اور وہ بھی کوئی اڑھائی بجے شب۔ ادھر ہم تھے مصروف طلبا کی امداد میں نتیجہ وہی ہوا جو دنیا میں نیکی اور احسان کا ہوا کرتا ہے یعنی ریل روانہ جو ہوئی تو ہمارا سیکنڈ کلاس روانہ ہو گیا۔ گھبراہٹ میں ایک تھرڈ کلاس منہ کے سامنے آ گیا۔ اس پر خواہ مخواہ لٹک جانا پڑا۔ اب جو لٹک کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو اندر سے کسی نے جھنجھلا کر ہمیں ایسا دھکا دیا کہ اگر دروازہ باہر کی طرف کھلنے والا ہوتا تو گئے تھے ملا رموزی صاحب ''جوارِ رحمت'' میں۔ اب فکر یہ ہوئی کہ آخر دروازہ نہ کھولنے کا سبب کیا ہے۔ ادھر ریل لمحہ بہ لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے اور ہم

تھے کہ ڈاکہ زنوں کی طرح ڈبے سے چمٹے کھڑے تھے۔ جب دروازہ کھولنے کے لیے زور آزمائی کرتے تو ہم سے زیادہ زور اندر کی طرف سے ڈالا جاتا۔ پھر سوچا کہ آخر یہ اسکولوں میں 'رسہ کشی' تو سنی تھی مگر یہ ریل میں 'دروازہ کشی' آج تک نہ سنی۔ بہر حال ہمیں تو دروازہ کھولنا ہی تھا ورنہ ریل سے گر کر خودکشی کے لیے تو سوار ہوئے نہیں تھے۔ اس لیے چار و ناچار دروازہ پر دستک دینا شروع کیا تو اس کا جواب بھی کچھ نہ ملا۔ ہم کاہے کو باز رہتے تھے، اب جوں جوں ریل تیز رفتار ہوتی ہی طاقت سے ہم دروازہ بجائیں، ہلائیں، ٹھونکیں، کوٹیں، پیٹیں، دھڑ دھڑائیں، جھنجھوڑیں، کھولیں، دھکائیں، اٹھائیں، بٹھائیں مگر نہ کھلے تو دروازہ سے کان لگا کر سوچیں کہ یہ اندر کے بیٹھنے والے کہیں اناللہ تو نہیں ہو گئے؟ کبھی سوچیں کہ ہو نہ ہو ڈبے میں ہمارے کچھ دوست ہیں جو جان بوجھ کر محض مذاق کے طریق پر ہمیں تنگ کر رہے ہیں تو اس خیال سے ہم کہیں:

اماں بس رہنے بھی دو اب مذاق وذاق، چلو دروازہ کھولو۔

لاحول ولا اور جو ہم نیچے گر گئے تو واللہ ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی۔

اونہہ تو اس سے فائدہ؟

ہم ایسا مذاق تو پسند نہیں کرتے۔

اماں واللہ ریل پوری رفتار سے جاری ہے۔

دیکھو اگر گارڈ نے دیکھ لیا اور ریل کھڑی ہو گئی تو جیل خانے بھیج دیے جائیں گے، کیونکہ وہ تو سمجھے گا کہ ہے یہ کوئی اٹھائی گیرا، لفنگا، چور، ڈاکو جو ریل کے باہر کھڑا مسافروں کے اسباب کی تاک میں ہے۔

تو آخر مذاق کی بھی کوئی حد ہے؟

لاحول ولا۔ اچھا تو لو اب نہ کہیں گے۔ نہ کھولو۔ قسمت میں یوں ہی مرنا لکھا ہے تو مر جائیں گے۔ استغفر اللہ یہ بھی کوئی مذاق میں مذاق ہے۔ اچھا تو نہ کھولو گے۔

یہ سب کچھ ہم اسی خیال میں کہہ رہے ہیں گویا ڈبے کے اندر واقعی کچھ دوست بیٹھے یہ سب کچھ سن ہی تو رہے ہیں حالانکہ واقعہ یوں تھا کہ سارے مسافر پڑے سو رہے تھے اور ایک مسافر نے دروازہ کے قریب ہی بستر جما کر اپنے پاؤں دروازہ سے یوں اڑا لیے تھے کہ دروازہ کے ساتھ ہی

ان کے پاؤں بھی کھلتے تھے اس لیے وہ پاؤں کو دروازہ سے پوری قوت کے ساتھ لگائے پڑے ہوئے تھے اور باہر سے زور لگانے سے چونکہ ان کی نیند خراب ہو چکی تھی اس لیے وہ مارے تاؤ کے دروازہ بھی نہیں کھولتے تھے، مگر تا بکے آخر ہمارے مسلسل شور اور زور سے تنگ آ کر ایک مرتبہ اٹھ کر یوں دروازہ کھولا کہ ہم اتنے زور کے ساتھ ریل میں منہ کے بل جا پڑے۔ تو اب جھنجھلا کر بولے کہ یہ چلتی ریل میں کہاں گھس رہے ہو؟

اس وقت ہمیں اس قدر تاؤ تھا کہ اس مسافر کو جہنم واصل کر دیں مگر اپنی پھانسی کے خوف سے دم بخود ہو کر بیٹھ گئے۔ تو بیٹھے یوں کہ اُن مسافر صاحب کا آدھا بستر اداب کر۔ اب اس پر ایک تازہ ہنگامہ اور شور ہوا اور مسافر صاحب کے جو جی میں آیا کہا مگر ہم نے ایک کا بھی جواب نہ دیا تو تنگ آ کر چپ تو ہوئے مگر ہمیں رہ رہ کر یوں گھوریں گویا ہم کہیں کے اُچکّے اور گرہ کٹ ہیں جو ان کے ڈبہ میں چلتی ٹرین میں گھس آئے ہیں۔ پھر بھی وہ چپ نہ ہوتے تھے تو ایک مرتبہ ہم نے بڑے انکسار سے اپنا نام یوں بتایا کہ حضور ہم ہیں ضیاء الملک ملا رموزی، فاضل الٰہیات، ایم۔ آر۔ اے۔ ایس لندن موجدِ گلابی اردو۔

مگر یہ نام نہ ان کی سمجھ میں آنے والا نہ آیا۔ اور ویسے بھی دفتری قسم کے مسلمانوں کی نظر میں ایسے ناموں کی قیمت ہی کیا۔ اس لیے ہم نے کہا بھائی اصل میں ہم ہیں حضور نظام حیدر آباد کے اے۔ ڈی۔ سی اب تو گھبرائے اور فرمایا تو جناب یہ آدھی رات کو اس طرح کیوں سوار ہوئے؟ ہم نے کہا ہمارا سیلون اسی ریل میں لگا ہوا ہے، ہم حضور نظام کے لیے سوڈا واٹر لینے گئے تھے کہ ریل روانہ ہو گئی وہ بوتل بھی ہاتھ سے گر کر چور چور ہو گئی، خیر جان ہی بچ گئی۔ آگے کے اسٹیشن سے ہم چلے جائیں گے۔ اب تو پورا بستر دے دیا اور فرمایا کہ کوئی مضائقہ نہیں واقعی خدا نے بڑی خیر کی۔ اور جناب معاف کیجیے گا میں سو رہا تھا اور کیوں صاحب یہ نظام حیدر آباد کہاں تشریف لیے جا رہے ہیں۔ ہم نے کہا دہرہ دون جا رہے ہیں۔ وہاں وائسرے سے خفیہ ملاقات فرمائیں گے۔ آپ کسی سے نہ کہیے گا۔ یہ کہہ کر ہم نے انھیں سگریٹ پیش کیا تو اب یہ ہمارے اے۔ ڈی۔ سی ہونے کے قائل ہو گئے تب خیال آیا کہ مسلمانوں میں علم و ادب کوئی چیز نہیں صرف سکریٹری یا اے۔ ڈی۔ سی ہونا بڑی بات ہے اور یہ اس لیے کہ مسلمان بے چارے علم و ادب سے خود بے بہرہ اور

محروم ہیں، انھیں کسی کی علمی وادبی حیثیت کا اندازہ ہوتو کیوں کر ہو۔ بھلا یہ انٹرنس پاس کیا جانیں ابوالکلام آزاد کی ادبی عظمت کو اور یہ ایف۔ اے پاس کیا پہچانیں مولوی ظفر علی خاں کی بہار آفریں انشاپردازی کو اور بی۔ اے پاس کیا محسوس کریں ملا رموزی کی لطافت نگاری کو؟

الغرض دوسرے اسٹیشن سے ہم اپنے ڈبہ میں جو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ طلبا کے بیچ میں ہارمونیم باجا رکھا ہے اور ایک نزاکت مآب طالب علم صاحب یوں گا رہے ہیں گویا وہ اسکول کے طالب علم نہیں بلکہ منّی جان آگرہ والی کے ملازم ہیں۔ یہ گویا ریل میں تفریح ہو رہی تھی۔ ان کے مجمع کے صدر حضرت ماسٹر صاحب تھے جو نہایت آن بان سے لیٹے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے اور دوسرے طلبا بھی محوِ سگریٹ نوشی تھے۔ اب فرمایئے کہ جو استاد طلبا کے سامنے سگریٹ نوشی کرے اور طلبا کو بھی اس نوشی کی اجازت دے وہاں شرم وحیا اور ادب وتعظیم کی مشرقی رسم کس طرح باقی رہے؟ پھر یہ کہ شاگرد رشید کی قوالی میں شرکت آج کل کے اساتذہ کا ایک ضابطۂ تعلیم ہی سمجھ لیجیے۔ پھر جب بورڈنگ ہاؤس کا کوئی طالب علم استاد صاحب پر فوجداری کا مقدمہ چلا دیتا ہے تو کہتے ہیں کہ ''بڑا گستاخ'' ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ گانے والے طالب علم صاحب اپنے استاد صاحب ہی سے سگریٹ طلب فرماتے تھے جن سے ان کے اور استاد صاحب کے خوشگوار تعلقات کا پتہ چلتا تھا اور آج کل اسکولوں اور کالجوں میں ایسے خوشگوار تعلقات کا بہت زور ہے خصوصاً امیر خاندانوں کے طلبا ان تعلقات میں بہت مستعد ثابت ہوتے ہیں۔ یا پھر ایسے افغانی گھرانے کے لڑکے جو کسی وقت بادشاہ افغانستان سے بغاوت کر کے اب ہندستان میں دنیا جہان کی بے حیائی اور بے شرمی کے لیے زندہ ہیں۔

اب ہم جو اس ڈبہ میں داخل ہوئے تو ہم نے اس مشغلہ پر ماسٹر صاحب کو دھرلیا اعتراضات پر مثلاً ہم نے کہا:

کیوں ماسٹر صاحب کیا اسی کا نام ہے تعلیم وتربیت؟

ماسٹر: کیا عرض کیا جائے۔ یہ آج کل کے فیشن نے طلبا میں ایسی بے حیائی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔

ہم: مگر آپ تو اپنے اقتدار کو باقی رکھیں۔

ماسٹر: اقتدار باقی رہتا ہے ڈنڈے کے بل پر اور طلبا کو ڈنڈے، چھڑی، لٹھ، گھونسے اور چانٹے سے مارنا اصولِ تعلیم کے منافی ہے اِدھر یہ اسیر گھرانے کے لونڈے ہوتے ہی ہیں بے شرم، بے حیا، بے حمیت اور بے غیرت اور یہ سب کچھ سیکھ کر آتے ہیں اپنے اُن بزرگوں سے جو خود آپس میں ایک دوسرے عزیز سے بے باکانہ اور بے حیائی کے معاملات میں باک اور شرم نہیں کرتے۔

ا: ٹھیک ٹھیک، درست درست، بجا بجا، صحیح صحیح، واقعی، واقعی۔ خود ہمارے دوستوں میں بھی ایسے خاندان ہیں جو اپنے سے چھوٹے بچوں سے کوئی حجاب نہیں کرتے اور انھیں دانستہ طور پر ایسے مواقع بہم پہنچاتے ہیں مگر انھیں موت نہیں آتی پھر ایسے سفید رنگ کے طلبا اور سرخ رنگ کے ماں باپ میں استاد کی عظمت و عزت کیا؟

صبح ہوئی تو طلبا سیٹیاں بجاتے ہوئے بیدار ہوئے اور وہ اپنی سگریٹ منہ میں داب کر ریل کی ''میونسپلٹی'' میں لوٹا لے کر گئے۔ وہاں سے آئے تو داڑھیاں اور مونچھیں یوں صاف کیں گویا وہ بھی دہلی کی عروس نو ہیں جو شام کے وقت آراستہ ہو کر کوٹھے پر جانے والی ہیں۔ یاد وہ زمانہ تھا جب نوجوان طلبا اپنے سینہ اور شانہ کو تان کر چلنا مردانگی کی علامت سمجھتے تھے۔ یہاں سے پوریاں، دہی بڑے، پاپڑ، چائے اور گوشت روٹی، خریدی گئی اور یوں کھائی گئی کہ اسٹیشن کے تمام مسافر تماشہ دیکھتے رہے۔ اس کے بعد ایک نے بانسری بجائی اور دوسرے نے گانا سنایا۔ ایک صاحب پر علم و فضل کا جوز در ہوا تو انھوں نے پھر تازہ پانیئر خرید لیا مگر اخبار زمیندار لاہور کو اس لیے نہ لیا کہ وہ ان کی ماں کی زبان میں شائع ہوتا ہے۔

اب چل پہ چل، اس شہر کے قریب پہنچے جہاں علمی و تاریخی تحقیق کا معاملہ طے ہونے والا تھا۔ گاڑی میں پھر ہلچل پیدا ہوئی اور طلبا نے پھر نئے نئے سوٹ بوٹ سنبھالے اور بالوں کی آرائش اور چہروں کی زیبائش کو لاجوابی کی حد تک پہنچا دیا تو اس شہر کے لیے ہم لوگ الٹا تماشہ بن گئے۔ جدھر سے گزرتے لوگ ہمیں گھور گھور کر دیکھتے مگر نہ ہمارے طلبا پر شرم طاری ہوتی تھی نہ خود ہمارے اوپر اور ماسٹر صاحب تو پہلے ہی معقول مدد فرما چکے ہیں۔ تحقیق و تدقیق کے مرکز پر یوں پہنچے

کہ طلبا نے جاتے ہی انگڑائیاں لیں اور مع ماسٹر صاحب کے ان آثارِ قدیمہ کے سامنے لیٹ گئے۔ کسی نے کوئی قصہ سنایا تو کسی نے ریل کا کوئی واقعہ۔ کسی نے کچھ دیر انگریزی بولی اور کسی نے کوئی شعر گنگنایا۔ تھوڑی دیر بعد آثارِ قدیمہ کے ایک پروفیسر آئے تو طلبا ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ کوئی بیس منٹ تک انھوں نے لیکچر دیا اور ان سب نے سنا۔ نہ کسی نے اس لیکچر کا کوئی فقرہ نوٹ کیا نہ کسی کتاب سے اسی وقت مقابلہ ہوا۔ نہ اس خالص اور اہم علمی معائنہ پر طلبا میں کوئی مباحثہ ہوا نہ کوئی نقد و جرح نہ آثارِ قدیمہ وعلمیہ کی تحقیق ہوئی۔ صحیح بلکہ تحریک ہوئی کہ اب دھوپ سخت ہو رہی ہے قیام گاہ پر جلد چلیے۔ طلبا کے ساتھ جانے والے ماسٹر صاحب اس پورے علمی اور تاریخی لیکچر میں یوں منہ کھولے کھڑے رہے گویا وہ طلبا کے ماسٹر نہیں بلکہ چوکیدار ہیں یا چپراسی ہے۔ جدھر طلبا جاتے وہ مذاق فرماتے ہوئے اور سگریٹ پیتے ہوئے ساتھ ہو جاتے۔ اس لیے طلبا نے طے فرمایا کہ ماسٹر صاحب آج یہاں کی ہاکی ٹیم سے ہم میچ کھیلیں گے۔ ماسٹر صاحب نے اجازت دے دی۔ پھر طلبا نے طے کیا کہ آج شب کو یہاں کا سنیما دیکھیں گے تو ماسٹر صاحب نے اس کی بھی اجازت عطا فرما دی۔ کسی نے کہا تو سیسل ہوٹل میں ناشتہ کیجیے گا تو ماسٹر صاحب نے بڑے زور سے فرمایا کیوں نہیں؟ کسی نے کہا دو دن تو اور قیام کیجیے پرسوں یہاں بڑا بھاری میلہ ہوگا تو ماسٹر صاحب نے فرما دیا اچھا ٹھہر جائیں گے گھبراتے کیوں ہو؟

واضح ہو کہ اس تمام قیام میں ہم سے نہ کوئی سوال کیا گیا نہ کوئی تاریخی مباحثہ۔ البتہ ہم سے ڈاڑھی صاف کرنے اور کپڑے بدلنے کا مطالبہ بہت جلد جلد اور اصرار سے کیا جاتا تھا اور یہاں ننھے میاں کی والدہ کا بخشا ہوا وہی ایک جوڑا تھا جسے گھر تک صاف ستھرا لے جانا بھی ہمارے شوہرانہ سلیقے میں داخل تھا۔

یوں سفر کرتے ہیں آج کے طلبا۔ پھر ان سے ملازمانی زندگی میں عدل و انصاف، امانت و دیانت، مستعدی اور جفاکشی اور کسی ہنرمندی کی امید ایسی ہی ہے جیسی ہم ننھے میاں کی والدہ سے فرماں برداری کی توقع قائم کریں۔

◆◆◆

ذرا کانپور تک

اچھا فرض کیجیے کہ آپ کوئی نہایت مقبول اور شہرۂ آفاق ادیب ہوں۔ آپ کے حکمت زا اور بہار آفریں مضامین پر دنیا عقیدت و احترام کے پھول برساتی ہو۔ پھر آپ کو ایسی جگہ طلب کیا جائے جہاں سامانِ فراغت اور بلند سے بلند مرتبہ لوگوں میں آپ کے دیدار کے جذبات کی کمی نہ ہو، اس وقت اگر آپ کے ''ننھے میاں کی والدہ'' آپ کو صرف پندرہ روپیہ سفر کے خرچ کے لیے دے دیں تو ایمان سے کہیے آپ کا دل اور دماغ کتنے دن اور زندہ رہ سکتا ہے؟ نتیجہ یہی ہوگا کہ آپ تمام راستہ ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بدبودار قسم کے مسافروں کے دھکے کھاتے چلے جائیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کا ایک نامور ادیب اس ریل میں سفر کر رہا ہے۔ اماں اور تو اور وہ ہمارے ناشتہ کی روٹیاں بھی اخبار زمیندار میں یہ کہہ کر لپیٹ دینا کہ برتن کہیں بھول آؤ گے، تو گویا اس حساب سے ہوئے نا ہم گنوار آدمی؟

17 راگست کو بھائی محمد بشیر صاحب بی۔ کام لندن بار ایٹ لا آزیری مجسٹریٹ و میونسپل کمشنر کانپور کا ایک گورنمنٹی قسم کا خط ملا کہ جلد آیئے دار العلوم الٰہیات میں عید میلاد النبی کا مبارک و مسعود جلسہ ہو رہا ہے۔ بھائی بشیر ملک کے ان چند ممتاز نوجوانوں میں سے ایک ہیں جو ادب اردو اور مشاہیر اردو کے احترام و خدمت کو بہترین خدمت تصور کرتے ہیں اور ہم چونکہ ممدوح کے اس

ادب نواز اور علم دوست جذبہ کو سمجھتے ہیں اس لیے فوراً ہی تیار ہو گئے یہ اور بات ہے کہ ننھے میاں کی والدہ نے اس شان سے کانپور بھیجا تھا کہ ریل کے تھرڈ کلاس ہی میں خودکشی کا ارادہ ہو گیا تھا۔ بڑی شان سے تو کیا بس خاموشی سے ایک تنگ و تاریک ڈبہ میں بیٹھ گئے۔ غور کیجیے کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ تو ہم نے اپنی کمائی کے روپیہ سے خریدا تھا اور ہمارے سامان کو قاعدے سے رکھنے کا حکم دے رہے تھے تھرڈ کلاس کے دوسرے مسافر۔ تین بجے تک جو دوزانو ہو کر بیٹھے ہیں تو حرکت تک نہ کی۔ وہ تو یہ غنیمت ہے کہ ابھی گورنمنٹ نے تھرڈ کلاس کے مسافروں کو دوسرے مسافروں کے قتل کر دینے کی اجازت نہیں دی ہے ورنہ ہندستان بھر کی ریلوں کے تھرڈ کلاس میں سفر کرنے کا طریقہ یہ ہو جائے کہ ہر نیا سوار ہونے والا مسافر پہلے سے بیٹھے ہوئے مسافر کو قتل کر کے باہر پھینک دے اور خود اس کی جگہ بیٹھ جائے۔ اماں خدا کا قہر نازل ہو۔ یہ ہندستانی کونسلوں کے مکان پر کہ یہ بد بخت کبھی ریلوں کے تھرڈ کلاس مسافروں کی تکالیف پر کوئی سوال ہی نہیں کرتے اور پھر یہ برٹش ہندستان کی آبادی کو دیکھیے ایسے ارکان کو کونسل میں بھیجنے کے لیے کیسی پریشانیاں اٹھاتی ہے؟ ریلوں کے تھرڈ کلاسوں کی وہ دق اور دمہ پیدا کر دینے والی حالت اس زمانے میں جب ہندستانی خود کو سوراج لینے کے قابل ظاہر کر رہے ہیں اور ابھی کیا ہے ذرا موتی لال صاحب اور ان کے ساتھیوں کو کامیاب تو ہو جانے دو پھر دیکھیے گا جو ہر ہندستانی افسر کے مکان پر ایک ایک ریل نہ بندھی رہے تو ہمارا ذمہ۔ بس پھر ملا رموزی صاحب اونٹ پر سوار ہو کر کانپور جایا کریں گے اور ریلوں میں بیٹھے پھریں گے یہ لیڈر اور لیڈرنیاں بس ایسے ہی حالات دیکھ کر ریل والوں نے بھی یہ طریقہ ایجاد کر دیا ہے کہ ریل کو اسٹیشن پر اتنا بھی نہیں روکتے کہ تھرڈ کلاس مسافر سکون سے پانی تو پی سکیں۔ واللہ ایک اسٹیشن پر سکون سے وضو نہ کر سکے، ابھی تین کلیاں بھی پوری نہ ہوئی تھیں کہ ریل نے سیٹی دے دی۔ اب بغیر وضو ہی ڈبے میں واپس آئے تو اپنی جگہ پر تین نئے مسافروں کو یوں موجود پایا گویا ہماری جگہ ان کے باوا کی جائیداد تھی۔ اب یا تو ان لوگوں سے عظیم الشان دنگل لڑیئے یا کھڑے ہو جایئے۔ گال سے ہاتھ لگا کر، بس اس طرح آپ کے ادب اردو اور زبان اردو کے یہ لطافت نگار ادیب حضرت ملا رموزی صاحب کانپور میں اس وقت پہنچے جب صبح کی طلعت بارساعتوں میں بوڑھے، ضعیف، بیمار اور پنشن یافتہ مسلمان خدائے جلال و جمال کی بارگاہ میں

غلامی و بندگی کے لیے سر جھکاتے ہیں اور علی گڑھ کے نوجوانوں سے لے کر خدا کی دی ہوئی بے شمار دولت کے مالک عرف مسلمان تاجر لوگ، کونسل کے مسلمان اور اسلامی اخبارات کے ایڈیٹر گہری نیند سوتے ہیں۔

پلیٹ فارم پر برادر عزیز محمد بشیر صاحب کے پرائیویٹ حضرت عبدالکریم صاحب ولی مانگرولی اور ممدوح کے مشیر تجارت ڈاکٹر آرنسٹ موجود تھے۔ ہم نے کہیں غلطی سے ولی صاحب سے اتنا کہہ دیا کہ ہمیں نماز صبح پڑھنی ہے تو ممدوح نے ہمیں بڑے اعزاز کے ساتھ ایک قلی کے سپرد فرمادیا یہ کہہ کر کہ آپ کو اسٹیشن سے باہر والی مسجد میں پہنچادو۔ قلی مزدور چونکہ اسٹیشنی جغرافیہ کے پروفیسر ہوتے ہیں اس لیے قلی صاحب ہمیں ریل کی پُر پیچ پٹریوں سے یوں اچھالتے ہوئے لے چلے کہ اگر ایک آدھ انجن ادھر سے گزر جاتا تو یہ آپ کے ادیب شہیر ملا رموزی صاحب کسی پٹری پر دو ہوئے نظر آتے۔

نماز کے بعد ہمارا جلوس روانہ ہوا باوجود بارش اور صبح صادق کے سڑکوں پر رعایا کا خاصا ہجوم تھا، کہیں کہیں گنگا نہانے والے ننگ دھڑنگ ہندستانی یوں جا رہے تھے اور یوں جا رہی تھیں کہ ان کے ہر ہر عضو سے ہزاروں مطلع اور شعر پیدا ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے کانپور چمکدار اور روغنی سڑکوں پر جو نظر پڑی تو اندازہ یہ ہوا کہ برطانیہ کی حکومت نے کانپور کی رعایا سے ان سڑکوں کے لیے خوب خوب دام وصول کیے ہوں گے اور پھر دیکھنا لندن ٹائمز اخبار کسی دن اکڑ کر اعلان کردے گا کہ کانپور کی ساری رونق محض برطانیوں کے دم قدم سے ہے۔ چمکدار سڑکوں پر جب کانپور کے لاکھوں گندے اور قحط زدہ صورت مرد اور عورتیں نظر آتی تھیں تو کانپوری رعایا کی خوشحالی کا اندازہ بہ آسانی ہو جاتا تھا۔ انھی سڑکوں کے کنارے کانپوری تاجروں کی وہ کوٹھیاں ہیں جن کے اندر انگریز معاشرت کا وہ نقشہ جما ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندستانیوں کے سر سے پاؤں تک میں یورپ بس گیا ہے کہ اب نکالے نہیں نکل سکتا۔ ان کوٹھیوں میں دوا کے لیے بھی کوئی ہندستانی وضع کی چیز نہیں مل سکتی۔ فرش سے لے کر مسہریاں، کرسیاں، غسل خانے، موٹریں، تصویریں، برقی روشنی، برقی پنکھے، بون، لونڈر، صابن اور میونسپل بورڈ تک میں انگریزی سامان اس کثرت سے کہ ایک ایک کوٹھی ،دس دس لاکھ روپیہ انگریزی سوداگروں نے حاصل کیا ہوگا۔ اماں ان کانپوری سوداگروں کی کوٹھی

پر کتے تک یورپ کے پلے ہوئے ہیں۔ گویا ہندستانی کتے کو شب کے وقت بھونکنا بھی نہیں آتا۔ بس ساری تہذیب اور وفاداری یورپ ہی کے کتوں میں تو گھسی ہے؟ غرض کانپوری سوداگروں نے یوروپی معاشرت کو جس جوش سے اختیار کیا ہے اس کی آخری حد یہ ہے کہ کہ شب کے وقت یہ سوداگر صاحب اپنی کوٹھیوں میں گنجفہ تک یوروپی وضع کا کھیلتے ہیں اور اس نخرے سے کھیلتے ہیں گویا وائسرائے ہند کے اے۔ ڈی۔ سی اور جمہوریہ جرمنی کے صدر تو یہ غرض یورپ زدگی کی اس حد کو پہنچ کر بھی ان بھائیوں کی حالت یہ ہے کہ نہ کونسلوں میں جگہ نہ نوکری آسان، پھر یورپ کی اس معاشرت پر دولت برباد کرنے والے ہندستانیوں کی نظر میں ذلت اس درجہ کہ بے وقوف سمجھتے ہیں ملا رموزی کو اور تمدن ناشناس جانتے ہیں تو ملا رموزی کو۔

ہاں تو ان تماشوں سے گزرتے ہوئے پہنچے بشیر صاحب کی خدمت میں۔ بھائی بشیر نے جس گرمجوشی اور خلوص قلب سے معانقہ کیا اس کے اندازے سے یقین آیا کہ ابھی کانپور سے اسلامی اخلاق و تواضع کا جنازہ بالکل ہی نکل نہیں گیا ہے۔ بس یہی ہوا کہ تھوڑی دیر تک وہ ہمارے اندر جذب رہے اور ہم ان کے اندر۔ فوراً ہی چائے منگائی گئی اور چائے کے بعد مسلم حلیم ہائی اسکول کو روانہ ہوئے جہاں سرکار دو عالم اور مصلح اعظم احمد مصطفیٰؐ روحی فداہ کی تقریب ولادت کا مقدس و محترم جلسہ تھا۔ اس اسکول میں پہنچے تو خواہ مخواہ علی گڑھ کالج یونین سے کم نہیں۔ فرق یہ ہے کہ علی گڑھ میں برطانوی جھنڈیوں کو انگریزی عبارت کے مقولوں اور کتبوں سے کام لیا گیا ہے اور یہاں سب کچھ دیسی ہے یا مذہبی۔ کمرہ کے دونوں طرف حلیم لائبریری کی علوم و فنون کی نایاب کتابوں کی الماریاں ہیں، لکڑی کے اسٹیج پر قالین کا فرش اور حاضرین کے لیے دری کا فرش۔ مقررین میں مولوی سعید انصاری، ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ اور مولوی حافظ احمد اللہ خاص تھے۔ یا ملا رموزی۔ جلسے کے بعد اسکول کا معائنہ کرایا گیا جس کی وسعت، کشادگی اور پختگی کو دیکھ کر مسلمانوں کے محسن اور مخلص ہمدرد حضرت خان بہادر حافظ حاجی محمد مسلم صاحب آنریری مجسٹریٹ و تاجر اعظم کانپور کی اولوالعزمی اور ایثار کی عظمت دوبالا ہوگئی۔ صرف اس اسکول کی تعمیر کے لیے حافظ صاحب ممدوح کا ایک لاکھ روپیہ نقد دینا اس یورپ پرستی کے زمانہ میں جس قدر بھی قابلِ احترام ایثار کہا جائے کم ہے۔ اسی طرح دوسرے تاجران کا اس اسکول پر اپنا سب کچھ خرچ

کرتے رہنا بتا رہا ہے کہ اگر مسلمانوں کے سر سے ان کی حکومت کا سایہ اٹھ گیا تو ابھی ایسے مسلمان موجود ہیں جو بے کس اور بے ذریعہ مسلمانوں کی اولاد کو ذی علم اور ہنر مند بنانے کے لیے یوں تیار ہیں گویا قوم کے سارے بچے انھی کی اولاد ہیں۔ پھر بھائی بشیر کا بحیثیت ناظمِ اعلیٰ اس اسکول کی حیات و ترقی میں سرگرم رہنا ان نوجوان مسلمانوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو سوائے چائے اور تجارت کے نہیں جانتے کہ دوسرے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے۔

واپسی پر بھائی بشیر نے فرمایا کہ میرے ایک دوست حکیم مولوی سید اظہر حسین صاحب مدظلہ کو اس لیے ساتھ لیں کہ وہ ملا رموزی سے ملنے کے بڑے شائق ہیں۔ لفظ حکیم سے تو ہم بہت بدگمان ہوئے لیکن حکیم صاحب موصوف سے مل کر جو مسرت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ موصوف کے طبی تبحر، ادبی معلومات اور شعری مذاق کی بلند پائیگی کا اعتراف نہ کرنا حقیقت سے انکار کرنا ہے۔ خصوصیت سے وہ علم شعر کے بڑے بلند مرتبہ عالم ہیں۔ مجلسی مذاق اور اخلاق میں صرف اتنا پُرانا پن باقی ہے کہ آپ مضطر خیر آبادی مرحوم کے ''خط و کتابت فیلو'' رہ چکے ہیں۔

ممدوح کے گل بنفشہ، گاؤ زبان اور شربتِ نیلوفر کے حالات کو چھوڑ کر ان کے کوفتہ بخنتہ شعری حالات ہی کو سن لیجیے تو اس کا سلسلہ میر و داغ کی صحبتوں سے جاملتا ہے۔ مزاج کے ہر گوشے سے اسلامی، اخلاقی اور مشرقی آداب و خلوص کی گنگا جاری رہتی ہے۔ حکیموں کا لباس یوں بھی ہر وقت ''در آب تر کردہ و مالیدہ'' رہا کرتا ہے لیکن اس پر آپ میرے کا ئنر مہ اس کثرت سے لگاتے ہیں کہ آنکھوں کا غزالی پن تین دن تک بھی نہیں مٹ سکتا۔ شیروانی کے پورے بٹن لگانا آپ کے نزدیک حماقت ہے اور چھتری کو ہر حال میں سینہ سے لگائے رہنے کو بڑی قابلیت سمجھتے ہیں۔ دنیاوی دولت جو نہیں ملی ہے تو خلقِ حسن اور غیرت و خودداری کے وہ ''جوش دادہ زلال'' بنے رہتے ہیں کہ بات کی تاب نہیں۔ صحیح معنی میں دوستوں کے کام آنے والے مگر زیادہ رات گزرنے پر باہر آنے کو برا سمجھتے ہیں۔ طبِ یونانی میں آپ کے بعض نسخے ایسے لاجواب ہیں کہ یورپ بھی جواب سے عاجز۔

آج کا دن کانپور کی ادبی اور صحافتی دنیا کی میر کا تھا۔ موٹر تو خدا نے دلا دیا تھا بھائی بشیر کا پھر

ہماری اکڑفوں میں کمی کون سی تھی۔ بڑی شان سے پہنچے کانپور کے ہونہار اور مستعد ادیب حضرت مولوی حاجی سید ابومحمد ثاقب، ایڈیٹر ''نظارہ'' کے دولت خانہ پر۔ مولوی صاحب ممدوح کانپور کے ان نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی تربیت اور شہرت میں ملا رموزی کی طرح صرف خدا کا فضل و کرم تو شریک ہے اور کسی کا احسان نہیں۔ ممدوح محترم ہمارے ان عزیز از جان دوستوں میں سے ہیں جن سے ہم مکتبی اور استاد بھائی کا دلنواز رشتہ ہے۔ ہمیں دیکھ کر جس قدر خوش ہونا چاہیے تھا اس سے بھی کچھ سوا ہی خوش ہوئے۔ تھوڑی دیر میں آپ کے دست حضرت شیام کشور نور بھی تشریف لائے۔ یہ ہندو نوجوان ملک کے ان مخصوص انشا پردازوں میں سے ہیں جو ادب اردو اور زبانِ اردو کو اپنی مادری اور ملکی چیز اور وراثت سمجھتے ہیں اور ابتدائی عمر ہی سے افسانہ نگاری کو شغلِ زندگی بنا کر آج مستعد اہلِ قلم حضرات کی صفِ اول میں موجود ہیں۔ ملا رموزی سے بہت زیادہ محبت فرماتے ہیں۔ اور اگر کانپور میں ملا رموزی رہ جائیں تو حضرت ثاقب اور حضرت نورانہی کے پاس رہا کریں۔

برادرم ثاقب سے طے پایا تھا کہ وہ کانپور کی ادبی اور صحافتی دنیا کی سیر میں ساتھ رہیں گے۔ اس لیے سب سے پہلے ادب اردو کے دیرینہ خادم دیا نرائن نگم بی۔اے، ایڈیٹر اخبار ''آزاد'' اور رسالہ ''زمانہ'' کے گھر پہنچے۔ رسالہ ''زمانہ'' کانپور کا ملک کے ان علمی، ادبی اور سیاسی رسالوں میں شمار ہوتا ہے جو تعصب اور کوتاہ نظری سے بہت بلند رہ کر ملک و ملت اور علوم مشرقی کی گوناگوں خدمات انجام دے رہا ہے۔ حضرت دیا نرائن صاحب اطلاع پاتے ہی باہر تشریف لائے اور بے حد تپاک سے ملے۔ دفتر میں لے گئے، سگریٹ اور پان ہم لوگوں کو یوں اپنے ہاتھ سے نکال کر پیش کیے گویا وہ ان ڈبوں کو چھوت سے بچا رہے ہیں، اس لیے کہ یہی ڈبے پھر آپ نے ایک اور پنڈت صاحب کے سامنے بے تامل رکھ دیے۔ ہمارے مضامین اور کتابوں کے بڑے شائق ہیں۔ تمام کتابوں کے پتے لکھ کر رسالہ ''زمانہ'' کے لیے ہم سے مضمون کی فرمائش کی۔ معاوضہ کا سن کر فرمایا اچھا تو خط و کتابت کی جائے گی۔ مزاج میں انکسار اور تواضع کا رنگ خاصا ہے۔ ہم نے جب ممدوح کی ادبی خدمات کی داد دی تو اسی انکسار سے شکریہ ادا فرمایا اور باہر تک رخصت کرنے آئے اور اسی مصروفیت میں یہ بھول گئے کہ ملا رموزی صاحب کو رسالہ

''زمانہ'' کا کوئی پرچہ پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ ممکن ہے اب جاری فرمادیں۔ اب تنگ و تاریک گلی میں چلے جارہے تھے کہ ثاقب صاحب نے فرمایا یہ ہیں حضرت مولانا، پلٹ کر دیکھا تو ادب و حریت کا وہ آفتاب جلوہ فرما تھا جسے عرف عام میں مولانا حسرت موہانی کہتے ہیں۔ فوراً مصافحہ کیا۔ پہلا فقرہ ارشاد ہوا کہ'' آپ کے تذکرے سے تو کوئی اخبار خالی نہیں، اب آپ کو اپنا مستقل کام خود ہی کرنا چاہیے''۔ تو ہم نے سرمایہ نہ ہونے کی شکایت کی تو بہت افسردہ ہوئے اور دیر تک اپنے گراں پایہ خیالات سے مستفید فرماتے رہے۔ آخر میں اپنا اخبار ''مستقبل'' اور رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' مرحمت فرمایا اور اردوئے معلیٰ میں عنوان معائب سخن خصوصیت سے بتایا اور فرمایا کہ اس موضوع پر بڑی کاوش سے میں لکھ رہا ہوں اور آئندہ محاسنِ سخن کے موضوع پر لکھوں گا آپ ضرور پڑھیے گا۔ قبلہ حسرت موہانی کی سیاسی خدمات کے مقابل ادبی خدمات بھی اس درجہ وسیع اور گراں پایہ ہیں کہ ان کی تفصیل ایک مستقل تصنیف کی محتاج ہے۔ خصوصیت سے شعرِ اردو یا تغزل میں ان کا جو پایہ ہے اس نے مستعد شعرا کو ایک جاں نواز سلیقہ سکھایا ہے غزل گوئی کا۔ پھر ممدوح کے اخلاق اور زندگی میں جو سادگی موجود ہے اس کا تو جواب نہ ہوا ہے اور نہ ہو۔ حسرت بھی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ بی۔ اے پاس ہیں، لیڈر ہیں۔ ایڈیٹر ہیں مگر نہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں نہ کوٹھی میں رہتے ہیں۔ نہ عام مسلمانوں سے تپاک سے پیش آنے میں نخرہ کرتے ہیں نہ گفتگو میں متکبرانہ اختصار حالانکہ 95 فیصدی لیڈرس کا یہی حال ہے جن سے عام مسلمان مخاطب ہونے سے ڈرتے ہیں۔ مگر ایک حسرت موہانی کہ نمونہ بنے ہوئے ہیں اسلامی خلق و مساوات کا۔ خدا زندہ رکھے۔

یہاں سے اخبار ''صداقت'' کانپور کے دولت خانہ پر پہنچے۔ یہ اخبار کا دولت خانہ اس لیے کہ ابھی دفتر ''صداقت'' کی تعمیر جاری ہے۔ حضرت خواجہ عبدالسلام ایڈیٹر ہیں اور یہ ایک ہفتہ وار اخبار ہے جو بہترین ترتیب سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر ہمارے بھائی مولوی احسن سمبھی رحمۃ اللہ کے صحیح معنی کے قدرداں ہیں اس لیے اپنے اخبار کی پیشانی پر مرحوم کا یہ بصیرت افروز مطلع ہر اشاعت میں لکھا جاتا ہے:

جمال پر تو حق عزم مستقل میں رہے
زبان پر بھی وہی ہو جو تیرے دل میں رہے

خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بے حد مسرت کا اظہار فرمایا۔ صداقت کے ایک چھوڑ دو پرچے عطا فرمائے۔ ان پرچوں میں حضرت ثاقب کی ایک معرکتہ الآرا نعت ''آغوشِ آمنہ میں'' شائع ہوئی تھی اور حضرت فرحت بی۔ اے کی ایک نظم تھی جو ادیب محترم حضرت احسن سبھی رحمۃ اللہ کی جدائی پر لکھی گئی تھی۔ احسن کو اس طرح زندہ رکھنے پر خواجہ عبدالسلام اور حضرت فرحت۔ بی۔ اے کی جو عزت ہمارے دل میں پیدا ہوئی اسے اس ناقدردانی اور بے مروتی کے دور میں بھول نہیں سکتے۔ یہاں سے حضرت ثاقب نے اپنی علمی و ادبی خدمات کے مرکز یعنی اسلامیہ کتب خانہ عامہ کا رُخ کیا جو ممدوح محترم کی شبانہ روز کوششوں کا نتیجہ اور آپ کے ہمدرد معاونت کی جدوجہد کا ایک سبق آموز نمونہ ہے۔ جن لوگوں نے کانپور میں ہندو بھائیوں کی لائبریری اور کتب خانوں کو دیکھا ہے وہ اس بے بضاعت سے اسلامی کتب خانے کو دیکھ کر جس درجہ دل گرفتہ ہوں گے اس کا اندازہ مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے۔ یہ کتب خانہ کانپور کے چوک میں ایک شاندار عمارت میں واقع ہے۔ بے شمار کتابوں کی الماریاں بھی ہیں جو روزانہ مسلمانوں کے لیے مفید ثابت پیش کی جاتی ہیں۔ اکابرینِ ملک نے اس کے متعلق بہترین رائے کا اظہار فرمایا ہے مگر باوصف اس کے سارے کانپور میں مسلمانوں کی اس واحد اسلامی اور قومی لائبریری کا حال یہ ہے کہ آمدنی چار روپیہ ماہوار اور خرچ یک صد روپیہ نقد۔ اسلامی اخبارات کی یہ بے حرمتی کس درجہ تکلیف دہ ہے کہ وہ اپنے پرچے اس کتب خانے کو مفت جاری نہیں کرتے اور مالی سرپرستی کے لیے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کانپور میں کبھی مالدار اور غیور مسلمان اس طرف سے ہو کر بھی نہیں گزرے ورنہ اس کی سرپرستی ضرور فرماتے۔

اخبار ''البرید'' کانپور کے دفتر میں پہنچے اور حضرت مولوی فضل حسین صاحب مرادآبادی سے ملاقات کیا ہوئی گویا دو حقیقی بھائی آپس میں ملے۔ اخبار البرید کانپور ہی ہے جس نے ملا رموزی کی ابتدائی مضمون نگاری کے لیے اپنے صفحات کو بڑی محنت سے وار کھا۔ مولوی فضل حسین صاحب، ایڈیٹر اخبار البرید کانپور ایک نہایت کہنہ مشق اور فاضل ایڈیٹر ہیں اور ممدوح کے

اس عزمِ مستقل کا تو جواب نہیں کہ باوصف ہزاروں مصائب و مشکلات کے آج پندرہ سال سے اخبار کو جاری کیے ہوئے ہیں اور صوبہ جات متحدہ کے مسلمانوں کی جو خدمات اخبار البرید نے انجام دی ہیں حق یہ ہے کہ ان کا پایہ خاص اور امتیازی ہے۔ یہی وہ اخبار ہے جس کے مطالعہ سے اصولی اخبار بینی اور سنجیدہ رائے زنی کا سلیقہ ملتا ہے۔ مولوی صاحب ممدوح ہمارے بڑے قدر دان ہیں اور بے حد بڑے شفیق بزرگ الحمدللہ کہ صاحب فراغ اور مقدرت ہیں، ملتے ہی فرمایا کہ گاؤں پر چلیے شکار کے لیے۔ اسی موقع پر حضرت ممدوح کے برادر عزیز مولوی اشفاق حسین مرادآبادی ایڈیٹر اخبار ''رہنما'' مرادآباد تشریف لائے اور اس درجہ تپاک سے ملے کہ تمام بی۔ اے پاس مسلمانوں کے ملنے سے نفرت ہوگئی۔ اماں واقعہ تو یہ ہے کہ خلوص و ہمدردی اور اخلاق و تواضع تو کچھ وہ ہی جانتے ہیں جو علی گڑھ سے بچ گئے ہیں اور جنھیں اخبار پانیئر پڑھنا نہیں آتا۔

تو یہ ہے کہ کانپور کی علمی و ادبی اور اخباری دنیا۔ ان پرچوں کے سوا یہاں سے اخبار ''نظامِ عالم'' اور ''صدائے مسلم''، ''سفیرِ ہند'' اور ''شحنۂ شریعت'' بھی جاری ہیں جو عدیم الفرصتی کی وجہ سے معائنہ سے رہ گئے۔ اب سچ تو یہ ہے کہ کانپور کے اخبارات جس پست اور ادنیٰ حیثیت سے جاری ہیں اس سے یا تو اصولی اور باوقار اخبار نویسی بدنام ہوتی ہے یا مسلمانوں کا علمی اور اخباری ذوق ذلیل نظر آتا ہے۔ خدا جانے ان اخباروں کے جاری کرنے والوں کو کون سا مرض ستاتا ہے کہ یہ ایسے پست اور ادنیٰ اخبار جاری کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کاغذ دیکھیے تو لکھنوی کنکوے یاد آجائیں۔ سائز دیکھیے تو پنساری کی پڑیاں یاد آجائیں۔ لکھائی چھپائی دیکھیے تو دنگل کے اشتہارات یاد آجائیں۔ مضامین دیکھیے تو قصۂ حاتم طائی اور اندر سبھا امانت سے زیادہ وزن نہیں۔ پھر بھی انھیں اخبار کہہ کر عوام کی بدمذاقی اور ناقدرشناسی کا رونا روئے چلے جارہے ہیں۔ ایسے اخباروں کے ایڈیٹر صاحب ہونے سے یہ بہتر ہے کہ ملک اور قوم کی اصلاح پر کوئی مستقل مگر بے حد وقیع کتاب لکھ دیا کریں تاکہ مطبوعاتِ اردو ہی میں تصنیفی اضافہ ہوتا رہے۔

اخباروں کے بعد اگر عوام کانپور کے علمی و ادبی ذوق کا آخری اندازہ درکار ہو تو معلوم کیجیے

کہ کانپور میں ایک بھی ادبی انجمن نہیں نہ یہاں مسلمانوں کے دارالمطالعے ہیں نہ ادبی انجمنیں۔ جس شہر میں متمول اور امیر قسم کے مسلمانوں کی آبادی دوسری قوموں سے کہیں سوا ہو وہاں علم وادب کی یہ بے اعتنائی ان کی یورپ زدہ ذہنیت اور غلامی فطرت ذوق کو اس لیے ثابت کرتی ہے کہ ان کی تجارتی دنیا میں انگریزی زبان کا چلن خاصا ہے۔ آپ کانپور کی جس دکان پر چاہیں دیکھ لیں اس کے نام کا تختہ انگریزی زبان میں یوں لکھا ہوگا گویا لارڈ ارون وائسرائے ہند ہی تو ان کی دکان سے سودا سلف لینے آیا کرتے ہیں اور ان کی سہولت کے لیے کانپور کے تمام ہی سوداگروں نے اپنی دکانوں پر انگریزی زبان کے تختے لگا رکھے ہیں تو کیا برا کیا؟ وہ تو اچھا ہوا کہ یہ اورنگ آباد کی انجمن ترقی اردو مولوی عبدالحق کبھی کانپور نہ آئے ورنہ وہ یہاں سوداگروں کے ہاتھ اپنی ملکی اور مادری زبان اردو کی یہ درگت اور انگریزی زبان کی اس ترقی کو دیکھ کر مارے تاؤ کے ان تختیوں کو پولیس کے حوالے کر دیتے۔ اماں غضب خدا کا یہ کانپوری سوداگروں نے اپنی دکانوں کے خطوط تک میں اپنا پتہ انگریزی زبان میں چھپوا رکھا ہے۔ حالانکہ اکثر ایسے ہیں جنھیں عمر میں ایک آدھ دفعہ ہی کسی انگریزی کمپنی سے خط وکتابت کی نوبت حاصل ہوئی ہوگی، مگر ان کالج زدہ بھائیوں کو کون سمجھائے کہ اگر آپ لوگ زبانِ اردو ہی میں انگریزی کمپنی والوں سے خط وکتابت کریں تو وہ آپ کو ضرور جواب دیں گے۔ اس لیے کہ انگریز ہر حال میں اصول پسند ہوا کرتا ہے، تو یہ فائدہ ہوا زبانِ اردو کو ان ہائی اسکولوں اور کالجوں سے، پھر یہ تمام پانیئر زدہ ہندستانی جھنجھلاتے ہیں حضرت ملا رموزی صاحب پر کہ کیوں وہ ان کی یورپ پسندی کے خلاف کچھ لکھتے ہیں اور دیکھ لینا کہ ہمارے اس مضمون کو پڑھ لینے کے بعد یوں پٹک دیا جائے گا گویا اس میں کوئی کام کرنے کے قابل تو بات کہی ہی نہیں گئی۔

بھائی بشیر کی کوٹھی کیا تھی ملا رموزی کے لیے تو جنت اس لیے تھی کہ یہاں ننھے میاں کی والدہ کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ برقی پنکھوں اور لچک پیدا کرنے والی کرسیاں۔ مرغ کے کبابوں سے لے کر انگور اور چوڑی کا باجا تک موجود تھا۔ خدام اور موٹر کی موجودگی سے ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ اگر ہندستان کی جگہ یورپ کی قوموں کے لیے مضامین لکھتے تو آج خود ملا رموزی صاحب کی

ایک اوپر دس کوٹھیاں موجود ہوتیں، مگر بھائی بشیر کی اس راحت بخش کوٹھی میں بھی جب یہ خیال آتا تھا کہ ننھے میاں اور ان کی والدہ کے لیے کانپور کے تحفے کہاں سے جائیں تو معاملہ دگرگوں ہو جاتا تھا۔ اس کوٹھی کی سکوں بخشیوں پر حضرت محترمہ بیگم صاحبہ مدظلہا، حضرت برادر محترم بشیر صاحب اور برادر خورد حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کی تواضع اور حسن اخلاق ایک ایسی حیات آرا دولت تھی جو ملا رموزی کو دنیا جہان سے بیگانہ بنائے ہوئے تھی۔ باوصف علالت طبع ان دونوں عزیز از جان بھائیوں نے ملا رموزی کے ساتھ جس خلوص اور حسن کرم کو ہر لحظہ روا رکھا حق یہ ہے کہ اس کا شکر ادا نہ کرنا خالص ٹلاپن ہے۔ بھائی بشیر سے لے کر خاندان کے جملہ ارکان خصوصاً ممدوح کے برادرانِ گرامی نے ملا رموزی کی میزبانی میں جن پیار بھرے جذبات کو خرچ کیا وہ لکھنؤ کے تعلقہ داروں اور حیدرآباد کے جاگیرداروں کی دولت سے کہیں زیادہ ہیں کہ دولت بہرحال تھیٹر یا سینما میں نہیں تو ننھے میاں کی والدہ کے زیور پر خرچ ہو جاتی مگر یہ جذبات ملا رموزی کے دل میں یوں محفوظ رہیں گے کہ بس محفوظ رہیں گے اگر یہ دیکھیں کہ بھائی بشیر ادب اردو کے مشاہیر کے بہترین فوٹو بھی کھنچوا دیا کرتے ہیں اور انھیں رخصت ہوتے وقت بطریق یادگار بہترین قلم بھی عطا فرماتے ہیں تو خطرہ ہے کہ ہندستان کے تمام اہلِ قلم حضرات ان کی کوٹھی پر ٹوٹ پڑیں گے اس لیے آپ بھی سمجھ لیجیے کہ وہ کچھ نہیں دیتے اور بڑے بے مروّت ہیں۔ غرض ان تمام حالات کے ساتھ اگر ننھے میاں کی والدہ کے مہر وصول کرنے والے دعویٰ کا خطرہ نہ ہوتا تو شاید ہم عمر بھر اس کوٹھی سے اس لیے جدا نہ ہوتے کہ ایسی ہی فراغتیں تو درکار ہیں بے چارے ملا رموزی کو۔ دعا ہے کہ خدا بھائی بشیر کے دونوں بھائیوں کو صحت عاجل عطا فرمائے۔ ان تمام بھائیوں کے بھی شکر گزار ہیں جو ہمیں نصف شب کو اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے اور جن کے نام افسوس کہ ہمیں یاد نہیں ڈاکٹر آرنسٹ صاحب، حکیم اظہر حسین صاحب، بھائی بشیر صاحب، نواب صاحب اور عبدالجبار صاحب کے نام اس لیے نہیں لکھتے کہ دوسرے بھائی ناراض ہوں گے کہ ہمارے نام نہیں لکھے۔

بھائی بشیر صاحب کے کارخانۂ شکر سازی میں یہاں کے مخلص بھائیوں نے ہمیں جس خلوص اور پیار سے چائے کی دعوت دی اور جس کثرت سے اس میں مٹھائی اور فواکہ فراہم کیے اور

جس لطف سے ہمیں ستار سنایا، اس کے لیے آخر میں سراپا سپاس ودعا اس لیے ہیں کہ یہ قصہ ہمیں بعد میں یاد آیا۔ پھر بھی اتنا کہے دیتے ہیں کہ اس کارخانہ سے جو مسلمان شکر خریدے گا اسے جنت میں ایک محل موتیوں کا بنا ہوا اس لیے ملے گا کہ اس کی آمدنی سے مسلمانوں کے بچوں کی امداد کی جاتی ہے۔ لیجیے وہ فرما رہی ہیں کہ نماز بھی پڑھو گے یا نہیں۔ حالانکہ خود نماز کے ارکان تک سیکھ کر نہیں آئی ہیں۔ نماز کی عادت کا تو ذکر ہی کیا۔ تو ایسی ہوا کرتی ہیں ملا رموزیوں کی بیویاں۔

◆◆◆

طالب علم

طالب علم اصل میں نام ہے اُس بدنصیب، ستم زدہ اور مظلوم انسان زادے کا جو اپنی ماں کی حیات پرور گود سے لے کر اسکول اور استاد کی بے رحم توجہ پر چھوڑ دیا جائے۔ گو اسکول کے بعد اس کا نام ڈپٹی کلکٹر اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل تک ہو جاتا ہے مگر اس وقت کہ وہ دنیا کی بہترین اور مرغوب خواہشوں کو یوں ترک کر دے جیسے اپنے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے مریدوں نے تھیٹر کا تماشا دیکھنا ترک کر رکھا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ طالب علم دو چار کتابیں پڑھ کر اپنے خاندان کا چراغ مانا جاتا تھا اور اسے ہاتھی پر بٹھا کر تمام چوک میں گشت دیتے تھے اور پلاؤ پکاتے تھے۔

طالب علم کی دوسری تعریف یہ ہے کہ وہ طالب علمی کے بعد دنیا جہان کی امارت، ریاست، حکومت اور عزت و احترام کا مستحق ہوتا ہے اور دنیا کی ساری منزلتیں اسی کے لیے ختم ہوتی ہیں بشرطیکہ وہ خود کو کامیاب بنائے۔

طالب علم کی تیسری تعریف یہ ہے کہ وہ خاندان، قوم، ملک اور انسانوں کی بزرگی، آزادی، رہنمائی اور نجات کا سبب ہوتا ہے اس سبب سے کہ وہ اپنے عہد طالب علمی کو کامیابی اور ثبات قدم کے ساتھ گزار دے۔

طالب علم کی چوتھی تعریف یہ ہے کہ وہ خود کو صبر و استقامت، علم و جفاکشی، ایثار و محبت اور جد و جہد کے حوصلہ آزما مصائب سے آسانی کے ساتھ گزارے۔

پس ان حالات کے ساتھ آپ ہندستان میں غور کیجیے کہ طلبا کتنے اور غیر طلبا کتنے؟ ہمارے خیال میں طلبا کی جو قسمیں کہ ملک ہندستان میں نظر آتی ہیں ان میں:

قسم اول کا طالب علم وہ چھوٹا سا آدمی ہوتا ہے جس کے گلے میں کتابوں کا بستہ الجھادیا جاتا ہے اور گھر پر ''حافظ جی'' آکر اسے پڑھاتے ہیں۔ ایسے ننھے منے طلبا خواہ گھر پر پڑھیں خواہ حافظ جی کے مکتب میں جائیں روتے ضرور ہیں۔ جہاں پڑھنے کا وقت آیا اور انھوں نے رونا شروع کیا اور یہ روئے وہ روئے بس اب روئے اور دیکھنا کہ وہ روتے ہیں اور یہ لیجیے یہ رو پڑے تا آخر کار اور پھر یہی نہیں کہ فقط رونے لگے بلکہ وہ مکتب جانے سے پہلے والد صاحب اور اماں بی سے ایک عظیم الشان دنگل بھی لڑتے ہیں اور پھر بھی بغیر چھی اور چانٹوں کے مکتب نہیں جاتے اور لڈو کے لیے بے شمار پیسے وصول کیے بغیر تو دم نہیں لیتے۔ ایسے طالب علم کے سامنے تعلیم کا کوئی مقصد نہیں ہوتا صرف مصیبت سمجھ کر پڑھتا ہے۔ وہ مکتب میں پہنچ کر بھی روتا ہے اور بات بات پر ناک صاف کرنے، چھوٹا استنجا اور بڑا استنجا کرنے مکتب سے باہر جا کر یوں کھڑا رہتا ہے کہ جب تک حافظ جی کا دوسرا لڑکا اسے پکڑنے نہ جائے وہ مکتب میں واپس نہیں آتا اور واپس آ بھی گیا تو پڑھنے کی جگہ یا شرارت کرتا ہے یا روتا ہے۔ حافظ جی جتنا چاہتے ہیں اسے پیٹ لیتے ہیں اور کبھی کبھی اوندھا بھی لٹکا دیتے ہیں۔ ایسے طلبا مکتب جاتے ہوئے راستہ کی کسی تنگ و تاریک گلی میں ٹھہر جاتے ہیں۔ گولیاں، گلی ڈنڈا یا کوئی اور کھیل کھیلتے رہتے ہیں کہ مکتب کا پورا وقت اس کھیل کے نذر ہو جاتا ہے اور سیدھے اپنے گھر جا کر کہہ دیتے چھٹی ہو تو گئی یعنی پڑھ تو آئے۔

ان میں سے بعض ہوتے ہیں جو مکتب کا وقت باغات، تماشا گاہوں، نہروں، تالاب اور کنوئیں پر بھی گزار دیتے ہیں لیکن حافظ جی کے ہاتھ نہیں آتے اور انھیں میں کے بعض ہوتے ہیں جو ذرا جوان ہو کر بجائے بی۔ اے پاس ہونے کے یا پہلوان ہو جاتے ہیں یا غنڈے یا کسی تھیٹر کمپنی کے ایکٹر۔

قسم دوم کا طالب وہ ہوتا ہے جو اپنے باوا کے ڈپٹی کلکٹر ہونے کی وجہ سے گھر پر ماسٹر کو ملازم

رکھ کر پڑھتا ہے اور اس زمانہ کا ماسٹر تنخواہ پانے کی وجہ سے اُلٹا شاگرد کو اپنا استاد سمجھتا ہے۔ یہ ماسٹر تو پابندی سے حاضر ہوتا ہے مگر طالب علم غیر حاضر۔ ایسے طالب علم کو بید، چھڑی، دھول، ڈانٹ اور چانٹا مارنے کی سخت ممانعت ہے اسی لیے آج کل کے استاد اور شاگرد ایک طرح کے "یارِ غار" ہوا کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہی ماسٹر اس عمر کے طالب علم کو اپنے ساتھ تھیٹر کا تماشا بھی دکھانے لے جاتے ہیں اور بے وقوف ماں باپ کو اطمینان رہتا ہے کہ بچہ ماسٹر صاحب کے ساتھ ہی تو تماشا دیکھنے گیا ہے۔ اس قسم کا طالب علم اسی وقت سے بیڑی اور سگریٹ پینا شروع کر دیتا ہے۔ جیب میں ہر وقت سات نمبری بیڑی یا قینچی چھاپ سگریٹ موجود رہتا ہے یا موجود رہتی ہے۔ ان سگریٹوں کا صرف اکثر ماسٹر صاحب بصیغۂ راز برداشت کرتے ہیں کیونکہ مخنتی طالب علم سے آج کل کے ماسٹروں کو محبت ہو ہی جاتی ہے یا پھر یہ مصارف محلے کے غنڈے برداشت کرتے ہیں اور ماں باپ ان حالات سے بے خبر رہتے ہیں اور کبھی خبردار بھی ہو جاتے ہیں تو از راہِ بے شرمی ان حالات کی روک تھام نہیں کرتے۔

ایسا طالب علم تعلیم سے بے زار اور مذاق و تفریح کا بے حد شائق ہوتا ہے۔ ایسا طالب علم اکثر امیر خاندان کا ہوتا ہے اس لیے اسے لباس بہت خاصا فیشن ایبل ملتا ہے صرف خرچ سے تنگ رکھا جاتا ہے تو وہ بھی اس طرح خرچ حاصل کر لیتا ہے جس طرح اوپر بیان کیا گیا مگر والد صاحب اور بھائی صاحب اسی خیال میں مست رہتے ہیں کہ ہمارا بچہ بڑا صابر اور جفاکش ہے۔

قسم سوکا طالب علم وہ ہوتا ہے جو کسی نہ کسی طرح گلستاں بوستاں تک پڑھ پڑھا کر ملازمت تلاش کرتا ہے یا پھر گھر کا افلاس اور ماں باپ کی جہالت اسے تعلیم میں آگے نہیں بڑھنے دیتی اور ایسے طلبا کی تعداد ہندستان میں زیادہ ہے مگر اسی قسم کے طلبا میں سے بعض ہوتے ہیں جو اپنی خداداد ذہانت، جفاکشی، فطری صلاحیت اور قدرتی استعداد سے دنیا میں شبلی، سرسید اور ملا رموزی ایسے مشاہیر اور نامور لیڈر بن جاتے ہیں اور جن کی ذہنی تربیت محض فطرت کی غیر نمایاں قوت کرتی ہے، لیکن اسی قسم کا انگریزی طالب علم نہایت وسیع قسم کا طالب علم ہوتا ہے۔ اس وقت وہ پندرہ بیس سال کا ہوتا ہے یہ تعلیم کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا صرف اپنے چہرے اور بدن کی خوبصورتی بڑھانے کی فکر میں ڈوبا رہتا ہے اور اسی وجہ سے کبھی کبھی وہ امتحان میں پاس بھی کر دیا

جاتا ہے۔ چونکہ بعض ماسٹروں کے خیال میں تعلیم سے زیادہ مفید فیشن ایبل ضرورت بھی ہے۔ ایسا طالب علم غریبوں کا نہیں، بلکہ افسروں کا بیٹا ہوتا ہے جسے ہاکی، ٹینس، کرکٹ اور سینما کا شوق حد سے سوا ہوتا ہے۔ لباس اور جسم کے اندر جس قدر رنگینیاں دنیا میں ہو سکتی ہیں وہ جمع کرتا ہے۔ خصوصاً سر کے بالوں کی آرائش پر اس کے بے شمار لمحے صرف ہوتے ہیں اور ہاکی میچ کے دن تو وہ نزاکت، ملاحت اور صباحت کہ "بادِ بہاری" بن کر فیلڈ پر جاتا ہے۔ اسی لیے بے شمار تماشائی کھیل کی جگہ اسے دیکھا کرتے ہیں۔ ایسا طالب علم ہر سال فیل ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ اور اس کا ساتھی اسکول سے خارج بھی کر دیا جاتا ہے اور پھر کسی دوسرے اسکول میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسا طالب علم اکثر رات کے وقت بھی چوری سے گھر سے نکل آتا ہے اور تھیٹر یا سینما چلا جاتا ہے۔ ایسے طالب علم کی سرپرستی کے لیے آج کل ہر شخص تیار رہتا ہے اور طالب علم سے ہمدردی کرنا ویسے بھی نہایت محمود فعل ہے۔ اس طالب علم کا زیادہ وقت خطوط لکھنے میں صرف ہوتا ہے۔ یہ خط میں اپنے نام کے ساتھ بجائے مخلص یا کمترین کے ہمیشہ آپ کا فلاں لکھتا ہے۔ اس کے والد کی طرف سے اس کی نگرانی کی اہم تر ذمہ داری اسی کا خدمت گار کرتا ہے۔ یہی خدمت گار اسے اسکول چھوڑنے جاتا ہے اور یہی اسکول سے لینے جاتا ہے اور باوا صاحب بڑے مطمئن رہتے ہیں کہ نوکر تو ساتھ ہے، مگر یہی خدمت گار ہوتا ہے جو اس طالب علم کی بیڑی اور سگریٹ کا انتظام کرتا ہے۔ گھر پر اس طالب کا زیادہ وقت اسی خدمت گار کی کوٹھری یا کمرے میں گزرتا ہے اور وہ ہر بات میں اپنے خدمت گار کا محتاج ہوتا ہے اور یہی خدمت گار اس طالب علم کے راز کے خطوط اپنی صندوق میں رکھتا ہے اور والد صاحب کے پاس طالب علم کی ہر ضرورت کو یہی خدمت گار پہنچا کر طے کرتا ہے۔ کبھی کبھی یہی خدمت گار سینما اور تھیٹر کی اجازت بھی دلا دیتا ہے۔ بعض رشوت خور خدمت گار اس طالب علم کی ملاقات کسی اور سے بھی کرا دیتے ہیں۔ ایسے خدمت گار اس لیے شب کے بارہ تیرہ بجے تک دروازہ کھلے رہنے دیتے ہیں اور والد صاحب یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے ہی کمرے میں سو رہے ہیں۔ پھر ان حالات و اطوار کا طالب علم کہیں کا افسر ہو جاتا ہے تو اس سے ظلم و ستم، بے حیائی، بے شرمی اور بے مروتی کا ہر فعل سرزد ہوتا ہے۔ اور وہ نہیں شرماتا۔ ایسے طلبا بحساب 95 فیصدی فیل ہوتے ہیں۔

قسم چہارم کا طالب علم مذکورہ طالب علم سے صرف ذرا اونچا ہوتا ہے۔ حالات اور اطوار تو وہی صرف عمر میں قدرے اضافہ کے باعث معاملات اور واقعات میں تھوڑی سی سنجیدگی اور بردباری پیدا ہو جاتی ہے۔ علمی حیثیت سے یہ طالب علم آنکھوں چشمے اور پائنیر اخبار کے مطالعے تک ترقی کر جاتا ہے۔ اسکا پہلا کام اپنے ماں باپ کی اصلاح اور مشاہیر عالم پر اعتراضات ہوتا ہے۔ یہ دنیا میں کسی بڑے سے بڑے ماہرِ فن کو بھی خاطر میں نہیں لاتا، مگر اس مصلحانہ حیثیت میں بھی خرچ حاصل کرنے کے لیے کسی غنڈے سے تعلق ضرور ہوتا ہے اور اس طالب علم کا یہی وہ پہلا زینہ ہے جہاں سے طالب علم سائیکل پر سوار ہوتا ہے اور بغیر سائیکل کے وہ اسکول یا کالج نہیں جا سکتا۔ ایسا طالب علم شام کے وقت تفریح گاہوں میں یوں ٹہلتا نظر آتا ہے گویا دنیا جہان کی اصلاح کے لیے افلاطون ایک مرتبہ پھر اپنی قبر سے نکل رہا ہے اور جو ایسا طالب علم اخبار ''زمیندار'' یا رسالہ ''سفینہ'' کی اردو زبان کے چند الفاظ سیکھ لے تب تو اپنے مولانا محمد علی اور شوکت علی اور پنڈت موتی لال نہرو کی بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ انھیں میں سے بعض ہوتے ہیں جو کسی اخبار کے ایڈیٹر بھی ہو جاتے ہیں اور ایسے ہی ایڈیٹروں کی وجہ سے موجودہ صحافت اردو میں پختگی، متانت اور اصابت رائے اور مصلحانہ تدبیر و خطاب کی جگہ گالیاں اور بازاری پن زیادہ نظر آتا ہے یا پھر اس قسم کا طالب علم عراق عرب میں برطانیہ کا ہیڈ کلرک ہو جاتا ہے اور بس مذہب اور احکام مذہب سے یہ جنازہ کی نماز تک سے واقف نہیں ہوتا اسی لیے اس کے مزاج میں غیرت اور خودداری کا کوئی ادنیٰ جذبہ بھی نہیں ہوتا۔ شیکسپیر، ملٹن اور ابوالکلام آزاد کے پچاس ساٹھ جملوں کو رٹ لیتا ہے اور شام کے وقت کسی کمپنی باغ میں بیٹھ کر دنیا جہان پر تنقید کرتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ کے کم فہم طلبا پر اس کی تقریر کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے مگر ملا رموزی صاحب ایسے طالب علم کو لونڈے سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ایسا طالب علم در پردہ اپنے خدمت گار یا غنڈوں کا قرضدار رہتا ہے۔ ایسا طالب علم بھی سر کے بالوں کو بہت محنت سے آراستہ رکھتا ہے اور سفر کے وقت انگریزوں کی ٹوپی ضرور لگاتا ہے۔ اس سے بڑے مولوی صاحب بہت نفرت کرتے ہیں اور اس کے ''مقدمہ'' میں گواہی دینے سے شرماتے ہیں۔ ایسے طلبا میں بے غیرتی، بے شرمی اور بے حیائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور ایسے ہی طلبا سے موجودہ نسل اور نوجوان جماعت ذلیل ہو رہی

ہے۔

قسم پنجم۔اس طالب علم کا صحیح معیار قائم کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ از روئے طب یونانی اس عمر کا طالب علم عمل کے قابل ہوتا ہے تعلیم کے قابل نہیں۔مگر ہندستان میں اس عمر کا طالب علم بی۔اے میں پڑھتا ہے اور اسی لیے کہا جاتا ہے اور والد ماجد کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ:

''آپ کا غلام آج کل بی۔اے میں پڑھ رہا ہے، کامیابی کی دعا کیجیے کہ خدا پاس کردے۔''

گویا بی۔اے کی تعلیم میں بھی (نعوذ باللہ) خدا اور رسول کی خوشنودی ہے جو خدا سے دعا کرائی جاتی ہے۔غرض بی۔اے کے طالب علم کا 95 فیصدی مقصد ملازمت ہوتا ہے۔مگر بی۔اے قسم کے طلبا کی چند اقسام ہیں ان میں سے پہلی قسم کا طالب وہ ہوتا ہے جو لندن سے بی۔اے پاس کرکے آئے یا وہیں کسی میم کے ساتھ رہ جائے۔جس وقت یہ لندن سے بی۔اے پاس کرکے ہندستان آتا ہے تو اس کے خیالات ذیل کی چیزوں میں بند ہوتے ہیں:

بے پردگی، لاطینی حروف میں اردو لکھنا، کرکٹ، ٹینس، اخبار میں اخبار پانیئر، لباس میں لباس انگریزی لباس، مونچھوں میں مونچھیں صفا چٹ مونچھیں، ماں باپ سے نفرت، کتے سے محبت۔ایسا طالب علم اگر کسی جگہ افسر ہوجائے تو یہ تمام ماتحت ہم وطنوں کو بجائے زبان کے اجلاس پر گھنٹی سے بلاتا ہے کھانے پینے اور سونے جاگنے میں تمام اصول یورپ کے استعمال کرتا ہے اسی لیے پچاس سال کے اندر اندر مر جاتا ہے اور جنازے میں صرف ماتحت لوگ شریک ہوتے ہیں اور محلے والے (الحمدللہ) کہہ کر چپ ہوجاتے ہیں۔

افغانی طالب علم۔اس قسم کے طالب علم کی تعریف کرتے وقت خواہ مخواہ منطق سے بحث کرنا پڑتا ہے مثلاً جس انسان کے جسم پر دس بارہ تھان کپڑا لپٹا ہو وہ افغانی طالب علم کہا جاسکتا ہے یا جو انسان دس بارہ کپڑوں میں خود لپٹ جائے اسے افغانی طالب علم کہہ سکتے ہیں، مگر ہمارے نزدیک اصلی افغانی طالب علم وہ ہے جو افغانستان سے سیدھا کسی پرانے عربی کے مدرسہ میں جاکر داخل ہوجائے اور ہندستان کے بے شمار اسکولوں اور کالجوں کو دھیان میں بھی نہ لائے۔اس طالب علم کی ذہنی صلاحیت، بیداری اور روشن خیالی کا اندازہ کرنا ہو تو بچہ سقا کے حامیوں کو دیکھ لو،

اس کی طالب علمانہ جدوجہد کے لوازم یہ ہیں۔ سفید تر کی چادر، جامع مسجد کی سیڑھیاں، مسجد کا حجرہ، محلے کی روٹی، جمعرات کو دعوت، جمعہ کو غسل، ساری رات کا مطالعہ اور جنازہ کی امامت، شام کے وقت یہ کسی کمپنی باغ میں لیٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی اردو زبان حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے مطب میں بھی درست نہیں ہوتی اور یہ سندھ اور سرحد کے اس طرف چلا جاتا ہے پھر معلوم نہیں وہاں کیا کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں امان اللہ خاں کی مخالفت ہی کرتا ہوگا۔ ان میں کا ایک خمیرہ گاؤزبان، عناب، سپستاں اور شربت بنفشہ کی تعلیم پاتا ہے اور اسی لیے اسے افغانستان میں بھی کانگریس اور لیگ بنانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ البتہ کچھ دن سے چند افغانی طلبا اسلامیہ کالجوں میں بھی داخل ہو رہے ہیں اور انھی میں کے ہو سکتے ہیں جو تعلیم کے مقصد کو سمجھ کر تعلیم پائیں۔ باقی ہے وہ افغانی طلبا جو جدید تعلیم سے مزین ہو کر نکلے ہیں تو ان کے لیے افغانی سقوں بچوں نے عمل کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں۔

خاص طالب علم وہ ہوتا ہے جو انٹرنس پاس کر کے شادی بھی کر لیتا ہے اور ملازمت بھی مگر تعلیم حاصل کیے جاتا ہے اور باز نہیں آتا۔ اس کا مقصد بھی علوم کا حصول نہیں بلکہ تنخواہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے طالب علم ابتدائی مدارس میں ''ماسٹر صاحب'' بن جاتے ہیں اور بی۔اے کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ گھر کے افلاس اور اپنے ننھے میاں کی والدہ کی فضول خرچیوں سے تنگ آ کر ''ٹیوشن'' بھی کرتے ہیں، عرف گھروں پر جا کر لڑکے پڑھاتے ہیں اور انھی کے گھروں پر جا کر پڑھانے نے ہندستان میں استادوں کی عزت دو کوڑی کی کر دی ہے۔ پھر بھی ایسا طالب علم پڑھے جاتا ہے۔ اسکول کے بعد اگر اس نے کبھی گھر میں کتاب کو ہاتھ لگایا تو اس کے ننھے کی اماں نے کہا:

پھر تم نے کتاب شروع کی؟

تو میں بیٹھی رہوں؟

تو تم ہی کہو گے کہ ترکاری بے مزا ہے۔

ارے وہ تیل منگا رہی ہوں تیل۔

تو ننھے کو بھی لیتے جاؤ۔

وہ دیگچی پکانے نہیں دیتا اور تم کہتے ہو کہ میں ابھی آتا ہوں۔

تو کیا میں اسے سکھا دیتی ہوں؟

اونہہ دیکھوتو وہ خود بخود تو تمھاری طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے۔

کیا پہلے؟ پہلے پکا لیتی تو وہ چاول پڑے رہ جاتے نا؟

اور خود کہہ رہے تھے کہ اس وقت پڑھ رہا ہوں مجھ سے بات نہ کرو۔

سنو سنو۔

کیا خاک سنوں وہی تمھارے ملا رموزی صاحب آواز دے رہے ہیں۔

بس اب خدا حافظ ہے دیکھیں ملا رموزی صاحب سے اب انھیں فرصت کب ملے۔

اچھے ملا رموزی ہیں ایک گھڑی بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔

تم کیا جانتی ہو ملا رموزی صاحب کو؟ بے چارے میرے حال پر کرم فرماتے ہیں جو چلے آتے ہیں ورنہ ان کی تو صورت دیکھنے کو لوگ ترستے ہیں۔

ترستے ہوں گے؟

ہاں تم بے چاری گھر کی بیٹھنے والی کیا جانو ملا رموزی صاحب کو؟

بہت اچھا حاضر ہوا ملا صاحب!

بس ذرا ٹھہریے ابھی حاضر ہوا۔

ہاں تو ڈھائی آنے تک کی لوکی اور وہ سوا آنے کی کیا چیز منگا رہی ہو؟

تمھاری گڑ بڑ میں میں بھی تو بھول گئی۔

وہ تو اب تمھارا دل لگا ہوا ہے ملا رموزی صاحب میں۔

اچھا تو جانے دو مگر دیکھو وہ رحیمن کو میرے پاس بھیجتے جانا۔

لاحول ولا میرے ساتھ ملا صاحب ہوں گے اور میں رحیمن کے گھر بھی جاؤں۔

تو یہ میلی ٹوپی تو ننھے کو نہ پہناؤ۔

تو ذرا خود ہی دوسرے دالان میں دیکھ لو۔

اچھا اچھا تم تو خدا کے لیے باہر جاؤ۔

اور سنو تو، ارے سنا؟

میں نے کہا کہ کب تک آؤ گے؟

اچھا چھا... بہت اچھا، بس آیا ملا صاحب

کیوں نہیں... میں... کروں گی۔

یہ چند نمونے ہیں ہندستان کے طلبا کے۔ صحیح نہیں کہ تمام طلبا ایسے ہی ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ کثرت ایسے ہی طلبا کی ہے۔ پس اگر ایسے طلبا دنیا کی کسی قوم کے لیے باعثِ زوال و ذلت ہو سکتے ہیں تو آیئے سب سے پہلے ہندستانی طلبا کی اخلاقی اصلاح کی تدابیر اختیار کیجیے لیکن اس کے لیے کسی زبردست ''کانفرنس'' یا کسی آل انڈیا کی ضرورت نہیں صرف اسکول کے ماسٹروں اور کالج کے پروفیسروں کی اصلاح مقدم ہیں کیونکہ طلبا میں ''نسوانی'' اور ''یورپی ذہنیت'' پیدا کرنے والے یہی فیشن زدہ اور اپنی قومی عصبیت سے بے بہرہ ماسٹر اور پروفیسر ہیں اور جب تک ان لوگوں میں ''خالص ہندستانی قومیت'' پیدا نہ ہوگی اس وقت تک ہندستان سے کوئی ایسی جماعت پیدا نہیں ہو سکتی جسے صحیح معنی میں تعلیم یافتہ جماعت کہا جائے اور یہ جو آج کل تعلیم یافتہ لوگ کہے جاتے ہیں یہ تو ہیں فقط ''انگریزی یافتہ'' اور اس کا بہتر ثبوت ان کی اخلاقی ذلت ہے ورنہ تعلیم کبھی ایسے اخلاق کی محرک نہیں۔

آئندہ جو رائے عالی ہو بواپسی مطلع فرمایئے، جواب کا انتظار رہے گا۔ تمام خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام۔

◆◆◆

دست بدست

سو ہزار مصیبتوں کی ایک مصیبت غلامی اور اس کے بعد غلام ماحول کی تعلیم و تربیت ہوا کرتی ہے۔ مقہور و زوال یافتہ اقوام کی بے شمار علامتوں میں سے ایک علامت اس کے افراد کی ''ذہنی فضولی'' بے اعتدالی یا غیر ذمہ دارانہ اعمال ہیں اور اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کو زندگی کے جس حصہ میں چاہو دیکھو وہ موجود ملے گی۔

مذہب جو آج تک بہ اتفاقِ عام و خاص ایک برتر از قیاس و گمان احترام و تقبیل کی چیز مانا گیا ہے، مگر مسلمانانِ ہند اور ہندوؤں نے اس کی ذمہ داری کو مسجد کے سامنے باجے کی حرکت اور گائے بیل کی حفاظت تک محسوس کیا ہے اور بس۔

تجارت میں اگر کوئی ذمہ داری محسوس کی گئی ہے تو صرف اس قدر کہ ملا رموزی صاحب کو ہر چار آنے کی چیز بارہ آنے میں فروخت کی جائے اور بس۔

تعلیم میں اگر ذمہ داری کا احساس ہے تو بوٹ سوٹ بورڈنگ میں نوجوانوں کا نسوانی بناؤ سنگھار یا پھر ہاکی فٹ بال اور کرکٹ کی ''ٹورنامنٹ بازی'' اور بس۔

سیاست میں نہرو رپورٹ کا جھگڑا، اسمبلی میں بم کے گولے، گورنمنٹ سیدھی کو وجہ شہرت و ترقی اور وائسرائے کے ساتھ چائے نوشی کو ذریعہ اول یا وفد کے ساتھ یورپ گھوم آنے

کو ذریعہ آخر قرار دینا اور بس۔

صحافت میں دوسرے تمام ایڈیٹرس کو گالیاں، اعتذار، پریس کے لیے چندہ کی اپیل اور ہندو مسلم فسادات کے جذبات کی ترجمانی اور بس۔

شاعری میں از خود ''شاعر اعظم'' بن کر گوہر جان اور منی جان کے کلب کی تصاویر پر نظمیں لکھنا یا امیروں کے قصیدے لکھنا اور جو زیادہ بڑھنا تو دو چار اشعار میں ''ہائے قوم اور وائے قوم'' لکھ دینا اور بس۔

مضمون نگاری میں عشقیہ فسانے لکھنا اور تالیف و تصنیف میں فقط ملٹن اور ٹیگور کی غیر مانوس کتابوں کے ترجمہ لکھنا اور بس۔

پس یہ سب کچھ اثر ہے تعلیم و تربیت کے ہندستانی ٹھیکیداروں کی ''نیم یورپ زدہ ذہنیت اور صحبت کا'' بھلا وہ ماسٹر اور پروفیسر ہندستانیوں میں کیا خاک اصولِ ذہنیت، قومیت اور ذمہ دارانہ احساس کی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں جو خود دوسری اقوام کے عادات و خصائل اور اطوار و کردار کو اپنے قومی آداب و اصول پر ترجیح دینے ہی کو اپنی قابلیت سمجھتے ہوں اور جو اخبار زمیندار کے مقابل اخبار پائنیر کو اور رسالہ عالم گیر کے مقابل انگریزی ناولوں اور انگریزی رسالہ ''ماڈرن ریویو'' کو آنکھوں پر دھرتے ہیں۔ اماں اور تو اور یہ جب بچہ کو شروع ہی سے خود ماسٹر صاحب بھرے جلسہ میں سیٹی بجا کر ہاکی اور فٹ بال کھلاتے ہوں تو ان کی تعلیمات و ارشادات کا اس بچہ پر کیا خاک اثر ہوگا۔

پس ان حالات کے جو تباہ کن اثرات ہندستانیوں کے ہر حصۂ زندگی پر پڑ رہے ہیں ان میں ایک حصہ ''بنی'' بھی ہے۔ آپ بنی سے مراد ناک نہ لے لیں بلکہ یہ وہ بنی ہے جسے اخبار رسالے اور کتب خانے کے ساتھ ملا کر اخبار بنی، رسالہ بنی یا کتب بنی کہتے ہیں۔ اب اگر ہندستانیوں کی اخبار بنی یا رسالہ بنی کی تفصیلات پر کچھ لکھا جائے تو وہی دس وہام بیس جلدیں تیار ہو جائیں گی اس لیے آپ آج فقط ان کی ''رسالہ بنی'' ملاحظہ فرما لیجیے تا کہ سند رہے۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم نے کوئی تین چوک بارہ مرتبہ لکھا ہے کہ ہم اخبارات اور رسائل کے آمد و خرچ کے حساب سے ایک طرح کا ''صدر ڈاک خانہ'' ہیں اللہ میاں کا فضل ہی کہیے کہ

ہندستان کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا اخبار اور رسالہ نہیں جو' بخدمت شریف ملا رموزی صاحب' نہ آتا ہو اور اب جو کچھ دن سے یہ ''بغرض اظہار رائے'' کی ہوا چلی ہے تو اس نے تمام چراغوں کا رُخ ہماری طرف پھیر دیا ہے اور الحمدللہ کہ ایک ہفتہ کی ردّی کے دام روپیہ سوا روپیہ ہوتے ہیں، ہم نے ان پرچوں کے محفوظ رکھنے کی کوشش کبھی جو نہ کی سو کسی تجارتی غرض سے نہیں بلکہ اس لیے کہ انسانی ارتقا اور ترقی کے طبعی اثر سے ہمارے شہر میں بھی اخبار بینی اور رسالہ بینی کافی زور اختیار کر چکی ہے جس کی تفصیل ہی آج کا مضمون ہے یعنی شروع ماہ جون 1929 میں رسالہ ''عالم گیر'' لاہور کا سالانہ نمبر آب و تاب سے شائع ہو گیا اس طرح کہ دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک سب کے پاس یہ پہنچ گیا۔ اخباروں میں اس خاص نمبر کے اشتہارات شائع ہو گئے اور ''ریویو'' بھی لکھ دیے گئے۔ ڈاک خانے والوں نے جس قدر پرچے چاہے چرا بھی لیے مگر یہ سالانہ نمبر آیا تو ہمارے پاس، اور ہمیں چونکہ ''مضمون بازی'' سے فرصت نہ ملی اس لیے ہم نے ایڈیٹر صاحب سالانہ نمبر کو بھی نہ لکھا کہ ''بھیج دو'' مگر چارپائی پر لیٹے لیٹے بولیں کہ کیوں جی یہ ''عالمگیر'' تمھارے پاس ابھی تک نہیں آیا؟ یہ ''زمیندار'' میں تو لکھا ہے کہ عالمگیر چھپ گیا، ان کے لفظ'' کیوں جی' پر آگ ہی لگ گئی اور ہم نے جھنجھلا کر ٹالنے کے لیے کہا آ جائے گا۔ تو پھر بولیں کس قدر دلیل کے ساتھ بولیں کہ اور جو سب کا سب بک گیا تو؟ اس پر بھی ہم نے چاہا کہ وہ کسی طرح خاموش ہو جائیں کیوں اس وقت ہم تھے مصروف لکھ پڑھ۔ مگر وہ چپ کیوں ہوتیں بولیں اور پھر دلیل کے ساتھ بولیں کہ اس وقت لکھ بھی رہے ہو، ایک کارڈ اسے بھی لکھ دو گے تو کیا برا ہے؟ ظاہر ہے کہ اب سلامتی اسی بات میں تھی کہ کارڈ لکھ دیتے۔ ادھر یہ بھی خیال تھا کہ ابھی نام خدا ان رسالوں سے شوق تازہ بہ تازہ ہے کہیں اسے ٹھیس نہ لگ جائے ورنہ کودن ہی رہ جائیں گی۔ لہٰذا ایڈیٹر صاحب عالمگیر کو فوراً لکھا کہ اب تک کیوں نہیں بھیجا۔ خیر تو اب بھیج دیجیے۔ عالمگیر کے دفتر میں جہاں بھول جانے والے لوگ موجود ہیں وہاں یاددہانی پر چندہ بھیج دینے والے لوگ بھی جمع ہیں اس لیے کارڈ پہنچتے ہی عالمگیر کا سالانہ نمبر بذریعہ رجسٹری اپنی پوری زیبائشوں کے ساتھ بذریعہ رجسٹری ہمیں عین دوپہر کے وقت یوں ملا کہ ڈاکیے صاحب نے کمرہ کے دروازہ پر اپنی ڈاک کا تھیلا اس زور سے دے مارا کہ ہم دوپہر کی میٹھی نیند سے نیم بیدار سے ہو گئے اور اب وہ چیخا کہ ''مولی ساب یہ رجسٹری لینا'' آنکھیں ملتے

ہوئے، سینہ کھجاتے ہوئے اور چکر کھاتے ہوئے دروازہ پر پہنچے تو دستخط کے لیے ڈاکیے نے پھر قلم لینے گھر میں واپس بھیجا۔ قلم لاکر دستخط کیے تو تاریخ لکھنے تک روشنائی ختم ہوگئی تو پھر روشنائی کے لیے میز کی دوات تک گئے اور پھر دروازہ پر آکر تاریخ لکھی تب کہیں 'عالمگیر' کا سالانہ نمبر ملا تو اب وہ میٹھی نیند غائب، شفاخانے کے مریضوں کی طرح پلنگ پر دوبارہ ہاتھ پاؤں مار کر نیند کو بلانا چاہا مگر وہ نہ آئی تو سالانہ نمبر کے اوراق کو الٹنا شروع کیا۔ کہیں کہیں سے کچھ پڑھا بھی کہ نیند آ گئی۔ اب کوئی شام کے پانچ بجے یا کوئی ساڑھے پانچ بجے اٹھے تو دیکھا کہ وہ بیٹھی عالمگیر کی تصویریں دیکھ رہی ہیں، بس اُن کے اس ذوق کو غنیمت سمجھ کر خود کو ان کی طرف سے یوں غافل بنالیا گویا ہم نے انھیں تو دیکھ لیا مگر یہ نہیں دیکھا کہ وہ ''عالمگیر'' کی تصویریں دیکھ رہی ہیں۔

نمازِ عصر اور چائے سے فارغ ہوکر لکھنے پڑھنے والے کمرہ میں جاکر بیٹھے تو خود ہی عالمگیر لاکر سامنے پٹک دیا۔ اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ پیش تھا کہ عالمگیر کے اس نظر آرا سالانہ نمبر پر کوئی رائے لکھیں؟ لیکن رائے لکھیں تو پہلے اس کے 192 صفحات کی ایک ایک سطر پر انگلی رکھ کر اسے پڑھیں اور جو معاملہ صرف ''سرسری'' پر اٹھا رکھیں تو پھر ہم خود اُس غیر ذمہ داری کے مجرم قرار پائیں گے جس پر یہ مضمون لکھا جانے والا تھا اس لیے سالانہ نمبر کی ایک ایک سطر پڑھنے کی ٹھانی ہی تھی کہ آواز آئی اور بس:

میں حاضر ہوسکتا ہوں؟

تشریف لائیے۔

السلام علیکم

مزاجِ اقدس

کہیے کیا ہو رہا ہے؟

اماں لاحول ولا یہ بھی کوئی مضمون نگاری کا وقت ہے؟

تم تو ہوگئے ہو پاگل۔

بھئی تو آخر یہ دن رات کی مضمون نگاری کچھ تمھیں خدا سے بخشوا دے گی؟

کہاں؟ بس یہی عجائب خانے کے باغ تک

تو چلو پھر اٹھو نا

یہ کیا؟ اچھا عالمگیر کا سالانہ نمبر ہے۔

اچھا تو بھئی مُلّا اسے ذرا ہم لے جاتے ہیں۔

نہیں نہیں، واللہ کل واپس کر دیں گے۔

ہاں ہاں صبح ہی صبح۔

یہ ہمارے ایک دوست تھے جو ابھی نئی روشنی میں آنکھیں کھول رہے ہیں اور ہم بھی چاہتے ہیں کہ یہ اتنے دلچسپ تو ہو جائیں کہ ان سے مل کر کبھی ہم خوش ہو لیا کریں۔ واضح ہو کہ ان کا دولت خانہ ہمارے غریب خانے سے پورے تین میل دور ہے، عالمگیر تو گیا اور ہم دوسرے مضامین میں مصروف ہو گئے کہ ایڈیٹر صاحب عالمگیر کا دوسرا خط آیا کہ اور وہ مضمون؟ دسرے دن مذکورہ بالا دوست تشریف لائے تو ہم نے بغیر سلام ہی کے عرض کیا۔

اور وہ ''عالمگیر''؟

استغفر اللہ اماں وہ ایسا بھی کیا کوئی سونے کی چڑیا ہے جو خیریت نہ خیروعافیت، عالمگیر، عالمگیر، بڑا عالمگیر۔

چلو چلو کل بھیج دوں گا وہ تو رات کو آدھے کے قریب دیکھ بھی لیا۔ اب دوسرے دن موصوف خود ہی غائب ہو گئے تو تنگ آ کر تیسرے دن ہم خود ان کے دولت خانے پر حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ حضرت گھر میں تشریف نہیں رکھتے اس لیے آج کا ہمارا سفر اور وقت بے کار ہو گیا۔ چوتھے دن ہم نے وقت کی پھر قربانی کی اور پہنچے تو موصوف ملے، بڑی خاطر سے کمرہ کے اندر بٹھایا، پان اور سگریٹ لائے، اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئی تھیں کہ موصوف کے بڑے بھائی صاحب بھی تشریف لائے اور صورت دیکھتے ہی فرمایا:

اخاہ مُلّا رموزی صاحب ہیں۔

بھئی واللہ تم تو عید کا چاند ہو گئے۔

کہو اچھے تو ہو؟

اماں کہاں رہتے ہو؟

بھئی مجھے تو واللہ دفتر سے ایک منٹ کی فرصت نہیں اور بھئی دفتر سے آنے کے بعد تو خود تم جانتے ہو کہ بازار تک جانا بھی قیامت ہو جاتا ہے۔

اچھا خیر آپ یہ تو کہو کہ وہ امان اللہ خاں کا کیا ہوا۔ اماں یہ مردود بچہ سقہ بھی عجیب نکلا۔ میاں تم نے تو اخبار پڑھنے کی حد ہی کر دی ہے۔ مگر تو مانو یا نہ مانو ہمارا تجربہ بھی یہی ہے کہ یہ سب خبریں گپ ہیں یہ کمبخت اخبار والے پیسہ کمانے کے لیے ایسی ہی اُڑایا کرتے ہیں۔

قریب تھا کہ سیاست کے ایسے ہی نادر فیصلے صادر فرماتے ہوئے مسٹر میکڈانلڈ کی وزارت اور جمعیۃ الاقوام کے وجود سے بھی انکار کر دیتے کہ ہم نے بات کاٹ کر چھوٹے بھائی سے کہا کہ:

''لایئے تو وہ عالمگیر، بڑا ضروری کام ہے اب جا رہے ہیں'' کہ فوراً ہی سیاست داں بھائی بولے:

بھئی ملا صاحب قصور معاف 'عالمگیر' تو ابھی نہ دیں گے کیونکہ اس میں ہیں بھئی قصے بہت عمدہ اور ابھی میں نے یوں نہیں دیکھا کہ چھوٹے میاں ابھی اسے دیکھ رہے تھے بس پرسوں انشاء اللہ میں پہنچا دوں گا۔

یہاں سے 'عالمگیر' دست بدست کے رتبہ پر پہنچا اور ہم واپس آ گئے۔ اب بڑے بھائی کی ''پرسوں'' بھی یوں پوری ہوئی کہ تیسرے دن ہم پھر خود ہی حاضر ہوئے تو چھوٹے بھائی عالمگیر لائے تو مگر اس طرح کے بڑے انکسار سے فرمایا کہ ملا صاحب اگر آپ اجازت دیں تو میں صفحہ اول کی تصویر لے لوں یہ مجھے بہت پسند ہے اور ویسے بھی آپ کو تو تصویر سے کوئی دلچسپی بھی نہیں۔ مشرقی دوستی کا تقاضا تھا کہ عرض کر دیں کہ تصویر حاضر ہے۔ وہی ہوا کہ موصوف نے ہمارے ہی سامنے بغیر بسم اللہ اللہ اکبر کہے تصویر کو عالمگیر سے یوں نوچ لیا کہ پورا صفحہ اول اکھڑ گیا اور جلد کا تاگا ٹوٹ گیا، مگر اس نقصان پر بھی خوش تھے کہ 'عالمگیر' تو مل گیا۔ گھر لا کر میز پر رکھا اور پڑھتے پڑھتے چھوڑ کر چلے گئے، نوکری پر واپس آئے تو راستہ ہی سے ایک دوست ساتھ ہو لیے یہ کہہ کر کہ:

''اماں تم تو ملتے ہی نہیں، چلو آج تمھارے ہی گھر چائے پئیں گے۔''

ہم تو گئے انھیں بٹھا کر اندر اور انھوں نے اس عالمگیر پر قبضہ جما لیا۔ اندر سے جو ہم آئے تو دیکھا کہ عالمگیر کو یوں پڑھ رہے ہیں گویا وہ براہ راست انھی کے پاس آیا ہے۔ کچھ بھی نہ کہا، چائے

پلائی ایک گھنٹہ تک گپ ہوتی رہی۔ اب جو رخصت ہونے لگے تو فرمایا:

''میں عالمگیر لے جاتا ہوں''۔

تو ہم نے مسلسل تین چار قسمیں کھا کر عرض کیا کہ بڑی مشکل سے ابھی آٹھ دن کے بعد ہمیں ملا ہے اور یہ دیکھو یہ اس کے ایڈیٹر کے خطوط پر خطوط چلے آرہے ہیں۔ ہمیں کل تک رائے دینے کا اور موقعہ دے دو پھر تم اسے ہمیشہ کے لیے لے جانا، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ واضح ہو کہ یہ ہمارے ایک ایسے دوست ہیں جن سے کوئی پانچ اوپر دس برس سے دوستی اور دشمنی برابر سے چلی آرہی ہے۔ دوستی کے ساتھ یہ دشمنی اس لیے کہ وہ بھی ہماری طرح کے فوجداری کے وکیل ہیں اور کبھی استدلال، استشہاد، استناد، مذاکرے، مقابلے اور مباہلے تک سے نہیں چوکتے۔ بس ہمارا اتنا عرض کرنا تھا کہ فوراً ہی تو اتر آئے فوجداری پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عالمگیر پر قابض ہو گئے۔ پھر یہی نہیں کہ وہ عالمگیر ہی لے گئے بلکہ ہمیں بھی اپنے ساتھ دھر لیا اور دور تک وہ آپ کی مشایعت میں یوں گئے گویا عالمگیر لے جانے پر بھی ہم ان سے بے حد خوش تھے۔ جو ان کے ہمراہ گپ فرماتے ہوئے چلے جارہے تھے، اب یہاں عالمگیر دست بدست کے دوسرے درجہ میں داخل ہو گیا اور نہ فقط عالمگیر ہی گیا بلکہ وہ مضمون کا سارا وقت بھی غارت ہو گیا۔ نہایت معتبر ذرائع سے بعد میں معلوم ہوا کہ ممدوح جو عالمگیر کو لے کر گئے تو راستہ ہی میں وہ اپنے ایک دوست کے ہاں بھی کچھ دیر ٹھہرے جس کو ان سے سب کچھ چھین لینے کے ''ادبی حقوق'' حاصل تھے لہٰذا دو دن تک عالمگیر اسی دوست کے گھر رہا اور تیسرے دن وہ ممدوح کے دولت خانے پر پہنچا تو ہم خود سمجھ گئے کہ اب دو دن تک ان سے طلب کرنا اپنی ہی حماقت تو ہو سکتی ہے ان کی نہیں۔ لہٰذا پورے چار دن کے بعد خود ہی ان کے دولت خانے پر پہنچے اور عالمگیر کا تقاضا کیا تو فرمایا۔

استغفر اللہ ــــ عمر بھر میں اگر آپ کا ایک رسالہ لے آیا تو قرض خواہ کی طرح سر پر سوار ہو۔ اور ہزار بار ایسا ہوا ہوگا کہ تم میری کتابیں لے گئے ہو گے مگر میں نے کبھی منہ سے ایک حرف بھی نہ کہا۔

اس 'ہزار لے گئے ہو گے' کے فقرہ پر ویسے بھی از روئے ریاضی ہمیں کچھ کہنے کا حق باقی نہیں رہا تھا مگر کچھ جو کہہ دیا تو فرمایا اور کس قدر معقول فرمایا کہ:

بہتر ہے تو کل وہ پرچہ آپ کو مل جائے گا۔

آ کر لے جایئے گا کیونکہ اس وقت تو اس کا پتہ نہیں ہے، شاید وہ وحید نے کہیں رکھ دیا ہوگا۔

خیر سے وحید صاحب کو بھی ایک چھوڑ دو ایسے صاحبزادے مل گئے ہیں جو ہم سے تو خاصے اکڑ لیتے ہیں مگر ہمارے مضمون والے پرچے کے مطالعہ سے بھی چوکتے نہیں۔ اس لیے سمجھ لیا کہ بس گیا عالمگیر، مگر وہ تو کہیے کہ ہم ذرا عملی آدمی واقع ہوئے ہیں اس لیے پہنچ گئے پھر ان کے گھر۔ معلوم ہوا کہ ابھی باہر گئے ہیں اور چونکہ ہندستانی خاندانوں میں صرف ایک آدمی تمام خاندان کا کفیل اور سرپرست ہوا کرتا ہے، لہٰذا جب کفیل ہی گھر پر نہ ہو تو پھر ہمیں ''عالمگیر'' کون دے سکتا ہے۔ استغفراللہ وغیرہ پڑھتے ہوئے پھر واپس آ گئے اور پھر دوسرے دن پہنچے تو صورت دیکھتے ہی فرمایا اور کوتوالی کے لہجہ میں فرمایا کہ:

جی ہاں وہی عالمگیر کے لیے آیا ہوں۔

ہاں تو میں نے معلوم کر لیا وہ فلاں صاحب لے گئے ہیں کل میں ان سے منگا لوں گا اور آپ لے جایئے گا۔

پھر بھی حاضری ہمارے ذمہ رکھی گئی۔ موصوف کو چونکہ خدا نے لیڈری کی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے اس لیے گھر پر قوم کا خاصا مجمع رہتا ہے اور وہ بھی رات میں، اس لیے کہ قہر درویش بر جانِ درویش پہنچے جناب رات کے نو بجے جلسے کے ہر رکن کو ملا رموزی صاحب کے آنے کی بے حد خوشی ہوئی، اس لیے اس خوشی میں جب رات کے گیارہ بجے تو ہم نے عالمگیر کا سوال پیش کیا تو جو صاحب موصوف الصدر دوست سے لے گئے تھے ایک جمائی ملی ہوئی انگڑائی لے کر بولے

ہاں ملا صاحب وہ آپ کا ''عالمگیر'' میں لے گیا ہوں کل انشاءاللہ ضرور حاضر کر دوں گا۔

یہاں تاب کسے تھی اس لیے ہم نے عرض کیا کہ اگر جناب اجازت دیں تو ہم یہاں سے آپ ہی کے دولت خانے چلیں تو آپ ہمیں پرچہ دے دیں، بیچ ہی سے بول اٹھے:

اماں پرچہ کیا ہو گیا ہے بلائے جاں ہو گئی، بھلا یہ بھی کوئی پرچہ مانگنے کا وقت ہے؟ چلو تم تو یہ سنو۔

یہ صاحب کیا فرما رہے ہیں۔

دوسرے صاحب بولے۔ بس جناب جو میں دہلی کے اسٹیشن پر اترا تو یہ ہوا اور وہ ہوا۔

ہم نے بھی یہ بے اصولی دیکھ کر عالمگیر ہی کو لے لیا اور وہ تقاضے شروع کیے وہ تقاضے شروع کیے کہ تقریباً تمام محفل بول اٹھی کہ اچھا تو آپ اسی وقت ان کے گھر سے جا کر پرچہ لے لو۔ اور بھئی دیکھو اب تو ملا صاحب سے پرچہ لائے ہو لیکن اگر ان کے پاس سرخاب کا پر بھی ہو تو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔ بس بس ملا صاحب بس جایئے جایئے اور پرچہ لے لیجیے۔ یہ گویا پرچہ طلب کرنے پر محفل کے آوازے اور پھبتیاں تھیں جو ہم نے نیچی گردن کر کے سن لیں مگر عالمگیر کے تقاضے سے چوکے نہیں تو بھائی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے مگر یہ کہتے ہوئے کہ ملا صاحب آپ گھر تو چل رہے ہیں مگر اس وقت گھر میں سب سو گئے ہوں گے خدا ہی ہے جو عالمگیر اس وقت مل سکے کیونکہ وہ لونڈے نے مجھ سے لے لیا تھا اور اب وہ پڑا سو رہا ہوگا اور سو رہی ہوں گی تو پھر صبح پر نہ رکھیے؟ تو ہم نے بھی کہہ دیا جی نہیں۔ اسی وقت۔ اسی سنٹ اور اسی سیکنڈ ہی پر رکھیے تو قدرے تاؤ کے ساتھ بھائی صاحب ہمراہ ہو لیے اور ہم گرہ سے ''شب تاب'' عرف ''سرچ لائٹ'' خرچ کرتے ہوئے بھائی صاحب کی گندی اور بدبودار گلیوں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے کوئی تہجد کی نماز سے دو گھنٹہ پہلے پہنچے۔ راستہ میں جو بے تک باتیں ہوتی جاتی تھیں اس میں کبھی کبھی پولیس والوں کی ''کون'' بری طرح حائل تھی مگر وہ تو کہیے کہ ہمارے پاس شب تاب تھی اس لیے کوتوالی جانے سے محفوظ رہے ورنہ عالمگیر کے صدقہ میں یہ بھی ہو رہتا تو مضائقہ ہی کون سا تھا کیونکہ دوستوں کی بے اصولی اور غیر ذمہ داری نے تو سب سامان فراہم ہی کر دیے تھے۔ اماں اگر روشنی پاس نہ ہوتی تو تم ہی کہو کہ یہ پولیس والے صبح ضمانت لینے سے پہلے گھر کب جانے دیتے خاص کر ہمارے ہمراہی اکثر مشکوک اور مشتبہ قسم کے ہوا ہی کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ یوں سمجھ لیجیے کہ عالمگیر کا سالانہ نمبر اس طرح دست بدست دوستوں میں کیا گھوما تھا۔ اصل میں ہمیں کوتوالی پہنچانے والا تھا اور صاحب خدا کسی کو رات کے وقت کبھی کوتوالی لے ہی نہ جائے کیونکہ عام طور پر کوتوالیوں کے مچھر اور سانپ، بچھو مشہور ہیں۔ ادھر ہماری حیثیت عرفی تیس کم سو روپیہ سے زیادہ نہیں۔ بارے خدا کا شکر ہے کہ ہم گیارہ دن کے بعد عالمگیر کو دیکھنے کے قابل یوں ہوئے کہ کوئی ایک بجے گھر پہنچے تو کہیں کے رئیس

اور صدر بلد یہ تو تھے نہیں جو دروازہ پر سپاہی، چپراسی یا خدام ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے اور اسی لیے تو یہ دفاتر کے ملازمین بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ ملا صاحب مضمون نگاری اور چیز ہے اور دفتر کا کام اور ہے۔ گویا ایک مضمون نگار میں فقط روٹی کھانے اور سو جانے ہی کی صلاحیت ہوا کرتی ہے اور بس۔ ہاں تو اب ایک بجے شب کے گھر پہنچے تو نام خدا وہ تو سو رہی تھیں، جوانی کی نیند اس لیے جو جناب نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا ہے تو تقریباً محلے کے کوئی پانچ دس آدمی اپنی اپنی چار پائی سے گردنیں اٹھا اٹھا کر سن رہے ہوں گے مگر نہیں سنا تو ننھے میاں کی والدہ نے۔ تنگ آ کر دروازہ کے اندر ہاتھ ڈال کر چاہا کہ کنڈی کھول لیں تو خدا کا شکر ہے کہ ہاتھ ڈالا تو یوں پھنس گیا کہ نہ باہر آتا نہ اندر جاتا تھا اور اب ہاتھ کی رگوں کا یہ حال کہ بس برا حال۔ اب یہی اور رہ گیا تھا کہ ہم دوسرے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹ لیتے کہ اندر سے ایک مری ہوئی سی آواز آئی کہ کون ہے؟

اس پر ہم نے جو جواب دیا بس ان کا بھی دل ہی جانتا ہوگا، مگر اتنا ضرور ہوا کہ دروازہ پر آ گئیں آخر کو جناب شوہر پھر شوہر ہی ہوتا ہے، لاکھ وہ رات کے ایک بجے آئے یا دن کے تیرہ بجے۔ پس اندر جاتے ہی واللہ بات تک نہ کی اور عالمگیر کو رکھ لیمپ کے سامنے جو پڑھنا شروع کیا تو آدھے سے زیادہ پڑھ ڈالا۔ اس وقت سالانہ نمبر کی صفائی اور رعنائی کا یہ عالم تھا کہ اس دست بدست گردش سے صفحہ اول مل ملا کر ہو گیا تھا کوئی تین آنے گز والا ململ، پیشانی پر کسی کے گھر کی سیاہی کے نشان بنے ہوئے تھے تو کسی غزل کے کسی شعر پر کسی دوست نے کوئی اعتراض لکھ دیا تھا، کسی نظم کے اشعار پر پسندیدگی کے صاد بنے ہوئے تھے اور کوئی تصویر سرے سے ندارد تھی تو کہیں پان کے سرخ نشانات نے صفحات کی سفیدی کو تباہ کر دیا تھا اور جلد کی ترتیب سے تو ایک ورق بھی اپنی جگہ پر درست نہ تھا۔ جس طرح ہو سکا اسے پڑھ لیا اور آج تیرہ دن کے بعد یہ رائے لکھنے بیٹھے ہیں۔

یہ ہے وہ دست بدستہ عنایت کا نتیجہ۔ تو یہ حالت ہے ان کی جو خود کو دوست، مہذب، تعلیم یافتہ، روشن خیال، بیدار مغز، شاعر، اہلِ قلم، اخبار نویس اور خدا جانے کیا کیا سمجھے ہوئے دن رات گزارتے ہیں تو پھر کم علم طبقہ میں اخبار بینی اور رسالہ بینی کا جو حال ہوگا یا ہو سکتا ہے اس کا اندازہ اب بہت آسان ہے۔ اسی لیے تو اب تک طلسم ہوشربا اور گوہر جان کی ٹھمری والی کتابوں سے لوگوں کی دلچسپی باقی ہے اور پھر ہیں کہ سائمن کمیشن صاحب سے کہتے ہیں کہ 'گو بیک' اماں پہلے اپنی جماعتی

حالت کوتو ذمہ داری کی حیثیت دو جس جماعت میں وقت اور ذمہ داری کا کوئی احساس نہ ہو، جو عہد و پیان اور وقت کے پابند نہ ہوں وہ دنیا میں امان اللہ ہو کر بھی بچہ سقہ سے بدل جایا کرتے ہیں۔

زبانِ اردو کے اس دور میں جب کہ وہ علم وادب، سیاست وتجارت اور بین الاقوامی لحاظ سے شباب پا رہی ہے اور ایسا شباب جو اسے ان ادیبوں کے دور میں بھی نصیب نہ ہوا تھا جن کی سوانح عمریوں اور جن کی انشا پردازی پر آج کل کے چند تہی مغز رسالے مضامین کے مقابلے شائع کر کے فرسودہ انسانوں سے عہدِ حاضر کے ناظرین کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ پھر زبانِ اردو آج جب کہ محض اپنی وسعت اور بین الاقوامی صلاحیت کے باعث ہندستان سے مٹائی بھی جارہی ہے ایسے رسالوں کا جاری ہونا جیسا کہ رسالہ عالمگیر یا اس کا سالانہ نمبر بابت ماہ جون 1929 ہے از بس کہ مفید وضروری ہے۔ یہ سالانہ نمبر جس طرح نظری اعتبار سے بے حد دل آویز اور دل کشا ہے معنوی لحاظ سے بھی اتنا ہی بلند ہے۔ اس کے مضامین، تصاویر، طباعت جدولیں، نقش ونگار کاغذ کی صفائی، مضبوطی اور چھپائی کا حسن غرض ہر چیز اس درجہ دلکش ہے کہ یہ سالانہ نمبر کسی ایک خریدار کے پاس دوستوں سے محفوظ ہی نہیں رہ سکتا۔ وہ جو علی گڑھ والے کہا کرتے ہیں کہ زبانِ انگریزی میں جیسے بلند رسالے شائع ہوتے ہیں دنیا کی کسی زبان میں شائع ہو ہی نہیں سکتے تو کوئی ان ملکی چیزوں سے نفرت کر کے غلام ذہنیت اختیار کرنے والوں کو "عالمگیر" کا یہ سالانہ نمبر دکھادے تو بس اعتراض کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ جائے گا اور اسی دن سے عالمگیر کے سالانہ خریدار ہو کر رہ جائیں گے۔ بڑی چیز رسالے کے مضامین میں تنوع اور مضامین کی کثرت ہے۔ سو اس لحاظ سے عالمگیر کے سالانہ نمبر کے صفحات مضامین کی تعداد 192 ہے اور اس سے زیادہ صفحات کسی طلسم ہوشربا کے تو ہو سکتے ہیں مگر اردو کے رسالے کے نہیں۔ پھر مضامین پر علمی، اثری، ادبی، تاریخی اور تحریری تصاویر، بلند مقصد نظموں، شائستہ مذاق غزلوں اور تخیلی تصویروں پر تخیلی نظموں کا اضافہ ایک ایسا دلفریب حسن ہے جو رسالے کے مضامین کی خشکی کو یوں دور کر دیتا ہے جس طرح اپنے ہاں کے عربی داں حضرات سے خدا نے ظرافت اور لطافت پسندی کے ملکہ کو چھین لیا ہے۔ تصویری تنوع کا یہ عالم ہے کہ انتہائی بڑھاپے کے نمونہ میں جہاں حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب العجیب

تصویر دی گئی ہے وہاں کم عمری کی تمام لطافتیں میاں سید احمد اللہ قادری طول عمرہ کی تصویر میں فراہم نظر آتی ہیں۔ مضامین میں جو حق تحقیق ادا کیا ہے وہ فقط دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر جس قدر بلند رکھار کھا گیا ہے اس میں حضرت حکیم عمر خیام کو ایک ایسی دنیائے شباب و جمال کے ساتھ شراب پیتا دکھایا گیا ہے جسے عرف عام میں ''عورت ذات'' کہتے ہیں۔ حقیقت میں خیال و گمان کی جو نزاکتیں اس تصویر میں جمع کی گئی ہیں اس میں دنیا کی شاعری ختم ہو جائے تو غلط نہیں۔ کاش اس تصویر کی فراختیں بغیر شراب ہی کے اگر اپنے ملا رموزی صاحب کو مل جائیں تو پھر ملا رموزی صاحب بھی ثابت ہی کر دیں کہ دنیا میں فقط ایک ہی عمر خیام کو پیدا ہونے کا حق نہیں تھا، مگر یہاں اپنے ملا رموزی صاحب ننھے میاں کی جس جاہل اور تاریک تربیت والی والدہ میں بند کر دیے گئے ہیں اس کا جواب بھی ساری صنف لطیف پیش کرنے سے قاصر ہے۔

چند مشاہیر کی قلمی تحریروں کے عکس کو چھاپ کر ''عالمگیر'' نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ زبان اردو میں ہر قسم کی ترقی پذیر اہلیت کو دکھانے کے لیے روپیہ کی کافی مقدار بھی قربان کرتا ہے۔ عام اس سے کہ اس بلند پایہ پرچے کی ساری کاپیاں خریدی جائیں یا بے دماغ ہندستانی قصۂ گل و بکاؤلی اور اخبار پانیئر ہی خریدتے رہیں۔ سب سے آخر خوبی یہ ہے کہ اس کے صفحۂ اول پر افغانی ٹوپی کے متعلق ہماری رائے درج ہے اور اندر ایک تازہ مضمون ہے جو ہر گھر کے طالب علم اور اس کے باوا کے پڑھنے کے قابل ہے۔ پس بر بنائے حالات مذکورہ ہم ''عالمگیر'' کے ایڈیٹر صاحب کو کوئی مشورہ دے سکتے ہیں تو فقط یہ کہ آئندہ آپ رسالہ میں ہندو بھائیوں کے مضامین بھی شائع فرمانے کی کوشش کیجیے۔ یہ سب کچھ اس لیے لکھا کہ اخبارات اردو میں چونکہ اپنی ذمہ داری کے احساس کا وہی فقدان موجود ہے جو ہمارے مذکورہ بالا دوستوں میں پایا گیا، اس لیے امید نہیں تھی کہ یہ اخبار ایسے جلیل العظمت رسالوں کا خیر مقدم کریں گے پھر عالمگیر ایسا جمیل پرچہ تو اخباروں کے دفتر میں کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

پس اگر ان تمام خوبیوں کے اعتبار پر ہندستانیوں نے اس رسالہ کو مبلغ ایک روپیہ میں خرید لیا تو ہم مان لیں گے کہ وہ سوراج بھی لے سکتے ہیں۔ فقط۔

◆◆◆

عید کے بعد

عید کے ایک معنی تو یہ ہیں ''خوشی'' مثلاً علی گڑھ والوں کی عید کہتے ہیں اُسے کہ کوئی علی گڑھ کی ٹیم کے میچ میں یا ٹورنامنٹ جیت جائے اس طرح کہ کپ بھی اسے مل جائے۔ عام طلبا کی عید ہوتی ہے اسکول کی چھٹی۔ لیڈروں کی عید ہوتی ہے جب کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی قوم سے غداری کر کے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر بن جائیں یا بن جانے کے قریب پہنچ جائیں یا انھیں امید ہو جائے کہ آئندہ سال وہ ضرور صدر بن جائیں۔ بڑے مولوی صاحب کی عید ہوتی ہے اس دن جب انھیں محلّے کے کسی امیر آدمی کے ہاں سے ماحضر تناول فرمانے کا اذن آجائے۔ دفتری ملازموں کی عید ہوتی ہے جب کہ ان کی تنخواہ میں اضافہ ہو جائے۔ تانگے والوں کی عید ہوتی ہے جب کہ انھیں ایک کے اوپر ایک ہو کر بیٹھنے والی سواریاں اتنی تعداد میں مل جائیں کہ گھوڑے کا سانس اُکھڑ جائے۔ قلی مزدوروں اور موٹر لاری کے ڈرائیوروں کے لیے مسافروں کی کثرت۔ رئیسوں کے لیے ان کے گھوڑ دوڑ میں ان کے گھوڑے کا سب سے آگے آجانا۔ مالکانِ رسائل کے لیے ان کے ''عید نمبر'' کا بالکل فروخت ہو جانا۔

ہم نے عید نمبر کے لیے عنوان رکھا ہے ''عید کے بعد'' تا کہ اس میں جو کچھ لکھیں وہ ایسا ہو کہ عید کے اول بھی کام آئے اور عید کے بعد بھی۔

پس واضح ہو کہ عید کے بعد کہتے ہیں اُس وقت کو جب عیدگاہ میں امام صاحب نماز کے خاتمہ پر بائیں طرف منہ کر کے کہیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور اب مسلمانوں کے وہ تمام خیالات بدلنا شروع ہو جاتے ہیں کہ جو سارے رمضان شریف میں ان کے دماغوں میں آنے والی عید کے لیے بھرے رہتے ہیں۔ بس سلام کے بعد جو دعا مانگی جاتی ہے اسی دعا میں 95 فیصدی مسلمان کہتے ہوں گے کہ ''اللہ میاں یہ رمضان اور عید کا قرض جلد ادا کر دینا'' کیونکہ تو ہر حالت میں غالب و قادر خدا ہے۔ گو کہنے کو عیدگاہ سے معانقے جوشیلے مصافحے اور پرمسرت سلام اور مبارکباد کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں مگر کتنے مسلمان ہوتے ہیں جو عیدگاہ ہی سے اپنے بچوں سے کہنا شروع کر دیتے ہیں:

ابے دیکھ مردود شیروانی پر داغ لگ گیا۔

تو ذرا سنبھال کر پہن۔

تو وہ بقر عید پر اب ایک اور نئی شیروانی کہاں سے لاؤں گا؟

لاحول ولا ارے بیٹے ذرا دیکھو تو اپنی قمیص کا یہ دامن تھوک سے خراب کر لیا تم نے۔

تھوکو تھوکو پان اگر ایسے ہی پان کھاؤ گے تو پھر ہم تو بنا چکے اتنی قمیضیں تمھاری۔

استغفر اللہ اور وہ جو ابھی عیدگاہ میں میں نے تمھیں اٹھنّی دی تھی وہ آخر کہاں کھو دی۔

تو نالائق تو نے مجھ سے وہیں کیوں نہ کہا۔

ابے کب کوئی تیرا خادم بیٹھا ہے وہاں جو تیری اٹھنّی اٹھالائے گا اور دے دے گا تجھے کہ لو میاں یہ آپ کی اٹھنّی۔

تجھے کیا خبر کہ پیسہ کس طرح کماتے ہیں۔

چلو چلو بس لے لی مٹھائی۔ یہاں تو فقط اب یہ چار آنے پڑے ہیں جیب میں اور ابھی گھر میں خدا جانے کیا ضرورت پیش آ جائے؟

تو بس اتنے کھلونے کافی ہیں۔ کیا کھلونوں کو کھاؤ گے جو یہ گاڑی بھر کھلونے خرید رہے ہو؟

کوئی تین دن بھی عید کے بعد نہیں گزرتے ہوں گے کہ غریبوں کے گھروں میں عید کے کپڑے تہہ کر کے صندوقوں میں بند کر دیے جاتے ہیں اور ہر گھر میں قرض کے ادا کرنے کی ترکیبیں سوچی جانے لگتی ہیں اور وہ تمام قالین، کرسیاں، میزیں، آئینے اور گدے تکیے سنبھال کر

رکھ دیے جاتے ہیں جو عید کی نمائش کے لیے بڑے اہتمام سے لائے جاتے ہیں اور لگائے جاتے ہیں۔

مجاہد عبدالہادی انصاری ہمارے اُن دوستوں میں سے ایک ہیں جنھیں جہد و جہاد اور مذہب و احکام مذہب سے وہ غازیانہ شیفتگی ہے جو کبھی عہد سعادت یا عہدِ حکومت اسلامی کے دور میں مسلمانوں میں دیکھی اور سنی گئی ہے اور اسی غازیانہ جذبہ کی نسبت سے ان کا نام بھی مجاہد عبدالہادی واقع ہوا ہے۔

وہ جو کہا ہے کہ انسان کا شیطان انسان ہوتا ہے سو اس مثل کے خلاف مجاہد عبدالہادی اور نہیں تو رمضان شریف کے الوداع والے جمعہ کے دن سے عید کے بعد تک ملا رموزی صاحب کے حق میں ایک قسم کے مذہبی کوتوال صاحب ضرور بنجاتے ہیں۔ یوں کہنے کو علی گڑھ والوں کو لفظ ''اسلام'' کا جتنا درد ہے اور مذہب کی خدمت کے لیے جتنا علی گڑھ کا آدمی کام کرتا ہے شاید ہی ہندستان میں کوئی دوسرا مسلمان اس درجہ جوشیلا مذہبی نظر آئے۔ مگر سوائے مولانا ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور محمد علی شوکت علی کے دوسرے بے شمار علی گڑھیوں نے خلافت ایجی ٹیشن، نیشنل کانگریس کی کامل آزادی والی قرار داد، ترکِ موالات کی تعمیل، مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں نماز با جماعت۔ کھدر کے استعمال، کم سے کم رتبہ مسلمانوں سے دوستی اور برادری سے لے کر رمضان شریف تک میں جو کچھ بھی کیا کرتے ہیں وہ ساری دنیا پر ظاہر ہے۔ اماں صاف کہتے ہیں کہ یہ علی گڑھیے اپنے اپنے مقامِ سکونت میں سارے رمضان بیٹھے فرنگیوں کے چرٹ عرف سگار اور سگریٹ پیا کرتے ہیں۔ رہی نماز کی پابندی تو وہ یونیورسٹی کی مسجد تک میں نہیں پڑھتے تو پھر کہیں کے افسر اور کلکٹر ہو کر کیا پڑھیں گے ہاں پائنیرؔ اخبار کی تلاوت کے بڑے پابند ہیں اور مکانوں پر کتے پالنے کے بے حد مداح مگر اللہ بچائے یا نہ بچائے مجاہد عبدالہادی انصاری سے کہ جہاں رمضان شریف کا پہلا چاند نظر آیا اور یہ خدا جانے کہاں سے اور کس طرح تمام دُنیوی کاموں سے فارغ ہو کر یوں مسلط ہوتے ہیں کہ عید کے بعد بھی تھوڑے روزے رکھوائے بغیر باز نہیں آتے۔ شعبان کے چودھویں رات سے یکم رمضان تک ان کا ساتھ جس طرح گزرتا ہے، اس کی تفصیل

یوں ہے کہ:

کہو اس مرتبہ کے رمضان میں بھی روزے رکھو گے یا نہیں؟

اماں شرم تو آتی نہیں، خدا کے کاموں میں ہو کہ صحت کی خرابی کو لیے پھرتے ہو۔ آخر آخرت میں کیا جواب دو گے خدا کو؟

اور ہاں قرآن شریف کس مسجد میں سناؤ گے؟

کیا کہا؟

لاحول ولا استغفر اللہ۔ اور اس پر بنے پھرتے ہیں ملا رموزی۔

تو پھر یہ خدا کے بندوں کو دھوکہ دیا ہوا مسلمان کاہے کا ہے؟

استغفر اللہ تو یہ کون کہتا ہے کہ تم بارہ مہینے روزے رکھو، مگر یہ تو وہ زبردست فرض ہے کہ کسی حال میں ٹالا نہیں جاسکتا۔

بس تو پھر اس مرتبہ قرآن شریف سنانا۔

انا اللہ اماں یہ تمھارے حالات تو نیچری لوگوں کے سے معلوم ہوتے ہیں۔

تو مگر یہ مضامین تمھیں بخشوا دیں گے کیا؟

مگر وہ تو میں تیرہ برس سے تمھارا ہی قرآن شریف سن رہا ہوں، اب کسی دوسری مسجد میں لوگ مجھے دیکھ کر کیا کہیں گے؟

اماں گری کیسی؟

اور وہ تو سوچو کہ صحابہ کرامؓ کیسے آگ برستے ہوئے میدانوں میں جہاد کرتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے۔

اور تم خود بھی تو کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کے طریقوں، ان کے اخلاق و عادات اور ان کے ہر عمل کی تقلید کریں تو پھر یہ خود را فضیحت اور دیگراں را نصیحت کیسی؟

رمضان شروع ہوئے اور اب الوداع کا جمعہ بھی گزر گیا تو مجاہد عبدالہادی کی پریشانی کا عالم یہ ہے کہ ہر شام کے وقت سارے شہر کی غلط کاریوں کی رپورٹ جب تک پیش نہ کردیں تو

کھانے کے ہضم میں فتور آ جائے۔

تو دیکھا آج وہ شوکت علی خاں ''سپرنٹنڈنٹ'' ملا صاحب آپ نے؟

اماں غضب خدا کا اس نے آج جو عید کا کپڑا خریدا ہے تو میں کیا کہوں تم سے؟

لے گیا ہوگا کوئی ہزار سوا ہزار کا کپڑا، مگر اس آنکھوں کے اندھے کو نہ سوجھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اماں کہا کیوں نہیں ہر طرح سمجھایا کہ دیکھو بھائی یہ انگریزی کپڑا ہے اور پھر ایک سے ایک بڑھیا قسم کا اول تو شرعاً حرام ہے۔ پھر یہ کہ تجھے اگر اتنا ہی لینا ہے تو لے، مگر خدا کے لیے تو کسی مسلمان کی دکان سے لے اور جو عید کے سامان کے لیے تجھے مسلمانوں کی دکان سے خریدنا ایسا ہی ناپسند ہے تو پھر دیسی سامان خرید بندے خدا کے، اور پھر یہ عورتوں کے لیے جو تو پمپ جوتے خرید رہا ہے تو اول تو یہ کہ اس سے عورتوں میں نمود و نمائش اور فضول خرچی کی عادت ترقی پڑے گی پھر جب بچے اپنی ماں بہنوں کو یوں پمپ جوتوں میں غرق پائیں گے تو وہ بھی پھر سائیکل اور موٹر سائیکل کے طالب ہوں گے کل کو۔ اور یہ جو آج کل اسکولوں کے لمڈے بغیر کوٹ، پتلون، جاکٹ، باس کٹ اور سر میں انگریزی تیل ڈالے بغیر اسکول ہی نہیں جاتے تو اس لیے کہ وہ گھر میں جب اپنے ماں باپ کو پمپ جوتا پہنے، موٹر کار میں سیر کو جاتا دیکھتے رہتے ہیں تو پھر ایسوں کی اولاد میں مذہبی احکام کی تعمیل، کفایت شعاری کا خیال اور دیسی چیزوں سے محبت پیدا ہو تو کس طرح؟

تو کیا غلط کہہ رہا ہوں ملا صاحب۔

اچھا ان سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بھی جانے دیجیے بھاڑ میں۔ وہ اس ابراہیم علی حلوائی کی حرکت بھی معلوم ہوئی آپ کو۔ اماں عجیب جاہل انسان واقع ہوا ہے کہیں کا۔

تم جانتے ہو کہ اس شہر میں لے دے کے صرف یہی ایک مسلمان حلوائی ہے، مگر جہاں عید کی نماز سے واپس آیا اور اس نے دکان بند کر کے جو گشت شروع کیا تو خدا جانے کہاں کہاں مارا پھرتا ہے اور مسلمان ہیں کہ ہندوؤں کی دکانوں سے ہزاروں روپیہ کی مٹھائی خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

خدا جانے ان مسلمانوں کو دولت کمانا کب آئے گا۔

اور میں نے اُس کی داڑھی سے ہاتھ لگا کر سمجھایا کہ دیکھ ابراہیم علی بس ایک تو ہی ہمارے شہر کا مسلمان حلوائی ہے، خدا کے لیے تو عید کے بعد اپنی دکان کھولا کر کہ اس میں تیرا بھی نفع ہے اور مسلمان بھی مسلمانوں سے سودا خریدنے کے عادی ہو جائیں گے۔

کہنے لگا کہ ہاں مولانا صاحب میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا، مگر آپ دیکھ لیجیے گا ملا صاحب کہ وہ ہرگز دکان نہ کھولے گا اور ملا صاحب ایمان کی تو یوں ہے کہ ایک بے چارے ابراہیم علی سے کیا شکایت یہ آپ کے دوسرے مسلمان تاجر، دکاندار اور سودا سلف والے عید کے دن دکانیں کب کھولتے ہیں۔ ان میں کا ایک ایک مارا پھرتا ہے عید کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا اور دوسری قوموں کے دکاندار ہوتے ہیں کہ انھی بے خبر اور جاہل عید منانے والے مسلمانوں سے عید کے موقع پر سال بھر کی دولت وصول کر لیتے ہیں اور پھر کہا یوں جاتا ہے کہ مسلمان دنیا کی سب سے ذلیل، جاہل، مفلس اور تنگ دست قوم ہے تو پھر ذلیل نہ ہو تو کیا ہو۔ غرض ملا صاحب ان عید منانے والے مسلمانوں کی بے اعتدالیوں، ان کی فضول خرچیوں اور ان کی بدمستیوں سے میں تو یوں عاجز آ گیا ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔

اور تماشہ دیکھیے کہ یہ مسلمانوں کے اسکولوں میں پڑھنے والے "لمڈے" تو واللہ عید کے موقع پر اپنے ماں باپ کی دولت یوں تباہ کرتے ہیں کہ بھئی واللہ دیکھا نہیں جاتا۔ اماں غضب خدا کا ان میں کا ایک لونڈا انگریزی موزے، بنیائن، مفلر، ٹائی، کالر، ولایتی جوتے، لونڈر، پاؤڈر اور انگریزی کھلونے اس قدر کثیر مقدار میں خریدتا ہے کہ خدا جانے صرف ایک عید پر کئی کروڑ روپیہ ہندستان کے سارے مسلمانوں کی جیب سے نکل کر یورپ والوں کے گھر پہنچتا ہو گا۔

بے شک ملا صاحب سچ فرماتے ہیں آپ کے ان بے چارے کم سمجھ نادان لونڈوں کی کیا خطا ہے اصل میں خطا تو ہے ان غلام ہندستانی ماسٹروں اور پروفیسروں کی جو اسکولوں اور کالجوں میں ان بچوں کے سامنے بس انگریز بنے پھرتے ہیں۔ ہاں اگر یہ غلام دماغ ہندستانی ماسٹر اور پروفیسر اپنا ملکی اور قومی لباس پہن کر اسکول جائیں اور سارے طلبا کو دیسی لباس اور دیسی باتیں پسند کرنے کی ہدایت کرتے رہیں تو پھر کیا مجال جو بچوں میں کفایت شعاری اور جفاکشی کے جذبات بیدار نہ ہوں۔

ملا رموزی کے دوست کی عید تو اوپر ملاحظہ فرمائی آپ نے۔ ممدوح گرامی کو کسی کل چین ہی نصیب نہ ہوا اور عید کے موقع پر آپ مسلمانوں کے فضولیوں ہی پر غم و غصے اور انتظام میں صرف ہو گئے لیکن ملا رموزی کی عید کا عالم اس سے بھی زیادہ نرالا ہے۔ چنانچہ ہمارے ننھے میاں کی تازہ والدہ الوداع کا جمعہ تو بہت دور کوئی دس بارہ رمضان سے پہلے ہی ایک دن فرمانے لگیں کہ بس اب عید میں رہا کیا۔

آج ہی کے دن عید ہو بھی چکی ہو گی۔

اس کا مطلب صاف یہ تھا کہ عید میں بہت کم دن باقی ہیں اور آپ ہو کہ اب تک مجھ سے یہ بھی دریافت نہیں کرتے کہ تمھیں کن چیزوں کی ضرورت ہے؟

ہوتے ہوتے کوئی بیس رمضان کو یکا یک وہ بولیں کہ ابھی سے کہے دیتی ہوں کہ میں عید پر اماں بی کے ہاں نہ جاؤں گی ورنہ عین موقع پر کہو کہ کیوں نہیں جاتی ہو؟ اب تو لامحالہ دریافت کرنا ہی پڑا کہ کیوں؟ بس ہمارے منہ سے "کیوں" کا نکلنا تھا کہ بولیں:

کیوں کیسی؟

کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اس مرتبہ عید کے لیے اماں جان کے ہاں خالو میاں اور خالہ جان بھی کلکتہ سے آرہی ہیں اور پھر محلے کی دس پانچ ماں بہنیں بھی آخر جمع ہو ہی جاتی ہیں تو ان سب میں میں کس منہ سے بیٹھوں گی؟ یہ دیکھیے نا آخر کہ میرے پاس یہ جوتا ہے تم ہی کہو کہ کب کا ہے اب اگر عید کے موقع پر نیا جوتا بھی نہ ہوا تو پھر عید کیا ہوئی بچوں کا کھیل ہو گئی۔

اب تک پاجاموں اور قمیصوں کا کپڑا نہیں آیا ہے تو پھر کیا عین عید کے دن آئے گا؟

میں تو قیامت تک دیسی کپڑے کی قمیض نہ پہنوں گی۔

تو کیا اسی دن کے لیے بنے تھے آپ ملا رموزی؟

تو اگر ایسا ہی مجھے دیسی لباس پہنانا تھا تو ابتدا ہی میں کہہ دیا ہوتا مجھ سے۔

خدا کا شکر ہے میرے باپ نے تو مجھے ہمیشہ ریشم ہی پہنایا ہے اور آج کہو تو میرے ماں باپ میرے کپڑے بنا کر بتا دیں تم کو۔

جی نہیں میرا بدن کوئی لوہے اور فولاد کا تو ہے نہیں جو ان موٹے کپڑوں کو برداشت کر سکے، یہ تو آپ ہی کو مبارک رہیں۔

ہاں ہاں تو کب کہتی ہوں کہ آپ چوری کر کے عید کے کپڑے لائیں۔

تو پھر ناحق کو تم نے مجھ سے چھپایا، ڈر کس کا تھا، کہہ دیا ہوتا پہلے ہی کہ مجھے کوئی قرض نہیں دیتا بس تو رہنے دیجیے مجھے عید ہی نہیں کرنا وغیرہ۔

اس قسم کی جو جرح اور گفتگو الوداع کے جمعہ تک ہوتی ہے یا مسلمان عورتوں میں ہوتی رہتی ہے، اس کا نتیجہ یہی نکلتا دیکھا گیا ہے کہ ملا رموزی صاحب گئے بازار تاؤ میں اور لے آئے اتنا سامان قرض کہ محرم کے بعد تک اس کا روپیہ ادا نہ ہو سکا اور جب عید کے بعد بھی کوئی ان کے سامنے عید کا نام لیتا تو جی چاہتا کہ یہ شخص بات ہی نہ کرے۔

اس لیے عرض ہے کہ جن لوگوں کو اس عید پر نہیں تو آنے والی بقرعید پر تو از راہ خدا ان باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ان کا اور ان کے بچوں کا اور ان کی عورتوں کا لباس حد سے زیادہ سادہ ہو، مگر دل و دماغ عید کی خوشی سے مالا مال ہوں کہ عید کا اصل مقصد دل کی خوشی اور قومی کاموں کی اصلاح ہے اور بس۔

◆◆◆

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دھونیا لوک

مترجم : عنبر بہرائچی

صفحات:80

قیمت : -/64روپے

ہندوستانی تہذیب

مصنف : ابن کنول

صفحات:399

قیمت : -/131روپے

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ : ڈاکٹر سیدہ جعفر

صفحات:823

قیمت : -/233روپے

حسن نعیم اور نئی غزل (تجزیہ وتنقید)

مصنف : احمد کفیل

صفحات:284

قیمت : -/104روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد اول)

مرتبہ : امتیاز وحید

صفحات:354

قیمت : -/118روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد دوم)

مرتبہ : امتیاز وحید

صفحات:368

قیمت : -/133روپے

₹ 243/-

ISBN: 978-93-5160-024-4

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025